صلی اللہ علیہ وسلم

رسولِ رحمت

محمد رسول اللہ

سیرتِ طیبہ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقالات

بہ ترتیب و اضافہ مطالب

مولانا غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز

• لاہور • حیدرآباد • کراچی

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء)

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است
(اقبال)

رسولِ رحمتؐ

سیرتِ طیبہ پر

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور

کے مقالات

بہ ترتیبؒ و اضافۂ مطالبؒ

غلام رسول مہرؔ

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

فہرست

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

ترتیبِ کتاب کی سرگزشت

با تو پیوستم و از غیرِ تو دل ببریدم
آشنائے تو ندارد سرِ بیگانہ و خویش

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور ۲۱۔ فروری ۱۹۵۸ء کو یکایک بیمار ہُوئے۔ ابتدائی خبروں ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ بیماری خاصی خطرناک ہے۔ میں دہلی پہنچنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ۲۲۔ فروری کو یہ الم انگیز اطلاع مل گئی، مولاناؒ اس عالم میں پہنچ گئے ہیں جہاں موت کے دروازے سے گزرے بغیر رسائی ممکن نہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ یُوں وہ رشتۂ عقیدت و نیاز جو کالج کی تعلیم کے زمانے میں استوار ہوا تھا، مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا، چالیس سال کے بعد دنیوی زندگی کی حد تک اختتام کو پہنچ گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ عالم بقا میں ربط و تعلق کی شکل کیا ہوگی اور تعلق پیدا بھی ہو سکے گا یا نہیں؛ مولاناؒ کا دامنِ حیات علم و عمل دونوں کے رنگا رنگ جواہر پاروں سے بھرا ہُوا تھا۔ اس ایک زندگی میں کئی زندگیوں کی گرمجوشیوں اور ہنگامہ آفرینیوں کی بجلیاں کارفرما تھیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے فضلِ لایزال سے جو بلند مقام عطا ہوگا، وہاں تک مجھ عاصی پُر معاصی کا پہنچنا کیوں کر ممکن ہوگا، جس کے پاس نہ علم کا کوئی قابلِ ذکر سرمایہ فراہم ہو سکا اور نہ عمل کی کوئی ایسی متاع میسّر آسکی، جسے شایانِ توجہ سمجھا جا سکے:

نہ دمیدنے تمامے، نہ رسیدنے بہ کامے
چہ کنم کہ کشت دہقاں بہ کنارِ کشت ما را

—— (۲) ——

البتہ یہ کہہ سکتا ہُوں کہ جب سے ہوش سنبھالا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک اور دینِ حق کے لیے ایک خاص تڑپ قلب و روح کی گہرائیوں میں برابر موجزن رہی۔ اس کا تموّج اس وقت بھی خاصا تیز تھا جب میں اس کی حقیقت سے بڑی حد تک ناآشنا تھا اور آج بھی خاصا تیز ہے، جب میں اس سے بالکل غیر متعارف نہیں رہا۔ یہی تڑپ ہے جس نے زندگی کی تاریک منزلوں میں امید کا چراغ لگاتار روشن رکھا۔ ہر کام میں میری رہنمائی کی۔ ہر سفر میں یہ میرے لیے توشہ و زادِ راہ بنی رہی۔ یہی تڑپ ہے، جو عملِ حسن سے محرومی کی حسرتوں کے ہجوم میں بھی زندگی کا حاصل معلوم ہوتی ہے،

بریں زیستم ، ہم بریں بگذرم

میرزا غالب اس سلسلے میں جو کچھ کہہ گئے ہیں، وہ مجھ ایسے ان گنت، کج مج زبان گنہگاروں کا ترجمان حال ہے:

گزشتم ز حسرت، امیدیم ہست — پلید آب روے سپیدیم ہست
کہ البتہ ایں رند نا پارسا — ق — کج اندیشہ گبر مسلمان نما
پرستارِ فرخندہ منشور[1] تست — ہوادار فرزانہ وخشور[2] تست
بر بند امید استواری فرست
بر غالب خطِ رستگاری فرست

(۳)

مولانا آزادؔ فضائل و مکارم علم و فضل کا ایک عجیب پیکر تھے۔ ان کا ہفتہ وار اخبار "الہلال" ۱۹۱۲ء میں ابر بہار کی طرح فضا سے کلکتہ پر نمودار ہُوا۔ وہ ظاہر و باطن میں ہر ایسے جریدے سے جداگانہ تھا، جو ملک میں جاری ہو چکے تھے اور چند ہی مہینوں میں ایسی شہرت و ہر دلعزیزی حاصل کر لی، جو نہ پہلے کسی کو ہُوئی تھی اور نہ بعد میں حاصل ہو سکی۔ انھوں نے حقایق کتاب و سنّت جس دلپذیر انداز میں پیش کیے، اس کی کوئی مثال پھر نہ مل سکی۔ نیز علم و فضل کے ہر شعبے میں انھیں یگانہ حیثیت حاصل تھی۔ جو کچھ لکھتے تھے، اس کی شان سب سے الگ ہوتی تھی اور علم و عمل کے ہر دائرے میں ان کا یہ امتیازِ یگانگی برابر قایم رہا۔ ان کی وفات بڑا ہی الم انگیز حادثہ تھی۔ اس سے بھی بڑا المیہ یہ تھا کہ ان کے بے شمار علمی و دینی افادات بکھرے پڑے تھے، جن کی فراہمی اور ترتیب کی فرصت انھیں جہاد آزادی کی ہمہ گیر مشغولیتوں اور مصائب قید و بند کی بے پناہ مجبوریوں کے باعث نہ مل سکی، بلکہ اس جہاد میں ان کے بہت سے علمی ذخیرے بھی تلف ہو گئے۔ انھوں نے آزادی کے بعد ہر چھوٹے بڑے علمی یا طباعتی ادارے کے لیے ہر ممکن امداد کا انتظام فرما دیا تھا، مگر وہ اپنے افادات کی ترتیب و تہذیب کے لیے کچھ بھی کرنے پر آمادہ نہ ہُوے، حالانکہ یہ ان کی نہیں، علم و فضل کے ایسے نوادر کی خدمت تھی جنھیں بندگانِ خدا کے لیے ہر دور میں بے شمار بصیرتوں اور ہدایتوں کا سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

(۴)

ایسے اکثر مقالات "الہلال" دور اول و دوم یا "البلاغ" میں شائع ہو چکے تھے۔ اول "الہلال" و "البلاغ" کی جلدوں تک عام شائقین کو دسترس ہی حاصل نہ تھی۔ یہاں تک کہ آخری دور میں خود مولانا کے پاس بھی ان اخباروں کے فائل موجود نہ تھے۔ پھر ان کے افادات کو جس انداز میں مرتب کرنا چاہیے تھا، اس کا اندازہ بہت کم اصحاب کو تھا۔

---

[1] قرآن حکیم [2] حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۵)

یقیناً مولانا کے انتقال کے بعد حکومت ہند نے یہ کام ساہتیہ اکیڈمی کے حوالے کر دیا اور اکیڈمی اب تک "تذکرہ" و "غبارِ خاطر" کے علاوہ ترجمان القرآن تین جلدوں میں نہایت اہتمام سے شائع کر چکی ہے۔ اگرچہ ترجمان کی ترتیب میں ایک ایسی تبدیلی کر دی گئی، جو مولانا کی تقسیم مطالب کے مطابق نہ تھی اور اسے کسی بھی اعتبار سے مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ تاہم یہ کتابیں تو پہلے بھی مرتب شدہ موجود تھیں۔ اصل اور حد درجہ اہم معاملہ تو مرحوم کے بکھرے ہوئے افادات کا تھا۔ میں ۱۹۵۹ء میں دہلی گیا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ "الہلال" و "البلاغ" اور "لسان الصدق" کے علاوہ بعض دوسرے مقالات کی اشاعت بھی اکیڈمی کے پیشِ نظر ہے مگر اوّل تمام مضامین کو یکسانی مطالب کے پیشِ نظر حسنِ ترتیب کے بغیر چھاپ دینا چنداں سود مند نہ تھا۔ دوم جو مضامین آج سے کم و بیش نصف صدی پیشتر ضبطِ تحریر میں آئے تھے اور ان میں جا بجا وقت کے احوال و ظروف کے بارے میں تلمیحات تھیں، اگر انھیں توضیحات و حواشی کے بغیر چھاپا جاتا تو وہ عہد حاضر یا دور آیندہ کے اربابِ ذوق کے لیے یسیر الفہم نہیں رہ سکتے تھے۔

یکسانی مطالب کے مطابق انھیں حسنِ ترتیب سے چھاپا جاتا تو وہ مستقل کتابوں کی شکل اختیار کر سکتے تھے، جو ہمیشہ محفوظ رہتیں اور بار بار بے تکلف چھاپی جاتیں۔ بکھرے ہوئے مضامین اسی حالت میں چھاپنے سے نہ وہ کتابی صورت اختیار کر سکتے تھے، نہ ان کی اہمیت کا پورا اندازہ ہو سکتا تھا اور نہ مولانا کے تعلق میں عقیدت و محبت کے تقاضے اس طرح پورے ہو سکتے تھے۔ قطعاً شبہ نہیں کہ اصل کام خاصی محنت اور خاص کاوش و دیدہ ریزی کے سوا پورا نہیں ہو سکتا تھا نیز اس کے لیے گزشتہ حالات خصوصاً مولانا کے حالات سے آگاہی لازم تھی لیکن حکومت ہی کے وسائل ایسی ترتیبات کے لیے مناسب وسیلہ بن سکتے تھے۔ انفرادی وسائل کتنے ہی اچھے ہوتے تمام ضرورتوں کی کفالت کا بار نہیں سنبھال سکتے تھے۔

(۶)

خود میں نے بھی ان ترتیبات کے متعلق کچھ منصوبے سوچ لیے تھے۔ میرے نزدیک بیشتر مقالات کو اصولاً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ اوّل وہ مقالات جو مطالب کی یکسانی کے باعث ایک سلسلے میں مرتب ہو کر مستقل کتابیں بن سکتے تھے، اگرچہ وہ کتابوں کی شکل میں لانے کے لیے شائع نہیں کیے گئے تھے۔ دوم وہ مقالے جن کی تعداد یکسانی مطالب کے اعتبار سے کم تھی یا جن کی حیثیت وقتی تھی۔ اگرچہ "الہلال" و "البلاغ" میں ایسے مقالوں کو بہت کم جگہ ملی۔ وہ یا تو لوگوں نے باہر سے بھیجے تھے اور ان کی علمی حیثیت چنداں بلند نہ تھی یا ان کا تعلق وقت کے بعض جزوی معاملات تک محدود تھا۔

میں چاہتا تھا کہ سب سے پہلے ان مقالوں کو مرتب کر دوں، جو کتابوں کی صورت اختیار کر سکتے تھے۔ ایسی ترتیبات

کی سعی اس لیے بھی ضروری تھی کہ مولاناؒ کے افادات کو حقایق دین کے اعتبار سے حد درجہ اہم حیثیت حاصل تھی اور حق یہ ہے کہ "الہلال" و "البلاغ" میں اگرچہ بڑی ہی عجیب وغریب چیزیں شائع ہوئیں لیکن ان رسالوں کی روح و روان دعوتِ دین ہی تھی۔ اس لیے بھی میں مضطرب تھا کہ مجھ عاجز کی گردن پر چوالیس سال کی پُرخلوص عقیدت اور حق صحبت کا بارِ احسان تھا اور اس کے تقاضے خواجہ حافظ کے الفاظ میں بار بار یاد دلا رہے تھے کہ اے صبا دوست کے ہاں سے خبرِ خوش لا کر دل کا غم دُور کر:

تا معطر کنم از لطف نسیم تو مشام
شمۂ از نفحاتِ نفسِ یار بیار

تاہم میں تنہا ان تمام منصوبوں کو لباسِ عمل نہیں پہنا سکتا تھا نہ میرے قبضے میں ایسے ذسائل تھے کہ ایک مختصر سا ادارہ قایم کر کے، جو چیزیں حد درجہ ضروری تھیں انھیں مرتب کرا دیتا۔ یہ یقین تھا کہ جو کچھ مرتب ہو جائے گا، عزیز مکرم شیخ نیاز احمد (شیخ غلام علی اینڈ سنز) اس کی اشاعت کا انتظام ضرور فرما دیں گے۔

(۷)

تحدیث نعمت کے طور پر یہاں یہ عرض کر دینا غالباً بے محل نہ سمجھا جائے گا کہ گزشتہ اٹھارہ بیس سال کی خانہ نشینی کے ظلمت زار میں جن کرنوں کی بدولت میری آنکھیں منور، میرا دل مستنیر اور میری صلاحیت کار، جیسی بھی تھی، برابر روشن اور گرمجوش رہی، ان کا مصدر و منبع عالم اسباب میں عزیز مکرم شیخ نیاز احمد ہی تھے۔ وفقہ اللہ لما یحبہ ویرضاہ۔ میری طبیعت خدا نے ایسی بنائی تھی کہ علم کی طلب و جستجو نے مجھے برابر بے تاب و بر قرار رکھا۔ اس لگن نے نہایت ناخوشگوار حالات میں بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا لیکن مایحتاج کے حصول کا کوئی ایسا سلیقہ مجھے عطا نہ ہوا جو دورِ حاضر میں میرے لیے کارآمد ہو سکتا۔ یا تو یہ دور میرے لیے ساز گار نہ تھا یا میں اس دور میں زندگی بسر کرنے کے ہر شیوے سے نابلد تھا۔ محض حسن اتفاق کی بنا پر شیخ نیاز احمد میری زندگی میں داخل ہوئے۔ وہ شیخ مبارک علی کے قریبی عزیز تھے، جن سے میرے گہرے تعلق کی ابتدا اٹھاون سال پیشتر ہوئی تھی، جب میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا کچھ معلوم نہیں کہ مجھ بے مایہ کے متعلق شیخ نیاز احمد کے دل میں کیا احساس پیدا ہوا کہ وہ گزشتہ اٹھارہ بیس سال سے میری ضروریات ہی نہیں، زندگی کے ان تمام معاملات کی ذمہ داری سنبھالے بیٹھے ہیں، جو کسی انسان کے لیے وجہ تشویش ہو سکتے ہیں۔ میرزا غالب نے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا!

میں کہہ سکتا ہوں کہ خدا نے میرے لیے رزق کے اچھی طرح ملنے کا ایک وسیلہ شیخ نیاز احمد کی شکل میں مہیا کر دیا اور اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ کمی کا اس لیے کبھی خیال نہیں آیا کہ جب ضرورت پیش آتی ہے،

اللہ کی رحمت سے پوری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد شکوۂ قلت یا تقاضائے بشری حدود ناشناسی بھی ہے اور ناسپاسی بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں زندگی میں منت گزار ہوا تو ایسے عزیز کا، جس کا ہر احسان میرے دل پر اس طرح گزرتا ہے جیسے صبح کے وقت نسیم کلیوں پر سے گزرتی ہے۔ عرفی نے بھی غالباً ایسے ہی حالات میں کہا تھا:

یک منعم و یک نعمت و یک منت و یک شکر
صد شکر کہ تقدیر چنیں راندہ قلم را

شیخ نیاز احمد کے ساتھ عزیزی شیخ بشیر احمد اور برادرم شیخ مبارک علی کو بھی شامل کر لیجیے۔ ان کے ساتھ میرا کوئی خونی رشتہ نہ تھا، دلی خواہش کے باوجود میں ان کی کوئی خدمت بھی بجا نہ لا سکا۔ بہ ایں ہمہ ان کا برتاؤ میرے ساتھ، میری دانست کی حد تک، ایسا رہا کہ کوئی عزیزداری اور کوئی خدمت گزاری اس سے برتر و بہتر ثمرہ پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے شکر و سپاس کے جو جذبات سینے میں ہر وقت موجزن رہتے ہیں، اظہار مطالب کا کوئی اسلوب انھیں اپنے دامن میں سمیٹ نہیں سکتا۔ یہ الفاظ مناسبت ذکر کے سلسلے میں بے اختیار زبان قلم پر آ گئے، حالانکہ اظہار کی ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ:

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

"تاہم اللہ تعالیٰ کے اس فضل بے پایاں پر جوشِ ممنونیت اور فراوانی سپاس گزاری کا سیل بہ ہر حال کسی نہ کسی طور پر نکلنے کے لیے بے تاب تھا اور یہ نکلا:

آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

ان عزیزوں نے محبت و خلوص کی جو متاع بیش بہا مسلسل و متواتر اور بالکل بے غرضانہ مجھ عاجز کے لیے وقف رکھی، اس کی تفصیلات میں جاؤں تو یقین فرمایئے کہ اس حُسنِ سلوک ہی نہیں، طرز و اندازِ حسنِ سلوک کا سراغ دورِ حاضر میں تو شاید ہی مل سکے۔ چند صدیاں پیشتر کے ماضی میں بھی اس کے نشان "دستہ دستہ" نہیں "جستہ جستہ" ہی نظر آئیں گے۔ خدا شاہد ہے کہ میرے لیے اس محبت و خلوص کے مظاہر کا حساب و اندازہ بھی ممکن نہیں اور دعائے اجرِ جمیل کے سوا میرے پاس ہے بھی کیا؛

از دستِ فقیر بے نوا ناید ہیچ
جز ایں کہ بہ صدق دل دعائے بکند

(۸)

اگرچہ وسائل بقدرِ ضرورت میسر نہ تھے، لیکن میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا کہ جتنا بھی ہو سکے، ضرور کیا جائے۔ اور کچھ نہیں تو مولاناؒ کے افادات کی ترتیب کا ایک نمونہ ہی بروئے کار آ جائے گا۔ خدا کی رحمت

سے کچھ بعید نہیں کہ آنے والے دور کے اربابِ ذوق و ہمت ترتیب کے اس سے بھی خوب تر اور خوشتر نقشے آراستہ کر سکیں۔

مجھے یاد تھا کہ مولانا نے "الہلال" و "البلاغ" میں سیرۃ طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اوقات میں بہت سے مقالے شائع کیے تھے۔ وہ ربیع الاول کی تقریب میں ضرور ایک یا دو یا زیادہ مقالے تحریر فرمایا کرتے تھے۔ علاوہ بریں لوگوں کی طرف سے استفسارات آجاتے تھے جن کے مفصل اور تشفی بخش جواب دینا ان کا شیوۂ خاص تھا۔ اسی طرح انھوں نے انبیاے کرام علیہم السلام کے متعلق بہت کچھ لکھا تھا۔ خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق۔ میں نے ایک دوست کو تمام مقالوں کی نقل پر لگا دیا اور چند مہینے میں یہ کام پورا ہو گیا۔

میں نے سیرتِ طیبہ کے مقالے ترتیب سے رکھے اور ان کی فہرست مرتب کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کے متعلق نہایت قیمتی سرمایہ یکجا ہو گیا ہے۔ پھر مولانا کا اندازِ بیان ایسا تھا کہ جو کچھ زبانِ قلم پر آتا، دامنِ دل کو یقین و اعتماد کے گلہاے رنگا رنگ سے بھر دیتا اور شک و تذبذب کی خلش کے لیے کوئی گنجایش باقی نہ رہتی۔ دراصل مولانا فطرۃً داعیِ حق تھے۔ دل پذیری اور یقین افروزی داعی کی تحریر و تقریر کا جوہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے نکلی ہوئی شاید ہی کوئی چیز ہو جو دعوت کے اس معنوی جوہر سے بھرپور نہ ہو۔

میں نے ان مقالوں پر ضروری حواشی لکھے، تمہیدی عبارتیں تحریر کیں۔ جہاں جہاں خلا محسوس ہوئے انھیں مختصر تحریروں کے ذریعے سے پُر کر دیا اور ستمبر ۱۹۶۴ء میں کتاب طباعت کے لیے تیار ہو گئی لیکن دل اس پر مطمئن نہ تھا حالانکہ اس کتاب کا مقدمہ بھی مولانا ہی کے قلم سے تھا۔ یہ تو محسوس ہوتا تھا کہ ان مقالوں پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ جو خلا مختصر سی تحریروں کے ذریعے سے پُر کیے گئے ہیں، وہ دوسرے پہلوؤں کے متعلق مولانا کی مفصل تحریروں کے مقابلے میں بہ دستور خلا ہی محسوس ہوتے رہیں گے لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا صورت اختیار کی جائے اور کمی کیوں کر پوری ہونی چاہیے؟ اسی وجہ سے کتاب حوالۂ طباعت نہ ہو سکی۔

پھر خیال آیا کہ مولانا کے مقالات میں بعض مباحث نامکمل رہ گئے ہیں اور سیرت کے بعض حصے ایسے بھی ہیں جو زیادہ مفصل تحریرات کے متقاضی ہیں۔ ہمارے اکثر سیرت نگار اپنی کتابوں میں جغرافیائی معلومات مہیا کرنے پر ضرورت کے مطابق توجہ نہ فرما سکے اور گزشتہ بیس پچیس سال میں جغرافیائی معلومات کا جو قیمتی ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا (اس سلسلے میں سب سے بڑھ کر سعی و کوشش ڈاکٹر حمید اللہ نے فرمائی تھی) اسے بھی کسی نہ کسی طرح جزوِ کتاب بنا دینا چاہیے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ان ضرورتوں کو کون پورا کرے؟ سیرت کی کتابوں میں جو کمی جا بجا محسوس ہوتی ہے، اس کی تلافی کس سے کرائی جائے اور کتاب کا جو نقشہ ذہن میں جما ہوا ہے، اس کی تکمیل کس کے سپرد ہو؟

(۹)

خود میرے لیے اس باب میں توقف کے دو واضح سبب موجود تھے:

۱۔ موضوع کی انتہائی اہمیت اور اس کا غیر معمولی تقدس حد درجہ ہمت شکن اور حوصلہ فرسا تھا۔ ایسے شخص کے لیے جو علم و عمل دونوں کے اعتبار سے سراسر تہی دامن تھا، اس موضوع پر قلم اٹھانے کا تصور بھی دل پر لرزہ طاری کر دینے کے لیے کافی تھا۔

۲۔ مولاناؒ جو کچھ لکھ چکے تھے، وہ اس درجہ پاکیزہ، دلربا اور ایمان پرور تھا کہ اس پر نظر پڑتے ہی عزمِ نگارش عرقِ انفعال بن کر بہ نکلتا تھا۔

نہ ویسا لکھنا آئے، نہ لکھنے والا ملے۔ آخر قدم آگے بڑھے تو کیونکر بڑھے؟

موضوع کی اہمیت کے متعلق عرفیؔ جو کچھ کہہ گیا ہے، اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے؟

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

صحرا کی وسعت و پہنائی میں انسان جہاں چاہے قدم رکھے، جس طرف چاہے نکل جائے۔ پوری عمر بھی نئے نئے راستے اختیار کرنے کی کوششوں میں گزار دے تو جہاتِ مستعار ختم ہو جائے گی اور دامنِ صحرا کی پہنائی بدستور بے پایاں رہے گی۔ پھر تلوار کی دھار پر کون چل سکتا ہے؟ دھار پر پاؤں دھرتے ہی اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے اور چلنے والا معذور ہو کر بیٹھ جائے گا۔ عرفیؔ اس حقیقت سے ناواقف نہ تھا مگر اس نے راستے کی مشکلات کا زیادہ سے زیادہ جامع اور موثر تصور پیدا کرنے کی کوشش میں یہ اسلوب اختیار کیا اور حق یہ ہے کہ مشکلات کا اس سے دل نشین تر خاکہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

(۱۰)

یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ عمر بھر لکھنے ہی سے سروکار رہا۔ اوائلِ شباب سے اب تک جتنی خامہ فرسائی کی، اس کے نتائج کی وسعت کا کوئی اندازہ ذہن میں موجود نہیں۔ میں نے اٹھائیس سال اخبار نویسی میں صرف کیے جو ذہنی اور بدنی قوتوں کے بہترین سال تھے اور وہ بھی روزنامہ نویسی میں۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے صرف افتتاحی مقالات کا سرسری حساب کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ متوسط سائز کی ہر جلد پانسو صفحے کی رکھی جائے تو میرے لکھے ہوئے مقالاتِ افتتاحیہ کم و بیش اسّی جلدوں میں سمائیں گے تاہم مشاقی کے زعم میں سیرۃ طیبہ کے کسی حصے پر لکھنے کے لیے آمادہ ہو جانا بہت بڑی جسارت تھی، جو میرے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی اور شیخ سعدیؒ کا یہ حکیمانہ قول سامنے تھا،

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

سپر اندازی کا اس سے بڑا مقام کیا ہو سکتا تھا جو مجھے درپیش تھا؛

(۱۱)

غرض مولاناؒ کے مقالات بڑے شوق سے نقل کرائے تھے اور خیال تھا کہ جلد چھپ جائیں گے، لیکن میرے تصورات ترتیب میں اس طرح اُلجھے کہ پانچ سال گزر گئے اور بظاہر ان کے طبع ہونے کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ آخر سوچا کہ یہ تعطل کب تک جاری رہے گا اور جو بیش بہا دینی وعلمی دولت میں نے مشقت سے جمع کی تھی، وہ کب تک "گنج بہ ویرانہ" کی صورت میں شوق کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے گی؛ کیوں نہ خود ہی ہمت کر کے پہلے وہ ابواب مرتب کیے جائیں، جو نسبتہً سہل ہیں اور ان میں زیادہ دقیق مباحث سے سابقہ نہیں پڑتا، جن میں ذرا سی لغزش بھی انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ اس طرح کام شروع ہوا تو رفتہ رفتہ بہت کچھ لکھا گیا۔ کئی معاملے ایسے بھی معرض تحریر میں آ گئے جو نئے ہونے کے باعث شاید اجنبی سے محسوس ہوں۔ لیکن میں نے اپنی دانست میں انھیں ضروری سمجھتے ہوئے مرتب کیا اور جو کچھ لکھا، اس میں مولاناؒ ہی کی مہیا کی ہوئی روشنی میری رفیق طریق رہی یا کہنا چاہیے کہ کم از کم میرا تصور یہی تھا۔

(۱۲)

پھر میں نے وہی ابواب لکھے جو یا تو مولاناؒ کے مقالات میں آئے ہی نہیں تھے، اس لیے کہ وہ سیرت نہیں لکھ رہے تھے۔ سیرت کا جو حصہ اتفاقیہ ان کے سامنے آ جاتا، اس پر مقالہ لکھ دیتے یا کسی معاملے کے متعلق کہیں سے استفسار آ جاتا تو عادت شریف کے مطابق اس کا مفصل جواب چھاپ دیتے یا ان کے بعض ضمنی اشارے کسی قدر تفصیل کے محتاج تھے، ان پر لکھا یا وہ کسی اہم مسئلے کی محض تمہید ہی لکھ سکے۔ پھر نظر بندی کی نوبت آ گئی اور مضمون مکمل نہ ہو سکا۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق کوشش کی کہ متعلقہ موضوع کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر دوں، تاکہ زیادہ بالغ نظر اصحاب مزید غور وفکر کے بعد خوب تر تحریر کے لیے سفر شروع کریں تو میری مہیا کی ہوئی معلومات زادِ راہ کا کام دے سکیں۔

(۱۳)

مولاناؒ کی تحریرات میں اپنی تحریریں شامل کر دینا ایسا ہی ہے جیسے حریر صد رنگ کی تہوں میں ٹاٹ کے ٹکڑے رکھ دیے جائیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ:

رشتہ بر قیمت از آمیزش گوہر نہ شود

لیکن ظاہر ہے کہ میں مجبور تھا، اس لیے معذور سمجھیے۔ حالات ایسے پیش آ گئے کہ میرے لیے قدم آگے بڑھانے کے سوا چارہ نہ رہا؛

من بہ ایں وادی نہ خود آیم، جنوں آرد مرا

یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے اپنے لکھے ہوئے تمام ابواب کے ساتھ "مولف" کی تصریح کر دی ہے اور جہاں جہاں کوئی ایسا نشان نہیں، سمجھ لیجیے کہ وہ تمام مقالے اور تمام تحریرات مولاناؒ کی ہیں۔

(۱۴)

علم وعمل کی کوئی قابلِ ذکر متاع دامن میں ہے ہی نہیں کہ دعویٰ سے کچھ کہا جا سکے اور ہوتی بھی تو آپ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس کے آستانہ مبارکہ پر پہنچ کر کوئی دعویٰ زبان پہ لانے یا دل میں رکھنے کا یارا کیسے ہو سکتا ہے؛ عشق ومحبت سے رُوح وقلب سرشار سہی، لیکن جب اپنے غیر شایاں اعمال پر نظر پڑتی ہے تو یہ سرشاری بھی سراسر بے حیثیت ہی رہ جاتی ہے۔

آخر میں دردمندانہ التجا ہے کہ اگر میری تحریر کا کوئی بھی حصہ کسی دل میں حبِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چراغ کی لو کسی قدر بھی تیز کر سکے تو وہ صاحب دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس روسیاہ کی عاقبت بخیر ہو۔ جہاں جہاں لغزشیں اور خطائیں، خامیاں اور افتادگیاں نظر آئیں، ہاتھ اٹھائیں کہ خدائے عرش عظیم اپنے لطف عمیم اور فضل جسیم سے اس خطاکار کے گناہ بخش دے۔ ان میں قصد ونیت کا کوئی دخل نہ تھا۔ انّہٗ ھو یُبدی ویُعید وھو الغفور الودود ذو العرش المجید، فعالٌ لما یرید؛

بر مسکنت بنشینیم یا قبول کنند
طفیلیان سرخوان خواجۂ لولاکؐ

مقدمہ

باب ۱

سیرۃ نبویؐ کا مقام

(۱)

شیخ عماد الدین واسطی

حافظ ابن کثیر اپنی تاریخ کبیر "البدایہ والنہایہ" میں شیخ عماد الدین واسطی کی نسبت لکھتے ہیں کہ ابتدا میں ان کا مسلک دوسرا تھا، لیکن پھر دوسرا رنگ چڑھ گیا۔ ان کی نشوونما فقہاء متکلمین کی جماعت میں ہوئی تھی اس لیے جدل و خلاف اور کلام و رائے کا اثر غالب تھا۔ مصر سے بغداد گئے تو وہاں خیالات میں توسیع ہوئی۔ اپنی حالت کا محاسبہ کیا تو یقین و طمانیت سے قلب کو خالی پایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فقہاء سے متکلمین کے طریق سے دل برداشتہ ہو گئے۔ تصوف کی طرف توجہ ہوئی لیکن عام متصوفین کی صحبتوں کا جو رنگ ڈھنگ نظر آیا اس سے طبیعت اور زیادہ مکدر ہو گئی۔ بالآخر دمشق آئے اور امام ابن تیمیہؒ کی صحبت میں داخل ہو گئے۔

ابن تیمیہ کا ارشاد

خود شیخ عماد الدین واسطی کا بیان ہے کہ میں دمشق پہنچا تو امام ابن تیمیہؒ سے بھی ملا۔ کہتے ہیں کہ جب پہلی مرتبہ ان کی صحبت درس میں حاضر ہوا تو عجیب اتفاق ہے کہ علم کلام کی نسبت گفتگو تھی اور امام موصوف فرما رہے تھے: دنیا میں متکلمین و فلاسفہ سے بڑھ کر مضطرب و محروم اور اطمینان قلب و سرور روح کی لذت سے یک قلم ناآشنا اور کوئی گروہ نہیں۔ پھر مشاہیر فلاسفۂ قدما اور ارباب مقالات کے چند اقوال سنائے جن میں انھوں نے خود اپنے وجود پر مجہولیت و نامرادی اور بدحالی و بے بصیرتی کی شہادت دی تھی۔

غرض شیخ موصوف کہتے ہیں کہ ایک ہی صحبت میں شکوک و اضطراب کے سارے پردے اٹھ گئے اور میرے دل نے حلاوت ایقان و لذت طمانیت پالی۔ پھر جب امام موصوف میرے حالات سے آگاہ ہوئے تو وصیت کی:

"ساری چیزیں چھوڑ کر صرف سیرۃ نبویہ کے مطالعے اور تدبر و فکر کو اپنے اوپر لازم ٹھہرا لو۔ یقین اور ایمان کی تمام بیماریوں کے لیے یہی نسخۂ شفا ہے۔"

چنانچہ میں نے اسی کو حرز جاں بنا لیا اور جو کچھ پایا اسی کے وسیلے سے پایا۔

شک و اضطراب کا واحد علاج

امام ابن تیمیہ کی اس وصیت کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

بہر حال اس واقعے میں قابل غور وہ عشق و شغف ہے جو امام موصوف (ابن تیمیہ) کو خصوصیت کے ساتھ سیرۃ نبویہ سے تھا۔ ایک سرسری نظر رکھنے والا تو اس واقعے کو معمولی سی بات سمجھ کر معرضانہ آگے بڑھ جائے گا، لیکن صاحب نظر و بصیرت اسی ایک بات سے امام موصوف کے تمام علوم و اعمال کا محور

مرکز معلوم کر لے سکتا ہے۔

علم و بصیرت کا اصل سرچشمہ

انھوں نے ایک ایسے صاحبِ علم، مگر مریضِ شک و اضطراب کو، جو مدعیانِ علم و حکمت کی دانش فروشیوں کے ہاتھوں اپنا یقین و اطمینان ضائع کر چکا تھا یہ وصیت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف حیاتِ طیبۂ نبوت کے مطالعہ و تفکر میں لگ جاؤ۔ گویا اس طرح تبلا دیا کہ علم و بصیرت کا اصل سرچشمہ صرف حیاتِ نبوت اور منہاجِ مقامِ رسالت ہے، جسے قرآن حکیم نے " الحکمۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے؛

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔[1]

کیونکہ دنیا میں حکمتِ صادقہ کا اس حکمت سے الگ کوئی وجود ہی نہیں۔ "حکمت" یا تو خود منہاج و سنتِ نبوت ہے یا علم و عمل کی ہر وہ بات جو اس سے ماخوذ اور صرف اسی پر مبنی ہو۔ یہی "خیرِ کثیر" مبدءِ جمیع خیرات و برکاتِ ارض و نوع ہے اور صرف اسی نسخۂ شفا سے دل اور روح کی ساری بیماریاں دُور ہو سکتی ہیں۔ خواہ شکوک و ارتیاب کی بیماری ہو، خواہ اوہام و افکار کی، خواہ ادعاے ادریت کا ہیجان ہو، خواہ حیرانی و سرگردانیِ لاادریت کا خمار؛

زہر مرض کہ بنالد کسے، شراب دہند!

کوئی بیماری ہو دوا صرف ایک ہی ہے؛

یکے دواست بہ دارالشفاے میکدہ ہا![2]

الفاظ مختلف، مفہوم ایک

باقی یا تو اسماء مختلفہ ہیں اور مسمّٰی وہی ایک ہے، مثلاً "سنّت و سیرت" کی جگہ "قرآن و کتاب" کا لفظ بول دیا جائے کہ نام دو ہو گئے مگر حکایت شہد و عسل سے زیادہ نہیں، یعنی بات وہی ایک رہی۔ دلالت و تسمیہ میں تعدد ہُوا، مدلول و مسمّٰی میں نہیں؛

عبارا تنا شتیٰ و حسنک واحد![3]

یا پھر اسی نسخہ کے اجزاء و توابع، جیسے آثار و سیرِ صحابہ و سلفِ امت اور معارف و بصائر ماخوذہ و مکتسبہ کتاب و سنت کہ گو اشکال و اسماء میں تفرقہ و امتیاز ہُوا، مگر "بحکم علیکم بسنتی و سنۃ خلفاء الراشدین"[4] اور " وَاٰخَرِيْنَ

---

[1] جسے حکمت مل گئی تو یقین کر و اس نے بڑی ہی بھلائی پالی۔ (سورۃ بقرہ: ۲۶۹)

[2] یہ شعر یحییٰ کاشی کا ہے اور اصل میں یوں ہے؛

دوا یکے است بہ دارالشفاے میکدہ ہا

زہر مرض کہ بنالد کسے، شراب دہند

[3] ہماری عبارتیں گوناگوں ہیں مگر تیرا حسن ایک ہی ہے۔ [4] میری سنت اور سنت خلفاے راشدین کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ (حدیث)

مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ[۱]" اور" فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ[۲]" اور" مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِیْ[۳]"
معنیً وحکماً ، جزء وکل ، اصل و فرع ، مصدر و مشتق یا شمس و کواکب کا سا معاملہ واقع ہوا ہے ۔ روشنی صرف ایک ہی ہے
اور ایک ہی کی ہے اگرچہ چاند سے بھی مل جائے اور چمکیلے ستاروں سے بھی ...... اور اگر یہ دونوں صورتیں بھی نہیں
تو پھر جو کچھ ہے ، نہ تو علم ہے اور نہ شفاء ، بلکہ خود جہل ہے اور مرض ۔ اگرچہ افسوس کہ اس دنیا میں زیادہ حصہ انھی مریضوں کا
بستا ہے جنھوں نے ہمیشہ طلبِ مرض کو طلبِ شفا سمجھا ہے اور سمِ قاتل سے امیدِ حیات رکھی ہے ، پھر یاد رہے کہ
یہی معنی ہیں سلف کے اس قول کے کہ علم نہیں ، مگر وہ جس میں " حدثنا " اور " اخبرنا " ہو اس کے سوا جو کچھ ہے ' وساوس
وضلالت سے زیادہ نہیں .... اور یہی معنی ہیں اس قولِ نبوی صلعم کے کہ علم صرف تین ہیں ، ماسوا ان کے
جو کچھ ہے ، فضل ہے ، آیۂ محکمہ ، سنّتِ قائمہ اور فریضۂ عادلہ ، اور یہ منجملہ جوامع الکلم نبویہ کے ہے کہ اس دنیا میں علم کی حقیقت
اور اس کے حدود و مقاصد و مراتب و انواع کی نسبت جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے ، وہ سب کچھ ان تین لفظوں میں جمع کر دیا گیا
اور بتلا دیا گیا ....

۲ دو بنیادی بیماریاں

سبب اس کا ظاہر ہے ۔ قلب و روح کی جتنی بھی بیماریاں ہیں اصل مبدء ان کا دو قسموں سے باہر نہیں ۔ ایک قسم مرض کا نام الحاد و انکار ہے ، دوسری کا توہم و سوفطائیت ۔ باقی تمام
بیماریاں اس کے اتباع وعوارض و فروع ہیں اور دونوں قسموں میں ظہورِ مرض کے علائم و آثار و عواقب مشترک ہیں ،
یعنی دونوں کا نتیجہ شک وجہل و اضطراب ہے اور فطرت کی طمانیت نیز سرور و راحتِ قلبی کا ازالہ ، یعنی بہ اصطلاح
قرآن حکیم " نفسِ مطمئنہ " کا فقدان[۴]۔

پس مرض بہ لحاظ علت وظہور ہر حال میں صرف یہی ہوا کہ شک وظلمت اور اس عالم میں وحی الٰہی اور حکمِ نبوت
اور اس سے ماخوذ و مکتسب کے سوا جو کچھ ہے " یقین ، برہان ، بصیرت اور فرقان " نہیں شک وظن ہے ۔ عدمِ علم و
بصیرت ہے یا تخمین و رائے اور تلعب و تخرص بالریب ہے ۔ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ[۵]
اور بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ[۶] اور وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۵

---

[۱] اٹھایا اس رسول کو دوسرے لوگوں کے واسطے بھی جو ابھی نہیں ملے ان میں (جمعہ : ۳) [۲] اور جس کسی نے اللہ تعالیٰ اور
اس کے رسول کی اطاعت کی تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر خدا نے انعام کیا (اور وہ نبی ہیں ، صدیق ہیں ، شہید ہیں اور نیک و
راستباز لوگ ہیں) (نساء : ۶۹) [۳] جس راستے پر میں اور میرے اصحاب ہیں ۔ (حدیث)

[۴] اس کے لیے دیکھیے پیشِ نظر باب کا ضمیمہ ۔

[۵] اور ان کو کچھ خبر نہیں اس کی ، محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں (الجاثیہ : ۲۵)

[۶] کوئی نہیں وہ دھوکے سے ہیں کھیلتے ۔ (الدخان : ۹)

ثَانِیَ عِطْفِهٖ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ[1] اور هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا[2] اور اَفَمَنْ كَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ[3] اور وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا[4] قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ[5] اور بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ[6] مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ[7] وغیر ذالک من الآیات والقواطع اور اسی لیے دعوت خاتم الادیان و مکمل الشرائع کی نسبت اکثر خطبات نبویہ میں یہ اعلان عام پاتے ہو کہ اس کا ظہور کرہ ارضی کے کمال جہل وفقدانِ علم کے وقتوں میں ہوا، یعنی اس لیے ہوا تاکہ علم و نور سے دنیا کو بھرپور کر دے اور علم و نور نہیں مگر یقین اور زوالِ شک و ریب، علی الخصوص اولین خطبہ جمعہ بالمدینہ میں فرمایا: "ارسلہ بالھدی والنور والموعظۃ علی فترۃ من الرسل وقلۃ من العلم، وضلالۃ من الناس[8] اخرجہ الحاکم علی شرط الصحیحین والطبری فی تاریخہ۔

پس ظاہر ہے کہ جن نام نہاد علوم کا ماحصل خود ظلمت ظن و شک اور کوری وہم و رائے سے زیادہ نہیں، وہ مریضان یقین و اعتماد کے لیے کیونکر شفا ہو سکتے ہیں؟ اور جو خود سرگشتہ راہ اور واماندہ کار ہے وہ دوسرے گم کردہ راہوں کی کیا رہنمائی کر سکتا ہے؟

جوہر طینتِ آدم ز خمیر دگر ست
تو توقع ز گل کوزہ گراں می داری

---

[1] اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ نہ تو ان کے پاس علم کی روشنی ہے، نہ کسی طرح کی رہنمائی، نہ کوئی کتاب روشن، مگر گھمنڈ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو ان کی راہ سے بھٹکا دیں۔ (الحج ۸-۹) [2] کیا تمہارے پاس علم کی کوئی روشنی ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ (الانعام: ۱۴۹) [3] کیا وہ جو اپنے پروردگار کے بتلائے ہوئے راستے پر ہیں، ان لوگوں کی طرح ہو سکتے ہیں جنھیں اپنے اعمال بد میں خوبی نظر آتی ہے اور وہ ارادۂ نفس پر چلتے ہیں (محمد: ۱۴) [4] اور اس بارے میں ان کے پاس کوئی ذریعہ تحقیق و یقین نہیں، محض اپنے گمان پر چل رہے ہیں اور ظن و تخمین کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقت و علم کے سامنے کچھ کارآمد نہیں (النجم: ۲۸) [5] اے پیغمبر! تم کہہ دو میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی راہ کی طرف بلاتا ہوں اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح) بلاتے ہیں۔ (یوسف: ۱۰۸) [6] نہیں یہ بات نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ (یونس: ۳۹) [7] تم اللہ تعالیٰ کے سوا جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی خاص سند نہیں اتاری حکومت تو اللہ کے لیے ہے (یوسف: ۴۰) [8] اسی نے محمد کو ہدایت، نور اور نصیحت کے ساتھ ایسے زمانے میں بھیجا ہے جبکہ مدت سے کوئی رسول دنیا میں نہیں تھا۔ علم گھٹ گیا اور گمراہی بڑھ گئی۔ (یہ پورا خطبہ آگے آرہا ہے)

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُم مِّنْهَا عَمُونَ۔[1]

ازالۂ مرض کا طریقہ مرض کا ازالہ دوا سے ہوسکتا ہے نہ کہ خود تولیدِ مرض سے۔ اگر دنیا کا اصل مرض "بے یقینی" اور "بصیرت" سے محرومی ہے اور "شک و گمان" کی ہلاکت، تو اس کا علاج وہ کیونکر کرسکتے ہیں جن کا خود اعلان ہے ہمارا منتہائے فکر و ادراک اس سے زیادہ نہیں کہ "لا ادری ولا اعلم" ہم نہیں جانتے اور نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے اور کس کے لیے ہے؛ یعنی بحکم "وشھدوا علی انفسھم"[2] وہ خود اپنے منتہائے معرفت کو جہل سے زیادہ نہیں تبلاتے۔ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ۔[3]

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اس کا علاج اور نسخہ شفاء "لما فی الصدور" تو صرف اسی اعلم الخلائق و اعرف العباد کے دار الشفا وحی میں مل سکتا ہے جو شک کی جگہ یقین کا، ظلمت کی جگہ نور کا، عدم علم کی جگہ علم و بصیرت کا، ظن و قیاس و گمان کی جگہ بینہ و حجت کا، برہان و فرقان کا "بتیاناً لکل شیٔ" اور عروۃ الوثقیٰ" کا، غرض کہ "لا ادری" اور "لا اعلم" کی جگہ "انی اعلم" اور "انی علی بینۃ من ربی" اور "انی اشھد" بلکہ "رأیت و سمعت" کا دعویٰ اور اعلان کر رہا ہو اور تمام نوع بشر کو یہ کہہ کر بلا رہا ہو: ھٰذہٖ سبیلی ادعوا الی اللّٰہ علیٰ بصیرۃٍ انا ومن اتبعنی![4] اور تمام منکرین و جاحدین سے بار بار مطالبہ کرتا ہو، ھل عندکم من علمٍ فتخرجوہ لنا۔[5] یعنی یہ علم و یقین اور خروج من الظلمات الجھل الی نور المعرفۃ و الحقیقۃ کی راہ ہے جس پر میں تم کو دعوت دے رہا ہوں پھر تمہارے پاس بھی کوئی یقین اور "علم و بصیرت" ہے جسے دنیا کے سامنے پیش کرسکتے ہو؟

علم و لاعلمی فھل یستوی الاعمیٰ والبصیر؟[6] اور وھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون؟[7] اور ایک کہتا ہے میرے پاس شک ہے اگر تم میری طرف آؤ تو تم کو شک سے معمور کر دوں گا۔ دوسرا کہتا ہے میرے پاس جو کچھ ہے بجز یقین و برہان کے اور کچھ نہیں: لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید[8] اور بل ھو اٰیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم۔[9] میں بصیرت ہوں، دعوت علم ہوں، پیام

---

[1] بلکہ ان کو شبہ ہے اس میں، بلکہ وہ اندھے ہیں (نمل: ۶۶) [2] خود اپنے اوپر گواہی دیتے ہیں (اعراف: ۳۶) [3] ہم کو آتا تو ہے ایک خیال سا اور ہم کو یقین نہیں آتا (جاثیہ: ۳۲) [4] میری راہ تو یہ ہے میں اس روشنی کی بناء پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور اس راہ میں جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا وہ بھی اسی طرح بلاتے ہیں۔ (یوسف: ۱۰۷) [5] کیا تمہارے پاس علم ہے؟ اگر ہے تو ہمارے سامنے لاؤ (انعام: ۱۴۸) [6] کیا وہ جو اندھا ہے (اور حقیقت کے لیے کوئی علم و یقین نہیں رکھتا) اور جو بصیر ہے (کہ حقیقت کی روشنی دیکھ رہا ہے) دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ (انعام: ۵۰) [7] کیا صاحبان علم اور گم گشتگان جہل دونوں کا ایک ہی درجہ ہے؟ (زمر: ۹) [8] قرآن ایسا ہے کہ نہ اس کے آگے باطل جم سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے اسے جگہ مل سکتی ہے وہ خدائے حکیم و حمید کا اتارا ہوا ہے (حم سجدہ: ۴۲) [9] بلکہ وہ کھلی نشانیاں ہیں اہل علم کے سینوں میں (عنکبوت: ۴۹)

حجت و برہان ہوں، حقیقت جو ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتی اس کی ایک ہی راہ ہوں۔ اقوم الطرق، اوضح السبل، صراط السوی: ان ھٰذا صراطی مستقیماً فاتبعوا و لا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔[1]

پھر بھلا دنیا کو جو طمانیت و قرار قلب کی کھوج کی پیاسی اور شک و اضطراب نفس کے زخموں سے جاں بلب ہے، کس کا ساتھ دینا چاہیے؟ اس کا جو خود شک و ریب کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے؟ ایک تاریکی سے نکلنے کے لیے دوسری تاریکی میں ڈوبتا ہے اور تاریکیوں کا یہ حال ہے کہ خود اپنا ہاتھ بھی اسے سجھائی نہیں دیتا۔ ایک گتھی سلجھانا چاہتا ہے تو دس نئے الجھاؤ رشتۂ ادراک میں پڑ جاتے ہیں۔" او کظلمٰت فی بحرٍ لجیٍّ یغشاہ موجٌ من فوقہ موجٌ من فوقہ سحابٌ ظلمات بعضھا فوق بعض، اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا۔ و من لم یجعل اللہ لہٗ نوراً فما لہٗ من نور۔[2]

اور جس کی ان ساری کوششوں اور طلب و جستجو کا جو حقیقت تک پہنچنے اور عقدۂ ہستی کو حل کرنے کے لیے کرتا ہے، یہ حال ہے کہ ہر نیا مرحلہ ایک نئی گمراہی کا پیام اور ہر منزل ایک نئے بُعد و گم گشتگی کی مایوسی ہوتی ہے جس نظریے پر رُکتا اور جس تھیوری کو فاتح کار سمجھ کر پُوجتا ہے، جب اس تک پہنچتا ہے تو یقین کی جگہ وہ خود ایک نئے شک کی دعوت نکلتی ہے اور جواب کی جگہ وہ خود ایک نیا سوال ہوتی ہے۔ اس طرح اس کی ساری امیدیں اور ساری خوشیاں اس پیاسے کی امید سے زیادہ نہیں ثابت ہوتیں جو ریگستان افریقہ کو دجلہ و فرات سمجھ کر بے تحاشا دوڑ رہا ہو؛ کسرابٍ بقیعۃٍ یحسبہ الظمآن مآءً حتیٰ اذا جآءہٗ لم یجدہ شیئاً۔[3]

کس کا دامن تھامنا چاہیے؟

پس کیا کھوئے ہوؤں کو طلب و دلیل و ہدایت میں اپنے ہی جیسے کھوئے ہوؤں کا دامن پکڑنا چاہیے؟ ضعف الطالب و المطلوب[4] اور لبئس المولیٰ و لبئس العشیر[5] یا پھر اس کا ساتھ دینا اور بلاچون و چرا سمع و طاعت کا سر جھکا دینا چاہیے جس کی ساری پکار اور سارے پیاموں کی بنیاد ہی یہ ہے کہ میں ظلمت نہیں بلکہ سرتاسر نور ہوں۔ میں تاریکی میں ادھر ادھر بھٹکنے والا قدم اور خود اپنے ہاتھ کو بھی نہ دیکھ سکنے والی آنکھ نہیں ہوں، بلکہ معرفت و شہادت کا اجالا ہوں۔ نورانیت میں بے خوف لغزش و بے خطرۂ گمراہی دوڑنے والا قدم ہوں اور دوپہر کی چمکیلی روشنی میں ایک ایک ذرہ تک کو دیکھ لینے اور پا لینے والی

---

[1] یہی راہ میری ٹھہرائی ہوئی سیدھی راہ ہے اس پر چلو اور دوسری (راہ) پر نہ چلو کہ خدا کی راہ سے بھٹکا کر تمھیں تتر بتر کر دے (انعام ۱۵۲)

[2] اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ چڑھی آتی ہے اس پر ایک لہر، اس پر ایک اور لہر، اس پر بادل، تاریکی پر تاریکی چھائی ہے آدمی اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے اور جسے اللہ ہی نے نہ دی روشنی اس کے لیے کہیں نہیں روشنی (نور ۴۰)

[3] جیسے چٹیل میدان میں ریت کہ پیاسا دور سے اسے پانی سمجھ کر دوڑتا ہے مگر جب اس کے پاس آتا ہے تو کچھ بھی نہیں پاتا (نور: ۳۹)

[4] طلبگار بھی درماندہ اور مطلوب بھی درماندہ (حج: ۷۳) [5] کیا ہی بُرا دوست اور کیا ہی بُرا ساتھی۔ (حج: ۱۳)

بناتی ہوں" بعثت بالحنیفة السمحة[۱] وترکتکم علی البیضاء لیلھا کنھارھا[۲]۔ یہاں ظلمات بعضھا فوق بعض کا معاملہ نہیں بلکہ یمین ویسار، بالا وپست اور بین یدیہ وخلفہ بجز نور اور نورٌ علیٰ نور کے اور کچھ نہیں۔ وکان من دعائہ صلعم باللیل: اللھم اجعل فی قلبی نوراً واجعل فی لسانی نورًا واجعل فی سمعی نورًا واجعل فی بصری نورًا واجعل خلفی نورًا ومن امامی نورًا واجعل لی من فوقی نورًا ومن تحتی نورًا۔ اللھم اعطنی نورًا (الٰہی میرے دل میں، میری زبان میں، میرے کانوں اور میری آنکھوں میں نور بھر دے۔ میرے پیچھے، میرے آگے، میرے اوپر، میرے نیچے نور ہو۔ الٰہی مجھے نور عطا کر) نہ میری حقیقت بیں آنکھ کے لیے زیغ ہے، نہ منزل شناس قدم کے لیے ٹھوکر۔ ما زاغ البصر وما طغیٰ لقد رأی من اٰیات ربہ الکبریٰ[۳] بلکہ جس حقیقت ہزار حجاب کا ایک سچا یا کم از کم سچائی سے قریب تصور بھی تم سے بن نہ آیا۔ میں نہ صرف اس کا سراغ ہی رکھتا ہوں بلکہ وہ تو میری دیکھی بھالی اور میرے سامنے کی مشہود ومنظور ہے۔ حتیٰ وجدت بین ثدیی (اس کی انگلیوں سے چھونے کی ٹھنڈک اپنے سینہ پر محسوس کر رہا ہوں) اس کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۔ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۔[۴]

ایمان وایقان

تم نے اپنی درماندگیوں سے عاجز آکر اس کا نام ما فوق ادراک اور غیب رکھ دیا ہے حالانکہ یہاں تو اس کے شہود ورویت کا یہ حال ہے کہ اس کا ذکر ہی "شہادت" کے لفظ سے کیا جاتا ہے جس کے معنی حضور ورویت کے ہیں۔ شھد اللہ لا الٰہ الا ھو والملٰئکة واولوا العلم قائما بالقسط[۵]۔ تم اس کی طلب وجستجو کو گمان وخیال اور قیاس وظن سے تعبیر کرتے ہو کہ اس سے آگے تمہارا قدم نہیں بڑھتا: ذٰلک ظن الذین کفروا[۶] حالانکہ یہاں ظن وگمان کا کیا ذکر، ظن کو تو یہاں زندگی (ہدایت) کے دائرے ہی سے خارج اور موت (کفر) کا ہم نشیں سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو اس کی نسبت جو کچھ کہا اور سمجھا جاتا ہے اس کا نام ہی "ایمان" اور "ایقان" ہے یعنی عدم شک اور یقین صرف وبحت۔

غرض امام ابن تیمیہؒ نے ایسی حقیقت جو طبیعت کو جو ارباب ظن ورائے کی صحبتوں سے وادی شک واضطراب میں حیران وسرگرداں ہو گئی تھی، ان ساری باتوں میں سے ایک بات بھی نہیں کہی جو اور لوگ کہہ سکتے تھے بلکہ صرف یہ

---

[۱] میں ملت حنیفیہ سمحہ کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔ (طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۹۲) [۲] ابن ماجہ باب اتباع السنة الخلفاء الراشدین۔ [۳] بہکی نہیں نگاہ اور نہ حد سے بڑھی، بے شک اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ (نجم ۱۷-۱۸) [۴] پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا، پھر رہ گیا فرق دو کمان کے برابر بلکہ اس سے بھی نزدیک (نجم ۸-۹) [۵] اللہ تعالیٰ نے اس بات کی گواہی آشکارا کر دی کہ کوئی معبود نہیں مگر صرف اس کی ذات یگانہ، عدل کے ساتھ تدبیر وانتظام کرنے والی، فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو علم رکھنے والے ہیں۔ (آل عمران ۸) [۶] یہ ان کا خیال ہے جو کافر ہیں۔ (ص: ۲۷)

وصیت کی کہ سیرۃ طیبہ نبویہ کا مطالعہ کرو۔ یہی نسخہ شفا شک و ریب کے سارے دکھوں کا واحد علاج ہے۔ پھر قولاً بھی آپ نے تمام مصنفات میں اسی چیز کو بنیاد و منبع ہر گونہ علم و ایقان بتلاتے ہیں۔

باب ۲

سیرۃ نبوی کا مقام

—(۲)—

قرآن و سیرۃ

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے صاحب قرآن کی سیرت و حیات مقدس کے مطالعے سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض قلوب و علل ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحبِ قرآن کی سیرت ہے اور دراصل قرآن اور حیات نبوۃ معناً ایک ہی ہیں۔ قرآن متن ہے اور سیرۃ اس کی تشریح۔ قرآن علم ہے اور سیرۃ اس کا عمل، قرآن صفحات و قراطیس ما بین الدفتین اور فی صدور الذین اوتو العلم[۱] میں ہے اور یہ ایک مجسّم و ممثّل قرآن تھا جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کما قالت الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ "وکان خلقہ القرآن"۔

ما دو جانے آمدہ در یک بدن
من کیم؟ لیلیٰ و لیلیٰ کیست؟ من

انبیاے کرام کی زندگی سے بڑھ کر "یقین" اور "ایمان" کی پکار اور کیا ہو سکتی ہے؟ محال قطعی ہے کہ ایک صاحبِ استعداد سیرۃ نبویہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا بھی پیش نظر رکھتا ہو، پھر شک و اضطراب نفس کا افسونِ ہلاکت اس پر کارگر ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا انبیاے کرام علیہم السلام کے نفسِ زندگی و وجود کو بطور ایک حجت و برہان کے پیش کیا ہے۔ نہ کہ محض بطور قصص و اظہار علم ماسبق و انباء بالغیب کے، جیسا کہ عموماً سمجھا گیا ہے۔

انبیاء کی زندگی اور قرآن

قرآن کا کھلا کھلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی کی زندگی جس طرح شروع ہوئی اور جس طرح ختم ہوئی جو کچھ اس پر گزرا اور قولاً و فعلاً جو کچھ اس سے تعلق رکھتا ہے، ان میں سے ہر بات بجاے خود ایک دلیل اور برہان حق ہے۔ اس سے بڑھ کر اس حقیقت کے اثبات کے لیے اور کوئی دلیل یقینی و قطعی نہیں ہو سکتی کہ خدا ہے، ساری اچھی اور حسین صفتوں سے متصف ہے، اس نے جس طرح عالمِ ہستی اور مافیہا کو بنایا اسی طرح اس کے لیے قوانین و نوامیس عمل و نتائج بھی بنائے اور وہ ہر حال میں اٹل ہیں۔ دنیا میں انسان زیادہ سے زیادہ اور قطعی سے قطعی یقین جن چیزوں پر رکھتا ہے اور جن وسائل سے ان کے یقینی ہونے کو

---

[۱] ان لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم دیا گیا ہے۔

مانتا ہے، قرآن کی یہ دلیل ان سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ روشن و محکم ہے اور اگر یقین کے لیے یہ دلیل کافی نہیں تو پھر اس دنیا میں یقین کا وجود بھی نہیں، حتّٰی کہ دوپہر کے وقت چمکتے ہُوئے سورج کا بھی نہیں اور جسم کے ایک ایک مسام سے چھوتی اور لگ کر چلنے والی ہوا کا بھی نہیں! اگر تم کتنے ہو کہ دنیا میں صرف انھیں باتوں کو ماننا چاہیے جو "یقینی" ہوں اور "ثابت" شدہ یعنی تمام اعتقاد کے لیے صرف "امکان" کو کافی نہیں سمجھتے، "اثبات" کے طلب گار ہو، تو جب بھی دنیا میں "الکلم الطیب" اور "العمل الصالح" سے بڑھ کر اور کون سی ثابت و واقع حقیقت ہو سکتی ہے؛ خود تمہارا وجود اور اثبات "انا" بھی اس سے زیادہ ثابت و مشہود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا دعوت الی الوحی کو "قول الثابت" اور "دین القیم" اور "الواقع" اور "الثابت" وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ لوگ دوسری طرف چلے گئے۔

حجۃ قائمہ

بہر حال حضرت نوحؑ کا وجود بجائے خود ایک دلیل اثبات ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اپنی ذات کے اندر خود ایک حجۃ قائمہ اور آیۃ کاملہ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی پُوری زندگی صرف ایک لفظ میں بتلا دی جا سکتی ہے، برہان محکم و دلیل ثابت اور اسی طرح تمام انبیا و مرسلین اور بوجہ ان کی تبعیت و معیت کے تمام نفوس صادقہ بشر من الصدیقین و الشہداؑ و الصالحین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگیاں اور تمام وقائع و اعمال بجائے خود ایک مستقل دلیل و برہان حق ہیں اور اس طرح ہر نبی کا تنہا وجود سیکڑوں دلیلوں اور ہزاروں شہادتوں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے قرآن حکیم ان کا استشہاداً و استدلالاً ذکر کرتا اور ان کو "آیت" اور "بیّنہ" سے تعبیر کرتا اور اس طرح گویا ہر ایک تذکرہ و حکایت حیات نبوت و ناجاد بالحق میں دنیا کے سامنے صدہا دلیلیں اور روشنیاں چمکا دیتا ہے۔ علی الخصوص یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا حضرت ختم المرسلین و صاحب اسوۂ حسنہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو بطور ایک مستقل دلیل و شاہد ثابت کے پیش کیا ہے اور نہایت کثرت سے ان کی سیرت و سوانح اور وقائع و ایام پر مختلف پیرایوں اور مختلف لواحق و سوابق اور روابط کے ساتھ بار بار توجہ دلائی ہے اور بسا مقامات میں ایسا بھی ہے کہ؛

گفتہ آید در حدیث دیگراں

کا معاملہ ایک کیفیت خاص اور لذت اشارات ارباب راز و نیاز کے ساتھ اصحاب نظر و ذوق کے لیے قرۃ عیون اور سرور نفس و قلوب کا حکم رکھتا ہے، حتّٰی کہ بعض عرفاء و اصحاب اشارات نے کہا "با" سے "بسم اللہ" سے "س" والناس تک جو کچھ ہے، گو حکایت موسیٰ کلیم کی ہو اور یوسف صدیق کی (صلوٰۃ اللہ علیہما) لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی ہے اور گو نام دوسروں کے ہوں مگر روئے سخن اسی طرف ہے؛

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود[1]

---

[1] مصرعہ میرزا غالب کا ہے اس کا پہلا مصرعہ ہے؛

دود شِ کز گردش بختم گلہ بر لبِ تو بود

اور اردو میں کسی نے خوب کہا ہے؛

نام ان کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں[۱]

والکنایۃ ابلغ والذمن التصریح؛

خوش دلکش است قصۂ خوباں روزگار
تو یوسفی وقصہ تو احسن القصص ہے[۲]

کمال اشتراک

اگر اس بات کو باب اشارات سے باہر بھی دیکھا جائے، جب بھی اس کی صداقت میں کلام نہیں۔ جب تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا وجود اصلاً ایک ہی اصل وحقیقت پر مبنی اور اپنے تمام مقاصد و اعمال و وقائع میں جزواً وکلاً ایک ہی سلسلۂ بعثت کی مختلف کڑیاں اور ہم رنگ وہم معنی اشکال وصور ہیں اور اس لیے باہم دگر یک قلم اشباہ ونظائر کا حکم رکھتے ہیں، بجدیکہ بوجہ کمال اشتراک صورت ومعنی اگر ایک کڑی ہٹا دی جائے تو دوسری ٹھیک ٹھیک اس کی جگہ جڑ جائے اور معلوم ہے کہ اس سلسلے کی آخری کڑی یعنی وجود مقدس حضرت خاتم الادیان ومکمل الشرائع ومتمم النعم ساری کڑیوں کا جامع اور اس لیے بحکم "انا سید ولد آدم" اور "لوکان موسیٰ حیاما وسعہ الا اتباعی" اور نص قرآنی کہ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس[۳] اور الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی[۴] اور فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علی ھاؤلاء شھیدا[۵] منتہائے مرتبہ سیادت وقیادت عالم ومرکزیت رسل وشرائع وافضلیت کل نوع سے فائز وممتاز ہے[۶]؛

---

[۱] یہ مصرعہ نواب یوسف علی خاں والی رام پور کا ہے۔ [۲] مولانا جامی کا شعر ہے۔ مگر اصل میں پہلا مصرع یوں ہے "لیس دلکش است قصۂ خوبان وزان میاں"
[۳] تم سب سے اچھی امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح وارشاد) کے لیے ظہور میں آئی ہے (آل عمران: ۱۱۰) [۴] آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی (مائدہ: ۳) [۵] اے پیغمبر کیا حال ہوگا اس دن جب ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تجھ بھی ان لوگوں پر گواہی کے لیے بلائیں گے (نساء: ۴۱) [۶] مولانا نے ان آیات کریمہ پر ایک نوٹ تحریر فرمایا کہ جس میں اختصاراً بتایا ہے کہ ان سے افضلیت وسیادت حضرت ختم المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) کیونکر ثابت ہوتی ہے اس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے؛

(۱) امت مسلمہ کو ساری امتوں سے بہتر فرمایا اور شریعت محمدی کو تکمیل ادیان واتمام نعمت قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت مستلزم افضلیت مطاع اور نعمت کا اتمام، لم سابقہ سے اعلیٰ واتم ہونا، حامل ومبلغ نعمت کے اعلیٰ وافضل ہونے پر دال ہے۔

(ب) اگر آخری شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لیے ان سے افضل ہے، اگر آخری امت ساری پچھلی امتوں کے برکات ونعم سے مالامال اور اس لیے ان سب سے امثل واصلح ہے تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ امت آخری کا رسول ومتوقم بھی سارے پچھلے رسولوں کے مراتب ومقامات کا جامع اور اس لیے ان سب سے افضل وما فوق کا مصداق نہ ہو۔ کتاب وسنت کی نصوص وتصریحات اس بارے میں بے شمار ہیں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

بہ طرز زندگی قامتِ موزوں نازم

یک قبا نیست کہ شایستہ اندام تو نیست[۱۵]

تو لامحالہ باب فضائل و مقامات اور قصص و حکایات مناقب و برکات ہیں جو کچھ قرآن حکیم نے بیان کیا ہے یا جو کچھ صدق لسان و تحقیق بیان کے ساتھ اس بارے میں کہا جائے گا، وہ گو بلاواسطہ دوسروں کی حکایت ہو مگر بالواسطہ متعلق اسی وجود اجمع و اکمل سے ہو گی اور جب کبھی خاص اس وجود جامعیت کی نسبت کچھ کہا جائے گا تو گو اس میں دوسروں کا ذکر لفظاً نہ آئے لیکن حال یہ ہو گا کہ گویا تمام انبیاء و مرسلین بلکہ نوع انسانی کے تمام افراد فضلیت اور جماعت من انعم اللّٰہ علیہم کے تمام اشخاص مراتب و کمال میں سے ایک ایک فرد کا ذکر کر دیا گیا اور وہ سب کچھ آ گیا اور سمیٹ لیا جو ان کے بارے میں کہا جا سکتا تھا۔ جب باغ و چمن کا نام لیا تو گو تم نے نہ پھولوں کا نام لیا ہو نہ ان کے رنگ و بُو کا، نہ نہروں کا ذکر کیا ہو نہ نضارت و روانی کا لیکن خود ان سب کا ذکر آ گیا اور اس ایک نام کے ساتھ وہ سارے نام لے لیے گئے اور جب تم نے کہا، تختہءِ گل، ہوائے عطر بیز، نظارۂ انہار و اشجار، بنفشہ و سنبل و یاسمین، تو اب تم باغ و چمن کا نام لو یا نہ لو مگر اس کا نام تو تم نے ان ناموں میں سے ہر نام کے ساتھ لے ہی لیا اور گو بظاہر ذکر بنفشہ و سنبل اور اشجار و انہار کا تھا مگر فی الحقیقت ذکر ان سب کا نہیں بلکہ صرف ایک ہی حقیقت جامعہ کا تھا یعنی باغ و چمن کا۔ مولانا رومؒ کے اشارات اس مقام کی نسبت از بس لطیف و پُر ذوق واقع ہوئے ہیں۔ ازاں جملہ کیا خوب فرمایا:

نام احمدؐ نام جملہ انبیا ست

چونکہ صد آمد، نود ہم پیش ما ست[۱۶]

جب "سو" کہہ دیا تو اب ایک سے ننانوے تک جو کچھ ہے سب آ گیا اور جب کہا ایک، دو، دس، پچاس تو فی الحقیقت ذکر "سو" ہی کا ہوا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳)

ج ۔ "تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض کی تفسیر میں اس مطلب کو کمال شرح و بسط اور شاید ایک طرز تازہ و استدلال جدید کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اور حقیقت جامعیت رسالت محمدیؐ و جامعیت شریعت اسلامیہ و جامعیت امت مسلمہ و جامعیت جمیع ما یتعلق بہا پر ایک خاص اسلوب نظر سے بحث کی گئی ہے باقی رہا " لا نفرق بین احدھم " تو وہ معاملہ دوسرا ہے۔

د ۔ تفریق بین الرسل کو مسئلہ تفضیل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح لا تفضلونی علی یونس بن متی وغیر ذالک تو اس نہی کا مورد و محمل بھی دوسرا ہے اور منہی عنہ معاملہ تفضیل میں وہ تکلم بالرای ہے جو منجر بہ تفریق بین الرسل ہو، جس نے تمام امم سابقہ کو گمراہ کیا، نہ کہ نفس تفضیل۔

ہ ۔ انا سید ولد آدم ولا فخر اور آدم و ما دونہ تحت لوائی کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ پھر قطع نظر قرآن حکیم کے خود نصوص سنت اس بارے میں بے شمار و معلوم۔ [۱۵] یہ شعر خواجہ حافظ کا ہے۔ [۱۶] مولانا رومؒ

قرآن اور صاحبِ سنّت کی یگانگی

قرآن حکیم میں یا احکام ہیں یا وعظ و حکم ہیں یا شرح قوانین ہدایت و ضلالت یا قصص الاولین۔ تو معلوم ہے کہ اگر احکام ہیں تو اسی شریعت کے ہیں جس کے حامل سیّد المرسلینؐ ہیں۔ مواعظ و حکم ہیں تو وہی ہیں جن کی عملی تصویر و اسوۂ کاملہ وجودِ سید المرسلینؐ ہے۔ قصص ہیں تو انھیں فضائل و مراتب کے، جو سب کے سب مرتبہ جامعیت محمدؐی میں بوجہ اتم و اکمل جمع ہو گئے۔ پس اگر حضرات صوفیہ کرام نے تمام قرآن کو اسی ایک حسن[1] اکمل و جمالِ بے ہمتا کی حکایت شمائل و شرح سراپا کہا تو قطع نظر فسحت میدان اشارات کے، ویسے بھی یہ کیوں موجب قدح و شک ہو؟ حق یہ ہے کہ "قرآن" اور "صاحبِ سنت" کی باہمی یگانگت اور اتحاد کے باب میں جو کچھ بھی اور جس قدر بھی کہا جائے، اس سے بہت کم ہے، جس قدر کہنا چاہیے۔

کتاب و حامل کتاب کا علاقہ وحدت

اور اگر خاص طور پر اس معاملے کو دیکھا جائے تو فی الحقیقت یہ چیز بھی منجملہ خصائص قرآن و صاحبِ قرآن کے ہے۔ آج تمام ادیان حاضرۂ عالم میں کوئی دین بھی ایسا نہیں، جس کی کتاب الٰہی اور صاحب و حامل کتاب کے باہمی علاقۂ وحدت کا یہ حال ہو اور دونوں میں سے ہر وجود ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ و ملحق اور باہم دگر شاہد و مشہود کا تعلق رکھتا ہو کہ کتاب، حامل کتاب کی صداقت پر دلیل و شاہد ہو اور حامل کتاب اصل کتاب کی شہادت پر:

این دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند[1]

حتیٰ کہ اگر تاریخ شریعت کے تمام وسائل معدوم ہو جائیں اور روایت و حکایت کے تمام صحائف سے قطع نظر کر لیا جائے جب بھی صاحبِ شریعت کے وجود و سیرت کی تاریخی حقیقت اسی طرح روشن و بیّن باقی رہے جس طرح تاریخ و روایات کے دفاتر میں ہے اور اگر دنیا چاہے تو اس کی پوری سوانحعمری اور تاریخ حیات صرف ایک کتاب اللہ کی طرح محفوظ اور کتاب قیم ہی سے بلا ایک نقطے کی فروگزاشت کے مرتب کر لے۔

---

[1] عرفی۔ پورا شعر یوں ہے:

از ازل حسن و محبت بہم اندوختہ اند
دو چراغ اند کہ از یک دگر افروختہ اند

ضمیمہ

انسان کی نفسی و قلبی حالت بہ لحاظ سعادت و شقاوت تین قسموں سے باہر نہیں یا تو نورِ فطرت کی محجوبیت و مظلمیت کے باعث اس کا بُعدِ مسخ و انقلاب پہنچ جاتا حتیٰ کہ احساس و تمیز تک کا باقی نہ رہنا یعنی یہ حالت ہوجانا کہ روشنی اور تاریکی، سنکھیا اور دودھ دونوں کو ایک سمجھنے لگے۔ نہ اچھائی پر خوشی ہو، نہ برائی پر غم۔ قرآن نے اسے "نفس امارہ" سے تعبیر کیا ہے۔ اِن النفس لامّارۃٌ بالسوء (آدمی کا نفس تو برائی کے لیے بڑا ابھارنے والا ہے)

پھر اس ظلمت کدے سے باہر نکل کر نورِ فطرت کی بجھی ہوئی روشنی ٹمٹمانے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ احساس و امتیاز خفتہ جاگ اٹھتا ہے۔ روشنی کی تمنا اور تاریکی سے بیزاری محسوس ہونے لگتی ہے۔ بُرائی سے بچنے اور کانٹوں میں نہ الجھنے کی طاقت تو نہیں ہوتی لیکن فطرت اصلیہ کا سروش غیبی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ یہ "نفس لوامہ" کی تندرستی و حصول کا مرتبہ ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے اپنے طرز مخصوص میں اس کی اندرونی شہادت پر انسان کو توجہ دلائی ہے۔ ولا اقسم بیوم القیامہ ولا اقسم بالنفس اللوامہ۔ (نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں، نہیں، ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں۔ سورہ قیامہ ۱-۲) یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حدیث ابن معبد میں اشارہ فرمایا اور جو حقیقتِ خیر و شر فطرت انسانیہ اصلیہ کے باب میں چند لفظوں کے اندر ایک صحیفہ علم اور ایک دیوان درس حقیقت ہے یعنی: البرما اطمانت علیہ النفس و اطمان علیہ القلب والاثم ماحاك فی النفس و تردد فی الصدور و ان افتاك الناس افتون۔ (فرمایا، کیا نیکی اور اچھائی کی حقیقت اور پہچان پوچھتے ہو؟ سو پہچان اس کی یہ ہے کہ "استفت قلبك" یعنی اپنے ضمیر سے فتویٰ طلب کرو۔ نیکی وُہ کام ہے جس پر نفس کو اطمینان و خوشحالی ہو اور دل کے لیے اس پر قرار اور لگاؤ ہو۔ گناہ وہ ہے کہ اطمینان کی جگہ تمھارے اندر چبھن اور خلش پیدا کر دے اور دل کو اس پر جماؤ اور قرار نہ ہو۔ اگرچہ سیکڑوں آدمی فتویٰ دے دیں کہ فلاں بات اچھی ہے، لیکن خود تمھارے اندر اس پر اطمینان نہ ہو۔

یاد رہے کہ اس حدیث میں "قلب" کا جو لفظ آیا ہے تو اس سے مقصود "قلب سلیم" ہے نہ کہ سقیم و مریض، کیونکہ ذائقے کے باب میں تندرست آدمی کا ذائقہ معتبر ہوگا نہ کہ بیمار کا۔

تیسری قسم سعادت قلبی اور ارتقاے معنوی کا آخری مرتبہ ہے۔ اسے قرآن نے "نفس مطمئنہ" سے تعبیر فرمایا ہے: یایتھا النفس المطمئنۃ ○ ارجعی الی ربك راضیۃ مرضیۃ (اے سکون یافتہ نفس اپنے رب کی طرف واپس آ اور اس حالت میں کہ تو اس سے راضی ہو اور وُہ تجھ سے راضی ہو۔ سورۃ فجر: ۲۷-۲۸)

غرض قرآن حکیم نے نفس انسانی کی اصولاً تین ہی قسمیں کی ہیں ، نفس امّارہ ، نفس لوّامہ اور نفس مطمئنہ ۔ لوّامہ کا آخر گو بوجہ قرب و اتصالِ مطمئنہ ، صحت و تندرستی نفس کا مقام ہے ، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کا ابتدائی مقام بوجہ قرب اسفل بیماری کی حالت میں داخل ہے۔

یہ جو کہا کہ قسمیں تین ہیں تو یہ کہ تقسیمات قرآنیہ اس پر مبنی ہیں۔ اگر دقت نظر سے کائنات ہستی کا مطالعہ کرو گے تو معلوم ہوگا کہ قانون الٰہی عالم ہستی میں کچھ ایسا ہی واقع ہوا ہے۔

باب۳

قرآن اور سیرۃ نبویہ

صرف قرآن سے ترتیب سیرت

لوگوں نے حیات و سیرت طیبہ حضرت ختم المرسلین (صلعم) پر اس حیثیت سے بہت کم نظر ڈالی ہے کہ اگر روایات و دفاتر تاریخی سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف قرآن حکیم کو سامنے رکھا جائے تو آپ کی سیرت و حیات پر کیسی روشنی پڑتی ہے اور جس طرح قرآن اپنی کسی بات میں اپنے غیر کا محتاج نہیں، اسی طرح اپنے حامل و مبلّغ کے وجود و حیات کے بیان میں بھی خارج کا محتاج ہے یا نہیں؟ اصحاب سیر و محدثین کرام نے فضائل و مدائح منصوصہ قرآنیہ کے تو باب باندھے ہیں مثلاً قاضی عیاض نے "شفا" کے متعدد ابواب میں قرآن حکیم کی آیات متعلق فضائل و مدائح جمع کی ہیں، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے، آج تک کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ صرف قرآن حکیم میں دائرۂ اسناد و اخذ محدود رکھ کر ایک کتاب سیرت میں مرتب کی جائے۔

مولانا شبلیؒ سے گزارش

جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا۔ میں نے کہا، آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجیے "قرآن و سیرت محمدیہ" اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلائیے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو وہ اس کی ابتدا میں ہمیشہ شک اور تردد سے کیا کرتے تھے اور جب تک یقین کرنے کے لیے مجبور نہ ہو جائیں، یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس چیز نے ان کی عملی زندگی کو (یعنی کاروبار انتظامات کی زندگی کو) بھی بہت نقصان پہنچایا اور وہ کوئی عملی کام جم کر نہ کر سکے۔ ندوہ کے معاملے میں جو الجھاؤ لوگوں نے ڈالے، وہ بھی ان کے اسی ضعف یقین و عدم جزم و صلابت ارادہ کا نتیجہ تھے ورنہ ان سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ان کو جگہ سے ہٹا سکتا۔ بہرحال انھوں نے اس خیال پر بہت ہی پسندیدگی ظاہر کی، مگر وہی اپنی عادت کے مطابق اظہار شک و ناامیدی کہ اتنا مواد صرف قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے، سیرت کا ایک باب مرتب ہو سکے! لیکن جب میں نے بہت اصرار کیا تو کہا، اچھا تم اگر یہ ٹکڑا مرتب کردو تو سیرت کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ آخری یکجائی دہلی میں ہوئی تھی

اس وقت انھوں نے کہا: اب مجھ کو بھی خیال ہوتا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے اور بہت ہی اہم چیز ہو گی۔

توقع سے کہیں زیادہ کامیابی

دہلی سے آکر میں نے کچھ وقت اس میں صرف کیا اور ایک مستقل سیرت نبویہ مجرد قرآن حکیم سے ماخوذ و مستنبط شروع کر دی۔ جوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا، نئے نئے دروازے کھلتے گئے اور امید و توقع سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ گو حقیقت پہلے سے پیش نظر تھی حتیٰ کہ اس بارے میں بڑا ذخیرہ آیات کا ذہن میں مستحضر تھا، لیکن یہ بات تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں گزری تھی کہ جس کتاب کو بظاہر جا بجا ذکرِ احکام و مسائل و قصص گزشتگان سے مملو پاتے ہیں، اس میں اس قدر وافر ذخیرہ خاص شخص رسالت کے حالات و وقائع کا بھی موجود ہو گا۔ کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد جو دیکھا تو عجیب عالم نظر آیا حیات و سیرت کا کوئی ضروری ٹکڑا ایسا نہیں جس کے لیے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ہوں۔

رسول اللہ صلعم اور صحابہ کرام

پھر نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت بلکہ صحابہ کرام کے حالات و خصائص کا بھی کافی ذخیرہ موجود ملا۔ صحابہ کی جماعت درسگاہِ تزکیہ و تعلیم نبوت سے نکلی ہوئی "مومنون الاولون" کی اولین جماعت تھی۔ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ[1] اس لیے ان کے سوانح و ایام بھی سیرت نبویہ کے مختلف اجزاء ہیں بلکہ ہدایت قرآنی و حکمت نبوی کے عملی و مجسم ثمرات ہونے کے لحاظ سے دلائل و آیات نبوت کے حکم میں داخل، پس یقیناً آپ کی سیرت مکمل نہ ہوتی اگر ان کے حالات بھی قرآن میں پوری شرح و تفصیل سے نہ ملتے۔ اس ٹکڑے کو دیکھ کر مجھ کو آخری مرتبہ یقین اس بارے میں حاصل ہو گیا کہ اگر دنیا سے تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہو جائیں۔ دنیا نے جو کچھ چھٹی صدی عیسوی کے ایک ظہور دعوت کی نسبت سنا ہے وہ سب کچھ بھلا دے اور صرف قرآن ہی دنیا میں باقی رہے، جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مقدسہ اور آپ کی سیرت و حیات کے براہین و شواہد مٹ نہیں سکتے۔

صرف قرآن کافی ہے

صرف قرآن ہی اس لیے بس کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ دنیا کو تبلا دے، اس کا لانے والا کون تھا؟ کیسے زمانے میں آیا؟ کس ملک میں پیدا ہوا؟ اس کے خویش و بیگانہ کیسے تھے؟ قوم و مرز بوم کا کیا حال تھا؟ اس نے کیسی زندگی بسر کی؟ اس نے دنیا کے ساتھ کیا کیا اور دنیا نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس کی باہر کی زندگی کیسی تھی اور گھر کی معاشرت کا کیا حال تھا؟ اس کے دن کیسے بسر ہوتے تھے اور راتیں کن کاموں میں کٹتی تھیں؟ اس نے کتنی عمر پائی؟ کون کون سے اہم واقعات و حوادث پیش آئے؟ پھر جب دنیا سے جانے کا وقت آیا تو دنیا اور دنیا والوں کو کس عالم میں چھوڑ گیا؟ اس نے جب دنیا پر پہلی نظر ڈالی تھی تو دنیا کا کیا حال تھا؟

---

[1] انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

اور جب واپسیں نظر وداع ڈالی تو وہ کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی؟ غرض ایک وجود، مقاصد وجود اور اعلام صداقت و عظمت کے لیے اس کے وقائع و ما یتعلق بہا و ما یناسب ذٰلک میں سے جن جن باتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ سب کچھ صرف قرآن ہی کی زبانی دنیا معلوم کر لے سکتی ہے اور اس بارے میں بھی قرآن اپنے سے باہر کا ابداً محتاج نہیں اور یہ سب کچھ از قبیل اشارات و مرموزات نہیں، جیسا کہ ارباب نکات و دقائق کا طریق استنباط ہے، بلکہ صاف صاف اور کھلا کھلا بیان، جو فقہا کے طریق واستنباطِ اشارۃ النص سے کہیں زیادہ واضح و ظاہر اور اگر رموز و اشارات و تلمیحات کا طریق اختیار کیا جائے تو پھر خاص خاص آیتوں کو چھانٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ پورے قرآن میں بجز اس ایک ذکر کے اور کوئی ذکر ہی نہیں!

قرآن کا ایک اہم اعجاز

اگر غور کیا جائے تو فی الحقیقت یہ معاملہ بھی منجملہ خصائص و اعجاز قرآن ہے کہ کسی پیغام کی صداقت جانچی نہیں جا سکتی، جب تک پیغام لانے والے کی صداقت و امانت نہ جانچی جا سکے اور وہ ممکن نہیں، جب تک اس کی پوری زندگی اور زندگی کے اعمال و وقائع دنیا کے سامنے نہ ہوں۔ پس اس اعتبار سے آج تمام عالم میں اگر کوئی صحیفۂ آسمانی ایسا ہے، جو اپنے لانے والے کی زندگی کے وقائع و سوانح ہر زمانے اور ہر عہد میں خود اپنی زبانی سنا دے سکتا ہے تو وہ بحکم "ھٰذا کتابنا ینطق علیکم بالحق"[1] بجز قرآن حکیم و محفوظ کے اور کوئی نہیں۔ اس کے سوا جس قدر کتب سماویہ (فی اعتقادنا او فی زعمھم) موجود ہیں، وہ یا تو اپنی صداقت کی اور ساری باتوں کی طرح اس بارے میں بھی بالکل خاموش و مظلم ہیں، حتیٰ کہ اپنے لانے والوں کے وجود کے اثبات سے عاجز اور اگر اس کی شخصیت کا ذکر کرتے بھی ہیں تو ایسے مجہول و سراپا شکوک و ارتیاب کی شکل میں، جس سے اثبات کی جگہ اور زیادہ سلب و نفی کا یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر جب اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ آج دنیا میں شہرت و تواتر، نقل و حفظ، روایت اور توارثِ اسناد و قراۃ و تعامل کروڑہا نفوس عالم نسلاً بعد نسلٍ و حینٍ و تلاوت اوقاتِ خمسہ لیل و نہار (فضلاً عن تلاوتہ و تدبرہ ما فی کل حین و آن) کے اعتبار سے صرف یہی کتاب قطعی و یقینی اور محفوظ و غیر مبدل ہے۔ بحیث "لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ"[2] و "انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون"[3]، "بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ"[4] و "فی صدور الذین اوتوا

---

[1] یہ ہماری کتاب تمہارے بارے میں حق کے ساتھ بولتی ہے (جاثیہ: ۲۹) [2] باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے (حم سجدہ: ۴۲) [3] ہم نے یہ ذکر یعنی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ (الحجر: ۹) [4] بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں موجود ہے۔ (البروج: ۲۱، ۲۲) -

العلم[۱]" وغیر ذلك من قواطع الحفظ والصیانۃ اور اس لیے علی وجہ الارض اسم وعلم "الکتاب" کا مستحق اور کوئی نہیں تو پھر ظاہر ہے کہ جس وجود و شخصیت اور اس کی حیات و برکات کا اثبات و اعلام اس کتاب کے اندر ہو گا اس کے وجود و سیرت سے بڑھ کر سارے دنیا کے نیچے اور کون سی انسانی ہستی قیامت تک کے لیے اثبت و اقوم ہو سکتی ہے؟ اور دنیا اپنی ہدایت کے لیے اگر کسی انسان کے آگے جھک سکتی ہے تو اس انسانیت کبریٰ وعبدیت اعلیٰ وبشریت واحدہ کے سوا اور کون انسان ہے جس پر آنکھوں سے دیکھنے والوں کی طرح ہمیشہ یقین کیا جا سکتا ہے اور جس پر ایمان لانے کے لیے پچھلی امتیں اور نسلیں بھی پہلوں کی طرح قطعی و یقینی روشنی رکھتی ہیں؛ پھر جس وجود کی سیرت وحیات قیامت تک کے لیے اس طرح محفوظ و ثبت کر دی گئی ہو، علاوہ ان نقوش غیر فانی کے جو صفحۂ عالم پر ثبت ہیں اور جس کی زندگی کے وقائع طیبہ کو اس طرح سورج کی دائمی روشنی اور ستاروں کی یکساں سیر و حرکت کے دامن سے باندھ دیا ہو، کیوں نہ اس خاکدان جسم و زماں میں اس کی موت وحیات یکساں ہو؛ اور کیوں اس کی دائمی حیات وقیام کے عقیدے سے انسان کے تاریک دلوں کو انکار اور غافل دلوں کو گریز ہو؟

رفع ذکر کی حقیقت

فی الحقیقت یہی معنی ہیں دیگر معانی وحقائق ثابتہ کے ساتھ اس رفع ذکر کے کہ "ورفعنا لك ذكرك[۲]" اور یہی وہ مقام ہے کہ اصحاب کشف و مشاہدات کے سامنے کھلا تو انھوں نے "حقیقت محمدیہ" کے احاطہ وحیات اور عدم زوال و بقا و استمرار کو تمام انبیائے کرام کے حقائق تعینات سے مافوق اور بوجہ دائرۃ الدوائر اور مرکز ادوار تعینات ما بعد اور نقطۃ الحیات فی الاصل والحقیقت ہونے کے تمام انوار تعینات و وجود کو اس کی نورانیت کے سامنے بے فروغ اور ماند پایا اور اس لیے شیخ اکبر نے اس کو تعین اوّل اور مورد صحیح، اصطلاح "عقل اوّل" کا قرار دیا۔ پھر "انسان کامل" اور "روح اعظم" اور "نفس واحدہ" اور "قلم الاعلیٰ" اور "نور الانوار" اور "نفس الکائنہ" سے بھی اسے تعبیر کیا گیا کہ بہ لحاظ بقائے ذکر و دوام فیضان و حیات وہی ایک انسان کامل، روح الاعظم اور النفس واحدہ والکائنہ ہے اور حیات معنویہ مستمرۂ نوع وارض کی مرکزیت صرف اسی کو پہنچتی ہے اور اسی لیے قرآن حکیم نے صرف اسی وجود کو "العبد" سے تعبیر کیا کہ ساری عبودیتیں آتی و رفتی ہیں، مگر صرف یہی وہ عبودیت کاملہ واحدہ ہے جو ہمیشہ عباد و معبود میں واسطۂ ہدایت اور ہمیشہ عبد کو معبود سے واصل کر دینے کے لیے حی و قائم ہے، وقال العارف البوصیری۔

منزہ عن شریک فی محاسنہ
فجوہر الحسن فیہ غیر منقسم[۳]

---

[۱] ان لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم دیا گیا ہے۔ [۲] اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا (الانشراح: ۴) [۳] حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذاتی وصفاتی خوبیوں میں شریک وانباز سے بالکل پاک ہیں، یعنی ان خوبیوں میں کوئی دوسرا شریک نہیں اور حضور صلعم کے حسن کا جوہر تقسیم نہیں ہوا کہ حضور کے علاوہ دوسروں کو بھی اس کا کوئی جزو ملا ہو۔

حقیقتِ محمدیہ

اور چونکہ نوعِ انسانی کی سعادت و تنویر کا مرکز و مبداء وجودِ انبیائے کرام ہے اور "حقیقتِ محمدیہ" بحکم وجئنابک علی ھا ولاء شھیدا[1] " ان سب سے مافوق اور شمس و کواکب اور صباح و مصباح کے معاملے کا حکم رکھتی ہے۔ اس لیے حیات قائمہ و دائمہ کا نور الانوار اور مصباح المصابیح صرف وہی دائرہ ٹھہرا اور اسی لیے شیخ اکبر و جیلی نے اس کو "حقیقت الاسمائیہ" اور "لوحِ محفوظ" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ سبحان اللہ! یہ آخری تسمیہ و تعبیر کس درجہ ترجمانِ حقیقت و اوفق بالشرع و العقل ہے! دنیا میں جس قدر بھی ہدایت و تعلیم کی لوحیں تھیں، سب کے لیے تغیر و تبدل ہوا حتیٰ کہ آج کوئی بھی محفوظ نہیں، لیکن، اللہ اکبر! مقام محمدیؐ کی محفوظیت و مصونیت کہ اس کی سیرت طیبہ اور حیات حیہ و قائمہ کی لوحِ محفوظ کا ایک نقطہ بھی محو نہ ہو سکا اور قرآن محفوظ و کتابِ مسطور فی رق منشور اور فی صدور الذین اوتوا العلم میں اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اسی طرح نقش و ثبت ہے اور ہمیشہ رہے گا، جس طرح قلم ازل نے اوّل تعین کی کرنوں سے لکھ دیا تھا پس قرآن کے بعد اگر کوئی اور "ہستی" "لوحِ محفوظ" ہو سکتی ہے تو وہ صرف وہی روحِ اعظم و خالد ہے، جس کے ذکر کو خود قرآن نے اپنی آغوشِ حفظ و صیانت میں ہمیشہ کے لیے لے لیا ہے۔ حضرت سید العارفین شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے اسی مقام کی طرف اشارہ کیا ہے، اگرچہ بعض کم فہموں نے اس کی ضمیر متکلم کو نہ سمجھا[2] اور ایک دوسری وادی میں لے گئے اور یہ آفت عام و اعم ہے۔

افلت شموس الاوّلین و شمسنا
ابداً علی افق البقا لا تغرب[3]

حضرت والد مرحوم نے اس ملفوظ مبارک پر ایک دوسرا مصرع لگا کر مطلب واضح کر دیا ہے۔ یہ ان کے ایک طویل قصیدۂ بائیہ میں سے ہے۔

شمس تقادم قبل آدم طلعھا
ابداً علی افق البقاء لا تغرب[4]

سیر قدمی کی آخری حد

اور یہ بعض اکابر نقشبندیہ، علی الخصوص حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے علوم کشفیہ میں ظاہر کیا کہ "دائرہ حقیقت محمدیہ" سیر قدمی کی آخری حد ہے۔ اس کے بعد صرف

---

[1] اور تجھے ہم ان پر گواہ لائیں گے (النساء: ۴۰) [2] یعنی خود شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی مراد "شمسنا" سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تھی۔ کم فہموں نے اس سے مراد خود شیخ جیلانی کی ذات لے لی۔ [3] پہلوں کے سورج غروب ہو گئے لیکن ہمارا آفتاب یعنی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ افق پر جلوہ فرما رہے گا اور کبھی غروب نہ ہوگا۔ [4] وہ آفتاب جسے طلوع میں آدمؑ پر بھی تقدم حاصل ہے، ہمیشہ افق پر جلوہ فرما رہے گا اور کبھی غروب نہ ہوگا (یہ مولاناؒ کے والد ماجد مولانا خیر الدین مرحوم کا لگایا ہوا مصرع ہے)۔

سیر نظری کی گنجائش ہے۔ وھو من خصائصہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نیز تمام اصحاب احوال وکشوف بھی اس پر متفق ہوئے تو حقیقت اس کی بھی یہی ہے کہ چونکہ حقیقتِ محمدیہ روح حیات کا آخری نقطہ اور سرچشمہ قرار پائی تو لاجرم سیر و اقدام کی آخری منزل بھی وہی ٹھہری۔ اس کے بعد جو کچھ ہے مافوق اور وراء الوراء التعینات ہے، اس لیے نہ سیر کی وہاں گنجائش، نہ قافلۂ طلب اور محملِ شوق کا وہاں گزر، بلکہ طائرِ فکر و مرغِ خیال بھی اس کی فضا سے لاتعین میں درماندہ و پر و بال سوختہ؛

اے بروں از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من[1]

والکلام فی ھذا یطول ولہ موضع غیر ھذا السو اضع الذی نحن فیہ اور یہ جملہ معترضہ بھی جو بحد فصل مخل ربطِ مطالب تک پہنچ گیا تو اس لیے کہ مذکور کی جاذبیت و محبوبیت سے ذکر و ذاکر کی بیخودی و محویت ناگزیر ہے اور اشارات کا طول و قصر مشارٌ الیہ کے جذب و کشش پر موقوف، پھر جب مذکور و مقصود کا یہ حال ہو کہ بقول صاحب فتوحاتِ مکیہ

یا من ھو للقلوب مقناطیس[2]

اور اس دنیا میں ذکر صرف اسی کا ذکر اور بات صرف اسی کی بات ہو، اس کے سوا جو کچھ ہو یا اسی طرف منصرف و محمول ہو اور یہ نہ ہو تو بے خودی و بے حاصلی، اتلاف صرف و ضیاع بحت،

اوقات ہماں بود کہ با دوست بسر رفت
باقی ہمہ بے حاصلی و بے خبری بود

تو کیوں کر ممکن ہے کہ عنانِ قلم از دست رفتہ نہ ہو اور سررشتۂ فکر و شغل دامن صبر و شکیب کی طرح ہاتھ سے چھوٹ جائے۔

قرآن سے ماخوذ سیرت کی اہمیت

ذکرِ "سیرتِ نبویہ ماخوذ و مستنبط از قرآن" کی نسبت تھا۔ سو الحمدُ لِلّٰہ وہ امید و گمان سے بھی وہ چند اوسع و اکمل مرتب ہوگئی۔ ودائیت فیہ مالا عین رأت ومالا اذن سمعت[3]۔ انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ساری سیرتیں اور تاریخیں ایک طرف اور خود لسانِ الٰہی کا ایک کلمۂ منطوقہ و محفوظہ ایک طرف، تعجب ہے کہ اصحاب سیر نے باوجود کمال سعی و نظر اور مشغولیت بجمیع طرق و ترتیبات سیرت اس طرف کیوں توجہ نہ کی؟ جب تک یہ چیز مرتب نہیں ہوئی تھی، خود اپنا حال بھی دوسرا تھا اور اب جو دیکھا تو کارخانہ ہی دوسرا نظر آیا؛

---

[1] مولانا رومؒ [2] اے وہ ذات پاک جو دلوں کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہے جس طرح لوہے کو مقناطیس۔ (فتوحاتِ مکیہ)
[3] میں نے اس میں جو کچھ دیکھا نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا۔

تمام بود بہ یک حرف گرم و ما غافل
حکایتے کہ ہمہ نا تمام گفتند[1]!

معہذا:

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی[2]

(تذکرہ، طبع اول)

---

[1] عرفی کا شعر ہے۔

[2] شعر سعدی کا ہے جیسا کہ تخلص سے واضح ہے۔ کلیات سعدی میں شعر یوں ہے:

نہ حسنت آخرے دارد، نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

باب ۴

اشاعت سیرت طیّبہ

مولاناؒ نے نومبر ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں مجالس ذکر مولد کے متعلق خود ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا، جس میں واضح کیا تھا کہ سیرۃ نبویؐ کے لیے ایک ادارہ بن جانا چاہیے، جس میں مختلف رسائل ایک خاص اسلوب پر عوام کے لیے لکھے جائیں اور انھیں مجالس مولد میں پڑھا جائے۔

سیرۃ نبویؐ کی اہمیت

فقیر کا ایک مدت سے خیال ہے کہ سیرت نبویؐ میں ایک محققانہ و مفصل کتاب کی تدوین کے علاوہ (جیسی سیرت کبیر مولانا شبلی نعمانی مرتب فرما رہے ہیں) اور بھی بہت سی صورتیں ترتیب و اشاعت کی مطلوب و ضروری ہیں۔

از انجملہ سخت ضرورت ہے، ایسے مختصر رسائل کی، جن میں مباحث، مناظرات متعلق سیرۃ سے بکلی چشم پوشی کی جائے۔ صرف حالات زندگی صحت و تحقیق کے بعد درج کیے جائیں۔ اختصار ہر جگہ ملحوظ رہے اور صرف وہی مواقع مفصل ہوں جن کی تفصیل ہماری موجودہ عملی زندگی کے لیے اسوۂ حسنہ کی دعوت رکھتی ہے اور جس کی نسبت ایک الہامی نکر نقاؒ کے ساتھ کہا گیا تھا کہ "خلقہ القرآن" (آنحضرت کا خلق تعلیم قرآنی کی تصویر ہے)

ان رسائل سے عام مطالعہ و واقفیت اور اثر و اصلاح کے علاوہ مخصوص طور پر مقصود یہ ہے کہ مجالس ذکر ولادت نبوی کی اصلاح ہو اور یہ جو ایک نہایت قوی رسم اجتماع و احتفال موجود ہے اس کی قوت سے اصلی و حقیقی فائدہ اٹھایا جائے۔

میں ایک بار اس کی نسبت لکھ چکا ہوں۔ میرے اعتقاد میں قرآن کریم جو ایک "کتاب مسطور فی رق منشور"[1] ہے، اس کی لوح محفوظ حامل قرآن کی زندگی تھی اور میں "قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین"[2] میں "نور" کو کتاب کا وصف نہیں سمجھتا بلکہ اس وجود انسان کامل کی زندگی سمجھتا ہوں، جس کی نسبت دوسری جگہ کہا گیا کہ "داعیاً الی اللہ باذنہ و سراجاً منیراً"[3]۔

---

[1] لکھی ہوئی کتاب پھیلے ہوئے ورق میں (طور، ۲، ۳) [2] یقیناً اللہ کے پاس سے تمہاری طرف "نور" اور واضح کرنے والی کتاب آچکی ہے (مائدہ، ۱۷) [3] اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے روشن کرنے والا سورج (احزاب، ۴۶)

وللناس فیما یعشقون مذاهب!

پس اگر ہمیں مسلمان بننے کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کی ضرورت ہے تو یقین کیجیے کہ اسے ایک عملی زندگی کی صورت میں دیکھنے کے لیے اس "اسوۂ حسنہ" کے مطالعے کی ضرورت ہے، لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ [1] اور یہ پچھلی ضرورت پہلی ضرورت ہی جتنی ہے، پہلی سے کم نہیں۔

مجالس ذکر مولد اس کا بہترین ذریعہ مجالس مولد نبوی ہیں بشرطیکہ ان میں عام رسائل مولد کی جگہ جو بالعموم موضوعات وقصص اور غیر مفید و لاحاصل صرف عبارت و انشا کا مجموعہ ہیں، پیش نظر طریقے سے صحیح و محقق حالات نبوی بیان کیے جائیں۔

اس قسم کی چیزیں دراصل لکھنے اور پڑھنے کی نہیں، اس لیے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو سیرۃ النبی کے خطیب (لکچرر) ہوں جنھوں نے اس موضوع خاص کا مطالعہ کیا ہو، جن کو اس میں صاحب فن کا درجہ حاصل ہو اور وہ ہر مجلس اور جماعت کے سامنے، اس مجمع کی حالت، ضرورت، گرد و پیش اور مخصوص داعیات و احتیاجات کے مطابق، سیرت نبوی پر خطبے دے سکیں کیونکہ ہر شہر، ہر محلے، ہر خاندان، ہر جماعت اور ہر مجلس کی ضروریات یکساں نہیں۔

احوال و ضروریات کا لحاظ کسی جماعت کے لیے سیرۃ نبوی کا کوئی خاص حصہ زیادہ تفصیل چاہتا ہے، کسی کے لیے مخصوص و وقتی حالات کسی خاص موقع کے انتساب کے طالب ہیں۔

کسی کو بدر کی فتح کا واقعہ سنانا چاہیے اور کسی کو احد کی ہزیمت [2] کے مصالح کے ذریعے سے عزم و استقامت کی وصیت کرنی چاہیے۔ کسی کے لیے مجاہدات و غزوات کے عزائم ضروری ہیں اور کسی کے لیے فتح مکہ کا عفو و صفح اور درگزر و کرم۔ پھر ایک جماعت کے واقعات و حالات کے لحاظ سے، اخلاق و خصائل نبوت میں سے کسی خاص خلق عظیم پہ زور دینے کی ضرورت ہے اور دوسرے کے لیے کسی دوسری حالت کی۔

اگرچہ اس حیات طیبہ مقدسہ کا کوئی فعل ایسا نہ تھا جو محبوب و محمود نہ ہو، وکل ما یفعلہ المحبوب، محبوب؛

ز فرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست [3]

---

[1] یقیناً تمھارے لیے رسول خدا کی حیات طیبہ ہی نیک نمونہ ہے (احزاب، ۲۱) [2] مولانا بھی مولانا شبلی کی طرح احد میں مسلمانوں کی ہزیمت کے قائل تھے لیکن اسے ہزیمت قرار دینا صحیح معلوم نہیں ہوتا البتہ اس جنگ میں مسلمانوں کا نقصان بہت ہوا تھا تاہم قریش میدان چھوڑ کر پلٹ گئے تھے اور مسلمانوں نے حمراء الاسد تک ان کا تعاقب کیا تھا، جو مدینہ منورہ سے آٹھ میل پر ہے۔ جب یقینی اطلاع مل گئی کہ قریش واپس چلے گئے تو مسلمان بھی حمراء الاسد سے لوٹ آئے۔ [3] نظیری نیشاپوری

تاہم وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے اور ہر حصّے کے لیے اسوۂ حسنہ ہے، زندگی اور زندگی کے متعلقات کی صد ہا صورتیں ہیں۔ یکون ہے جو اس صحیفہ نبوت کا اوّل سے آخر تک حق مطالعہ ادا کر سکتا ہے؛ پس بجز اس کے چارہ نہیں کہ اپنے چہرۂ اعمال کے حسن و آرائش کا جو حصہ سب سے زیادہ بگڑ گیا ہو، سب سے پہلے اسی کو اس آئینہ میں دیکھ کر سنوار لیں۔

رسائل خطبات سیر

لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسے لوگ کہاں سے آئیں؟ اپنے جہل اور بے مائیگیوں پر کہاں تک ماتم کریں؟ اگر یہ نہیں تو کم از کم اتنا تو ہو کہ سیرت نبوی پر مختلف مقاصد اور مختلف پیرایہ و ترتیب سے چھوٹے چھوٹے رسائل لکھے جائیں اور انھی کو لوگ مجالس میں پڑھ دیا کریں یا یاد کر کے مثل خطبہ کے سنا دیں۔

ایک مجموعہ خطبات سیرت کا ہو جو صرف تعلیم یافتہ مجامع کے لیے مخصوص ہو۔ ایک مجموعہ صرف عام مجالس کے لیے اور ایک بطور درس و مطالعہ کے بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے۔ سب سے پہلے کم از کم ان تین قسموں کی سیرتیں علاوہ سیرت کبیر کے ضرور لکھنی چاہئیں۔

اسلوب و زبان

لیکن نہایت مشکل اور اہم مسئلہ اس کی زبان اور طرز تحریر کا ہے، علی الخصوص ایک ایسے عہد خیرہ مذاقی میں جب لوگ فن بیان و انشا پردازی کا شوق تو پیدا کر لیتے ہیں، لیکن اس کے مواقع استعمال اور صحیح مفہوم بلاغت سے بے خبر ہیں۔

جو مجموعہ خطبات کا مجالس و محافل ارباب علم و فکر کے لیے ہو، اس کا انداز تحریر اور ہونا چاہیے اور مجالس عامہ کے لیے اور۔

ایک بیں تاریخ و سیرت کے اسلوب کے ساتھ اگر بہ اعتدال و بلا اغراق و تغلیب، طرز بیان میں انشا پردازانہ علو و رفعت بھی پیدا کی جائے تو مضائقہ نہیں کیونکہ موضوع کی بلندی خود مستحق رفعت ہے، لیکن دوسرے بیں تاریخ کی جگہ اصلاح و دعوت کا مقصد پوشیدہ اور مخاطب عامۃ الناس، اس لیے نہ تو اسلوب بیان مورخانہ و فلسفیانہ ہو اور نہ بلند و عالمانہ، بلکہ نہایت عام فہم و سلیس اور محض سادہ و سہل۔ با ایں ہمہ سادگی بیان کے ساتھ ضرور ہے کہ بغیر کسی انشا پردازانہ پیچ و خم کے، اپنے اندر ایک ایسی بے امان تاثیر بھی رکھتا ہو کہ سننے والے اس کے ہر لفظ پر بے اختیار دل و جان سپرد کر دیں! و ان من البیان لسحرا۔

جس بات کو میں نے یہاں چند سطروں میں لکھا ہے، غور کیجیے تو یہ ایک نہایت نازک اور دقیق نکتۂ بلاغت ہے اور افسوس کہ اقلام عصر کو اس کا احساس نہیں۔

ایک ضروری نکتہ

بڑی مشکل یہ ہے کہ ایک عرصے سے عام لوگ ذکر میلاد کی مجالس میں ٹھمری ٹھپّے کے عادی ہو گئے ہیں۔ مجھ کو بہت سی ایسی صحبتیں یاد ہیں، جہاں غزلوں کے مطالب اور صراحت خطاب و ضمیر سے اگر قطع نظر کر لیا جاتا، تو یہ بتلانا محال ہو جاتا کہ ایک مقدس ذکر دینی کی صحبت میں بیٹھے ہیں یا کسی توآموز مگر

صحیح معنوں میں خوش گلو مغنیہ کے سامنے۔ میں یہ کہنے سے نہیں شرماتا کہ موسیقی کو نہایت محبوب رکھتا ہوں اور چونکہ دل رکھتا ہوں، اس لیے اس شے سے قطع تعلق نہیں کر سکتا، جس کا تعلق دل کے ساتھ، جسم اور روح کا تعلق ہے تاہم یہ تو کوئی شخص بھی پسند نہیں کر سکتا کہ مجالس دعوت مقدسہ و مذاکرات دینیہ کو موسیقی کے مشتبہ جذبات سے آلودہ کیا جائے۔ میرے خیال میں اس ذکر مقدس کے لیے یقیناً یہ ایک ناقابل تحمل گستاخی ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ یہ نئے خطبات سیرت تو اس عنصر دلکش سے بالکل خالی ہوں گے۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی روضہ خوانی کی طرح نہیں بلکہ ایک وعظ کی طرح بالکل تحت اللفظ ہوگا۔ اصلاح کے کاموں میں لوگوں کی دلچسپی کے قیام اور توجہ کی بقا سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جا سکتی، ورنہ اصل مقصود فوت ہو جائے۔ پس نہایت ضروری اور اساسی امر یہ ہے کہ ان کے اسلوب بیان و طرز تحریر میں کچھ ایسی باتیں بھی تبع کی جائیں جن کی تاثیر و کشش، تمام عوام پسند اجزائے میلاد کی پوری پوری تلافی کر دے اور طریق و آداب خطبات و رسم و مواعظ دعوت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

ادارۂ سیرت نبوی

ان خطبات کی ضرورت تو مجالس ذکر مولد کے خیال سے ہے لیکن ان کے علاوہ بھی مختلف انداز بیان و ترتیب اور تلخیص مطالب و مسائل کے ساتھ سیرت نبوی مرتب کرنے کی ضرورت ہے، جو طرح طرح کے اشکال دعوت و اثر میں اس اسوۂ حسنہ الٰہیہ کو اہل اسلام و غیر اہل اسلام کے سامنے پیش کرے۔

ضرورت تھی کہ ایک خاص ادارہ "سیرت نبوی" کی غرض سے قائم کیا جاتا جس کا کام مسلسل اور دائمی ہوتا اور جو اس بارے میں تحقیقات و انکشافات فن کی مصروفیت کے ساتھ، سیرت کے چھوٹے بڑے، مختلف اشکال و مقاصد کے ایڈیشن بھی شائع کرتا رہتا۔

کاش موجودہ ادارۂ سیرت جو شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے زیر ادارت قائم ہے، تکمیل سیرت کبیر کے بعد بھی اپنا کام جاری رکھے اور ایک باقاعدہ جماعت اس مقصد اعظم و اقدم کو اپنے ہاتھ میں لے لے، جو اصلاح و بقائے ملت و دعوت دیانت حقہ اسلامیہ کے لیے بمنزلہ اساس کار و بنیاد جمیع مساعی و مبانی ہے۔

احتفال مولد نبوی

مجھ کو کئی بار خیال ہوا کہ ایک دو رسالے سیرت نبوی پر متذکرہ صدر اصول کے پیش نظر رکھ کر لکھوں اور آج اس بحث کو زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا بھی اس لیے تاکہ ارباب قلم و نظر کو اس طرف توجہ ہو اور ایک ابتدائی مشورہ ان کے سامنے آجائے۔ اگر ماہ ربیع الاول قادم تک کسی بزرگ نے اس طرف توجہ نہ کی تو چند خطبات سیرت پر لکھوں گا۔ نیز کوشش کروں گا کہ کسی بڑے شہر میں ایک احتفال عظیم اسی مقصد سے منعقد ہو اور اس میں صرف سیرت مبارک پر مختلف ارباب علم و خبر خطبات دیں۔ یہ خیال بھی مجھے عرصے سے ہے۔ امسال لاہور یا لکھنؤ میں ماہ ربیع الاول کی ایک مرکزی مجلس ضرور منعقد کرنا چاہیے۔

وما توفیقی اِلا باللہ۔

(یہ مقالہ نومبر ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں شائع ہُوا تھا۔ آیندہ سال اگست میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی اور "الہلال" کی دو ہزار کی ضمانت ضبط کر کے دس ہزار کی ضمانت مانگ لی گئی۔ اس وجہ سے پرچہ بند کیے بغیر چارہ نہ رہا، کیونکہ اگر دس ہزار کی ضمانت داخل بھی کر دی جاتی تو امید نہ تھی کہ وہ زیادہ عرصے تک محفوظ رہتی۔ یوں یہ منصوبہ بروئے کار نہ آسکا۔ ایک سال کے بعد مولاناؒ نے "الہلال" کی جگہ "البلاغ" جاری کیا، جس میں زیادہ توجہ "ترجمان القرآن"، "مقدمۂ تفسیر" اور خود تفسیر (البیان) پر مبذول رہی۔ چند مہینے کے بعد مولاناؒ کو بنگال سے اخراج کا حکم ہو گیا اور انھیں کلکتہ چھوڑ کر رانچی جانا پڑا۔ وہاں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں وہ رہا ہُوئے۔)

باب۳

رسول اللہ صلعم کا احترام اور اس کا مقام

(قرآن و حدیث کی روشنی میں)

" الہلال " کے ایک مضمون میں مولانا نے غلطاً لکھ دیا تھا " محمد بن عبداللہ (صلعم) اپنی عمر کے تریسٹھ برس چار مہینے کے بعد آغوشِ الٰہی میں زندہ رہا " . . . . اس پر اعتراض ہوا اور مولانا نے معترض کا خط چھاپ کر معافی مانگ لی۔ ایک اور صاحب نے یہ سوال اٹھایا کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کو بے تامل " مسیح " لکھتے اور بولتے ہیں اور بعض مواقع پر اختصار کا تقاضا یہی ہوتا ہے۔ کیا کوئی مذہبی حکم اس بارے میں ہے کہ رسول اللہ صلعم کے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ ضرور بولے جائیں؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں ؛

اب محض اس عبارت کے ٹکڑے کی بحث نہ رہی بلکہ آپ نے ایک اصولی بحث چھیڑ دی۔ افسوس ہے کہ فقیر آپ کے خیال سے کبھی متفق نہیں ہو سکتا۔

سچا احترام اور اس کا مقام

بے شک سچا ادب اور احترام وہی ہے جو دل سے ہو، نہ کہ زبان سے، مگر صرف اسی پر موقوف نہیں۔ انسان کا کوئی اعتقاد اور خیال ایسا نہیں جس کا گھر " دل " کی جگہ " حلق " میں ہو۔ اعتقاد چیز ہی ایسی ہے جو دل و دماغ سے تعلق رکھتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ ؛

ولما یدخل الایمان فی قلوبکم ؛ اور جب کہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ (الحجرات ؛ ۱۴)

یعنی ایمان کی جگہ دل ہے نہ کہ زبان۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ دل کے اعتقاد کا ترجمان کون ہے؟ کیونکر معلوم ہو کہ یہ دل ابوذر غفاریؓ کا ہے اور یہ دل ابوجہل شقی کا؟ جواب صاف ہے کہ صرف اعمال اور زبان کا اعتراف کہ " نحن نحکم بالظواہر "۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر دنیا میں سیاہ و سفید کی تمیز ہی اٹھ جائے۔ قانون کو دیکھیے کہ وہ نیت اور ارادے کو ان کی پوری جگہ دینے سے انکار نہیں کرتا، لیکن ساتھ ہی اگر آپ عدالت میں جا کر مجسٹریٹ کو یور آنر (Your Honour) کی جگہ محض " تم " کر کے خطاب کیجیے گا تو گو آپ کتنا ہی کہیں کہ تعظیم کی جگہ دل ہے، زبان نہیں، لیکن امید نہیں کہ وہ آپ کو دفعہ ۱۷۷ سے بری کر دے۔

اقرار، تصدیق اور عمل

مذہب بھی ایک روحانی قانون ہے اس نے خود ہی انما الاعمال بالنیات (تمام کاموں کا دار و مدار نیت پر ہے) کا اصول قائم کیا ہے، لیکن ساتھ ہی اعمال ظاہری و لسانی کو بھی وہ اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود قرآن کریم کے بار بار اظہار کے کہ ایمان کا تعلق محض دل و اعتقاد سے ہے، ہم نے یہ نہایت سچی تعریف اسلام کے عقاید میں تسلیم کرلی ہے کہ اقرار باللسان و تصدیق بالجنان وعمل بالارکان (اقرار زبان سے، تصدیق دل سے اور عمل اعضاء و جوارح سے)

آپ کہتے ہیں کہ تعظیم کی اصل جگہ دل ہے، میں کہتا ہوں چونکہ دل ہے، اسی لیے آجکل کے تعلیم یافتہ اشخاص کی زبان اور عمل تعظیم سے خالی ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو نام دل کو محبوب و محترم ہو، وہ زبان پر گزرے اور محبت و احترام سے خالی ہو؛ اگر آپ کسی کو چاہتے ہیں تو سمجھ سکیں گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں:

قسم بنام تو خوردن دلیل غیرت نیست
بخاک پاک تو آں ہم کمال بے ادبی است

ایک محدث کا ارشاد

آج کل کے ارباب تحریر و تقریر کو اکثر دیکھتا ہوں کہ انھوں نے بقول آپ کے آنحضرتؐ کے اسم سامی کے تعظیمی الفاظ کی طوالت سے گھبرا کر "بانی اسلام" کی ایک اصطلاح تصنیف کرلی ہے۔ وہ بلا تامل اپنی تحریر و تقریر میں "بانی اسلام نے یوں کہا" اور "بانی اسلام نے اس طرح کہا" بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس طرح ٹھیک ٹھیک ان کی زبان ان کے دلی الحاد کی ترجمانی کرتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ ان کے دل میں آنحضرت صلعم کی تعظیم ہے تو ان کو تو بار بار اسم محبوب و مطلوب درود و صلوٰۃ کے ساتھ لینا تھا کہ محبوب کی یاد کی جتنی تقریبیں نکل آئیں، عین مقصود عشق ہیں۔ ایک جلیل القدر محدث سے جب پوچھا گیا کہ علم حدیث سے اس درجہ شوق کیوں ہے؟ تو اس نے کہا "اس لیے کہ اس میں بار بار" قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کا جملہ آتا ہے اور اس طرح اس اسم گرامی کے ذکر اور اس پر درود و صلوٰۃ عرض کرنے کی تقریب ہاتھ آجاتی ہے۔

تعظیم کے نصوص

یہ نہ سمجھیے گا کہ محض اعتقاد قلبی اور جوشِ تعظیم و احترام اسلامی اس اعتقاد کا ذریعہ ہے' نہیں بلکہ فی الحقیقت آنحضرت صلعم کی یہ تعظیم اسمی بھی ایسے نصوص قطعیہ پر مبنی ہے، جس سے کوئی قائل قرآن تو انکار نہیں کرسکتا۔

جب بنی تمیم کا ایک وفد مدینہ میں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں تشریف رکھتے تھے۔ نادانوں نے دروازے سے آپؐ کا اسم سامی لے لے کر پکارنا شروع کر دیا کہ "یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اخرج الینا" اللہ تعالیٰ کو آپؐ کے ساتھ اتنی گستاخی بھی گوارا نہ ہوئی اور ارشاد ہوا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ (اے پیغمبر! جو لوگ تمھیں مکان کے باہر سے نام لے لے کر

اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۔ وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ۔ (الحجرات: ۴،۵)

پکارتے ہیں' ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو مطلق عقل اور تمیز نہیں۔ بہتر تھا کہ وُہ صبر کرتے اور جب تم باہر نکلتے تو مل لیتے۔

اس آیت سے پہلے کی آیت میں فرمایا :

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔

(اے مسلمانو! جب آنحضرت کے حضور میں عرض حال کرو تو اپنی آوازوں کو ان کی آواز سے بلند کر کے گفتگو نہ کرو اور نہ بہت زور سے بات چیت کرو جیسا کہ تم آپس میں کیا کرتے ہو ایسا نہ ہو کہ اس گستاخی کے سبب سے تمہارے تمام اعمال ضائع جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو[۱]

خطاب میں امتیاز تعظیمی کی شان

خدا تعالیٰ کو اتنا بھی گوارا نہیں کہ آپ کی جناب میں کوئی اونچی آواز سے گفتگو کرے، چہ جائیکہ تعظیم و تکریم کے بغیر نام لیا جائے۔ قرآن کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہو کہ خدا تعالیٰ نے سب سے پہلے خود آپ کے اس امتیاز تعظیمی کی شان کا نمونہ ہر جگہ قایم رکھا ہے۔ جس قدر انبیاء اولوالعزم سے تخاطب قرآن میں موجود ہے، جگہ جگہ آپ پائیں گے کہ ان کا اصلی نام اور علم لے کر انھیں پکارا گیا ہے۔ مثلاً "یا آدم اسکن انت و زوجك" "و ما تلك بیمینك یا موسیٰ" "یا داؤد انا جعلناك خلیفۃ فی الارض" "یا زکریا انا نبشرك بغلام اسمہ یحییٰ" "یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ" "یا عیسیٰ انی متوفیك و رافعك الی" اس طریق تخاطب کے مطابق چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی یا محمد! یا احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ کر پکارتا مگر اللہ کو اس درجہ آپ کا احترام کرنا مقصود تھا کہ تمام قرآن میں ایک جگہ بھی آپ کو نام لے کر مخاطب نہیں کیا، بلکہ جہاں کہیں پکارا ہے یا تو صدائے تعظیم و تکریم سے مثلاً "یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیك" "یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین" یا پھر صدائے محبت و عشق سے: "یا ایھا المزمل" "یا ایھا المدثر! و کل ما یفعلہ المحبوب' محبوب :

به طراز ندگی قامت موزوں نازم
یک قبا نیست کہ شایستہ اندام تو نیست

---

[۱] ضمناً ان آیات میں تہذیب صحبت اور قانون مجلس کی بھی کیسی ضروری تعلیم دی گئی ہے یعنی کسی شخص کا نام لے کر دروازے پر پکارنا اور مجلس میں چلا چلا کر گفتگو کرنا تہذیب کے خلاف ہے۔ افسوس کہ اس تعلیم قرآنی کے سچے عامل آج کل انگریز ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ آپؐ کے نام کی عزت و احترام کی مثال کیوں نہ قائم کرتا، حالانکہ جس شہر کی خاک آپؐ کے قدموں سے مس ہوئی ہے، اس کو تو وہ بھی اس درجہ محبوب ہے کہ اس کی قسم کھاتا ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ (البلد: ۱، ۲)

اے پیغمبر! ہم شہر مکہ کی قسم کھاتے ہیں اور اس لیے کہ تم اس میں مقیم ہو۔

محبت اور ایمان

حقیقت یہ ہے کہ دلی اعتقاد ایک بیج ہے جو بغیر محبت کے بار آور نہیں ہوتا اور محبت کے لیے احترام و تعظیم ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں آپ کی تعظیم و تکریم پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ "تعزّروہ و توقروہ (فتح : ۹) یعنی ان (صلعم) کی تعظیم کرو اور ان (صلعم) کا احترام بجا لاؤ! محدثین نے اس مسئلے پر بہت بحث کی ہے کہ مومن کے لیے اللہ کی اور آنحضرت صلعم کی محبت بھی اتباع احکام کی طرح اجباری ہے یا اختیاری؟ کیونکہ محبت اختیاری شے نہیں اور اصل مقصود احکام اسلام کی پیروی ہے، لیکن غور کیجیے تو اس سوال کی یہاں گنجائش ہی نہیں، محبت اختیاری و اجباری ہونے کا سوال تو جب پیدا ہو، جب محبت اور ایمان دو چیزیں ہوں، حالانکہ ایمان تو از سرتا پا محبت ہے اور وہ ایمان نہیں جو محبت سے خالی ہو۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (بقرہ: ۱۶۵)

جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کی محبت اللہ سے نہایت شدید ہے۔

یہاں ارباب ایمان کی یہ علامت بتلائی اور دوسری جگہ یہودیوں کے اس دعوے پر کہ "نحن ابنا اللہ و احبائہٗ" یہ جواب دیا کہ،

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ (آل عمران: ۳۱)

اگر تم واقعی محبت الٰہی کے مدعی ہو تو اس کی یہ صورت ہے کہ رسول کا اتباع کرو۔ پھر تمہارے محبت کرنے کی ضرورت نہ رہے گی خود خدا تم کو اپنا محبوب بنائے گا اور وہ تمہارے گناہوں کو بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

اگر آنحضرت صلعم کا اتباع محبت و محبوبیت الٰہی کے لیے شرط ہے تو محبت بدرجہ اولیٰ شرط ہے کیونکہ جس کی محبت آپ کے دل میں نہیں، اس کا اتباع کیا کیا جائے گا؟

احادیث کی شہادت

صحیحین کی اس مشہور حدیث کے بھی یہی معنی ہیں کہ،

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔

"تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک محبوب تر نہ ہوں اس کے ماں باپ سے، اس کی اولاد سے اور اتنا ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں سے۔"

• ایک دوسری حدیث میں ہے، جب حضرت عمرؓ نے آپؐ سے کہا کہ "لانت احب الیّ من کل شیٔ الا نفسی" آپ (صلعم) محبوب ترین ہیں" مجھ کو تمام چیزوں سے، البتہ میری جان سے زیادہ نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ "والذی نفسی بیدہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیک من نفسک"، قسم خدا کی تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک مجھ کو اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب نہ رکھو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "انت احب الی من کل شیٔ حتی نفسی" اب دیکھتا ہوں تو آپ (صلعم) اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ تب آپ نے فرمایا کہ "الاٰن یا عمرؓ" اسے عمرؓ تیرا ایمان مکمل ہو گیا۔

تو حضرت! اپنا اعتقاد تو یہ ہے۔ انصاف کیجیے کہ میں کہاں ہوں اور آجکل زمانہ کہاں ہے؟ لوگ جس شے کو ایمان کی اقلیم کہتے ہیں، میں تو اس کو، اس وجود محبوب و مطلوب کے ایک ذرۂ محبت کے اندر دیکھتا ہوں۔ اسی سے تعظیم و تکریم اسمی و رسمی جو کچھ آپ کا مقصود ہو قرار دے لیجیے۔

ترا نوالہ دما دم ز خوان یطعمنی[1]

ترا پیالہ مدام از شراب "یسقینی"

مرا تو قبلۂ دینی، ازاں سبب گفتم

بہ مردماں کہ لکم دینکم ولی دینی

دین مقبول

لیکن یہ عالم دوسرا ہے اور ان باتوں سے ذوق لینے کے لیے آجکل کی آب و ہوا موافق نہیں۔ کس سے کہا جائے اور کسے سنایا جائے؟ جن دلوں میں خدا کے اعتقاد کو جگہ نہ ملی، وہاں اس کے رسولؐ اور قرآن کی عزت کو کون پوچھتا ہے؟ جن سے منصب رسالت اور وجود وحی کے اعتقاد کی امید نہیں، ان سے رسولؐ کی عزت کی کس نادان کو توقع ہے؟ دل کی تعظیم کا نام نہ لیجیے کہ جب دل خالی ہوتا ہے تو زبان کو بھی کچھ نہیں ملتا۔ رہی عیسائیوں کی تقلید و اتباع، تو یورپ کے اتباع و تقلید کے لیے خیر سے ایک وسیع میدان آپ حضرات کے لیے پیشتر موجود ہے اور الحمدللہ اس کا کوئی کونہ اس اتباع کی برکت سے خالی نہیں۔ اتنے ہی پر قناعت کیجیے اور نئے مسائل وضع نہ کیجیے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (آل عمران: ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا خواہش مند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ آخرت کے دن اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔

---

[1] یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں آپ نے اپنے ایک مقام خاص کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ابیت عند ربی، ھو یطعمنی و یسقینی، میں اپنے رب کے یہاں شب باش ہوا تھا اس نے جو کچھ کھلایا میں نے کھایا اور جو کچھ پلایا میں نے پیا۔

ظہور قدسی

تاریخ ولادت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موسم بہار میں دوشنبہ کے دن، ۹ ربیع الاوّل سنہ عام الفیل مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء مطابق یکم جیٹھ ۶۸۲ بکرمی کو مکہ معظمہ میں بعد از صبح صادق اور قبل از طلوع نیّر عالمتاب پیدا ہوئے۔ یہ قاضی محمد سلیمان مرحوم منصورپوری صاحب "رحمۃ للعٰلمین" کا بیان ہے۔ قاضی صاحب مزید فرماتے ہیں: دوشنبہ کو حضور صلعم کی حیات مبارک میں خصوصیت حاصل ہے۔ حضورؐ کی ولادت اسی دن ہوئی۔ نبوت اسی دن ملی۔ ہجرت اسی دن ہوئی۔ قبا میں داخل اسی دن ہوا۔ وفات کا سانحہ بھی اسی دن پیش آیا۔ حساب کے مطابق صحیح تاریخ ولادت ۹ ربیع الاول ہی ثابت ہوتی ہے۔

مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ مصر کے مشہور ہیئت دان محمود پاشا فلکی نے دلائل ریاضی سے یہی تاریخ ثابت کی ہے۔

۲۲ اپریل گریگورین قاعدے کے مطابق ہے جس پر ستمبر ۱۷۵۲ء سے مروجہ عیسوی تقویم کا حساب شروع ہوا۔ قاعدۂ قدیم کے مطابق ۹ ربیع الاول مطابق ۱۹ اپریل ۵۷۱ء جولین اور گریگورین قاعدے نے اسے ۱۹ یا ۲۰ اپریل ۵۷۱ء قرار دیا ہے۔ قاضی صاحب مرحوم نے حساب کی تفصیلات سے ثابت کیا ہے کہ اس دن ۲۲ اپریل تھی۔ مزید فرماتے ہیں: دھوپ گھڑی کے گھنٹوں کے حساب سے مکہ مکرمہ میں صبح صادق کا طلوع چار بج کر بیس منٹ پر ہوا تھا۔ آفتاب اس وقت برج حمل سے ۱۳ درجے ۲۰ دقیقے پر تھا اور یکم جیٹھ کو شروع ہوئے تیرہ گھنٹے سولہ منٹ گزر چکے تھے۔[1]

موضوع روایات

ولادت نبوی کے سلسلے میں بہت سی موضوع اور ضعیف روایات رائج ہو گئی تھیں، جن کے بارے میں مولانا آزاد سے استفسار کیا گیا۔ یہ استفسار اور جواب ۱۳ فروری ۱۹۱۳ء کے "الہلال" سے لیا گیا ہے۔ استفسار اس لیے پورا نقل کیا گیا ہے کہ جب تک یہ سامنے نہ ہو، مولاناؒ کے جواب کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی۔ البتہ مختلف روایات کے طویل عربی متون حذف کر دیے گئے ہیں کیونکہ ان کا ملخص و مفاد خود مولاناؒ کے جواب میں آگیا ہے اور ان کے حذف سے اصل مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ساتھ ہی تقریب میلاد پر مولاناؒ کی ایک تقریر درج ہے۔[2]

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے "رحمۃ للعٰلمین" جلد اول۔ ص ۴۲-۴۳ حواشی۔ [2] یہ مختصر تحریر عاجز مؤلف کی ہے۔

باب

میلاد نبوی اور موضوع روایات

—(۱)—

استفسار چند دنوں کے بعد ماہ مبارک ربیع الاول آنے والا ہے جبکہ مولود شریف کی مجلسیں جابجا منعقد ہوں گی لیکن جس طریقے سے یہ مجلسیں منعقد ہوتی ہیں اور جو حالات و واقعات ان میں بیان کیے جاتے ہیں، معلوم نہیں جناب کا خیال اس بارے میں کیا ہے؟ میں تو اس کو نہایت افسوسناک سمجھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ یہی حالات و واقعات ہیں، جنھوں نے حضرت بانیِ اسلام صلعم کی پاک زندگی کے متعلق مخالفین کے دلوں میں شکوک پیدا کر دیے ہیں۔

ایک مدت سے میرا خیال تھا کہ ایک مختصر سا رسالہ آنحضرتؐ کے حالات میں جمع کر دوں، جس کو مولود شریف کی مجلسوں میں پڑھا جائے، لیکن جس طرح کے حالات کی تلاش تھی وہ کہیں نہیں ملتے تھے۔ عرصہ ہوا ایک رسالہ امیر احمد امیر مینائی صاحب نے شائع کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس میں حالاتِ زندگی ایک بہت بڑے عالم کی مدد سے لکھے گئے ہیں لیکن اسے بھی دیکھا، از سرتاپا وہی قصے بھرے تھے۔

اس سال میں نے بطور مسودے کے ایک تحریر لکھی اور چند علمائے دین کو بغرض اصلاح سنائی، لیکن وہ اس امر پر نہایت برہم و ناراض ہوئے کہ ذکر ولادت کے وہ واقعات اس میں نہ تھے جو تمام کتب مولود میں بیان کیے گئے ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک صاحب تصنیف عالم سے عرض کیا کہ کیا یہ واقعات مستند تاریخوں اور حدیث کی کتابوں میں لکھے ہیں؟ انھوں نے جواب میں لکھا کہ "یہ تمام واقعات و معجزات صحیح ہیں جن کو تمام مورخین و محدثین نے ہمیشہ بیان کیا ہے۔ بڑے بڑے علمائے دین اور اکابر اسلام نے ان کی تصدیق فرمائی ہے اور ان کو پڑھا ہے اور مجلسوں میں سنا ہے، البتہ آج کل کے نیچریوں اور لامذہبوں کو ان کے ماننے میں تامل ہے، کیونکہ انگریزی کتابوں میں مرقوم نہیں۔"

آپ ہمیشہ ہم انگریزی دانوں کو الحاد اور مذہبی غفلت کا الزام دیتے ہیں، لیکن جس انداز اور طریقے سے دیتے ہیں، اس کی وجہ سے ہم نہایت خوش ہیں اور آپ کو اپنا خیر خواہ اور مصلح سمجھتے ہیں لیکن خدا کے لیے اس بارے میں میری تشفی کو دیجیے کہ آیا یہ واقعات واقعی مستند کتابوں میں مرقوم ہیں؟ اور ان میں شک کرنا نیچریت اور مذہب سے کنارہ کشی ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو انصاف کیجیے کہ کیا یہ واقعات عقل میں

آتے ہیں؟ اور ان کو آج کل کوئی تسلیم کر سکتا ہے؛ معاف فرمایئے گا اگر ایسے ہی واقعات سنا کر آپ ہم کو وہی جذبات سے برگشتگی کا الزام دیتے ہیں تو دیکھیے۔ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتے۔ وہ واقعات یہ ہیں؛

۱۔ حضرتؐ کی ولادت کا وقت قریب آیا تو ایک مرغ سفید نمودار ہوا اور حضرت آمنہؓ کے پاس آیا، نیز اس شب کو تمام جانوروں اور پرندوں نے گفتگو کی۔

۲۔ حضرت مریمؑ اور حضرت آسیہؑ کا ولادت سے پہلے آنا اور بشارت دینا۔

۳۔ جب حضرت عبداللہ کا نکاح حضرت آمنہ سے ہوا تو دو سو عورتیں رشک سے مر گئیں۔

۴۔ حضرتؐ کی ولادت کے دن آتشکدۂ ایران بجھ گیا۔ قصر نوشیرواں کے کنگورے گر گئے اور خانہ کعبہ کے بُت اوندھے ہو گئے۔

۵۔ ولادت کے بعد حضرت کچھ دیر کے لیے غائب ہو گئے پھر کسی نے بہشتی کپڑوں میں لا کر رکھ دیا۔

۶۔ روشنیوں کا نمودار ہونا اور عجیب عجیب آوازوں کا سنائی دینا۔

مجالس ذکر حضورؐ کی فضیلت مولانا نے جواب میں تحریر فرمایا،

آپ کا جوش دینی، محبت ایمانی اور فکر اصلاح مجالس ذکر مولود، مستحق تحسین و لائق تشکر ہے۔ فجزاکم اللہ تعالیٰ۔

آپ نے ایک نہایت اہم اور ضروری بحث چھیڑ دی۔ جی چاہتا ہے کہ بلا تامل صفحے کے صفحے لکھ جاؤں، لیکن افسوس کہ وقت اور گنجایش سے مجبور ہوں، لہذا چند کلمات ضروریہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

مولود کی مجالس کا عجیب حال ہے۔ مقصد مجالس کے لحاظ سے دیکھیے تو فقیر کے اعتقاد میں اس سے زیادہ اہم، عظیم المنفعۃ اور قوم کے لیے ذریعہ ارشاد و ہدایت اور کوئی اجتماع نہیں۔ لیکن طریق انعقاد پر نظر ڈالیے تو اجتماعی و مجلسی قوتوں کے ضائع کرنے کی بھی اس سے زیادہ اور کوئی افسوسناک مثال نہیں ملے گی۔ اسلام ایک تعلیم تھی اور اس تعلیم کا عملی نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کہ،

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا۔ (الاحزاب: ۲۱)	(بے شک رسول اللہ کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے پیروی اور اتباع کا بہترین نمونہ ہے جو اللہ سے ڈرنے اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے اور بہ کثرت ذکر کرنے والے ہیں)

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ اس "صاحب خلق عظیم" کا اخلاق کیا تھا؟ فرمایا؛ خلقه القرآن! اگر آنحضرتؐ کا اخلاق دیکھنا ہے تو قرآن کو دیکھ لو کہ اس "کتاب مرقوم" کا وہ ایک "ظل مجسم" اور اس کے عملی نمونے کی ایک "لوح محفوظ" ہے!

وفی ذلك فليتنافس المتنافسون[1]

---

[1] اور اس میں چاہیے رغبت کرنے والے رغبت کریں (التطفیف: ۲۶)

اصل مقصد کیا تھا

پس مولود کی مجلسوں کا اصلی مقصد یہ ہونا تھا کہ وہ اس "اسوۂ حسنہ" کے جمال الہٰی کی تجلی گاہ ہوتیں۔ آنحضرت صلعم کے صحیح حالات زندگی سنائے جاتے۔ ان کے اخلاق عظیمہ اور فضائل کریمہ کے اتباع کی لوگوں کو دعوت دی جاتی اور ان اعمال کا دلوں میں شوق وولولہ پیدا کیا جاتا، جو ایک "مسلم و مومن" زندگی کے کیرکٹر کا اصلی مایۂ خمیر ہیں اور جن کے اتباع نے صحابہ کرام کی زندگی کو اس درجہ تک پہنچا دیا تھا کہ لسان الہٰی نے "یحبھم و یحبونہ[1]" کی صدائے محبت سے ان کی مدح سرائی کی اور اتباع محبوب نے انھیں خود محبوب بنا دیا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (آل عمران: ۳۱)

اے پیغمبر! مدعیان محبت الہٰی سے کہہ دو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو (اگر تم نے ایسا کیا تو تم کو اللہ کی محبت کے دعوے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ) خود اللہ تم کو اپنا محبوب بنالے گا اور تمھارے گناہوں کو بھی بخش دے گا۔ وہ نہایت مہربان بخشنے والا ہے۔

اگر ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ ان مجالس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لیے سعادت کونین کا ذریعہ اور کیا تھا؟ یہ تمام کانفرنسیں، اور انجمنیں جن کا چاروں طرف ہنگامہ بپا ہے، ایک طرف اور اس مجلس کا ایک لمحہ ایک طرف، جو اس "اسوۂ حسنہ" کے نظارے میں بسر ہو۔ ہماری مجلسیں اسی ذکر کے لیے ہونی چاہئیں اور ہماری آنکھیں اسی جمال جہاں آرا کے نظارے کے لیے؛

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا

ولنعم ما قیل؛

مصلحت دید من آن است کہ یاران ہمہ کار
بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند!

---

[1] اشارہ ہے سورۂ مائدہ کی اس آیت کی طرف؛

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ٘ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىٕمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ (۵۴)

مسلمانو! تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے پھر جانے سے دین کو کچھ نقصان پہنچے گا) قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ مومنوں کا پیدا کر دے جنھیں خدا دوست رکھتا ہو اور وہ بھی خدا کو دوست رکھنے والے ہوں، مومنوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلے میں نہایت سخت، اللہ کی راہ میں جانیں لڑا دیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ اللہ کا فضل ہے جس گروہ کو چاہے عطا فرما دے۔ وہ اپنے فضل میں بڑی ہی وسعت رکھنے والا اور سب کا حال جاننے والا ہے۔

صورت قائم، حقیقت مفقود

لیکن بدبختی یہ ہے کہ ہمارے اعمال کی صورتیں مسخ نہیں ہوئیں۔ حقیقت غارت ہو گئی ہے۔ قومی تنزل کے معنی یہی ہیں کہ تمام قومی و دینی اشغال بظاہر قائم رہتے ہیں، لیکن ان کی رُوح مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہماری مسجدیں اُجڑ گئی ہیں۔ کتنے جھاڑ اور فانوس ہیں، جن سے مسجدیں بقعۂ نور بنائی جاتی ہیں! مگر رونا یہ ہے کہ دل اجڑ گئے ہیں اور یہ وہ بستی ہے کہ جب یہ ویران ہو جائے تو پھر آبادی کہاں؟

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ! تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

فانہا لا تعمی الابصار و لکن تعمی القلوب التی فی الصدور[1]

مجھے کیا کہنا تھا اور کیا کہنے لگا۔ بہرحال مولود کی مجلسیں بھی اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک بہترین دینی عمل تھیں، جن کی صورت تو قائم ہے، مگر حقیقت مفقود ہے۔ محض ایک رسمی تقریب ہے جو مثل اور رسمی صحبتوں کے ضروری سمجھ لی گئی ہے اور امرا و رؤسا نے تو اپنی نمائش اور ریائے دولت کا اسے بھی ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔

روایات ضعیفہ و قصص موضوعہ

آنحضرت صلعم کے صحیح حالات زندگی اور ان انقلابات عظیمہ کے بیان کی جگہ (جو آپ کی ولادت کے واقعے نے مشرق و مغرب میں پیدا کر دیے) کتنے افسوس کی بات ہے کہ محض چند روایات ضعیفہ و قصص موضوعہ کے بیان کرنے پر اتنے بڑے ملی و دینی جذبے کو قربان کر دیا جاتا ہے! پھر اگر محض طبقہ عوام کا یہ حال ہو تو قابل شکایت نہیں، لیکن تعجب اور صد ہزار تعجب ہے اس بوالعجبی پر کہ صدہا علمائے ملت ہیں جو باوجود ادعائے رسوخ حدیث و سیر و وسعت نظر و علم، ان روایات کو خاموشی کے ساتھ سنتے ہیں۔ خود پڑھتے ہیں اور لوگوں سے پڑھواتے ہیں۔ مگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے دل میں تحقیق و تفتیش کی جنبش پیدا نہیں ہوتی؛

کاش جس قدر بحث نفس انعقاد مجلس کے سنت و بدعت ہونے کی نسبت کی گئی ہے، وہ اس مجلس کی اصلاح حال کے لیے کی جاتی۔ یہ وہ تمام چیزیں جو قوم میں شوق و شغف کے ساتھ موجود ہوں، درحقیقت ایک قوت ہیں۔ پس سب سے اول کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اسٹیم کو ضائع کرنے کی جگہ اس سے مفید کام لیا جائے۔ البتہ اگر اصل کار ہی جادۂ شریعت سے منحرف ہو اور صورت اصلاح مفقود تو پھر اس کے استیصال کی کوشش امر بالمعروف میں داخل اور ناگزیر ہے۔

مذہب کے نادان حامی

ہزار تعجب ہے اس عالم، صاحب تصنیف و تالیف کے دعوائے علم پر، جس کے جواب کے بعض جملوں کو آپ نے نقل کیا ہے۔ درحقیقت یہی وہ مذہب کے نادان حامی ہیں

---

[1] پس آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں، جو سینوں میں ہیں۔ (سورۃ حج: ۴۶)

جن کی دوستانہ حمایت ہمیشہ دشمنوں کی مخالفت سے زیادہ مذہب کے لیے مضر رہی ہے۔ جن روایات کی نسبت آپ نے تحقیق چاہی تھی، ان کا انکار نہ تو نیچریت ہے اور نہ الحاد، بلکہ عین شیوۂ اسلام و ایمان ہے اور ہر صاحبِ نظر جس کو فنِ حدیث وسیر سے کچھ بھی خبر ہو گی، ایک لمحہ کے لیے بھی ان روایات کو تسلیم نہیں کرے گا۔

آپ اس سعی و کوشش کے لیے مستحق تحسین تھے۔ افسوس کہ اس نادان مدعی علم نے تشدد مذہبی اور حمیت کا بیجا استعمال کیا، حالانکہ جو محل استعمال ہیں ان کی ہمارے علما خبر بھی نہیں لیتے۔

بہت سے لوگ ہیں جو تشدد مذہبی اور تعصب دینی کو علمائے حال کی طرف منسوب کرتے ہیں اور برسوں سے اس پر زور دے رہے ہیں لیکن میں اسے صحیح نہیں سمجھتا۔ مجھ کو تو شکایت ہے کہ جس درجہ تشدد مذہبی علما میں ہونا چاہیے، افسوس ہے کہ نہیں ہے۔ صدہا امور ایسے ہیں جن میں صاف طور پر ان کے بےجا تسامح و مداہنت کو دیکھ رہا ہوں اور حق و معروف کے اعلان سے دانستہ اعراض کیا جا رہا ہے۔ البتہ چند چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن میں تشدد کا اظہار ہوتا ہے، چونکہ یہ اظہار بے محل ہوتا ہے کہ اس لیے محض رائیگاں جاتا ہے بلکہ اکثر موقعوں میں اور مضر ہوتا ہے۔

ایک بڑا نکتہ

ایک بہت بڑا نکتۂ عمل یہ ہے کہ ہر قوت کا استعمال اس کے صحیح محل میں ہو۔ آپ اسٹیم کو جس سے سمندروں میں جہاز، خشکیوں پر ریل اور کارخانوں میں مشینیں چلتی ہیں، ٹاٹ کی بوریوں میں بھر کر غبارہ بنانے کی کوشش نہ کیجیے ورنہ آپ کی قوت اور سعی دونوں رائیگاں جائیں گی۔

یہ اس ذکر کے چھیڑنے کا وقت نہیں ورنہ بجائے خود ایک داستان طولانی ہے۔ اپنی مصیبتوں کا حال یہ ہے کہ چاروں کا کوئی گوشہ وجہے سے خالی نہیں۔ کس کس چیز کو بیان کیجیے؟ کس کس کے حال پر روئیے؟ پھر اتنا وقت کہاں سے لائیے؟

آسودہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

معیار صحت روایات

لیکن ان روایات کی صحت و عدم صحت کی نسبت آپ نے ضمناً جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، افسوس کہ فقیر ان سے متفق نہیں۔ وہ ایک نہایت خطرناک اصولی غلطی ہے، جس میں زمانۂ حال کے مدعیان تحقیق و اجتہاد اور رہروان جادۂ تطبیقِ عقل و نقل برسوں سے مبتلا ہیں۔ آپ نے بار بار اس سوال کو دہرایا ہے کہ اگر یہ روایات صحیح ہیں تو کیا عقل میں آ سکتی ہیں؟ جواباً گزارش ہے کہ روایات تو یقیناً صحیح نہیں، لیکن یہ اصول بھی کب صحیح ہے کہ جو واقعہ آپ کی عقل میں نہ آئے وہ یکسر غلط اور موضوع ہے؟

آپ بلا تامل پوچھیے کہ یہ واقعات اصول فن روایت کی بنا پر کہاں تک صحیح اور قابل قبول ہیں؟ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ صرف اتنا پوچھ لینا ہی آپ کے مقصد کے لیے کافی ہے، لیکن یہ کہاں کا اصول تحقیق اور معیار تمیز

حق و باطل ہے کہ واقعے کی صحت کے لیے پہلی شرط آپ کی عقل کی تصدیق ہے؟ آپ لوگ آج کل بے تکلف یہ جملہ کہہ دیا کرتے ہیں مگر نہیں سمجھتے کہ کیسی خطرناک سوفسطائیت کی راہ ہے، جو اس طرح آپ کے سامنے کھل جاتی ہے؟ ہر واقعے کی صحت و عدم صحت کے لیے پہلی چیز اصول روایت اور صحت نقل کی شرائط کا اجتماع ہے اور بس، نہ کہ زید و عمرو کی عقل میں آنا۔ مجھ کو یقین نہیں کہ مارکونی ٹیلیگرام کو آپ کی عقل تسلیم کرتی ہو[1] اور غالباً آپ نے اب تک اس کا عینی مشاہدہ بھی نہ کیا ہوگا، لیکن اول مرتبہ جب اس ایجاد کی خبر یورپ کے کسی مستند پرچے میں دیکھی ہوگی اور تمام اخباروں میں اس کی شہرت کا غلغلہ مچا ہوگا تو فرمائیے آپ نے اس کی تصدیق کی تھی یا انکار۔

صحیح راہِ عمل

آپ کو معلوم نہیں یہی وہ سرحد ہے جہاں سے (باوجود اتحاد مقصد و اصول) مجھے آجکل کے مصلحین مذہب سے الگ ہوجانا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ حال ہے جس حدیث اور جس روایت کو اپنے خود ساختہ معیار عقلی سے ذرا بھی الگ پاتے ہیں معاً اس سے انکار کردینے کے لیے بے چین ہوجاتے ہیں اور پھر اس انکار محض کو "تطبیق منقول و معقول" کے مرعوب کن لفظ سے تعبیر کرنے کے علانیہ تمسخر سے نہیں شرماتے۔ وتقولون بافواهكم ما ليس لكم به علم وتحسبونه هيّناً وهو عند الله عظيم[2]

حالانکہ اگر ان کو علوم دینیہ کے حصول کا موقع ملا ہوتا اور علم و فن پر نظر ہوتی تو وہ دیکھتے کہ اسی مقصد کو اصول فن کے ساتھ چل کر بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

کیا ضرورت ہے، ان روایات کی محض اس وجہ سے تغلیط کردی جائے کہ وہ ہماری عقل میں نہیں آتیں، جبکہ اصول مقررۂ حدیث و آثار و طریق جرح و تعدیل روایت و تحقیق و نقد درایت و شہادات موثقہ ارباب علم و فن کی بنا پر بغیر ادنیٰ دقت کے ثابت کرسکتے ہیں کہ یہ روایات ہی پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور اصول فن کے اعتبار سے لائق احتجاج نہیں۔ اس طرح بغیر سررشتہ اصول کو ہاتھ سے دیے، اسی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

انکار کی جداگانہ بنیادیں

معلوم نہیں آپ نے میری گزارش کو سمجھا بھی یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ بہت سی باتیں ہیں، جن سے انکار کرنے میں ممکن ہے آپ کے مصلحین حال اور ہم متفق ہوں، لیکن پھر بھی ہم میں اور ان میں بعد المشرقین ہے۔ وہ محض اس بنا پر انکار کرتے ہیں کہ ان کی عقل میں نہیں آتی اور ہم اس لیے انکار کرتے ہیں کہ اصول فن سے ان کا قابل تسلیم ہونا ثابت نہیں۔ فاي الفريق احق بالامن ان

---

[1] یہ ۱۹۱۳ء کی تحریر ہے جب لاسلکی یا بے تار برقی کے ذریعے سے پیغام پہنچانے کی ایجاد پر زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ اٹلی کا مشہور سائنسدان مارکونی اس کا موجد تھا مولانا نے اسی کی مثال پیش کردی۔ [2] تم اپنے منہ سے وہ بات کہتے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہ تھا اور تم اسے سہل سمجھتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک بھاری بات تھی۔ (سورۂ نور: ۱۵)

کنتم تعلمون[1]

آپ کہیں گے کہ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ میں کہوں گا کہ منزل تک پہنچنے ہی پر سفر کی کامیابی موقوف نہیں، بلکہ بہت کچھ راہ سفر کے تعین و انتخاب پر بھی ہے۔

آج کل کے مصلحین اور علمائے حق

آپ کو نہیں معلوم، صدہا باتیں ہیں کہ آج کل کے مصلحین بھی کہتے ہیں اور انھیں کو امام غزالی اور شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہا نے بھی کہا ہے، مگر دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک سے الحاد پرورش پاتا ہے اور دوسرے سے مذہب کو تقویت ہوتی ہے؛ حالانکہ مقصود پہلی جماعت کا بھی تقویت مذہب ہی ہے۔ یہ فرق حالت بھی زیادہ تر اسی اختلاف طریق کا نتیجہ ہے۔ آپ لوگوں کو شکایت ہے کہ علما آجکل کی چیزوں پر متوجہ نہیں ہوتے۔ یہ سچ ہے، مگر اس کو بھی تو دیکھیے کہ آپ لوگوں نے ان کی نظروں کو متوجہ کرنے ہی کا کون سا سامان کیا ہے؛ لوگ دیکھتے ہیں کہ جس چیز کو آپ "تطبیق عقل و نقل" کہتے ہیں، وہ صرف ایک تیز و برق خرام قینچی ہے جس کو آپ نے اٹھایا اور بے تکان قطع و برید شروع کر دی۔ نہ علم و فن سے مس ہے، نہ اصول و قواعد کی خبر ہے، نہ کتابوں پر نظر ہے اور نہ اس زبان سے واقفیت ہے جس سے قرآن و حدیث کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر وہ آپ کی وقعت کریں تو کیا کریں؛

گو میں اپنے عقیدے میں اس اغماض کو بھی علما کی ایک سخت غلطی سمجھتا ہوں اور بیان وجوہ کا یہ موقع نہیں۔ تاہم اگر وہ اپنے اغماض کی یہ توجیہ کریں تو آپ کیا جواب دیں گے؟

میں جو ہمیشہ شیخ محمد عبدہٗ اور ان کے متبع طریقت سید رشید رضا کی تعریف کرتا ہوں تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بہ نسبت ہندوستان کے مصلحین جدید کے اس نکتے کا زیادہ خیال رکھا ہے، حالانکہ ضرورت ان کے سامنے بھی وہی تھی، جو یہاں درپیش ہے۔

طبقہ محدثین اور گروہ قصاص

اب آپ اپنے سوالات کا جواب لیں۔ عقل و فلسفہ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ سرے سے یہ تمام روایتیں ہی از قبیل قصص و حکایات موضوعہ ہیں، جن کا کتب معتبرۂ حدیث میں نام و نشان تک نہیں۔

تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں مگر چند الفاظ کہوں گا۔ یہ کیسی سخت بدبختی کی بات ہے کہ آج مسلمانوں میں جن چیزوں کی سب سے زیادہ شہرت اور عوام و خواص میں جو بیانات سب سے زیادہ مقبول ہیں، وہی سب سے زیادہ غیر معتبر اور ناقابل تسلیم بھی ہیں۔ یہ حال ہر علم و فن کا ہے۔ تاریخ میں وہی کتابیں اور انھیں کتابوں کی حکایتیں مشہور و

---

[1] ہم دونوں فریقوں میں سے کس کی راہ امن کی راہ ہوئی۔ اگر تم علم و بصیرت رکھتے ہو؟ (انعام ۸۱)

متقدمین ہیں، جن کے بعد ہمارے یہاں خرافات و اکاذیب کا کوئی درجہ نہیں۔ سیر و فضائل میں بھی انھیں کتابوں کو قبول عام حاصل ہے، جن کے مصنف محدثین کی جگہ قصاص و واعظین تھے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ قدما کی کتابوں پر نظر نہیں اور ہر علم و فن میں تمام تر دار و مدار متاخرین پر ہے۔ یہ لوگ محض حاطب اللیل تھے اور چند کتابوں سے رطب و یابس روایات کو کسی ترتیبِ تازہ کے ساتھ جمع کر دینا ہی ان کی قوت تصنیف کا سدرۃ المنتہیٰ تھا۔

میں نے "قصاص و واعظین" کا لفظ کہا، یعنی مذہبی قصص و حکایات سے گرمیٔ محفل کا کام لینے والے واعظ۔ فی الحقیقت یہ طبقہ ہمارے یہاں ابتدا سے سرچشمۂ موضوعات و مبدٔ جمیع اقسام افترا و مکذوبات و ینبوع خرافات و حکایات رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے وعظ و بیانات کو انظارِ عوام میں دلفریب و پرکشش بنانے کے لیے مجبور تھے کہ قصص و حکایات کی تلاش و جستجو میں رہیں اور اگر میسر نہ آئیں تو خود وضع کریں۔ یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ[1] پھر یہ لوگ اسی طرح کی تمام روایتوں کو شاعرانہ اغراق و تغلیب اور داستان طرازانہ اضافہ و تحشیہ کے ساتھ اپنی مجلسوں میں بیان کرتے تھے اور رفتہ رفتہ مرض متعدی ہو جاتا تھا۔

علی الخصوص متاخرین ایران میں بعض لوگوں نے وعظ گوئی کو ایک مستقل فن بنا دیا اور چونکہ قابل اور اہل قلم بھی تھے اس لیے اپنی مجالس کو کتب سیر و قصص کی صورت میں مدون بھی کر دیا۔ اضلوا فاضلوا، فویل لھم ولا تباعھم[2] مثلاً ملا حسین واعظ کاشفی اور ملا معین الدین ہروی انھیں لوگوں میں سے تھے۔ علی الخصوص آخر الذکر شخص جو فی الحقیقت انشا پردازی، حکایت طرازی، اقتباس روایات ضعیفہ و موضوعہ، تاویلات رکیکۂ قرآن و سنت اور عبور و رسوخ اسرائیلیات و روایات یہود میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

مولود کی اردو کتابوں کے مآخذ

شاید بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ آج اردو زبان میں جس قدر مولود لکھے گئے ہیں اور رائج ہیں وہ سب کے سب بے واسطہ یا بالواسطہ اسی ملا معین ہروی کی کتابوں "معارج النبوۃ" تفسیر سورۂ یوسف موسوم بہ "نقرہ کار" قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موسوم بہ "اعجاز موسوی" وغیرہا سے ماخوذ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان کتابوں میں بعض حصے نہایت دلچسپ اور قابل دید ہیں مثلاً وہ صوفیانہ و عارفانہ لطائف و نکات آیات و احادیث، جو اقوال و مرویات صوفیہ سے لیے گئے ہیں یا خود اس نے پیدا کیے ہیں تاہم ان لطائف کو کیا کیجیے کہ اصل موضوع ہی سرتاسر ینبوع خرافات ہے۔

---

[1] اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ (بقرہ: ۷۹) [2] وہ گمراہ ہوئے پس وہ گمراہ ہوئے افسوس ان پر اور ان کے پیروؤں پر۔

یہ لوگ ان میں سے اکثر چیزوں کے خود موجد نہ تھے، بلکہ اپنی جماعت کے پیشرو افراد کے متبع، لیکن فارسی میں لکھ کر اور کتب مجالس و وعظ شائع کر کے ان لوگوں نے تمام موضوعات و خرافات کو ایران و ہند میں پھیلا دیا۔ چونکہ عوام بالطبع اس غذا کے خواہاں رہتے ہیں، بغیر کسی دقت کے انھیں قبول عام حاصل بھی ہو گیا والقصہ لطولہا۔

باب

میلادنبوی اور موضوع روایات

(۲)

سرچشمہ اول آپ نے جن روایات کی نسبت استفسار کیا ہے۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ان میں سے ایک واقعہ بھی ایسا نہیں، جو اصول فن حدیث کی بنا پر صحیح تسلیم کیا جا سکے اور جس کو کتب معتبرہ محدثین میں روایت کیا گیا ہو صحاح ان قصص سے خالی ہیں۔ عام مسانید و معاجم اور مصنفات مشہورہ میں بھی کوئی لائق احتجاج ثبوت نہیں ملتا۔ حافظ سیوطی نے "جمع الجوامع" میں جمع احادیث کا پورا التزام کیا ہے، لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان روایات کا اس میں بھی کہیں پتا نہیں۔ "کنز العمال" میں متعدد ابواب تھے، جہاں یہ روایات آسکتی تھیں مثلاً معجزات من قسم الاقوال کے باب اعلام و دلائل نبوت میں، لیکن ایک اثر بھی وہاں درج نہیں کیا گیا۔ قسم الافعال میں ولادت کا مستقل باب موجود ہے مگر وہ نہایت مختصر ہے اور صرف چند آثار، تاریخ و ایام ولادت کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان واقعات کا کہیں ذکر نہیں معجزات ولادت میں صرف دو چار روایتیں آنحضرتؐ کے مختون پیدا ہونے کی نسبت البتہ درج کی ہیں، لیکن وہ تمام تر ابن عساکر کی ہیں، جن کی نسبت علامہ ابن تیمیہ کہتے ہیں: "وفیہا احادیث کثیرۃ ضعیفۃ موضوعۃ وھینۃ" پھر ان سب کے راوی اول حضرت ابن عباس ہیں اور اس لیے تمام روایات ولادت کی طرح یہ روایت بھی منقطع ہے، پس قابل احتجاج نہیں۔ "کنز العمال" کے باب قسم الافعال میں دلائل و اعلام نبوت کے عنوان کے نیچے دو تین طول طویل روایتیں ابن عساکر وغیرہ سے لے کر درج کی ہیں جن میں نہایت بے سروپا قصے بیان کیے ہیں اور یقیناً یکسر موضوع ہیں۔ تاہم ان میں بھی ان واقعات ولادت کا کہیں پتا نہیں۔

روایات حافظ ابونعیم پس دراصل ان قصص کا سرچشمہ وحید اور مبدأ اول وہ تین طول طویل حدیثیں ہیں جن کو ابونعیم صاحب دلائل نے عمرو بن قتیبہ، ابن عباسؓ اور خود حضرت عباسؓ کی نسبت سے روایت کیا ہے اور یہی روایات ہیں کہ آگے چل قصاص و مجلس آرا واعظوں نے اپنی گرمی مجلس کے لیے ان کا استقبال کیا پھر تمام قصص و حکایات، کتب سیر متاخرین میں داخل ہوگئیں۔

شیخ جلال الدین سیوطی نے خصائص کبریٰ کی پہلی جلد میں ان تینوں روایتوں کو نقل کیا۔ ان میں سے ہر روایت ایک ایک صفحے کی ہے [1]

---

[1] مولانا نے ان کے بعض ٹکڑے نقل کیے ہیں۔ ہم نے پورے عربی متن حذف کر دیے ہیں اس سے اصل مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حافظ ابونعیم کی حیثیت

لیکن یہ تینوں روایتیں قطعاً بے اصل ہیں۔ وجوہ درج ذیل ہیں:

ا۔ حافظ ابونعیم پانچویں صدی کے حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ ذہبی نے انھیں تیرھویں طبقے کے ذیل میں شمار کیا ہے اور "تذکرہ"[ل] میں مفصل ترجمہ لکھا ہے۔ ان کی جلالت مرتبت سے انکار نہیں، لیکن کیا کیجیے کہ یہ ان لوگوں میں ہیں جن کی نسبت مسلّم ہے کہ فضائل معجزات میں رطب و یابس اور ضعیف و موضوع ہر طرح کی حدیثیں درج کر دیا کرتے تھے یا تو یہ حسن اعتقاد کی وجہ سے تھا یا پھر اعتماداً علی الناس کہ لوگ خود درجہ صحت و ضعف کو تحقیق کرلیں گے۔ یہاں تک کہ علامہ ابن تیمیہ کو ابوالشیخ اصفہانی کے ذکر میں لکھنا پڑا،

وفیہا احادیث کثیرہ قویہ صحیحۃ وحسنۃ واحادیث کثیرہ ضعیفہ وموضوعہ........ وکذلک مایرویہ ابونعیم فی فضائل الخلفا فی کتاب مفرد فی اول حلیۃ الاولیا۔ (کتاب التوسل[ل])

(اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی و حسن ہیں اور بہت سی ضعیف و موضوع ہیں...... یہی حال ان احادیث کا ہے جو ابونعیم نے خلفا کے فضائل میں بصورت ایک مستقل کتاب کے روایت کی ہیں حلیۃ الاولیا کی ابتدا میں)

علامہ ابن تیمیہؒ کی شہادت پر شاید بعض پرستاران سبکی و ابن حجر کی چیں بجبیں ہوں۔ مگر یہ واضح رہے کہ علامہ موصوف کے رسوخ حدیث و حفظ و ضبط و اتقان فن کا وہ ارفع و اعلیٰ مقام ہے، جس سے ان کے سخت سے سخت مخالف کو بھی کبھی انکار کی جرأت نہ ہوسکی۔ حدیث "کنت نبیا و آدم بین الماء والطین" کو علامہ موصوف نے موضوع لکھا تھا حافظ ابوالخیر (سخاوی)، ایک فتوے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس بارے میں ابن تیمیہؒ کے علم واسع اور حفظ حدیث پر اعتماد کرلینا، اعتماد کے لیے کافی ہے جس کا موافق اور مخالف دونوں کو اقرار ہے"۔

سخاوی کا یہ قول زرقانی نے "مواہب" کی شرح میں نقل کیا ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ حافظ ذہبی کا قول اس موقع پر یاد کرلینا چاہیے، جو کہتے ہیں کہ، مارایت اشد استحضاراً للمتون وعزوھا منہ وکانت السنۃ بین عینیہ ولسانہ بعبارۃ رشیقۃ وعین مفتوحۃ۔

حافظ ابونعیم کے اس تساہل، موضوعات پر سکوت اور نقل و جمع روایات میں بے احتیاطی کی شکایت صرف علامہ موصوف ہی کو نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر واضح ثبوت اس کے لیے موجود ہے۔ یہی حافظ ذہبی جنھوں نے تذکرہ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ "میزان" میں حافظ ابونعیم اور ان کے معاصر ابن مندہ کے باہمی طعن و قدح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[ل] یعنی "تذکرۃ الحفاظ" [ل] یہ رائے علامہ ابن تیمیہؒ نے "کتاب التوسل" میں ظاہر کی ہے لیکن یہ کتاب اس وقت میرے پاس موجود نہیں مولانا شبلی نے دیباچہ سیرت نبوی میں یہ عبارت نقل کی ہے اور صفحہ ۶۹ کا حوالہ دیا ہے (سیرۃ نبوی طبع اول میں یہ حوالہ صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶ پر موجود ہے)

لا اقبل قول کل منهما فی الآخر وهما عندی مقبولان لا اعلم ذنبا اکبر من روایتهما الموضوعات ساکتین علیها۔

میں ان دونوں میں سے کسی کے طعن کو دوسرے کے حق میں قبول نہیں کرتا۔ میرے نزدیک دونوں مقبول ہیں۔ مجھے ان دونوں کا گناہ اس سے بڑھ کر تو کوئی نہیں معلوم کہ وہ جھوٹی حدیثیں روایت کرتے ہیں اور اس کی نسبت سکوت اختیار کر لیتے ہیں۔

حافظ ذہبی کے نزدیک یہ غفلت ان کی مقبولیت میں خلل انداز نہیں لیکن افسوس کہ اسی خطرناک مقبولیت نے ان موضوعات وحکایات کو قوم میں پھیلا دیا، جن کی وجہ سے آج اسلام کو شرمندۂ اغیار اور ہدفِ طعنۂ مخالفین و اجانب بننا پڑتا ہے۔

سلسلہ منقطع

۲۔ اب ان روایات پر نظر ڈالیے۔ میں اس وقت یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتا کہ درایۃً ان کے مطالب کس درجہ قابلِ اعتراض و انکار ہیں، کیونکہ کہہ چکا ہوں، پہلی چیز نفسِ روایت کی صحت و عدمِ صحت ہے۔ ان روایات میں پہلی عمرو ابن قتیبہ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا "وکان من اوعیۃ العلم" انھوں نے اپنے والد کی فضیلت علمی تو بیان کر دی لیکن کچھ نہیں معلوم کہ انھوں نے یہ واقعہ کیونکر معلوم کیا اور کس اعتماد پر بیان کر رہے ہیں؟ ذکرِ ولادت کی اکثر روایتیں منقطع ہیں (یعنی واقعہ تک راوی کا سلسلہ نہیں پہنچتا) لیکن یہ روایت منقطع روایات میں بھی بدترین منقطع ہے۔ دوسری روایت کے راوی اول حضرت ابن عباسؓ ہیں لیکن ابن عباسؓ واقعہ ولادتِ نبوی کے پچاس برس بعد پیدا ہوئے ہیں۔ نہیں معلوم انھوں نے کس سے سنا۔ پھر باقی روایت کا پتا نہیں۔

تیسری روایت کا معاملہ

تیسری روایت میں خود تصریح کر دی ہے کہ "بسندٍ ضعیف" لیکن راوی کے اس انکسارِ طبع پر ہم قانع نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ روایت ضعیف ہی نہیں بلکہ سرے سے موضوع ہے۔ روایت خود حضرت عباسؓ سے ہے، جو بطور جملہ معترضہ کے آغازِ حدیث میں کہتے ہیں: ولد اخی عبداللہ وھو اصغرنا (میرا بھائی عبداللہ پیدا ہوا اور وہ ہم تمام بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا) صرف یہی جملہ معترضہ اس روایت کے موضوع ہونے کے لیے ایک محکم اندرونی شہادت ہے کیونکہ بالاتفاق یہ مسلّم ہے کہ حضرت عبداللہؓ حضرت عباسؓ سے بڑے تھے نہ کہ چھوٹے۔

حافظ ابن عبدالبرؒ "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" میں لکھتے ہیں:

عباس ابن عبدالمطلب عم رسول اللہ یکنی ابا الفضل بابنہ الفضل وکان العباس اسن من

عباسؓ بن عبدالمطلب آنحضرت کے چچا اپنے لڑکے فضل کی نسبت سے ابوالفضل کنیت رکھتے تھے ان کی عمر

رسول اللہ بسنتین وقیل بثلاث سنین۔ (کتاب مذکور جلد ۲ صفحہ ۴۹۷)

آنحضرت صلعم سے صرف دو برس زاید تھی اور بعض نے کہا کہ تین برس ہے۔

جب خود حضرت عباسؓ کی عمر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صرف دو تین برس زیادہ تھی تو وہ آپ کے والد سے کیونکر بڑے ہو سکتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ جس نادان نے یہ قصہ گھڑ کر حضرت عباسؓ کی طرف منسوب کیا ہے یا تو اس غریب کو اس کی خبر نہ تھی یا جانتا تھا اور روایت کو معتبر بنانے کے لیے قصداً یہ ٹکڑا داخل کر دیا تاکہ ضمناً ایک دوسرا مغالطہ دے کر روایت کو انقطاع سے محفوظ ثابت کر دے۔ فکفیٰ بذالک کذبہ وبہتانہ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعمہ، ومن کذب علیہ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ فی النار۔

حافظ سیوطی کی شہادت

۳۔ ایک سب سے بڑی دلیل واضح ان روایات واہیہ کے ناقابل اعتبار ہونے کی یہ ہے کہ خود حافظ ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں ان روایات کو نقل نہیں کیا[1]۔ حالانکہ اس میں ہر طرح کی ضعیف ومنکر روایتیں بلا تامل جمع کر دی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود حافظ موصوف کے نزدیک یہ روایات اس درجہ واضح طور پر موضوع تھیں کہ وہ ضعیف ومنکر روایتوں میں بھی انھیں نہ لے سکے اور باوجود ان کے مذاق میں سب سے بڑے ذخیرۂ دلائل واعلام نبوت ہونے کے مجبوراً چھوڑ دینا پڑا۔

۴۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک برہان قاطع اور شہادت واضح (جو فی الحقیقت ان روایات کے موضوع ہونے کا آخری فیصلہ کر دیتی ہے) یہ ہے کہ خود حافظ سیوطی خصائص کبریٰ میں تیسری روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ھذا الاثر والاثران قبلہ فیھا نکارۃ شدیدۃ ولم اورد فی کتابی ھذا اشد نکارۃ منھا ولم تکن نفسی تطیب بایرادھا (فتامل) لکنی تبعت الحافظ ابانعیم فی ذٰلک۔ (خصائص کبریٰ جلد ۱۔ صفحہ ۴۹)

یہ روایت اور اس سے قبل کی جو دو روایتیں ہیں تو ان میں نہایت سخت وشدید انکار وقباحت ہے اور باوجود ان کے اشد شدید انکار کے میں نے اس کتاب میں جو درج کیا تو میرا دل اس اثر کو پسند نہیں کرتا تھا مگر میں نے محض حافظ ابونعیم کی پیروی کے خیال سے ایسا کر دیا۔

حافظ سیوطی ہر طرح کی رطب ویابس روایتوں کے جمع کرنے بلکہ ان سے استدلال کر دینے میں جس درجہ بے احتیاط اور تساہل پیشہ ہیں وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں، لیکن ان روایات کی لغویت کا یہ حال تھا کہ وہ بھی باایں ہمہ تساہل چپ نہ رہ سکے اور بے اختیار ہو کر انکار شدید کے ساتھ اس کی معذرت کرنی پڑی کہ محض حافظ ابونعیم کے اتباع

---

[1] دلائل النبوۃ دائرۃ المعارف حیدرآباد میں چھپ گئی ہے۔ اس کے پہلے حصے کے صفحہ (۴۷) میں تزویج آمنہ کا پورا باب دیکھ جائیے۔ بہت سی روایات ضعیفہ وواہیہ درج ہیں مگر ان روایات کا پتا نہیں۔

کے خیال سے درج کر دیتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں کہ میرا جی نہیں چاہتا کہ ان روایتوں کو درج کروں۔ غور کیجیے کہ جن روایتوں کے درج کرنے سے حافظ سیوطی کی طبیعت بھی اعراض کرے وہ کس درجہ واہی و مزخرف ہوں گی؟

آج کل مناقب و فضائل اور واقعات و سیر میں مدعیان فن کی انتہائی سرحد حافظ سیوطی و اقرانہ ہیں، لیکن یہ کیسا دلچسپ اقرار خود حافظ موصوف کا ہے کہ میں ہر طرح واہی و منکر روایتیں لوگوں کے اتباع کے خیال سے درج کر دیتا ہوں۔ فتاملوا وتفکروا ولا تغتروا باصحاب العمائم العجراء اذ قروھا واجازوھا، ان ھم الا اصحاب اوھام وشقاشق یتقربون بہا من العوام۔

ایوان کسریٰ وغیرہ

آپ کے اکثر سوالات کا جواب ان روایات کی بحث میں آگیا۔ نیز بعض غیر مسئول امور کا بھی۔ لیکن ابھی ایک چوتھی روایت باقی ہے جس میں آتشکدۂ ایران کے بجھ جانے، قصر نوشیرواں کے کنگوروں کے گرنے، کاہنوں کے پر اسرار و عجائب اظہارات اور ایک خطبہ کہانت کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ روایت بھی پورے دو صفحے کی ہے۔ سیوطی نے "خصائص" میں اور حافظ ابونعیم نے "دلائل" میں اسے درج کیا ہے۔ اگر نقل کروں تو پورے دو کالم مطلوب ہوں (یعنی "الہلال" کے) خلاصہ مضمون یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی ولادت کی رات کسریٰ کے ایوان میں زلزلہ محسوس ہوا اس کے چودہ کنگورے گر گئے۔ ایوان کی وہ آگ جو ہزار سال سے نہیں بجھی تھی، بجھ گئی۔ بحیرۂ ساوہ خشک ہو گیا۔ نوشیرواں نے وزرا اور موبدوں کو جمع کر کے اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے بھی خواب دیکھا ہے، عرب میں کوئی انقلاب ہونے والا ہے۔ اس پر نوشیرواں نے نعمان بن منذر کے نام خط لکھا کہ عرب سے ایک ایسا شخص بھیج دو جو میرے ہر سوال کا جواب دے۔ نعمان نے عبدالمسیح نامی ایک کاہن کو بھیجا لیکن اس نے اپنے سے زیادہ عالم سطیح کاہن شام کو بتلایا اور نوشیرواں کے سوالات لے کر وہ اس کے پاس گیا۔ سطیح مرض الموت میں گرفتار تھا۔ عبدالمسیح نے کہانت آمیز اشعار پڑھے اور جب اس نے سر اٹھایا تو کہا: تھوی الی سطیح وقد اوفی علی الضریح، بعثک ملک بنی ساسان، لارتجاس الایوان وخمود النیران ورویا الموبذان، رای ابلا صحابا تقود خیلاً عرابا وغیرہ وغیرہ۔

سطیح مر گیا اور جواب کی مہلت نہ پائی[1] لیکن یہ روایت بھی قطعاً ناقابل اعتنا ہے۔ اس کا راوی اول مخزوم ابن ہانی ہے جو اپنے باپ سے روایت کرتا ہے۔ خود حافظ سیوطی یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال ابن عساکر: حدیث غریب لا نعرفہ الا من — ابن عساکر نے اس کی نسبت کہا ہے کہ حدیث غریب ہے

---

[1] پوری روایت کے لیے "دلائل النبوۃ" جلد اول صفحہ ۴۱، اور "خصائص" جلد اول صفحہ ۴۹ کو دیکھیے۔

حدیث ابن مخزوم عن ابیہ تفرد بہ ابو ایوب جس کو سوائے ابن مخزوم کے اور کسی نے روایات نہیں کیا۔ البجلی۔ (جلد اول ص ۱۰۱)

اس روایت کے واقعات بہ تغیر الفاظ و حذف و اضافۂ بعض امور فضایل و حکایات کی کتابوں میں بہ کثرت ملتے ہیں، لیکن ان سب کی بنیاد یہی روایت ہے۔ والعبرة بما یروی المحدثون، لا بما ینبدی بہ القصاصون الکاذبون[1]

---

[1] اعتبار کے لائق محدثین کرام کی روایات ہیں نہ کہ جھوٹے داستان طرازوں کی بے سروپا گپیاں۔

باب

ربیع الاول کا جشن میلاد

علم انسانیت کے لیے بشارت و شرف آزادی

مولانا لکھی ہوئی تقریروں کے عادی نہ تھے۔ انھوں نے خود ایک موقع پر فرمایا تھا کہ پیش نظر مطالب کی بنا پر کھڑا ہوجاتا ہوں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ زبان پر جاری کر دیتا ہے، تقریر ہوجاتی ہے۔ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ (جنوری ۱۹۱۶ء) کی بات ہے، کلکتہ کے کسی مجمع میں مولانا نے سیرت پر ایک تقریر فرمائی تھی، اس زمانے میں "البلاغ" جاری ہوگیا تھا اور اس کی ایک اشاعت (۱۴، ۲۱ اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۶ء) کو انھوں نے تذکار ولادت نبوی کے لیے وقف کر دیا تھا، اسی لیے غالباً یہ تقریر بھی بعد میں مرتب کرالی۔ اس سے سیرت کے بعض نہایت اہم پہلوؤں پر جو روشنی پڑتی ہے، وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں اور سیرت طیبہ کے بنیادی پہلوؤں کو کسی نے بھی آج تک اس انداز میں پیش نہیں کیا۔

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت، بہ منبر نتواں گفت [۱]

ربیع الاول کی برکات

عزیزان ملت! ماہ ربیع الاول کا ورود تمھارے لیے جشن و مسرت کا ایک پیغام عام ہوتا ہے کیونکہ تم کو یاد آجاتا ہے کہ اسی مہینے کے ابتدائی ہفتوں میں خدا کی رحمت عامہ کا دنیا میں ظہور ہوا۔ اسلام کے داعی برحق کی پیدائش سے دنیا کی دائمی غمگینیاں اور سرگشتگیاں ختم کی گئیں صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلم۔

تم خوشیوں اور مسرتوں کے ولولوں سے معمور ہو جاتے ہو، تمھارے اندر خدا کے رسول برحق کی محبت و شیفتگی ایک بے خودانہ جوش و محویت پیدا کر دیتی ہے۔ تم اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اسی کی یاد میں، اسی کے

---

[۱] میرزا غالب کا شعر ہے۔

تذکرے میں اور اسی محبت کے لذت و سرور میں بسر کرنا چاہتے ہو۔

تم اس کے ذکر و فکر کی مجلسیں منعقد کرتے ہو، ان کی آرائش و زینت میں اپنی محبت و مشقت کی کمائی بے دریغ لٹاتے ہو۔ خوشبودار اور تر و تازہ پھولوں کے گلدستے سجاتے ہو۔ کافوری شمعوں کے خوبصورت فانوس اور برقی روشنی کے بہ کثرت کنول روشن کرتے ہو، عطر و گلاب کی مہک اور اگر کی تبیوں کا بخور جب ایوان مجلس کو اچھی طرح معطر کر دیتا ہے تو اس وقت مدح و ثنا کے زمزموں اور درود و سلام کے مقدس ترانوں کے اندر اپنے محبوب و مطلوب مقدس کی یاد کو ڈھونڈتے ہو اور بسا اوقات تمہاری آنکھوں کے آنسو اور تمہارے پُر محبت دلوں کی آہیں اس کے اسم مبارک سے والہانہ عشق اور اس کے عشق سے حیات روحانی حاصل کرتی ہیں۔

پس کیا مبارک ہیں وہ دل، جنھوں نے اپنے عشق و شیفتگی کے لیے رب السموات و الارض کے محبوب کو چنا اور کیا پاک و مطہر ہیں وہ زبانیں جو سید المرسلین و رحمۃ للعٰلمین کی مدح و ثنا میں زمزمہ سنج ہوئیں:

مصلحت دید من آن است کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

انھوں نے اپنے عشق و شیفتگی کے لیے اس کی محبوبیت کو دیکھا، جسے خود خدا نے اپنی چاہتوں اور محبتوں سے چنا، کیا اور ان کی زبانوں نے اس کی مدح و ثنا کی، جس کی مدح و ثنا میں خود خدا کی زبان، اس کے ملائکہ اور قدوسیوں کی زبان اور کائنات ارض کی تمام پاک روحوں اور سعید ہستیوں کی زبان، ان کی شریک و ہم نوا ہے: ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی، یایہا الذین اٰمنوا، صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔[۱]

کائنات ہستی کی محبوبیت اعلیٰ

بلا شبہ محبت نبوی اور عشق محمدی کے یہ پاک ولولے اور یہ مخلصانہ ذوق و شوق تمہاری زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے اور تم اپنے ان پاک جذبات کی جتنی بھی حفاظت کرو، کم ہے۔ تمہارا یہ عشق الٰہی ہے، تمہاری یہ محبت ربانی ہے، تمہاری یہ شیفتگی انسانی سعادات اور راست بازی کا سرچشمہ ہے، تم اس وجود مقدس و مطہر سے محبت رکھتے ہو جس کو تمام کائنات انسانی میں سے تمہارے خدا نے ہر طرح کی محبوبیتوں اور ہر قسم کی محمودیتوں کے لیے چن لیا اور محبوبیت عالم کا خلعت اعلیٰ صرف اسی کے وجود اقدس پر راست آیا۔ کرۂ ارض کی سطح پر انسان کے لیے بڑی سے بڑی بات جو کہی جا سکتی ہے زیادہ سے زیادہ عشق جو کیا جا سکتا ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ مدح و ثنا جو زبان پر آ سکتی ہے، غرض انسان کی زبان، انسان کے لیے جو کچھ کہہ سکتی اور کر سکتی ہے، وہ سب کا سب صرف اسی ایک انسان کامل و اکمل کے لیے ہے اور اس کا

---

[۱] اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اس پر صلوٰۃ بھیجو اور سلام بھیجو، اچھا سلام۔ (الاحزاب: ۵۶)

مستحق اس کے سوا کوئی نہیں؛

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد[1]

وللہ درما قال؛

عباراتنا شتی وحسنك واحد
وکل الی ذاك الجمال یشیر

عبودیّت کبریٰ

خدا کی الوہیت و ربوبیت جس طرح وحدہٗ لاشریک ہے کہ کوئی ہستی اس کی شریک نہیں، اسی طرح اس انسان کامل کی انسانیت اعلیٰ اور عبدیت کبریٰ بھی وحدہٗ لاشریک ہے کیونکہ اس کی انسانیت و عبدیت میں کوئی اس کا ساجھی نہیں اور اس کے حسن و جمال فردانیت کا کوئی شریک نہیں؛

منزہ عن شریک فی محاسنہ
فی جوہر الحسن فیہ غیر منقسم[2]

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں تم دیکھتے ہو کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر جہاں کہیں کیا گیا، وہاں ان سب کو ان کے ناموں سے پکارا ہے اور ان کے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے تو ان کے ناموں کے ساتھ کیا ہے لیکن اس انسان کامل، اس فرد اکمل، اس صفات عبدیہ کے وحدہٗ لاشریک کا اکثر مقامات میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ نہ تو اس کا نام لیا گیا، نہ ہی کسی دوسرے وصف سے نامزد کیا گیا، بلکہ صرف "عبد" کے لفظ سے اس کے پروردگار نے اسے یاد فرمایا؛

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی۔

کیا پاک ہے وہ خداوند قدوس جس نے ایک رات اپنے "عبد" کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔

سورہ جن میں فرمایا؛

وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا۔ (سورۃ جن: ۱۹)

اور جب اللہ کا بندہ (عبد) تبلیغ حق کے لیے کھڑا ہوتا ہے تاکہ اللہ کو پکارے تو کفار اس کو اس طرح گھیر لیتے ہیں گویا قریب ہے کہ اس پر آگریں گے۔

سورہ کہف کو اس آیت سے شروع کیا؛

---

[1] میرزا غالب کا شعر ہے۔ [2] اس کے ترجمے کے لیے دیکھیے "مقدمہ" تیسرا باب۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ ۔ (سورہ کہف : ۱)

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے "عبد" پر کتاب اتاری۔

سورہ فرقان کی پہلی آیت ہے :

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۔

کیا ہی پاک ذات ہے اس کی جس نے "الفرقان" اپنے عبد پر اتارا تاکہ وہ تمام عالم کی ضلالتوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔

اسی طرح سورہ نجم میں کہا،

فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی [1]

حدید میں کہا :

ینزل علٰی عبدہٖ آیات [2]

پس ان تمام مقامات میں آپ کا اسم گرامی نہیں لیا، بلکہ اس کی جگہ صرف "عبد" فرمایا، حالانکہ بعض دیگر انبیاء کے لیے اگر "عبد" کا لفظ فرمایا ہے تو اس کے ساتھ نام کی تصریح بھی کر دی ہے۔ سورہ مریم میں حضرت زکریا کے لیے فرمایا : ذکر رحمۃ ربک عبدہ زکریا [3] - سورہ ص میں کہا، واذکر عبدنا داؤد [4] - نیز واذکر عبدنا ایوب [5] -

خصوصیت و امتیاز

اس خصوصیت و امتیاز سے اسی حقیقت کو واضح کرنا مقصود الٰہی تھا کہ اس وجود گرامی کی عبدیت اور بندگی اس درجۂ آخری و مرتبۂ قصوئی تک پہنچ چکی ہے، جو انسانیت کی انتہا ہے اور جس میں اور کوئی عبد اس عبد کامل کا شریک و سہیم نہیں۔ پس عبدیت کا فرد کامل وہی ہے اور اس لیے بغیر اضافت و نسبت کے صرف "عبد" کا لقب اس کو ناموں اور علموں کی طرح پہنچا دیتا ہے کیونکہ تمام کائنات ہستی میں اس کا سا اور کوئی عبد نہیں۔

پس یہ وہ تھا کہ اس کے صفات الٰہیہ کا یہ حال رہا ہے، اس کی انسانیت و عبدیت کی وحدت اس طرح فرمانفرمائے جمیع کائنات ہے، اس کی محبت و محبوبیت کا خود رب السموات والارض نے اعلان کیا اور اس کی رحمت کو اپنی ربوبیت کی طرح تمام عالمین پر محیط کر دیا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات رافت و رحمت سے متصف فرمایا اور اگر اپنے آپ کو "الرحمٰن الرحیم" کہا تو اسے بھی بالمومنین رؤف الرحیم قرار دیا۔ اسے تمام قرآن حکیم میں کبھی بھی نام لے کر نہ پکارا بلکہ کبھی صدائے عزت سے نوازا کہ یا ایہا الرسول اور کبھی

---

[1] سورۃ نجم : ۱۰ [2] سورۃ حدید : ۹ [3] سورۃ مریم : ۲ [4] سورہ ص : ۱۷ [5] سورہ ص : ۴۱

طریقِ محبت سے پکارا کر یا ایہا المزمل! اس کے وجود با جود کی عزت وعظمت کو اپنی عزت کی طرح اپنے بندوں پر فرض کر دیا اور جابجا حکم دیا کہ تعزروہ وتوقروہ (اس کی عزت کرو اور اس کی توقیر بجا لاؤ) پھر وہ کہ اس کی محبوبیتوں اور عظمتوں کا یہ حال تھا کہ اس کا وجود مقدس و اطہر تو بڑی چیز ہے، وہ جس آبادی میں بسا اور جس شہر کی گلیوں میں چلا پھرا، اس کی عزت کو بھی خدا سے زمین و آسمان نے تمام عالم میں نمایاں کیا:

لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ ہم مکہ کی قسم کھاتے ہیں مگر اس لیے کہ تیرا وجود اس کی سرزمین میں رہا اور بسا ہے۔ (البلد: ۱)

ومن مذھبی حب الدیار لاھلھا

وللناس فیما یعشقون مذاھب

پس جس کی قدوسیت وجبروتیت کا یہ مرتبہ ہو، اس کی یاد میں جتنی گھڑیاں بھی کٹ جائیں، اس کے عشق میں جتنے آنسو بھی بہہ جائیں، اس کی محبت میں جتنی آہیں بھی نکل جائیں اور اس کی مدح وثنا میں جس قدر بھی زبانیں زمزمہ پیرا ہوں، انسانیت کا حاصل، رُوح کی سعادت، دل کی طہارت، زندگی کی پاکی اور ربانیت والٰہیت کی پادشاہی ہے۔ وللہ درما قال۔

راہ تو بہ ہر قدم کہ پویند خوش است

وصل تو بہ ہر سبب کہ جویند خوش است

روے تو بہ ہر دیدہ کہ بینند نکوست

نام تو بہ ہر زباں کہ گویند خوش است

جشنِ حصول اور ماتمِ ضیاع

لیکن جب کہ تم اس ماہِ مبارک میں یہ سب کچھ کرتے ہو اور اس ماہ کے واقعۂ ولادت کی یاد میں خوشیاں مناتے ہو تو اس کی مسرتوں کے اندر تمھیں کبھی اپنا وہ ماتم بھی یاد آتا ہے جس کے بغیر اب تمھاری کوئی خوشی نہیں ہوسکتی؟ کبھی تم نے اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ یہ کس کی پیدائش ہے جس کی یاد کے لیے تم سروسامان کرتے ہو؟ یہ کون تھا جس کی ولادت کے تذکرے میں تمھارے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا ایسا عزیز پیام ہے؟

آہ! اگر اس مہینے کی آمد تمھارے لیے جشن ومسرت کا پیام ہے، کیونکہ اسی مہینے میں وہ آیا جس نے ہمیں سب کچھ دیا تھا، تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کسی مہینے میں ماتم نہیں، کیونکہ اس مہینے میں پیدا ہونے والے نے جو کچھ ہمیں دیا تھا، وہ سب ہم نے کھو دیا۔ اس لیے اگر یہ ماہ ایک طرف بخشنے والے کی یاد تازہ کرتا ہے تو دوسری طرف کھونے والوں کے زخم کو بھی تازہ ہو جانا چاہیے:

ماخانہ رسیدگان ظلمیم

پیغام خوش از دیار رہانیست

مجلسیں روشن اور دل تاریک تم اپنے گھروں کو مجلسوں سے آباد کرتے ہو، مگر تمھیں اپنے دل کی اجڑی ہوئی بستی کی بھی کچھ خبر ہے؟ تم کافوری شمعوں کی قندیلیں روشن کرتے ہو، مگر اپنے دل کی اندھیاری کو دُور کرنے کے لیے کوئی چراغ نہیں ڈھونڈتے۔ تم پھولوں کے گلدستے سجاتے ہو، مگر آہ، تمھارے اعمالِ حسنہ کا پھول مرجھا گیا ہے۔ تم گلاب کے چھینٹوں سے اپنے رومال و آستین کو معطر کرنا چاہتے ہو، مگر آہ! تمھاری غفلت کہ تمھاری عظمت اسلامی کی عطر بیزی سے دنیا کے مشام روح یکسر محروم ہیں! کاش تمھاری مجلسیں تاریک ہوتیں۔ تمھارے اینٹ اور چونے کے مکانوں کو زیب و زینت کا ایک ذرہ نصیب نہ ہوتا، تمھاری آنکھیں رات رات بھر مجلس آرائیوں میں نہ جاگتیں، تمھاری زبانوں سے ماہ ربیع الاول کی ولادت کے لیے دنیا کچھ نہ سنتی، مگر تمھاری روح کی آبادی معمور ہوتی، تمھاری زبانوں سے نہیں مگر تمھارے اعمال کے اندر سے اسوۂ حسنۂ نبوی کی مدح و ثنا کے لیے ترانے اٹھتے: فانها لا تعمى الا بصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور[1]

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ، تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

پھر آہ وہ قوم، اور صد آہ اس قوم کی غفلت و نادانی، جس کے لیے ہر جشن و مسرت میں پیام ماتم ہے اور جس کی حیات قومی کا ہر قہقہۂ عیش، فغانِ حسرت ہو گیا ہے، مگر نہ تو ماضی کی عظمتوں میں اس کے لیے کوئی منظر عبرت ہے، نہ حال کے واقعات و حوادث میں کوئی پیام تنبّہ و ہوشیاری ہے اور نہ وہ مستقبل کی تاریکیوں میں زندگی کی کوئی روشنی اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اسے اپنی کامجوئیوں اور جشن و مسرت کی بزم آرائیوں سے مہلت نہیں، حالانکہ اس کے جشن و طرب کے ہر دور میں ایک نہ ایک پیام ماتم و عبرت بھی رکھ دیا گیا ہے، بشرطیکہ آنکھیں دیکھیں، کان سنیں اور دل کی دانائی غفلت و سرشاری نے چھین نہ لی ہو: ان في ذلك لذكرى لمن كان له قلب او القى السمع وهو شهيد[2]

ظہور و مقصد ظہور ماہ ربیع الاول کی یاد میں ہمارے لیے جشن و مسرت کا پیام اس لیے تھا کہ اسی مہینے میں خدا کا وہ فرمان رحمت دنیا میں آیا جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرمان کا موسم بدل دیا، ظلم و طغیان اور فساد و عصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں۔ خدا اور اس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔ انسانی اخوت و مساوات

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے تو آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں پوشیدہ ہیں (حج ۴۶)

[2] یقیناً اس میں اس کے لیے نعمت ہے جس کا دل ہے درانحالیکہ وہ کان لگاتا ہے اور اس کا دل حاضر ہے (سورہ ق: ۳۷)

کی یگانگت نے دشمنیوں اور کینوں کو نابود کر دیا اور کلمۂ کفر و ضلالت کی جگہ کلمۂ حق و عدالت کی بادشاہت کا اعلان عام ہُوا:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ، يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (مائدہ ۱۵-۱۶)

اللہ کی طرف سے تمھاری جانب ایک نور ہدایت اور کتاب مبین آئی۔ اللہ اس کے ذریعے سے اپنی رضا چاہنے والوں کو سلامتی اور زندگی کی راہوں پر ہدایت کرتا اور ان کے آگے صراط مستقیم کھولتا ہے۔

لیکن دنیا شقاوت و حرمان کے دروسے پھر دکھیا ہوگئی۔ انسانی شر و فساد اور ظلم و طغیان کی تاریکی خدا کی روشنی پر غالب ہونے کے لیے پھیل گئی، سچائی اور راستبازی کی کھیتیوں نے پامالی پائی اور انسانوں کے بے راہ گلے کا کوئی رکھوالا نہ رہا۔ خدا کی وہ زمین جو صرف خدا ہی کے لیے تھی، غیروں کو دے دی گئی اور اس کے کلمۂ حق و عدل کے غمگساروں اور ساتھیوں سے اس کی سطح خالی ہوگئی،

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ۔ (روم : ۴۱)

زمین کی خشکی اور تری دونوں میں انسان کی پیدا کی ہوئی شرارتوں سے فساد پھیل گیا اور زمین کی صلاح و فلاح غارت ہوگئی۔

پھر آہ! تم اس کے آنے کی خوشیاں تو مناتے ہو، پر اس کے ظہور کے مقصد سے غافل ہوگئے ہو اور وہ جس غرض کے لیے آیا تھا، اس کے لیے تمھارے اندر کوئی ٹیس اور چبھن نہیں۔

یہ ماہ ربیع الاول اگر تمھارے لیے خوشیوں کی بہار ہے، تو صرف اس لیے کہ اس مہینے میں دنیا کی خزانِ ضلالت ختم ہوئی اور کلمۂ حق کا موسم ربیع شروع ہوا۔ پھر اگر آج دنیا کی عدالت سموم ضلالت کے جھونکوں سے مرجھا گئی ہے تو اسے غفلت پرستو! تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ بہار کی خوشیوں کی رسم تو مناتے ہو مگر خزاں کی پامالیوں پر نہیں روتے؟

باب ۹

ماہ ربیع الاول اور یادگار حسرت

آتشین شریعت

اسس موسم کی خوشیاں اس لیے تھیں کہ اسی ماہ میں اللہ کی عدالت کی وہ "آتشیں شریعت" کوہ فاران پر نمودار ہوئی، جس کی خبر سعیر کی چوٹیوں پر صاحب تورات کو دی گئی تھی اور جو مظلومی کے آنسو بہانے، مسکینی کی آہیں نکالنے، ذلت و نامرادی سے ٹھکرائے جانے کے لیے دنیا میں نہیں آئی تھی بلکہ اس لیے آئی تھی کہ اعدائے حق و عدالت ناکامی کے آنسو بہائیں، دشمنانِ الٰہی مسکینی کے لیے چھوڑ دیے جائیں، ضلالت و شقاوت، نامرادی و ناکامی کی ذلت سے ٹھکرائی جائے، سچائی اور راستی کا عرش عظمت و اجلال نصرتِ الٰہی کی کامرانیوں اور اقبال و فیروزی کی فتحمندیوں کے ساتھ تمام کائنات ارضی میں اپنی جبروتیت و قدوسیت کا اعلان کرے۔ پس وہ اللہ کے ہاتھوں کی چمکائی ہوئی ایک تلوار تھی، جس کی ہیبت و قہاریت نے باطل پرستی کی تمام طاقتوں کو لرزا دیا۔ دنیا کو کلمۂ حق کی بادشاہت اور دائمی فتح کی بشارت سنائی۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (توبہ: ۳۳)

وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کو دنیا کی سعادت کے قیام اور ضلالت کی مقہوریت کے لیے دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ تمام دینوں پر اسے غالب کر دے۔ پس اسس کی حقانیت کی طاقت ہی آخر میں دائمی اور عام فتح پانے والی ہے اگرچہ مشرکوں پر ایسا ہونا بہت ہی شاق گزرے۔

مراد کی بشارت اور کامیابی کی بہار

وہ ذلت کا زخم نہ تھا، بلکہ نامرادی کا زخم لگانے والا ہاتھ تھا۔ وہ مظلومی کی تڑپ نہ تھی بلکہ ظلم کو تڑپانے والی شمشیر تھی۔ وہ مسکینی کی بے قراری نہ تھی، بلکہ دنیا کو بے قرار کرنے والوں نے اس سے بے قراری پائی۔ وہ درد و کرب کی کروٹ نہ تھی بلکہ درد و کرب میں مبتلا کرنے والوں کو اس سے بے چینی کا بستر ملا۔ وہ جو کچھ لایا اس میں غمگینی کی چیخ نہ تھی، ماتم کی آہ نہ تھی، ناتوانی کی بے لبسی نہ تھی۔ حسرت و مایوسی کے آنسو نہ تھے بلکہ یکسر شادمانی کا غلغلہ تھا، جشن و مراد کی بشارت تھی۔ کامیابی و عیش فرمائی کی بہار تھی، طاقت اور فرمانفرمائی کا اقبال تھا۔ امید اور یقین کا خندۂ عیش تھا، زندگی اور فیروزمندی کا پیکر و تمثال تھا، فتح مندی کی ہمیشگی تھی اور نصرت و کامرانی کا دوام:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ

اللہ کے وہ صالح بندے جنھوں نے دنیا کی تمام طاقتوں سے

عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ـ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ـ (حٰم سجدہ: ۳۰-۳۱)

سے کٹ کر کہا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں، پھر ساتھ ہی اس پر جم گئے اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنی خدا پرستی کو قایم کیا، سو یہ وہ لوگ ہیں کہ کامرانی و فتح مندی کے لیے خدا نے ان کو چن لیا ہے۔ وہ اپنے ملائکہ نصرت کو ان پر بھیجتا ہے جو ہر دم پیام شادمانی و کامیابی پہنچاتے ہیں کہ نہ تو تمھارے لیے خوف ہے اور نہ کسی طرح کی غمگینی۔ دنیا کی زندگی میں بھی تم خدا کی نصرت و حمایت سے فتح مند و کامیاب ہو گے اور آخرت میں بھی خدا کی مہربانیوں سے بامراد۔ اللہ کی تمام نعمتیں صرف تمھارے ہی لیے ہیں تم جو نعمت چاہو گے تمھیں ملے گی اور جس چیز کو پکارو گے پاؤ گے۔

لا تھنوا و لا تحزنوا

کیونکہ وہ جو ربیع الاول میں آیا، اس نے کہا کہ غم اور ناکامی ان کے لیے ہونی چاہیے، جن کے پاس کامیابی و نصرت بخشنے والے کا رشتہ نہیں، پر وہ جنھوں نے تمام انسانی اور دنیوی طاقتوں سے سرکشی کر کے صرف خدا کی قدوس طاقت کے ساتھ وفاداری کی اور اس ذات کو اپنا دوست بنا لیا جو ساری خوشیوں کا دینے والا اور تمام کامیابیوں کا سرچشمہ ہے تو وہ کیونکر غمگینی پا سکتے ہیں اور خدا کے دوستوں کے ساتھ اس کی زمین میں کون ہے جو دشمنی کر سکتا ہے؛

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ـ (محمد: ۱۱)

اس لیے کہ اللہ مومنوں کا دوست اور حامی ہے، مگر جنھوں نے اس سے انکار کیا، ان کے لیے کوئی دوست، حامی اور سازگار نہیں۔

جن پاک روحوں نے خدا کی سچائی اور کلمۂ حق و عدل کی خدمت گزاری کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، وہ کسی سے نہیں ڈر سکتے، البتہ ان کی ہیبت و قہاریت سے دنیا کو ڈرنا چاہیے؛

فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ـ (آل عمران: ۱۷۵)

دشمنانِ حق کی شیطانی ہیبتوں سے نہ ڈرو، اللہ سے ڈرو اگر فی الحقیقت تم مومن ہو۔

خدا پر ایمان اور انسان کا خوف

دنیا میں متضاد سے متضاد اجزا باہم جمع ہو سکتے ہیں۔ آگ اور پانی ممکن ہے ایک جگہ جمع ہو جائیں، شیر اور بکری ہو سکتا ہے ایک گھاٹ سے پانی پی لیں، لیکن خدا کا "ایمان" اور "انسان کا خوف" یہ دو چیزیں ایسی متضاد ہیں جو کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

اگر ایک بدبخت، ایمان الٰہی کا دعویٰ کر کے انسان کے ڈر سے بھی کانپ رہا ہے تو تم اسے ان کنکروں اور پتھروں کی طرح ٹھکرا دو جو انسان کی راہ میں لڑھک کر آجاتے ہیں تاکہ دوڑنے والوں کے لیے ٹھوکر بنیں کیونکہ وہ ایمان کے یقین سے محروم ہے:

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (آل عمران: ۱۳۹)

نہ ہراساں ہو اور نہ غمگین ہو، تمھیں سب پر غالب آنیوالے ہو اگر تم سچے مومن ہو۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (یونس: ۶۲)

یاد رکھو کہ جو لوگ اللہ کے دوست اور اس کے چاہنے والے ہیں، ان کے لیے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ کبھی وہ غمگین ہوں گے۔

استبدال نعمت

لیکن آج جبکہ تم عید میلاد کی مجلسیں منعقد کرتے ہو، تو تمھارا کیا حال ہے؟ وہ تمھاری دولت کہاں ہے جو تمھیں دی گئی تھی؟ وہ تمھاری نعمت کامرانی کدھر گئی جو تمھیں سونپی گئی تھی؟ وہ تمھاری روح حیات کیوں تمھیں چھوڑ کر چلی گئی، جو تم میں پھونکی گئی تھی؟ آہ! تمھارا خدا تم سے کیوں روٹھ گیا؟ تمھارے آقا نے کیوں تم کو صرف اپنی ہی غلامی کے لیے نہ رکھا؛ کیا ربیع الاول میں آنے والے نے خدا کا وعدہ نہیں پہنچایا تھا کہ عزت صرف تمھارے ہی لیے ہے۔ اور اس دولت کا اب زمین پر تمھارے سوا کوئی وارث نہیں؟

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (منافقون: ۸)

عزت اللہ کے لیے ہے، اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے، لیکن جن کے دل نفاق میں کھوئے گئے، وہ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

پھر یہ کیسا انقلاب ہے کہ تم ذلت کے لیے چھوڑ دیے گئے ہو اور عزت نے تم سے منہ چھپا لیا ہے؟ کیا خدا کا وعدۂ نصرت تم تک نہیں پہنچایا گیا تھا کہ:

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (روم: ۴۷)

مسلمانوں کو نصرت و فتح دینا ہمارے لیے ضروری ہے (یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ہم غیروں کو فتح یاب کریں اور مومن ناکام رہ جائیں)

غفلت و بدعملی

پھر یہ کیوں ہے کہ تم نے کامیابی نہ پائی اور کام و مراد نے تمھارا ساتھ چھوڑ دیا؛ کیا خدا کا وعدہ سچا نہ تھا؟ اور کیا وہ اپنے قول کا پکا نہیں کہ تم جو انسانوں کے وعدوں پر ایمان رکھتے اور ان کے حکموں کے آگے گرنا جانتے ہو۔ خدا کے وعدۂ لایخلف المیعاد کے لیے اپنے اندر ایمان کی کوئی صدا نہیں پاتے؛ آہ! نہ تو اس کا وعدہ جھوٹا تھا اور نہ اس نے اپنا رشتہ توڑا، مگر تم ہی ہو، تمھاری ہی محرومی و بے وفائی ہے۔ تمھارے ہی ایمان کی موت اور راستی کی حرمانی ہے، جس نے اپنا پیمان وفا توڑا اور خدا کے مقدس رشتے کی عزت کو اپنی غفلت و بد اعمالی اور غیروں کی

کی پرستش و بندگی سے ہٹا لگایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (انفال: ۵۳)

اس لیے کہ خدا کبھی کسی قوم کی نعمت کو محرومی سے نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود ہی اپنے اندر تبدیلی نہ کر دے اس لیے بھی کہ اللہ (سب کی) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے۔

خدا اب بھی غیروں کے لیے نہیں، بلکہ صرف تمھارے لیے ہے، بشرطیکہ تم بھی غیروں کے لیے نہیں بلکہ صرف خدا ہی کے لیے ہو جاؤ:

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۔ (محمد: ۷)

اگر تم خدا کے کلمۂ حق کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمھاری مدد کریگا اور تمھارے اندر ثابت قدمی اور مضبوطی پیدا کر دے گا۔

یادگارِ حریت

تم ربیع الاول میں آنے والے کی یاد اور محبت کا دعویٰ رکھتے ہو اور مجلسیں منعقد کر کے اس کی مدح و ثنا کی صدائیں بلند کرتے ہو، لیکن تمھیں کبھی یہ یاد نہیں آتا کہ جس کی یاد کا تمھاری زبان دعویٰ کرتی ہے، اس کی فراموشی کے لیے تمھارا ہر عمل گواہ ہے اور جس کی مدح و ثنا میں تمھاری صدائیں زمزمہ سرا ہوتی ہیں، اس کی عزت کو تمھارا وجود بٹا لگا رہا ہے؟ وہ دنیا میں اس لیے آیا تھا کہ انسانوں کو انسانی بندگی سے ہٹا کر صرف اللہ کی عبودیت کے صراطِ مستقیم پر چلائے اور غلامی کی ان تمام زنجیروں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دے جن کے بڑے بڑے بوجھل حلقے انھوں نے اپنے پاؤں میں ڈال لیے تھے:

يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (الاعراف: ۱۵۷)

پیغمبر اسلام کے ظہور کا مقصد یہ ہے کہ گرفتاریوں اور بندشوں سے انسان کو نجات دلا دے اور غلامی کے جو طوق انھوں نے اپنی گردنوں میں پہن رکھے ہیں، ان کے بوجھ سے رہائی بخشے۔

صرف خدا کی اطاعت

اس نے کہا کہ اطاعت صرف ایک ہی ہے اور حکم و فرمان صرف ایک ہی کے لیے سزاوار ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (یوسف: ۴۰)

حکم و طاقت کسی کے لیے نہیں مگر صرف اللہ کے لیے۔

اس نے سب سے پہلے انسان کو اس کی چھنی ہوئی آزادی و حریت واپس دلائی اور کہا کہ مومن نہ تو بادشاہوں کی غلامی کے لیے ہے، نہ کاہنوں کی اطاعت کے لیے، نہ کسی اور انسانی طاقت کے آگے جھکنے کے لیے، بلکہ اس کے سر کے لیے ایک ہی چوکھٹ، اس کے دل کے لیے ایک ہی عشق، اس کے پاؤں کے لیے ایک ہی زنجیر اور اس کی گردن کے لیے ایک ہی طوقِ اطاعت ہے۔ وہ جھکتا ہے تو اسی کے آگے، روتا ہے تو اسی کے لیے، اعتماد کرتا ہے تو اسی کی ذات پر، ڈرتا اور لرزتا ہے تو اسی کی ہیبت سے، امید کرتا ہے تو اسی کی رحمت پر۔ وہ مشرک نہیں کہ خدا کی

طرح انسانوں کو بھی ہیبت اور قہاریت کی صفت بخشے:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؟ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

(یوسف: ۳۹-۴۰)

پرستش اور غلامی کے لیے کئی ایک معبود بنا لینا اچھا یا ایک ہی خدائے واحد و قہار کا ہو رہنا؟ یہ جو تم نے اپنی بندگی کے لیے بہت سی چوکھٹیں بنا رکھی ہیں، تو بتلاؤ ان کی ہستی بجز اس کے کیا ہے کہ چند وہم ساز نام ہیں جو تم نے اور تمھارے بڑوں نے اپنی گمراہی سے گھڑ لیے اور مدت کی ضلالت و رسم پرستی نے ان کے اندر مصنوعی ہیبت و مرعوبیت پیدا کر دی حالانکہ خدا نے نہ تو ان کے اندر کوئی طاقت رکھی اور نہ ان کی معبودیت و محبوبیت کے لیے کوئی حکم اتارا۔ یقین کرو کہ تمھاری غلامی کے یہ تمام مصنوعی بت کچھ بھی نہیں۔ حکم و سلطانی دنیا میں نہیں مگر صرف اللہ کے لیے، اس نے حکم دیا کہ پرستش نہ کرو مگر صرف اسی کی یہی انسان کی فطرت صالحہ کی راہ ہے اور اسی لیے یہی دین قیم ہے۔

ایک سبق آموز مثال

اور دیکھو کہ اس نے انسان کی حریت صادقہ اور آزادی حق کو کس طرح مثالوں کی دانائی میں سمجھایا:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ۔

(النحل: ۷۴)

اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ یوں فرض کرو کہ ایک شخص ہے جو کسی دوسرے انسان کا غلام ہے۔ خود اسے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ وہ اپنی کسی چیز پر باوجودیکہ اسی کی ہے، کچھ قدرت نہیں رکھتا اور صرف اپنے آقا کے حکموں کا بندہ ہے! مگر اس کے مقابلے میں ایک دوسرا آزاد و خود مختار انسان ہے جس پر کسی انسان کی حکومت نہیں، اسے اپنی ہر چیز پر قدرت و اختیار حاصل ہے اور جو کچھ خدا نے دیا ہے، وہ اسے ظاہر و پوشیدہ، جس طرح چاہتا ہے، بے دھڑک خرچ کرتا ہے تو کیا یہ دونوں آدمی ایک ہی طرح کے ہوئے؟ کیا دونوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں؟ اگر فرق ہے تو پھر وہ کہ اس کا

مالک صرف خدا ہی ہے اور وہ کہ اس کے گلے میں انسانوں کی
اطاعت کے طوق پڑے ہوئے ہیں، دونوں ایک طرح کے
کیسے ہو سکتے ہیں؟

ربیع الاولٰی کی اصل خوشی

پس اگر ربیع الاول کا مہینا دنیا کے لیے خوشی اور مسرت کا مہینا تھا تو صرف اس لیے کہ اسی مہینے میں دنیا کا وہ سب سے بڑا انسان آیا جس نے مسلمانوں کو ان کی سب سے بڑی نعمت یعنی "خدا کی بندگی اور انسانوں کی آقائی" عطا فرمائی اور اس کو اللہ کی خلافت و نیابت کا لقب دے کر خدا کی ایک پاک و محترم امانت ٹھہرایا۔ پس ربیع الاول انسانی حریت کی پیدائش کا مہینا ہے۔ غلامی کی موت اور ہلاکت کی یادگار ہے، خلافت الٰہی کی بخشش کا اولین یوم ہے، وراثت ارضی کی تقسیم کا اولین اعلان ہے۔ اسی ماہ میں کلمۂ حق و عدل زندہ ہوا اور اسی میں کلمۂ ظلم و فساد اور کفر و ضلالت کی لعنت سے خدا کی زمین کو نجات ملی۔

تم کیا ہو؟

لیکن، آہ! تم کہ اس ماہ حریت کے درود کی خوشیاں مناتے ہو اور اس کے لیے ایسی طیاریاں کرتے ہو گویا وہ تمہارے ہی لیے اور تمہاری ہی خوشیوں کے لیے آیا ہے، خدارا مجھے بتلاؤ کہ تم کو اس پاک اور مقدس یادگار کی خوشی منانے کا کیا حق ہے؟ کیا موت اور ہلاکی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ زندگی اور روح کو اپنا ساتھی بنائے؟ کیا ایک مردہ لاش پر دنیا کی عقلیں نہ ہنسیں گی اگر وہ زندوں کی طرح زندگی کو یاد کرے گی؟ ہاں یہ سچ ہے کہ آفتاب کی روشنی کے اندر دنیا کے لیے بڑی ہی خوشی ہے، لیکن ایک اندھے کو کب زیب دیتا ہے کہ وہ آفتاب کے نکلنے پر آنکھوں والوں کی طرح خوشیاں منائے؟

پھر تم بتلاؤ کہ تم کون ہو؟ تم غلاموں کا ایک گلہ ہو جس نے اپنے نفس کی غلامی، اپنی خواہشوں کی غلامی، ماسوا اللہ کے رشتوں کی غلامی، اور غیر الٰہی طاقتوں کی غلامی کی زنجیروں سے اپنی گردن کو چھپا دیا ہے۔ تم پتھروں کا ایک ڈھیر ہو جو نہ تو خود ہل سکتا ہے اور نہ اس میں جان اور رُوح ہے، البتہ چُور چُور ہو سکتا اور ایک دوسرے پر پٹکا جا سکتا ہے تم غبار راہ کی ایک مٹھی ہو، جس کو ہوا اڑا لے جائے تو اڑ سکتی ہے، ورنہ وہ خود صرف اس لیے ہے کہ ٹھوکروں سے روندی جائے اور جولانِ قدم سے پامال کی جائے۔

ویا للمصیبۃ!

گلگونۂ عارض ہے، نہ ہے رنگِ حنا تو
اے خوں شدہ دل، تو تو کسی کام نہ آیا

غفلت و بے خبری کی انتہا

پھر اے غفلت کی ہستیو! اور اے بے خبری کی سرگشتۂ خواب روحو! تم کس منہ سے اس کی پیدائش کی خوشیاں مناتے ہو جو حریت انسانی کی بخشش، حیات روحی و

معنوی کے عطیے اور کامرانی و فیروزمندی کی خسروی و ملوکی کے لیے آیا تھا؟ اللہ اللہ غفلت کی نیرنگی اور انقلاب کی بوقلمونی! ماسوا اللہ کی عبودیت کی زنجیریں پاؤں میں ہیں، انسانوں کی مملوکیت و مرعوبیت کے حلقے گردنوں میں، ایمان باللہ کے ثبات سے دل خالی اور اعمال حقہ وحسنہ کی روشنی سے روح محروم! ان سامانوں اور طیاریوں کے ساتھ تم مستعد ہوتے ہو کہ ربیع الاول کے آنے والے کی یادکا جشن مناؤ، جس کا آنا خدا کی عبودیت کی فتح، غیر الٰہی عبودیت کی ہلاکت، حریت صادقہ کا اعلان حق، عدالت حقہ کی ملوکیت کی بشارت اور امت عادلہ وقائمہ کے تمکن و قیام کی بنیاد تھا! فما لهؤلاء القوم لا یکادون یفقہون حدیثا![1]

یادگار منانے کا استحقاق

پس اے غفلت شعاران ملت! تمھاری غفلت پر صد فغان و حسرت اور تمھاری سرشاریوں پر صد ہزار نالہ و بکا اگر تم اس ماہ مبارک کی اصلی عظمت و حقیقت سے بے خبر رہو اور صرف زبانوں کے ترانوں، در و دیوار کی آرائشوں اور روشنی کی قندیلوں ہی میں اس کے مقصد و یاد کو گم کر دو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ماہ مبارک امت مسلمہ کی بنیاد کا پہلا دن ہے۔ خداوندی بادشاہت کے قیام کا اولین اعلان ہے، خلافت ارضی و وراثت الٰہی کی بخشش کا سب سے پہلا مہینا ہے، پس اس کے آنے کی خوشی اور اس کے تذکرہ و یاد کی لذت ہر اس شخص کی روح پر حرام ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے اندر اس پیغام الٰہی کی تعمیل و اطاعت اور اس اسوۂ حسنہ کی پیروی و تاسی کے لیے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔ فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ[2]۔

---

[1] ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ہو، سمجھ بوجھ کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ (النساء: ۷۷)
[2] خوشخبری سنا دو میرے ان بندوں کو جو سنتے ہیں بات، پھر اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔ وہی ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور وہی ہیں عقل والے (زمر: ۱۷، ۱۸)۔

بعثت و نبوّت

باب ۲

سوانح مبارکہ کا سرسری مرقع

(مولف کے قلم سے)

ابتدائی دور کے سوانح ولادت باسعادت کے بعد آنحضرتؐ کو رضاعت کے لیے حضرت حلیمہؓ سعدیہ کے سپرد کیا گیا جو قبیلہ ہوازن کی ایک خاتون تھیں۔ دور رضاعت کے بعد مکہ مکرمہ میں آب و ہوا کی خرابی کے باعث آنحضرتؐ کم و بیش چھ سال اپنی رضاعی والدہ ہی کے پاس رہے۔ پھر والدہ ماجدہ کے ساتھ یثرب گئے جو آگے چل کر حضور صلعم کے قدوم سعادت لزوم کے باعث مدینہ منورہ کے نام سے مشہور آفاق ہوا اور عالم اسلام کے لیے دوسرا حرم پاک ہے۔ اس سفر میں ام ایمن (جو کنیز تھیں) کے علاوہ آنحضرتؐ کے جد امجد عبدالمطلب بھی ساتھ تھے، جن کی ننھیال یثرب میں تھی۔ واپسی میں آنحضرتؐ کی والدہ ماجدہ بیمار ہوئیں، ابوا[1] میں ان کا انتقال ہو گیا، وہیں انھیں دفن کیا گیا۔

۱۔ آنحضرتؐ چھ سال سے آٹھ سال کی عمر تک جد امجد کی کفالت میں رہے[2]۔ وفات کے وقت جد امجد نے یہ کفالت اپنے فرزند ابو طالب کے حوالے کر دی جو آنحضرتؐ کے والد ماجد عبداللہ کے ماں جائے بھائی تھے۔

۲۔ حضور صلعم کو عہد طفلی میں "حرب فجار" پیش آگئی یعنی "ناجائز جنگ" کیونکہ یہ ان مہینوں میں ہوئی تھی جن میں عربوں کے پرانے دستور کے مطابق لڑائی بھڑائی ممنوع تھی اور یہ ممانعت غالباً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقرر کیے ہوئے قواعد حج پر مبنی تھی۔ اس لڑائی میں ایک فریق قبیلۂ قیس تھا اور قبیلہ ہوازن اس کا معاون تھا۔ دوسرا فریق قریش تھے۔ حضور صلعم بھی اپنے اہل خاندان کے ساتھ لڑائی میں شریک ہوئے مگر کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا[3]۔

---

[1] ابوا مکہ و مدینہ کے درمیان طریق سلطانی کا مشہور مقام تھا جو رابغ کے شمال میں مستورہ کے قریب ہے۔ یہ علاقہ فرع کے توابع میں سمجھا جاتا تھا۔ [2] قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری نے دن تک گنوا کر فرمایا ہے آٹھ سال اور دس دن کی عمر تک۔

[3] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۶۹۔

حلف الفضول

مسلسل لڑائیوں کے باعث ملک بے امنی کی جولاں گاہ بن گیا تھا۔ راستے مخدوش ہو گئے تھے، مسافر لٹتے، غریبوں پر زبردستوں کے بے پناہ ظلم ہوتے تھے اس لیے بعض نیک دل اور شریف انسانوں نے ایک انجمن بنائی تھی جس کے ارکان عہد کرتے تھے کہ:

ا: ہم ملک سے بے امنی دور کریں گے۔

ب: مسافروں کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

ج: غریبوں کے لیے ہر ممکن امداد و اعانت بہم پہنچائیں گے۔

د: زبردست کو زیر دست پر ظلم سے روکیں گے[۱]

اصل عہد کو "حلف الفضول" کہتے تھے۔ اس نام کی دو توجیہیں کی گئی ہیں۔ اول جن بندگان خدا کو سب سے پہلے اس عہدنامے کا خیال ہوا، ان کے ناموں میں لفظ "فضیلت" کا مادہ داخل تھا۔ مثلاً فضیل بن حرث، فضیل بن واعہ، مفضل، جو جرہم قطورا کے قبیلے سے تھے۔ دوسری توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ عربی میں "حق" کو "فضل" بھی کہتے ہیں جس کی جمع "فضول" ہے اس لیے معاہدہ "حلف الفضول" کے نام سے مشہور ہوا یعنی "معاہدۂ حقوق" یا "معاہدۂ حفظ حقوق"۔

یہ معاہدہ کارگر نہ ہو سکا، غالباً "حرب فجار" کے بعد حضور صلعم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب کو اس کے احیا، کا خیال آیا اور اس میں بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب، بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تمیم شامل تھے۔ حضور صلعم بھی اس کے سرگرم رکن رہے۔ عہد نبوت میں بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر اس معاہدے کے مقابلے میں مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جاتے تو کبھی اس سے نہ ہٹتا۔

تجارت

حضور صلعم کی شرافت، نیکی، دیانت اور راست بازی ابتدائی دور ہی میں خواص و عوام کے دلنشیں ہو گئی تھی اور عوام حضور صلعم کو "الصدیق" اور "الامین" کے لقبوں سے پکارا کرتے تھے۔ عہد طفلی سے منزل شباب میں قدم رکھتے ہی تجارت کا خیال آیا جو اہل مکہ کا عام پیشہ تھا، لیکن ابو طالب کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ کوئی قابل ذکر امداد دے سکتے۔ اللہ نے اپنی رحمت سے ایک اچھی صورت پیدا کر دی۔ مکہ مکرمہ میں ایک دولت مند بیوہ خاتون حضرت خدیجہؓ نام تھیں، جنھیں شرافت کردار کی بدولت "طاہرہ" کا لقب مل گیا تھا۔ وہ اپنا سرمایہ تجارت میں لگائے رکھتیں۔ انھیں حضور صلعم کے اوصاف و محامد سے آگاہی تھی خود حضور صلعم کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ میرا مال قافلے کے ساتھ شام لے جائیں تو جو معاوضہ اوروں کو دیتی ہوں، آپ کو اس سے

---

[۱] "رحمۃ للعالمین" جلد اول ص ۴۶، ۴۷ نیز "سیرت النبیؐ" جلد اول ص ۱۷۰ - ۱۷۱

المضاعف دو دی گی۔ حضور صلعم نے چچا سے مشورے کے بعد یہ تجویز منظور کر لی۔ اس تجارت میں حضرت خدیجہؓ کو بہت نفع ہوا۔

شادی

جب حضرت خدیجہؓ کو سابقہ معلومات کے علاوہ ذاتی تجربے کی بنا پر حضور صلعم کے حسن معاملت، فضائل اخلاق اور بلندی کردار کا پورا اندازہ ہو گیا اور اپنے غلام میسرہ سے بھی دوران سفر کے حالات تفصیل سے سن لیے تو خود نکاح کا پیغام بھیجا۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کی شادی ہو گئی۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ عمر کی چالیسویں منزل میں تھیں۔ اس کے بعد آپ نے متعدد تجارتی سفر کیے۔

تعمیر کعبہ

کعبہ مکرمہ کی دیواریں سیل کی وجہ سے پھٹ گئی تھیں۔ قریش نے اسے از سر نو تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ بڑے اہتمام سے تعمیر درجہ تکمیل پر پہنچی۔ چونکہ پورے کعبے کی چھت کے لیے لکڑی نہیں مل سکی تھی، اس لیے کچھ حصہ چھوڑ دیا گیا' جسے آج کل "حطیم" کہتے ہیں۔ جب حجر اسود دیواریں نصب کرنے کی نوبت آئی تو تمام قبیلوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ ہر قبیلے کا سردار چاہتا تھا کہ حجر اسود کو اصل مقام پر لگانے کا اعزاز اسی کو حاصل ہو۔ کشمکش بڑھتی دیکھ کر ابو امیہ بن مغیرہ نے جو، قریش میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا، یہ تجویز پیش کی کہ جو آدمی سب سے پہلے حرم میں آتا ہوا دکھائی دے اسے ثالث بنا لیا جائے۔ اس پر سب نے اتفاق کر لیا۔ پھر سب کی نگاہیں اٹھیں تو سب سے پہلے حضور صلعم تشریف فرما ہوتے نظر آئے۔ لوگ جوش مسرت سے پکار اٹھے " امین" "آ گئے۔" امین" آ گئے۔ آپ نے پیش نظر معاملہ سنتے ہی چادر زمین پر بچھا دی اور حجر اسود کو اس پر رکھ دیا پھر تمام قبیلوں کے سرداروں سے کہا کہ وہ چادر کے گوشے پکڑ کر اوپر اٹھائیں۔ اس طرح حجر اسود اصل مقام کے سامنے پہنچ گیا تو اسے نصب فرما دیا۔ یوں تمام رؤسائے قبائل کو اس مبارک تقریب میں شرکت کا شرف حاصل ہو گیا اور کشمکش کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔

زمانہ قرب بعثت

قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری فرماتے ہیں:

بعثت سے سات برس پہلے حضور صلعم کو ایک روشنی اور چمک نظر آنے لگی تھی[۱] اور آنحضرت اس روشنی کے معلوم کرنے سے خوش ہوا کرتے تھے[۲]۔ اس چمک میں کوئی آواز یا صوت نہ ہوتی تھی۔ بعثت کا زمانہ جس قدر قریب ہوتا گیا، حضور صلعم کے مزاج میں خلوت گزینی کی عادت بڑھتی جاتی تھی۔ اکثر پانی اور ستو لے کر (آپ) شہر سے کئی کوس پرے سنسان جگہ کوہ حرا[۳] کے ایک غار میں جس کا طول چار گز، عرض پونے دو گز تھا، جا بیٹھتے۔ عبادت کیا کرتے۔ اس

۱۔ صحیحین عن ابن عباسؓ ۲۔ "سفر السعادہ" مشرح مطبوعہ افضل المطابع کلکتہ چاپ ۱۲۵۳ھ ص ۱۳۱ ۳۔ اب اسے "جبل نور" کہتے ہیں یہ واضح کر دینا چاہیے کہ کوہ حرا یا جبل نور مکہ مکرمہ سے تین میل پر ایک الگ تھلگ ٹیلا ہے۔ یہ گول برج کی شکل میں خاصا بلند ہے۔ اوپر چڑھنے کا راستہ چکر کھاتا ہوا جاتا ہے۔ چوٹی تک پہنچنے میں قریباً پینتیس منٹ صرف ہو جاتے ہیں۔ اوپر پہنچیں تو قریباً نصف بالائی حصہ ہموار ہے۔ باقی نصف سو سوا سو فٹ اوپر اٹھا ہوا ہے۔ ہموار حصے میں جو مکہ مکرمہ کی جانب ہے ٹیلے کے کنارے سے دو بڑی سلیں اوپر سے مل گئی ہیں اور (باقی صفحہ ۷۲ پر)

عبادت میں تحمید و تقدیس الٰہی کا ذکر بھی شامل تھا اور قدرت الٰہیہ پر تدبر و تفکر بھی۔[ل] جب تک پانی اور ستو ختم نہ ہو جاتے، شہر میں نہ آیا کرتے۔[ٹ] ماہ رمضان عموماً عبادت ہی میں گزرتا۔ بعض اوقات حضرت خدیجہؓ بھی ساتھ جاتیں مگر کچھ وقت گزار کر واپس ہو جاتیں۔

اب حضور صلعم کو خواب نظر آنے لگے۔ خواب ایسے سچے ہوتے تھے کہ جو کچھ رات کو خواب میں دیکھ لیا کرتے تھے، دن کو ویسا ہی ظہور میں آجاتا۔[ٹ]

مولانا شبلی مرحوم نے سیرۃ النبیؐ میں تحنث کے متعلق لکھا ہے:

یہ وہی عبادت تھی جو آپؐ کے دادا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی۔ ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا۔ چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا۔ آفتاب پر اس سے زیادہ، لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے:

اِنّی لا احب الآفلین۔ میں فانی چیز کو نہیں چاہتا۔[ٹ]

نبوت

جب حضور صلعم کی عمر کے چالیس[ٹ] سال قمری پر ایک دن اوپر ہوا تو ۹[ٹ] ربیع الاول ۱۱ھ میلادی (مطابق ۱۲۔ فروری ۶۱۰ء) کو بروز دوشنبہ روح الامینؑ خدا کا حکم نبوت لے کر آئے۔ اس وقت حضورؐ غار حرا میں تھے۔

روح نے کہا، محمد! بشارت قبول فرمائیے۔ آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں۔[ٹ]

اس واقعے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوراً گھر میں آ گئے اور لیٹ گئے۔ بیوی سے کہا کہ مجھ پر کپڑا ڈال دو۔ جب طبیعت میں ذرا سکون ہوا تو فرمایا، "میں ایسے واقعات دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہو گیا ہے۔" خدیجۃ الکبریٰؓ نے کہا، "نہیں، آپ کو ڈر کا ہے کا؟ میں دیکھتی ہوں آپ اقربا پر شفقت فرماتے ہیں۔ سچ بولتے، راندوں، یتیموں، بیکسوں کی

(بقیہ ص ۱۷) خیمے کی سی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ یہی غار ہے جس کا طول و عرض قاضی صاحب مرحوم نے بتا دیا۔ مطلع صاف ہو تو اس حصے سے سمندر بھی نظر آتا ہے جو پچیس میل کے فاصلے پر ہو گا۔ حرم پاک اور شہر تو بالکل سامنے رہتے ہیں۔ اس غار میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ کنارے کی طرف کا کھلا حصہ عین حرم پاک کی سمت ہے۔ [ل] روایات میں لفظ "تحنث" استعمال ہوا ہے یعنی عبادت جس میں قاضی صاحب کی تعریح کے مطابق دونوں چیزیں شامل تھیں یعنی ذکر بھی اور تدبر و تفکر بھی (صحیحین عن عائشہ)۔ اہل عرب میں سے جو تھوڑے سے لوگ دین ابراہیمی کے پیرو رہ گئے تھے وہ بھی وقتاً فوقتاً تحنث کیا کرتے تھے، خصوصاً ماہ رمضان میں۔ [۲] صحیحین عن عائشہ [۳] صحیحین عن عائشہ (مشکوٰۃ ص ۵۱۲) [۴] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۸۷ [۵] صحیح بخاری عن عباس باب مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ [۶] رحمۃ للعالمین میں قاضی صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ "زاد المعاد" میں تاریخ ۸۔ ربیع الاول لکھی ہے لیکن دوشنبہ کے دن پر اتفاق ہے چونکہ دوشنبہ ۹۔ کو ہوا اس لیے ۹ ہی صحیح ہے۔ [۷] سفر السعادہ مشرح ص ۳۵۔

دستگیری کرتے، مہمان نوازی فرماتے ہیں۔ خدا آپ کو کبھی اندوہگیں نہ فرمائے گا۔[1]

قاضی صاحب فرماتے ہیں: "مجھے اپنی جان کا ڈر ہو گیا ہے" سے حضورؐ کا مطلب مشکلات نبوت کا بیان تھا" (رحمۃ للعلمین" حاشیہ ص ۵۳) مولانا شبلی نے تحریر فرمایا ہے: یہ تردد، یہ ہیبت، یہ اضطراب، جلال الہٰی کا تاثر (اور نبوت کے بارگراں کی عظمت کا تخیل تھا) آپ نے کیا دیکھا؛ ناموس اعظم نے کیا کہا؛ کیا کیا مشاہدات ہوئے؛ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۸۹) تاہم اصل حقیقت ایک حد تک مولاناؒ کے مقالوں سے آشکارا ہو گی جو آگے آرہے ہیں۔

نزول قرآن

قاضی سلیمان لکھتے ہیں:

کچھ دنوں کے بعد پھر فرشتہ آیا اور نبی صلعم کو جنھوں نے اب تک لکھنا پڑھنا نہ سیکھا تھا۔ خدا کا وہ پاک نام اور پاک کلمہ پڑھایا، جو سارے علموں کی کنجی اور ساری حقیقتوں کا خزانہ ہے۔ روح الامینؑ نے ان آیات کو پڑھا تھا:

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔

شروع ہے اللہ کے نام سے جو کمال رحمت اور نہایت رحم والا ہے پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے، جس نے (سب کچھ) پیدا کیا جس نے انسان کو پانی کے کیڑے سے بنایا۔ (ہاں) پڑھتا چلا جا۔ تیرا پروردگار تو بہت کرم والا ہے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی (جس نے) انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔[2]

قاضی صاحب مرحوم نے بشارت نبوت اور نزول قرآن میں قریباً چھ ماہ کا وقفہ بیان کیا ہے۔[3]

مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں:

نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے۔ جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے تھے بعینہٖ وہی پیش آتا تھا۔ ایک دن جب کہ آپ حسب معمول غار حرا میں مراقبے میں مصروف تھے فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپ سے کہہ رہا ہے۔ اقراء باسم .... الخ (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۸۸)

---

[1] صحیحین عن عائشہ [2] رحمۃ للعلمین ص ۴۵ [3] رحمۃ للعلمین میں قاضی صاحب لکھتے ہیں: علماء کا اتفاق ہے کہ ولادت باسعادت بماہ ربیع الاول ہوئی نیز اتفاق ہے کہ ابتدا سے وحی اکتالیسویں سال کے شروع میں ہوئی۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ابتدا سے وحی بھی ماہ ربیع الاول میں ہوئی مگر قرآن مجید سے ثابت ہے کہ نزول قرآن رمضان المبارک میں ہوا۔ پس نتیجہ یہ ہے کہ ابتدا سے نزول بہ ماہ رمضان ہے اس عرصے کا درمیانی فاصلہ قریباً چھ ماہ ہے، جس میں رویائے صادقہ آتے رہے، جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد نبوت تئیس سال ہے۔ قاضی صاحب کے نزدیک چھ مہینے تئیس سال کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔

طبری نے نزول قرآن کی تاریخ ۱۷، یا ۱۸ رمضان روایت کی ہے چونکہ ۱۸۔ رمضان سنہ نبوت کو یوم جمعہ تھا (مطابق ۱۰۔ اگست سنہ ۶۱۰ء) اس لیے نزول قرآن شب جمعہ ۱۸۔ رمضان کو ہوا۔

نماز اور تبلیغ قرآن مجید کی آیتیں پڑھا کر روح الامینؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غارِ حرا سے باہر اس مقام پر لائے جہاں کوہ حرا یا جبل نور کا ایک حصہ اوپر اٹھا ہوا ہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وضو کیا۔ حضور صلعم نے بھی اسی طرح وضو کیا۔ پھر دونوں نے مل کر نماز پڑھی۔ نماز روح الامینؑ نے پڑھائی۔[1]

ساتھ ہی پیغام حق کی تبلیغ شروع ہوگئی۔ یہ "سری تبلیغ" کا دور تھا جو تین سال جاری رہا۔ سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ (جن کی عمر صرف آٹھ سال تھی)، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ مسلمان ہوئے۔ چند روز کے بعد بلالؓ، عمروؓ بن عنبسہ اور خالدؓ بن سعید بن عاص نے اسلام قبول کیا۔ اس ابتدائی دور کے درخشاں بخت صحابہ و صحابیات میں سے ذیل کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں، عثمانؓ، زبیرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، طلحہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن الجراح، ابوسلمہ عبدالاسد بن ہلال، عثمانؓ بن مظعون، عامرؓ بن فہیرہ ازدی، سعیدؓ بن زید، ارقمؓ بن ابی الارقم، عمارؓ بن یاسرؓ حضرت عباسؓ کی اہلیہ ام الفضلؓ، اسماءؓ بنت ابی بکرؓ، اسماءؓ بنت عمیس۔ فاطمہؓ بنت الخطاب (خواہر حضرت عمرؓ) یعنی اہلیہ حضرت سعیدؓ بن زید۔ صادقین اولین کا یہ قدوسی گروہ کسی گھاٹی میں جا کر نماز بھی پڑھا کرتا تھا۔[2]

علانیہ تبلیغ کا حکم پھر خدا کا حکم پہنچا:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ

اے درست کرنے والے (عالم کے[3]) اٹھو گندے اعمال والوں کو ڈراؤ۔ اپنے پروردگار کی بزرگی کو پھیلاؤ اور پاکدامنی اختیار کرو[4] (مخلوق پرستی کی) نجاست سے علیحدگی اختیار کرو۔ احسان اس نیت سے نہ کرو کہ لوگوں سے اس کا فائدہ حاصل کیا جائے۔ اپنے پروردگار کے لیے (رسالت کرتے ہوئے) ہر ایک امتحان اور تکلیف میں استقلال رکھو۔

قاضی سلیمان مرحوم نے ان آیات سے رسالت کے مندرجہ ذیل مقاصد اخذ کیے ہیں:

۱۔ نافرمانوں کو ان کی خطرناک حالت سے آگاہ کرنا اور انجام سے ڈرانا۔

۲۔ اللہ کی ربوبیت، کبریائی اور جلال آشکار کرنا۔

---

[1] "رحمۃ للعالمین" جلد اول ص ۵۴-۵۵ [2] "رحمۃ للعالمین" جلد اول ص ۵۵-۵۶ [3] قاضی سلیمان مرحوم کا ترجمہ یہی ہے۔ [4] مولانا روم نے لکھا ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ "اپنی روح کو پاکی بخش اور منزہ رکھ" کیا ہے۔ علامہ ابن قیم "اغاثۃ اللهفان" میں لکھتے ہیں تمام محققین کا اتفاق ہے کہ یہاں "ثیابک" سے مقصود کپڑا نہیں قلب ہے۔

۳۔ لوگوں کو اعتقاد، اعمال اور اخلاق کی ظاہری و باطنی نجاستوں سے پاک رہنے کی تعلیم دینا۔

۴۔ پاکیزگی، صفائی اور پاک دامنی سکھانا۔

۵۔ الٰہی تعلیم مفت دینا، نہ لوگوں پر احسان جتانا، نہ ان سے اپنے کسی فائدے کی توقع رکھنا۔

۶۔ اس کام میں جس قدر بھی مصائب و شدائد جھیلنے پڑیں، سب برداشت کر لینا[1]

تبلیغ کے مراتب پنجگانہ تبلیغ کا دائرہ تدریجاً ہی پھیل سکتا تھا۔ قاضی سلیمان مرحوم نے اس کے پانچ درجے قرار دیے ہیں؛

۱۔ قریبی رشتہ دار اور خاص احباب۔

۲۔ قوم اور شہر کے لوگ۔

۳۔ وہ قبیلے اور گروہ جو اطراف مکہ مکرمہ میں آباد تھے۔

۴۔ عرب کے تمام حصوں کے قبائل اور گروہ۔

۵۔ دنیا بھر کی قومیں اور جماعتیں[2]

اسی طبعی ترتیب کے مطابق تبلیغ میں توسیع ہوتی رہی یہاں تک کہ اسلام اطراف و اکناف عالم میں پھیل گیا۔

(یہ باب مولف نے اس خیال سے مرتب کیا کہ خوانندگان کرام کے ذہن میں ابتدائی دور کے اہم واقعات تازہ ہو جائیں) ؛ (مؤلف)

---

[1] "رحمۃ للعلمین" ص ۵۶ - ۵۷ - [2] "رحمۃ للعلمین" ص ۵۷ -

بابِ ۱۱

ترتیبِ قرآن و سُورۂ فاتحہ

(۱)

یہ مولاناؒ کے مرتبہ "مقدمۂ قرآن" کے بارھویں باب کا صرف ایک حصّہ ہے، جو ۱۹۱۶ء میں کم ازکم بارھویں باب تک یقینی طور پر چھپ گیا تھا۔ ساتھ "ترجمان القرآن" بھی چھپ رہا تھا۔ تفسیر "البیان" بھی زیرِ طبع تھی، جس کے ساتھ مقدمۂ قرآن جزؤاً جزؤاً شامل کرنا منظور تھا۔ اچانک مولاناؒ کے نام بنگال سے اخراج کا حکم پہنچ گیا، وہ رانچی چلے گئے، جہاں انھیں نظربند کر دیا گیا۔ پولیس تمام کاغذات جن میں مسودات، مطبوعہ فرمے اور مولانا کی مرتبہ یادداشتیں بھی تھیں، اٹھا کر لے گئی۔ ان میں سے کوئی بھی شے سلامت نہ مل سکی۔ مقدمے کے صرف بارھویں باب کا ایک فرمہ اتفاق سے کہیں پڑا رہ گیا اور کرم خوردہ ملا، جو "ترجمان" کی تازہ اشاعت کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ میں اسے پورے کا پورا اس لیے شائع کر رہا ہوں کہ ابتدائی حصہ اصل موضوع سے بظاہر بے تعلق ہونے کے باوجود دورانِ بعثت کے بعض اہم مباحث کی تمہید ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خوانندگانِ کرام اس کے بغیر اصل بحث کی اہمیت کا پورا اندازہ نہ فرما سکیں گے۔

قرآن کی وقتی ترتیب اور دائمی ترتیب

"مقدمے" کے پانچویں باب میں قرآن حکیم کے طرزِ نزول اور ترتیب و انضباط کی بحث تم پڑھ چکے ہو اور یہ حقیقت تم پر واضح ہو چکی ہے کہ قرآن حکیم کی ایک ترتیب وقتی تھی اور ایک دائمی۔ وقتی ترتیب وہ تھی جو اس کے جستہ جستہ حسبِ ضرورت نزول میں ملحوظ رہی اور دائمی وہ تھی جس کے مطابق وہ بشکل کتاب مرتب و مدون ہوتا رہا۔ یہی "الکتاب" ہے جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے اور ٹھیک ٹھیک ویسی ہی مرتب و منظم ہے، جیسی کہ وحیِ الٰہی نے مرتب کر دی تھی، لیکن ساتھ ہی اس کی ترتیبِ نزول کی تاریخ بھی ضائع نہیں ہوئی۔ اسے بھی ہم معلوم کر سکتے ہیں اور اس کی حفاظت کے لیے صحابہ و تابعین کرام نے اپنی روایات و تعلیم میں "علم تاریخ نزول و شانِ نزول" کو محفوظ رکھا ہے۔

دو ترتیبوں کا مقصد

ان دونوں ترتیبوں کے مقصد میں اختلاف تھا۔ پہلی ترتیب اس لیے تھی کہ ایک محدود و مخصوص جماعت کو تعلیم دے کر تمام دنیا کی تعلیم و تربیت کے لیے تیار کیا جائے۔ پس جیسی ان کی حالت تھی اور جس طرح درجہ بدرجہ ان کی استعداد ترقی کرتی جاتی تھی، اسی طرح یکے بعد دیگرے انھیں سبق بھی دیے جاتے تھے، لیکن دوسری ترتیب کا مقصد کسی محدود جماعت اور مخصوص وقت سے تعلق نہیں رکھتا تھا،

بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے تمام نوع انسانی کی تعلیم و تربیت کی غرض سے ایک کتاب مبین کی شکل اختیار کرنا چاہتی تھی، اس لیے ضروری تھا کہ پہلی ترتیب سے وہ مختلف ہو اور طلبہ کی ایک خاص جماعت کے لیے درس علوم کی جو ترتیب مدرسے کے اندر اختیار کی گئی، وہ ایک مستقل کتاب علوم کی ترتیب علمی میں آکر بالکل بدل جائے۔

کتابی ترتیب اور درسی ترتیب

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی کتابی ترتیب، ترتیب درس یعنی ترتیب نزول سے مختلف ہے اور اکثر وہ سورتیں پہلے نظر آتی ہیں جو بعد میں نازل ہوئیں۔ آخری پاروں کی اکثر سورتیں مکی ہیں یعنی آغاز عہد (نبوت) میں نازل ہوئی ہیں لیکن اب انھیں سورتوں پر کتاب الٰہی ختم ہوتی ہے۔ سورۃ بقرہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی لیکن اب سورۂ فاتحہ کے بعد اسی سے "الکتاب" شروع ہوتی ہے۔

فاتحہ کی اولیت

لیکن اس اعتبار سے سورۂ فاتحہ ایک عجیب سورۃ ہے، جو ہر ترتیب میں پہلی ہے اور اس کی اولیت ہر جگہ یکساں طور پر ممتاز نظر آتی ہے۔ وہ پہلا سبق ہے جو درسگاہ الٰہی میں "مومنون الاولون" کو دیا گیا اور پہلا بیان ہے جو ہمیشہ کے لیے "الکتاب" میں بھی پہلے رکھا گیا، یعنی نزول کے اعتبار سے بھی وہی پہلی سورۃ ہے جسے صحیفۂ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ ملا۔ وحی الٰہی کے مستور و محجوب چہرے نے جب سرزمین فاران میں نقاب الٹا تو اس کے جمال حقیقت کا اولین نظارہ اسی سورۂ فاتحہ میں تھا پھر یہی سورۃ ہمیشہ کے لیے پہلی قرار پائی کہ کرۂ ارض پر نوع انسانی جب کبھی جستجوئے حقیقت میں بے قرار ہوگی تو سب سے پہلے یہی جلوۂ حق اس کے سامنے آئے گا۔

سعادت و ہدایت کی پہلی نمود

صرف ترتیب درس و نزول اور ترتیب کتاب ہی پر موقوف نہیں۔ آگے چل کر تمھیں معلوم ہوگا کہ کائنات تعلیم و سعادت انسانی میں جو کچھ ہے، اس میں سب سے پہلی حقیقت یہی سورت اور اسی سورت کی سات آیتیں ہیں۔ اگر وہ ایک سفر ہے تو اس کی پہلی منزل یہی ہے۔ اگر وہ ایک جمال ہے تو اس کا پہلا نظارہ یہی ہے۔ اگر وہ ایک نغمۂ حقیقت ہے تو اس کا پہلا ترانہ اسی سے اٹھتا ہے۔ اگر وہ ایک وقت ہے تو اس کا پہلا دن اسی سے شروع ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک درخت ہے تو اس کا اولین تخم اسی میں ہے اور اگر وہ ایک دائرۂ سعادت ہے تو اس کا نقطہ اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ غرض نوع انسانی کی سعادت اور کائنات ارضی کے ارشاد و ہدایت میں جو کچھ بھی ہے اس میں جس طرح اور جس شکل میں دیکھو گے اسی سورت کی نمود ہر لحاظ سے پہلے نظر آئے گی۔

جلوۂ حقیقت کا پہلا نظارہ

یہی وجہ ہے کہ مومنین کی حیات ایمانی کا پہلا دن یہی ہے۔ اس کے ساز فطرت کا پہلا نغمہ اسی کے اندر سے اٹھتا ہے۔ اس کے دائرۂ علم و عمل کا نقطۂ سعادت اسی کی سات آیتیں ہیں۔ وہ جب سفر حقیقت شروع کرتا ہے تو اس کا پہلا قدم یہی ہوتا ہے۔ وہ چلتا ہے تو اسے

پہلی منزل یہی پیش آتی ہے۔ بولتا ہے تو پہلی آواز یہی نکلتی ہے۔ مانگتا ہے تو پہلی طلب اسی میں ہوتی ہے اور عشق حق میں روتا ہے تو چشم حقیقت کا پہلا آنسو یہی ٹپکتا ہے۔ یعنی اس کی حیات میں جو کچھ ہے اس میں پہلی اور اول چیز یہی ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے سب اس کے بعد ہے۔ اسی سے ہے اور اسی کے لیے ہے۔

فطری درجہ سبقت

تم آگے چل کر معلوم کرو گے کہ اس کی اولیت کی محکم و یقینی حقیقت ایک قانون فطری اور ناموس الٰہی ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا اور فطرت الٰہیہ کا کوئی عمل ٹوٹنے کے لیے نہیں۔
یہ اس لیے پہلی نہیں کہ اسے پہلی چیز ٹھہرانا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ یہ پہلی ہے بلکہ اس لیے ہے کہ نوع انسانی کی فطرت صالحہ کی پہلی آواز یہی ہے اور جب کبھی انسانی فطرت ہر طرح کی مصنوعی و خارجی کدورتوں اور آلودگیوں سے پاک ہو کر اپنی اصلی حقیقت کی راہ میں نمودار ہو گی تو اس کے اندر سے پہلی صدا یہی اٹھے گی۔

طلب حق کی اصلی صدا

انسان بالفطرت اس کے لیے مجبور ہے کہ حرفوں اور آوازوں کے اندر جب کبھی معانی حقیقت اور تصورات صحیحہ فطریہ کی ترجمانی کرے۔ لفظوں میں اور صداؤں کے ساتھ جب کبھی اپنے خدا کو پکارے تو اس کی سب سے پہلی اور اصلی آواز وہی ہو، جو سورۃ فاتحہ کی سات آیتوں کے اندر سے نکل سکتی ہے۔ اس کے سوا انسان کی فطرت صالحہ اور کچھ نہیں کہ سکتی اور اگر کہے گی تو وہ اس کی سچی اور حقیقی آواز نہ ہو گی بلکہ گمراہیوں کی ایک بناوٹ، آلودگیوں کی ایک ناپاکی، کدورتوں کی ایک اندھیاری، زنگوں اور غباروں کی صناعی تیرگی ہو گی جو فطرت صالحہ کی صالح اور بے میل صداؤں کی جگہ طرح طرح کی بناوٹی آوازوں کا شور مچائے گی۔

کائنات کی تسبیح

پھر نوع انسانی کی اصلی اور پہلی آواز یہ کیسے نہ ہو جبکہ تم تھوڑی دیر میں معلوم کر لو گے کہ کائنات انسانی اور اس کی خلقت و وجود میں جو کچھ ہے سب کی فطری اور پہلی آواز یہی ہے:

وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ۔ (بنی اسرائیل: ۴۴)

اور دنیا میں کوئی چیز نہیں، جو خدا کی حمد نہ کرتی ہو، مگر تم ان کی حمد و ثنا پر غور نہیں کرتے اور نہیں سمجھتے۔

آغاز اور انجام و اکمال

دائرہ جس نقطے سے شروع ہوتا ہے اسی پر ختم بھی ہو جاتا ہے، اس کی پہلی اور آخری دونوں منزلیں ایک ہی ہیں۔ اس لیے آگے چل کر تم یہ بھی پاؤ گے کہ جس طرح سورۂ فاتحہ سب سے پہلی حقیقت ہے، اسی طرح سب سے آخری بھی وہی ہے جس طرح وہ ابتدا ہے اسی طرح اس کے سوا انتہا بھی اور کوئی نہیں۔ جس طرح وہ آغاز ہے، اسی طرح اس کے اندر اتمام و اکمال بھی ہے جس طرح وہ ایک بیج ہے جو سب سے پہلے درخت کے سلسلۂ عملیات میں نمودار ہوا اسی طرح درخت کا سب سے آخری ظہور بھی وہی ہے کیونکہ درخت نے سب سے پچھلا کام یہی کیا کہ اپنی شاخوں میں بیج کا پھل لگایا۔ پس نوع

انسانی کی سعادت جس طرح سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اسی طرح اسی پر ختم بھی ہو جاتی ہے۔ مومن کی ہدایت کی ابتدا بھی یہی ہے اور کمال بھی یہی ہے۔ یہ ایک بیج ہے اور اس لیے درخت کی ابتدا و انتہا جو کچھ ہے اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہو سکتا ہے سب کچھ اسی کے اندر ہے، اس لیے ایک مسلم زندگی یعنی فطرت صالحہ کی ایک بے میل و خالص روح سب کچھ بھول جاتی ہے مگر سورۂ فاتحہ کو نہیں بھول سکتی۔ اس کے ساز زندگی سے شب و روز یہی نغمۂ حقیقت بلند ہوتا رہتا ہے جس طرح اس کی صبح کا پہلا نغمہ یہی ہے، اسی طرح اس کی رات کا آخری ترانہ بھی یہی ہے صبح کے آفتاب کا چہرہ دیکھنا اس پر حرام ہے، جب تک وہ سورۂ فاتحہ کے اندر سے اپنے خدا کو نہ پکار لے اور رات کی راحت اور سکھ کے بستر پر اس کا جسم چین نہیں پا سکتا، جب تک سورۂ فاتحہ کی صداؤں کے ساتھ اپنے محبوب و معبود حقیقی سے عشق نہ کر لے۔ سورج نکلتا ہے تو مومن کے لیے سورۂ فاتحہ کا پیام لاتا ہے۔ ڈوبتا ہے تو اسی کے لیے ولولہ انگیزی ہوتی ہے۔ چڑیا صبح کے وقت چہچہاتی اور شام کے وقت اپنا بسیرا ڈھونڈتی ہے۔ حقیقت فراموش انسان بھی ایسا ہی کرتا ہے، پر مومن ہے جو صبح کی سفیدی دیکھتے ہی خدا کو پکارتا اور سورج ڈوبتا دیکھتے ہی اس کے عشق کی روح اور نغمۂ فاتحہ کے پاک ترانوں سے معمور ہو جاتا ہے،

یذکرنی طلوع الشمس صخراً

واذکرہ لکل غروب شمس[1]

پس اس کا دن شروع ہوتا ہے تو فاتحہ سے اور ختم بھی ہوتا ہے تو فاتحہ پر۔

فاتحۃ الکتاب

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام "فاتحۃ الکتاب" رکھا اور اس طرح اس کی حقیقت اولیت کو نام ہی سے واضح کر دیا۔

لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب۔ — اس شخص کی نماز ہی نہ ہوئی جس نے نماز میں فاتحۃ الکتاب یعنی سورۂ فاتحہ نہ پڑھی۔ (بخاری و مسلم عن عبادہ بن صامت)

اسی طرح دارقطنی اور ترمذی کی حدیث آگے آئے گی جس میں منجملہ دیگر اوصاف کے ایک وصف اس کا یہ بھی فرمایا کہ وہ "فاتحۃ الکتاب" ہے۔ چنانچہ یہی اس کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا وصف قرار پایا اور زیادہ تر اسی نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کرام نے اسے پکارا۔

لفظ فتح کی تشریح

عربی میں "فتح" کا لغوی اطلاق دراصل مشکلوں، بندشوں اور رکاوٹوں کے دور ہو جانے پر ہوتا ہے جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے: "الفتح: ازالۃ الاغلاق والاشکال" چونکہ بندشوں

[1] سورج کا طلوع میرے دل میں صخر کی یاد تازہ کر دیتا ہے اور اس کے غروب پر بھی اسی کو یاد کرتی ہوں (خنسا اپنے بھائی صخر کے مرثیے میں)

کے دور ہونے اور مشکلوں کے چھٹ جانے میں کھل جانے کا مفہوم ہے، اس لیے اس کا اطلاق ہر اس حالت پر ہونے لگا جو کھلنے کے بعد ہی نمایاں ہوئی اور اس لیے سب سے پہلے نمایاں ہوئی۔ بند دروازہ کھل گیا تو یہ دروازے کا فتح ہونا ہے۔ لڑائی میں کامیابی نمودار ہوئی اور رکاوٹیں دور ہوگئیں تو یہ لڑائی کی فتح ہے۔ غم دور ہوگیا اور راحت شروع ہوئی تو یہ فتح غم و الم ہے۔ غرض "فتح" کے معنی میں اصل حقیقت لغوی تو کھلنے کی ہے لیکن چونکہ کھلنے کے بعد ما بعد کی سب سے پہلی نموداری ہوئی ہے اس لیے آغاز و ابتدا کا مفہوم بھی اس کا ایک جزو ہوگیا ہے اور اس کے تمام استعمالات میں نظر آتا ہے۔

اسی "فتح" سے "فاتحہ" ہے یعنی وہ چیز جس سے کوئی شے کھلے اور شروع ہو؛

فاتحہ کل شیٔ بعدہ الذی یفتتح بما بعدہ۔ ہر شے کا فاتحہ اس کا مبدٔ ہے یعنی جس سے وہ شروع ہوئی ہے اور ما بعد اس چیز کا اس مبدٔ سے کھلتا ہے۔ (مفردات امام راغب)

قرآن حکیم کی کلید

اب غور کرو اس سورۃ کا نام "فاتحہ" یعنی "فاتحۃ الکتاب" ہے لفظ فتح کے مفہوم لغوی میں بندش کا دور ہونا، کھلنا اور شروع ہونا ہے اور ان تمام استعمالات لفظ کے اعتبار سے یہی سورۂ فاتحہ ہے وحی الٰہی کھلی اور بندش دور ہوئی تو سب سے پہلے یہی سورۃ نمودار ہوئی اور تمام کلام اللہ اس کے ما بعد ہے۔ درسگاہ وحی الٰہی نے امت مسلمہ کے پہلے گروہ کو تعلیم کتاب و حکمت دے کر تیار کرنا چاہا تو سب سے پہلا سبق اور درس یہی تھا جس سے سلسلہ اسباق شروع ہوا۔ پھر "الکتاب" کی دائمی ترتیب میں بھی قرآن حکیم کا مبدٔ یہی ہے یعنی قرآن کے کھلتے ہی سب سے پہلے اس کا اجمال علم نظر افروز ہوتا ہے اور سب کچھ اس کے بعد ہے۔ نیز خدا کا جس قدر کلام دنیا میں آیا اور جو کچھ قرآن حکیم میں ہے وہ سب کا سب سورۂ فاتحہ ہی سے کھلتا ہے اور سب کے لیے یہی سورت نقطہ آغاز و افتتاح ہے (اس آخری وصف فاتحیت کی تشریح آگے آئے گی)

عملی فاتحیت و اولیت

اس کے بعد اس کی عملی فاتحیت و اولیت کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ فطرت صالحہ یعنی مسلم و مومن انسان کی زندگی کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے لیے ہر طرح کے افتتاحوں اور ابتداؤں کا نقطہ یہی ہے۔ وہ جب کھلتی ہے تو اس میں سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نظر آتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس میں اولین نمود اسی سورت کی حقیقت کی ہوتی ہے اگر تم صبر کرو گے تو زیادہ وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کو معلوم کرلو گے لیکن سردست اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ انسان کی روزانہ زندگی کا آغاز صبح سے ہوتا اور رات کے پہلے پہر پر ختم ہوجاتا ہے۔ سو مومن کی ہر صبح اسی سورت سے شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم ہوجاتی ہے۔

ایک روایت

اوپر جو کچھ کہا گیا، وہ محض اتفاق تخمین نہیں بلکہ خود احادیث و احکام نبویہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کے ہر کام کا افتتاح سورۃ فاتحہ کی حقیقت سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس مشہور حدیث کو سامنے لاؤ، جسے اصحاب صحاح و سنن نے بہ کثرت مختلف طریقوں سے

روایت کیا ہے لیکن راوی اول سب کے ابوہریرہؓ ہیں :

كل امرذي بال لم يبدء فيه بالحمد فهو ابتر۔ جو کام حمد الٰہی سے شروع نہیں کیا گیا اس میں کامیابی نہیں۔

یہ ابن ماجہ وابوداؤد کے الفاظ ہیں لیکن ابن العربی، لغوی وغیرہ کی روایات میں "بالحمد لله" یعنی ہر کام کو الحمدللہ سے شروع کرنا چاہیے اور امام نسائی کی روایت میں "كل كلام لا يبدء فيه بحمد الله فهو اجزم"۔ بعض روایتوں میں اقطع میں بھی آیا ہے نیز بعض روایتوں میں الحمد کی جگہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ہے یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے جو کام شروع نہ کیا جائے، وہ ابتر ہے۔

الحمدللہ اور بسم اللہ

سو اب دیکھو، اس حدیث سے کس طرح ثابت ہو رہا ہے کہ مومن کے تمام کاموں کو اسی سورت کی حقیقت سے شروع ہونا چاہیے۔ اس سورت کی اولین حقیقت حمد الٰہی ہے۔ پس فرمایا کہ ہر کام کا افتتاح "الحمدللہ" سے ہونا چاہیے۔ اس کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پس فرمایا کہ ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کیا جائے۔ دونوں روایتوں میں افتتاح اعمال، حقیقت فاتحہ ہی سے ہے اور سچ یہ ہے کہ مومن کے خصائص و امتیازات میں اولین چیز یہی ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کے نام سے کرتا ہے اور اسی سے زندگی کے ہر شعبے کو شروع کر کے اپنے تئیں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص کر دیتا ہے۔

اسی طرح ان تمام احادیث کو سامنے لاؤ جن میں مختلف اعمال مقدسہ کے متعلق بہ تصریح فرمایا گیا ہے کہ بسم اللہ سے شروع کرو اور بسم اللہ سورۂ فاتحہ ہی کی پہلی آیت ہے حتیٰ کہ بعض ائمہ حدیث و فقہ کے نزدیک وضو کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ حضرت امام احمد نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اس شخص کا وضو ہی نہیں ہوتا جو اللہ کے نام سے وضو شروع نہ کرے۔ جن ائمہ نے نیت کو شرطِ وضو قرار دیا ہے، ان کی نظر اسی دقیق نکتے پر گئی ہے۔

باب ۱۲

ترتیب قرآن اور سورہ فاتحہ

—— (۲) ——

انبیاے کرام کا اسوہ

پھر سورۂ فاتحہ کی افتتاحی خصوصیت کس طرح نمایاں ہو جاتی ہے، جب، قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاے کرام علیہم السلام نے بھی اپنے اعمال مہمہ کو ہمیشہ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت سے شروع کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی پر قدم رکھا تو فرمایا "بسم اللہ مجرھا و مرسٰھا" حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو خط لکھا تو اسی سے شروع کیا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور احادیث کی بکثرت تصریحات سے یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام کاموں کو اسی اولین آیت فاتحہ سے شروع کرتے تھے۔

پس ان آیات سے واضح ہوا کہ یہ سورت ہر لحاظ سے "فاتح" ہے اور فاتحیت و ابتدا ہر حیثیت سے اسی کے لیے ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا نام "فاتحہ" قرار پایا۔

"مکی" اور "مدنی" سورتیں

البتہ اس تاریخی حقیقت کو کہ جس طرح ترتیب "الکتاب" میں یہ سورت پہلی ہے اسی طرح ترتیب درس و نزول میں بھی پہلی ہے، کسی قدر زیادہ وضاحت کے ساتھ صاف ہو جانا چاہیے۔

تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن حکیم تیئیس سال کے عرصے میں جستہ جستہ نازل ہوا ہے۔ تاریخ نزول قران میں اس زمانے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلا حصہ ابتدائی زمانے کا ہے جو ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے اور "عہد مکی" کہلاتا ہے۔ دوسرا دور ہجرت مدینہ سے شروع ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرمانے تک قایم رہتا ہے۔ اسے "مدنی" کہتے ہیں۔ پس قرآن حکیم کی جو سورتیں پہلے یعنی ابتدائی عہد میں نازل ہوئیں تو انھیں "مکی" کے نام سے پکارتے ہیں اور جو آخری عہد میں نازل ہوئی ہیں، وہ "مدنی" ہیں۔ "مکی" اور "مدنی" سے مقصود محض ان سورتوں کے نزول کا وطن نہیں بلکہ ہجرت سے پہلے اور بعد کے دو عہدوں میں سے کسی ایک عہد کا ہونا ہے۔

بہترین تقسیم

انبیاے کرام علیہم السلام کے اعمال اجتماعیہ کا پہلا دور دعوت و تبلیغ کا ہوتا ہے۔ دوسرا وسطی ہجرت کا تیسرا فیصلۂ حق و باطل اور ظہور امر الٰہی کا۔ پس چونکہ ہجرت نبوی پر پہلا دور ختم ہو کر نیا دور شروع ہوتا تھا اس لیے وحی الٰہی کی تاریخ کو بھی انھیں دو بڑے دوروں میں تقسیم کر کے محفوظ رکھا گیا اور فی الحقیقت تاریخ نزول کے لیے اس سے بہتر تقسیم عہد ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ علماے فن نے فیصلہ کر دیا، مدنی سورتوں سے مراد یہ نہیں کہ سرزمین

مدینہ ہی میں نازل ہوئی ہوں بلکہ ہجرت کے بعد جو سورتیں اتریں، وہ سب کی سب، مدنی ہیں اگر فتح مکہ کے بعد اثنا سے قیام مکہ میں بھی کوئی آیت اتری ہے تو وہ بھی اپنے عہد کے لحاظ سے "مدنی" ہی ہے، اگرچہ سرزمین مدینہ میں نہیں اتری۔

سورۂ فاتحہ مکی ہے یا مدنی

پس سورۂ فاتحہ کے متعلق پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی؟ یعنی پہلے عہد میں نازل ہوئی ہے یا دوسرے عہد میں؟ اس کا جواب خود قرآن حکیم میں موجود ہے۔ سورۂ حجر میں جو بالاتفاق مکی ہے، اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ کے متعلق خود فرما دیا ہے کہ وہ نازل ہوچکی ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ۔ (اور بلاشبہ ہم نے تجھے سات چیزیں دیں، بار بار دہرائی جانے والی اور قرآن عظیم) (حجر: ۸۷)

احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ جنھیں آگے چل کر تم پڑھو گے، بتلاتے ہیں کہ اس آیت میں "سات چیزوں" سے مراد سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں اور "مثانی" اس کا وصف ہے کہ وہ ہر روز نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہے اور مومن اسے بار بار دہرانے سے کبھی نہیں تھکتا۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ سورۂ فاتحہ قطعاً مکی ہے، کیونکہ اگر مکہ میں سورۂ حجر سے پہلے نازل نہ ہوچکی تھی تو خدائے تعالیٰ نے اس کا ذکر سورۂ حجر میں کیوں فرمایا؟

صحابہ و تابعین اور مفسرین

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس، ابومیسرہ، حسن، قتادہ، ابوالعالیہ وغیرہ کبار صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے اور حضرت علی علیہ السلام نے بھی اس کی تصریح کی ہے:

عن علی علیہ السلام قال نزلت فاتحۃ الکتاب بمکہ۔ (اسباب النزول للواحدی ص ۱۲) حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ سورۂ فاتحہ مکہ میں اتری۔

بالعموم تمام علماء و مفسرین و محققین کی جماعت اسی طرف گئی ہے۔ حافظ سیوطی نے "اتقان" میں لکھا ہے:

الاکثرون علی انہا مکیہ بل ورد انہا اول ما نزل۔ (ص: ۲۴) اکثر اس پر ہیں کہ یہ مکی ہے بلکہ یہ بھی آیا ہے کہ یہی سب سے پہلے اتری۔

متقدمین و متاخرین میں امام ابن جریر اور حافظ ابن کثیر جیسے آئمہ تفسیر بالحدیث کا بھی یہی مذہب ہے اور ان دونوں کے بعد کسی اور قال وقیل، قیاس و رائے کی طرف اعتنا کرنے کی ضرورت نہیں۔

مدنی ہونے کے دلائل

لیکن بحث کو صاف کر دینے کے لیے بہتر ہوگا کہ جن لوگوں کو سورۂ فاتحہ کے مدنی ہونے کا خیال ہوا ان کے دلائل پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ بعض صحابہ و تابعین کے متعلق مفسرین نے تصریح کر دی ہے، وہ سورۂ فاتحہ کو مدنی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر

لکھتے ہیں:

وقیل مدنیہ، قالہ ابوھریرۃؓ و مجاھدؒ و عطاؒ بن یسارؒ والزھریؒ۔	اور کہا گیا ہے کہ مدنی ہے۔ یہ قول ابوہریرہ، مجاہد، عطا اور زہری کا ہے۔

سعی تطبیق ہمارے مفسرین متاخرین اس اختلاف سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے دونوں قولوں کو جمع کرنے کی کوشش کی اور یہ قیاس کر لیا کہ سورۂ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی ہوگی۔ ایک بار مکہ میں جب نماز فرض ہوئی اور ایک دفعہ مدینہ میں جب قبلہ بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ قرار پایا۔ بلاشبہ یہ تطبیق کی عمدہ صورت تھی اور یہ بات بھی کچھ عجیب نہیں کہ سورۂ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی ہو کیونکہ سعادت انسانی کا پہلا سبق بھی وہی ہے اور آخری بھی وہی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کا کوئی ثبوت ہمارے سامنے نہیں۔ کسی صحابی اور تابعی نے اس کی تصریح نہیں کی اور محض قیاسات کی بنا پر ہم نزول قرآن کی تاریخ قرار نہیں دے سکتے۔

بعضوں نے کہا کہ سورۂ فاتحہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی۔ نصف مکہ میں اتری ہے اور نصف مدینہ میں، مگر وہ یہ بھول گئے کہ سورۂ حجر مکہ میں اتری ہے اور اس میں سورۂ فاتحہ کی ساڑھے تین آیتوں کی جگہ سات آیتوں کا ذکر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تطبیق اختلاف کے لیے ان تکلفات کی ضرورت ہی نہیں۔ تھوڑے سے غور کے بعد بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مدنی ہونے کی روایات میں کوئی قوت ایسی نہیں کہ انھیں ایک مستقل مذہب قرار دے کر بحث کی جائے۔

اصل روایت کا معاملہ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ صحابہ کرام میں سے بھی کسی نے اسے مدنی قرار دیا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس کے مکی ہونے کے متعلق حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسے اجلۂ صحابہ و مفسرین کی تصریحات موجود ہیں۔ حافظ ابن کثیر اور ابن عطیہ نے حضرت ابوہریرہؓ کا نام لکھا ہے۔ اول تو تفسیر قرآن کے بارے میں بمقابلہ حضرت علیؓ و حضرت ابن عباسؓ کے ان کے قول کو زیادہ وزنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ثانیاً یہ بھی مشتبہ ہے کہ واقعی ابوہریرہؓ کا یہ مذہب تھا بھی یا نہیں۔ دراصل یہ رائے تابعین میں سے حضرت مجاہد کی ہے اور انھیں سے زیادہ تر مشہور ہوئی۔ وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں، جیسے طبرانی نے اوسط میں نقل کیا ہے:

عن مجاھد عن ابوھریرہ ان ابلیس رن حین انزلت فاتحۃ الکتاب و انزلت بالمدینۃ۔ (اتقان ص: ۲۵)	مجاہد نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ شیطان چیخ اٹھا جب سورہ فاتحہ نازل ہوئی اور وہ مدینہ میں اتری۔

لیکن حافظ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں:

و یحتمل ان الجملۃ الآخرۃ مدرجۃ من قول مجاھد۔ (ص ۲۵)	اور اس کا احتمال ہے کہ آخری جملہ مجاہد کے قول سے داخل روایت ہو گیا ہو۔

یعنی بہت ممکن ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول صرف اسی قدر ہو کہ ان ابلیس رن اور آخر میں اتنا ٹکڑا کہ وہ مدینہ میں اتری خود مجاہد کی جانب سے ہو۔

مکی ہونے کا قطعی ثبوت

رہا یہ امر کہ حضرت مجاہد کا مذہب ایسا کیوں تھا؟ لیکن جب صحابہ کا مذہب ہمیں معلوم ہو گیا ہے تو یہ امر چنداں لایق اعتنا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھیں اس بارے میں سہو ہو گیا یا کسی وجہ سے اشتباہ میں پڑ گئے۔ واحدی اسباب النزول میں مجاہد کی راے نقل کر کے لکھتے ہیں:

قال الحسین بن الفضل لکل عالم هفوة هذه بادرة عن مجاهد لانه تفرد سهوا القول والعلما على خلافه و مما يقطع به انها مكية قوله تعالى ولقد آتينك سبعاً من المثانی..... الخ (ص ۱۳)

حسین بن الفضل نے کہا کہ ہر عالم کے اقوال میں ایک ایک بات لغو ہوتی ہے اور مجاہد کا یہ قول بھی ایسا ہی ہے اور ان کی ذات سے ایسی غلطی کا ہونا تعجب انگیز ہے۔ علماء اس کے خلاف کہتے ہیں تنہا انھی کی یہ راے ہے۔ سورۂ حجر میں موجود ہے کہ ولقد آتینک سبعاً من المثانی اور اس سے مراد فاتحہ ہے۔ پس قطعی طور پر اس کا مکی ہونا ثابت ہو گیا۔

امام واحدی کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سورۂ فاتحہ کے مدنی ہونے کی نسبت صرف مجاہد کا یہ مذہب ہے کیونکہ حسین بن الفضل نے "تفرد" کا لفظ کہا ہے۔ پس یہ کہنا کہ اس بارے میں دو مذہب ہیں کسی طرح صحیح نہیں۔ تمام صحابہ و علما کا مذہب ایک ہی ہے اور وہ یہی ہے کہ سورۂ فاتحہ مکی ہے۔ صرف ایک شخص یعنی حضرت مجاہد کا قول خلاف ہے۔ بعض اور نام بھی اگر ہمارے سامنے آجاتے ہیں تو وہ غالباً انھیں کے قول سے متاثر ہوے ہیں۔

پہلی وحی

اب اس کے بعد دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مکی سورتوں میں بھی سب سے پہلی سورت کون سی ہے؟ سورۂ فاتحہ جسے پہلی ہونا چاہیے یا کوئی اور سورت؟

اس کے متعلق علماے فن کے حسب ذیل اقوال ہیں:

۱۔ امام بخاری نے "بدء الوحی" میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک مفصل روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے پہل کیونکر وحی نازل ہوئی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سب سے پہلے رویاے صادقہ شروع ہوے پھر آپ نے خلوت و گوشہ نشینی اختیار کر لی، غار حرا میں آپ اکثر جاتے اور رات بھی وہیں بسر کرتے یہاں تک کہ نور حق ظاہر ہوا۔

وجاء الملك فيه فقال: اقراء قال

اور اللہ کے فرشتے نے ظاہر ہو کر کہا "اقرأ" یعنی پڑھ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : ما انا بقاری ...... فقال : اقراء باسم ربک الذی خلق .... الخ

آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں، کیونکر پڑھوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اسی طرح اس نے تین بار کہا۔ آخری بار کہا: اقرا باسم ربک الذی خلق ، اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی لیا ہے نیز بہ اختلاف جزئیات الفاظ، حاکم، طبرانی و بیہقی وغیرہ سے بھی مروی ہے۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ سب سے پہلی سورت جو نازل ہوئی ہے وہ سورت اقرأ ہے اور چونکہ امام بخاری نے "کیف کان بدأ الوحی" (وحی کیونکر شروع ہوئی) کا باب اسی حدیث کی بنا پر قایم کیا ہے۔ اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب کا مذہب بھی یہی تھا۔ اکثر محدثین اور علماء کا یہی مذہب ہے اور بہ کثرت تابعین و آئمہ سے منقول ہے۔ مجاہد اور زہری کے اقوال حافظ سیوطی نے نقل کیے ہیں۔ (اتقان : ۵۲)

دوسرا قول

دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے "سورہ مدثر" نازل ہوئی، امام بخاری و مسلم نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا:

سالت جابر بن عبد اللہ : ای القرآن انزل قبل؟ قال یا "ایھا المدثر" قلت : او اقراء باسم ربک؟ قال : احدثکم ما حدثنا بہ رسول اللہ ، قال صلی اللہ علیہ وسلم انی جاورت بحرا فلما قضیت جواری نزلت فاستبطنت بطن الوادی فنودیت فنظرت امامی و خلفی و عن یمینی و عن شمالی ، فلم وراحدا ......

میں نے جابر بن عبداللہ سے پوچھا کہ قرآن میں سے کونسی چیز پہلے اتری؟ کہا: ایھا المدثر۔ میں نے کہا یا اقرا باسم ربک۔ جابر نے کہا میں تم سے وہی کہتا ہوں جو ہم سے رسول اللہؐ نے بیان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے غار حرا میں قیام کیا جب میرا زمانۂ قیام ختم ہوا تو وہاں سے نکلا اور وادی میں سے گزرنے لگا۔ میں نے سنا کہ مجھے کوئی پکار رہا ہے۔ میں نے اپنے سامنے پیچھے دہنے بائیں نظر ڈالی لیکن کوئی نظر نہ آیا......

ثم نودیت فرفعت راسی فاذا ھو علی العرش فی الھوا یعنی جبریل فاخذنی رجفة فاتیت خدیجه فامرتھا فدثرونی نزل اللہ "یا ایھا المدثر قم فانذر"۔ (مسلم)

اسی طرح تین بار آواز سنی۔ پھر میں نے اوپر سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ہوا میں ایک کرسی پر بیٹھا ہے یعنی جبریل۔ یہ دیکھ کر مجھ پر سخت اضطراب طاری ہوا۔ میں خدیجہؓ کے پاس آیا اور کہا مجھے کپڑا اوڑھا دو چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس پر اللہ نے اتارا: یا ایھا المدثر۔

تیسرا قول

تیسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نازل ہوئی۔ امام واحدی نے عکرمہ اور حسن کا قول نقل کیا ہے کہ:

اول ما نزل من القرآن بسم الله الرحمن الرحيم — سب سے پہلی چیز جو قرآن میں سے اتری وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ (اسباب النزول: ۹)

چوتھا قول

چوتھا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی امام واحدی نے ابومیسرہ سے روایت کیا ہے کہ ابتدأً میں آنحضرت صلعم ایک آواز سنتے، جو ان کا نام لے کر پکارا کرتی تھی۔ جب آپ نے اس صدا کے جواب میں لبیک کہا تو اس نے کہا:

قل الحمد لله رب العلمين حتّٰى فرغ من فاتحة الكتاب۔ (اسباب النزول) — کہ الحمد للہ رب العٰلمین چنانچہ آخر تک سورۃ فاتحہ اس نے پڑھ دی۔

اس کے بعد امام واحدی لکھتے ہیں۔ وهٰذا قول علی بن ابی طالب (اور یہ قول حضرت علی علیہ السلام کا ہے) امام بیہقی نے بھی "دلائل" میں یہی روایت نقل کی ہے مگر لکھا ہے کہ حدیث مرسل ہے البتہ راوی تمام ثقہ ہیں۔ صاحب "کشاف" نے اس قول کو اکثر مفسرین کا مذہب لکھا ہے۔

و اکثر المفسرين الی ان اول سورة نزلت فاتحة الكتاب۔ — اور اکثر مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ سب سے پہلے سورۃ فاتحہ اتری ہے۔

مگر حافظ ابن حجر عسقلانی نے "کشاف" کے بیان سے انکار کیا ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کی روایت آغاز وحی کے خلاف ہے اور لکھا ہے کہ اکثر کا یہی مذہب ہے سب سے پہلے اقراء نازل ہوئی۔

مفسرین متاخرین اور متن حدیث

اس آخری قول کی نسبت ایک اور روایت میری نظر سے گزری ہے جو صاحب تفسیر نیشاپوری نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں لکھی ہے:

قد صح عن النبی صلی الله علیه وسلم فی حدیث ابی بن کعب انها من اول ما نزل من القرآن وانها السبع المثانی۔ (برحاشیہ طبری ۱: ۷۲) — بلاشبہ ابی بن کعب کی حدیث میں آنحضرت سے یہ قول ثابت ہو چکا ہے کہ سورۂ فاتحہ ہی قرآن میں سے پہلی چیز ہے جو نازل ہوئی اور وہی السبع المثانی ہے۔

لیکن مفسر موصوف کا یہ قول ان کی ناواقفیت من حدیث و تساہل نقل و روایت پر شاہد ہے اور اس امر کا ایک بین ثبوت ہے کہ مفسرین متاخرین کا یہ طبقہ فن حدیث سے کس قدر ناآشنا ہے اور اگر ایک شخص ان لوگوں پر اعتماد کر لے تو وہ کیسی سخت غلطیوں میں اپنے آپ کو غرق پائے گا۔

یہ عبارت پڑھ کر ہر شخص یہی سمجھے گا کہ حضرت ابی ابن کعب نے کوئی روایت نقل کی ہے اور اس میں صاف صاف

موجود ہے کہ قرآن میں سے پہلی چیز جو اتری وہ سورۂ فاتحہ ہے حالانکہ اصلیت اس کے بالکل خلاف ہے۔ تمام کتب صحاح میں حضرت ابی بن کعب کی کوئی روایت ایسی نہیں جس میں یہ موجود ہو کہ انہا اول ما نزل من القرآن اور نہ عام مجامع و اسفار حدیث میں کوئی روایت اس مضمون کی مل سکتی ہے۔

ابی بن کعب کی روایت

بلاشبہ ابی بن کعب کی ایک مفصل روایت فضیلت فاتحہ کے متعلق موجود ہے، جسے اصحاب صحاح و مسانید نے بالاتفاق روایت کیا ہے اور جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سورۃ فاتحہ السبع المثانی ہے لیکن اس روایت میں یہ کہیں بھی نہیں کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے اتری۔

اسی ایک واقعے سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ ان مفسرین متاخرین کی روایات مندرجۂ تفسیر کا کیا حال ہے۔ ان کے علاوہ عام مفسرین کے اور بھی مختلف اقوال ہیں مگر یہ مسئلہ فن حدیث کی معلومات سے تعلق رکھتا ہے اور اس بارے میں مفسرین محض کے اقوال قابل اعتنا نہیں۔

باب ۱۴

حقیقت انبعاث وحی

مختلف اقوال و روایات کیوں؟ اب ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ان تمام روایات پر نظر ڈالیں اور کسی تشفی بخش حقیقت تک پہنچ سکیں۔

سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ قرآن حکیم کے آغاز وحی و تنزیل کے متعلق اس قدر مختلف اقوال و روایات کیوں ہیں اور کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تاریخ تنزیل قرآن کی ابتدا محقق و واضح نہیں؟

لیکن ہمارے نزدیک ایسا اعتراض کرنا محض تقصیر نظر و عدم ذوق فن کا نتیجہ ہوگا۔ بظاہر اگرچہ ان روایات میں اختلاف نظر آتا ہے مگر فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں۔ سب ایک ہی حقیقت کو واضح کر رہی ہیں اور ان چاروں قولوں میں سے (جو پیشتر نقل ہو چکے) کوئی بھی قول ایسا نہیں جو اصلاً غلط ہو۔ متاخرین کی ایک عام غلطی یہ ہے کہ وہ تطبیق و تحقیق روایات مختلفہ کی کوشش بہت کم کرتے ہیں اور اگر ایک ادنیٰ سا اختلاف بھی دو بیانوں میں نظر آجاتا ہے تو فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ دو مختلف مذہب اور قول ہیں اور فن حدیث میں تو اس طرح کا تساہل عموماً کیا گیا ہے اور تمام علوم سے زیادہ خطرناک ہے۔

حقیقت انبعاث وحی سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس مسئلے کو سمجھنے میں عموماً ایک بنیادی غلطی ہو جاتی ہے اور جب تک وہ غلطی صاف نہ ہو جائے حقیقت واضح نہیں ہو سکتی۔

ایک چیز ہے قرآن حکیم کی پہلی سورت جو صاحب قرآن پر نازل ہوئی، ایک چیز ہے سب سے پہلی وحی، جس سے سلسلۂ تنزیل وحی شروع ہوا۔ یہ دو مختلف چیزیں ہیں لیکن بہت سے لوگ اس میں فرق نہیں کرتے۔ اس لیے جب کبھی ان دونوں حالتوں کے متعلق مختلف بیانات نظر آتے ہیں تو اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ ایک ہی حقیقت کے متعلق دو مختلف بیان ہیں۔

مراتب ظہور حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی حیات مقدسۂ نبوت کے مختلف مراحل و مراتب ہیں اور ایک مرتب و منظم سلسلۂ عروج کے ساتھ وہ یکے بعد دیگرے ہر منزل سے گزرتے ہوئے آخری منزل تک پہنچتے ہیں۔

ان میں سے ہر مقام اور ہر منزل کے لیے خاص حالات و واردات ہیں اور قرآن نے ان سب کی تشریح کی ہے۔

پہلی مثال نبوت ایک بیج ہے جو انبیائے کرام کی سرزمین قلب میں ودیعت کیا جاتا ہے اور وہ اندر ہی اندر نشو و نما پاتا اور مختلف ابتدائی مراتب و انبساط سے گزرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے

جب اس کی قوت نشو و نما بحدِ کمال تک پہنچ جاتی ہے اور اس کی شاخیں اُبھرنے اور پھیلنے کے لیے ایک فضائے وسیع کو ڈھونڈتی ہیں۔ اس وقت سے اس کی قوت نشو کا ابھار بے قرار ہو کر زور مارتا اور ابھرنے کے لیے جوش کھاتا ہے پس زمین شق ہوتی ہے اور مخفی قوت نشو اپنے ابھرنے کی راہ نکال لیتی ہے اس کے بعد انشعاب و ظہور کا دور آتا ہے اور اس کی پھیلی ہوئی شاخوں سے زمین کی بالائی سطح گھر جاتی ہے۔

دوسری مثال

یا مرتبۂ نبوت کے ظہور سے پہلے انتظار و بلوغ کی ایک رات ہوتی ہے جس کے گھنٹے یکے بعد دیگرے گزرتے جاتے ہیں اور رات تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے تاکہ جلد ختم ہو اور صبح کی نمود شروع ہو جائے۔ پس ایسا ہوتا ہے کہ سب سے پہلے آفتاب نہیں آتا بلکہ آفتاب کے طلوع ہونے کے آثار آتے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ افق پر آہستہ آہستہ سفیدی پھیلنے لگتی ہے۔ یہ سفیدی بڑھنے لگتی ہے اور اس کے بڑھنے کے ساتھ ہی تاریکی کا پردہ بھی جلد جلد چاک ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ ظہور اجلال آفتاب کا وقت موعود آجاتا ہے اور مشرق کی جانب سے روشنیوں اور نورانیوں کا تخت درخشاں یکایک طلوع ہو جاتا ہے۔

پھر اس طلوع کے بھی مختلف مدارج ہیں اور روشنی متعدد تدریجی منزلوں سے گزر کر آخری مرتبۂ ظہور تک پہنچتی ہے سب سے پہلے ایک روشن چہرہ نظر آتا ہے۔ پھر وہ اونچا ہوتا ہے اور اس کی ہلکی ہلکی شعاعیں بلند میناروں اور بالاخانوں کی چھتوں پر پڑنے لگتی ہیں نیچے کی زمینیں اس سے محروم رہتی ہیں۔ پھر شعاعیں زیادہ بلند اور تیز ہونے لگتی ہیں اور وہ وقت آجاتا ہے جب زمین کا ہر بالا و پست حصہ روشنی دیکھ لیتا ہے۔ یہ چاشت کا وقت ہوتا ہے۔

آخری مرتبۂ کمال

اس کے بعد آخری مرتبہ کمال نصف النہار کا وقت ہے۔ اس وقت سورج کا قہر حرارت اور اعلان تجلی آخری درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ تکمیل حرارت کے لحاظ سے اس کی گرمی زمین کے ایک ایک ذرّے تک پہنچ جاتی ہے کوئی آنکھ اس کی چمک کا حریفانہ مقابلہ نہیں کرسکتی اور تکمیل نورانیت و تجلی کے لحاظ سے اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ ایک طرف غار اور تہ خانے تک دن کے وجود کی شہادت دینے لگتے ہیں، دوسری طرف نہایت کم بصارت والی بیمار اور دھندلی آنکھیں بھی روشنی کو پالیتی ہیں اور ٹھوکر سے بچ جاتی ہیں۔ البتہ اندھا ہر حال میں نہیں دیکھے گا۔ اس کے لیے نصف شب کی تاریکی، صبح کی سفیدی، چاشت کی نورانیت اور نصف النہار کی تجلی سب یکساں ہیں۔

سواءٌ علیھم ءَ أنذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ۔ (سورۂ بقرہ ۶)

(جن لوگوں نے سچائی کے سننے اور قبول کرنے کی استعداد کھو دی ان کے لیے ہدایت کی تمام صدائیں بیکار ہیں، تم انھیں (انکار حق کے نتائج سے) خبردار کرو یا نہ کرو، وہ ماننے والے نہیں۔ ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر لگادی اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔

پس پہلے رات ہوتی ہے اور صبح کا انتظار، پھر انفلاق صبح ہوتا ہے یعنی سیاہی پھٹتی ہے اور سفیدی اس کے اندر سے پھوٹ کر نمایاں ہونے لگتی ہے پھر ظہور فجر ہے یعنی صبح آگئی اور سورج کا جمالِ پنہاں بے نقاب ہوگیا۔ پھر مرتبہ ضحیٰ ہے، یعنی سورج اچھی طرح نمایاں ہوگیا اور دھوپ پھیلنے لگی۔ اس کے بعد دن ہے، جب سورج کی تجلی کمال مرتبہ ظہور و سلطان تک پہنچ جاتی ہے۔

ظہور نبوت کی چار منزلیں

اسی طرح ظہور آفتاب نبوت و احاطہ و سلطانِ دین الٰہی کے لیے بھی بالترتیب چار ہی منزلیں ہوتی ہیں جو انبیائے کرام علیہم السلام کو پیش آتی ہیں اور جن کی طرف سورۃ الشمس، والضحیٰ، فجر وغیرہ میں اشارہ کیا گیا ہے اور جس کی حقیقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں "فکان لا یری رویا الا جاءت مثل فلق الصبح[1]" سے بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ پس انتظار کی رات ہے جس کے گھنٹے یکے بعد دیگرے گزر جاتے ہیں تاکہ جلد سے جلد صبح کو پالیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جو انبعاث وحی الٰہی کے آنے سے پہلے کا زمانہ ہوتا ہے اور ایسی حالت ہوتی ہے، جیسے بیج کے اندر ہی اندر نشوونما پانے سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد مرتبہ، انفلاق صبح کا ہے، جب کہ انتظار کی رات ختم ہوجاتی ہے مگر طلوع آفتاب کے آنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہوتی ہے۔ یہ وقت عجیب و غریب قسم کا ہوتا ہے جس کے سمجھنے کے لیے ہمیں صرف تصور صحیح و بالغ سے کام لینا چاہیے۔ ہم لفظوں میں اس کے لیے کچھ نہیں پا سکتے۔

حقیقت انبعاث

شاید اس حالت کا ایک خفیف سا تصور ہمیں یوں حاصل ہوسکے کہ ہم دنیا کے انقلابات مادیہ پر نظر ڈالیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا میں ایک مواد بتدریج تیار ہوتا اور پکتا ہے۔ پھر جب اس کی تیاری مکمل ہوچکتی ہے تو اس پر ایک سخت ہیجانی اور التہابی حالت طاری ہوجاتی ہے یعنی اس کے اندر ایک شدید بھڑک اور بے قراری پیدا ہوجاتی ہے اور چاہتی ہے کہ تمام حائل پردوں کو چاک چاک کر دے اور ابھر کر پھٹ اٹھے۔ اس التہاب کا نتیجہ انفجار ہوتا ہے، یعنی بالآخر وہ پھٹ اٹھتا ہے اور اپنے دور نمو و ظہور کو ختم کر دیتا ہے۔

قرب ظہور نبوت

اسی سے عالم روحانیات و قدسیات کے واردات کے لیے ایک ناقص مثال کا کام لو۔ مرتبۂ نبوت کے ظہور کا وقت بھی جب بالکل قریب آجاتا ہے تو قوت الٰہیہ نبویہ کی تکمیل ابھرنے اور ظاہر ہوجانے کے لیے کھولنے اور جوش مارنے لگتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس مرتبے میں پہنچ کر انبیائے کرام علیہم السلام پر ایک سخت التہابی ارادہ طاری ہوجاتا ہے۔ ایک غیر نفسانی اضطراب اور ایک پاک و منزہ بے قراری سے

---

[1] آپ جو خواب دیکھتے، صبح کی روشنی کی طرح اس کی سچائی ظاہر ہوجاتی (بخاری) اس ارشاد سے رویائے صالحہ کی حقیقت و کیفیت بالکل واضح ہوجاتی ہے۔

ان کی روحِ مقدس معمور ہو جاتی ہے۔ اگر مرتبۂ نبوت ایک بیج ہے تو یہ وہ وقت ہوتا ہے جب مخفی طاقت بالکل کامل و مستعد ہوکر، اس فوارے کی طرح، جس کا بالائی منفذ نہ کھولا گیا ہو، پھٹ اٹھنے اور نکل آنے کے لیے کھولنے اور ابلنے لگتی ہے۔ اگر وہ افقِ حقیقت و الٰہیت کا ایک طلوع نورانیت ہے تو یہ وہ وقت ہوتا ہے جب شبِ انتظار ختم ہو چکی ہوتی ہے اور جس جمالِ صبح کے لیے رات والہانہ و بے قرارانہ دوڑتی آئی تھی، اسے بالکل قریب پاکر سورج کے لیے اضطراب کرتی اور اس کے چہرۂ درخشاں کے لیے تڑپتی اور بے قرار ہو جاتی ہے۔

بے خودانہ اضطرابِ عشق

پس اس وقت انبیائے کرام پر ایک بے خودانہ اضطراب و التہابِ عشق کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ ایک غیر معلوم حقیقت کے لیے بے قرار، ایک غیر متعین معشوق کی جستجو میں سرگرداں اور ایک غیر مفہم انکشاف و انبعاث کی فکر میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کی روحانیت نبوت اس وقت بے قرار ہو ہو کے اور تڑپ تڑپ کے کسی غیر متعین حقیقت کو ڈھونڈنے اور پکارنے لگتی ہے اور ان کا اضطراب یکسر ایک صدائے جستجو اور دعوتِ سوال ہوتا ہے کہ اسے وہ کہ آنے والا، نکلنے والا اور طلوع ہو جانے والا ہے، تو کہاں ہے؟ کیوں اپنے چہرے سے نقاب نہیں الٹ دیتا، کیوں اپنے جمالِ درخشاں سے ظلمتوں اور اندھیاریوں کو دور نہیں کر دیتا؟

جب کچھ دنوں تک، جیسے حکمتِ الٰہی نے قرار دے دیا ہے، یہ مضطربانہ حالت طاری ہو چکتی ہے تو پردوں کے پھٹنے، تاریکیوں کے یکسر شق ہو جانے، بدلیوں کے یک قلم چھٹ جانے اور آثارِ صبح کے نہیں بلکہ خود وجودِ صبح کے طلوع ہو جانے کا وقت اچانک آجاتا ہے اور اس کے ظہور کے لیے یہ اضطرابی اور التہابی حالت بالکل اس طرح محرک و داعی ہو جاتی ہے جس طرح ایک عاشق کی انتہائی بے قراریاں معشوق کے لیے بے تابانہ نکل آنے کے لیے یا کسی مستعد مواد کا شدتِ التہاب اس کے انفجار و انشقاق کے لیے یا موسم کی سخت گرمی اور اس آسمان پر بدلیوں کے چھا جانے اور بارانِ رحمت کے لیے ابل پڑنے کے لیے۔

سو اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ اضطراب و التہاب حد درجے تک پہنچ جاتا ہے اور اس لیے وحیِ الٰہی بھی اپنی پہلی نمود میں تسکین و تسلی کی صدا بن کر چمکتی ہے اور سب سے پہلے اس غیر متعین عشق و طلب کو ایک متعین یقین و معرفت کے مرتبے میں لاتی ہے۔ عشق کو معشوق، طلب کو مطلوب اور پکار کو جواب مل جاتا ہے پھر فعل و انفعال، جذب و انجذاب، اثر و تاثیر دونوں باہم جڑ جاتے اور مل جاتے ہیں اور صبح کی سفیدی بڑھتے بڑھتے مرتبہ منتہیٰ تک پھر "والنہار اذا تجلّی" تک پہنچ جاتی ہے۔

افتتاحِ وحی

دوسرے لفظوں میں افتتاحِ وحی کا یہ پہلا مرتبہ ہوتا ہے جو اس لیے ہوتا ہے کہ دروازہ کھلنے کا اعلان کرے اور شخصِ اعظم رسالت کو آئندہ آنے والے کاموں کے لیے تعلیم دے کر تیار کر دے۔ اگر وجود

نبوت کا رشتہ انسانوں سے ایک معلم وجود کا ہے تو یہ گویا وحی کا وہ اولین ظہور ہوتا ہے جو انسانوں کی تعلیم کے لیے اس معلم کو نہیں بھیجنا چاہتا، بلکہ خود معلم پر سرچشمہ علم کو کھولنا چاہتا ہے۔

سو یہی وہ مرتبہ ظہور کے قرب کی بے چینی اور بے قراری تھی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی سینا کے کوہ وبیاباں میں ایک پاک اور ملکوتی سرگردانی بخشی تھی اور وہ ایک غیر متعین مطلوب کے عشق میں بغیر اس کے کہ جہت و ارادہ مقرر کریں والہانہ وبے تابانہ نکل کھڑے ہوئے تھے۔ پھر یہی وہ اضطراب ظہور والتہاب نمود نبوت تھا جو ظہور وحی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں نظر آتا ہے جس نے تمام علائق دنیوی سے کنارہ کشی کرا کے آپ کو غار حرا کے ایک ایسے گوشے میں معتکف کرا دیا تھا جہاں دنیا اور دنیا والوں کی صدائیں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ وہ پاک گھبراہٹ، وہ منزہ بے قراری جو آپ کی رُوح مقدس پر طاری ہوتی تھی جو رُک رُک کر ابھرتی اور ٹھہر ٹھہر کے بڑھتی تھی اور جو اس حد تک پہنچ گئی کہ کبھی "قد خشیت علی نفسی[1]" سے اس کی تعبیر کی گئی ہے اور کبھی "یتردی من رؤوس شواھق الجبال[2]"۔ سو یہ تمام واردات اسی مقام کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پھر یہی واردۂ مقدسہ نبوت ہے جس کی طرف "ووجدک ضالاً فھدیٰ[3]" میں اشارہ کیا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے جس سے کبھی دثرونی، دثرونی کی صدا اٹھی ہے اور کبھی زملونی زملونی کی[4] اب اصل مقصود کی طرف توجہ کرو۔ یہ اضطراب اپنے اندر ایک نہایت قوی و طاقتور داعیہ وحی رکھتا ہے اور اس لیے جب طلب کی بے قراری حد درجے تک پہنچ جاتی ہے تو مطلوب کا چہرہ بھی تسکین وتسلی کے لیے اچانک بے نقاب ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ عالم طاری تھا تو یکایک انھوں نے وادی ایمن کے بقعہ مبارکہ میں ایک روشنی کی چمک دیکھی اور اس کے اندر سے پکار اٹھی کہ اے موسیٰ تم جس حقیقت غیر متعینہ کے (جویا ہو) وہ بھی تمھیں ڈھونڈ رہی ہے اور وقت آگیا ہے کہ وحی الٰہی تمھیں اختیار کرے۔

فلما اتٰھا نودی یٰموسیٰ انی انا ربک فاخلع — پس جب موسیٰ قریب آئے تو انھوں نے ندائے ربانی سنی:

---

[1] "مجھے اپنی جان کے بارے میں خوف ہے"! مولانا شبلی مرحوم بالکل درست فرماتے ہیں: یہ تردد، یہ اضطراب، جلال الٰہی کا تاثر (اور نبوت کے بارگراں کی عظمت کا تخیل تھا) [2] یہ فترۃ وحی یعنی وحی رک جانے کے زمانے کی کیفیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ پر چڑھ جاتے اور جی چاہتا اپنے آپ کو نیچے گرا دیں۔ حقیقتہً یہ وہی اضطرابی و التہابی کیفیت تھی جس کی توضیح مولاناؒ فرما رہے ہیں۔ [3] سورۃ والضحیٰ: اے رسولؐ! اللہ نے تجھے اپنی تلاش میں سرگرداں پایا اور تجھے ہدایت کا راستہ بتا دیا۔ [4] دونوں کا مطلب ہے مجھے کوئی کپڑا اڑھا دو۔ یہی موقع ہے جب "یا ایھا المدثر" کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں۔ قاضی سلیمان مرحوم و مغفور نے "مدثر" کا ترجمہ کیا ہے: اے درست کرنے والے (عالم کے) یقیناً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالم کے درست کرنے والے تھے لیکن یہاں موقع اور محل کے اعتبار سے اے کپڑا اوڑھنے والے ہی مناسب ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى. وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ. إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي. إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ.

(طٰہٰ : ۱۱-۱۵)

اے موسیٰ میں ہوں تمہارا پروردگار قدوس، پا برہنہ ہو کر آؤ۔ تم اس وقت وادی مقدس طویٰ میں ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہیں اپنی صداقت کی تبلیغ و دعوت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ پس جو کچھ تم پر وحی کیا جاتا ہے، اسے سنو اور اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ میں ہی خدائے واحد ذوالجلال ہوں میرے سوا اور کوئی نہیں۔ میری ہی بندگی کرو اور میرے ہی ذکر کے لیے نماز قائم کرو بلاشبہ فیصلہ کرنے والا دن آنیوالا ہے ہم اس گھڑی کو پوشیدہ رکھنے والے ہیں تاکہ ہر انسان اپنے ان اعمال کا نتیجہ پالے جن کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔[۱]

پس یہ اولین ندائے حق جو حضرت موسیٰ (علی نبینا وعلیہ السلام) نے سنی۔ وحی الٰہی کا سب سے پہلا انکشاف تھا اور جو صرف اس لیے تھا تاکہ بند دروازہ کھل جائے اور شخص نبوت اپنے سامنے اپنے قرار دادہ اور طے شدہ کاموں کو پالے۔ یہ معلمِ حق کے لیے تعلیم کا اولین افتتاح تھا۔

رسول اکرمؐ کا وارد ۂ نبوّت

ٹھیک ٹھیک اسی صدائے حق کے مقابلے میں وہ وارد ۂ نبوت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غارِ حرا کی گوشہ نشینی کے ایام مبارکہ میں طاری ہوا۔ جس طرح وہاں تکمیل وقت نے ایک اضطراب والتہاب روحانی حضرت موسیٰؑ پر طاری کر دیا تھا، اسی طرح یہاں بھی وقت ظہور کے قرب نے ایک مقدس و پاک بے قراری شخص اقدس و اعظم نبوت پر طاری کر دی اور دیکھو کہ آبادی کا قیام ترک کر کے اور دنیوی علائق سے کنارہ کش ہو کر ایک پہاڑ کے غار کو اپنی روحانیت کا مسکن بنایا جس طرح وہاں داعیۂ نبوت کا اضطراب بالآخر ظہور سلسلۂ وحی کے لیے (محرک) ہوا اسی طرح یہاں عشق ظہور کی بھڑک اور استعجال نمود کی ملکوتی شورش انبعاث وحی کی بارش کے لیے طلب کی پیاس بنی۔ پھر جس طرح وہاں روشنیوں کے اندر سے ندا اٹھی تھی اسی طرح یہاں

---

[۱] ان آیات کا ترجمہ ترجمان القرآن میں یوں کیا گیا ہے، پھر جب وہ (یعنی موسیٰؑ) وہاں پہنچا تو اس وقت پکارا گیا (ایک آواز اٹھی کہ) اے موسیٰ میں ہوں تیرا پروردگار، پس اپنی جوتی اتار دے تو طویٰ کی مقدس وادی میں ہے اور دیکھ میں نے تجھے (اپنی رسالت کے لیے) چن لیا ہے پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی بندگی کر، میری ہی یاد کے لیے نماز قائم کر۔ بلاشبہ (مقررہ) وقت آنے والا ہے میں اسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں تاکہ (لوگوں کے یقین و عمل کی آزمائش ہو جائے اور) جس شخص کی جیسی کوشش ہو اس کے مطابق بدلا پائے۔

بھی ناموس اکبر نے ظاہر ہو کر سلسلہ وحی کا اولین مرتبۂ تعلیم شروع کیا۔ وہاں صرف آواز تھی اور صرف چنگاریوں کی نمود، کیونکہ مرتبہ موسیٰ اتنے ہی کا متحمل تھا، پر یہاں ندائے محض اور نمود نور کی جگہ ناموس اکبر نے اپنا وجود ظاہر کیا کیونکہ مرتبۂ محمدی کا مقام دوسرا تھا ولنعم ما قیل؛

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پر تو صفات

تو عین ذات مے نگری ، در تبسمی

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ (سورہ نجم ۵-۹)

اس کو سکھلایا سخت قوتوں والے نے، زور آور نے، پھر سیدھا بیٹھا اور وہ تھا اونچے کنارے پر آسمان کے پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا پھر رہ گیا فرق دو کمان کے نزدیک بلکہ اس سے بھی نزدیک[۱]

سو جس طرح وہاں اولین مخاطبہ وحی یوں ہوا تھا کہ" انا اخترتك فاستمع لما یوحیٰ" (میں نے تجھے دعوت حق اور تبلیغ حکم الٰہی کے لیے اختیار کر لیا ہے یعنی چن لیا ہے تو میرے پیغاموں اور حکموں کو سن تا کہ دنیا والوں کو پہنچا سکے) اسی طرح یہاں اولین مخاطبہ یوں ہوا کہ ملاء اعلیٰ کا ناموس اکبر ظاہر ہُوا اور اس نے کہا" اقراء" پڑھ اور پڑھنا اور بیان کرنا شروع کر۔ پھر اس کے بعد مرتبۂ حکم" انذار" آیا اور ندا اٹھی" قم فانذر" تو چادر اوڑھ کر لیٹا ہوا ہے حالانکہ تمام عالم انسانیت تیرے جمال و دیدار کے لیے بے تاب ہے۔ اٹھ کہ انتظار کا وقت ختم ہو گیا اور ڈرا کر ڈرانے کا وقت آ گیا۔

---

[۱] مولاناؒ نے ترجمہ نہیں لکھا تھا۔ میں نے حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ نقل کر دیا ہے۔

باب ۱۴

انبعاث وحی اور تنزیل سور

انبعاث وحی اور تنزیل سور اس تمہیدی بیان سے تم پر واضح ہو گیا ہوگا کہ جب کبھی انبیائے کرام علیہم السلام پر تنزیل وحی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو ابتدا میں سلسلۂ وحی کے کھلنے اور مخاطبۂ الٰہی کے شروع ہونے کی اولین منزل نمودار ہوتی ہے یہ گویا خود وجود نبوت کی تعلیم کا پہلا مرتبہ ہوتا ہے اس کے بعد جب پردے اٹھ جاتے ہیں اور شخص نبوت کا ربط و علاقہ عالم وحی سے قائم ہو جاتا ہے تو سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور حکم انذار و تعلیم قوم و امت پہنچتا ہے۔ اس کے بعد جب تک اللہ کی حکمت چاہتی ہے اس سلسلے کو جاری رکھتی ہے۔

نیز تم پر یہ امر بھی واضح ہو گیا ہوگا کہ ایک چیز ہے وحی و مخاطبۂ الٰہی کا شروع ہونا اور ایک چیز ہے احکام و اوامر و بصائر الٰہیہ کی تنزیل و ترتیب، دونوں کو ملا نہیں دینا چاہیے۔

مسئلہ اولیت نزول اب ہم مسئلہ اولیت نزول قرآن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تمام روایات و دلائل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی وحی و مخاطبہ الٰہی کا جو افتتاح ہوا، وہ حکم "اقراء" سے ہوا، یعنی حکم ہوا وحی الٰہی کا پڑھنا شروع کرو۔ جب آپ ایسا کر چکے تو حکم تبلیغ ہوا "قم فانذر" اٹھو اور فرامین الٰہی کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ پس آپ اٹھے اور جب آپ اٹھے تو سب سے پہلی سورت جو قرآن اور "الکتاب" میں سے آپ پر اتاری گئی جو قرآن وحی الٰہی کا خلاصہ اور دین الٰہی کی حقیقت جامعہ اور صلوۃ الٰہی کی اصل و اساس تھی اور جس کے بغیر دعوت اسلام اور تعلیم امت مسلمہ ہو ہی نہیں سکتی تھی وہ سورۂ فاتحہ ہے یعنی پہلی سورت، جس سے تنزیل و تعلیم بھی شروع ہوئی اور ترتیب "الکتاب" بھی۔

اس سلسلے میں "اقراء باسم ربك الذی خلق" بہ منزلہ اس اولین صدا کے ہے جو وادی ایمن میں "انا اخترتك فاستمع لما یوحٰی" کے لفظوں میں سنائی دی تھی۔ "یا ایها المدثر، قم فانذر" بالکل ویسا ہی حکم ہے جیسا حضرت موسیٰ کو ہوا تھا:

اذهب الی فرعون انه طغیٰ۔ (طٰہٰ: ۲۳) فرعون کی طرف دعوت حق لے جاؤ اس نے بڑی ہی سرکشی کی ہے۔

حضرت موسیٰ کی دعوت بنی اسرائیل کی نجات اور مقابلۂ فرعون کے لیے مخصوص تھی، اس لیے حکم انذار میں فرعون کا

ذکر خاص طور پر کیا گیا، لیکن داعی اسلام کی دعوت پورے کرہ ارض اور نوع انسانی کی نجات اور تمام فراعنۂ و نماردۂ عالم کے مقابلے کے لیے تھی اس لیے حکم انذار میں کسی خاص قوم اور شخص کا نام نہیں لیا گیا بلکہ عام طور پر علی الاطلاق فرمایا "قم فانذر" اٹھو اور ڈراؤ۔

حیثیت اقراء یہ امر کہ نزول "اقراء" محض افتتاح وحی ہے نہ کہ نزول سورت، متعدد وجوہ سے بالکل واضح ہے سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ حضرت عائشہؓ کی روایت مندرجہ بخاری میں ہے کہ حضرت جبریل نے اپنے اولین ظہور میں تین بار صرف "اقراء" کہا اور آخری بار "مالم یعلم" تک۔ یعنی ابتدا کی چار آیتوں تک پڑھایا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ پوری سورت کا نزول نہ تھا، بلکہ صرف ابتدائی ٹکڑا تھا۔

پھر اس پر غور کرنا چاہیے کہ ابتدا کی ان چار آیتوں کا مطلب کیا ہے؟

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ۔

پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا[1]

ان آیتوں میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فضل اور حکمت و تعلیم کی طرف توجہ دلائی ہے جو ایک امّی سے تمام عالم انسانیت کا کام لے سکتی ہے۔ نیز علم و مرتبۂ علم کو ظاہر کیا ہے۔ پس یہ آیتیں آگے چل کر ایک سورت کی ابتدا قرار پائیں لیکن موقع محض وحی الٰہی کے افتتاح کا تھا اور اس میں وحی کے پڑھنے، باب علم و تعلم کے کھلنے اور مستعد کار ہو جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

یہ پہلی منزل تھی جو آپ کو پیش آئی۔ جب آپ پڑھ چکے اور علاقہ ربط و وحی قائم ہو گیا تو مرتبۂ تبلیغ و رسالت کا ظہور ہوا۔

"قم فانذر" دوسرا حکم آیا کہ اب کام شروع کر دو۔ یعنی "قم فانذر" یہ بھی کسی سورت کا نازل ہونا نہیں تھا، بلکہ صرف افتتاح وحی کے بعد کام کے شروع کر دینے کا حکم تھا۔ چنانچہ اسی روایت حضرت جابر بن عبد اللہ میں جس کے آخری ٹکڑے کو امام بخاری نے بھی کیف کان بدء الوحی میں لیا ہے بہ تصریح موجود ہے:

فقلت زملونی زملونی فانزل اللہ یا ایھا المدثر الیٰ قول فاھجر۔

پس میں نے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا "مجھے کپڑے میں لپیٹ دو۔ مجھے کپڑے میں لپیٹ دو۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل کیا "یا ایھا المدثر، فاھجر" تک۔

---

[1] یہ ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا ہے۔

یعنی آغاز سورۂ مدثر سے صرف اس قدر نازل کیا کہ،

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَاَنْذِرْ، وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ (سورۂ مدثر)

اے کپڑا اوڑھ کر پڑ جانے والے! اٹھ اور لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرا۔ اپنے پروردگار کی کبریائی کا اعلان کر۔ اپنی روح کو پاکی بخش اور منزہ رکھ اور بد اعمال قوم کی گندگیوں سے الگ ہو جا۔

پس ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں بھی صرف حکم انذار و تبلیغ ہے جو افتتاح وحی اور قیام رابطہ و علاقۂ مبدء تنزیل کے بعد دوسری منزل تھی۔ قرآن حکیم کے تعلیمی حصے میں سے یہ کوئی چیز نہیں اور یہ احکام خود ظاہر کر رہے ہیں کہ ابھی کام شروع نہیں کیا گیا۔ کام کرنے والے کو مستعد کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ قدما میں سے بھی بعض ارباب نظر نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں تطبیق دیتے ہوئے حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

وعبر بعضهم عن هذا بقوله اول ما نزل للنبوة "اقراء" و اول ما نزل للرسالة يا ايها المدثر۔ (اتقان ، ۵۴)

اور بعض نے یوں تطبیق دی ہے کہ سب سے پہلی چیز جو نبوت کے لیے اتری "اقراء" ہے اور سب سے پہلی چیز جو رسالت کے لیے نازل ہوئی، وہ "یا ایہا المدثر" ہے۔

زیادہ روشن رائے

اور اس سے بھی زیادہ روشن رائے وہ ہے جو بعض محققین و ارباب نظر کی نسبت سے ابو امامہ بن النقاش نے نقل کی ہے اور "مواہب لدنیہ" میں قسطلانی نے بھی اس سے استدلال کیا ہے۔ حیث قال:

كان فى نزول "اقراء" نبوته و فى نزول "مدثر" ارساله بالنذارة والبشارة وهذا قطعاً متاخر عن الاول، لانه لما كانت سورة "اقراء" متضمنة لذكر اطوار الآدمى من الخلق والتعليم و الافهام ناسب ان تكون اول سورة انزلت ، وهذا هو الترتيب طبعى وهو ان يذكر سبحانه اسداه الى نبيه من العلم و الفهم والحكمة والنبوة....... ثم يامر بان يقوم فينذر عباده۔

(مواہب جلد اول ص ۴۴)

"اقراء" کے نزول میں مقام نبوت کا حصول اور "مدثر" کے نزول میں رسالت کا یعنی ڈرانے اور بشارت دینے کا۔ اس کے نزول کو "اقراء" کے بعد ہی ہونا تھا کیونکہ سورۂ "اقراء" میں خلقت انسانی کے ان مختلف دوروں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق خلق، تعلیم و رشد اور ارتقا سے فہم و ادراک سے ہے۔ پس ضرور تھا کہ وہی آیتیں پہلے نازل ہوتیں اور سلسلۂ علم و تعلم کو ان کی تنزیل سے شروع کیا جاتا۔ یہ ایک ترتیب طبعی سلسلہ وحی کی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اس علم و حکمت اور نبوت کے مقامات کا ذکر کرے جن کے لیے اس نے شخص نبوت کو چن لیا ہے پھر اس کے بعد اس

چیز کی اطلاع دے جس کے لیے یہ مراتب اسے عطا کیے گئے۔

یہ اقوال دیکھ کر مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ جن بزرگوں کا یہ قول ہے یقیناً ان کا یہی مقصود تھا کہ افتتاح وحی و تنزیل میں بالترتیب دو منزلیں پیش آتی ہیں، پہلا مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ وجود نبوت کو وحی الٰہی کی جانب مخاطب کرے اور اس سے علاقۂ وحی قائم کیا جائے۔ اسے انھوں نے "نبوت" سے تعبیر کیا۔ دوسری تعبیر یہ ہے کہ جب رابطہ قائم ہو گیا تو اب کام کے شروع کر دینے کا حکم دیا گیا۔ یہ "رسالت" ہے یعنی احکام الٰہی کی تبلیغ اور انسانوں تک حکم خدا کو پہنچانا۔

اوّلین تعلیم

لیکن اب تک اصلی کام شروع نہیں ہوا ہے۔ اصل کام کیا ہے؟ "انذار" اور "بشارت" یعنی اعمال بد کے نتائج سے ڈرانا اور اعمال صالحہ و قبول حق کے نتائج حسنہ کی خبر دینا۔ نیز ایک امت صالحہ کو تعلیم و تزکیۂ نبوت سے تیار کر دینا اور وحی الٰہی سے کتاب و حکمت کا بتدریج درس دینا۔ جب وجود معلّم خود تعلیم پاکر مستعد ہو گیا جیسا کہ "علّم الانسان مالم یعلم" کے علیم و حکیم نے اسے پڑھا دیا۔ پھر جب اسے حکم بھی مل گیا کہ اب تم پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے ہو، کام شروع کر دو یعنی "قم فانذر" تو اس نے ایک طرف انذار و بشارت کا کام کیا، دوسری طرف امت مسلمہ کو پڑھانے اور تعلیم کتاب و حکمت سے تیار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ سو جب ایسا ہو چکا تو سب سے پہلا درس، سب سے پہلا سبق، سب سے پہلی تعلیم جو دی گئی وہ سورۂ فاتحہ کا جامع و مانع درس تھا اور انہی سات آیتوں کی اولین تعلیم تھی کہ فاتحیت اعمال و تعلیمات صرف انہی کے لیے ہے۔

جمع روایات

یہ وہ حقیقت ظہور و انبعاث وحی ہے جس کے معلوم کرنے کے بعد تمام روایات جمع ہو جاتی ہیں اور کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

۱۔ امام بخاری کی روایت "کیف کان بدأ الوحی" سب سے زیادہ مستند و معتبر ہے، جو اس بارے میں ہم تک پہنچی ہے اور تقریباً تمام ائمۂ فن نے اسے قبول کیا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے لیکن اس میں صرف "بدأ الوحی" یعنی انفلاق صبح وحی کی خبر دی گئی ہے۔ یہ مخاطبہ وحی کا آغاز ہے اور جن صحابہ و تابعین سے اولیت "اقراء" منقول ہے سب نے افتتاح وحی ہی کی بنا پر "اقراء" کو اولین چیز قرار دیا ہے۔

"مدثر" کا مقام

۲۔ دوسری روایات سورۂ "مدثر" کے متعلق ہیں۔ بعض متاخرین نے انھیں ایک دوسرا مذہب قرار دیا ہے لیکن فی الحقیقت ان میں اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں کوئی اختلاف نہیں۔ عبدالرحمٰن بن سلمہ نے حضرت جابرؓ سے پوچھا کہ سب سے پہلے کون سی چیز اتری؟ انھوں نے جواب دیا کہ "مدثر"، لیکن سائل سن چکا تھا کہ پہلا خطاب "اقراء" ہے۔ اس لیے اس نے پوچھا کہ "اقراء" یا "مدثر"؟ حضرت جابرؓ نے کہا کہ میں وہی کہتا ہوں جو آنحضرت صلعم سے میں نے سنا ہے۔ پھر آنحضرت صلعم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت جبریلؑ کو فضا میں دیکھا اور گھر پہنچ کر خدیجہؓ سے کہا کہ مجھے چادر اڑھا دو۔ اس پر یہ آیت اتری "یا ایھا المدثر"۔

یہ بھی بالکل صحیح ہے لیکن اس میں صرف ابتدا کا اتنا حصہ رہ گیا ہے کہ حضرت جبریلؑ کے اولین مشاہدے میں "اقراء" کا حکم ہوا اور اس کے بعد دوسرے مشاہدے میں "یا ایہا المدثر" اتری۔ چنانچہ اسی روایت میں آنحضرت صلعم فرماتے ہیں "جب میں نے اوپر نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی موجود ہے" یعنی جبریل موجود ہیں "وہ" کا اشارہ واضح کرتا ہے کہ یہ مشاہدہ پہلا نہیں۔ اگر پہلا ہوتا تو اس اشارے سے کام نہ لیتے۔

اصل یہ ہے کہ سلسلۂ واقعات کو سامنے رکھنے کے بعد یہ دونوں روایتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ سب سے پہلے جب فرشتۂ الٰہی کا ظہور ہوا تو اس نے کہا "اقراء" اس کے بعد آپ نے غار حرا کا اعتکاف جاری رکھا۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر آپ نے دیکھا کہ وہی ملک فضا میں موجود ہے یہ دیکھ کر آپ پر اضطراب طاری ہوا (گھر پہنچے) اور آپ نے کہا "دثرونی" اس کے بعد "یا ایہا المدثر" نازل ہوئی۔

ہم نے جو روایت نقل کی ہے وہ صحیح مسلم کے "باب بدء الوحی" میں ہے لیکن اسی روایت کو امام بخاری نے "کیف کان بدء الوحی" میں حضرت عائشہؓ کی روایت کے بعد درج کیا ہے اور اس تقدیم و تاخیر اندراج سے واضح کر دیا ہے کہ پہلا واقعہ "اقرا" کا اور دوسرا "مدثر" کا ہے۔ اس طرح تمام اختلاف دُور ہو گیا۔ امام بخاری کی یہی دقت نظر، حسن استنباط، قوت اخذ و استدلال، خوبی ترتیب و تقسیم اور فضل مخصوص تبویب و تراجم ہے جو انھیں تمام ائمہ و مجتہدین فن میں ممتاز کر دیتا ہے اور جس قدر کاوش کرتے جائیے اس کی خوبیاں کھلتی اور بڑھتی جاتی ہیں۔

قول جابرؓ کی تشریح

رہی یہ بات کہ حضرت جابرؓ نے کیوں فرمایا کہ سب سے پہلے "مدثر" اتری؟ تو شارحین صحیحین نے اس پر متعدد پہلوؤں سے نظر ڈالی ہے اور حافظ سیوطی نے تطبیق کی پانچ صورتیں نقل کی ہیں۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کا مقصود اولیت سے یہ تھا کہ "اقرا" کا نزول تو محض افتتاح وحی کا تھا کسی سبب کی بنا پر نازل نہیں ہوئی۔ برخلاف "مدثر" کے یہ آنحضرت صلعم کے اضطراب کی وجہ سے نازل ہوئی۔ اس سلسلے کی یہ پہلی چیز ہے۔ یہ صورت تطبیق ہمارے بیان کے لیے ایک مزید تائید ہے کیونکہ ہمارے نزدیک بھی "اقرا" کا نزول محض افتتاح وحی اور تعلیم شخص معلم ہے۔ تاہم بہترین جواب وہی ہے جسے حافظ سیوطی نے بھی مان لیا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز وحی کے واقعات بیان فرماتے ہوئے اس ٹکڑے کو بیان کیا جو افتتاح وحی کے بعد وحی کا دوسرا نزول ہے۔ حضرت جابرؓ نے خیال کیا کہ اسی سے سلسلۂ وحی شروع ہوا ہوگا۔ پس یہ ان کا اجتہاد ہے نہ کہ جزء روایت۔ ان کی روایت کو حضرت عائشہؓ کی روایت سے موخر رکھ کر ہم صحیح ترتیب پیدا کر لیتے ہیں۔ (اتقان: ۵۴)

بسم اللہ کا معاملہ

۴۔ اس کے بعد وہ روایتیں سامنے آتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اجلہ تابعین مثلاً حسن اور عکرمہ کا یہ بیان تھا کہ سب سے پہلے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اتری تو یہ بھی بالکل درست ہے اور ٹھیک اصل مقصود کی موید۔ سب سے پہلی سورت جو نازل ہوئی اور سب سے پہلی تعلیم

جو وحی الٰہی نے انسانوں کو دی وہ سورۂ فاتحہ ہے اور " بسم اللہ الرحمٰن الرحیم " سورۃ فاتحہ ہی کی پہلی آیت ہے۔ پس جن تابعین کا یہ قول ہے وہ دراصل یہی کہ رہے ہیں کہ سب سے پہلے سورۃ فاتحہ اتری کیونکہ اس کی اولین آیت بسم اللہ ہے اسے کوئی علیحدہ مذہب قرار دینا صحیح نہیں۔

پہلی سورت

اس کے بعد چوتھا قول ہے اور وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی اور مندرجہ بالا تشریح کے بعد اس قول میں اور ابتدا کی تین روایتوں میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ بلاشبہ یہ حق ہے اور انکشاف وحی و حکم انذار و تعلیم کے بعد سب سے پہلی سورت جو نازل ہوئی ہے اور جس کے سوا کوئی سورت پہلی نہیں ہو سکتی وہ " فاتحۃ الکتاب " ہے۔ یہی مذہب حضرت علی علیہ السلام کا بھی تھا۔

(ناتمام)

" مقدمہ تفسیر " کا جو فرمہ پولیس کے تصرف سے کسی طرح محفوظ رہ گیا تھا، وہ یہاں پر ختم ہو گیا۔ بعد کے اوراق میں خدا جانے کیا بحثیں ہوں گی۔ لیکن سورۂ فاتحہ کے نزول اور آغاز نبوت کے احوال و کوائف کے متعلق جو کچھ مولانا نے فرمادیا ہے اس کی کوئی مثال دوسری جگہ شاید ہی مل سکے۔

ضمیمہ باب

مولانا نے ترجمان القرآن کی جلد اول پر نظر ثانی فرماتے ہوئے ایک مقام پر حاشیے میں جو کچھ تحریر فرمادیا تھا اس کا تعلق بھی اسی موضوع سے ہے۔ یہ حاشیہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ابتدائے وحی کے زمانے میں جو مختلف حالات وواردات آپ پر طاری ہوئے، ان میں سے ان کے ایک حالت یہ تھی کہ جب وحی الٰہی شروع ہوکر کچھ عرصے کے لیے رک گئی تو آپ کا حزن واضطراب حد درجے تک پہنچ گیا اور کئی بار ایسا ہوا کہ شدت اضطراب میں آپ نے چاہا کہ پہاڑ سے اپنے آپ گرادیں۔

جو لوگ مقام نبوت کے ان واردات وحالات کی حقیقت پر نظر نہیں رکھتے جن کی تشریح ہم کرچکے ہیں وہ احادیث صحیحہ میں اس قسم کے بیانات دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک نبی کی شان سے اس قدر کمزوری کا ظہور بعید ہے اور اس لیے بہتر ہے کہ آغاز وحی کی روایتوں کو موقوف قرار دے کر ان کی تضعیف کردی جائے؛

قصہ کوتہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کمزوری نہیں بلکہ قوت عظیمہ نبویہ کے ایسے شواہد بیّنہ اور آثار صادقہ ہیں، جن سے عقل صحیح تعبیر وبرہان پاتی ہے اور جن کے اندر نظر حق وصادق کے لیے نشانیوں اور صداقتوں کی بڑی ہی ناقابل انکار روشنی ہے۔ یہ کوئی جسمانی اور نفسانی اضطراب نہیں، جو ایک نبی کی شان سے بعید ہو۔ یہ رُوح کا وہ مقدس اور ملکوتی اضطراب ہے، جو اگر نہ ہو تو ایک نبی کے نبی ہونے کے لیے کوئی دلیل باقی نہیں رہتی۔ گو یہ حقیقت زیادہ تفصیل کی محتاج ہے لیکن امید ہے کہ جو تشریح بطور اشارے کے کردی گئی ہے، وہ فہم مقصود کے لیے کافی ہوگی۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ بخاری کی یہ روایت اس درجہ مرتبہ شہرت وقبول تک پہنچ چکی ہے اور اس قدر کثرت سے یکے بعد دیگرے تمام طبقات امت نے اس کی تصدیق وتوثیق کی ہے کہ امام بخاری کے وجود سے انکار کرنا آسان ہے مگر اس روایت سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ رہا اس روایت کا موقوف ہونا تو اسے بھی ہم تسلیم نہیں کرتے۔ معنیً اس میں رفع موجود ہے اور حضرت عائشہؓ کے ذاتی اجتہاد کے اندراج کی کوئی علامت نہیں۔ اگر حضرت عائشہؓ باوجود اس قرب واتصال کے جو آپ کو حاصل تھا، آغاز وحی جیسے اہم واقعے کو محفوظ نہیں رکھ سکیں تو فن شہادت کا دنیا میں خاتمہ ہوچکا۔

لطف یہ کہ یہ شبہ نیا نہیں بلکہ پہلے بھی پیش ہوچکا ہے اور انسان کے اکثر شبہات وظنون نئے نہیں ہوتے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسی روایت کی شرح میں محدث اسماعیلی کا قول نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ محدثین پر بعض طعن کرنے والے اعتراض کرتے ہیں کہ کیف یجوز للنبی، ان یرتاب فی نبوتہ حتی یرجع الی ورقہ

...... وحتی یوقی بذروة جبل لیطلقی منها نفسه۔[۱] الخ فتح الباری جلد ۱۲ ص ۲۰۷) پھر محدث موصوف نے اس کا جواب دیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ ان کا جواب تشفی بخش نہیں۔ حقیقت وہی ہے جو ہم لکھ چکے ہیں یہ اضطراب ظہور واستعجال نمود والتہاب والفجار قوت نبویہ وشدت عشق وشغف حصول وحی ومخاطبہ الٰہی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان واردات مقدسہ سے مقام نبوت اور شخص اقدس نبوت کی کمال تصدیق ہوتی ہے حاشا کہ جسمانی ونفسانی کمزوری کا نتیجہ ہو یا محض بشری ضعف طبع کا جیسا کہ شارحہ بخاری اور قسطلانی وغیرہ نے لکھا ہے۔ (مولانا)

---

[۱] نبی کے لیے کیوں کر جائز ہے کہ اپنی نبوت میں شک کرے یہاں تک کہ ورقہ بن نوفل کی طرف رجوع کی نوبت آئے، یا پہاڑ پر چڑھ جانے کے لیے تیار ہو تاکہ اپنے آپ کو نیچے گرا دے ...... الخ

دعوت اسلام

مولانا کی تحریرات میں دعوت حق کا کوئی مرتب خاکہ موجود نہ تھا جسے اٹھا کر کتاب میں شامل کر دیا جاتا اگرچہ ان کی حیات مستعار کی گرمجوشیوں اور ہنگامہ پرودیوں کا محور دعوت حق کے سوا کچھ نہ رہا، لیکن اس سے اعراض کا مطلب یہ ہوتا کہ بعثت و نبوت کی غرض وغایت ہی نظرانداز کر دی جاتی، حالانکہ پوری سیرت طیبہ کی روح و رواں دعوت حق کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی؟ پھر یہ بھی امید تھی کہ جو اصحاب ان اوراق کا مطالعہ فرمائیں گے، ان کے لیے دین قیم کے حقائق و خصائص پر ایک نظر ڈال لینے کا موقع ضرور بہم پہنچا دینا چاہیے۔ شاید اس طرح رسول اللہ صلعم کی بعثت سے وہ بہتر طریق پر روشناس ہو جائیں۔ دعوت کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ تمام برائیوں کی آلائش سے لوگ پاک ہو جائیں، خواہ ان کا تعلق عقاید سے ہو یا رسوم اور طور طریقوں سے یا اعمال و اخلاق سے اور ان کی جگہ اچھائیوں کے پیکر بن جائیں یعنی اچھے عقیدے، اچھے طور طریقے، خیر و سعادت کے اصول اور اچھے اعمال، لیکن اس سلسلے میں بعض اہم نکات کا پیش کر دینا ضروری تھا، جن سے دین حقہ اسلام کے مبانی و مقاصد کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے۔ میں نے کئی ہزار صفحات سے ضروری ٹکڑے انتخاب کر کے بطور خود ترتیب دیے ہیں۔ امید ہے کہ یہ اصل مقصد کو کم از کم ایک حد تک ضرور پورا کر سکیں گے۔

اتنا اور عرض کر دوں کہ ان ٹکڑوں میں جہاں جہاں مجھے ترتیب و تصریح مطالب کے لیے چند الفاظ بڑھانے ضروری معلوم ہوئے، انھیں قوسین میں درج کیا تاکہ مولاناؒ کی تحریر سے الگ رہیں نیز بعض مفصل تحریروں میں سے کچھ حصے حذف کر دیے اور بعض ٹکڑوں کو اشتراک مطالب کی بنا پر یکجا کر دیا لیکن اصل تحریر بدستور مولاناؒ ہی کی رہی۔ حوالے دینے مشکل نہ تھے لیکن مناسب معلوم نہ ہوا کہ ایک ایک فقرے یا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے حوالوں سے حواشی کو گرانبار کروں، مقصود حقیقی اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ قرآن حکیم اور سیرت طیبہ کو مولاناؒ نے جس طرح سمجھا، اس سے استفادہ سہل و یسیر ہو جائے۔ دعوت کے بعض ٹکڑے کتاب میں اور مقامات پر بھی منقول ہیں مثلاً حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب کی تقریر نجاشی کے دربار میں، مدینہ منورہ میں جمعہ کا پہلا خطبہ، خطبۂ تبوک یا فتح مکہ و حج کے خطبات وغیرہ ان کا اعادہ یہاں مناسب معلوم نہ ہوا اور جو ضروری باتیں ان خطبوں میں آ گئیں، انھیں حتی الامکان یہاں نہیں لایا گیا۔

(مولف)

باب ۵

دعوتِ اسلام

— (۱) —

عالمگیر دعوت پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کسی خاص قوم اور ملک کے لیے نہیں، تمام نوع انسانی کے لیے ہے (سورۂ اعراف) کی آیت (۱۵۷)[1] جوامع آیات میں سے ہے، جس نے دعوت اسلام کی پوری حقیقت واضح کر دی؛

۱۔ یہ دعوت یکساں طور پر تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔

۲۔ یہ ایک خدا کے آگے سب کے سروں کو جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۳۔ ایمان باللہ وکلماتہ اس کا شعار ہے، یعنی خدا پر اور اس کے تمام کلمات وحی پر ایمان۔

فرمایا، خدا نے مجھے تم سب کی طرف بھیجا ہے وہ خدا کہ آسمان و زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے یعنی جب تمام کائنات ہستی میں ایک ہی خدا کی فرمانروائی ہے تو ضروری ہوا کہ اس کا پیغام ہدایت بھی ایک ہی ہو اور سب کے لیے ہو۔

پیامِ زندگی پیغمبر اسلام (صلعم) کی دعوت اس لیے ہے کہ تمہیں زندہ کر دے[2] یعنی وہ انسانیت اعلیٰ کے انبعاث و قیام کی دعوت ہے۔ غور کرو اس دعوت نے وقت کی تمام مردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے

---

[1] سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ یہ ہے:

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السمٰوٰت والارض، لا الٰہ الا ھو یحیی و یمیت فاٰمنوا باللہ و رسولہ النبی الامی الذی یومن باللہ وکلمٰتہ واتبعوہ لعلکم تھتدون۔

(اے پیغمبر) کہہ دے افرادِ نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں پر) ایمان رکھتا ہے۔ اس کی پیروی کرو تاکہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔

[2] اشارہ ہے سورۃ انفال کی آیت ۲۴ کی طرف یعنی

یا ایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم۔

مسلمانو اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمہیں (روحانی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کر دے۔

اٹھاکر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر مردوں کو جلانا کیا ہوگا کہ عرب کے ساربانوں میں ابوبکر، عمر، علی، عائشہ، خالد، ابن ابی وقاص، ابن العاص (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر پیدا ہو گئے اور پچاس برس کے اندر عرب کے وحشی، کرۂ ارضی کی سب سے بڑی اور مہذب قوم تھے۔

توحید خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ مالک الملک ہے۔ حی و قیوم ہے۔ اس کی حکومت سے کوئی گوشہ باہر نہیں اس کے علم سے کوئی شے مخفی اور اوجھل نہیں۔ وہ غفلت سے منزہ اور نسیان سے پاک ہے۔ جس ہستی کی ایسی صفتیں ہوں، اس کے سامنے کسی کی سعی و سفارش کی کیا گنجائش ہے اور اس کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کون ہے جو دخل دینے کی جرأت کر سکتا ہو؟

بعض ضروری نکتے (قرآن مجید میں توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات بھی کمال پر پہنچا دی گئی۔ انسان کے لیے دینی عقاید و اعمال کا جو تصور قایم کیا اس کی بنیاد تمام تر رحمت و محبت پر رکھی۔ سورۂ فاتحہ میں ربوبیت و رحمت کی صفتوں کے بعد "مالک یوم الدین" (جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا) کہہ کر صفت عدالت کا ذکر کیا اور تمام صفات جلال کو عدالت ہی کے تابع رکھا۔

۱۔ فطرت کائنات میں ربوبیت و رحمت کے ساتھ مجازات بھی ہیں۔ انسان نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا۔ اس طرح خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصور پیدا ہو گیا، حالانکہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کیا گیا، وہ عین مقتضا سے رحمت ہیں۔ تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی تو میزان عدل قایم نہ رہتی اور نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

۲۔ صفات الٰہی میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں، البتہ عدالت ضرور ہے اور صفات قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہیں در اصل اسی (عدالت ہی) کے مظاہر ہیں۔

(توحید فی الصفات میں صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ شرک کی تمام راہیں بھی بند کر دیں)

(ا) عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے۔ اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔

(ب) صرف خدا ہی کی ذات انسانوں کی پکار سنتی اور دعائیں قبول کرتی ہے۔ اگر تم نے دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔

(ج) اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص رہنا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے پیدا کر لیا تو توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

(ﮯ) یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں "ایاک نعبد و ایاک نستعین" میں اول عبادت کے ساتھ استعانت کا ذکر بھی کیا گیا، پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید حصر ہے یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔"

(۷) سب سے زیادہ اہم مسئلہ تشخص نبوت کی حد بندی کا تھا۔ پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا اور اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ یہ قرار دیا، اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔ یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (صلعم) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے (اور بندگی کا اقرار رسالت کے اقرار پر مقدم ہے)

نبوت کی روشن ترین دلیل

سورۂ یونس میں ہے،

قل لو شاء اللہ ما تلوتہٗ علیکم و لا ادراکم بہٖ فقد لبثت فیکم عمراً قبلہ، افلا تعقلون؟ (آیت ۱۶)

تم کہو، اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمھیں سناتا ہی نہیں اور تمھیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمھیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

صداقت نبوت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں، جس کے فضائل و حالات کی تمھیں خبر نہ ہو۔ تمھیں میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں یعنی چالیس سال کی مدت تک کہ عمر انسانی کی پختگی کی خاص مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمھاری آنکھوں کے سامنے رہی بتلاؤ اس تمام عرصے میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور امانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے طیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق و فضائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے جو سانچا اس عرصے میں بن گیا، وہ بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا۔

پھر فرمایا:

۵ے مولانا کا املا "تیار" کے متعلق یہی تھا۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۔ (یونس ۱۷)

تبلاؤ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے، جو اپنے جی سے جھوٹ بنا کر اللہ پر افترا کرے اور اس آدمی سے جو اللہ کی سچی آیتیں جھٹلائے؟ یقیناً جرم کرنے والے کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے، جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں۔ جو صادق کو جھٹلائے، وہ بھی سب سے زیادہ شریر ہے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا۔ اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا، اس کا کلمۂ صدق آج تک قایم ہے اور قایم رہے گا۔

پیغمبر اسلام کی صداقت

پیغمبر اسلام کی صداقت کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سخت سے سخت معاند بھی اس عجیب و غریب کشش و تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے تھے، جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی۔ چونکہ اعتراف حقیقت کے لیے تیار نہ تھے اس لیے مجبور ہو جاتے تھے کہ اسے جادو سے تعبیر کریں۔

"الانبیا" کی آیت ۳[1] میں فرمایا، وہ پیغمبر اسلام کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ان کے پاس گئے اور جادو میں پھنسے۔ یہ ہماری طرح ایک آدمی ہے، پس جو کچھ اس کا اثر و نفوذ ہے، وہ جادو ہی کی وجہ سے ہے۔

سچائی کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اسے سچائی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اگر اور کچھ کہنا چاہو گے تو کتنا ہی زور لگاؤ، بات بنے گی نہیں۔ بنے گی اسی وقت جب سر جھکا دو گے کہ ہاں یہ سچائی ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ

---

[1] سورۃ انبیاء کی آیت ۳ یہ ہے،

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ؟

دل ہیں کہ یک قلم غافل اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے سرگوشیاں کیں۔ "آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جادو کے سوا اور کچھ نہیں؟

نفس انسانی کی گراہی و سرکشی پر حقیقت کا اعتراف ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ وہ بغیر لڑے کبھی ہتھیار نہیں رکھے گی۔ وہ مانے گی (کیونکہ سچائی منوائے بغیر رہ نہیں سکتی) مگر اس وقت جب ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔

پیغمبر اسلام نے جب کلام حق کی منادی شروع کی تو قریش مکہ کا یہی حال ہوا۔ وہ سچائی دیکھ رہے تھے، مگر اسے سچائی سمجھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ مجنون ہو گیا ہے، خواب و خیال کو وحی و نبوت سمجھتا ہے۔ پھر تاثیر و نفوذ دیکھتے تو کہتے جادوگر ہے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور یہ ساری باتیں آپس میں کہیں۔ (ابن ہشام)

دین میں جبر نہیں

اس اصل عظیم کا اعلان کر دین و اعتقاد کے معاملے میں کسی طرح کا جبر و استکراہ جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ جبر و استکراہ سے۔

قریش مکہ کا فتنہ کیا تھا؟ یہ کہ ظلم و تشدد سے دین و اعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا، پس جس بات کے خلاف اس نے جنگ کا حکم دیا خود اسی بات کا حکم کیونکر ہو سکتا ہے۔

دعوت کی راہ تلقین و ہدایت کی راہ ہے، جدل و خصومت کی راہ نہیں۔ داعی حق کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسا دے یا کسی خاص دلیل پر اڑ کر اس کا ناطقہ بند کر دے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے دل میں سچائی اتار دے۔

خداپرستی اور نیک عملی

خدا پر، خدا کے فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر، خدا کے تمام رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنا سچا اور کامل ایمان ہے۔ خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور آخرت دین کے بنیادی حقائق ہیں۔

خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں روزی دیتے ہیں، انھیں بھی دیں گے۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں۔ کسی جان کو قتل نہ کرو جسے خدا نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ یتیموں کے مال کی طرف نہ بڑھو۔ جب کبھی کوئی بات کہو، انصاف کی کہو۔ اگرچہ معاملہ اپنے قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے، اسے پورا کرو۔

خداپرستی اور نیک عملی کی یہی راہ میری (خدا کی) ٹھہرائی ہوئی سیدھی راہ ہے۔ اسی پر چلو، اور راہوں پر نہ چلو کہ خدا کی راہ سے بھٹکا کر تمھیں تتر بتر کر دیں۔

جو کوئی اللہ کے حضور نیکی لائے گا تو اس کے لیے اس عمل نیک سے دس گنا زیادہ ثواب ہوگا اور جو کوئی برائی لائے گا

تو اس کے بدلے ہیں اتنی ہی سزا پائے گا۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، وہی درست اور صحیح دین ہے، ابراہیمؑ کا طریقہ کہ ایک خدا کے لیے ہو جانا۔ میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا صرف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار (یعنی مسلم) ہوں۔

اوامر و نواہی

۱۔ توحید فی العبادت کی تلقین، کیونکہ نفس توحید کا اعتقاد تو تمام پیروان مذاہب میں موجود تھا، لیکن توحید فی العبادت کی حقیقت مفقود ہو گئی تھی۔

۲۔ پھر والدین کے حقوق پر توجہ دلائی گئی۔ انسان کے لیے والدین کی ربوبیت، ربوبیت الٰہی کا پرتو ہے۔ والدین کی خدمت و اطاعت کی آزمائش کا اصلی وقت ان کے بڑھاپے میں آتا ہے، جب کمزوریاں انھیں دوسروں کی خدمت کا محتاج بنا دیتی ہیں۔

انسان کی احتیاج کے دو ہی وقت ہیں: طفولیت اور بڑھاپا۔ طفولیت میں ماں باپ نے خدمت کی تھی، بڑھاپے میں اولاد کو خدمت کرنی چاہیے۔

۳۔ ماں باپ کے بعد ان سب قرابت داروں کے حقوق ہیں، جو ہماری خبرگیریوں کے محتاج ہوں۔ ساتھ ہی "تبذیر" یعنی بے محل خرچ کرنے سے روکا۔ فرمایا، مال و دولت بے محل خرچ نہ کرو۔ خرچ کرنے کا صحیح محل ارباب حقوق ہیں۔

۴۔ مال و دولت خرچ کرنے میں اور ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ کسی ایک طرف نہ جھک پڑو کہ خرچ کرنے پر آئے تو سب کچھ اڑا دیا۔ احتیاط کرنی چاہی تو کنجوسی پر اتر آئے۔

۵۔ اولاد کو افلاس کے ڈر سے ہلاک نہ کرو، ہم تمھیں بھی روزی دیتے ہیں اور انھیں بھی۔

۶۔ زنا سے دُور رہو۔ یہ بڑی بے حیائی کی بات اور بڑی برائی کا چلن ہے۔

۷۔ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو، جسے قتل نہ کرنا اللہ نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ ہم نے مقتول کے وارث (یا وارثوں) کو مطالبۂ قصاص کا اختیار دے دیا ہے۔ پس چاہیے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کی جائے۔

۸۔ یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ (یعنی اسے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو) مگر ایسے طریقے پر جو ان کے لیے بہتر ہو۔ جب یتیم جوان ہو جائیں تو امانت ان کے حوالے کر دو۔

۹۔ عہد پورا کرو، اس کے بارے میں تم سے بازپرس کی جائے گی۔

۱۰۔ جب کوئی چیز ناپو تو پیمانہ بھرپور رکھا کرو۔ تولو تو صحیح ترازو سے (یعنی نہ ناپ میں کمی کرو اور نہ تول میں ڈنڈی دباؤ)۔

فرمانبرداروں کے نشان ان لوگوں کے اعمال و اوصاف (کی مجمل سی کیفیت) جنھوں نے احکام حق قبول کیے

اور دنیا کے لیے نافع بن گئے:

ا۔ اللہ کی بندگی کا عہد پورا کرتے ہیں اور اپنی عبودیت میں سچے اور کامل ہیں۔

ب۔ اللہ نے جو رشتے جوڑ دیے، انھیں ظلم و ناانصافی سے توڑتے نہیں بلکہ رشتے کا پاس کرتے اور ہر علاقے کا حق ادا کرتے ہیں۔ اس عمل میں تمام حقوق العباد آ گئے جس طرح (ا) میں حقوق اللہ آ گئے۔

ج۔ آخرت کی فکر سے بے پروا نہیں ہوتے۔ جو کچھ کرتے ہیں اس میں خوفِ آخرت کی کھٹک موجود ہوتی ہے۔ یقین رکھتے ہیں کہ ایک روز کسی کے آگے پیش ہونا ہے اور حساب کی سختی سے بچنا ممکن نہیں۔

د۔ اللہ کی محبت میں ہر طرح کی ناخوشگوار حالتیں صبر و ثبات کے ساتھ جھیل لیتے ہیں: شدتوں اور محنتوں سے منہ نہیں موڑتے، آزمائشوں کو پیٹھ نہیں دکھاتے۔

ھ۔ نماز اس کی ساری شرطوں کے ساتھ قائم کرتے ہیں۔

و۔ جو کچھ کماتے ہیں، اسے صرف اپنے ہی نفس پر خرچ نہیں کرتے۔ دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں اور ہر حال میں خرچ کرتے ہیں کھلے طور پر بھی اور پوشیدہ طور پر بھی۔

ز۔ بدی کے بدلے بدی کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ کوئی ان کے ساتھ کتنی ہی برائی کرے، وہ بھلائی ہی سے پیش آئیں گے۔

ایمان والوں کے پانچ وصف

مومنوں کے پانچ وصف خصوصیت سے بیان کیے گئے۔ گویا قرآن کے نزدیک ایمان و عمل کے مرقع میں سب سے زیادہ نمایاں خط و خال یہی ہیں جس زندگی میں یہ خصائص نہ ہوں وہ مومن کی زندگی نہیں ہو سکتی۔

ا۔ نماز کی محافظت اور اس کا خضوع و خشوع سے ادا کرنا۔ کسی باہیبت و جلال مقام پر کھڑے ہو جاؤ، تمھارے ذہن و جسم پر کیسی حالت طاری ہو جائے گی؟ ایسی ہی حالت کو عربی میں "خشوع" کہتے ہیں۔

ب۔ ہر اس بات سے مجتنب رہنا جو لغو ہو۔ صرف انھی باتوں کا اشتغال رکھنا جو دین و دنیا میں نافع ہوں۔

ج۔ کمائی میں سے اپنے محتاج بھائیوں کے لیے خرچ کرنا۔

د۔ زنا سے کبھی آلودہ نہ ہونا۔

ھ۔ امانت دار ہونا اور اپنے عہدوں کو پورا کرنا۔

راہ حق کے پیشرو

راہ حق میں سب سے آگے نکل جانے والے وہ ہیں،

ا۔ جو اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔

ب۔ جو پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

ج ۔ جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلا تامل دے دیتے ہیں ۔ ان کے دل ترساں رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور انھیں لوٹنا ہے۔

طریق خیر و سعادت

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ قرابت داروں کے حقوق سے غافل نہ ہو۔ یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور پڑوسیوں کی خبر گیری کرتے رہو۔ پڑوسی خواہ قرابت دار ہو، خواہ اجنبی، ہر حال میں اچھے برتاؤ کا مستحق ہے۔ اسی طرح جو لوگ تمھارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ہوں نیز لونڈی غلام جو تمھارے قبضے میں ہیں، ان سب کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ ضروری ہے کہ سب کے ساتھ محبت اور احسان سے پیش آؤ۔ بخل نہ کرو، خدا نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے بندوں کی خدمت میں خرچ کرو۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا ہاتھ انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) سے کبھی رک نہیں سکتا۔ البتہ جو کچھ خرچ کرو اللہ کے لیے کرو، نام و نمود کے لیے نہ کرو۔

نظم و فلاح میں اصل اصول

اجتماعی زندگی میں نظم و فلاح کے لیے اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حقدار ہو، اس کے حق کا اعتراف کرو اور جو چیز جسے ملنی چاہیے، وہ اس کے حوالے کر دو۔ وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو۔ قرضدار کا قرض ہو، امانت رکھنے والے کی امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ ہو۔ جو جس کا حق ہو اور جو جس کا اہل ہو، اسے ملنا چاہیے۔

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو صرف عدل و انصاف پیش نظر ہو کسی حالت اور کسی صورت میں بھی یہ جائز نہیں کہ فیصلہ انصاف کے خلاف کیا جائے۔

مسلمانوں کے لیے اصل دین

مسلمانوں کے لیے اصل دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں۔ اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور جو لوگ ان میں سے صاحب حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں (بہ شرطیکہ اصحاب حکم و اختیار کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش نہ ہو جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے خلاف ہو) بہ صورت نزاع اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی طرف رجوع کیا جائے اور جو فیصلہ ملے، اس کے آگے سب سر تسلیم خم کر دیں۔

قوّامون بالقسط

مسلمانوں کو چاہیے کہ "قوّامون بالقسط" ہوں یعنی حق و راستی پر اس مضبوطی سے قایم رہنے (اور جم جانے والے) کہ کوئی بات بھی انھیں جگہ سے ہلا نہ سکے۔ چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں۔ دنیا کی کوئی چیز انھیں سچ کہنے سے روک نہ سکے۔ اگر کسی معاملے میں سچائی خود ان کی ذات کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور اعزہ و اقربا کے خلاف ہو، جب بھی انھیں سچی ہی بات کہنی چاہیے، وہ صرف سچائی ہی کے لیے دل و زباں رکھتے ہیں[1]

---

[1] سورۂ مائدہ میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ: (باقی برصفحہ ۱۱۶)

بنیادی دستور العمل

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے شعائر کی بے حرمتی روا نہ رکھیں۔ دوسروں کے معاملے میں ان کا دستور العمل یہ ہونا چاہیے کہ نیکی کے کاموں میں سب کی مدد کریں۔ برائی کے کاموں میں کسی کی بھی مدد نہ کریں۔ کوئی ظلم کرے تو یہ بُرائی ہے، اس سے بچیں۔ کوئی حج و زیارت کو جائے تو یہ بھلائی ہے اس کے معاون بنیں (گویا نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں تعاون، گناہ اور ظلم کی ہر بات میں لاتعاون ہر مسلمان کے لیے بنیادی اصل کار ہے)

دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام چاہتا ہے کہ ہم اپنی سیرت میں سرتاسر حق و صداقت کے پیکر بن جائیں۔

(ماخوذ از ترجمان القرآن)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۵)

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ ، اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔

ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لیے ابھار دے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

باب ۱۶

دعوت اسلام

(۲)

انسانی مساوات نسل انسانی کی مساوات کا اعلان اور نسل و شرف کے تمام امتیازات سے انکار جو لوگوں نے بنا رکھے تھے اور جن کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے۔ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بڑا ہو یا چھوٹا۔ وضیع ہو یا شریف۔ انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

[رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں قریش کو خطاب کرتے ہوئے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا فرما دی تھی۔ فرمایا:

"اے جماعت قریش! خدا نے تمہاری جاہلانہ نخوت اور آبا و اجداد پر اترانے کا غرور آج توڑ دیا۔ سچ تو یہ ہے، سب لوگ آدم کے فرزند ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا تھا۔ خدا فرماتا ہے، لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ گوت قبیلے سب پہچان کے لیے بنا دیے ہیں اور خدا کے ہاں تو اسی کی زیادہ عزت، جس میں تقویٰ زیادہ ہے"[۱]

جب تمام انسان ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا) کی اولاد ہیں تو انسان ہونے میں امتیازات کی کون سی وجہ ہے؟ پھر خدا کے ہاں عزت کا جو معیار قرار پایا یعنی تقویٰ، وہ ایسا ہے کہ اس میں انسانوں کے درمیان حسد و رقابت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ منافی تقویٰ ہو گی۔ باقی ہر معیار یعنی دولت، عہدہ، رنگ وغیرہ میں حسد و رقابت کے سوا اور کسی بات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔]

دین کی اصل عظیم دین کی اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ اصل شے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے۔ شریعت کے ظاہری احکام و رسوم بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔

نزول قرآن کے وقت دنیا کی ایک عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے، دین سے مقصود محض شریعت کے

---

[۱] رحمۃ للعالمین جلد اول ص ۱۵۶۔ جس آیت کا ترجمہ دیا گیا ہے وہ سورۃ حجرات کی تیرھویں آیت ہے یعنی: یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

ظواہر و رسوم ہیں اور انھیں کے کرنے، نہ کرنے پر نجات و سعادت موقوف ہے۔ پس جہاں تک دین کا تعلق ہے، ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے نہ کہ وسائل کی۔

ابراہیمؑ کی راہ

دین کی جو راہ حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کی تھی، وہ کیا تھی؛ ان کے بعد ان کی اولاد جس طریقے پر چلتی رہی، وہ کون سا طریقہ تھا؛ خود حضرت یعقوبؑ نے بستر مرگ پر جس دین کی وصیت کی تھی وہ کونسا دین تھا؛ یقیناً وہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی نہ تھی (اس وقت تک یہودیت اور مسیحیت کا تو وجود بھی نہ تھا) وہ صرف خدا پر ایمان لانے اور اس کے قانون سعادت کی فرمانبرداری کرنے کی فطری اور عالمگیر سچائی تھی۔ اسی کی دعوت قرآن نے دی۔

دین الٰہی کو "الاسلام"[1] کے نام سے تعبیر کیا گیا، جس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں یعنی ہر طرح کی نسبتوں اور گروہ بندیوں سے الگ ہو کر صرف اطاعت حق کی طرف انسانوں کو دعوت دی جائے۔

عمل کی کمائی

قانون الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد کو وہی پیش آتا ہے، جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے اور نہ ایک کی بدعملی کے لیے دوسرا جواب دہ ہو سکتا ہے۔

انسان کے لیے قدامت پسندی کا پھندا بڑا ہی سخت ہے۔ اس کے پیچ سے وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا۔ ہندو ہزاروں برس سے مہا بھارت اور پرانوں کے افسانوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے دو فرقے آج تک اس نزاع سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیرہ سو برس پہلے سقیفۂ (بنو ساعدہ) میں خلافت کا جو انتخاب ہوا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؛ قرآن کہتا ہے: تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت و لکم ما کسبتم" اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ تم اپنی خبر لو۔ ان کے اعمال ان کے لیے تھے اور تمھارے تمھارے لیے ہیں۔

دنیا پرستی کا غرور

دین حق دنیا کا نہیں، دنیا پرستی کے غرور و سرشاری کا مخالف ہے۔ یہی دنیا پرستی کا غرور انسان کو خدا پرستی اور راست بازی سے بے پروا کر دیتا ہے۔ جب اسے طاقت اور حکومت مل جاتی ہے تو غرض و نفس کی پرستش میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے، جو دنیا میں انسان کا ظلم و فساد کر سکتا ہے۔ جو لوگ

---

[1] ملاحظہ فرمایئے: ان الدین عند اللہ الاسلام (بلاشبہ اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے) (آل عمران: ۱۹) ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ (جو کوئی الاسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا) (آل عمران: ۸۵) و رضیت لکم الاسلام دینا (تمھارے لیے پسند کر لیا کہ دین الاسلام ہو) (مائدہ: ۲)

سچے خدا پرست ہیں، وہ دنیا میں کتنے ہی مشغول ہوں، مگر ان کے پیش نظر نفس پرستی نہیں، صرف رضائے الٰہی ہوتی ہے

آخرت کی نجات آخرت کی نجات کا دار و مدار تمام تر ایمان و عمل ہے ۔ وہاں نہ تو نجات کی خرید و فروخت ہوسکتی ہے نہ کسی کی دوستی اور آشنائی کام دے سکتی ہے ۔ نہ کسی کی سفارش سے کام نکالا جاسکتا ہے (کسی نیک اور بزرگ ہستی سے حسن عمل کا سبق لیا جاسکتا ہے ۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کی جا سکتی ہے ۔ اہل علم سے مسائل پوچھے جاسکتے ہیں، لیکن نجات کا انحصار اپنے ہی ایمان و عمل پر یا اللہ کی رحمت پر ہے ۔ کسی کی سعی و سفارش کچھ اعانت نہیں کرسکتی ۔ ایسا تصور ہی سراسر غیر اسلامی ہے ۔)

حق و باطل کا معیار حق و باطل کے معاملے میں انسانوں کی قلت و کثرت معیار نہیں ۔ گمراہی و حق فراموشی کے ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں کہ نوع انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہوجاتی ہے ایسا ہی دور نزول قرآن کے وقت بھی دنیا پر چھایا ہوا تھا ۔ گمراہوں کی کثرت نہ دیکھو ۔ یہ دیکھو کہ کون سی راہ یقین اور بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی (حق کی راہ یقین و بصیرت ہی کی راہ ہے نہ کہ جہل و گمان کی ۔ اگرچہ بہت تھوڑے آدمی اس راہ پر کاربند ہوں آج دنیا کی آبادی میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، نہ کہ مسلمانوں کی ۔ پھر کیا اس بنا پر اکثریت کے مطابق حق کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے؟ ابتدائی دور میں مسلمان بہ مشکل چند لاکھ ہوں گے لیکن انھوں نے حیرت انگیز سعی و ہمت اور نادیدہ جوش فداکاری سے چند سال کے اندر روئے زمین کے گوشے گوشے میں نور حق کا اجالا کر دیا ۔ آج ان کی بھیڑ ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو باطل کی ظلمت کاریوں سے محفوظ رکھنے میں بے بس نظر آتے ہیں بلکہ وہ گروہ در گروہ ایسے طور طریقے اختیار کیے بیٹھے ہیں، جنھیں حق نہیں، باطل کے شناخسانے ہی کہا جاسکتا ہے)

منکرین آخرت جو لوگ منکرین آخرت ہیں یعنی محاسبۂ اعمال پر اعتقاد نہیں رکھتے، ان کی ذہنیت چار حال سے خالی نہیں:

ا ۔ انھیں خدا سے ملنے کی توقع نہیں ۔

ب ۔ وہ صرف دنیوی زندگی میں خوشنود ہوتے ہیں ۔

ج ۔ اس حالت کے خلاف ان کے اندر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی ۔ اسی پر وہ مطمئن ہوگئے ہیں ۔

د ۔ ان کے ذہن و ادراک میں اس درجہ تعطل پیدا ہوگیا ہے کہ قدرت کی تمام نشانیاں جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں انھیں بیدار نہیں کرسکتیں ۔

ان میں سے ہر بات نہ صرف بیان حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے ۔

مشکلیں اور آزمائشیں کتاب و حکمت کی تعلیم، شخص نبوت کی پیغمبرانہ تربیت (تزکیہ)، مرکز ہدایت کا قیام (کعبۂ مکرمہ) اور بہترین امت (خیر امۃ اخرجت للناس) ہونے کا نصب العین، یہی وہ بنیادی

عناصر تھے جو موعودہ امت کی نشو و نما کے لیے ضروری تھے۔ یہ تمام مراتب ظہور میں آگئے تو پیروان دعوت قرآنی کو سرگرم عمل ہو جانے کا حکم مل گیا۔

سرگرم عمل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مشکلیں اور آزمائشیں پیش آئیں۔ اس لیے صبر و استقامت اور جاں فروشی کی بھی دعوت دی گئی۔

صبر و ثبات

فرمایا:

ا۔ صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات و مصائب کو جھیلنے اور نفسانی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا کی جائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر و فکر سے روح کو تقویت ملتی ہے۔ جس جماعت میں یہ دو قوتیں (صبر اور نماز) پیدا ہو جائیں گی، وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔

ب۔ جو جماعت موت سے ڈرتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی۔ راہِ حق میں موت، موت نہیں، سرتاسر زندگی ہے۔

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں اور کتنی ہی بڑی جماعتیں ہیں جو چھوٹی جماعتوں سے شکست کھا جاتی ہیں۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی قلت و کثرت پر نہیں، دلوں کی قوت پر ہے۔ اللہ کی مدد انھیں لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جو صابر اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کا نصب العین

مسلمانوں کا جماعتی نصب العین یہ نہیں قرار دیا گیا کہ وہ طاقتور قوم بنیں یا سب سے برتر گروہ ہوں کیونکہ طاقت و برتری میں جماعتی گھمنڈ اور قومی حرص و آز کا لگاؤ تھا اور یہ بات انسانیت کے امن و سلام اور مساوات و اخوت کے منافی تھی۔ پس صرف "خیر" اور "بہتر" ہونے پر زور دیا گیا۔ (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس) جس کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے۔ جس جماعت کا نصب العین یہ ہو گا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو، وہ طاقتوں کے غرور اور قومی نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہو سکتی۔ (اور حق یہ ہے کہ خیر و سعادت میں سب سے بڑھ کر ہونے کے بعد کسی جماعت کی معنوی قوت میں کون سی چیز کی کمی رہ سکتی ہے اور معنوی قوت سے بڑھ کر کون سی قوت ہے جو امن و سلام کی ضامن ہو؟)

وحدت دعوت

قرآن مجید نے (دین حق کی اس اصل عظیم کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تمام نبی صرف ایک ہی دین کے داعی تھے۔ جب اللہ کا دین ایک ہے تو تمام رہنما ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جو ان میں تفریق کرتا ہے، وہ پورے سلسلۂ ہدایت ہی کا منکر ہے۔ اللہ کا دین اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانین فطرت کی اطاعت کی جائے اور آسمان و زمین میں جس قدر مخلوق ہے، سب قوانین الٰہی کی اطاعت کر رہی ہے۔ پھر اگر تمہیں اللہ کے قوانین فطرت سے انکار ہے تو اللہ کے قانون کے سوا کائنات ہستی میں اور کون سا قانون ہو سکتا ہے؟

ایمان اور محبت اللہ پر ایمان اور اللہ کی محبت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی ویسی ہی چاہت سے ماننے لگے، جیسی چاہت سے ماننا صرف اللہ کے لیے ہے تو یہ اللہ کے ساتھ دوسرے کو ہم پلہ بنا دینا ہوا اور توحید الٰہی کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھنے والا ہو۔ (والذین امنوا اشد حبا للہ)

جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعویدار ہے اسے چاہیے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرے۔ اللہ کی محبت کا دعویٰ اور اس کی راہ بتلانے والے کی پیروی سے انکار ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے (رسول صلعم کی پیروی کرنے والوں سے اللہ بھی محبت کرنے لگے گا اور ان کی خطائیں بخش دے گا)

قرآن مجید کے چار وصف سورہ یونس میں ہے:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (آیت ۵۷)

لوگو تمہارے پاس پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے۔ دل کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور ہدایت اور رحمت ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔

اس میں قرآن کے چار وصف بیان کیے،

ا۔ "موعظت" ہے یعنی دل میں اتر جانے کی دلیلوں اور روح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے، جو خیر و حق کی باتیں ہیں اور ان تمام باتوں سے روکتا ہے جو شر و بطلان کی باتیں ہیں، کیونکہ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت نہیں بلکہ ایسی نصیحت ہے جو موثر دلائل اور دل نشین دلیلوں سے کی جائے۔

ب۔ "شفاءٌ لما فی الصدور" دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخۂ شفا ہے جو فرد یا جو گروہ اس نسخے پر عمل کرے گا، اس کے قلوب ہر طرح کے مفاسد و رذائل سے پاک ہو جائیں گے۔ یاد رہے عربی میں قلب، فواد اور صدر کے الفاظ جب کبھی ایسے موقع پر بولے جائیں، جیسا یہ موقع ہے تو ان سے مقصود انسان کی معنوی حالت ہوتی ہے یعنی ذہن و فکر کی قوت، عقل و ادراک، جذبات و عواطف، اخلاق و عادات، اندرونی حسیات۔ وہ عضو مقصود نہیں ہوتا، جو فن تشریح کا دل اور سینہ ہے۔

ج۔ "ھدیٰ" ہے یعنی یقین کرنے والوں کے لیے ایک ہدایت۔

د۔ "رحمۃ للمومنین" یقین کرنے والوں کے لیے پیام رحمت ہے، یعنی ظلم و قساوت اور بغض و تنفر سے دنیا کو نجات دلاتا ہے۔ رحم و محبت اور امن و سلامتی کی روح سے معمور کرتا ہے۔

اعلان ہی نہیں دلیل بھی

یہ محض قرآن کے اوصاف کا مدعیانہ اعلان ہی نہ تھا، بلکہ اس کی صداقت کی سب سے زیادہ موثر دلیل بھی تھا۔ اگر ایک شخص دعویٰ کرے کہ وہ طبیب ہے تو اس کے دعوے کی جانچ کا سب سے زیادہ سہل اور قطعی طریقہ یہ ہوگا کہ دیکھا جائے اس کے علاج سے بیماروں کو شفا ملتی ہے یا نہیں؟ قرآن نے بھی جا بجا یہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے۔ اس نے کہا، میں نسخۂ شفا ہوں۔ ثبوت میں مومنوں اور متقیوں کی جماعت پیش کردی، جو اس کے دارالشفا میں طیار ہوئی تھی۔ آج بھی اس کی یہ دلیل اسی طرح قاطع ہے جس طرح عہد نزول میں تھی۔ اگر اس نے عرب جاہلیت کے مریضان روح و دل میں سے ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، خالدؓ، سلمانؓ، ابوذرؓ وغیرہ جیسی تندرست روحیں پیدا کر دی تھیں تو کیا اس کے نسخۂ شفا میں شک کیا جاسکتا ہے؟

صراط مستقیم اور دین قیم

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا،

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم۔ (۹)   بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے۔

قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کیے ہیں، ان میں جامع ترین وصف یہی ہے کہ زندگی اور سعادت کے ہر گوشے میں اس کی رہنمائی سیدھی سے سیدھی بات کے لیے ہے کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا پیچ و خم، کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط اس کی رہنمائی میں نہیں ہوسکتی۔ یہی حقیقت دوسری جگہ "صراط مستقیم" اور "الدین القیم" سے تعبیر کی گئی۔ (ماخوذ از ترجمان القرآن)

باب ۱

دعوت اسلام

—(۳)—

دین حق کے تین بنیادی اصول سورۂ اعراف میں ہے:

قل امر ربی بالقسط و اقیموا وجوھکم عند کل مسجد وادعوہ مخلصین لہ الدین۔

تم کہو، میرے پروردگار نے جو حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہربات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ درست رکھو اور دین کو اس کے لیے خالص کر کے اسے پکارو۔

اس آیت میں دین حق کے تین بنیادی اصول واضح کر دیے، عمل[۱] میں اعتدال، عبادت[۲] میں توجہ اور خدا پرستی[۳] میں اخلاص۔ یہ آیت باب توحید میں اصل اصول ہے۔ دین کو خدا کے لیے خالص کر کے پکارو یعنی دین کی جتنی باتیں ہیں وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کر دو۔

"خلق" اور "امر" دونوں اللہ ہی کی ذات سے ہیں یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اور اسی کے حکم وقدرت سے اس کا انتظام ہو رہا ہے۔

دکھاوے کی خیرات دکھاوے کی خیرات اکارت جاتی ہے۔ جو شخص نیکی کے لیے نہیں، نام ونمود کے لیے خیرات کرتا ہے اور خدا کی جگہ انسانوں میں بڑائی چاہتا ہے وہ یقیناً خدا پر سچا ایمان نہیں رکھتا۔ ایسی خیرات سے روکا گیا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک چوری چھپے خیرات نہ کر سکو، خیرات کرو ہی نہیں یا پوشیدگی کا تعلق بجائے خود عمل خیر سے مانع ہو جائے (چھپائے رکھنا ممکن ہو تو نہ چھپانا رفتہ رفتہ ریا ونمائش کا باعث بن سکتا ہے۔ نیت پاک ہو اور خدا کی رضا کے سوا کچھ منظور نہ ہو تو کسی کے سامنے بھی خیرات کر دینا نامناسب نہیں بلکہ بعض اوقات کھلم کھلا خیرات دوسروں کے لیے وسیلۂ ترغیب بن جاتی ہے۔ مقصود حقیقی یہ ہے کہ نمود ونمائش سے نیت کا آئینہ آلودہ نہ ہونے پائے)

نکمی اور بے کار چیزیں خیرات کے نام سے محتاجوں کو نہ دو۔ سوچو کہ اگر تمھیں کوئی ایسی چیز دے تو لینا پسند کرو گے؟

محبت و ہمدردی کے تقاضے

نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد نشو و نما نہیں پا سکتی تھی، اگر اس کا حکم دیتے ہوئے ایسی باتوں سے روک نہ دیا جاتا جو ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہیں۔ پس انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) کے ساتھ ساتھ سُود کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

دینِ حق انسانوں میں محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے خیرات کا حکم دیا کہ ہر انسان دوسرے کی احتیاج، اپنی احتیاج سمجھے۔ سود خوار کی ذہنیت بالکل اس کی ضد ہے۔ وہ چاہتا ہے دوسرے کی احتیاج سے خود انتہائی فائدہ اٹھائے اور محتاج کو دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنائے (گویا سود خوار کے دل میں ہم جنسوں کے لیے محبت و ہمدردی کا کوئی احساس باقی ہی نہیں رہتا)۔

مومن اور امید و یقین

قرآن نے ہر جگہ یہ حقیقت واضح کی کہ ایمان، امید اور یقین ہے، کفر، شک اور مایوسی ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ مایوس نہ ہو۔ امید کا چراغ روشن رکھو۔ ہر حال میں امیدوار فضل و سعادت رہو۔ یہی مقتضائے ایمان ہے۔ یہی سرچشمہ زندگی ہے۔ اسی سے تمام دنیوی اور اخروی کامرانیوں کی دولت حاصل ہو سکتی ہے۔

جس انسان نے امید و یقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی، خواہ دنیا کی زندگی کے لیے ہو، خواہ آخرت کے لیے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے آدمی کے لیے صرف یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈالے اور زندگی ختم کر دے۔

ایمان نام ہی امید کا ہے اور مومن وہ ہے جو مایوسی سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذہنی مزاج کسی چیز سے اتنا بیگانہ نہیں، جس قدر مایوسی سے۔ زندگی کی مشکلیں اسے کتنا ہی ناکام کریں لیکن وہ پھر سعی کرے گا۔ لغزشوں اور گناہوں کا ہجوم اسے کتنا ہی گھیر لے لیکن وہ پھر توبہ کرے گا، نہ تو دنیا کی کامیابی سے وہ مایوس ہو سکتا ہے، نہ آخرت کی نجات سے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی مایوسی موت ہے اور آخرت کی مایوسی شقاوت۔ وہ دونوں جگہ رحمتِ الٰہی کو دیکھتا اور اس کی بخششوں پر یقین رکھتا ہے کہ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ، ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا، انہ ھو الغفور الرحیم (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے۔ ہاں، وہ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ سورہ زمر: ۵۳)

قبولِ حق کی استعداد

بارش سے صرف وہی زمین فائدہ اٹھا سکتی ہے جس میں اس کی استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو سرسبز نہ ہو گی۔ اسی طرح قرآن کی ہدایت سے بھی وہی روحیں شاداب ہوں گی جن میں قبولیتِ حق کی استعداد ہے۔ جنھوں نے استعداد کھو دی، ان کے حصے میں محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آبا و اجداد کی اندھی تقلید، گھڑی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی

پرستش ہے۔ ابتدا میں جہل و فساد سے کوئی عقیدہ گھڑ لیا جاتا ہے۔ ایک مدت تک لوگ اسے مانتے رہتے ہیں۔ جب ایک عرصے کے اعتقاد سے اس میں شانِ تقدیس پیدا ہو جاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور عقل و بصیرت کی کوئی بھی دلیل اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن اسی کو "اسماءٌ سمیتموھا انتم و آباؤکم" (نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے گھڑ لیے ہیں) سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ بنائے ہوئے ناموں کے سوا وہ کوئی حقیقت اور معقولیت پیش نہیں کر سکتے۔

دعوتِ اسلام کی تین خصوصیتیں

سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷[1] میں پیغمبرِ اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں بیان کیں:

۱۔ نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے۔

۲۔ پسندیدہ چیزوں کا استعمال جائز ٹھہراتا ہے، ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال کو روکتا ہے۔ قرآن نے اس معنی میں "طیبات" اور "خبائث" کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۳۔ جو بوجھ اہلِ کتاب پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں گرفتار ہو گئے تھے، ان سے نجات دلاتا ہے۔

یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کیا تھے، جن سے قرآن نے نجات دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے: مذہبی احکام کی بیجا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل پابندیاں، ناقابلِ فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں، پیغمبرِ اسلام کی دعوت نے ان سب سے نجات دلا دی۔ سچائی کی ایسی سہل و آسان راہ دکھا دی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ اور عمل کے لیے کوئی سختی نہیں۔

درخشاں حقائق

چند حقائق ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ قرآن کے نزدیک کسی جماعت کے مسلمان ہونے کی عملی شناخت دو باتیں ہیں: نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کا نظام۔ جو جماعت یہ دو عمل ترک کر دے گی (وہ عملاً) مسلمان متصور نہ ہو گی۔ زکوٰۃ کے نظام سے مراد ہے کہ حکومت یہ

---

[1] اس آیت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

یامرھم بالمعروف و ینھٰھم عن المنکر و یحل لھم الطیبات و یحرم علیھم الخبائث و یضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم۔

(پیغمبر اسلام، جس کی صفات تورات و انجیل میں یوں مکتوب تھیں) وہ نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا۔ پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا۔ گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا۔ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے وہ دبے ہوں گے۔ ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔

انتظام نہ کر سکے یا کسی جگہ مسلمان خدانخواستہ محکوم ہو جائیں تو وہ خود زکوٰۃ کا نظام سنبھالیں۔

۲۔ شرف و بزرگی کے رسمی مناصب کوئی چیز نہیں۔ بزرگی اسی کے لیے ہے جو عمل و ایمان کی بزرگی رکھتا ہے۔

۳۔ قرآن کے نزدیک سب سے بڑا درجہ ان انسانوں کا ہے جو ایمان و حق پرستی کی راہ میں قربانیاں کرنے والے ہیں، نہ کہ ان لوگوں کا جو رواجی نیکیوں اور رسمی نمائشوں میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

۴۔ مومن وہ ہے جس کی حبِ ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت غالب نہ آ سکے۔

۵۔ جماعت کی زندگی اور فتح و کامرانی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں کہ مذبذب اور دو دلے آدمی اس میں موجود ہوں۔

۶۔ کاروبارِ حق میں دار و مدار شخصیتوں پر نہیں۔ شخصیت اس لیے ہے کہ بیج بو دے۔ باقی رہے برگ و بار، تو ہو سکتا ہے اس کی زندگی ہی میں سب نمودار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے، کچھ زندگی میں، کچھ اس کے بعد ہوں۔ اس تاخیر سے کاروبارِ حق پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۷۔ حلت و حرمت اشیاء میں قرآن کے اصول اربعہ:

ا۔ اصل اباحت ہے نہ کہ حرمت، اِلّا یہ کہ وحی الٰہی نے کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیا ہو۔

ب۔ کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینے کا حق خدا کی شریعت کو ہے۔

ج۔ محض اپنی رائے اور قیاس سے کوئی چیز حرام ٹھہرانا افترا علی اللہ یعنی خدا پر بہتان باندھنا ہے۔

د۔ انسان کے عقائد و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے، نہ کہ وہم و گمان پر۔

تذکیر و توکیل پیغمبر کا کام "تذکیر" و "تبلیغ" ہے "تبشیر" و "تنذیر" ہے۔ وہ داعی اور مذکر ہے۔ "وکیل" یعنی نگہبان نہیں جو زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جائے، پھر اس سے نکلنے نہ دے۔ سورۂ یونس میں ہے: وما انا علیکم بوکیل (میں تم پر نگہبان نہیں۔ یونس: ۱۰۷)۔ دوسری جگہ پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہی مطلب یوں ادا کیا: وما انت علیھم بجبار (تو ان لوگوں پر حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں کہ جبراً و قہراً بات منوا دے۔ ق: ۴۵) نیز فرمایا: لست علیھم بمصیطر (تجھے ان پر داروغہ بنا کر نہیں بٹھا دیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن تو انھیں راہ حق پر چلا دینے کا ذمہ دار ہو۔ غاشیہ: ۲۲) پھر فرمایا: فانما علیك البلٰغ وعلینا الحساب (جو کچھ تیرے ذمے ہے یہی ہے کہ پیغام پہنچا دیا جائے۔ ان سے ان کے کاموں کا حساب لینا ہمارا کام ہے۔ رعد: ۴۰)

قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خدا کے رسولوں کا منصب تذکیر و تبلیغ کے اندر محدود تھا حالانکہ وہ خدا کی طرف سے مامور تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی دوسرے شخص کے لیے وہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ وکیل، مصیطر اور جبار بن جائے؟

تذکیر و تبلیغ اور پسند و قبول دراصل اعمال انسانی کے تمام گوشوں میں اصل سوال حدود ہی کا ہے اور ہر جگہ

انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے۔ یعنی ہر بات کی جو حد ہے اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔ دو حق ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ ایک حق ہے تذکیر و تبلیغ کا، ایک پسند و قبولیت کا۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے، اسے دوسروں کو بھی سمجھائے لیکن اس کا حق نہیں کہ دوسروں کے حق سے انکار کر دے، یعنی یہ بات بھلا دے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے اور ایک فرد دوسرے کے لیے ذمہ دار نہیں۔

تاریخ کو بارہ صدیوں تک اس بات کا انتظار کرنا پڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلاف عقاید کی بنا پر ذبح نہ کرے۔ اتنی بات سمجھ لے کہ "تذکیر" و "توکیل" میں فرق ہے۔ اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکہ اور فرانس کے "اعلان حقوق انسانی" سے شروع نہیں ہوئی۔ اس سے بارہ سو برس پہلے (نزول قرآن کے ساتھ) شروع ہو چکی تھی۔

خوف و حزن

قرآن نے اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بھی بات اس قدر نمایاں نہیں جس قدر یہ کہ "لاخوفٌ علیھم ولاھم یحزنون" (اور یہ قرآن میں کئی مقامات پر ارشاد ہوا ہے) یعنی وہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت انھی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے، خوف اور دکھ۔ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی، اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آ گئیں۔ زندگی کے جتنے کانٹے بھی ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو، خواہ جسم میں چبھے ہوں، خواہ دماغ میں۔ خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں، خواہ آخرت کی۔ تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے، جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

عقل اور ماورائے عقل

قرآن اس بات کی بھی مذمت کرتا ہے کہ علم و بصیرت کے بغیر کوئی بات مان لی جائے اور اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بنا پر کوئی بات جھٹلا دی جائے۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی بات ہے۔ یا تو وہ عقل و بینش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کیے چلتا رہتا ہے یا پھر سمجھ بوجھ کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی، جھٹلا دی۔ اس طرح حقیقت کے اثبات و وجود کا مدار صرف ایک خاص فرد کی سمجھ پر رہ گیا۔

صورتیں دو ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو۔ ایک یہ کہ تمھاری عقل سے

بالاتر ہو۔ بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی ہیں، جن کا احاطہ تمہاری سمجھ نہیں کر سکتی، لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ سرے سے خلاف عقل ہیں۔ اول افراد کی عقلی قوت یکساں نہیں، ثانیاً عقل انسانی برابر نشو و ارتقا کی حالت میں ہے۔ ایک عہد کی عقل جن باتوں کا اثبات نہیں کر سکتی دوسرے عہد کے لیے وہ عقلی مسلمات بن جاتی ہیں۔ ثالثاً انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی۔

مرد عورت کی اخلاقی مساوات

قرآن نے مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا۔ سورۂ نسا میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے[1] چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے اسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانت عورتیں ہیں، جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بہ کثرت اس کا ذکر کرنے والے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بہ کثرت ذکر کرنے والیاں ہیں۔

قرآن کریم کی شہادت

مردوں کے لیے فرمایا،

التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ۔
(سورۃ توبہ، ۱۱۲)

(اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے) توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے، سیر و سیاحت کرنے والے، رکوع و سجود میں جھکنے والے نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے۔

عورتوں کے لیے بھی فرمایا:

مسلمٰتٍ، مومنٰتٍ، قانتٰتٍ، تائبٰتٍ، عابدٰتٍ،

مسلم عورتیں، مومن عورتیں، فرمانبردار، توبہ کرنیوالیاں،

---

[1] اشارہ ہے اس آیت کی طرف:

للرجال نصیبٌ مما اکتسبوا وللنساءِ نصیبٌ مما اکتسبن۔

مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے۔

سائحاتٍ۔ (سورہ تحریم: ۵) — عبادت کرنے والیاں، سیر و سیاحت کرنے والیاں۔

منافقوں کا ذکر کیا تو دو جنسوں کا کیا:

اَلْمُنَافِقُوْنَ وَ الْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۘ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ۔ (سورہ توبہ: ۶۷)

منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک دوسرے کے ہم جنس، برائی کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں۔

پھر فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (سورۃ احزاب: ۳۵)

مسلم مرد اور مسلم عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور صدق پر کاربند مرد اور صدق پر کاربند عورتیں۔ اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور اپنی حفاظت کرنے والے پاکباز مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی پاکباز عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور بہت ذکر کرنے والی عورتیں۔ ان کے لیے اللہ کے ہاں مغفرت اور بہت بڑا درجہ ہے۔

غور کرو کسی وصف میں تفریق نہیں، کسی فضیلت میں امتیاز نہیں، کسی بڑائی میں عدم مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ بد اخلاق ہے؟

صبر اور شکر

"صبر" کے معنی ہیں مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں جمے رہنا۔ "شکر" کے معنی ہیں اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں (اور نعمتوں) کی قدر کرنا اور انھیں ٹھیک ٹھیک کام میں لانا۔ خدا کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو قوم (مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں ثبات و استقامت پر استوار رہتی ہے اور) خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر بجا لاتی ہے اور ان سے ٹھیک طور پر کام لیتی ہے۔ خدا اسے اور نعمتیں عطا فرماتا ہے، لیکن جو کفران نعمت کرتی ہے یعنی قدر شناسی نہیں کرتی، محرومی و نامرادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے اور یہ اللہ کا سخت عذاب ہے، جو کسی انسانی گروہ کے حصے میں آتا ہے۔

غور کرو یہ حقیقت حال کی سچی تعبیر ہے۔ جو فرد یا گروہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا ہے مثلاً خدا نے اسے عقلمندی و اعلیٰ عطا فرمائی ہے۔ وہ اس نعمت کو پہچانتا، اسے ٹھیک طور پر کام میں لاتا اور اس کی حفاظت سے غافل نہیں ہوتا،

وہ اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا مستحق ہو جاتا ہے یا نہیں ؛ جو ایسا نہیں کرتا، اس کی نامرادی و تباہی میں کوئی شک ہو سکتا ہے؟

اکتساب مال اور انفاق مال

ہر انسان کی ذہنی و جسمانی استعداد یکساں نہیں ہوتی، اس لیے وسائل معیشت کے حصول کے اعتبار سے بھی سب کی حالت یکساں نہ ہوئی۔ کسی کو کمانے کے زیادہ مواقع حاصل ہو گئے کسی کو تھوڑے۔ پہلے قوت میں مقابلہ ہوا۔ طاقتور نے کمزور کو مغلوب کر لیا۔ پھر ذہن و جسم کا مقابلہ شروع ہوا اور ذہنی قوت نے جسمانی قوت کو مقہور کر لیا۔

قرآن اس صورت حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ حیثیت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی حالت یکساں نہیں، لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ حصول رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو کسی کو ملے، کسی کو نہ ملے۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا، دنیا کے سامان رزق سے حصہ پانے کا یکساں طور پر حقدار ہے۔

دراصل قرآن کی اس تہ میں یہ بنیادی اصل کام کر رہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے مختلف افراد اور جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور منقسم تسلیم نہیں کرتا، بلکہ سب کو ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے شریک حال ہیں۔

(قرآن) کہتا ہے کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ تم انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ تم جس قدر کما سکتے ہو کماؤ، بلکہ چاہیے زیادہ سے زیادہ کماؤ، لیکن یہ نہ بھولو کہ زیادہ سے زیادہ کمانا، زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے افراد کے ہاتھ کمائی کے لیے ہیں، لیکن جماعت کا حق خرچ کرانے کا ہے۔

غرض جہاں تک نظام معیشت کا تعلق ہے۔ قرآن نے اکتساب مال کا معاملہ، انفاق مال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے کوئی کمائی جائز نہیں تسلیم کی جا سکتی، اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتناز کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازہ کھلا نہ رکھے۔ قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک اور مستحق عقوبت ہے۔

بدعملی کا بڑا مرکز

انفرادی زندگی میں بدعملی کا بڑا مرکز دنیوی خوشحالی کی زندگی ہے۔ خوشحالی و ثروت کی حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اگر کسی جماعت میں پھیلی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی برکت نہیں اور اگر صرف چند افراد میں سمٹی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں، کیونکہ جب دولت صرف چند افراد کے قبضے میں آ گئی، باقی افراد جماعت محروم رہ گئے تو قدرتی طور پر ہر طرح کا غلبہ و تسلط چند افراد کے ہاتھ میں آ جائے گا اور ایسے غلبہ و تسلط کا نتیجہ غرور باطل اور استکبار عن الحق ہے (اس صورت حال کی الم انگیز مثالیں ہر طرف موجود ہیں)

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس جماعتی خوشحالی کو اللہ کا سب سے بڑا فضل قرار دیتا ہے، اسی کو انفرادی حالت میں "فتنہ" اور "متاع غرور" بھی کہتا ہے۔

آج تمام دنیا میں شور مچ رہا ہے کہ انفرادی سرمایہ داری دنیا کے لیے مصیبت ہے، لیکن قرآن چودہ سو برس پہلے اسے "فتنہ" قرار دے چکا اور اس کے لیے اکتناز کا لفظ بول چکا ہے۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ و لا ینفقونھا۔ (اور جو لوگ چاندی اور سونا اپنے ذخیروں میں جمع کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے) (سورۃ توبہ: ۳۴)

مشکل یہ ہے کہ جب تک قرآن کی صدا قرآن کی صدا ہے تمہاری نظروں میں جچتی نہیں۔ جب وہی بات وقت کے ذہن و فکر سے اٹھنے لگتی ہے تو فوراً اس کی پرستش شروع کر دیتے ہو۔ (ماخوذ از ترجمان القرآن)

باب ۱

دعوت اسلام

(۴)

فضیلت و کامرانی کے طریقے

سورہ اعراف میں ہے،

وان تدعوھم الی الھدی لا یسمعوا و تراھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون خذ العفو و امر بالمعروف و اعرض عن الجاھلین۔ (۱۹۸ - ۱۹۹)

(اے پیغمبر) اگر تم ان لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو ہرگز تمھاری پکار نہ سنیں۔ تمھیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمھاری طرف تک رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے نہیں (بہرحال) نرمی و درگزر سے کام لو، نیکی کا حکم دو، جاہلوں کی طرف متوجہ نہ ہو۔

(دیکھیے) چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت و کامرانی کے تمام طریقے واضح کر دیے۔ "اخذ بالعفو"، "امر بالمعروف" اور "اعراض عن الجاھلین" یعنی ناسمجھوں کی ناسمجھی بخش دینا، نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا اور جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا۔ سرسری نظر میں پتا نہیں لگے گا۔ اچھی طرح اور بار بار غور کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کی ساری عملی مشکلات ان تین اصلوں سے حل نہیں ہو جاتیں؛

آیت ۱۹۸ میں فرمایا؛ حقیقت یہ ہے کہ تجھے دیکھتے نہیں کیونکہ اگر دیکھتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔ سو ایک دیکھنا سلمانؓ فارسی کا تھا، جو پہلی ہی نگاہ میں پکار اٹھا؛ واللہ ما ھذا الوجہ کذاب (خدا کی قسم یہ صورت جھوٹے آدمی کی ہو نہیں سکتی) اور ایک دیکھنا ابوجہل کا تھا کہ مالھٰذا الرسول یاکل الطعام و یمشی فی الاسواق (یہ کیسا نبی ہے کہ آدمیوں کی طرح غذا کا محتاج ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے؟ الفرقان: ۷)

ذات وصفات

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے - اسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیت اعلیٰ تک پہنچنے کے لیے بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے۔ اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا تصور سامنے آ نہیں سکتا (جب تک) ایجابی صفتوں کے تشخص کا کوئی نہ کوئی نقاب چہرے پر نہ ڈال دے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے (صفات باری تعالیٰ میں) جو راہ اختیار کی وہ ایک طرف تو تنزیہ[1] کو اس کے

---

[1] "تنزیہ" سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے، صفات الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک و بلند رکھا جائے۔

کمال کے درجے پر پہنچا دیتی ہے۔ دوسری طرف "تعطیل"[1] سے بھی تصور کو بچا لیتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا حسن و خوبی کی ان تمام صفتوں سے، جو انسانی فکر میں آسکتی ہیں، متصف ہے۔ وہ زندہ ہے۔ قدرت والا ہے۔ رحمت والا ہے۔ لیکن اسی طرح صاف صاف اور بے لچک کہہ دیتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں، جو تمہارے تصور میں آسکتی ہو وہ عدیم المثال ہے۔

درماندگیوں کا ایک ہی حل

غرض قرآن کے تصور الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے اور ساری سرگردانیوں کے بعد بالآخر اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ یہاں ایک طرف بام حقیقت کی بلندی اور فکر کوتاہ کی نارسائیاں ہوئیں، دوسری طرف ہماری فطرت کا اضطراب طلب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام اتنا بلند کہ نگاہِ تصور تھک تھک کے رہ جاتی ہے۔ تقاضائے دید اتنا سخت کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پا سکتا۔ اگر "تنزیہ" کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو "تعطیل" میں جا گرتے ہیں اگر اثبات صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو "تشبیہ" اور "تجسم" میں کھوئے جاتے ہیں۔ پس نجات کی راہ صرف یہی ہوئی کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رہیں۔ "اثبات" کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، "تنزیہ" کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔

محکمات و متشابہات

قرآن نے مطالب کی دو بنیادی قسمیں قرار دیں، ایک کو "محکمات" سے تعبیر کیا۔ دوسری کو "متشابہات" سے۔ محکمات سے وہ باتیں مقصود ہیں، جو صاف صاف انسان کی سمجھ میں آجاتی ہیں اور اس کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لیے ایک زیادہ معانی کا دل میں احتمال نہیں۔ متشابہات وہ ہیں جن کی حقیقت وہ پا نہیں سکتا اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص حد تک جا کر رک جائے اور بے نتیجہ باریک بینیاں نہ کرے۔

هو الذی انزل علیك الكتاب فيه ايات محكمات هن ام الكتاب و اخر متشبهت ، فاما الذين فی قلوبهم زيغ يتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاويله و ما يعلم تاويله الا الله والراسخون فی العلم يقولون امنا

(اے پیغمبر) وہی (حی و قیوم) ہے جس نے تم پر الکتاب نازل فرمائی ہے۔ اس میں ایک قسم تو محکم آیتوں کی ہے (یعنی ایسی آیتوں کی جو اپنے ایک ہی معنی میں اٹل اور ظاہر ہیں) اور وہ کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ دوسری قسم متشابہات کی ہے (یعنی ان کا مطلب کھلا اور قطعی نہیں)

---

[1] "تعطیل" کے معنی یہ ہیں کہ "تنزیہ" کے منع و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکر انسانی کے تصور کے لیے کوئی بات باقی نہ رہے۔ قرآن کا تصور صفات تنزیہ کی تکمیل ہے، تعطیل کا آغاز نہیں۔ اسی طرح قرآن نے تشبیہ و تمثیل و تجسم کا بھی خاتمہ کر دیا۔

بہٖ کلٌ من عند ربنا و ما یذّکّرُ الا اولوا الالباب۔ (آل عمران ۲)

توجن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ (محکم آیتیں چھوڑ کر) ان آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو کتاب اللہ میں متشابہ ہیں، اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت معلوم کرلیں حالانکہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر جو لوگ علم میں پکّے ہیں کہتے ہیں ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور معصیت یہ ہے کہ (تعلیم حق سے) دانائی حاصل نہیں کرتے مگر وہی جو عقل و بصیرت رکھنے والے ہیں۔

متشابہات کی حقیقت کا ادراک عقل انسانی کی پہنچ سے باہر ہے وہ خلاف عقل نہیں (بلکہ) ماورائے عقل ہیں۔ انسان ان پر یقین کرسکتا ہے، مگر ان کی حقیقت نہیں پاسکتا۔

وفائے عہد اور قرآن

عہد جاہلیت کے عرب وفائے عہد کی اخلاقی قدر و قیمت سے بے خبر نہ تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو اپنے اور اپنے قبیلے کے مفاخر میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ وفائے عہد کو دیتے تھے لیکن جہاں تک جماعتی معاہدوں کا تعلق ہے، وفائے عہد کا عقیدہ کوئی علمی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک قبیلہ ایک قبیلے سے معاہدہ کرتا تھا۔ کل دیکھتا تھا کہ اس کے مخالف زیادہ طاقتور ہوگئے ہیں تو بے دریغ ان سے جاملتا تھا اور معاہد و حلیف پر حملہ کردیتا تھا۔ اگر کسی دشمن فریق سے (عہد جاہلیت کے عرب) امن کا معاہدہ کرتے، پھر دیکھتے کہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع پیدا ہوگیا ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی معاہدے کا احترام انھیں حملہ کردینے سے نہیں روکتا تھا اور بے خبر دشمن پر جا گرتے تھے۔

قرآن راستبازی کی جو روح پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک لمحے کے لیے بھی ایسی بد اخلاقی گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے وفائے عہد اور احترام پیمان کا جو معیار قایم کیا ہے وہ اس درجہ بلند، قطعی، بے لچک اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی بھی گوشہ اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ فرد ہو یا جماعت، ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی، عزیز ہوں یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہوں یا غیر ہم قوم و مذہب، دوست ہوں یا دشمن، امن کی حالت ہو یا جنگ کی، لیکن کسی بھی حال میں عہد شکنی جائز نہیں، وہ ہر حال میں جرم ہے۔ معصیت ہے۔ اللہ کے ساتھ ایک بات کرکے اسے توڑ دینا ہے۔ عذاب عظیم کا اپنے کو مستحق ثابت کرنا ہے۔

قرآنی ارشادات

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا وفائے عہد پر زور دیا ہے اور جہاں کہیں مومنوں کے ایمانی فضائل کی تصویر کھینچی ہے، یہ وصف سب سے زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے،

۱۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا۔ (البقرہ: ۱۷۷)

اور جب قول و قرار کر لیتے ہیں تو اس کا پاس کرتے ہیں۔

۲۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (المومنون)

نیز جن کی حالت یہ ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔

احادیث میں منافق کی یہ پہچان بتلائی گئی ہے:

اذا وعد اخلف۔

جب وعدہ کرے گا پورا نہ کرے گا

(سورۂ نحل آیت ۹۲ میں فرمایا)،

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ

تم آپس کے معاملے میں اپنی قسموں کو مکر و فساد کا ذریعہ بناتے ہو اس لیے کہ ایک گروہ کسی دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے (یاد رکھو) اس معاملے میں اللہ تمہاری (راستبازی اور استقامت) کی آزمائش کرتا ہے۔

پھر اس طرح کی بدعہدی کی مثال کیا ہے؟ فرمایا، کالتی نقضت غزلہا من بعد قوۃ انکاثا (اس عورت کی سی ہے جس نے بڑی جانفشانی سے سوت کاتا، پھر خود ہی اسے ٹکڑے کر کے برباد کر دیا) یعنی جب ایک شخص یا ایک گروہ کوئی معاہدہ کرتا ہے تو اس کی پختگی کے لیے بڑی باتیں کرتا ہے۔ ہر طرح دوسرے فریق کو یقین دلاتا ہے۔ پھر اگر ایک بات اتنی کوشش کے بعد پختہ کی گئی ہے تو کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے کل پختہ کی تھی، وہی آج اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ کر رکھ دے۔

رسول اکرم صلعم کی شان رافت و رحمت

سورۂ توبہ کی آخری دو آیتوںؒ میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا، اللہ کا رسول تم میں آگیا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ (۱۲۸ - ۱۲۹)

تمہارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ وہ مومنوں کے لیے شفقت اور رحمت رکھنے والا ہے اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو "میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں مگر اس کی ذات۔ میں نے اسی پر بھروسا کیا وہ تمام عالم ہستی کی جہانداری کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔

اس نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آ نکلا تھا۔ سنت الٰہی کے مطابق خود تمھیں میں پیدا ہوا اور چونکہ تمھیں میں سے ہے، اس لیے اول سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمھاری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں اس کا لڑکپن بھی تم میں گزرا۔ اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو اس نے تم سے کہیں چھپ کر زندگی بسر نہیں کی۔ اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے پھر جو کچھ گزرنا تھا، گزرا۔ تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سن لیے۔ فتح و کامرانی میں ان کی تصدیق بھی کر لی تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کی شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی آزما نہ لی ہو۔

پھر (رسول صلعم کے) ایک ایسے وصف پر زور دیا، جو منصب رسالت کے لیے اور ہر اُس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو، سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت، فرمایا، اس سے زیادہ کوئی بات تمھارے لیے یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتاپا شفقت و رحمت ہے۔ وہ تمھارا دکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ تمھاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے ہو، خواہ روح کے لیے، اس کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے۔ وہ اس کے لیے ایسا مضطرب قلب رکھتا ہے کہ اگر اس کی بن پڑتی تو ہدایت و سعادت کی ساری پاکیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلا دیتا۔ پھر اس کی یہ شفقت و محبت تمھارے ہی لیے نہیں وہ تو تمام مومنوں کے لیے خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے "رؤف رحیم" ہے۔

"رؤف" "رافت" سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری اور مصیبت پر جوش میں آئے۔ پس رافت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے۔ دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت و تاثیر کے ساتھ واضح ہو گیا۔

خدا نے یہ دونوں وصف جا بجا اپنے لیے فرمائے ہیں اور یہاں اپنے رسولؐ کے لیے بھی فرمائے۔

پیام موعظت کی ضرورت

اس کے بعد مجمع مخاطبین یہ سب کچھ دیکھ لینے اور تجربہ کر لینے کے بعد بھی ادائے فرض سے اعراض کرے تو اے پیغمبر تم آخری اعلان کر دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا تھا اور اب بھی بس کرتا ہے وہ اپنے کلمۂ حق کا محافظ ہے اور اس کی مشیت نے جو فیصلہ کر دیا ہے بہر حال ہو کر رہنے والا ہے۔ اس کا قیام و عروج کسی خاص ملک اور قوم کی پشت پناہی پر موقوف نہیں۔ میرا بھروسا اللہ ہی پر تھا، اسی پر ہے، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

یہ پیام موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا؟ اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں سورت (یعنی سورۃ توبہ) کے نزول کا وقت اور سورت کے مطالب۔ یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب تمام عرب میں کلمۂ حق سربلند ہو چکا تھا اور گو قرآن کی عالمگیر فیروزمندیوں کی خبر دے دی تھی تاہم ان لوگوں کے لیے جو کل تک

غربت و بیکسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے۔ تمام عرب کا مسلمان ہو جانا بڑی سے بڑی کامرانی تھی اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہو جائے۔ غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں بعض سے جو تساہل ہوا اس کی تہ میں بھی اسی حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صورت میں اس تفصیل اور شدت کے ساتھ استعداد کار اور عزم و ہمت کی تلقین کی گئی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسری سورت میں نہیں ملتی۔

تاریخ انسانیت کے نوادر

کوئی شخص کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے، لیکن تاریخ اسلام کے چند واقعات اس درجہ واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں ان سے انکار کیا جا سکے۔ ازاں جملہ یہ کہ جو جماعتیں پیغمبر اسلام صلعم کی مخالف تھیں، ان کے تمام کام اول سے آخر تک ظلم و تشدد، دغا و فریب اور وحشت و تشدد پر مبنی رہے اور پیغمبر اسلام صلعم اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا اس کا ایک ایک فعل، صبر و تحمل، راستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا۔

۱۔ مظلومی میں صبر،

۲۔ مقابلے میں عزم،

۳۔ معاملے میں راستبازی،

۴۔ طاقت و اختیار میں درگزر،

تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں، جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے (جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے اندر جمع ہوئے اور پورا عہد مبارکہ نبوت ان نوادر کی درخشانیوں سے جگمگا رہا ہے۔ گویا سیرۃ طیبہ کا نچوڑ یہی ہے جو حقیقت میں انسانیت عالیہ و عظمیٰ کا سدرۃ المنتہیٰ ہے)

"نذیر" و "بشیر"

انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو چاہتے ہیں کہ اسے انسانیت و بندگی کی سطح سے بلند کر کے دیکھیں، لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام صلعم کی حیثیت صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کر دی کہ ہمیشہ کے لیے اس گمراہی کا ازالہ ہو گیا۔ صرف یہی ایک بات ان کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے۔

جو دنیا پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہشمند تھی، اسلام کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب دان تسلیم کر لو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی نسبت جو بات سنائی، یہ تھی کہ میں انکار و بدعملی کے نتائج سے خبر کر دینے والا ("نذیر") اور ایمان و نیک عملی کی برکتوں کی بشارت دینے والا ("بشیر") ایک بندہ ہوں اگر غیب داں ہوتا تو زندگی کا کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا؛

کیا ایسے انسان کی زبان سے سچائی کے سوا کوئی بات نکل سکتی ہے؟

چہ عظمت دادہ ای یا رب بخلق آں عظیم الشاں
کہ "انی عبدہ" گوید بجائے قول "سبحانی"

سورۂ فاتحہ کی تعلیمی رُوح

سورۂ فاتحہ، "ام القرآن" ہے "الکافیہ" ہے "اساس القرآن" ہے "السبع المثانی" ہے قرآن کی تمام سورتوں میں دین حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں سورۂ فاتحہ میں انھی کا بہ شکل اجمال بیان موجود ہے۔ اس کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت (نماز پنجگانہ) کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔ ذرا اس کی تعلیمی روح کا اندازہ فرمائیے:

۱۔ وہ خدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں اور مذہبوں کی گروہ بندیوں کا خدا ہے بلکہ "رب العلمین" کی حمد میں جو کائنات خلقت کا پروردگار ہے اور تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر پروردگاری و رحمت رکھتا ہے۔

۲۔ پھر وہ اسے (خدا کو) اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف "رحمت" و "عدالت" ہی کی صفتیں اسے (حمد و ثنا کرنے والے کو) یاد آتی ہیں۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کے لیے سرتا سر رحمت و عدالت کی نمود ہے۔

۳۔ وہ اپنا سر نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے۔ کہتا ہے صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ دنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح انسانی فرمانروائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔

۴۔ پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے لیکن کون سی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل، خاص قوم یا خاص مذہبی حلقے کی سیدھی راہ؟ نہیں وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راستباز انسانوں کی متفقہ راہ ہے۔

۵۔ اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے۔ یہاں بھی ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔

۶۔ گویا جس بات کا طلبگار ہے، وہ بھی نوع انسانی کی عالمگیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے، وہ بھی نوع انسانی کی عالمگیر برائی ہے۔ نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی۔

۷۔ غرضکہ مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لیے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے؟

جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا؟ کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ اول، اس کی خدا پرستی خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی۔ دوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی وہ نسل، قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہ ہوگا، عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا۔ دعوت قرآنی کی اصل رُوح یہی ہے۔ (ماخوذ از ترجمان القرآن)

ہجرت حبش، مقاطعہ اور اسریٰ

باب ۱۹

قریش کا جور و ستم اور ہجرت حبش

قریش کی سنگدلی دعوت اسلام کے ساتھ ہی قریش کی آتش عداوت ایک دم بھڑک اٹھی اور ہجرت جور و ستم کا آغاز ہو گیا، حالانکہ دعوت کا جو خلاصہ ہم اوپر پیش کر چکے ہیں، ان میں کون سی چیز ایسی ہے جس پر بگڑنا یا جوش میں آجانا کسی مدعی شرافت کے لیے کسی بھی اعتبار سے زیبا ہو تا مثلاً خدا ایک ہے، وہی پوجا کے لائق ہے سورج، چاند، تارے، شجر، حجر، بت وغیرہ کسی کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ دین میں دیانت، وعدے کا ایفا، محتاجوں، مسافروں اور غریبوں کی خبر گیری، آپس میں مل جل کر رہنا، برائیوں سے بچنا، اچھائیوں کی پیروی کرنا یہی خاص باتیں تھیں لیکن قریش اسے برداشت نہ کر سکے جس کے اسباب سیرت کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں[۱]

مساکین کو خوفناک اذیتیں خصوصاً ان مساکین کو نہایت خوفناک اذیتیں پہنچائی گئیں، جو غلام تھے یا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا مثلاً:

۱۔ حضرت بلالؓ کی گردن میں رسی ڈال کر مکہ مکرمہ کی پہاڑیوں میں دوپہر کے وقت گرم زمین پر لٹا کر گرم پتھر چھاتی پر رکھ دیتے، مشکیں باندھ کر لکڑی سے پیٹتے، دھوپ میں بٹھائے رکھتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بلالؓ کو خرید کر خدا کے لیے آزاد کر دیا۔

۲۔ حضرت عمارؓ نیز ان کے والدین، یاسرؓ اور سمیہؓ، کو ابوجہل نے گوناگوں عذاب پہنچائے، حتیٰ کہ حضرت سمیہؓ ایک شدید زخم کے باعث شہادت پا گئیں۔

۳۔ خبابؓ بن الارت کو ایک روز دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا کر ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں، یہاں تک کہ کوئلے ٹھنڈے پڑ گئے۔

حضرت ابوبکرؓ نے ان مساکین میں سے بلالؓ کے علاوہ ان کی والدۂ ماجدہ، عامر بن فہیرہ، ام عُبیس، زنیرہ، اس کی بیٹی اور لبینہ کو بھاری داموں پر خریدا اور آزاد کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کو ان کا چچا صف میں لپیٹ کر لٹکا دیتا اور نیچے سے دھواں چھوڑتا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو

---

[۱] مثلاً سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۹۸۔۲۰۴ اور رحمۃ للعالمین جلد اول ص ۶۲۔۶۳

ان کی ماں نے گھر سے نکال دیا۔ بعض کو گائے اور اونٹ وغیرہ کے چمڑے میں لپیٹ کر دھوپ میں چھوڑ دیتے، بعض کو لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں جلتے پتھروں پر گرا دیتے۔

خدا کی راہ میں پہلی ہجرت

"جب قریش کے ظلم و تعدی کا بادل پیہم برس کر بھی نہ کھلا تو رحمت عالم (صلعم) نے جاں نثاران اسلام کو ہدایت فرمائی کہ حبش ہجرت کر جائیں جو قریش کی قدیم تجارت گاہ تھی[۱]۔"

حبش کے ساتھ قریش کے تجارتی روابط پشتوں سے چلے آ رہے تھے۔ آنحضرت (صلعم) کے پردادا ہاشم نے قیصر روم سے تجارت کا پروانہ حاصل کیا تھا تو قیصر نے اپنے ہم مذہب حکمران شاہ حبش کے نام بھی ایک سفارشی خط لکھ دیا تھا کہ اہل مکہ کے تجارتی قافلے اپنے ملک میں آنے دے۔ سیرۃ النبی میں ہے کہ ہاشم نے شاہ حبش سے قریش کے تجارتی مال پر ٹیکس نہ لینے کا فرمان حاصل کر لیا تھا[۲]۔ اس وقت سے قریش بڑی تعداد میں حبش جاتے آتے تھے۔

حبش کے بادشاہ کو عرب نجاشی کہتے تھے جو حبشی زبان کے لفظ نجوس (یا نیگوش) کی تعریب ہے اور اس کے معنی "بادشاہ" کے ہیں۔ وقت کے نجاشی کا نام اصحمہ تھا اور اس کے عدل و انصاف کی شہرت تھی۔

ہجرت سے ایک بدیہی فائدہ تو یہ تھا کہ مظلومین کے لیے مامن مہیا ہو جاتا، دوسرا اور اہم تر فائدہ یہ بھی تھا کہ دعوتِ حق کے پیرو جہاں جاتے وہاں اسلام کی روشنی خود بخود پھیلنے کا سر و سامان ہو جاتا۔ وہ زبان سے بھی اسلام کی دعوت دیتے۔ اپنے حسن عمل اور فضائل اخلاق کی بدولت بذات خود بھی ایک موثر عملی دعوت اسلام تھے۔

مہاجرین اوّلین

شروع میں گیارہ مردوں اور چار عورتوں نے ہجرت کی، جن میں حضرت عثمانؓ مع اہلیہ (حضرت رقیہؓ بنت آنحضرتؐ)، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت مصعبؓ بن عمیر، حضرت ابوسلمہؓ مخزومی مع اہلیہ (حضرت ام سلمہؓ[۳])، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عثمانؓ بن مظعون بعد میں وقتاً فوقتاً متفرق قافلے جاتے رہے، یہاں تک کہ حبش میں کل مہاجرین کی تعداد ایک سو ایک تک پہنچ گئی (تراسی مرد اور اٹھارہ عورتیں)۔ بعد کے قافلوں میں جو اہم شخصیتیں گئیں ان میں سے ایک حضرت جعفرؓ بن ابی طالب تھے، جو آگے چل کر دربار نجاشی میں مہاجرین حبش کے ترجمان بنے۔

قریش کی بے پناہ عداوت

اس زمانے میں اہل مکہ کے لیے بندرگاہ شعیبہ تھی، جہاں سے جہاز حبش

۱؎ سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۱۷ ۲؎ سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۵۵ ۳؎ حضرت ابوسلمہ کی وفات کے بعد رسول اللہ صلعم کے نکاح میں آئیں اور ام المومنین بنیں۔

اور دوسرے مقامات کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ یہ مقام جدہ سے تھوڑے فاصلے پر جنوب میں ہے۔ خود جدہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں بندرگاہ بنا اور شعیبہ کی رونق ادھر منتقل ہو گئی۔

مہاجرین کا پہلا قافلہ رجب ۵ نبوی (۶۱۴ء) میں روانہ ہوا تھا۔ یہ اصحاب دو تجارتی جہازوں پر سوار ہو کر گئے تھے۔ قریش کو ہجرت حبش کا علم ہوا تو مہاجرین کے تعاقب میں بندرگاہ تک گئے لیکن قافلہ پیشتر جا چکا تھا۔

بعد میں بھی مہاجرین کے قافلے چھپ چھپا کر جاتے رہے۔ قریش کی عداوت کا یہ عالم تھا کہ مظلومین کا تعاقب نہ چھوڑا۔ ایک وفد بطور سفارت شاہ حبش کے پاس بھیجا، جس میں عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص (جو حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد "فاتح مصر" بنے) شامل تھے۔ وفد نے نجاشی اور اس کے درباریوں کے لیے تحائف بھی ساتھ لیے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ درباریوں کو ہم نوا بنا کر اور مظلوم مسلمانوں کو حبش سے نکلوا کر اپنے ساتھ لے آئیں تاکہ پہلے کی طرح ظلم و جور کا شوق پورا کرتے رہیں۔

اس زمانے میں اکسوم حبش کا دارالحکومت تھا، جو آج بھی ایک معمولی سی بستی کے طور پر حبش کے شمالی و مشرقی گوشے میں موجود ہے۔ اہل حبش نے ۱۸۹۶ء میں عدوا کے مقام پر اطالویوں کو شکست فاش دی تھی۔ اکسوم عدوا کے قریب ہے۔ بعد میں عدیس ابابا دارالحکومت بنا، کیونکہ وہ زیادہ مرکزی مقام تھا۔

وفد کا مطالبہ

قریش کے وفد نے حبش پہنچتے ہی درباریوں اور پادریوں سے ملاقات کی۔ تحائف دے کر انھیں ہموار کر لیا۔ سب سے یہی کہا کہ ہمارے ہاں کے چند لوگ آبائی مذہب چھوڑ چکے ہیں اور یہاں آ گئے ہیں انھوں نے مسیحیت یا یہودیت بھی قبول نہیں کی لہٰذا انھیں ملک سے نکلوا دینے پر زور دینا چاہیے۔ پھر اہل وفد خود دربار میں پہنچے اور نجاشی سے بھی اسی انداز میں بات چیت کی۔ کہا کہ یہ جو لوگ آپ کے ملک میں آ بسے ہیں، ہمارا دین چھوڑ بیٹھے۔ آپ کے دین میں داخل نہیں ہوئے۔ انھوں نے نیا دین نکالا ہے۔ اشراف قوم نے، جن میں ان لوگوں کے باپ، چچا اور دوسرے اہل قبیلہ شامل ہیں، ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے کہ انھیں واپس کر دیں۔ درباریوں اور پادریوں نے بھی حسب قرارداد وفد کے مطالبے کی تائید کی۔

تحائف میں چمڑے کی بنی ہوئی چیزیں پیش کی گئی تھیں۔ اس زمانے میں قریش کا سب سے بڑا تحفہ یہی تھا اور اسے بہت قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ قریش کے تجارتی مال میں بھی ایک خاص جنس چمڑا ہی ہوتا تھا۔

نجاشی نے مطالبہ سن کر کہا کہ جب تک ان لوگوں سے بات چیت نہ کر لی جائے اور ان کا مسلک معلوم نہ ہو جائے، ان کے خلاف کوئی حکم دے دینا قرین انصاف نہیں۔ چنانچہ مسلمان مہاجرین کے نمایندے دربار میں بلائے گئے وہ آئے تو دستور عام کے مطابق بادشاہ کو سجدہ نہ کیا۔

حضرت جعفرؓ کی تقریر

نجاشی نے مسلمانوں سے ان کے مذہب کی کیفیت پوچھی۔ ان کی طرف سے حضرت جعفرؓ نے

ایک جامع اور پُرتاثیر تقریر فرمائی، جس میں اسلام کے اہم اجزا بھی آگئے تھے اور اسلام سے قبل عربوں کی حالت کا نقشہ بھی کھینچ دیا تھا، یہی پوری دنیا کا نقشہ تھا۔ حضرت جعفرؓ نے کہا:

"اے بادشاہ! ہم لوگ جاہلیت میں مبتلا تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے۔ بے حیائی کے کام کرتے تھے۔ اقربا کے حقوق سے قطع نظر کیے بیٹھے تھے۔ ہمسایوں سے ہمارا برتاؤ اچھا نہ تھا۔ ہم میں سے طاقتور کمزوروں کو کھا گئے تھے۔ یہ حالت تھی، جب اللہ نے ہم میں سے ایک رسول مبعوث کیا، جس کے حسب و نسب، صدق و دیانت، تقویٰ و پرہیزگاری سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت دی۔ سمجھایا کہ اکیلے خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ پتھروں اور بتوں کی پوجا چھوڑ دو، جنھیں ہم اور ہمارے آباو اجداد پوجتے تھے۔ سچ بولو۔ امانتیں ادا کرتے رہو۔ اقربا کے حقوق کا خیال رکھو۔ ہمسایوں سے اچھا برتاؤ کرو۔ حرام باتوں اور خونریزی سے دُور رہو۔ اس نے ہمیں تاکید کی کہ بے حیائی سے بچو۔ جھوٹ نہ بولو۔ یتیموں کا مال نہ کھاؤ۔ پاک دامن عورتوں پر بدنامی کے داغ نہ لگاؤ۔ وعدے پورے کرو۔ گناہوں سے دُور رہو۔ حکم دیا کہ صرف ایک خدا کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ نماز پڑھو، زکوٰۃ دو۔ روزے رکھو۔ اس نے جس چیز کو حرام بتایا، ہم نے حرام جانا۔ جس چیز کو حلال بتایا، ہم نے حلال جانا۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی۔ برے کاموں سے باز آئے۔ اس پر ہماری قوم جانی دشمن ہوگئی ہے۔ مجبور کر رہی ہے کہ ہم وحدہٗ لاشریک کی عبادت چھوڑ دیں۔ لکڑی اور پتھر کی مورتیں پوجیں۔ ہم نے قوم کے ہاتھوں بہت ظلم سہے۔ مجبور ہو کر پناہ لینے کے لیے تیرے ملک میں آئے ہیں۔"

نجاشی نے یہ تقریر سن کر کہا، جو کلام الٰہی تمھارے پیغمبر پر اترا ہے، وہ کہیں سے پڑھو۔ حضرت جعفرؓ نے سورۃ مریمؑ کی چند آیتیں سنائیں، جنھیں سنتے ہی نجاشی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور اس نے کہا، خدا کی قسم، یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔

قریش کے سفیروں کو جواب دے دیا کہ تم چلے جاؤ۔ میں ان لوگوں کو ہرگز واپس نہ کروں گا۔

حضرت عیسیٰ کے متعلق سوال

دوسرے روز عمرو ابن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا: اے بادشاہ! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ان لوگو کا عقیدہ کیا ہے؟ چنانچہ مسلمان دوبارہ دربار میں بلائے گئے۔ خود انھیں بھی اندیشہ تھا کہ نجاشی عیسائی ہے۔ ممکن ہے وہ مسلمانوں کا عقیدہ سن کر ناراض ہو جائے۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا: "کچھ بھی ہو ہمیں سچ کہنا چاہیے۔ ہم وہی کہیں گے جو ہمارے خدا اور ہمارے رسول صلعم نے فرمایا۔" دربار میں حضرت عیسیٰ کے متعلق سوال کیا گیا تو حضرت جعفرؓ نے

جواب دیا: "وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا کلمہ تھے، جو مریم عذرا پر القا کیا گیا۔" نجاشی نے یہ سنتے ہی تنکا زمین سے اٹھایا اور کہا: "جو کچھ تم نے بتایا، خدا کی قسم، عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ نجاشی آریوسی[1] مسیحیوں میں سے تھا، جو حضرت عیسیٰؑ کی وحدت فطرت کے قائل تھے۔ تثلیث کے قائلوں کی طرح یہ نہیں مانتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ میں دو فطرتیں جمع تھیں، ایک عبدیت کی اور دوسری الوہیت کی۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں کے عقیدے کی تصدیق کی۔

نجاشی کی خدمت

مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ اس اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا جس کے مقابلے کے لیے بادشاہ کو خود جانا پڑا۔ صحابہؓ نے مشورہ کیا اور قرار پایا کہ ان میں سے بھی ایک شخص ساتھ جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لیے نکلیں۔ حضرت زبیرؓ بن العوام نے، جو سب سے زیادہ کم عمر تھے، اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کیا۔ مشک کے سہارے دریائے نیل تیر کر رزمگاہ میں پہنچے۔ باقی صحابہؓ نجاشی کی فتح کے لیے خدا سے دعا مانگتے رہے۔ چند روز کے بعد حضرت زبیرؓ نے واپس آکر خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی۔

مہاجرین کی واپسی

ایک روایت ہے کہ حبش میں خبر مشہور ہوئی، قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر اکثر صحابہؓ نے مکہ کا رخ کیا۔ شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ خبر غلط ہے، اس لیے بعض لوگ واپس چلے گئے اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں پہنچ گئے۔ بعض مہاجرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد حبش سے مدینہ منورہ گئے۔ بعض حبش ہی مقیم رہے۔ جب حدیبیہ میں قریش کے ساتھ دس سال کے لیے صلح ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی مہاجرین کو بھی بلا لیا۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اس وقت مدینہ منورہ پہنچے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ حضرت جعفرؓ خود خیبر پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔[2]

خدا کی راہ میں گھر چھوڑنے والے

اس سلسلے میں مولانا کی تحریر بہت مختصر ہے لیکن اس میں کوئی ضروری امر نظر انداز نہیں ہوا۔ میں نے متعلقہ امور اپنی تحریر میں بیان کر دیے ہیں تاکہ

---

[1] آریوس (Arius) اسکندریہ کا پادری تھا جس نے چوتھی صدی مسیحی کے اوائل میں حضرت مسیحؑ کی وحدت فطرت کا عقیدہ پیش کیا، یعنی حضرت موصوف کی الوہی فطرت سے انکار کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ مسیحیت کی پہلی مجلس نیقیہ (ایشیائے کوچک) میں منعقد ہوئی تھی، جس میں آریوس کے عقیدے کو باطل قرار دیا گیا، تاہم اہل حبش نیز مشرقی مسیحیوں اور گاتھوں کی خاصی وسیع جماعتیں مدت تک آریوس کے عقیدے پر قائم رہیں۔ [2] یہ باب، جو ہجرت حبش کے اسباب اور بعض تفصیلات پر مشتمل ہے یہاں تک مولف کا مرتب کردہ ہے اور آگے جو تحریریں درج ہیں، وہ حضرت مولانا کی ہیں۔

خوانندگان کرام کو تمام معلومات یک جا مل جائیں۔

"جب دشمنوں کا ظلم و تشدد اس حد پر پہنچ گیا کہ مسلمانوں پر زندہ رہنا دشوار ہو گیا تو پیغمبر اسلام نے اجازت دے دی کہ حبش (ابی سینیا) کی طرف ہجرت کر جائیں چنانچہ پہلے بارہ مرد اور چار عورتوں کا قافلہ مکّہ سے نکلا، جس کے رئیس حضرت عثمانؓ بن عفان تھے۔ اس کے بعد اور لوگ نکلے، جن کی تعداد تہتر مردوں اور اٹھارہ عورتوں تک پہنچ گئی۔

تاریخ اسلام کی یہ پہلی ہجرت ہے۔ دوسری ہجرت یثرب کی طرف تھی۔

آیت ۱۴۱ (النحل)[1] میں جن مہاجرین کا ذکر کیا ہے اس سے مقصود ابی سینیا (حبش) ہی کے مہاجرین ہیں۔ فرمایا، انھوں نے اللہ کی سچائی کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا ہے اور ہجرت کی مصیبتیں برداشت کی ہیں تو ضروری ہے کہ اللہ ان کا مددگار ہو اور ان کے لیے دنیا میں اچھا ٹھکانا پیدا کر دے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ابی سینیا کا دار غربت ان کے لیے امن و عزت کا مہمان سرا بن گیا۔ یہ وہی ابی سینیا ہے جس کے ایک سپہ سالار ابرہہ نے پچاس برس پہلے مکہ پر حملہ کیا تھا، لیکن اب اسی مکہ کے مظلوموں کا اخلاص و محبت کے ساتھ استقبال کر رہا ہے!

اتنا ہی نہیں بلکہ مظلومیت کی یہ ہجرت تبلیغ حق کی کامرانیوں کا ایک عجیب و غریب وسیلہ بن گئی، یعنی ابی سینیا کے بادشاہ کا دل قبولیت حق کے لیے کھل گیا اور وہ دعوت اسلام پر ایمان لے آیا۔[2]

نجاشی کا قبول اسلام

اسلام کے ابتدائی عہد میں کہ دعوت حق کی غربت و بے چارگی کا زمانہ تھا، نجاشی یعنی "نیگوش" حبش کا مسیحی فرمانروا، بغیر دیکھے ایمان لے آیا۔ مسلمانوں کی جو جماعت ہجرت کر کے حبش چلی گئی تھی، نجاشی نے ان سے خواہش کی کہ اپنے پیغمبرؐ کا کلام سناؤ، انھوں نے سورۃ مریم کی تلاوت کی۔ نجاشی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ وُہ بول اٹھا: اس کلام میں وہی روح بول رہی ہے جو مسیحؑ میں گویا ہُوئی تھی۔

نجاشی کے علاوہ خود عرب میں بھی عیسائیوں کی بڑی تعداد ایمان لے آئی، لیکن یہودیوں کے جمود میں جنبش نہ ہوئی، وہ برابر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں خیبر سے جلا وطن کیے گئے۔ (مولف)

---

[1] ۱۴۱ (یاد رکھو) جن لوگوں پر (ان کے ایمان لانے کی وجہ سے) ظلم ہوا اور ظلم سہنے کے بعد انھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی تو ہم ضرور انھیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا بدلہ تو کہیں بڑھ کر ہے اگر یہ لوگ جان لیتے۔ ترجمان جلد دوم ص ۲۱۹۔

[2] ترجمان جلد اول ص ۴۹۲، سورۃ مائدہ کی آیت ۸۲ میں ذکر ہے کہ مومنوں کے زیادہ دشمن مسیحیوں کے مقابلے میں یہودی ہیں۔ مسیحیوں میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

باب ۲

بنی ہاشم سے مقاطعہ اور سفر طائف

قریش کا غیظ و غضب

قریش مسلمان مہاجروں کو حبش سے نکلوانے میں بری طرح ناکام ہو چکے تھے۔ اودھر حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت حمزہؓ اسلام لے آئے تھے۔ اس بنا پر قریش کے غیظ و غضب کی آگ اور بھی تیز ہو گئی۔ اب یہ تدبیر سوچی گئی کہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کیا جائے۔ چنانچہ قریش کے تمام قبیلوں نے ایک معاہدہ مرتب کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ خاندان بنی ہاشم سے کوئی شخص رشتہ ناتا نہ کرے گا۔ نہ ان سے کوئی چیز خریدی جائے گی، نہ ان کے ہاتھ کوئی چیز بیچی جائے گی، نہ انھیں کھانے پینے کا سامان دیا جائے گا۔ یہ معاہدہ اس وقت تک قایم رہے گا، جب تک بنی ہاشم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لیے حوالے نہ کر دیں گے۔ منصور بن عکرمہ نے یہ معاہدہ لکھا اور کعبہ مکرمہ کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

اگرچہ تمام بنی ہاشم مسلمان نہیں ہوئے تھے، تاہم ان سب کو آنحضرت صلعم کے حامی سمجھا جاتا تھا اس لیے سب کے مقاطعے کا ہدف بنا دینا ضروری سمجھا گیا۔ مجبور ہو کر تمام بنی ہاشم شعب ابی طالب میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہ درہ بنی ہاشم کا موروثی تھا۔ کم و بیش تین سال انھیں وہیں گزارنے پڑے۔ صرف حج کے زمانے میں رسول اللہ صلعم باہر نکل کر تبلیغ فرماتے تھے۔

سنگدلانہ تشدد

بنی ہاشم نے محصوری کا یہ زمانہ بڑی تکلیفوں میں بسر کیا۔ حدیثوں میں صحابہؓ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کے پتّے کھا کھا کر گزارا کرتے تھے۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا۔ اسی کو پانی سے دھویا، آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔

ابن سعد کی روایت ہے کہ بچے بھوک سے روتے تھے تو حصار کے باہر ان کی آواز آتی تھی۔ قریش یہ سن کر

(بقیہ صفحہ ۱۴۸)

قسیس اور رہبان ہیں، جو ہیں انجیل کی تعلیم نے فروتنی اور عاجزی پیدا کر دی تھی۔ پھر ارشاد ہوتا ہے، جب وہ کلام سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا ہے تو ان کی آنکھیں جوشِ گریہ سے بہنے لگتی ہیں۔ سورۂ مریم کی آیات سن کر نجاشی کی آنکھوں سے بھی آنسو بہ نکلے تھے۔ یہ نزولِ قرآن کے وقت کی حالت تھی مگر آگے چل کر مسیحی ریاستوں اور حکومتوں میں بھی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جو یہودیوں کی تھی۔

خوش ہوتے تھے۔

حج کے دنوں میں کافر بھی دشمن سے لڑنا حرام جانتے تھے۔ رسول اللہ صلعم اس زمانے میں گھاٹی سے باہر نکل کر لوگوں کو خدا پر ایمان لانے کے وعظ سنایا کرتے تھے۔ حرمت کے مہینوں میں عرب کے مسلمہ دستور کے مطابق کوئی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

ابولہب کا کام ہی یہ تھا کہ صبح سے شام تک رسول اللہ صلعم کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا اور لوگوں سے کہتا، دیکھو یہ دیوانہ ہے، اس کی بات نہ سنو، جو سنے گا اور مانے گا، وہ تباہ ہو جائے گا۔

محصوری کا خاتمہ

اسی زمانے میں ایک روز حکیم بن حزام نے، جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا، کچھ گیہوں اپنے ایک غلام کے ہاتھ پھوپھی کے لیے بھیجے۔ راستے میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور گیہوں چھین لینے چاہے۔ اتفاق سے ابوالبختری آ گیا۔ اگرچہ وہ کافر تھا، لیکن رحم کی بنا پر اس نے کہا، ایک شخص پھوپھی کو کچھ کھانے کے لیے بھیجتا ہے، تو کیوں روکتا ہے؛ آخر مختلف اصحاب نے اکٹھے ہو کر معاہدے کو چاک کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ابوجہل اور بعض دوسرے معاندوں نے شدید مخالفت کی، لیکن سود مند نہ ہوئی۔ اس اثنا میں دیکھا گیا تو معاہدہ خود دیمک چاٹ گئی تھی۔ مختلف لوگ ہتھیار باندھ باندھ کر بنی ہاشم کے پاس پہنچے اور انھیں گھاٹی سے نکال لائے۔ اس طرح مصائب کا یہ دور اختتام کو پہنچا۔

عام الحزن

محصوری سے باہر نکلنے کے بعد ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ نے چند روز کے تقدم و تاخر سے وفات پائی۔ یہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے۔ ابوطالب آنحضرت صلعم کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔ حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی انتہائی غمخوار و غمگسار رفیق تھیں۔ ان ہمدردوں کی وفات سے رسول اللہ صلعم کو اتنا رنج و قلق ہوا کہ اس سال کا نام "عام الحزن" پڑ گیا، یعنی رنج و غم کا سال۔

سفر طائف

اہل مکہ کی شدید مخالفت کے پیش نظر رسول اللہ صلعم نے طائف کا قصد فرمایا، جو مکہ مکرمہ سے پچاس ساٹھ میل مشرق میں حجاز کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ وہاں بڑے بڑے امرا اور ارباب اثر و رسوخ رہتے تھے۔ خیال تھا کہ اگر وہ راہ راست پر آ جائیں تو دعوت حق کی حمایت و تائید کے لیے بہتر صورتیں پیدا ہو جائیں گی۔

اس سفر میں حضرت زیدؓ بن حارثہ بھی رسول اللہ صلعم کے ہمراہ تھے۔ یہ سفر شوال ۱۰ نبوی (۶۱۹ء) میں ہوا۔

حضور صلعم راستے کے قبیلوں میں وعظ فرماتے ہوئے منزل بہ منزل پیادہ پا طائف پہنچے۔ وہاں تین بھائی بہت معزز مانے جاتے تھے یعنی عبدیالیل، مسعود اور حبیب۔ یہ تینوں عمرو بن عمیر بن عوف ثقفی کے بیٹے تھے۔ حضور صلعم نے یکے بعد دیگرے تینوں سے ملاقات کی اور خدا کا پیغام پہنچایا، مگر بدبختی سے تینوں نے نہایت تلخ و ناخوشگوار جواب دیے۔ ایک نے کہا، میں کعبے کے سامنے داڑھی منڈوا دوں، اگر تجھے اللہ نے رسول بنایا ہو۔ دوسرا بولا، کیا خدا کو

تیرے سوا رسول بنانے کے لیے کوئی نہ ملا؟ تجھے تو سواری بھی میسر نہیں۔ رسول بنانا تھا تو کسی حاکم یا سردار کو بنایا ہوتا۔ تیسرے کا جواب یہ تھا کہ اگر تو واقعی اللہ کا رسول ہے، جیسا کہ کہتا ہے تو تجھ سے کبھی بات نہ کروں گا، کیونکہ تیرے کلام کو رد کروں تو یہ خطرناک امر ہوگا۔ اگر تو خدا پر جھوٹ بولتا ہے تو تجھ سے بات کرنا شایاں ہی نہیں۔

آنحضرت صلعم نے یہ سن کر فرمایا: "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ خیالات اپنے ہی تک محدود رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگوں کے لیے ٹھوکر کھانے کا سبب بن جائیں۔"

گالیاں، تالیاں اور سنگ باری

ان بدنصیبوں نے حضور صلعم کی آخری نصیحت بھی قبول نہ کی۔ اپنے غلاموں، طائف کے بازاریوں اور لڑکوں کو ابھار دیا کہ جب حضور صلعم وعظ فرمائیں تو خوب ہنسی اڑائی جائے چنانچہ جب آپ نے وعظ کہنا شروع کیا تو اوباشوں نے اتنے پتھر پھینکے کہ حضورؐ لہو میں تربتر ہو گئے۔ آپ طائف سے چلنے لگے تو اوباشوں کا مجمع دو رویہ صف باندھ کر کھڑا ہو گیا اور دو تین میل تک آپ پر پتھر برسائے گئے، گالیاں دی گئیں، تالیاں بجائی گئیں۔ آخر آپ نے ایک باغ کے احاطے میں پناہ لی، جو ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ آپ انگور کی ایک بیل کے سایے میں بیٹھ گئے۔ عتبہ اور شیبہ دیکھ چکے تھے کہ طائف کے اوباشوں نے آپ پر کتنے ظلم کیے۔ انھوں نے اپنے غلام عدّاس کو انگور کا خوشہ دے کر بھیجا۔ حضورؐ نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا۔ عدّاس نے حیرت سے آپ کی طرف دیکھا پھر کہا: یہ ایسا کلام ہے کہ یہاں کے باشندے نہیں بولا کرتے۔

حضورؐ: تم کہاں کے ہو اور تمہارا مذہب کیا ہے؟

عدّاس: میں عیسائی ہوں اور نینوی کا باشندہ ہوں۔

حضورؐ: کیا تم مردِ صالح یونسؑ بن متّٰی کے شہر کے ہو؟

عدّاس: آپ کو کیا خبر کہ یونسؑ بن متّٰی کون تھا اور کیسا تھا؟

حضورؐ: وہ میرا بھائی ہے۔ وہ بھی نبی تھا اور میں بھی نبی ہوں۔

عدّاس یہ سنتے ہی جھک پڑا اور حضورؐ کا سر، ہاتھ اور قدم چوم لیے۔

حضورؐ کی دعا

ان تکلیفوں اور ایذاؤں کے باوجود حضور کا قلب مبارک خدا کی عظمت و محبت سے بھرپور تھا۔ اس وقت حضورؐ نے یہ دعا مانگی:

"الٰہی! اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے قدری کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔ اے رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے! تو ہی درماندہ عاجزوں کا مالک ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے؟ بیگانہ ترش رو کے یا اس دشمن کے، جسے میرے معاملے پر قابو ہو؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے کسی مصیبت کی

کچھ پروا نہیں کیونکہ تیری حفاظت و عافیت میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور کی پناہ میں آتا ہوں جس سے تمام اندھیرے اجالے بن جاتے ہیں۔ دنیا اور آخرت کے تمام کام سنور جاتے ہیں۔ تیری ناراضی یا غصہ مجھ پر نہ ہو، مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے۔ نیکی کرنے اور بدی سے محفوظ رہنے کی طاقت تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔"

آپ سوچیں اور خوب غور کریں، آیا خدا سے سچی محبت کی ایسی پاک اور روح و قلب کو روشن کر دینے والی کوئی ایسی مثال سورج اور چاند کی آنکھوں نے دیکھی ہے، جس کا ایک عجیب و غریب نمونہ اس ایمان افروز دعا میں ملتا ہے؟

مخلوق پر شفقت کا بہترین مظاہرہ

جنگ احد میں مسلمانوں کو سخت پریشانیاں اٹھانی پڑی تھیں۔ ان کی بڑی تعداد شہید ہوئی۔ خود رسول اللہ صلعم بھی مجروح ہو گئے تھے حضرت عائشہؓ نے پوچھا، آیا آپ پر اس سے بھی زیادہ سخت زمانہ گزرا ہے؟ فرمایا، عائشہ! تیری قوم کی طرف سے مجھے سخت گھڑیاں دیکھنی پڑی ہیں" پھر اس سلسلے میں طائف کے واقعے کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

"میرے پاس پہاڑوں کا فرشتہ آیا اور بولا، ارشاد ہو تو پہلو کے دونوں پہاڑ ان لوگوں پر الٹا دوں اور وہ پیسے جائیں۔ میں نے کہا، نہیں نہیں، امید ہے اللہ تعالیٰ انھیں میں سے ایسے لوگ پیدا کر دے جو صرف ایک خدا کی عبادت کریں گے۔"

یہ تھی حضورؐ کی شانِ رحمت، یہ تھی خلقِ خدا پر لاانتہا ہی شفقت، صبر و استقامت کی حیرت انگیز مثال، مخلوق کی بہبود کے لیے بے پناہ تڑپ، پیغامِ حق کی صداقت پر انتہائی یقین اور اس پیغام کو دنیا تک پہنچانے کا جو نادر نمونہ اس ارشاد میں ملتا ہے۔ سرگزشت عالم میں اس کی کوئی دوسری نظیر نظر نہیں آتی۔ عالم انسانیت میں سے کسی دوسرے برگزیدہ وجود کے قدمہائے مبارک شفقت علی الخلق کے اس بلند ترین مقام تک نہ پہنچ سکے۔

واقعہ طائف کی اہمیت

دیکھیے، حضورؐ وہ پیغام لے کر طائف پہنچے تھے، جس میں انسانوں کے لیے دنیا اور آخرت کی صلاح و فلاح تھی۔ اس دستور العمل سے بڑھ کر کوئی دوسرا دستور العمل انسانوں کے کانوں تک نہیں پہنچا تھا اور یہ پیغام اہل طائف کی بہتری کے لیے تھا۔ اس سلسلے میں کسی نوع کی ذاتی غرض و منفعت کا کوئی سوال نہ تھا، لیکن بدنصیبوں نے نہ صرف اس پیغام کو ٹھکرایا بلکہ حضورؐ پر جتنے ظلم وہ کر سکتے تھے، بیباکانہ کیے۔ حضورؐ کی زبان مبارک سے پھر بھی ان کے خلاف کوئی کلمہ نہ نکلا۔ تمام مصائب انتہائی تحمل اور بردباری سے جھیل لیے، لیکن ان لوگوں کے لیے کسی قسم کی آفت یا مصیبت گوارا نہ فرمائی۔ پیغامِ حق کے پہنچانے میں سفر طائف کو یگانہ حیثیت حاصل ہے۔ کسی داعی حق کا قدم اس حد تک نہ پہنچ سکا۔ اس وجہ سے سفر طائف حضورؐ کی حیات طیبہ کا نہایت اہم واقعہ ہی نہیں بلکہ ایک بڑا انقلابی موڑ بھی ہے گویا مکہ مکرمہ اور طائف دونوں حضورؐ کے پیغامِ حق سے

منہ موڑ چکے تھے اور اب یثرب پر رحمت کا دروازہ کھلنے والا تھا، جس نے بہت جلد مدینہ منورہ کی حیثیت اختیار کی اور اس مبارک و مسعود دور کا آغاز ہوا جس میں تیس چالیس سال کے اندر کرۂ ارض کا بہت بڑا حصہ دعوت حق سے گونج اٹھا۔ سفر طائف حقیقۃً ہجرت کا اولین مقدمہ ثابت ہوا۔[1] (مولف)

---

[1] یہ باب بھی عاجز مولف ہی کا مرتبہ ہے۔ مجھے اس سلسلے میں مولانا کی کوئی تحریر نہ مل سکی لیکن سیرۃ طیبہ کے دو اہم واقعے یعنی بنی ہاشم سے مقاطعہ اور سفر طائف چھوڑے نہیں جا سکتے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ تفصیلاً نہ سہی، خلاصۃً ہی ضروری مطالب عرض کر دیے جائیں تا کہ کتاب کے تسلسل میں خلل نہ آئے۔

باب ۲

اسریٰ یا معراج

(از مولف)

عمومی کیفیت

بعض اصحاب نے واقعے کی صرف عمومی کیفیت بیان کر دینے پر اکتفا کی۔ پھر مختلف امور کے متعلق اختلافات کی بحثیں چھڑیں لیکن یہاں صرف وہ حقائق اجمالاً پیش کر دینے ضروری ہیں، جن سے معراج کی حقیقت ذہن نشین کر لینے میں مدد ملے۔

مولانا حکیم عبدالرؤف مرحوم داناپوری فرماتے ہیں: "جب آپ کی عمر اکاون برس نو مہینے کی ہوئی تو معراج کا واقعہ پیش آیا۔ زمزم اور مقام ابراہیم کے درمیان سے آپ براق پر حضرت جبریلؑ کے ساتھ پہلے بیت المقدس گئے۔ پھر وہاں سے تقرب الٰہی کے انتہائی منازل میں بلائے گئے، جہاں ملائکہ مقربین بھی نہیں جا سکتے اور اسی رات میں پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی۔"[۱]

قاضی سلیمان منصور پوریؒ لکھتے ہیں: "۲۷۔ رجب ۱۲ نبوت کو معراج ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملکوت السمٰوات والارض کی سیر کرائی۔ اول مسجد الحرام سے بیت المقدس تک تشریف لے گئے۔ وہاں امام بن کر جماعت انبیاء کو نماز پڑھائی۔ پھر آسمانوں کی سیر کی اور انبیا سے ان کے مقامات پر ملتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ اور بیت معمور تک پہنچے۔ وہاں قرب حضوری خاص حاصل ہوا اور گوناگوں وحی سے مشرف ہوئے۔"[۲]

قاضی صاحب مرحوم حاشیے میں فرماتے ہیں: "واضح ہو کہ عروج جسدی کا انکار آجکل کے فلسفۂ خشک کی بنیاد پر فضول ہے، کیونکہ جس قادر مطلق نے اجرام سماویہ کے بھاری بھر کم اجسام کو خلا میں قائم رکھا ہے وہ جسم انسانی کے صغیر جرم کو خلا میں لے جانے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ آج کل نائٹروجن کی طاقت سے ہوائی جہاز اور غباروں کے اندر آدمی اڑ رہے ہیں، اس لیے خدائے کریم کا اپنے نبی کریمؐ کو بہ سواری براق (جو برق سے مشتق اور الیکٹرسٹی کی طاقت مخفیہ کی جانب اشارہ کن ہے) ملکوت السمٰوات کی سیر کرانا کچھ مستبعد نہیں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ معراج جسم کے ساتھ اور بہ حالت بیداری ہوئی۔"[۳]

سید سلیمان مرحوم کا بیان

سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں اسریٰ یا معراج کا بیان کم و بیش اسی صفحات پر پھیلا ہوا ہے (صفحہ ۳۵۵ - ۴۳۵)۔ اس میں مختلف پہلو پوری وضاحت سے لکھ دیے گئے ہیں۔

---

[۱] اصح السیر ص ۵۷ [۲] رحمۃ للعالمین جلد اول ص ۸۶ [۳] رحمۃ للعالمین ص ۸۶ حاشیہ۔

مثلاً انبیائے کرام کی سیر ملکوت، معراج محمدیؐ، اس کا وقت، تاریخ اور تعداد وقوع، صحیح روایتیں، واقعے کی کیفیت، کفار کی تکذیب، کیا نبی (صلعم) نے خدا کو دیکھا؛ معراج جسمانی تھی یا روحانی؛ خواب تھا یا بیداری؛ اس کے بعد پورے سورۂ بنی اسرائیل کو واقعہ معراج پر منطبق کر دیا ہے۔ مثلاً آنحضرت صلعم نبی القبلتین ہوئے۔ بنی اسرائیل کی مدت تولیت ختم ہو گئی۔ کفار مکہ سے متعلق آخری اعلان کر دیا گیا۔ معراج کے احکام و وصایا، ہجرت اور عذاب، نماز پنجگانہ کی فرضیت، ہجرت کی دعا، نبوت، قرآن، قیامت، معراج اور معجزات، حضرت موسیٰؑ کے واقعات سے استشہاد، معراج کے انعامات اور اس کا پر اسرار منظر۔

ان تمام عنوانوں پر مفصل بحث نہیں کی جا سکتی، لیکن صحیح روایات کی بنا پر اصل واقعے کی مسلسل کیفیت اختصاراً بیان کر دینا ضروری ہے۔

صحیح روایات مولانا سید سلیمان فرماتے ہیں:

احادیث و سیر کی کتابوں میں اس واقعے کو کثیر التعداد صحابیوں نے بیان کیا ہے۔ علامہ زرقانی نے پچیس صحابیوں کو نام بنام گنایا ہے۔ علامہ ابن کثیر نے تفسیر (بنی اسرائیل) میں اکثر روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ ان میں "صحیح"، "قوی"، "ضعیف"، "موقوف"، "مرسل"، "منکر" سبھی قسم کی روایتیں ہیں۔ صحاح ستہ میں سے معراج کا واقعہ مستقلاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے۔ ترمذی اور نسائی وغیرہ سب میں ضمناً اور مختصراً یہ واقعات مختلف ابواب میں کہیں کہیں آ گئے ہیں۔

امام بخاری اور امام مسلم نے اسے حضرت ابوذرؓ، حضرت مالکؓ بن صعصعہ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابرؓ بن عبد اللہ اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود سات اکابر صحابہ سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے چار پچھلے صحابیوں نے صرف چند متفرق جزئیات بیان کیے ہیں۔

اصل واقعہ مولانا سید سلیمان فرماتے ہیں: "جب اسلام کی سخت اور پرخطر زندگی کا باب ختم ہونے کو تھا اور ہجرت کے بعد اطمینان و سکون کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا تھا تو وہ شب مبارک اور وہ ساعت ہمایوں آئی، جو دیوان قضا میں سرور عالم صلعم کی سیر ملکوت کے لیے مقرر تھی۔ رُوح الامینؑ وہ سواری، جو بجلی سے زیادہ تیز گام اور روشنی سے زیادہ سبک خرام تھی (جو خطۂ لاہوت کے مسافروں کے لیے مخصوص ہے) حرم کعبہ میں لے کر حاضر ہوئے۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے: حضرت جبریلؑ نازل ہوئے، انھوں نے آپ کا سینۂ مبارک چاک کیا، پھر اسے آب زمزم سے دھویا، سونے کا ایک طشت ایمان و حکمت سے بھر کر لائے۔ سینۂ مبارک میں ڈال کر بند کر دیا، پھر آپ کا ہاتھ پکڑ کر آسمان پر لے گئے وہاں حضرت صالحؑ، حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ

سے ملاقات ہوئی۔ حضرت جبریلؑ آپ کو اور اوپر لے گئے۔ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں قلم (قدرت) کے چلنے کی آواز آتی تھی۔ اسی موقع پر امت کے لیے پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی پھر آپ کو سدرۃ المنتہیٰ کی سیر کرائی گئی۔ حضرت جبریلؑ آپ کو جنت میں بھی لے گئے۔

بعض دوسری روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ آپ براق پر سوار ہو کر گئے۔ خواب و بیداری کی درمیانی حالت میں تھے اور آپ حطیم میں لیٹے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ بیت معمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے۔ سدرۃ المنتہیٰ پرشان ربانی کا پرتو تھا۔ آسمان سے اتر کر آنحضرت صلعم زمین پر تشریف لائے اور بیت المقدس میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ انبیاء علیہم السلام کا مجمع ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ نماز میں مصروف ہیں۔ اسی اثنا میں نماز (غالباً صبح کی نماز) کا وقت آ گیا۔ سرور انبیاء علیہ السلام منصب امامت سے سرفراز ہوئے۔

حافظ ابن قیمؒ

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے: حضرت عائشہؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت حسن بصریؒ سے یہ قول ابن اسحٰق نے نقل کیا ہے کہ معراج میں آپ کی رُوح لے جائی گئی اور آپ کا جسم کھویا نہیں گیا، یعنی وہ اسی دنیا میں اپنی جگہ موجود تھا لیکن یہ کہنا کہ معراج منام (خواب) تھی اور یہ کہنا کہ بذریعہ روح کے تھی، جسم کے ساتھ نہ تھی، ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ سونے والا جو کچھ دیکھتا ہے، اس کی محسوس صورتیں سامنے آجاتی ہیں۔ اسراء روحی سے مراد یہ ہے کہ روح مبارک کو ان جملہ مقامات کی سیر کرائی گئی۔ خواب میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہ درجہ اتم و اکمل، اشرف و اعلیٰ ہے۔ علمائے جمہور کا قول یہ ہے کہ اسریٰ جسم و روح کے ساتھ تھا۔

آنحضرت صلعم کو شب معراج میں جو کچھ حاصل ہُوا، وہ اس سے بھی زیادہ کا حامل تھا، جو روح کو مفارقت جسم کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ صلعم خرق عادات کے مقام میں تھے، یہاں تک کہ آپ کا سینہ چاک کیا گیا اور زندہ ہونے کے باوجود آپ کو تکلیف نہیں ہوئی اسی طرح خود روح مبارک اوپر چڑھائی گئی بغیر اس کے کہ آپ پر موت طاری کی جائے۔ آپ کے سوا کسی کی روح کو موت اور مفارقتِ تن کے بغیر یہ عروج نصیب نہ ہُوا۔ انبیا کی روحیں، جو وہاں ٹھہری ہُوئی تھیں، وہ مفارقت جسم کے بعد تھیں، لیکن آنحضرت صلعم کی روح پاک زندگی کے عالم میں وہاں گئی اور واپس آئی۔

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

معراج میں آپ کو مسجد اقصیٰ لے جایا گیا۔ پھر سدرۃ المنتہیٰ اور جہاں خدا نے چاہا۔ یہ سب کچھ جسم مبارک کے لیے بیداری کی حالت میں ہوا، لیکن اس مقام میں، جو عالم مثال اور عالم ظاہر کے درمیان اور دونوں عالموں کے احکام کا جامع ہے۔ اس لیے جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوئے اور روح پر معاملات روحانی جسم کی صورت میں نمایاں ہوئے۔ ان واقعات میں سے ہر واقعے کی ایک تعبیر ہے۔

فرماتے ہیں:

ا۔ سینہ چیرنے اور اسے ایمان سے بھرنے کی حقیقت یہ ہے کہ ملکیت کے انوار کا غلبہ ہوا اور طبیعت بشری کا شعلہ بجھ گیا۔

ب۔ براق پر سوار ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کے نفس ناطقہ نے اس روح حیوانی پر استیلا حاصل کر لیا، جو کمال حیوانی ہے یعنی آپ کی روح بشری کے احکام روح حیوانی پر غالب آ گئے۔

ج۔ مسجد اقصیٰ اس لیے لے جائے گئے کہ یہ مقام شعائر الٰہی کا مظہر، ملأ اعلیٰ کے ارادوں کی تعلق گاہ اور انبیاء علیہ السلام کی نظرگاہ ہے۔ گویا وہ ملا اعلیٰ کی طرف ایک روشندان ہے، جہاں سے روشنی چھن چھن کر کرۂ انسانی پر فائض ہوتی ہے۔

د۔ انبیاء علیہم السلام سے ملاقات اور امامت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ سب ایک ہی رشتے میں حظیرۃ القدس سے مربوط ہیں اور آپ کی ان حیثیات کمال کا ظہور ہے، جو ان تمام پیغمبروں میں آپ کی ذات سے مخصوص تھیں۔

ہ۔ آسمانوں پر درجہ بدرجہ چڑھنے اور پھر عرش الٰہی تک پہنچنے کی حقیقت یہ ہے کہ ہر آسمان پر جو فرشتے متعین ہیں اور کامل انسانوں میں سے جو جس جس درجے پر پہنچ کر ان سے مل گیا ہے، ان کے حالات سے، نیز اس تدبیر سے، جو ہر آسمان میں خدا نے وحی کی اور اس مباحثے سے جو اس آسمان میں فرشتوں کی جماعت میں ہوتا ہے اس سے آگاہی حاصل ہو۔

و۔ سدرۃ المنتہیٰ وجود کا درخت ہے۔ اس کا ایک دوسرے پر مترتب ہونا پھر تدبیر واحد میں مجتمع ہونا ہے، جس طرح درخت شاخوں کے اختلاف کے باوجود کہ ایک وجود دوسرے پر مترتب ہے پھر سب کا سب قوت غاذیہ اور قوت نامیہ کی تدبیر میں متحد و مجتمع ہوتا ہے۔

ز۔ جو انوار اس درخت کو ڈھانکے ہوئے تھے وہ تنزلات الٰہیہ اور تدبیرات رحمانیہ ہیں، جو اس عالم ظاہر میں وہاں چمکتی ہیں، جہاں ان کے قبول کی استعداد ہوتی ہے۔

ح۔ نہروں کا سوتوں میں وہاں نظر آنا رحمت، حیات اور نشو و نما کا منبع ہے جو عالم ملکوت میں اسی طرح جاری ہے جس طرح عالم ظاہر میں۔

ط۔ بیت معمور کی حقیقت وہ تجلی الٰہی ہے، جس کی طرف انسانوں کے تمام سجدے اور بندگیاں متوجہ ہوتی ہیں۔ وہ گھر کی صورت میں اس لیے نمایاں ہوا کہ ان قبلوں کی طرح ہو جو انسانوں کے درمیان کعبہ اور بیت المقدس کی صورت میں ہیں۔

سلف صالحین کا عقیدہ

مولانا سید سلیمان ندوی سلف صالحین کا عقیدہ ابن اسحٰق کی عبارت میں یوں بیان فرماتے ہیں،

"آپ کے اس سفر شبانہ اور جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے، اس میں آزمائش، کافر و مومن کی

تمیز، خدا کی قدرت اور سلطنت میں سے کوئی الٰہی شان ہے اور اس میں اہل عقل کے لیے عبرت ہے جو اللہ پر ایمان لایا اور تصدیق کی، خدا کے کاموں پر یقین رکھتا ہے، اس کے لیے اس میں ہدایت، رحمت اور ثابت قدمی ہے۔ بس اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رات کے وقت لے گیا، جس طرح چاہا اور جیسے جیسے چاہا تاکہ اسے اپنی نشانیوں میں سے جو چاہے، دکھائے، یہاں تک کہ آپ نے خدا کی شان اور اس کی عظیم القدر قوت کے مناظر دیکھے، جو دیکھے۔ اس قدرت کو دیکھا، جس سے وہ جو کچھ چاہتا ہے، کرتا ہے"[1]

سورۂ بنی اسرائیل اور واقعۂ معراج

سید سلیمان مرحوم فرماتے ہیں:

"عموماً سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معراج کا بیان سورۂ بنی اسرائیل کی صرف ابتدائی تین چار آیتوں میں ہے لیکن ہم نے بنی اسرائیل کو شروع سے آخر تک بار بار پڑھا اور ہر بار اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ یہ پوری سورت معراج کے اسرار و حقائق، نتائج و عبر اور احکام و اعلانات سے معمور ہے۔"

پھر سید مرحوم اس سورت کے جلی عنوانات لکھتے ہیں، جو خلاصتاً ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ آنحضرت صلعم کا نبی قبلتین ہونا (بنی اسرائیل: ۱)

۲۔ بنی اسرائیل کی مدت تولیت کا اختتام (بنی اسرائیل: ۲-۷)

۳۔ قریش کے نام آخری اعلان (بنی اسرائیل: ۸-۲۱)

۴۔ معراج کے احکام و وصایا (بنی اسرائیل: ۲۲-۳۹)

۵۔ ہجرت اور عذاب (بنی اسرائیل: ۵۷-۷۷)

۶۔ نماز پنجگانہ کی فرضیت (بنی اسرائیل: ۷۸)

۷۔ ہجرت کی دعا (بنی اسرائیل: ۷۹)

۸۔ نبوت، قرآن، قیامت، معراج اور معجزات (بنی اسرائیل: ۸۲-۱۰۰)

۹۔ حضرت موسیٰؑ کے واقعات سے استشہاد (بنی اسرائیل: ۱۰۱-۱۰۴)

معراج کے خاص انعامات

سید سلیمان لکھتے ہیں کہ معراج میں آنحضرت صلعم کو دو اور خاص عطیے عنایت ہوئے اول یہ بشارت کہ امت محمدیہ میں سے جو شخص شرک کا مرتکب نہ ہوگا، دامن مغفرت کے سایے میں اسے پناہ مل سکے گی۔ دوم سورۂ بقرہ کا اختتامی رکوع اسی بارگاہ میں فرمان خاص کے طور پر مرحمت ہوا۔ اس

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد سوم ص ۴۰۶-۴۰۷۔ شاہ ولی اللہ اور حافظ ابن قیم کے اقتباسات بھی اسی کتاب سے تلخیصاً لیے گئے ہیں۔

رکوع میں سب سے پہلی مرتبہ ایمان کی تکمیل کے اصول اور عفو و مغفرت کے سبق انسانوں کو سکھائے گئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پہلے عطیے کی بشارت درحقیقت انھیں آیات میں مذکور ہے۔

معراج کا پراسرار منظر سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے معراج کے روحانی مناظر کا بیان صرف دو لفظوں میں ختم کر دیا،

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۔ ہم نے اپنے بندے کو سیر اس لیے کرائی کہ ہم اپنی کچھ نشانیاں اسے دکھائیں۔ (بنی اسرائیل: ۱)

یہ نشانیاں کیا تھیں؟ کیا ان کی تفصیل کے لیے عاجز و درماندہ انسان کی زبان میں کچھ الفاظ ہیں؟ ہاں ہیں، مگر نا تمام ہمارا فہم، ہمارا علم، ہمارا خیال، ہمارا قیاس، غرض جو کچھ ہمارے پاس ہے، اس کا دائرہ ہمارے محسوسات اور ہمارے تعقلات سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور سارے ذخیرۂ لغت میں انھیں کے لیے الفاظ ہیں، اس بنا پر وہ معانی، جو نہ عام محسوسات انسانی کے حدود میں داخل ہیں اور نہ تعقل و تصور کے احاطے کے اندر ہیں، الفاظ و کلمات میں کیونکر سما سکتے ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ اپنے کمال قدرت سے انھیں حروف و کلمات کا جامہ پہنا بھی دے تو دماغ انسانی ان کے فہم و تحمل کی قدرت کہاں سے لائے گا؟[۱] (مولف)

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد سوم ص ۴۰۸ - ۴۳۴ تلخیصاً۔ یہاں مولف کا بیان ختم ہو گیا۔ آگے جو عبارت ہے وہ مولانا آزاد مرحوم کی ہے۔

باب ۲۲

اسریٰ کے متعلق مولانا کے افادات

دلائل حقیقت کا مشاہدہ

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور نے واقعۂ "اسریٰ" پر جو کچھ تحریر فرمایا گو وہ اگرچہ جامع ہے لیکن بہت مختصر ہے۔ اسی لیے مجھے تمہید میں مختلف علمائے کرام کے افادات نقل کرنے پڑے۔

مولانا فرماتے ہیں:

ہجرت مدینہ سے تقریباً ایک سال پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو "اسریٰ" کا معاملہ پیش آیا، جو عام طور پر "معراج" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سورت (سورہ بنی اسرائیل) کی ابتدا اسی واقعے کے ذکر سے کی گئی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس معاملے سے مقصود کیا تھا: لنریہٗ من اٰیٰتنا، تاکہ اللہ کی نشانیاں ان کے مشاہدے میں آجائیں، یعنی دلائل حقیقت کا عینی مشاہدہ کرلیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ معاملہ وحی کی تکمیل تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد فرمایا: اٰتینا موسی الکتاب (سورہ انعام: ۱۵۴) اسی طرح حضرت موسیٰ کا معاملہ وحی بھی کوہ طور کے اعتکاف میں تکمیل ہوا تھا۔ ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا وکلمہ ربہٗ (سورہ اعراف: ۱۴۲) اور انھیں کتاب شریعت دی گئی تھی:

یہاں مسجد حرام سے مقصود مکہ اور مسجد اقصیٰ سے بیت المقدس کا ہیکل ہے۔ اسے اقصیٰ اس لیے فرمایا کہ عرب کے لیے قریب ترین عبادت گاہ خانہ کعبہ تھی اور دور کی عبادت گاہ ہیکل۔

نوعیت واقعہ

واقعۂ "اسریٰ" کی نوعیت کیا تھی؟ یہ عالم بیداری میں پیش آیا یا عالم خواب میں؟ صرف روح پر طاری ہوا تھا یا جسم بھی اس میں شریک تھا؟ اس بارے میں صحابہ و سلف کا اختلاف معلوم ہے۔ اکثر صحابہ و تابعین اس طرف گئے کہ روح و جسم دونوں پر طاری ہوا لیکن حضرت عائشہؓ، حذیفہؓ بن الیمان، حسن، معاویہؓ، ابن اسحٰق وغیرہم سے مروی ہے کہ یہ ایک روحانی معاملہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے احوال و واردات ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے لیے ہماری عام تعبیرات کام نہیں دے سکتیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کر دے گی جو عام طور پر ہمیں پیش آتی رہتی ہیں، لیکن انبیائے کرام کو جو حالات پیش آتے ہیں، ان کی نوعیت ہی دوسری ہے۔ وہ ہمارے محسوسات و مفہومات کے دائرے سے باہر کے معاملات ہیں۔

حقیقت نبوت

خود نبوت کی حقیقت کیا ہے؟ وحی کا معاملہ کیونکر انجام پاتا ہے؟ کیا اس بارے میں ہماری کوئی بھی تعبیر حقیقت حال کی کامل تعبیر ہو سکتی ہے؟ صحیحین کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے

فرمایا، جب وحی آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے "صلصلۃ الجرس"[1] کی آواز ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک تمثیل ہے جو اس لیے اختیار کی گئی کہ اس معاملے کا ایک قریبی تخیل ہمارے اندر پیدا ہو جائے ورنہ وحی کی آمد محض گھنٹیوں کی آواز کی طرح نہیں ہو سکتی۔

سونے اور جاگنے کا درمیانی معاملہ

پس "اسریٰ" کے معاملے کے لیے بھی ہماری محدود تعبیرات کام نہیں دے سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کے تاثرات مختلف ہوئے۔ جن لوگوں نے اس کی نفی کی کہ بیداری میں پیش آیا تھا، وہ اس طرف گئے کہ یہ ہماری جسمانی نقل و حرکت کی طرح کا معاملہ نہ تھا۔ جن لوگوں نے اس پر زور دیا کہ یہ بیداری میں پیش آیا تھا، وہ اس طرف گئے کہ اسے محض خواب کا معاملہ نہیں کہہ سکتے اور اس میں شک نہیں دونوں اپنے تاثرات میں برسرِ حق تھے۔ خود صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: میں اس وقت ایک ایسے عالم میں تھا کہ نہ تو سوتا تھا اور نہ جاگتا تھا۔ "بین النائم والیقظان" اس سے معلوم ہو گیا کہ اس معاملے کو نہ تو ایسا معاملہ قرار دے سکتے ہیں جیسا ہمیں جاگتے میں پیش آیا کرتا ہے، نہ ایسا، جیسے سوتے میں دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ان دونوں حالتوں سے ایک مختلف قسم کی حالت تھی اور ہماری تعبیرات میں اس کے لیے کوئی تعبیر نہیں۔ اس مقام کی مزید تشریح "البیان" میں ملے گی۔

رویا پر بحث

وما جعلنا الرویا التی اریناک الافتنۃ للناس[2] میں "رویا" سے مقصود یہی واقعہ ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس، سعید بن جبیر، مسروق، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج وغیرہم سے ایسا ہی مروی ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس پر محققین تفسیر کا اجماع ہو چکا ہے۔ پس جن مفسروں نے رویا سے مراد کوئی دوسری رویا لی ہے مثلاً فتح مکہ کی رویا، وہ قابلِ اعتنا نہیں کیونکہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور وہ معاملہ ایک عرصے کے بعد مدینہ میں پیش آیا تھا اور تطبیق کے لیے طرح طرح کے تکلفات کرنا قرآن کو چیستان بنا دینا ہے۔

ان مفسروں نے یہ تکلفات اس لیے کیے کہ رویا کا اطلاق خواب پر ہوتا ہے اور اگر اس رویا سے مقصود واقعۂ "اسریٰ" ہو تو ان صحابہ کا قول تسلیم کر لینا پڑے گا جو اس کے بیداری میں ہونے کے قائل نہیں لیکن تعجب ہے کہ ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر پر نظر نہ ڈالی۔ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ ان صحابہ میں سے ہیں جو معراج کو عالمِ بیداری کا معاملہ سمجھتے تھے اور اس مذہب کے سب سے بڑے پیشرو تھے۔ بایں ہمہ انھوں نے بھی رویا کی یہی تفسیر کی ہے کہ

---

[1] گھنٹی کی آواز

[2] وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔ (بنی اسرائیل: ۶۰) اور رویا جو ہم نے تجھے دکھائی تو اس لیے دکھائی کہ لوگوں کے لیے ایک آزمائش ہو۔

واقعۂ" اسریٰ" مراد ہے۔ رؤیاعینٍ اریہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری) آنکھوں سے دیکھی ہوئی رؤیا جو" لیلۃ الاسریٰ" میں آنحضرتؐ کو دکھائی گئی تھی۔ اگر حضرت ابن عباسؓ کو اس آیت کی اس تفسیر میں کوئی وقت پیش نہ آئی جو اس مذہب کے سب سے بڑے قائل تھے تو پھر اور لوگوں کو کیوں دُور از کار توجیہوں کی ضرورت پیش آئے؟ اور یہ جو حضرت ابن عباس نے فرمایا؛" رؤیاعینٍ اریہا" تو اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا اور وہ حقیقت آشکارا ہوگئی، جس کی طرف ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں یعنی جو کچھ پیش آیا، تھا تو رویا ہی، لیکن کیسی رویا؟ ویسی ہی رویا جیسی عالمِ خواب میں ہم دیکھا کرتے ہیں؟ نہیں" رؤیاعینٍ"۔ ایسی رویا جس میں آنکھیں غافل نہیں ہوتیں بیدار ہوتی ہیں، جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسا آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہو۔

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ، لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی۔ (النجم: ۱۷، ۱۸)

بہکی نہیں نگاہ اور نہ حد سے آگے بڑھی بے شک دیکھے اس نے اپنے رب کے بڑے نمونے۔[1]

---

[1] مطلب کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا پورے تمکن و اتقان سے دیکھا۔ نہ نگاہ ٹیڑھی ترچھی ہو کر دائیں بائیں یا اوپر نیچے ہٹی اور نہ مقصود مشاہدہ سے تجاوز کر کے آگے بڑھی۔ بس اسی چیز پر جمی رہی جس کا دکھانا اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔

ہجرت

باب ۲۳

مقام ہجرت

عام کیفیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہجرت یعنی یثرب مکہ مکرمہ سے کم و بیش دو سو اسی میل شمال میں تھا۔ یہی مقام ہے جس نے مدینہ منورہ کے مقدس نام سے انظار و قلوب عالم کے لیے دائمی جلوہ آرائیوں اور ضیا گستریوں کا شرف پایا۔ یہ پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع مستطیل میدان ہے، جس کا طول بارہ میل اور عرض کسی قدر کم ہے[1]۔ اس کے جنوب میں جبل عیر ہے جو خاصا بلند ہے اور شمالی حد پر جو پہاڑ ہے، اس کا نام جبل ثور ہے۔ دائیں بائیں یعنی شرقاً غرباً لاوے کی دیواریں ہیں، جنھیں "لابتین" یا "حرتین" کہتے ہیں۔ شرقی جانب "حرۂ واقم" اور غربی جانب "حرۂ وبرہ"۔ میدان کے جنوبی و شرقی حصے کی سطح کسی قدر بلند ہے اس لیے یہ عالیہ یا عوالی کہلاتا ہے پھر جیسے جیسے شمالی جانب بڑھتے جائیں سطح کسی قدر پست یا ہموار ہوتی جاتی ہے۔ میدان کے بیچ میں بھی چھوٹے بڑے ٹیلے ہیں مثلاً "جبل سلع" جو شہر مدینہ منورہ سے قریب شمالی جانب ہے۔ اس سے آگے "جبل ذوباب" اور مزید آگے بڑھ کر وادی قنات کے جنوبی کنارے پر "جبل عینین" یا "جبل رماۃ" ہے۔ اس وادی کے شمال میں "جبل عینین" کے سامنے "جبل احد" ہے، جو خاصا بلند اور طویل ٹیلہ ہے۔

وادیاں میدان میں چشموں کے علاوہ وادیاں ہیں، جن میں بارش کے وقت پانی بہتا ہے۔ ان کی مجمل سی کیفیت یہ ہے:

۱۔ وادی "رانونا" جبل عیر سے نکل کر شمال جانب بہتی ہے۔

۲۔ حرۂ واقم سے ایک وادی نکلتی ہے جس کا نام مہزور ہے۔ ایک اور وادی یعنی مذینیب کوئی سات میل سے آتی ہے۔ یہ دونوں عوالی ہی میں مل جاتی ہیں اور متحدہ وادی کا نام "بطحان" ہے۔

۳۔ قبا سے تھوڑی دور آگے بڑھ کر وادی رانونا، وادی بطحان میں مل جاتی ہے، پھر یہ وادی جس کا نام "بطحان" ہی رہتا ہے، شہر مدینہ کے جنوبی و مغربی حصے سے گزرتی ہوئی شمالی جانب نکل جاتی ہے۔

۴۔ مدینہ منورہ سے قریباً تین میل شمال میں ایک وادی مشرقی جانب سے آتی اور جبل احد کے سامنے سے گزرتی ہوئی

---

[1] یہ باب ملاحظہ فرماتے وقت متعلقہ نقشہ پیش نظر رہے تو مطالب بہتر طریق پر ذہن نشین ہو جائیں گے۔

مغربی جانب نکل جاتی ہے۔

۵۔ ایک وادی جبل عَیر کے جنوب سے آتی ہے اور اس کے مغربی گوشے، نیز "حرۂ وبرہ" کے مغرب سے گزرتی ہوئی شمالی جانب جاتی ہے۔ یہ وادی "عقیق" ہے۔

۶۔ "بطحان"، وادی "قنات" میں مل جاتی ہے۔ پھر یہ دونوں جبل احد کے مغرب میں وادی "عقیق" سے مل کر تھوڑے فاصلے پر زغابہ میں پہنچ جاتی ہیں، جو جبل احد کے شمال ومغرب میں ہے۔

آبادیاں اس وسیع میدان میں ایک بستی نہ تھی۔ بہت سی چھوٹی بڑی آبادیاں یا مواضع تھے، جن میں سے اکثر مدینہ منورہ کی توسیع میں ختم ہو گئے لیکن زیادہ تر جنوبی اور جنوبی و شرقی جانب ہی تھے مثلاً:

۱۔ قبا، مدینہ منورہ سے قریباً تین میل جنوب میں ہے، جہاں رسول اللہ صلعم ہجرت میں سب سے پہلے پہنچے اور چند روز قیام فرما رہے تھے۔ یہ اب بھی موجود ہے:

۲۔ عالیہ یا عوالی جنوب مائل بہ مشرق ہے۔ یہ بھی موجود ہے۔

۳۔ یہود کے قبیلہ بنی نضیر کی بستی جبل عَیر کے مشرق اور قبا و عوالی کے جنوب مشرق میں وادی مُذینیب کے جنوبی کنارے پر تھی۔ اس سے جانب جنوب کعب بن اشرف کا قلعہ تھا۔

۴۔ یہود بنو قریظہ کی بستی عوالی میں وادی مہزور کے جنوبی کنارے پر تھی۔

۵۔ بنی ظفر، بنی عبد الاشہل، بنی حارثہ اور بنی معاویہ کی بستیاں حرۂ واقم کے ساتھ ساتھ یکے بعد دیگرے جنوباً شمالاً واقع تھیں۔

۶۔ "یثرب" اس زمانے میں سب سے بڑی بستی تھی، جس کا نشان اب بھی جبل سلع کے شمال مغرب میں وادی قنات و وادی بطحان کے مقام اتصال سے قریب ملتا ہے اور وسیع میدان کی تمام آبادیاں بحیثیت مجموعی یثرب ہی کے نام سے مشہور تھیں[1]۔

۷۔ قبا اور مدینہ منورہ کے درمیان بھی کئی بستیاں تھیں مثلاً آنحضرت صلعم قبا سے مستقل مقام کی طرف روانہ ہوئے تو بنی سالم کے محلے میں نماز جمعہ ادا کی تھی وہاں مسجد الجمعہ اب تک موجود ہے گویا بنی سالم کا محلہ یا آبادی اسی جگہ تھی۔

۸۔ جو مقام رسول اللہ صلعم کے لیے تجویز ہوا تھا وہاں عبد المطلب کے ننھیال کی آبادی تھی۔ اسی آبادی میں

---

[1] بیشتر خوانندگان سیرت نے میرے علم کی حد تک اسی مقام کو یثرب سمجھ لیا، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرما ہوئے۔ اصل آبادی یثرب اس سے خاصے فاصلے پر شمال مغرب میں تھی اور اب بھی موجود ہے۔

حضرت ابو ایوبؓ انصاری کا مکان تھا، جہاں رسول اللہ صلعم، ابتدائی سات مہینے قیام فرما رہے۔ ان کے علاوہ آپ کے ہمسایے یعنی سعدؓ بن عبادہ، سعدؓ بن معاذ اور عمارؓ بن حزم کے مکانات تھے۔ پھر آنحضرتؐ نے وہیں زمین خرید کر مسجد تعمیر کرائی نیز ازواج کے لیے حجرے بنوائے۔ آگے چل کر اسی آبادی نے شہر کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہی مقام مدینۃ الرسول یا مدینۃ النبی کے نام سے مشہور ہوا اور عام زبانوں پر صرف "مدینہ" رہ گیا۔

باشندے

ہجرت سے پیشتر یثرب کی آبادی دو گروہوں پر مشتمل تھی۔ اول عرب جن کے دو بڑے قبیلے تھے۔ اوس اور خزرج۔ یہ عام عربوں کی طرح بت پرست تھے۔ دوسرا گروہ یہودیوں کا تھا جو تین قبیلوں میں منقسم تھے۔ بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع۔ یہ کہنے کو دین موسوی کے پیرو تھے مگر حقیقۃً ان کی اعتقادی عملی اور اخلاقی زندگی اس درجہ بگڑ چکی تھی کہ اسے اصل دین یہود سے کوئی مناسبت باقی نہیں رہی تھی۔ قرآن حکیم میں بنی اسرائیل کا جو نقشہ جا بجا کھینچا گیا ہے وہ دراصل یہود یثرب ہی کا نقشہ تھا، اگرچہ تمام بنی اسرائیل پر بھی یکساں منطبق ہوتا تھا، خواہ وہ کہیں بھی رہتے تھے، بلکہ میرے اندازے کے مطابق تو اب تک بھی اس میں کوئی تغیر نہیں آیا، اگرچہ بعض خصوصیتیں بدلی ہوئی معلوم ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ازنجیت کے سانچے میں ڈھل کر ذمائم نے نئی اور زیادہ بری شکل اختیار کر لی ہے۔

یثرب کی ابتدا اور فروغ

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یثرب، عمالقہ نے ۱۶۰۰ ق م (ہجرت سے تقریباً ایک ہزار چھ سو اڑتیس سال پیشتر) آباد کیا تھا، جب وہ چند سو سال کی حکومت کے بعد مصر سے نکالے گئے تھے، انھی نے اس مقام میں کھجوروں کے باغ لگائے، نیز کھیتی باڑی شروع کی۔ پھر یہودی غالباً اس وقت حجاز پہنچے، جب شاہ بابل نے فلسطین کو پامال کر ڈالا تھا۔ ہیکل تباہ کر دیا تھا اور وہ بہت سے یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا تھا۔ یہ آفات سے بھاگ کر پناہ گیروں کی حیثیت میں آئے تھے بعض گروہ خیبر، فدک، وادی القریٰ میں آباد ہو گئے تھے۔ بعض نے یثرب میں اقامت اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ انھوں نے عمالقہ پر غلبہ حاصل کر لیا اور انھیں یا تو باہر نکال دیا یا یہودی بنا لیا۔

سب سے آخر میں اوس و خزرج جنوبی عرب سے اس وقت نکلے، جب بند مارب "سیل عرم" کے باعث ٹوٹا اور بستیاں ویران ہو گئیں۔ انھیں عموماً قحطانی الاصل قرار دیا جاتا رہا لیکن سید سلیمان مرحوم نے "ارض القرآن" کی جلد دوم میں انھیں اسماعیلی عرب بتایا ہے۔ وہ صرف اس وجہ سے قحطانی کہلائے کہ قحطانیوں کے علاقوں میں مدت تک مقیم رہے تھے سید مرحوم کے نزدیک غسانی بھی ان کے نسلی بھائی تھے، جو شام چلے گئے اور انھوں نے مسیحیت اختیار کر لی تھی۔

دورِ اقتدار اوس و خزرج دو بھائی تھے، جن سے دو قبیلے چلے۔ آگے چل کر یہ دو گروہ متعدد شاخوں میں تقسیم ہو گئے لیکن ہجرت سے پیشتر تک یثرب میں یہود کا زور تھا۔ وہ علم میں بھی برتر تھے۔ مال و زر میں بھی عرب ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ صنعت و حرفت میں بھی بہت بڑھے ہوئے تھے۔ بطورِ خاص قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ یثرب سے شام تک تمام اہم مقامات میں ان کی خاص آبادیاں تھیں اور اس طرح پوری تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں، "نسل و اولاد کی کثرت سے وہ بیس اکیس قبیلے بن گئے، اس لیے دُور دُور تک بستیاں بسا لی تھیں[1]۔" اوس و خزرج نے ان سے اعانت و شرکت کے معاہدے کر لیے تھے۔ وہ لوگ یہود کی برتری سے اس درجہ متاثر تھے کہ اگر کسی عرب کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہوتی تو وہ منت مانگتا کہ بچہ ہوگا تو اسے یہودی بنا دوں گا۔

پھر یہودیوں میں فطیون نام ایک عیاش اور اوباش رئیس پیدا ہوا۔ ایک عرب اسے قتل کر کے شام پہنچا اور غسانیوں کو اپنی برادری کی امداد کے لیے لے آیا۔ غسانیوں نے بڑے بڑے یہودی قتل کر دیے۔ اس طرح ان کا زور توڑ ڈالا۔

خانہ جنگی یہودیوں کا زور ٹوٹا تو اوس و خزرج نے اقتدار حاصل کر لیا جو غالباً زیادہ عرصے تک باقی نہ رہا۔ سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے درمیان کسی بات پر رزم و پیکار کا سلسلہ شروع ہو گیا، جو خاصی لمبی مدت تک جاری رہا۔ آخری بڑی لڑائی جنگ بُعاث تھی جو ظہورِ اسلام کے بعد اور ہجرت سے کچھ ہی عرصہ پیشتر ہوئی تھی[2]۔ اس خانہ جنگی میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار اور عام آدمی بڑی تعداد میں مارے گئے اور ان کی قوت پاش پاش ہو گئی۔ اغلب ہے یہود مختلف خفیہ تدبیروں سے اس آگ کو ہوا دیتے رہے ہوں، جو بہ اعتبار نتائج ان کے مقاصد کے عین مطابق تھی۔ اس طرح ان کا اقتدار کسی سعی و کوشش اور تگ و دو کے بغیر ہی بحال ہوتا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے وہ روپے اور ساز و سامانِ جنگ سے مختلف گروہوں کی امداد کرتے رہے ہوں تاکہ لڑائی جاری رہے اور ان کے قرض کی زنجیریں مختلف عربوں کے پاؤں اور ہاتھوں سے زیادہ گراں بار بنتی جائیں۔

آخر دونوں قبیلوں نے تھک کر صلح کر لی اور فیصلہ یہ کیا کہ کسی کو اپنا حکمران بنا لیں تاکہ ان کی قوت متحد رہے اور آیندہ اس کے اتلاف و پراگندگی کی نوبت نہ آئے۔ خزرج میں سے قبیلہ عوف کے سردار عبد اللہ بن ابی بن سلول کی حکمرانی پر اتفاق ہو گیا۔ ابھی ابن ابی کو حاکم مان لینے کی رسم باقاعدہ ادا نہیں ہوئی تھی کہ آفتابِ اسلام کی کرنیں یثرب کی فضا میں جلوہ آرا ہوئیں، پھر رسول اللہ صلعم تشریف لے آئے اور ابن ابی کے متعلق پورا منصوبہ درہم برہم ہو گیا۔ یہی صورتِ حالات ابن ابیؔ کے نفاق کا پس منظر تھی۔

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۴۰-۲۴۱ [2] غالباً ۶۱۸ء میں یعنی ہجرت سے چار پانچ سال پیشتر۔ مقام بُعاث جس سے یہ جنگ منسوب ہے، خطۂ یثرب کے جنوبی و مشرقی حصے میں تھا۔ یعنی بنو نضیر اور بنو قریظہ کی آبادیوں کے نزدیک مشرق میں۔

مدینہ منورہ کا ماحول

اب صرف یہ عرض کرنا باقی رہ گیا کہ آنحضرت صلعم کی تشریف آوری پر جس آبادی نے مرکزی حیثیت حاصل کی، اس کی عام کیفیت کیا تھی۔ اس کے جنوب، جنوب مشرق اور شمال مشرق میں کھجور کے گھنے باغ تھے جن میں سے اکا دکا آدمی گزر سکتے تھے مگر کسی فوج کے لیے گزرنا ممکن نہ تھا۔ نیز ان حصوں میں ہر طرف چھوٹی چھوٹی بستیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ یثرب کے شمال مشرق میں بھی جبل احد تک ایسے ہی باغات تھے۔ شمالی جانب صرف تھوڑا سا حصہ ایسا تھا جہاں سے کوئی فوج مدینہ منورہ پر چڑھائی کر سکتی تھی۔ قیاس یہ ہے کہ جنگ احزاب کے موقع پر اسی حصے میں خندق کھودی گئی تھی جس کی حد "آثار المدینۃ المنورہ" میں شمال مشرق سے شمال مغرب تک بتائی گئی ہے۔ محمد حسین ہیکل مرحوم نے "فی منزل الوحی" میں اسی کی پیروی کی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے خندق کی ابتدا دیار بنی عبد الاشہل سے کی ہے گویا لابۂ شرقیہ (حرۂ واقم) کی جڑ سے۔ پہلے اسے حرۂ وبرہ تک لے گئے ہیں پھر لوٹا کر جبل سلع کے شمالی و مغربی کونے سے ملا دیا ہے بعد ازاں وادی بطحان کے ساتھ اسے اس مقام تک لے آئے، جہاں بطحان و رانونا کا اتصال ہوا ہے گویا پوری شمالی اور پوری مغربی سمت خندق کے اندر آ گئی۔ یہ نقشہ بھی قیاسات پر مبنی ہے اور بنائے قیاس یہ کہ جتنے حصے سے دشمن کے حملے کا امکان تھا، وہ پورا محفوظ کر لیا گیا ہوگا۔

غرض ڈاکٹر حمید اللہ کے نزدیک خندق تقریباً ساڑھے تین میل لمبی، دس گز چوڑی اور اتنی ہی گہری تھی۔ چوڑائی اور گہرائی کے لیے بھی کوئی ثبوت تو موجود نہیں لیکن ظاہر ہے کہ حملہ آور گروہوں میں سے اکا دکا سواروں کے سوا کوئی اندر نہ آ سکا گویا یہ اتنی چوڑی اور گہری تھی کہ عام سواروں یا آدمیوں کے لیے اسے پھاند کر اندر آنا مشکل تھا۔ بس اسی پر قیاس سے ایک تصور قائم کر لیا گیا۔

یثرب کی خاص اہمیت

یثرب یا مدینہ منورہ محض اسی اعتبار سے اہم نہ تھا کہ مظلوم مسلمانوں کے لیے ایک مناسب مامن کا انتظام ہو گیا تھا، نیز اسلام کی حقانی تعلیمات پر عمل کا ایک اجتماعی مرقع دنیا کے روبرو پیش کرنے کا موقع میسر آ گیا تھا۔ یہ مقام جغرافیائی اعتبار سے اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے بے حد اہم تھا، کیونکہ شاہراہ مدینہ منورہ سے صرف اسّی میل تھی، جہاں سے قریش کے تجارتی قافلے شام جاتے آتے تھے اور اس شاہراہ کو قریش کے لیے اقتصادی شہرگ کی حیثیت حاصل تھی۔ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر مسلمان قریش کے قافلوں پر زبردست چھاپے مار سکتے تھے بلکہ شام کی شاہراہ ان پر کلیتہً بند کر سکتے تھے۔ یہ ان کے لیے نہایت خوفناک اقتصادی ضرب ہوتی اور اس سے قریش کی جنگی صلاحیت و قوت پر بھی مہلک اثر پڑتا۔ پیغام حق کے خلاف عداوت کے علاوہ قریش کے اضطراب کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوگی کہ شاہراہ تجارت کے نزدیک مسلمانوں کا جمع ہو جانا اہل مکہ کو اپنی تجارتی سرگرمیوں کے لیے سخت تشویشناک نظر آ رہا ہوگا یا وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ اسلام کو مدینہ منورہ میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تو یہ مقام ان کی تجارت کے لیے انتہائی تشویشات کا باعث ہو جائے گا۔ (مولف)

باب ۱۷

بیعت عُقبۂ اولیٰ

سوید بن صامت

اہل یثرب کے لیے دعوت اسلام کا آغاز عقبہ اولیٰ کی بیعت سے پہلے ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں اولین نام سُوَید بن صامت کا آیا ہے جو آنحضرت صلعم کے جد امجد عبد المطلب کا خالہ زاد بھائی تھا[۱]
آغاز ذی قعدہ سے آخر محرم تک تین متواتر مہینوں میں حج کے لیے اور ماہ رجب میں عمرہ کے لیے پورے عرب کی فضا امن و سکون سے لبریز ہو جاتی تھی۔ ان مہینوں میں آنحضرت صلعم قبائلی علاقوں کا دورہ بھی فرماتے رہتے تھے اور جو لوگ باہر سے ادائے عمرہ و حج کے لیے آتے تھے انھیں بھی بہ فحوائے "بلّغ ما انزل علیك" پیغام حق پہنچانے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

سُوَید بن صامت شجاعت اور شعر گوئی میں وہ درجۂ امتیاز حاصل کر چکا تھا جس کے حامل کو اہل عرب "کامل" کہا کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم کو اس کی آمد کا علم ہوا تو اس کے ڈیرے پر پہنچ کر اسلام کی دعوت دی۔ سُوَید بولا:
"شاید آپ کے پاس بھی ویسی ہی چیز ہے، جیسی میرے پاس ہے۔"

آنحضرت صلعم: تمھارے پاس کیا چیز ہے؟

سُوَید: حکمت لقمان۔

آنحضرت صلعم: اس میں سے کچھ پڑھ کر سناؤ۔

سُوَید نے تھوڑا سا پڑھا تو آنحضرت صلعم نے فرمایا: بے شک اس میں اچھی باتیں ہیں، لیکن جو کلام میرے پاس ہے اس سے افضل و ارفع ہے۔ یہ مجھ پر اللہ نے نازل کیا ہے اور سراپا ہدایت و نور ہے۔ چنانچہ آپ نے سُوَید کو قرآن مجید کی چند آیات سنائیں۔ اس نے اعتراف کیا کہ یقیناً یہ بہت اچھا کلام ہے لیکن نہ وہ اسلام لایا، نہ اس سے انکار کیا۔ واپس گیا تو خانہ جنگی کے کسی ہنگامے میں مارا گیا۔ یہ جنگ بُعاث سے پیشتر کا واقعہ ہے[۲]۔ سوید کے ہم قوموں

---

[۱] سوید بن الصامت بن عطیہ بن حوط بن حبیب بن عمرو بن عوف بن مالک بن الاوس۔ اس کی والدہ کا نام لیلیٰ تھا جو عمرو کی بیٹی تھی۔ اس کی بہن سلمیٰ بنت عمرو النجاریہ، عبد المطلب بن ہاشم کی والدہ تھی (البدایہ والنہایہ جلد سوم ص ۱۴۷)

[۲] البدایہ والنہایہ جلد سوم ص ۱۴۷۔

یں سے بعض کہتے تھے کہ وہ مسلمان فوت ہوا۔

ایاس بن معاذ

پھر قبیلہ اوس نے خانہ جنگی میں خزرج سے شکست کھائی تو ایک وفد مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ حریف قبیلے کے مقابلے میں قریش سے حلیفانہ روابط پیدا ہو جائیں اور ضرورت کے وقت مدد لی جا سکے۔ اس وفد کا رئیس ابوالحیسر انس بن رافع تھا اور اس میں بنو عبدالاشہل کا ایک نوجوان ایاس بن معاذ بھی شامل تھا۔ یہ بھی جنگِ بُعاث سے پیشتر ہی کا واقعہ ہے۔ آنحضرت صلعم معمول کے مطابق اس وفد کے پاس بھی پہنچے اور دعوت دی کہ صرف اللہ کی عبادت کرو، شرک سے بچو، قرآن مجید کی چند آیات بھی سنائیں۔ ایاس کا دل آئینے کی طرح صاف تھا۔ آنحضرت صلعم کی دعوت سنتے ہی بے اختیار بول اٹھا: "بھائیو! خدا کی قسم ہمارے لیے یہ دعوت اس کام سے بہتر ہے جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔" ابوالحیسر نے مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر ایاس کے منہ پر ماریں اور کہا: "چپ رہ، ہم اور کام کے لیے یہاں آئے ہیں۔" ایاس خاموش ہو گیا لیکن کہا جاتا ہے کہ خود اس نے وہیں اسلام کا اعلان کر دیا۔ مراجعت پر وہ بھی کسی لڑائی میں مارا گیا۔ مرتے وقت بھی اس کی زبان پر تکبیر و تہلیل جاری تھی۔

دعوت اسلام سے استفادے کے یہ دونوں معاملے ابتدائی مرحلے سے آگے نہ بڑھے اور ان فتیلوں سے دوسرے چراغ روشن ہونے کی نوبت نہ آئی۔

چھ خوش نصیب خزرجی

سنہ ۱۱ نبوی کے موسم حج[1] میں بھی آنحضرت صلعم معمول کے مطابق دعوت کے لیے نکلے۔ عقبہ میں پہنچے، جو جبل حرا اور منیٰ کے درمیان ہے (مکہ مکرمہ سے قریباً تین میل اور منیٰ سے قریب) تو چند افراد نظر آئے۔ عادت شریف کے مطابق حد درجہ شفیقانہ انداز میں اتا پتا پوچھا۔ معلوم ہوا خزرجی ہیں، یعنی یثرب میں یہود کے ہمسایے۔ فرمایا: کیا آپ لوگ بیٹھ کر میری کچھ باتیں سن سکتے ہیں؟ وہ بیٹھ گئے تو آپ نے دعوت اسلام دیتے ہوئے قرآن مجید کی چند آیتیں سنائیں۔ وہ لوگ یہود کی زبان سے بارہا سن چکے تھے کہ ایک نبی عنقریب

---

[1] یہ قاضی سلیمان مرحوم صاحب "رحمۃ للعالمین" کا بیان ہے (جلد اول ص: ۹۴) اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سیرۃ النبیؐ میں اسے رجب سنہ ۱۲ نبوی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے (جلد اول: ۲۴۳) اسے درست مانا جائے تو اول تاریخ ہجرت سے تطابق ممکن نہیں۔ دوم یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عرب عمرہ کے لیے بھی آتے تھے تو منیٰ میں ٹھہرتے تھے؛ حالانکہ عمرہ کے لیے چھوٹے چھوٹے گروہ مہینا بھر آتے رہتے ہوں گے اور کوئی بڑا اجتماع نہ ہوتا ہوگا، جس کے لیے مکہ مکرمہ سے تین میل باہر قیام لازم ہوتا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ حج کے لیے منیٰ میں قیام کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ۹۔ ذی الحجہ کو عرفات جانا پڑتا تھا جو منیٰ سے نو میل آگے تھا۔ عمرہ میں نہیں جانا پڑتا تھا۔ بعض اور بیانات بھی ملتے ہیں لیکن میری دانست کی حد تک صحیح بیان قاضی محمد سلیمان مرحوم ہی کا ہے۔ قمری اور شمسی تاریخوں میں تطابق کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے علم کی حد تک خوب غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ اگر کہیں سہو ہو گیا ہو تو عفو خواہ ہوں

مبعوث ہونے والا ہے۔ یہود کہا کرتے تھے کہ ہم اس نبی کے ساتھ ہو کر بت پرستی کا قلع قمع کر دیں گے۔

خزرجیوں نے دعوت اور آیتیں سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہود کو بازی لے جانے کا موقع نہ دینا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ یہی چھ خوش نصیب خزرجی تھے، جن کے قبول اسلام نے یثرب کے لیے مرکز اسلام بننے کا راستہ ہموار کر دیا۔ رسول اللہ صلعم کی ہجرت کے وقت سے وہ مدینۃ الرسول مشہور ہوا اور خاتم ہستی میں نگین کی مانند چمک اٹھا۔ اقبال اس خواب گاہ مصطفیٰؐ کو خطاب کرتے ہوئے کیا خوب فرماتے ہیں:

تجھ میں راحت اس شہنشاہؐ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شہنشاہ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے، وارث مسند جم کے ہوئے

آہ یثرب اولیں ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو!
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو!
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں، باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

بعض اصحاب اسے بیعت عقبۂ اولیٰ قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک عقبہ میں تین بیعتیں ہوئیں۔ بعض کے نزدیک عقبہ میں صرف دو بیعتیں ہوئیں۔ ایک ۱۲ نبوی کے حج پر اور دوسری ۱۳ نبوی کے حج پر[1] ان کا ذکر آگے آئے گا۔

ان خوش نصیبوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ ابو امامہ اسعدؓ بن زرارہ (بنی نجار، خزرج)
۲۔ عوفؓ بن حارث (” ” ”)
۳۔ رافعؓ بن مالک (بنی زُرَیق ”)
۴۔ قطبہؓ بن عامر (بنی سلمہ ”)
۵۔ عقبہؓ بن عامر (بنی سلمہ ”)

---

[1] رسول اللہ صلعم کی ولادت ۹۔ ربیع الاول کو ہوئی تھی اور بعثت بھی ۹۔ ربیع الاول ۱ نبوی کو ملی اگرچہ نزول قرآن رمضان ۱ نبوی سے شروع ہوا لہٰذا تیرھواں سال نبوت ۹۔ ربیع الاول ۱۳ کو پورا ہوا تھا یعنی حج سے تین مہینے بعد۔ اس وقت رسول اکرم صلعم یثرب پہنچ چکے تھے۔

۶۔ جابر بن عبداللہ بن رئاب (بنی عبید خزرج) [1]

بیعت عقبۂ اولیٰ

ان چھ مخلصین کی بدولت رسول اللہ صلعم کا ذکر اوس و خزرج تک پہنچ گیا۔ ۱۲ نبوی کے موسم حج کے لیے اوس و خزرج میں سے بارہ اصحاب مکہ مکرمہ آئے اور اسی گھاٹی (عقبہ) میں رسول اللہ صلعم سے ملاقات کی۔ جہاں گزشتہ سال چھ خزرجی ملے تھے۔ ان بارہ میں سے پانچ وہی تھے جو گزشتہ سال آئے تھے۔ جابر بن عبداللہ بن رئاب کسی وجہ سے نہیں آسکے تھے۔ باقی سات اصحاب کے نام یہ ہیں:

۱۔ معاذؓ بن حارث	(بنی نجار، خزرج)
۲۔ ذکوانؓ بن عبدقیس	(بنو زُرَیق، 〃)
۳۔ عبادہؓ بن صامت	(بنی عوف 〃)
۴۔ ابوعبدالرحمٰنؓ یزید بن ثعلبہ	(بنی بلیّ حلیف خزرج)
۵۔ عباسؓ بن عبادہ بن نظلہ	(بنی سالم، خزرج)
۶۔ ابوالہیثم مالکؓ بن تیّہان	(بنی عبدالاشہل، اوس)
۷۔ عُوَیم بن ساعدہ	(بنی عمرو بن عوف 〃)

شرائط بیعت

ان اصحاب نے مندرجہ ذیل باتوں پر بیعت کی تھی:

۱۔ ہم خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں گے۔

۲۔ چوری اور زنا سے باز رہیں گے۔

۳۔ اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہیں کریں گے۔

۴۔ کسی پر جھوٹا بہتان نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی کھائیں گے۔

۵۔ تمام اچھی باتوں میں نبی صلعم کے فرمانبردار رہیں گے۔

روایات میں اسے "بیعت النساء" کہا گیا ہے کیونکہ آنحضرت صلعم عورتوں سے انھی امور پر بیعت لیتے تھے۔ اس وقت تک قتال کی اجازت نہیں ہوئی تھی۔

اہل یثرب نے یہ درخواست بھی کی کہ ہمارے ساتھ معلّم بھیج دیجیے، جو ہمیں دین کی تعلیم دیں۔ چنانچہ حضرت مصعبؓ

---

[1] بعض روایتوں میں چھ کی جگہ آٹھ کا ذکر ہے ساتویں البراء ابن معرور اور آٹھویں ابوالہیثم مالک بن تیّہان۔ مولانا شبلی مرحوم نے آخرالذکر و عامر بن عقبہ کے بجائے چھٹا شمار کیا ہے۔

بن عُمیر کو ساتھ بھیج دیا گیا۔ حضرت مصعبؓ، عبدالدار کے گھرانے کے دولت مند نوجوان تھے۔ اسلام سے پیشتر گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تو قیمتی پوشاک زیب بر ہوتی اور آگے پیچھے غلام چلتے۔ اسلام لائے تو تمام آرائشیں ترک کر دیں۔ ایک کمل کو کانٹوں سے اٹکا کر تن پوشی کر لیتے۔ اہل یثرب انھیں "المقری" یعنی پڑھانے والے یا استاد کہتے تھے اور اس وقت تبلیغ بھی زیادہ تر قرآن مجید سنانے ہی پر موقوف تھی غالباً بعد میں حضرت عبداللہؓ بن ام مکتوم کو بھی تعلیم اسلام ہی کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ (مولف)

باب ۲۵

بیعت عقبۂ ثانیہ

یثرب میں اسلام حضرت مصعبؓ بن عُمیر ابو امامہ اسعدؓ بن زرارہ کے ہاں فروکش ہوئے اور ان کی تبلیغ سے گھر گھر اسلام کا چرچا ہو گیا، یہاں تک کہ اوس کا قبیلہ بنی عبدالاشہل ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔ سعدؓ بن معاذ اور اُسید بن حُضیر اس قبیلے کے سردار تھے۔ سعد کو پسند نہ تھا کہ اسلام ان کے قبیلے میں پھیلے مگر اسعدؓ بن زرارہ سے قریبی رشتہ تھا یعنی دونوں خالہ زاد تھے، اس لیے براہ راست حضرت مصعبؓ کو روکنے میں تامل تھا کہ مبادا اسعدؓ سے تعلقات بگڑ جائیں، جو معلم اسلام کے مہماندار تھے۔ چنانچہ سعدؓ نے اُسید بن حُضیر سے کہا کہ آپ جا کر مصعبؓ کو روک دیں۔ اسعدؓ بن زرارہ نے اُسیدؓ کو دُور سے آتے دیکھا تو مصعبؓ سے کہا کہ قبیلے کا سردار آرہا ہے خدا کرے وہ آپ کی بات مان جائے۔ اتنے میں اُسیدؓ آپہنچے اور کھڑے کھڑے سخت سست کہنے لگے۔ یہ بھی کہا کہ تم سادہ لوح اور نادان لوگوں کو بہسلا رہے ہو۔ مصعبؓ نے بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا، آپ بیٹھ جائیں میری باتیں سُن لیں، پھر کوئی رائے قایم کریں۔ چنانچہ اُسید اس درخواست کو معقول سمجھ کر بیٹھ گئے۔ مصعبؓ نے بڑی نرمی سے اسلامی تعلیم پیش کی اور قرآن مجید بھی سنایا۔ اُسید سن کر بولے: یہ بتاؤ کہ تمھارے دین میں داخل کیونکر ہوتے ہیں؟ کہا: نہلا کر، پاک لباس پہنا کر کلمۂ شہادت پڑھاتے ہیں پھر دو رکعت نفل پڑھا دیتے ہیں۔ اُسیدؓ یہ شرطیں پوری کر کے اسلام لائے اور کہا کہ میرے بعد ایک اور شخص آئے گا، اگر وہ تمھارا پیرو بن گیا تو کوئی مخالف باقی نہ رہے گا۔

پھر اُسیدؓ نے سعدؓ کو اسعدؓ بن زرارہ کے مکان پر بھیج دیا۔ ان کے تعلق میں بھی وہی کیفیت پیش آئی، جو اُسیدؓ کو پیش آچکی تھی چنانچہ وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ واپس گئے تو اپنے قبیلے کو پکار کر کہا: "بنی عبدالاشہل! میرے بارے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟" سب بالاتفاق بولے: "آپ ہمارے سردار ہیں اور ہمیں آپ پر پورا اعتماد ہے۔" سعدؓ نے کہا: "سنو، قبیلے کا کوئی فرد، مرد ہو یا عورت، جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لے آئے میں اس سے بات کرنا حرام سمجھتا ہوں۔" چنانچہ پورا قبیلہ ایک ہی دن میں اسلام لے آیا۔

غرض حضرت مصعبؓ فریضۂ تبلیغ احسن طریق پر انجام دے کر مکہ مکرمہ لوٹ آئے اور تمام حالات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کر دیے۔

بیعت عقبۂ ثانیہ

۱۳ نبوی کے حج میں یثرب سے تہتر اصحاب مکہ مکرمہ آئے، ان میں دو عورتیں تھیں۔ یثرب کے مسلمانوں نے ان لوگوں سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ رسول اللہ صلعم کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت پیش کریں۔ منیٰ میں رات کے وقت ایک الگ تھلگ مقام پر ان سے ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر رسول اللہ صلعم کے عم محترم عباس بھی ساتھ تھے اگرچہ اس وقت تک حلقہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

عباس نے اہل یثرب سے کہا: محمد (صلعم) اپنے خاندان میں معزز و محترم ہیں۔ ہم دشمنوں کے مقابلے میں برابر ان کی حفاظت کرتے رہے۔ اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے تھے۔ اگر مرتے دم تک ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی جواب دے دو۔

خود اہل یثرب میں سے بھی ایک صاحب نے اپنے ہم قوموں سے کہا: رسول اللہ صلعم سے جو عہد و پیمان کر رہے ہو، یہ سرخ لڑائیوں اور سیاہ لڑائیوں کو دعوت دینا ہے[1]۔ اگر اس عہد کو جان و مال کا نقصان برداشت کرتے ہوئے پورا کر سکو تو دنیا اور آخرت کی سرخروئی حاصل کرو گے۔ اگر پورا نہ کر سکے تو دنیا اور آخرت کی رسوائی حصے میں آئے گی۔

اہل یثرب معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد آخری فیصلہ کر کے آئے تھے اور کوئی خطرہ انھیں ہراساں نہیں کر سکتا تھا۔

رسول اللہ صلعم نے دعوت کے جواب میں صرف دو باتیں فرمائیں:

۱۔ کیا آپ دین کی اشاعت میں میری پوری مدد کریں گے؟

۲۔ کیا آپ اپنے شہر میں میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت و حفاظت اپنے اہل و عیال کی مانند کرتے رہیں گے؟

انھوں نے پوچھا: ہمیں ان کاموں کا اجر کیا ملے گا؟

رسول اللہ صلعم نے فرمایا: بہشت (جو نجات اور خدا کی خوشنودی کا محل ہے)[2]

ایک صاحب نے پوچھا، یا رسول اللہ یہود سے ہمارے روابط ہیں، وہ ختم ہو جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ جب آپ کو قوت و اقتدار حاصل ہو جائے تو ہمیں چھوڑ کر اپنے وطن تشریف لے آئیں۔

فرمایا، نہیں، تمہارا خون میرا خون ہے۔ تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں[3]

---

[1] سرخ لڑائیوں سے مراد ہے خونریز لڑائیاں، سیاہ لڑائیوں کا مطلب ہے وہ لڑائیاں جن کا انجام افسوسناک اور ناخوشگوار ہو۔ [2] رحمۃ للعٰلمین حصہ اول ص: ۱۰۰

[3] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص: ۲۴۶

ایک روایت ہے کہ فرمایا: میرا جینا اور میرا مرنا تمھارے ساتھ ہوگا[۱]

یوں تیرہ سال تک نہایت صبر آزما ایذائیں اور مشقتیں جھیل لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اسلام کے لیے ایک مامن مہیا کر دیا، جہاں اس دین حق کا نظام اجتماعی شکل میں دنیا کے لیے بہترین برکتوں اور سعادتوں کا سرچشمہ بننے والا تھا۔ مکہ مکرمہ اور طائف دونوں کے اکثر اکابر اس پاک دین اور مقدس تعلیم کو ٹھکرا چکے تھے اوس و خزرج نے اسے اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنا لیا۔ دین حق کی نصرت کے باعث وہ انصار کہلائے اور دائمی سعادتوں کا نورانی حصار ان کے اردگرد کھنچ گیا۔

نقیبوں کا تقرر

رسول اللہ صلعم نے اہل یثرب میں سے بارہ اصحاب کو نقیب مقرر فرمایا تاکہ وہ اپنے لوگوں میں دین کی اشاعت کریں۔ سیرۃ النبیؐ کا بیان ہے کہ یہ نام خود اہل یثرب نے پیش کیے تھے[۲] ان میں سے نو خزرجی تھے اور تین اوس میں سے تھے،

۱۔ اسعدؓ بن زرارہ (ابو امامہ) — بنی نجار، خزرج، یثرب میں نماز جمعہ کی ابتدا آپ ہی سے ہوئی، جنگ بدر سے پیشتر انتقال ہوا۔

۲۔ عبداللہؓ بن رواحہ — بنی حارث، خزرج، جنگ موتہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کے بعد اسلامی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے شہادت پائی۔

۳۔ اُسیدؓ بن الحضیر — بنی عبدالاشہل، اوس۔ عہد فاروقی میں وفات پائی۔

۴۔ ابوالہیثم مالکؓ بن تیہان — بنی عبدالاشہل، اوس، جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے طرفدار کی حیثیت سے شہادت پائی۔

۵۔ سعدؓ بن عبادہ — بنی ساعدہ، خزرج، سقیفہ بنی ساعدہ میں انھی کو انصار نے خلافت کے لیے پیش کیا تھا۔ پھر یہ شام چلے گئے اور عہد فاروقی میں وہیں انتقال ہوا۔

۶۔ براءؓ بن معرور — بنی سلمہ، خزرج، سن رسیدہ بزرگ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یثرب پہنچنے سے پیشتر ہی وفات پاگئے۔

---

[۱] رحمۃ للعالمین حصہ اول ص: ۱۰۰ [۲] سیرۃ النبی جلد اول ص: ۲۴۶

۷۔ سعدؓ بن ربیع — بنی سلمہ، خزرج، جنگ احد میں شہادت پائی۔ رسول اللہ صلعم نے ان کی تلاش میں آدمی بھیجے، زخمیوں میں پڑے دم توڑ رہے تھے۔ فرمایا: مجھے اب مردہ ہی سمجھو۔ رسول اللہ کی خدمت میں میرا سلام پہنچا کر عرض کرنا، اللہ آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے قوم سے کہنا، جب تک ایک بھی جھپکنے والی آنکھ تم میں باقی رہے، اگر دشمن رسول اللہ صلعم تک پہنچ گیا تو خدا کے حضور کوئی بھی عذر پیش نہ کر سکو گے۔

۸۔ عبادہؓ بن صامت — بنی عوف، خزرج، عالم صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان سے حدیثیں بھی مروی ہیں، عہد عثمانی میں وفات پائی۔

۹۔ رافعؓ بن مالک — بنی زُریق، خزرج، جنگِ احد میں شہادت پائی۔

۱۰۔ عبداللہؓ بن عمرو — بنی سلمہ، خزرج، جنگ احد میں شہادت پائی رسول اللہ صلعم نے ان کے صاحبزادے سے فرمایا: تمہارے باپ سے خدا نے کہا: اے میرے بندے جو مانگنا ہو مانگ لے۔ عرض کیا: میرے خالق ایک ہی آرزو ہے زندہ کیا جاؤں، پھر اسلام کی راہ میں جان دوں۔

۱۱۔ سعدؓ بن خیثمہ — بنی حارثہ، اوس۔ جنگ بدر کے لیے نکلنے لگے تو ان کے والد نے کہا کہ میرا بھی حصہ ہے۔ مگر ایک کو گھر پر رہنا چاہیے۔ قرعہ ڈالا گیا تو سعدؓ کے نام پر نکلا لہٰذا وہی گئے اور اسی جنگ میں شہادت پائی۔

۱۲۔ منذرؓ بن عمرو — بنی ساعدہ، خزرج، بئر معونہ میں شہادت پائی۔

ہجرت کی اجازت

اس کے بعد صحابہؓ کے لیے یثرب کی طرف ہجرت کی اجازت ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے بارگاہ باری تعالیٰ سے اذن کا انتظار کرنے لگے۔ یہ دین حق کی اشاعت کا ایک نہایت اہم موڑ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی دوسرے صحابہ کی طرح ہجرت کی اجازت مانگی تو رسول اللہ صلعم نے روک لیا۔ اس سے حضرت ابوبکرؓ کو خیال ہوگیا کہ شاید ہجرت میں رسول اللہ صلعم کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہو۔

باب ۲۶

سفرِ ہجرت کا آغاز

ہجرت کی اجازت

عقبہ کی دوسری (اور ایک حساب کے مطابق تیسری) بیعت کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کو یثرب کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی چنانچہ وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں نکلنے لگے۔ بعض کے لیے بڑی تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آئیں جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ مسلمانوں کی صرف تھوڑی سی تعداد مکہ مکرمہ میں رہ گئی، جن میں سے ممتاز ترین ہستیاں رسول اکرم صلعم کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؑ کی تھیں۔ باقی وہ بزرگ تھے جو مسکین و بے استطاعت ہونے کے باعث نئے مقام پر جا ہی نہیں سکتے تھے۔ انھیں نکالنے کی صورت خاصے عرصے کے بعد پیدا ہوئی۔

قریش کا منصوبہ

اب قریش کو خیال آیا کہ اگر رسول اللہ صلعم یثرب چلے گئے تو مسلمان منظم ہو کر زیادہ موثر طریق پر تبلیغ کریں گے اور رفتہ رفتہ مختلف قبیلوں کو ساتھ ملا کر قریش کے لیے زبردست خطرہ بن جائیں گے۔

چنانچہ اکابر نے دارالندوہ میں (جو ان کا دارالشوریٰ تھا) جمع ہو کر اس صورت حال پر غور کیا۔ اس مجمع میں تین تجویزیں پیش ہوئیں:

۱۔ رسول اکرم صلعم کو زنجیریں پہنا کر ایک مقام پر بند کر دیا جائے۔

۲۔ حضور صلعم کو کسی ایسی جگہ جلا وطن کر دیا جائے جہاں سے وہ ان فدائیوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہ پیدا کر سکیں، جو یثرب منتقل ہو چکے تھے۔

۳۔ حضور صلعم کو قتل کر دیا جائے۔

پہلی تجویز اس بنا پر رد کر دی گئی کہ حضور صلعم کو قید کر لینا، ممکن تھا لیکن قید رکھنا ممکن نہ تھا، کیونکہ حضور صلعم کے فداکار انھیں بہر حال رہا کرا لیتے۔ دوسری تجویز میں بظاہر یہ خامی محسوس ہوئی کہ ایسا کوئی مقام تھا ہی نہیں، جہاں سے یثرب کے ساتھ رابطہ پیدا کر لینا ممکن نہ رہتا۔ تیسری تجویز پر اتفاق ہو گیا لیکن سوال یہ تھا، خاندان رسول اکرم صلعم (بنو عبد مناف) کے جوش انتقام سے بچاؤ کی صورت کیا ہو؟ ابوجہل کی تجویز یہ تھی کہ قریش کے ممتاز قبیلوں سے ایک ایک جوان چنا جائے۔ وہ رات کو حضور صلعم کے مکان کا محاصرہ کر لیں۔ صبح کے وقت آپ نماز کے لیے باہر نکلیں تو تمام محاصرین ایک دم حملہ کر کے آپ کا کام تمام کر ڈالیں۔ اس طرح بنو عبد مناف کے سوا تمام قریش اس خون میں شریک ہو جائیں گے اور سب کا مقابلہ

بنو عبد مناف نہ کر سکیں گے۔ اس تجویز پر سب نے صاد کر دیا۔

قرآن مجید کا بیان قرآن مجید سے بھی اس منصوبے کی تصدیق ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک و یمکرون و یمکر اللہ و اللہ خیر الماکرین۔ (انفال: ۳۰)

اور اے پیغمبر اس وقت کو یاد کر جب مکہ مکرمہ میں کافر تیرے خلاف چھپی تدبیروں میں مصروف تھے تاکہ تجھے گرفتار کر رکھیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیریں کرنے والا ہے۔

منکروں اور معاندوں کی تمام تدبیریں بُری طرح ناکام رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کر رکھا تھا وہ ہر منصوبے کا تار و پود بکھیرتا ہوا روز روشن کی طرح حقیقت ثابتہ بن کر نمودار ہو گیا۔

محاصرین جو لوگ مسکن مبارک کے محاصرے کے لیے چنے گئے تھے ان کے نام طبقات ابن سعد کے مطابق یہ ہیں:

۱۔ ابوجہل (عمرو بن ہشام)
۲۔ عُقبہ بن ابی مُعیط
۳۔ نضر بن الحارث
۴۔ امیہ بن خلف
۵۔ ابی بن خلف
۶۔ زمعہ بن الاسود
۷۔ نبیہ بن الحجاج
۸۔ منبہ بن الحجاج
۹۔ طُعیمہ بن عدی
۱۰۔ حکم بن ابی العاص
۱۱۔ ابولہب
۱۲۔ ابن الغیطلہ

ان میں سے پہلے آٹھ ان معاندوں میں سے تھے جو غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔

فیصلہ روانگی اِدھر بارہ آدمی رسول اللہ صلعم کے گھر کا محاصرہ کرنے کے لیے مقرر ہوئے اُدھر آپ کو ہجرت کی اجازت مل گئی اور حضور صلعم نے وطن مالوف سے روانگی کا فیصلہ فرما لیا۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت ہے کہ ہم ٹھیک دوپہر کے وقت گھر میں بیٹھے تھے کہ کسی نے کہا: رسول اللہ صلعم تشریف لائے ہیں۔ آپ کا سر ڈھکا ہوا تھا۔[1] عادت شریف کے مطابق وہ وقت ہمارے ہاں آنے کا نہ تھا۔ والد (حضرت ابوبکرؓ) نے کہا: میرے ماں باپ ان پر قربان ہوں، اللہ کی قسم یہ تشریف آوری یونہی نہیں۔ کوئی اہم معاملہ ہے۔

آپ اجازت لے کر اندر آئے اور فرمایا: جو بھی آپ کے پاس ہو، اسے باہر کر دیں۔ ابوبکرؓ نے عرض کیا، صرف آپ کے گھر والے ہیں[2] یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا: مجھے ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔ ابوبکرؓ نے عرض کیا، میرا باپ آپ پر قربان ہو یا رسول اللہ، رفاقت و معیت کا آرزو مند ہوں۔ فرمایا: "ہاں"۔ یعنی رفاقت ہو گی۔ ایک اور روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: میں نے خوشی میں کسی کو روتے نہیں دیکھا تھا۔ رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے "ہاں" نکلا تو حضرت ابوبکرؓ کی آنکھوں سے جاری ہو گئے۔

یہ خوشی کے آنسو تھے اور دنیا میں اس سے بڑھ کر خوشی کا مقام کون سا ہو سکتا تھا کہ ایسے اہم سفر میں رہبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کی سعادت نصیب ہوئی!

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: میں نے دو سانڈنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر اسی غرض سے پالی ہیں، ان میں سے ایک آپ لے لیں۔ فرمایا: قیمت سے لوں گا۔

یہ فیصلہ فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے۔

امانتوں کا معاملہ اور حضرت علیؓ

اگرچہ قریش آپ کی جان کے دشمن تھے مگر مکہ مکرمہ کے اکثر لوگ اپنی امانتیں آپ ہی کے پاس رکھتے تھے۔ آپ نے تمام امانتوں کا معاملہ حضرت علیؓ کو سمجھا دیا اور فرمایا کہ یہ ان کے مالکوں کو لوٹا کر یثرب چلے آؤ۔ نیز فرمایا: بے تکلف میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔ بفضل اللہ کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

ان تمام انتظامات سے فارغ ہوئے تو محاصرین نے آکر کاشانۂ مبارک کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اول شب ہی میں گھر سے نکل گئے تھے۔ جو لوگ دروازے پر بیٹھے تھے، انھیں خبر تک نہ ہو سکی۔

ادھر حضرت ابوبکرؓ کے ہاں حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ نے جلد جلد سفر کا سامان درست کر دیا یعنی کھانا تیار کر کے چمڑے کے ایک تھیلے میں رکھا۔ جب تھیلے کا منہ باندھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملی تو حضرت اسماءؓ نے اپنے کمربند سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر منہ باندھ دیا۔ اس وقت سے "ذات النطاقین" مشہور ہوئیں یعنی دو کمربندوں والی۔ ایک روایت ہے کہ کمربند کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے کھانے کے تھیلے کا اور دوسرے سے پانی کے مشکیزے کا منہ باندھا تھا۔

---

[1] گرمی کا موسم تھا۔ اگست کے آخری دن تھے اور دوپہر کا وقت تھا۔ اغلب ہے دھوپ سے بچنے کے لیے کپڑا اوڑھ لیا ہو۔ [2] یعنی آپ کی اہلیہ (حضرت عائشہؓ) یا ان کی بہن اور والدہ (حضرت اسماءؓ اور ام رومانؓ)۔

غارِ ثور کاشانۂ مبارک سے نکل کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ، جن کا مکان مکہ مکرمہ کے جنوبی حصے میں تھا، شہر سے جنوبی سمت میں چل پڑے۔ چھ میل کے فاصلے پر ثور نام پہاڑ تھا، جس کے اندر ایک بڑا غار تھا راستہ سخت پتھریلا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلعم کو تکلیف سے بچانے کے لیے تھوڑی دُور تک کندھوں پر بٹھا لیا۔ چلتے وقت وہ کبھی رسول اللہ صلعم کے آگے، کبھی پیچھے، کبھی دائیں، کبھی بائیں ہو جاتے۔ گویا چاہتے تھے کہ ہر سمت سے حضورؐ کی حفاظت میں اپنی جان قربان کر دیں۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر حضرت ابوبکرؓ پہلے خود داخل ہُوئے اور غار کو خوب صاف کیا۔ اپنے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر تمام سوراخ بند کیے پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لے گئے۔ اس غار میں رسول اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ نے تین دن اور تین راتیں گزاریں۔

ضروری انتظامات محافظ حقیقی صرف خدا تھا، جس نے ہر قدم پر دشمنوں کے منصوبے ناکام بنائے اور اپنے رسول پاکؐ کو ہر خطرے سے محفوظ رکھا لیکن مجھے یقین ہے کہ جب سے ہجرت کا فیصلہ ہو چکا تھا اسی وقت سے نکلنے کی تمام تدبیریں بھی سوچ لی گئی ہوں گی مثلاً

۱۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلے سے دو سانڈنیاں سفر ہجرت کے لیے تیار کر لی تھیں۔

۲۔ مکہ مکرمہ سے جنوب کی جانب سفر اس لیے اختیار کیا کہ یثرب شمال میں تھا اور اس کی طرف جانے والے تمام راستے شمال ہی کی طرف جاتے تھے لہٰذا تعاقب کرنے والے لوگ انھیں راستوں کے آس پاس سرگرم تلاش ہوتے۔ جنوب کی طرف تلاش کا انھیں خیال بھی نہ ہوتا۔

۳۔ اغلب ہے، غار ثور میں پناہ لینے کا فیصلہ بھی پہلے سے کر لیا ہو۔ یہ فیصلہ موقع پر اچانک نہ ہوا ہوگا۔

۴۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ کو اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ دن بھر قریش کی باتیں سن کر جو کچھ ضروری سمجھے، رات کے وقت غار میں سنا جایا کرے۔

۵۔ اسی طرح حضرت اسماءؓ رات کی تاریکی میں کھانا پہنچا جایا کرتی تھیں۔

۶۔ عامر بن فُہیرہ حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپ کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ انھیں تاکید کر دی گئی تھی کہ دودھ والی بکریاں روک رکھیں اور رات کے وقت انھیں غار کے دہانے پر لے آیا کریں۔ اس طرح تازہ دودھ مل جاتا تھا۔

۷۔ صبح کے وقت عامر بن فُہیرہ ریوڑ دہانۂ غار کے پاس سے دور تک مکہ مکرمہ کی طرف لے جاتے تھے تاکہ کسی آنے جانے والے کے پاؤں کا نشان باقی نہ رہے۔

۸۔ ایک شخص عبداللہ بن اُرَیقط کو رہبری کے لیے پہلے سے مقرر کر لیا تھا اگرچہ عبداللہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا، مگر اس پر پورا اعتماد تھا۔

یہ تمام انتظامات اس خوبی اور خوش اسلوبی سے کیے گئے تھے کہ ہر کام ٹھیک وقت پر اور انتہائی رازداری سے پورا ہوتا رہا۔

غارِ ثور ہی میں لا تحزن ان اللہ معنا کا معاملہ پیش آیا جس کا ذکر مولاناؒ نے بھی اختصار سے فرمایا ہے۔ وہ آگے آئے گا۔

صدیقؓ اور ان کے متوسلین کی شانِ ایثار

یہ انتظامات حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دُور اندیشی، معاملہ فہمی، رازداری اور جاں نثاری کی ایسی شہادت پیش کر رہے ہیں، جس سے روشن تر شہادت کوئی نہیں ہو سکتی۔

حضرت صدیقؓ اپنی دولت کا بڑا حصہ ابتداء دعوت حق ہی سے راہِ اسلام میں بے دریغ صرف کر چکے تھے مثلاً ان مسکین غلام مسلمانوں کو خرید کر آزاد کر دیا جو اسلام کی وجہ سے ظالم آقاؤں کے جور و ستم کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ بے یار و مددگار مسلمانوں کی اعانت فرماتے رہے۔ تیرہ سال میں خرچ کرتے کرتے جو کچھ باقی بچا تھا وہ پُورے کا پُورا ساتھ لے لیا اور اس کا اندازہ پانچ چھ ہزار درام کیا جاتا ہے[1]۔

حضرت صدیقؓ کے والد ابو قحافہ کو بیٹے کی ہجرت کا علم ہوا تو اپنی پوتی حضرت اسماءؓ سے کہا: معلوم ہوتا ہے ابوبکرؓ تمھیں دوہری تکلیف میں ڈال گیا ہے۔ خود بھی چلا گیا اور نقد و مال بھی ساتھ لے گیا۔ حضرت اسماءؓ نے پتھر کے ٹکڑے لے کر اس جگہ رکھ دیے تھے جہاں گھر کا روپیہ رکھا جاتا تھا اور انھیں خوب کپڑے سے ڈھانک دیا تھا۔ ابو قحافہ کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ حضرت اسماءؓ نے کہا: "دادا جان، وہ ہمارے لیے کافی روپیہ چھوڑ گئے ہیں" اور بوڑھے دادا کا ہاتھ پکڑ کر ڈھکے ہوئے پتھروں پر رکھ دیا۔ اس طرح انھیں اطمینان دلایا۔

ابو قحافہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ وہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے۔ یوں حضرت صدیقؓ کو صحابہ کرام میں یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہوئی کہ ان کے خاندان کی چار پشتوں نے شرفِ صحابیت حاصل کیا[2]۔

دُوسرے روز صبح کو ابو جہل پہنچا اور حضرت اسماءؓ سے پُوچھا: تمھارا باپ کہاں ہے؟ جواب ملا: معلوم نہیں۔ سنگدل ابو جہل نے جوشِ غیظ میں حضرت اسماءؓ کے تھپڑ مارا جس سے کان کی بالی گر گئی[3]۔

یہ تمام تکلیفیں اور اذیتیں، اس ذاتِ پاک کی حفاظت کے لیے خوشی خوشی جھیل لی گئیں، جو دونوں جہانوں کے لیے ہدایت و فلاح کا روشن ترین مینار تھی۔

تاریخ کا معاملہ

اب صرف ایک معاملہ باقی رہ گیا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس تاریخ کو مکہ مکرمہ سے نکل کر غارِ ثور میں پہنچے۔ قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ

[1] رحمۃ للعالمین حصہ اول ص ۱۰۸۔ ۱۰۹ [2] رحمۃ للعالمین ص ۱۰۹ حاشیہ [3] رحمۃ للعالمین (ص ۱۰۸۔ ۱۰۹)

علیہ وسلم ۲۷ صفر ۱۳ نبوی کو کاشانۂ مبارک سے بہ قصد ہجرت روانہ ہوئے۔ جمعرات کا دن گزر چکا تھا اور جمعہ کی رات شروع ہو گئی تھی، عیسوی تاریخ ۱۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی۔ تطابق میں ایک یوم کے تقدم و تاخر کا امکان بھی ہے۔ طبقات ابن سعد کے مطابق مکہ مکرمہ سے روانگی کی تاریخ یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی تھی یعنی ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء۔ پہلے حساب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین دن رات غار ثور میں گزار کر یکم ربیع الاول کو عزم فرماے یثرب ہوئے یعنی ۱۳ ستمبر ۶۲۲ کو۔ دوسرے حساب کے مطابق روانگی ۴ ربیع الاول کو عمل میں آئی یعنی ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء کو۔ یوم روانگی پہلے حساب کے مطابق یقیناً دوشنبہ تھا۔ طبقات ابن سعد میں بھی غار ثور سے روانگی کا دن دوشنبہ ہی مذکور ہے گویا مکہ مکرمہ یا غار ثور سے روانگی کے دنوں میں کوئی اختلاف نہیں، صرف تاریخوں میں اختلاف ہے۔ (مولف)

باب ۲۷

مولاناؒ کی تصریحات

ان تمہیدات کے بعد اب آپ مولاناؒ کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں جنھیں ایک مستقل باب کی شکل دے دی گئی ہے اگرچہ وہ بہت مختصر ہیں۔

جب مکہ میں پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کا ظہور ہوا تو قدرتی طور پر دو گروہ پیدا ہو گئے: ایک ان لوگوں کا تھا، جنھوں نے یہ دعوت قبول کی۔ دوسرا پوری قوم اور ان کے سرداروں کا، جو اس کے مخالف تھے۔ غور کرو ان دونوں میں بنائے نزاع کیا تھی؟ پیروان دعوت کہتے تھے کہ انھیں حق ہے، جس بات کو درست سمجھیں، اختیار کریں۔ مخالف کہتے تھے انھیں یہ حق حاصل نہیں یعنی وہ انسان کے ضمیر و اعتقاد کی آزادی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بزورِ شمشیر مسلمانوں کو ان کے اعتقاد سے پھرا دیں۔

پیغمبر اسلامؐ نے تیرہ برس تک ہر طرح کے مظالم برداشت کیے۔ آخر جب مکہ میں زندہ رہنا دشوار ہو گیا تو مدینے چلے گئے لیکن قریش نے وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ پے در پے حملے شروع کر دیے۔

سورہ انفال کی آیت ۳۰ میں ہجرت کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "اے پیغمبر وہ وقت یاد کر، جب مکہ میں کافر تیرے خلاف چھپی تدبیروں میں لگے تھے تاکہ تجھے گرفتار رکھیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں اور وہ مخفی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیریں کرنے والا ہے۔"

(مراد یہ ہے کہ کافروں نے یقیناً تدبیروں میں کوتاہی نہ کی مگر اللہ ہی کی تدبیر کامیاب ہوئی۔ کافر ناکام و نامراد رہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی حفاظت میں یثرب پہنچ گئے)

"لا تحزن" سورۂ توبہ کی آیت ۴۰[1] میں واقعۂ ہجرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب مکہ میں اعدائے حق نے فیصلہ کر لیا کہ تمام قبائل کے لوگ مل کر بہ یک وقت پیغمبر اسلامؐ پر حملہ کر دیں تو آپ کو ہجرت کا حکم ہوا۔ آپ

---

[1] سورہ توبہ آیت ۴۰ یہ ہے:

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ

اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (نہ کرو) اللہ نے اس کی مدد کی ہے اور اس وقت کی ہے، جب کافروں نے

(باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ غار ثور میں پوشیدہ ہو گئے...... یہاں آپ نے تین راتیں بسر کیں۔ پھر مدینہ روانہ ہو گئے۔ دشمن جو آپ کی تلاش میں تھے، وہ یہاں بھی پہنچے لیکن اللہ نے آپ کی حفاظت کا ایسا سامان کر دیا تھا کہ بغیر دیکھے بھالے واپس چلے گئے۔

صدیقؓ کا حزن و اضطراب یہ تین راتیں حضرت ابوبکرؓ نے کہ شمع نبوت کے پروانے تھے جس عالم میں بسر کی ہوں گی ان کا اندازہ وہی کر سکتا ہے، جس نے عشق و محبت کا کچھ بھی ذائقہ چکھا ہو۔ اللہ کا رسول غار میں پوشیدہ تھا۔ دشمن سراغ میں تھے۔ ہر لمحہ اندیشہ تھا کہ کہیں سراغ نہ پا لیں اور ایک مرتبہ ان کی صدائیں بھی کانوں میں آنے لگی تھیں۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ان کے دل کے حزن و اضطراب کا کیا عالم ہوگا۔ بلاشبہ انھیں یقین تھا کہ اللہ اپنے رسول کا مددگار ہے لیکن عشق و محبت کا قدرتی تقاضا ہے کہ محبوب کو خطرے میں دیکھ کر اضطراب ہو۔ اس سے وہ اپنے دل کو روک نہیں سکتے تھے۔ اگر روک سکتے تو محبت کی عدالت کا فیصلہ ان کے خلاف ہوتا۔

لیکن پیغمبر اسلامؐ کے سکون قلب کا عالم دوسرا تھا۔ ان کا رفیق غار (صدیقؓ) جب جوش محبت میں مضطرب ہوتا تو تسلی دیتے اور فرماتے: "غمگین نہ ہو، اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ خود حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ جب دشمن غار کے قریب آئے تو میں نے مضطرب ہو کر کہا: ان میں سے کسی نے پاؤں اونچا کیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا: "ابوبکرؓ تم ان دو آدمیوں کے متعلق کیا خیال کرتے ہو جن کے لیے تیسرا خود اللہ ہے!" (شیخین عن انس)

یہاں فرمایا: اللہ نے اپنی جانب سے اس پر سکون و قرار اتارا یعنی ابوبکرؓ پر، کیونکہ پیغمبر اسلام کا قلب مبارک تو پہلے ہی ساکن و برقرار تھا۔

تعلیم قرآن کے معجزے سورۂ انفال کی آیت ۲۹ سے[ط] معلوم ہوا کہ جو جماعت متقی ہوگی، اس میں حق و باطل اور خیر و شر کے امتیاز کی ایک خاص قوت پیدا ہو جائے گی چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اس

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۵)

يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔

اسے اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ صرف دو آدمی تھے اور دو میں دوسرا اللہ کا رسول تھا، دونوں غار (میں) چھپے بیٹھے تھے اس وقت اللہ کے رسول نے اپنے ساتھی سے کہا تھا، غمگین نہ ہو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا اور ایسی فوجوں سے مددگاری کی جنھیں تم نہیں دیکھتے اور بالآخر کافروں کی بات پست کی اور اللہ ہی کی بات ہے جس کے لیے بلندی ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

[ط] يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا

اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرتے ہو (اور اس کی نافرمانی سے بچو)

(باقی ص ۱۸۷ پر)

اعتبار سے صدر اول کے مسلمانوں کا کیا حال تھا۔ عرب کے صحرا نشین جن کی ساری زندگیاں اونٹ چرانے میں بسر ہوتی تھیں یکایک ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں کی قسمتوں کے مالک ہوگئے، لیکن خیر و شر میں امتیاز کی ایک ایسی قوت ان کے قبضے میں آگئی تھی کہ جو کچھ کرتے تھے اور جس طرح کرتے تھے، وہ حق و عدالت اور خیر و سعادت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا؛

وہ زمانہ کیا ہوا جب مری آہ میں اثر تھا
یہی چشم خوں فشاں تھی، یہی دل، یہی جگر تھا

سورۂ انفال کی آیت ۳۰[1] پر غور کرو۔ انسان اپنے جہل و غفلت کی سرشاریوں میں کیا سوچتا ہے اور حکمت الٰہی کی مخفی تدبیروں کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ جب ہجرت سے پہلے قریش مکہ نے یہ منصوبے باندھے تھے تو کیا ایک لمحے کے لیے بھی انھیں آنے والے نتائج کا گمان ہوسکتا تھا؟ مگر کس طرح خود انہی کے ظلم و عداوت نے ان نتائج کا سارا سر و سامان کر دیا۔

اگر ظلم نہ ہوتا تو ہجرت بھی نہ ہوتی۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو وہ تمام نتائج بھی ظہور میں نہ آتے ایسی ہی صورت حال قانون الٰہی کی مخفی تدبیر ہے جو انسانی ظلم و فساد کی ساری تدبیریں ملیامیٹ کر دیتی ہے۔

پھر آیت ۳۳[2] میں فرمایا، اب کہ پیغمبر اسلام کو انھوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا اور ان کی سرکشی یہاں تک

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۶)

فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

تو وہ تمھارے لیے (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والی قوت پیدا کر دے گا اور تم سے تمام برائیاں دور کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا۔ اللہ تو بہت بڑا فضل کرنے والا ہے۔

[1] یہ آیت پہلے نقل ہوچکی ہے یعنی قریش کا منصوبہ کہ رسول اللہ صلعم کو قید یا قتل یا جلاوطن کر دیں لیکن اللہ کی مخفی تدبیر نے یہ منصوبہ خاک میں ملا دیا۔

[2] وما كان الله ليعذبهم وانت فيهم وما كان الله معذبهم وهم يستغفرون۔

اور اللہ ایسا کرنے والا نہ تھا کہ تو ان کے درمیان موجود ہو اور پھر انھیں عذاب میں ڈالے اور اللہ ایسا بھی کرنے والا نہیں کہ انھیں عذاب میں ڈالے حالانکہ وہ معافی مانگ رہے ہوں۔

مطلب یہ کہ دونوں مانع غائب ہوگئے۔ رسول اللہ صلعم مکہ مکرمہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے کیونکہ ظلم و ستم روز افزوں تھا اور خدا سے عفو طلب کرنا تو رہا ایک طرف وہ خدا ہی کو بھلا بیٹھے تھے پھر وہ عذاب کیوں نہ آتا جو آیا اور ان کے کبر و غرور کو اس طرح بکھیر گیا جس طرح تیز و تند ہوا ریت کے ذروں کو بکھیرتی ہے۔

پہنچ گئی کہ وہ خدا کے بندوں کو اس کی عبادت گاہ سے بہ جبر روکنے لگے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پاداش عمل کی نمود میں تاخیر ہو۔
چنانچہ وہ ظاہر ہوئی اور قریش مکہ کے جماعتی اقبال کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

باب ۵

منازل یثرب

یثرب کی طرف روانگی

تین راتیں غارِ ثور میں گزار کر رسولِ اکرم صلعم منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ اغلب ہے یہ فیصلہ پہلے سے کر رکھا ہو۔ البتہ مکہ مکرمہ میں خاص حالات پیدا ہو جانے کی بنا پر اس میں تغیر و تبدل کا امکان ضرور ہوگا۔ وقت پر دو سانڈنیاں غار کے پاس پہنچ گئیں جنھیں مہینوں سے ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر اس غرض کے لیے تیار کیا جا رہا تھا اور جن میں سے ایک کی قیمت رسول اللہ صلعم نے ادا فرما دی تھی۔ شاید اسی سانڈنی کا نام "قصویٰ" تھا۔

بعض روایات کے مطابق یہ سفر رات کو شروع ہوا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ اغلب ہے بہت تڑکے روانہ ہو گئے ہوں تاکہ دن نکلنے سے پہلے مکہ مکرمہ کے قرب و جوار کو بہت پیچھے چھوڑا جا سکے۔ ایک سانڈنی پر آگے رسولِ اکرم صلعم سوار ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کے پیچھے بیٹھے۔ دوسری سانڈنی پر عبد اللہ بن اُریقط اور عامر بن فہیرہ سوار تھے[1]

غارِ ثور سے نکل کر وہ راستہ اختیار کیا گیا جس پر سے عام آمد و رفت نہ تھی۔ اسی طرح مغربی و شمالی رُخ چلتے چلتے سمندر کے نزدیک پہنچ گئے۔ میرا اندازہ ہے یہ وہ راستہ ہوگا، جو جدّہ سے رابغ جاتا ہے[2]۔

سہ شنبہ کے روز دوپہر ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے ایک چٹان کے پاس سایہ دیکھا۔ زمین صاف کر کے اس جگہ چادر بچھائی تاکہ رسولِ اکرم صلعم استراحت فرمالیں۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک چرواہا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ اور بکری کے تھن خوب صاف کرا کے دُودھ نکلوایا۔ برتن کا منہ ڈھانک لیا تاکہ دُودھ گرد و غبار سے محفوظ رہے۔ اس میں پانی ڈال کر خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ آپ نوش فرما چکے تو روانہ ہو گئے۔

---

[1] روانگی کے وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ پر حسرت کی نظر ڈالی اور فرمایا: اے مکہ! تو مجھے تمام مقامات سے زیادہ عزیز ہے، مگر کیا کروں تیرے باشندے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ [2] یہ راستہ ساحلِ بحر کے ساتھ ساتھ ہے۔ راقم الحروف بھی ایک مرتبہ اسی راستے رابغ سے جدہ آیا تھا۔ ذہبان اسی راستے کا ایک ساحلی مقام ہے جہاں ۱۹۱۶ء میں انگریزی جہازوں نے شریف مکہ کے لیے سازوسامان جنگ اتارا تھا اور یوں شریف کے لیے سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کا موقع بہم پہنچایا تھا۔

مقامات طریق طبقات ابن سعد، سیرۃ ابن ہشام، وفا الوفا اور بعض دوسری کتابوں میں مقاماتِ سفر کے نام بھی دیے گئے ہیں مثلاً رابغ تک طبقات میں قُدَید اور ابن ہشام میں عسفان کا ذکر ہے مولانا شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ میں رابغ کا نام بھی لکھا ہے، جہاں آپ نے نماز مغرب ادا کی تھی[1]

یہ شاہراہ مدینہ کے مشہور مقامات ہیں۔ جب تک موٹروں کا رواج نہیں ہوا تھا اور اونٹ ہی سفر کا ذریعہ تھے، عسفان اور رابغ اس راستے کی خاص منزلیں تھیں۔

طبقات کے مطابق رابغ سے بعد کے مقامات یہ ہیں، خرّار، ثنیۃ المرّہ، لقف، مدلجۃ بقف، مدلجۃ مجاح، مرجح مجاح، بطن مرجح، ذات کِشد، جسے بعض نے کشت لکھا ہے۔ جداجد، اذاخر، بطن ریم، ذاسلم الغثانیہ، بطن القاحہ، عرج، جدوات، غائر، رکوبہ، بطن الحقیق، جثجاثۃ العصبہ۔

جیسا کہ میں حاشیے میں لکھ چکا ہوں، " بطن ریم" میں حضور صلعم نے مغرب کی نماز ادا فرمائی تھی اور اس مقام کا فاصلہ مدینہ منورہ سے تیس میل بتایا گیا ہے[2] العصبہ، قبا کے نزدیک ہے۔ یہ قبیلہ قبیلہ کا مقام تھا۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ رسول اکرم صلعم ان تمام مقامات پر قیام فرما ہوئے بلکہ یہ اس راستے کے مشہور مقامات ہیں، جو رسول اللہ صلعم نے ہجرت کے وقت اختیار کیا تھا

مدینہ منوّرہ کے راستے ترکوں کے عہد حکومت میں، نیز موٹروں کے جاری ہونے تک مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے چار معروف راستے تھے؛

۱۔ طریق شرقی، جس کی تفصیلات غیر ضروری ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ راستہ اختیار ہی نہیں کیا تھا۔

۲۔ طریق سلطانی، یہ حجاج و زائرین کا عام راستہ تھا۔ رابغ سے آگے اس کی منزلیں یہ تھیں؛ مستورہ، بئر الشیخ، دیار بنی حصانی، بئر عباس، بئر درویش، آبار علی (ذوالحلیفہ) مدینہ منوّرہ۔

۳۔ طریق الفرع، رابغ سے آگے، اس کی منزلیں یہ تھیں، بئر رمضان، ابوضباع، وادی ریان، القدیر، وادی المعظم، بئر الماشی، آبار علی، ذوالحلیفہ، مدینہ منوّرہ۔

رسول اللہ صلعم نے حجۃ الوداع سے مراجعت پر غالباً یہی راستہ اختیار کیا تھا۔

---

[1] بعض دوسری کتابوں میں مغرب کی نماز " بطن ریم" میں ادا کرنے کا ذکر ہے جسے بعض اصحاب نے " بطن ریغ" بھی لکھا ہے اور بطن ریم کا فاصلہ مدینہ منورہ سے تیس میل بتایا ہے۔ مجھے کئی مرتبہ خیال آیا کہ مولانا شبلی مرحوم نے کہیں " ریغ " کو " رابغ " نہ سمجھ لیا ہو۔ [2] وفا الوفا جلد دوم ص ۳۱۷۔

۴۔ طریق الغائر: یہ سب سے چھوٹا راستہ سمجھا جاتا تھا۔ رابغ سے آگے اس کی منزلیں یہ تھیں: بئر حمیر یک، رصفہ، جبل الغائر، بئر الماشی، آبار علی، مدینہ منورہ۔

رسول اللہ صلعم کا راستہ راستے کے مقامات کا نقشہ سامنے رکھ لیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے طریق الغائر اختیار فرمایا تھا۔ سب سے چھوٹا راستہ ہونے کے باعث یہ دوسرے راستوں سے کم تر مدت میں طے ہو سکتا تھا اور جبل الغائر سے گزرنے کی دشواری کے باعث اسے بہت کم لوگ اختیار کرتے تھے۔ بظاہر اسی کو محفوظ ترین راستہ سمجھا گیا ہوگا۔

راقم الحروف کا سفر مدینہ راقم الحروف کو ۱۹۲۵ء کے موسم سرما میں مدینہ منورہ کے سفر کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ سفر مولانا ظفر علی خاں مرحوم، شعیب قریشی مرحوم، مولانا محمد عرفان مرحوم اور ریاض الحسن صاحب کی معیت میں ہوا تھا۔ ہم لوگ دولت سعودیہ کے مہمان تھے۔ تین نجدی سوار اور کھانا پکانے والے لوگ ہمراہ تھے۔ سفر شام کے وقت شروع ہوتا تھا اور عموماً رات بھر جاری رہتا تھا۔ صبح ہوتے ہی قافلہ کسی منزل پر ٹھہر جاتا تھا۔ ہم اپنے خیال کے مطابق طریق سلطانی سے مدینہ منورہ پہنچنے کے خواہاں تھے۔ رابغ سے آگے بڑھے تو ہم لوگ اطمینان سے شقدفوں میں سو گئے۔[1] ساربان رات کی تاریکی میں راستہ بھول گئے اور طریق سلطانی کو چھوڑ کر طریق جبل الغائر پر ہو لیے۔ ایک منزل طے ہو گئی تو پتا چلا کہ ہم غلط راستے پر آ گئے ہیں۔ غور و فکر کے بعد ایک منزل واپس جا کر طریق سلطانی اختیار کرنے کے بجائے اسی راستے پر سفر جاری رکھنا مناسب سمجھا گیا۔ اس وقت تک مدینہ منورہ پر فرمانروائے نجد کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ جبل الغائر سے آگے پہنچے تو ایک تیز رو قاصد مدینہ منورہ سے آتا ہوا ملا، جس نے خوشخبری سنائی کہ نجدی فوجیں پُرامن طریق پر مدینہ منورہ میں داخل ہو گئیں۔ قاصد مکہ مکرمہ جا رہا تھا اور اس نے طریق الغائر اسی لیے اختیار کیا تھا کہ اس کا فاصلہ دوسرے راستوں کے مقابلے میں کم تھا۔

ہمارے ساتھ مکہ مکرمہ سے جو احباب آئے تھے انھوں نے راستے میں دو تین مقامات کی طرف اشارہ کیا کہ یہ رسول اللہ صلعم کے سفر ہجرت کے مقامات ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر حضور صلعم نے دوپہر کو استراحت فرمائی تھی۔ ایک مقام پر نماز ادا کی تھی۔

---

[1] جب سفر اونٹوں پر ہوتا تھا تو چارپائیوں کی وضع کی دو چیزیں (جن کے ایک طرف کے پایے چھوٹے ہوتے تھے، رسّوں سے باہم مضبوطی کے ساتھ باندھ کر اونٹ کے پالان پر رکھ دیتے گویا اونٹ کے دونوں طرف دو آدمیوں کے بیٹھنے اور سونے کی آرام دہ صورت پیدا ہو جاتی۔ انھیں اصطلاح میں شقدف کہتے تھے۔ ان کے اندر گدے بچھا کر اور تکیے رکھ کر نہایت آرام کے ساتھ سفر کیا جاتا۔ دن کے سفر میں مطالعہ خوب ہوتا رات کو نیند خوب آتی البتہ سواریوں میں سے ایک کو اترنا پڑتا تو دوسرے کے لیے بھی شقدف چھوڑنا لازم ہو جاتا یا اترنے والا اپنی جگہ عارضی طور پر کسی کو بٹھا دیتا۔

اسس بنا پر یقین ہے کہ حضور صلعم رابغ سے آگے طریق الغائر ہی سے یثرب پہنچے تھے۔

بہ بھی عرض کروں کہ جبل الغائر کی چڑھائی تو یقیناً تھوڑی سی زحمت کا باعث ہوئی کیونکہ اونٹوں سے اتر کر پیدل چلنا پڑا، لیکن اس راستے کی مشکلات کے متعلق اور جو داستانیں سنی تھیں، وہ بالکل بے اصل ثابت ہوئیں۔

سراقہ کا واقعہ

رابغ سے آگے سراقہ بن مالک بن جعشم کا واقعہ پیش آیا۔ اس کا قبیلہ رابغ ہی پر قابض تھا۔

کفار قریش رسول اللہ صلعم کو پا نہ سکے تو اعلان کر دیا کہ حضور صلعم یا ابوبکرؓ کو جو بھی زندہ یا مُردہ لے آئے گا، اسے ایک سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ سراقہ کو یہ خبر مل چکی تھی۔ وہ مجلس میں بیٹھا تھا جب کسی نے بتایا کہ ساحل بحر کی طرف چند سایے سے نظر آئے ہیں۔ شاید وہ محمد (صلعم) اور آپ کے ساتھی ہوں۔ سراقہ کو یقین ہو گیا کہ وہی ہیں لیکن آدمی کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ فلاں فلاں ہیں اور ابھی یہاں سے گزرے ہیں۔ دراصل وہ تنہا انعام لینا چاہتا تھا کوئی اور اس کام میں شریک ہو جاتا تو انعام بٹ جاتا۔

سراقہ چپ چاپ اٹھا۔ لونڈی سے کہا کہ میرا گھوڑا ٹیلے کے پرے لے جا کر ٹھہرو خود نیزہ لے کر پیدل وہاں پہنچا اور سوار ہو کر تعاقب میں نکل پڑا۔ قریب پہنچا تو یقین ہو گیا کہ رسول اللہ صلعم جا رہے ہیں۔ تیر نکال کر فال دیکھی تو خلاف نکلی، لیکن ایک سو اونٹ کے انعام کا لالچ ایسا نہ تھا کہ فال خلاف نکلنے پر ارادہ ترک کر دیا جاتا۔

امان نامہ

وہ خود کہتا ہے کہ میں نے فال کے خلاف عمل کیا۔ رسول اللہ صلعم مالک حقیقی سے لو لگائے قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے اور ادھر ادھر نہیں دیکھتے تھے۔ ابوبکرؓ چوکس تھے اور ان کی نظر ہر طرف تھی۔ سراقہ قریب پہنچ گیا اور ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلعم کو اطلاع کی تو آپ نے فرمایا: "الٰہی اس کے شر سے ہمیں بچا" ساتھ ہی سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور وہ گر پڑا۔ اٹھا اور گھوڑے نے پاؤں بمشکل زمین سے نکالے تو سراقہ کہتا ہے کہ ایسی گرد اڑی جو دھوئیں کی طرح آسمان تک پھیل گئی۔

سراقہ کو یقین ہو گیا کہ یہ معاملہ دوسرا ہے۔ درخواست کر کے سواریاں ٹھہرائیں زاد راہ پیش کی مگر قبول نہ ہوئی۔ حضور صلعم نے صرف اتنا فرمایا کہ ہمارا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ سراقہ نے عرض کیا کہ اب میں ہر تعاقب کنندہ کو پیچھے ہی روکتا رہوں گا۔

واپس ہوتے ہوئے سراقہ نے امان نامہ کے لیے درخواست کی۔ رسول اللہ صلعم کے ارشاد کے مطابق عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر امان نامہ لکھ کر سراقہ کے حوالے کر دیا۔[1] جنگ احد کے بعد سراقہ مسلمان ہوا اور فتح مکہ کے بعد یہ امان نامہ رسول اللہ صلعم کو دکھایا۔

کسریٰ کے کنگن

"استیعاب" میں ہے کہ سراقہ واپس ہونے لگا تو حضور صلعم نے فرمایا:

"سراقہ! اس وقت تیری شان کیا ہوگی، جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے شاہی کنگن ہوں گے۔"

---

[1] سیرۃ ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا اور انھوں نے تحریر لکھ دی۔

پہنائے جائیں گے۔

سراقہ نے پوچھا، کسریٰ بن ہرمز شاہنشاہ ایران کے کنگن؟

فرمایا "ہاں"۔

سراقہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

جب حضرت فاروق اعظم کے عہد میں مدین فتح ہوا اور ایران کا مال غنیمت مدینہ منورہ پہنچا تو اس میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے جو حضرت فاروق نے سراقہ کو پہنائے۔

زبیرؓ سے ملاقات

راستے میں حضرت زبیرؓ سے بھی ملاقات ہوئی جو شام سے تجارتی قافلے کے ساتھ آ رہے تھے۔ انھوں نے رسول اکرم صلعم اور حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں سفید کپڑوں کا ایک ایک جوڑا پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں بھی قافلے اور مال کو مکہ مکرمہ پہنچاتے ہی ہجرت کر کے آجاؤں گا۔

حضرت ابو بکرؓ بہت سے تجارتی سفر کر چکے تھے، اس لیے تجارتی شاہراہوں کے اطراف کے بہت سے لوگ انھیں پہچانتے تھے، ان میں سے اتفاقیہ راستے میں کوئی مل جاتا اور پوچھتا کہ آپ کے آگے کون سوار ہے تو حضرت ابو بکرؓ فرماتے: "ھذا یھدینی السبیل" (یہ راستے کے لیے دلیل ہے) حضرت ابو بکرؓ کے ذہن مبارک میں اس کا مفہوم یہ تھا کہ آپ میرے مرشد طریق ہیں۔ آپ ہی نے مجھے ہدایت کا راستہ دکھایا اور صراط مستقیم پر لگایا۔ جواب سننے والے یہ سمجھتے تھے کہ حضرت ابو بکرؓ نے آپ کو منزل مقصود کا راستہ بتانے کے لیے ساتھ لے لیا ہے۔

قبا میں ورود مبارک

سفر ہجرت میں کل آٹھ دن لگے۔ جن کے نزدیک غار ثور سے روانگی یکم ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ ان کے حساب کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ۸۔ ربیع الاول کو قبا پہنچ گئے۔ جن مورخین نے روانگی کی تاریخ ۴۔ ربیع الاول مانی، ان کے حساب کے مطابق قبا میں حضور صلعم کا ورود مبارک ۱۲۔ ربیع الاول کو ہوا۔ قاضی سلیمان مرحوم کا تعلق پہلے گروہ سے ہے۔ ان کا بیان ہے:

۸۔ ربیع الاول ۱۳ نبوت، روز دوشنبہ (۲۳ ستمبر ۶۲۲ء) مطابق ۱۰۔ تشری ۴۳۸۲ یہود تھی کہ خدا کا نبیؐ قبا میں پہنچ گیا۔[1]

مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں:

---

[1] قاضی صاحب مرحوم نے ۸۔ ربیع الاول کے لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب "سرور المحزون" کا اور دوشنبہ کے لیے صحیح بخاری باب ہجرت کا حوالہ دیا ہے۔ میرے حساب کے مطابق عیسوی تاریخ ۲۰۔ ستمبر ۶۲۲ء تھی نہ کہ ۲۳۔ ستمبر ۶۲۲ء۔ مولانا شبلی مرحوم کے نزدیک بھی ۲۰ ستمبر ہی صحیح ہے۔ قاضی صاحب نے ۱۳ نبوت اس لیے لکھا کہ رسول اکرم صلعم کو منصب نبوت ملنے کی تاریخ ۹۔ ربیع الاول تھی اور ۸۔ کو تیرھویں سال کا آخری دن تھا۔ عجیب امر یہ ہے کہ جو لوگ ۱۲۔ ربیع الاول کو قبا پہنچنے کے حامی ہیں وہ بھی عیسوی تاریخ ۲۰۔ ستمبر ۶۲۲ء ہی بتاتے ہیں۔

اکثر مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ آٹھ ربیع الاول ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) تھی۔ موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی تاریخ، رومی ماہ ایلول ۹۳۳ اسکندری کی دسویں تاریخ تھی[1]۔

کیفیت درود مبارک مولانا شبلی مرحوم نے کیفیت درود کا نقشہ یوں پیش کیا ہے،

تشریف آوری کی خبر پہلے پہنچ چکی تھی۔ تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا۔ بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ "پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آرہے ہیں۔" لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہو جاتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت سے واپس چلے آتے۔ ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعے سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ "اہل عرب، لو تم جس کا انتظار کرتے تھے، وہ آگیا" تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا۔ انصار ہتھیار سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے[2]۔

"شہر" سے مرحوم مولانا کی مراد قبا ہے جو یثرب میں انصار کی متعدد آبادیوں میں سے ایک آبادی یا بستی تھی۔ اس وقت تمام آبادیوں کے انصار موقع پر موجود نہ ہوں گے۔ کیونکہ اول بظاہر یقین نہ ہوگا کہ رسول اکرم صلعم سب سے پہلے قبا میں پہنچیں گے، دوم تمام آبادیوں سے زیادہ لوگ پہنچ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان میں سے بعض خاصے فاصلے پر تھیں۔ ممکن ہے کچھ اصحاب روزانہ قبا آجاتے ہوں۔

مشیت کی اندازہ فرمائی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے بعد قبا پہنچے ہوں گے کیونکہ انصار اس روز (۸۔ ربیع الاول کو) معمول کے مطابق دوپہر تک انتظار کر کے واپس جا چکے تھے۔

کوئی اسے اتفاق سمجھے یا مشیت ایزدی کی اندازہ فرمائی کہ حضور صلعم جس روز قبا پہنچے اس روز نبوت کا تیرھواں سال پورا ہو رہا تھا اور دوسرے روز سے نئے سال کا آغاز ہونے والا تھا۔ گویا حضور صلعم کی نبوت کا ایک دور اس روز پورا ہو گیا۔ دوسرا دور نئے سال کے پہلے دن سے شروع ہوا۔ نیز دوشنبہ کو حضور صلعم کی سیرۃ طیبہ میں جو خصوصیت حاصل ہے اسے بھی پیش نظر رکھیے۔ آپ دوشنبہ ہی کو اس دنیا میں جلوہ افروز ہوئے۔ دوشنبہ ہی کو منصب نبوت ملا۔ دوشنبہ ہی کو غار ثور سے نکل کر راہی یثرب ہوئے۔ دوشنبہ ہی کو قبا پہنچے اور دوشنبہ ہی کو اس دنیا سے رحلت فرما کے عالم بقا ہوئے۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم۔ (مولف)

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۲۷۵ مولانا مرحوم حاشیے میں لکھتے ہیں کہ رومی ماہ ایلول کی دسویں کے بجائے جدید حساب سے بیسویں ثابت ہوتی ہے۔ خوارزمی نے کہا جمعرات کا دن تھا، لیکن جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے۔ [2] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۲۵۵ [3] یہاں مولف کی تمہیدات ختم ہو گئیں۔ آگے مولانا کے افادات ہیں۔

باب

ہجرت اور سنہ ہجری کا آغاز

وحدثتنی یا سعد عنہا ، فزدتنی
جنونا ، فزدنی من حدیثک یا سعد!

—(۱)—

واقعہ ہجرت کی عظمت

آج جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں، محرم[1] کی تیرھویں تاریخ ہے۔ پورے تیرہ دن اس واقعے پر گزر چکے ہیں کہ پچھلا ہجری سال ختم ہو چکا اور نیا سال شروع ہو چکا ہے لیکن ہزاروں لاکھوں مسلمانوں میں شاید ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جس نے غور کیا ہوگا کہ اس سالانہ اختتام و آغاز میں تاریخ عالم کے کیسے عظیم اور انقلاب انگیز واقعے کی یاد پوشیدہ ہے؛ وہ عظیم واقعہ، جس کی یاد آوری سے بڑھ کر تاریخ اسلام کے کسی بھی واقعے میں ہمارے لیے عبرت کی عظمت اور موعظت کی سرچشمگی نہیں تھی، مگر جس واقعے سے بڑھ کر تاریخ اسلام کا کوئی بھی واقعہ ہماری یادداشت سے دور اور ہمارے دل کی اثر پذیریوں سے مہجور نہیں ہو گیا۔

جماعتی حافظہ اور اس کا مزاج

انفرادی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے اخلاق اور سیرۃ (کیریکٹر) کا اندازہ اس کے حافظے کی رفتار سے کر لیا جا سکتا ہے۔ ایک نیک سیرت آدمی کے حافظے میں غیر ضروری اور بری باتوں کی یادداشت کے لیے کوئی جگہ نہیں نکل سکتی، لیکن ضروری اور اچھی باتیں وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ برخلاف اس کے ایک بداخلاق آدمی کو کتنی ہی کارآمد اور اچھی باتیں سنائی جائیں، لیکن اس کے حافظے میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں نکلے گی۔ وہ صرف بیکار اور بری باتیں ہی یاد رکھ سکتا ہے۔

یہی حال جماعتوں اور قوموں کے دماغ کا بھی ہے۔ ان کے ادبار و تنزّل کی ایک بہت بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ جماعتی حافظے کا مزاج بالکل الٹ جاتا ہے۔ جو باتیں یاد رکھنی چاہئیں، وہ اس طرح بھلا دی جاتی ہیں کہ بار بار یاد دلانے پر بھی یاد نہیں آتیں اور جو باتیں بھلا دینی چاہئیں، وہ نہ صرف یاد رکھی جاتی ہیں بلکہ ان کی یادآوریوں کا ایسا اہتمام کیا جاتا ہے کہ بھلانے کی کتنی ہی کوششیں کی جائیں، کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں!

---

[1] محرم ۱۳۴۶ھ (جولائی ۱۹۲۷ء)

صدر اول کے مسلمان اور موجودہ مسلمان

صدر اول کے مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی سے موجودہ عہد کے مسلمانوں کی زندگی کا مقابلہ کرو تو اس حقیقت کی سب سے واضح مثال سامنے آجائے گی۔ اس وقت مسلمان اٹھتے بیٹھتے جو باتیں یاد رکھا کرتے تھے، آج کسی کو ان کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور جو باتیں آجکل بے شمار تقریبوں، تہواروں، یادگاروں اور اجتماعوں کے ذریعے یاد رکھی جاتی ہیں، یہ اس وقت کسی مسلمان کے وہم و گمان میں بھی نہیں گزری ہوں گی۔ اس وقت ان کا حافظہ صرف وہی چیزیں یاد رکھنی چاہتا تھا، جن کی یادداشت میں ان کی قومی زندگی کے لیے عبرت و موعظت تھی۔ آج ہمارا حافظہ صرف وہی باتیں یاد رکھنا چاہتا ہے جن کی یادداشت میں قومی زندگی کے لیے غفلت و اعراض ہے۔ وہ (صدر اول کے مسلمان) ان چیزوں کو بھول نہیں سکتے تھے، جنھیں یاد رکھنا چاہیے۔ ہم ان چیزوں کو بھلا نہیں سکتے، جنھیں ہمیشہ کے لیے بھلا دینا چاہیے!

سارت مشرقۃ و سرت مغرب

شتان بین مشرق و مغرب

فتح مندیوں کا بیج

تاریخ عالم کا یہ عظیم واقعہ جس کی یاد سال کے اس اختتام و آغاز میں پوشیدہ ہے۔ ہجرت نبوی کا واقعہ ہے، کیونکہ پہلی محرم سے نیا اسلامی سال شروع ہوتا ہے اور اس کی بنیاد واقعۂ ہجرت پر رکھی گئی ہے۔ ہر سال جب ۳۰ ذوالحجہ کا دن ختم ہوتا اور پہلی محرم کا چاند طلوع ہوتا ہے، تو وہ اس عظیم واقعے کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کر دینی چاہتا ہے۔ یہ فی الحقیقت اس واقعے کی ایک جاری و قائم یادگار ہے۔

یہ دنیا کی تمام قوموں کی یادگاروں کی طرح قوت کی کامرانیوں کی یادگار نہیں، بلکہ کمزوری کی فتحمندیوں کی یادگار ہے۔ یہ اسباب و وسائل کی فراوانیوں کی یادگار نہیں، بے سروسامانیوں کی کامیابیوں کی یادگار ہے۔ یہ طاقت اور حکومت کے جاہ و جلال کی یادگار نہیں، محکومی و بے چارگی کے ثبات و استقلال کی یادگار ہے۔ یہ فتح مکہ کی یادگار نہیں، جسے دس ہزار تلواروں کی چمک نے فتح کیا تھا، یہ فتح مدینہ کی یادگار ہے، جسے تلواروں کی چمک نے نہیں، بلکہ ایک آوارۂ غربت اور بے سروسامان انسان کی روح "ہجرت" نے فتح کیا تھا! تم نے بدر کی جنگی فتح اور مکہ کے مسلح داخلہ کی نشان و شوکت ہمیشہ یاد رکھی ہے، لیکن تم نے مدینہ کی بے ہتھیار فتح فراموش کر دی، حالانکہ تاریخ اسلام کی ساری آنے والی فتحمندیاں اسی اولین فتح میں ایک بیج کی طرح پوشیدہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ظاہری فتحمندیوں کے اعلان کا وقت آیا تھا تو اس وقت اسی معنوی فتحمندی کی یاد لوگوں کو دلائی گئی تھی:

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ! فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ وَ اَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا، وَ جَعَلَ کَلِمَۃَ

دو میں دوسرا (اللہ کا رسول)، تھا اور دونوں غار میں چھپے بیٹھے تھے اس وقت اللہ کے رسول نے اپنے ساتھی سے کہا تھا، غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اپنا سکون و

الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ، وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (توبہ ، ۴۰)

تواراس پر نازل کیا، پھرایسی فوجوں سے مددگاری کی جنھیں تم نہیں دیکھتے اور بالآخر کافروں کی بات پست کی اور اللہ ہی کی بات ہے جس کے لیے بلندی ہے۔

تذکار محرم

اس ہجری سنہ کے ساٹھویں برس کربلا کا حادثہ ظہور میں آیا۔ یہ حادثہ اس درجہ المناک اور درد انگیز تھا اور اس کے سیاسی اثرات اس درجہ قوی اور وسیع تھے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کی یاد ایک ماتمی یادگار کی حیثیت اختیار کرتی گئی یہاں تک کہ محرم کے دنوں کی تمام یاد آوری صرف اسی حادثہ کے تذکرہ و تألّم میں محدود ہو گئی اور دوسرے تمام پہلو یک قلم فراموش کر دیے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ حادثہ کربلا کی المناکیاں اور عبرت انگیزیاں ناقابل فراموش ہیں، لیکن ہمارے جماعتی ذہن و فکر کی یہ بہت بڑی غفلت ہوگی، اگر اس حادثہ کے استغراق میں تذکرۂ و اعتبار کے دوسرے پہلو فراموش کر دیے جائیں۔ یہ سنہ ہجری کے ساٹھویں برس کے ایک واقعے کی تذکار ہے لیکن خود سنہ ہجری کے پہلے برس کی تذکار سے کیوں چشم بصیرت بند کر لی جائے؟

سنہ ہجری کی ابتدا

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سنہ جاری تھے۔ زیادہ مشہور یہودی، رومی اور ایرانی سنین تھے۔ عرب جاہلیۃ کی اندرونی زندگی اس قدر متمدن نہیں تھی کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی۔ اوقات و مواسم کی حفاظت اور یادداشت کے لیے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اس سے وقت کا حساب لگا لیتے۔ منجملہ سنین جاہلیۃ کے "عام الفیل" تھا، یعنی شاہ حبش[1] کے حجاز پر حملہ کرنے کا سال۔ عرصے تک یہی واقعہ عرب کے حساب و کتاب میں بطور سنہ کے مستعمل رہا۔ ظہور اسلام کے بعد یہ اہمیت خود عہد اسلام کے واقعات نے لے لی۔ صحابہ کرام کا قاعدہ تھا کہ عہد اسلام کے واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے اور اسی سے حساب لگاتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد ہی سورۂ حج کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی؛ اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا و ان اللہ علی نصرہم لقدیر[2]۔ (حج ، ۴۰) اس لیے کچھ دنوں تک یہی واقعہ بطور ایک سنہ کے مستعمل رہا۔ لوگ اسے "سنہ اذن" سے تعبیر کرتے اور یہ تعبیر وقت کے ایک خاص عدد کی طرح یادداشت میں کام دیتی۔ اسی طرح سورۂ براۃ کے نزول کے بعد بول چال میں "سنہ براۃ" کا بھی رواج رہا۔ عہد نبوی کا آخری سنہ "سنۃ الوداع" تھا، یعنی آنحضرت (صلعم) کے آخری حج کا واقعہ جو "حجۃ الوداع" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اور ہجرت کے

---

[1] مراد ہے ابرہہ کا حملہ جو شاہ حبش کی طرف سے یمن کا حاکم تھا۔ [2] جن مومنوں کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انھیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی رخصت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔

دسویں سال پیش آیا تھا۔ بعض روایات سے اس طرح کے متعدد سنوں کا پتا چلتا ہے مثلاً" سنۃ التمحیص ، سنۃ الترفئۃ ، سنۃ الزلزال ، سنۃ الاستیناس۔ بیرونی نے آثار الباقیہ میں اس طرح کے دس سنوں کا ذکر کیا ہے۔

آنحضرت (صلعم) کی وفات کے بعد کچھ عرصے تک یہی حالت جاری رہی لیکن حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالک مفتوحہ کی وسعت اور دفاتر حکومت کے قیام سے حساب وکتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہوسے اور ضرورت پیش آئی کہ سرکاری طور پر کوئی ایک سنہ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ اس معاملے پر غور کیا گیا اور سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک واقعۂ ہجرت پر سولہ برس گزر چکے تھے۔

احساس ضرورت اور مشورہ

سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا تو کیوں حضرت عمرؓ اور تمام صحابہ کا ذہن اس طرف گیا کہ اسلامی سنہ کی ابتدا واقعہ ہجرت سے کی جائے؟ یہ تاریخ اسلام کا ایک ضروری اور نتیجہ خیز مبحث تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نظر وفکر سے محروم رہا۔

اس بارے میں متعدد روایتیں منقول ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور روایت میمون بن مہران کی ہے جسے تمام مورخین نے نقل کیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ "ایک مرتبہ ایک کاغذ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا جس میں شعبان کا مہینا درج تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: شعبان سے مقصود کون سا شعبان ہے؟ اس برس کا یا آیندہ برس کا؟ پھر آپ نے سربرآوردہ صحابہ کو جمع کیا اور ان سے کہا: اب حکومت کے مالی وسائل بہت زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہوجاتا لہٰذا ضروری ہے، حساب وکتاب کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہوسکیں۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ ایرانیوں سے مشورہ کرنا چاہیے۔ ان کے یہاں اس کے طریقے کیا تھے؟ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو بلایا۔ اس نے کہا: ہمارے یہاں ایک حساب موجود ہے جسے "ماہ روز" کہتے ہیں۔ اسی ماہ روز کو عربی میں "مورخہ" بنا لیا گیا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی حکومت کی تاریخ کے لیے جو سنہ اختیار کیا جائے، اس کی ابتدا کب سے ہو؟ سب نے اتفاق کیا کہ ہجرت کے برس سے کی جائے۔ چنانچہ ہجری سنہ قرار پایا۔[1]

دوسری روایت

ابن حبان نے قرہ بن خالد سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے۔ اس میں ایک دوسرے واقعے کا ذکر کیا گیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن سے ایک عامل آیا تھا، اس نے کہا لکھنے پڑھنے میں آپ لوگ تاریخ نہیں لکھتے۔ اس طرح کہ فلاں بات فلاں سنہ میں، سنہ کے فلاں مہینے میں ہوئی۔ اس پر حضرت عمرؓ اور لوگوں کو اس معاملے کا خیال ہوا۔ پہلے انھوں نے ارادہ کیا کہ آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے کے وقت سے سنہ کا حساب شروع کر دیں۔ پھر خیال ہوا کہ آپ کی وفات سے شروع کیا جائے لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی

---

[1] تاریخ کبیر، ذہبی وتاریخ مصر مقریزی۔

کہ ہجرت سے سنہ کا تقرر ہو۔

ان روایات کی مزید تشریح امام شعبی کی روایت سے ہوتی ہے جو محب طبری نے نقل کی ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ،

ان ابا موسیٰ الاشعری کتب الی عمر انہ تاتینا منك کتب لیس لها تاریخ وقد کان عمر دون الدواوین و وضع الاخرجة واحتاج الی تاریخ ولم یحب التاریخات القدیمہ فجمع علیہ عند ذلك و استشار الناس فاتفقوا علی ان یکون المبداء من الهجرة۔

(ریاض النفرۃ)

ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے نام خطوط آتے ہیں مگر ان پر کوئی تاریخ نہیں ہوتی اور یہ وقت وہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کے مختلف دفاتر قائم کر دیے تھے اور خراج کے اصول و قواعد طے پا گئے تھے اور اس سے محسوس کر رہے تھے کہ ضبط اوقات کے لیے ایک خاص تاریخ قرار پا جائے۔ پرانی تاریخیں موجود تھیں لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ انھیں اختیار کریں۔ ابوموسیٰ اشعریؓ نے لکھا تو انھیں زیادہ توجہ ہوگئی۔ صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ مشورہ میں سب کی رائے یہی قرار پائی کہ ہجرت کا واقعہ بنیاد ٹھہرا کر سنہ ہجری اختیار کیا جائے۔

حضرت علیؓ کی رائے

ابوہلال عسکری نے "الاوائل" میں اور مقریزی نے تاریخ میں حضرت سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے کہ واقعۂ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے حضرت علی علیہ السلام نے دی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

جمع عمر الناس فسالهم من ای یوم یکتب التاریخ؟ فقال علی بن ابی طالب من یوم هاجر رسول اللہ و ترك مكه ففعله عمر۔

(کتاب الاوائل قلمی و مقریزی طبع ثانی جلد ۲۔ صفحہ ۵۶)

جب حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کس دن سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے؟ تو حضرت علیؓ نے فرمایا: اس دن سے جس دن آنحضرت نے ہجرت کی اور مکہ سے مدینہ آئے۔

یعقوبی نے بھی اسے منجملہ ان امور کے قرار دیا ہے جو حضرت علیؓ کی رائے سے انجام پائے۔ ۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے:

وفیها ارخ عمر الکتب و اراد ان یکتب التاریخ منذ مولد رسول اللہ ثم قال من المبعث، فاشار علیہ علی ابن ابی طالب ان یکتبہ

اسی زمانے میں حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ ضبط کتابت کیلیے ایک تاریخ قرار دے دی جائے، پہلے انھیں خیال ہوا آنحضرت کی ولادت سے شروع کریں پھر خیال کیا آپ کی

من الھجرت ، فکتبہ من الھجرت ۔ بعثت کے واقعہ سے ابتدا کی جائے لیکن حضرت علیؓ نے رائے دی کہ ہجرت سے شروع کرنا چاہیے۔ (جلد ۲، صفحہ ۱۶۶)

قومی سنہ کی ضرورت و اہمیت

ان روایات کے مطالعہ کے بعد ضروری ہے کہ بعض امور پر غور کیا جائے: سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے ، یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور صحابہ نے یہ ضرورت کیوں محسوس کی ، ایک نیا سنہ قرار دیا جائے؟ امام شعبی کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ تاریخ کے تعین و تقرر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسری قوموں کی تاریخ اختیار کریں۔ پہلی روایت میں جس ہرمزان کو بلانے اور مشورہ کرنے کا ذکر ہے ، یہ خوزستان کا بادشاہ تھا اور مسلمان ہو کر مدینہ میں مقیم ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی مجالس شوریٰ میں اس کا بار بار ذکر آتا ہے[۱]۔ بیرونی لکھتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے نہ صرف ایرانیوں کا طریقہ ہی بتلایا بلکہ رومیوں کے طریقے کی بھی تشریح کی۔ ایرانیوں کے یہاں کا آخری سنہ یزدگرد کا سنہ تھا اور رومیوں کا مشہور سنہ سکندر کی پیدائش سے شروع ہوتا تھا۔ بعض اصحاب کو خیال ہوا انھی دونوں میں سے کوئی سنہ اختیار کر لیا جائے ، لیکن حضرت عمرؓ اور اور لوگ اس سے متفق نہ ہوئے[۲]۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایرانیوں اور رومیوں کے سنین مجمع صحابہؓ میں زیر بحث رہے اور بعض نے اسے اختیار کرنے کی رائے بھی دی لیکن عام رجحان اس طرف تھا کہ نیا سنہ مقرر کرنا چاہیے۔

اجنبی سنہ سے اجتناب کیوں؟

اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ سنہ کی ضرورت اور استعمال کی بڑی جگہ حساب و کتاب کے دفاتر تھے اور حضرت عمرؓ نے بہ اتفاق صحابہؓ ، دفاتر کے لیے وہی زبانیں اختیار کر لی تھیں جو پیشتر سے مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں۔ ایران کے لیے فارسی ، شام کے لیے سریانی اور مصر کے لیے قبطی تھی[۳]۔ ظاہر ہے کہ جب دفاتر کے لیے ایران و شام کی زبانیں اختیار کر لی گئی تھیں تو قدرتی طور پر سنہ بھی وہی اختیار کر لینا تھا جو ان زبانوں کے حساب و کتاب میں رائج تھا اور اس کے قواعد بندھے چلے آتے تھے لیکن حضرت عمرؓ اور صحابہؓ نے ایسا نہیں کیا۔ ایران اور روم و مصر کی زبانیں اختیار کر لیں مگر سنہ اپنا قائم کرنا چاہا۔ غور کرنا چاہیے ، اس اجتناب کی علت کیا تھی؟

---

[۱] بلاذری و طبری وغیرہما۔ [۲] بیرونی نے یہ تفصیل بن مہران کی روایت کے سلسلے ہی میں پیش کی ہے اور اس کے الفاظ روایت مندرجۂ متن سے مختلف ہیں چونکہ اس نے کوئی تخریج درج نہیں کی تھی اس لیے حسب اصول فن روایت اس سے اساسی استدلال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے ہم نے اوپر کی روایتوں میں اسے شامل نہیں کیا (الآثار الباقیہ صفحہ ۳۰)

[۳] مسعودی و بلاذری۔

کشادہ دلی کی روشن مثالیں

یہ علت تو قطعاً نہیں ہو سکتی کہ صحابہ کرامؓ محض قومی تعصب اور تنگ دلی کی بنا پر دوسری قوموں کی اچھی اور کار آمد باتوں سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ اولاً اس بارے میں خود اسلامی احکام کا یہ حال ہے کہ رکاوٹ کی جگہ صریح ترغیب دی گئی ہے ثانیاً اس عہد کے بے شمار واقعات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے تعصبات کو اس وقت کے مسلمانوں کی ذہنیت میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ وہ دنیا کے تمام علمی و تمدنی ذخیرے کو خواہ کسی قوم اور ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنا قومی ورثہ سمجھتے تھے۔ خود اسی عہد میں حضرت عمرؓ نے بے شمار معاملات میں غیر قوموں کے علمی اور تمدنی اصول معلوم کیے ہیں اور ان میں جو باتیں کار آمد اور ضروری نظر آئی ہیں، بلا تامل اختیار کر لی ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا، وہ ایرانیوں، رومیوں اور مصریوں کو بہ اصرار طلب کراتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ دفاتر حکومت کی تقسیم، خراج و محصول کا تعین، اراضی کی پیمایش اور تشخیص، خزانے کا قیام، حساب و کتاب کے اصول و قواعد اور اسی طرح کے بہت معاملات ہیں جن میں ایرانی اور رومی قواعد کا تتبع کیا گیا۔ فقہ کا ایک اہم باب فرائض ہے یعنی ورثہ کی تقسیم کے اصول و قواعد، چونکہ اس کا تعلق فن حساب سے ہے، اس لیے حضرت عمرؓ نے چاہا، اس کے قواعد کی ترتیب و درستگی کے لیے ایک ماہر حساب سے مدد لی جائے۔ مورخین نے تصریح کی ہے کہ اس غرض سے ایک رومی مسیحی مدینہ میں طلب کیا گیا تھا۔ طلبی کے فرمان میں والی شام کو جو الفاظ لکھے تھے وہ یہ ہیں: ابعث لنا برومی یقیم لنا حساب فرائضنا۔ ایک رومی کو بھیج دو تاکہ وہ ہمارے فرائض کا حساب استوار کر دے[1]۔ جب حضرت عمرؓ کو فرائض جیسے شرعی مسئلے کے حساب میں ایک رومی عیسائی سے مدد لینا ناگوار نہ ہوا تو ظاہر ہے کہ ایرانی یا رومی سنہ کے اختیار کر لینے میں قومی تعصب کیوں مانع ہوتا جس کا تعلق صرف حساب و تاریخ سے ہے؛ انھوں نے ایرانی اور رومی سنین جیسے مدون و رائج سنہ چھوڑ دیے اور ایک نیا سنہ از سر نو قائم کیا۔

صحابہ کرام کے دماغ کا سانچا

اصل یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم اور تربیت نے صحابہ کرام کا دماغ جس سانچے میں ڈھال دیا تھا وہ ایسا سانچا تھا جس میں دوسرے درجے کا کوئی خیال سما ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ صرف اول درجہ کے خیالات کے لیے تھا۔ بہت ممکن ہے دنیا کے تمدنی علوم و فنون کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات علمی طریقوں اور مصطلحہ لفظوں میں ادا نہ کر سکتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بات کی علت اس شکل و صورت میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے لیکن ان کی طبیعت کی افتاد اور ذہنیت کی روش کچھ اس طرح کی بن گئی تھی کہ جب کبھی کسی معاملے پر سوچ بچار کرتے تھے تو خواہ علت و موجب سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں لیکن دماغ جاتا اسی طرف تھا جو علم و حکمت کے لیے بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند پہلو ہو سکتے ہیں۔ یہی معنی ہیں انبیائے کرام

---

[1] صراط مستقیم، حافظ ابن تیمیہ۔

کے مقام "تزکیہ" کے کہ "ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ"[۱] (جمعہ : ۲) یعنی دل ودماغ کی اس طرح تربیت کر دی جاتی ہے کہ ایک موزوں اور مستقیم سانچا ڈھل جاتا ہے۔ اب جب کبھی کوئی ٹیڑھی چیز اس میں رکھی جائے گی وہ قبول نہیں کرے گا اور موزوں چیزیں ہی اس میں سما سکتی ہیں۔

---

[۱] ان کے اخلاق کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

باب

ہجرت اور سنہ ہجری کا آغاز

(۲)

قومی زندگی کی بنیادی اینٹ

اسلام کی تربیت نے صحابہ کے دل و دماغ میں قومی شرف و خودداری کی روح پھونک دی تھی۔ قومی زندگی کی بنیادیں جن اینٹوں پر استوار ہوتی ہیں، ان میں سے ایک ایک اینٹ کے لیے ان کے اندر پہچان اور لگاؤ تھا اگرچہ وہ لفظوں اور تعبیروں میں انھیں بیان نہ کر سکیں۔ جب حضرت عمرؓ نے سنہ اور تاریخ کی ضرورت محسوس کی تو اگرچہ متمدن اقوام کے سنین رائج و مستعمل تھے لیکن ان کی طبیعت ان کی طرف مائل نہ ہو سکی، اس لیے کہ ایسا کرنا نہ صرف قومی شرف و خودداری کے خلاف تھا، بلکہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ کھو دینی تھا۔

قومی زندگی کے بنیادی مقومات میں سے ایک نہایت اہم چیز سنہ اور تاریخ ہے جو قوم اپنا قومی سنہ نہیں رکھتی، وہ گویا اپنی بنیاد کی ایک اینٹ نہیں رکھتی۔ قوم کا سنہ اس کی پیدایش اور ظہور کی تاریخ ہوتا ہے۔ یہ اس کی قومی زندگی کی روایات قائم رکھتا اور صفحۂ عالم پر اس کے اقبال و عروج کا عنوان ثبت کر دیتا ہے۔ یہ قومی زندگی کے ظہور و عروج کی ایک جاری و قایم یادگار ہے۔ ہر طرح کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں، لیکن یہ نہیں مٹ سکتی، کیونکہ سورج کے طلوع و غروب اور چاند کی غیر متغیر گردش سے اس کا دامن بندھ جاتا ہے اور دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عمر بھی بڑھتی رہتی ہے۔ آج آگسٹس، بکرماجیت، جلال الدین ملک شاہ اور اکبر اعظم کے نام ان کے سنین کے اندر ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمارا حافظہ ان سے گردن نہیں موڑ سکتا۔

سنہ اپنا ضروری تھا

ممکن نہ تھا کہ قومی زندگی کا ایک ایسا اہم معاملہ حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کے سامنے آتا اور ان کا دماغ غلط فیصلہ کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام کی دماغی تربیت غلط ہو جاتی۔ کچھ ضروری نہیں کہ انھوں نے اپنے اس احساس کی کوئی توجیہ و تعلیل بھی کی ہو۔ نتائج تعبیر اور تعلیل سے نہیں بلکہ فعل صحیح سے پیدا ہوتے ہیں دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اس کے خلاف میلان پیدا کر سکے۔ وہ باوجود غیر قوموں کی ہر طرح کی علمی و تمدنی چیزیں قبول کر لینے کے ان کا سنہ قبول نہ کر سکے۔ خود بخود ان کی طبیعت کا فیصلہ یہی ہوا کہ قومی سنہ سب سے الگ اور ایسا ہونا چاہیے جس کی بنیاد اپنی تاریخ کے کسی قومی واقعے پر ہو۔ انھوں نے اپنے دفتروں کے لیے ایرانیوں اور رومیوں کی زبان لے لی، ان کے حساب و کتاب کے قواعد قبول کر لیے، ان کے حساب کی مصطلحات اور اشارات سے بھی انکار نہیں کیا، لیکن

سنہ اور تاریخ لینے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ یہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں ایک اینٹ تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ یہ اپنی ہو اور اپنے ہی ہاتھ سے رکھی جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اسلام نے جو ذہنیت ان کی پیدا کر دی تھی اسے یہی کرنا تھا۔

متاخرین کی تعلیل و توجیہ

افسوس ہے کہ صدر اول کے مسلمانوں کی تاریخ کا چہرہ، متاخرین کی نقاشیوں سے اپنے اصلی خال وخط کھو چکا ہے۔ ہر عہد کا مورخ دراصل اسی عہد کی دماغی آب و ہوا کا مخلوق ہوتا ہے اس لیے سلف کے واقعات کی تصویر کھینچتے ہوئے اسی رنگ و روغن سے کام لیتا ہے جو اس کے عہد کی آب و ہوا مہیا کر سکتی ہے۔ اسلام کی حقیقی اجتماعی زندگی کا اصلی دور صحابۂ کرام کے عہد پر ختم ہو گیا اور اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، اس دور کی معنوی خصوصیات مفقود ہوتی گئیں۔ متاخرین اہل نظر و قلم کا زمانہ آیا تو یہ وہ وقت تھا جب صدر اول کی دماغی آب و ہوا کی جگہ بالکل ایک مختلف قسم کی فضا نشوونما پا چکی تھی اس لیے ان مصنفوں نے جب اس عہد کے حالات پر قلم اٹھایا تو بجائے اس کے کہ اس عہد کا ذوق و مزاج پیدا کر کے اس کا مطالعہ کرتے، اپنے عہد کے پیدا شدہ ذوق کے رنگ میں اس کی ہر بات رنگ ڈالی۔ تاریخ ہی پر موقوف نہیں ہر گوشے تک اس معاملے کے اثرات پہنچے، حتیٰ کہ فقہ و احکام تک کا گوشہ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگر عہد صحابہ سے لے کر آخری عہد تدوین کتب کی کتابیں مسلسل موجود ہوتیں اور صدیوں کی ترتیب کے ساتھ ان پر نظر ڈالی جا سکتی تو صاف نظر آجاتا کہ صدر اول کے واقعات و معاملات بعد کے ہر عہد میں نئے نئے لباس بدلتے آئے ہیں اور ان کی تعبیر نیز الفاظ کی جزئیات میں ہر عہد کی ذہنی خصوصیات کا پرتو موجود ہے مثلاً اگر تیرہ صدیوں کی تیرہ مسلسل تاریخیں موجود ہوتیں تو تم انگلی رکھ کر بتلا سکتے کہ صدر اول کے ایک ہی واقعہ نے اپنی جزئیات و صورت میں کس طرح تیرہ مختلف لباس پہن لیے ہیں۔

ایک مثال

بطور مثال کے اسی واقعے پر نظر ڈالی جائے۔ امام شعبی کی روایت میں صاف موجود ہے "ولم یحب التاریخات القدیمہ" یعنی حضرت عمرؓ ایک تاریخ کے تعین کی ضرورت محسوس کر رہے تھے مگر پسند نہیں کرتے تھے کہ قدیم تاریخیں اختیار کریں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کی تاریخ کا اختیار کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور یہ معاملہ ان کی نظر میں ایسا تھا جس کے لیے ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی ایک قومی تاریخ قرار دی جائے لیکن بعد کے مورخین نے اپنے ذوق و میلان طبع کے مطابق اس کی توجیہیں شروع کر دیں۔ واقعے کی اصلی علت پر تو نظر نہیں گئی۔ نئے نئے معنی پہنانے لگے میں یہاں صرف دو عہدوں کی دو مختلف نظروں کا ذکر کروں گا۔

"نسی" اور "کبیسہ"

علامہ مقریزی نے نویں صدی ہجری کے اوائل میں اپنی بے نظیر تاریخ مصر لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: حضرت عمرؓ اور صحابہؓ نے ایرانی اور رومی تاریخ پسند نہیں کی، کیونکہ دونوں کے حساب میں کبیسہ تھا (یعنی دورۂ ارضی کی کسر پوری کرنے کے لیے چند سال کے بعد مہینوں کے دنوں میں کمی بیشی۔ جس طرح کہ تقویم

گریگوری میں ہر چوتھے سال ایک دن کی بیشی کر دی گئی ہے) چونکہ اسلام نے "نسی" سے روکا تھا اور کبیسہ پر "بیشی" کا شبہ ہو سکتا تھا اس لیے مناسب نہ تھا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا۔

مورخ موصوف کو یہ دور از کار دقیقہ سنجی اس لیے کرنی پڑی کہ قومی تقویم کی ضرورت و اہمیت کے لیے ان کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی اور چونکہ کوئی اور معقول تعلیل سمجھ میں نہیں آئی اس لیے ناچار "نسی" کی شرعی ممانعت کی وادی میں پہنچ گئے، حالانکہ کسی اعتبار سے بھی یہ تعلیل لائق اعتنا نہیں۔ اول تو یہ ان روایات کے خلاف ہے جو اوپر گزر چکیں کیونکہ ان میں تمام قدیم تقویموں کی ناپسندیدگی کا ذکر ہے، نہ کہ کسی خاص تقویم کا۔ ثانیاً "نسی" "مصطلحۂ جاہلیۃ" اور "کبیسہ" "مصطلحۂ حساب" قطعاً دو مختلف چیزیں ہیں۔ جس "نسی" کو اسلام نے روکا اور قرآن نے کفر کی زیادتی سے تعبیر کیا، وہ یقیناً قمری مہینوں کی طبعی ترتیب کو اس طرح درہم برہم کر دینا تھا کہ کبھی شعبان، محرم بن جاتا تھا اور کبھی رمضان ذوالحجہ قرار دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اعمال و طاعات کے معین اوقات الٹ پلٹ ہو جاتے تھے اور ان کے تقرر و تعین کی اہمیت و مصلحت باقی نہیں رہتی تھی، لیکن "کبیسہ" بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ اس کا مقصد دوسرا ہے اور اس کے اجزا کے نتائج دوسرے ہیں۔ اس کا کوئی اثر اس طرح کا مترتب نہیں ہوتا۔ وہ محض اس لیے ہے کہ سال بھر کے تین سو ساٹھ دن قرار دے دینے کے بعد جو کسر رہ جاتی ہے اسے کچھ عرصہ کے بعد پورا کر دیا جائے تاکہ زیادہ مدت گزرنے کے بعد مہینوں اور برسوں کا فرق نہ بن جائے۔ پس کسی طرح بھی یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ حضرت عمرؓ اور اکابر صحابہ "نسی" کی حقیقت سے اس درجہ بے خبر تھے کہ تقویم کے کبیسہ کو بھی "نسی" سمجھ لیتے یا انھیں کبیسہ پر "نسی" کا شبہ ہو سکتا۔

حافظ سیوطی کا نظریہ

یہ نویں صدی کی ابتدا تھی لیکن سو برس کے بعد یعنی ہزارویں صدی کے اوائل میں یہی واقعہ ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی سے تقویم و سنین کے متعلق ایک سوال کیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں انھوں نے ایک رسالہ لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اور صحابہ کرامؓ نے رومی اور ایرانی سنہ اختیار کرنے سے اس لیے اجتناب کیا کہ یہ عیسائیوں اور مجوسیوں کا سنہ تھا اور اسلام نے انھیں روک دیا تھا کہ کفار کا طور طریقہ اختیار کر کے اس کے رواج و قبولیت کا باعث نہ ہوں۔ اب غور کرو، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کجا کفار کے طور طریقے سے اجتناب کا معاملہ اور کجا یہ معاملہ جو حساب و کتاب کے ایک علمی اصول و قواعد کا معاملہ ہے۔ حافظ موصوف نے یہ تعلیل کرتے ہوئے عہد فاروقی کی آدھی تاریخ فراموش کر دی۔ اگر اس قسم کے معاملات میں غیر قوموں سے اخذ و استفادہ جائز نہ ہوتا تو حضرت عمرؓ بے شمار معاملات میں ایران و روم کے قدیم انتظامات اور تمدنی طریقوں سے فائدہ اٹھانا کیوں جائز رکھتے؟ یہ صحیح ہے کہ صحابۂ کرام کو غیر قوموں کی بہت سی باتوں سے اجتناب تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی باتوں کو روکا اور عدم اتباع و تشبہ پر زور دیا، مگر وہ باتیں دوسری ہیں، ان کا محل دوسرا ہے، اس معاملے سے اسے کیا تعلق؟

واقعۂ ہجرت کا اختصاص

اس جملہ معترضہ نے بہت طول کھینچا۔ بہر حال اس معاملہ میں پہلی بات جو قابل غور تھی، وہ قومی سنہ کا تقرر اور اس کی اہمیت کا احساس تھا۔ بغیر کسی دُور دراز توجیہ کے اختیار کیے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ اور اکابر صحابہؓ کی اس پہلو پر نظر تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ قومی زندگی کی تقویم کے لیے قومی سنہ ضروری ہے اور اس لیے چاہیے کہ یہ باہر سے نہ لیا جائے، اندر ہی طیار کیا جائے۔

اس کے بعد دوسرا اہم نقطۂ نظر واقعہ ہجرت کا اختصاص ہے۔ اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ سنہ کی ابتدا قرار دینے کے لیے جس قدر بھی سامنے کی چیزیں ہوسکتی تھیں ان میں سے کسی چیز کی طرف ان کی نگاہ نہ گئی۔ ہجرت نبوی کا واقعہ جو آغاز اسلام کی بے سروسامانیوں اور کمزوریوں کی یاد تازہ کرتا تھا اختیار کیا گیا، آخر اس کی علت کیا تھی؟

مسلمانوں کا قومی سنہ قرار دینے کے لیے قدرتی طور پر جو چیزیں سامنے کی تھیں، وہ اسلام کا ظہور تھا۔ داعی اسلام کی پیدائش تھی۔ نزول وحی کی ابتدا تھی۔ بدر کی تاریخی فتح تھی مکہ کا فتحمندانہ داخلہ تھا۔ حجۃ الوداع کا اجتماع تھا جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل و فتح کا آخری اعلان تھا، لیکن ان تمام واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی اختیار نہیں کیا گیا۔ ہجرت مدینہ کی طرف نظر گئی جو نہ تو کسی پیدائش کا جشن ہے، نہ کسی ظہور کی شوکت۔ نہ کسی جنگ کی فتح ہے، نہ کسی غلبہ و تسلط کا شادیانہ۔ بلکہ اس زمانے کی یاد تازہ کرتا ہے جب آغاز اسلام کی بے سروسامانیاں اور ناکامیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ داعی اسلام کے لیے اپنے وطن میں زندگی بسر کرنا بھی ناممکن ہوگیا تھا۔ بیچارگی اور مظلومیت کی انتہا تھی کہ اپنا وطن، اپنا گھر، اپنے عزیز واقارب اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر، صرف ایک رفیق غمگسار کے ساتھ رات کی تاریکی میں، رہ سپار دشت غربت ہوا تھا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاملات میں قدرتی طور پر دوسری قوموں کے نمونے سامنے آیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کے سامنے بھی یہ نمونے موجود تھے لیکن وہ ان کی تقلید پر آمادہ نہ ہوسکے اور انھوں نے بالکل ایک دوسری راہ اختیار کی۔

دنیا کے قومی سنین

قومی سنہ دراصل قوم کی پیدائش اور عروج و اقبال کی تاریخ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سے قومیں اپنی تاریخ کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی واقعہ یاد رکھنا چاہتی ہیں۔ اس کا دور ہر بارہ مہینے کے بعد ختم ہوتا اور از سر نو شروع ہوتا ہے۔ اس طرح سال نو کی مسرتوں کے ساتھ اس کی تاریخی روایات کی شادمانیاں بھی تازہ ہوجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جس قدر سنہ رائج ہوئے سب کی بنیاد کسی ایسے واقعے پر نظر آتی ہے، جس سے کسی قومی فتح و اقبال کا آغاز ہوا ہے۔ چونکہ اس طرح کا آغاز عموماً کسی بڑے انسان کی پیدائش سے ہوا ہے یا کسی بڑے بادشاہ کی تخت نشینی سے یا کسی بڑی جنگ کی فتح اور کسی نئی سرزمین کے قبضہ و تسلط سے۔ اس لیے دنیا کے اکثر سنوں کی ابتدا مشاہیر واکابر کی پیدائش اور تخت نشینی ہی سے ہوتی ہے۔ "بیرونی" نے "آثار الباقیہ" نامی کتاب صرف سنین و تواریخ کے موضوع پر لکھی ہے اور اس درجہ کی لکھی ہے کہ آج بھی اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی جاسکتی۔

وہ دنیا کے تمام سنین کا استقصا کر کے لکھتا ہے،

"قوموں کا طریقہ اس بارے میں یہ رہا ہے کہ بانیان حکومت و مذاہب کی پیدائش، پادشاہوں کی تخت نشینی، انبیا کی بعثت، ملکوں کی فتح و تسخیر، سلطنت کے انقلاب و انتقال اور حوادث عظیمہ ارضیہ سے تواریخ سنین کی ابتدا کیا کرتے ہیں۔"

قدیم سنوں میں بابلی، یہودی، رومی، مسیحی، ہندوستانی اور ایرانی سنین سب سے زیادہ مشہور و مستعمل رہے ہیں۔ ان سب کی ابتدا کسی ایسے ہی واقعے سے ہوتی ہے۔ بابلی سنہ کی بنیاد بخت نصر اول کی پیدائش پر رکھی گئی تھی کیونکہ اس کے ظہور سے بابل کی عظمت کا آغاز ہوا۔ یہودیوں نے پہلے مصر سے خروج کے واقعے پر سنہ کی بنیاد رکھی تھی، کیونکہ اسی واقعے سے ان کی قومی آزادی کا دور شروع ہوتا تھا اس لیے اس کی یادآوری کے جذبے نے تاریخ و سنہ کی صورت اختیار کر لی۔ رومیوں کا سب سے زیادہ مشہور سنہ اسکندری سنہ ہے جو سکندر فاتح کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے پھر آگسٹس کی پیدائش سے نیا سنہ شروع ہوا جس کی فتح مندیوں نے رومی عظمت کا نیا دور شروع کر دیا تھا مسیحی سنہ کا تو نام ہی میلادی سنہ ہے یعنی اس کی ابتدا حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کے واقعے پر رکھی ہے۔

ہندوستان میں جہاں ہر گروہ کے لیے الگ الگ زبان اور الگ الگ پیشہ قرار دیا گیا تھا وہاں مختلف حلقوں کے لیے مختلف سنہ بھی قرار پا گئے تھے۔ جوتشیوں نے اپنے حساب کے لیے خاص جوتشی سنہ قرار دیا تھا۔ عوام اپنی یادداشت کے لیے ایک الگ سنہ رکھتے تھے۔ حکومتوں اور پادشاہوں کے سنہ ان کے لیے مخصوص تھے مگر ان سب کی بنیاد کسی نہ کسی ایسے ہی واقعے پر تھی۔ آخری سنہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا اور آج تک مستعمل ہے، بکرماجیتی سنہ ہے اور یہ راجا بکرماجیت کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ ایرانیوں میں بھی جس قدر سنہ رائج ہوئے، سب کی ابتدا پیدائش، تخت نشینی اور کسی ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں انتقالِ حکومت کا واقعہ ہے۔ اس رسم کی کہ ہر پادشاہ پچھلا سنہ منسوخ کر کے اپنی تخت نشینی کا نیا سنہ جاری کرے اور اسے سنہ جلوس کہا جائے، ایرانیوں نے ہی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں اور ایرانیوں میں جب جنگ ہوئی ہے تو ایران کا سرکاری سنہ یزدگرد آخری فرمانروا ایران کا سنہ جلوس تھا۔

حضرت عمرؓ کا تردد

ان روایات سے جو پچھلی تحریر میں درج ہو چکی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی ابتدا میں یہی خیال ہوا تھا کہ آنحضرت (صلعم) کی پیدائش یا بعثت کے وقت سے سنہ کی ابتدا کی جائے۔ سعید بن مسیب اور یعقوبی کی روایت میں ہے کہ آپ نے جب حضرت علیؓ سے مشورہ کیا تو ان کی رائے یہ ہوئی کہ واقعۂ ہجرت سے ابتدا کرنی چاہیے۔ یہ بات آپ کے دل میں اتر گئی اور صحابہ بھی اس سے متفق ہو گئے۔ ابن مہران کی روایت میں ہے کہ مبدأ تاریخ کے بارے میں حسب معمول صحابہ سے مشورہ کیا تھا۔ مختلف

رائیں لوگوں نے دیں۔ بالآخر سب اس پر متفق ہو گئے کہ واقعۂ ہجرت سے ابتدا کی جائے فاتفقوا علی ان یکون المبدء من الھجرۃ۔ ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے پر اچھی طرح غور و فکر کیا گیا تھا اور ہر طرح کی رائیں ظاہر ہوئی تھیں چونکہ سامنے کی صاف بات یہی تھی کہ آنحضرتؐ کی ولادت یا بعثت سے تاریخ شروع کی جائے، جو ظہور اسلام کی اصل بنیاد ہے اس لیے حضرت عمرؓ کا خیال ابتدا میں اسی طرف گیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کوئی بات اس میں ایسی تھی کہ آپ کی طبیعت کو اس پر انشراح نہیں ہوتا تھا، متردد تھے۔ بات قرینہ کی تھی لیکن دل میں بیٹھی نہ تھی۔ بالآخر مزید مشورہ کیا اور حضرت علی علیہ السلام نے رائے دی کہ واقعۂ ہجرت سے ابتدا کرنی چاہیے۔ یہ رائے اتنی ہنر اور جچی تلی تھی کہ فوراً حضرت عمرؓ کے دل میں اتر گئی اور تمام اکابر صحابہ بھی اس پر متفق ہو گئے۔ گویا ایک بھولی ہوئی بات تھی جو سب کے حافظہ میں تازہ ہو گئی۔ اب معلوم کرنا چاہیے کہ واقعہ ہجرت کی وہ کون سی مناسبت تھی جس نے حضرت علیؓ کو جو کہ مدینۂ علم نبوت کے باب اور حکمت و سنت رسالت کے محرم اسرار تھے، اس طرف توجہ دلائی؟ اور وہ کون سی ایسی مشہور و معلوم خصوصیت تھی، جس کی وجہ سے اتنی دور کی بات تمام اکابر صحابہ کے فہم میں فوراً در آئی اور اس طرح تسلیم کر لی گئی، جیسے ایک مسلّم اور طے شدہ بات ہو؟

باب ۳۱

ہجرت اور سنہ ہجری کا آغاز

(۳)

صحابہ کا مقام ہاں، آج ہمارے لیے کہ اسلام کے صدر اول کا دماغ اور روح دونوں کھو چکے ہیں، یہ بات کتنی ہی تعجب انگیز ہو، مگر صحابہ کرام کے لیے جو اسلام کے بخشے ہوئے دل اور اس کے بنائے ہوئے دماغ، دونوں کے مالک تھے۔ یہ بات اتنی صاف، اتنی کھلی ہوئی اور اس طرح جانی بوجھی ہوئی تھی کہ اس کی طرف صرف ایک اشارہ ہی کر دینا کافی تھا۔ داعی اسلام کے تزکیہ و تربیت اور درس کتاب وحکمت نے ان کے اندر ایک ایسا صالح مزاج پیدا کر دیا تھا کہ کوئی بات خواہ کتنی ہی سامنے کی اور مقبول و معمول کیوں نہ ہو لیکن اگر حقیقت اور دانائی کی گہرائیوں سے ذرا بھی ہٹی ہوئی تھی تو فوراً ان کی طبیعت میں کھٹک پیدا ہو جاتی تھی۔ پھر جتنی تھی تو اس وقت جب اصلی اور کامل چیز سامنے آجاتی تھی۔ تم نے ان کے علم اور دانائی کی گہرائیاں بھلادی ہیں، حالانکہ صرف ان کے دل ہی زیادہ نیک نہ تھے بلکہ ان کی دانائی وحکمت بھی سب سے گہری تھی جیسا کہ خود انھی میں سے ایک حقیقت شناس انسان نے کہا تھا: اولٰئك اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ كانوا افضل هذه الامة، ابرها قلوبًا، واعمقها علمًا، واقلها تكلفا، اختارهم الله بصحبة نبيه ولاقامة دينه (عن عبد الله ابن مسعود۔ رواه الدارمی) (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی امت میں سب سے افضل تھے، ان کے دل سب سے زیادہ پاک، ان کا علم سب سے زیادہ گہرا، وہ تکلفات میں سب سے کم، اللہ نے انھیں اپنے نبی پاک کی صحبت کے لیے اور اقامت دین کے لیے چنا تھا)

واقعۂ ہجرت کی اہمیت اس بارے میں قوموں کا طریقہ ان کے سامنے آیا اور خود انھیں بھی یہ بات صاف دکھائی دی کہ داعی اسلام کی پیدائش یا بعثت کو اپنی قومی تاریخ کی بنیاد ٹھہرائیں لیکن چونکہ یہ بات اس معیار نظر سے ہٹی ہوئی تھی جو اس طرح کے معاملات میں اسلام نے قائم کیا تھا، اس لیے نہایت واضح اور نمایاں ہونے پر بھی ان کی طبیعت کو مطمئن نہ کر سکی۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ کوئی دوسری بات ہونی چاہیے۔ وہ دوسری بات کیا تھی؛ ہجرت مدینہ کا واقعہ۔ جونہی یہ بات سامنے آئی، سب کے دلوں نے قبول کر لی۔ تاریخ کا یہ مبدء دنیا کی تمام تاریخوں اور یادگاروں کے خلاف تھا۔ صرف خلاف ہی نہ تھا، بلکہ صریح الٹا تھا۔ دنیا کی تمام قومیں فتح و اقبال سے اپنی تاریخ شروع کرتی ہیں۔ انھوں نے بیچارگی اور درماندگی سے اپنی تاریخ شروع کی۔ دنیا کی تمام قوموں نے چاہا اپنے ظہور کی سب سے بڑی فتح یاد رکھیں۔ انھوں نے چاہا اپنی تاریخ ظہور کی سب سے بڑی بے سروسامانی یاد رکھیں۔ دنیا کی تمام قوموں کا فیصلہ

یہ ہے کہ ان کی قومی تاریخ اس وقت سے شروع ہو، جب ان کی تاریخ کا سب سے بڑا انسان پیدا ہوا اور اس نے جنگ و قتال کے میدانوں میں فتح حاصل کی، لیکن ان کا فیصلہ یہ تھا کہ قومی تاریخ کی ابتدا اس دن سے ہو، جب سب سے بڑے انسان کی نہیں بلکہ سب سے بڑے عمل کی پیدائش ہوئی اور جنگ کے میدانوں میں نہیں بلکہ صبر و استقامت کے میدانوں میں فتح حاصل ہوئی۔ دنیا کی تمام قوموں کا یقین تھا کہ ان کی طاقت و شوکت کی بنیاد اس وقت پڑی جب انھوں نے ملکوں اور سلطنتوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کا یقین یہ تھا کہ طاقت و شوکت کا دروازہ اس دن کھلا، جب ملکوں پر انھوں نے قبضہ نہیں کیا بلکہ اپنا ملک و وطن بھی ترک کر دیا۔ بلاشبہ ان کی یہ سمجھ دنیا کی ساری قوموں سے الٹی تھی، لیکن اس سمجھ سے عین مطابق تھی جو اسلام کی تربیت نے ان کے اندر پیدا کر دی تھی، وہ اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر قوموں کی تقلید سے نہیں بلکہ اسلام کی روح فکر و عمل سے کرنی چاہتے تھے۔

مصیبت یہ ہے کہ دنیا معنی سے زیادہ لفظ کی اور روح سے زیادہ جسم کی پرستار ہے۔ وہ پھل ڈھونڈتی ہے لیکن تخم کی جستجو نہیں کرتی۔ وہ منارہ و محراب کی بلندیاں اور خوشنمائیاں دیکھتی ہے لیکن زیر زمین بنیادوں کے لیے نگاہ نہیں رکھتی۔ صحابہ کرام نے جب پیدائش و بعثت کے واقعات عظیمہ ترک کر کے ہجرت کا واقعہ انتخاب کیا تو ان کی نظر بھی پیدائش و ظہور، فتح و اقبال اور جشن و کامرانی ہی پر تھی۔ وہ کچھ ناکامی و نامرادی کے طلبگار نہ تھے، البتہ وہ فتح و اقبال کی صورت اور برگ و بار نہیں دیکھتے تھے۔ حقیقت اور تخم و اساس پر نظر رکھتے تھے۔ ان پر یہ حقیقت کھل چکی تھی کہ اسلام کی پیدائش و ظہور اور فتح و اقبال کی اصلی بنیاد ان واقعات میں نہیں جو بظاہر نظر آتے ہیں، ہجرت مدینہ اور اس کے اعمال و حقائق میں ہے اس لیے جو اہمیت دنیا کی نگاہیں پیدائش، بعثت، بدر اور فتح مکہ کو دیتی تھیں، وہ ان کی نظروں میں ہجرت مدینہ کو حاصل تھی۔

ہجرت مدینہ کی حقیقت

لیکن واقعۂ ہجرت کیا تھا؟ وہ ایک ہی واقعہ نہ تھا بے شمار اعمال و وقائع کا مجموعہ تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی حقیقت پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے۔ ایک عہد، مکہ کی زندگی اور اعمال کا ہے۔ دوسرا مدینہ کے قیام اور اعمال کا۔ پہلا آنحضرت صلعم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے اس کی ابتدا غار حرا کے اعتکاف سے ہوتی ہے اور تکمیل غار ثور کے انزوا پر۔ دوسرا ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور و اقبال کا اصلی دور، دوسرا دور تھا کیونکہ اسی دور میں اسلام کی پہلی ربت ختم ہوئی اور ظاہری طاقت و حشمت کا سر و سامان شروع ہوا۔ بدر کی جنگی فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی۔ مکہ کی فتح، عرب کی فتح کا اعلان عام تھی لیکن خود اسلام کی نظروں میں اس کی زندگی کا اصلی دور، دوسرا دور نہیں، پہلا تھا۔

وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں دوسرے میں نہیں پہلے دور میں استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا، لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے، ان کی طاقتیں کس میدان میں طیار ہوئی تھیں؟ بلاشبہ مکہ کی فتح، عرب کی فیصلہ کن فتح تھی، لیکن اگر مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کی فتح کی راہ کیونکر کھلتی؟ یہ سچ ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور اس کے دور کے اعمال سے فتح ہوا تھا۔ پس دوسرے دور میں جسم کتنا ہی طاقتور ہو گیا ہو، لیکن اس کی روح پہلے ہی دور میں ڈھونڈنی چاہیے۔

پہلا دور تخم تھا، دوسرا اس کے برگ و بار تھے۔ پہلا دور بنیاد تھی، دوسرا ستون و محراب تھا۔ پہلا نشو و نما کا عہد تھا، دوسرا ظہور و انفجار کا۔ پہلا معنی و حقیقت تھا، دوسرا صورت و اظہار۔ پہلا روح تھا، دوسرا جسم۔ پہلے نے پیدا کیا، درست کیا اور مستعد کر دیا، دوسرے نے قدم اٹھایا، آگے بڑھایا اور فتح و تسخیر کا اعلان کر دیا۔ دوسرے کا ظہور کتنا ہی شاندار ہو لیکن اولین بنیاد و استعداد کی عظمت پہلے ہی کو حاصل ہے۔

استعداد داخلی و خارجی

وجود اور زندگی کے ہر گوشے کے لیے خدا کا قانونِ وجود ایک ہی ہے۔ تم اس کے کتنے ہی مختلف نام رکھ دو، مگر وہ خود ایک سے زیادہ نہیں۔ اب ایک لمحے کے لیے ٹھہرو اور غور کرو کہ تخلیق و تکمیل وجود کے لیے خدا کا قانونِ حیات کیا ہے؟

فرد کی طرح جماعت کا بھی وجود ہے۔ عالم صورت کی طرح عالم معنی بھی اپنی ہستی رکھتا ہے، لیکن کوئی چیز ہو تخلیق و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ یکے بعد دیگرے دو مختلف دوروں سے گزرے۔ پہلا دور "استعداد داخلی" کا ہے، دوسرا "استعداد خارجی" کا۔ ضروری ہے کہ پہلے اندر کی استعداد وجود میں آئے اور ضروری ہے کہ اندر کی استعداد کی تکمیل کے ساتھ ہی باہر کی استعداد بھی اس کے اندر پیدا ہو جائے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لیے مثال کی ضرورت ہے۔ خدا کی رحمت و ربوبیت نے تمام کائنات ہستی کو بخشش کا خزانہ اور فیضانِ عام کی بارش بنا رکھا ہے۔ زندگی اور وجود کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان میں سے ہر چیز موجود ہے اور اس کی موجودگی صرف اس لیے ہے تاکہ استعداد کو ڈھونڈے، صلاحیت کو پا لے اور انفعال کو فعل سے اور انجذاب کو جذب سے مالا مال کر دے۔ سورج روز آسمان پر چمکتا ہے ستارے ہمیشہ زمین کی طرف جھانکتے ہیں۔ ہوائیں یکساں گرم جوشی سے چلتی ہیں۔ بادلوں کی رفتار میں کبھی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ سورج کی کرنیں سمندروں کو کھینچنے اور پانی کے ذخیرے جمع کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتیں۔ زمین کی سطح اپنے سارے خزانے لیے ہوئے موجود ہے۔ خاک کے ذروں میں سے ہر ذرہ اپنا خاصہ اور اپنی تاثیر رکھتا ہے۔ موسموں کی تبدیلی اور لیل و نہار کی گردش بھی اپنے مقصد اور حکمت سے باہر نہیں۔

یہ اور اسی طرح کی تمام ان گنت اور بے حد و حساب چیزیں،

وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها۔ (ابراہیم ۳۳)   اور اگر تم خدا کی نعمتیں اور بخشائشیں شمار کرنی چاہو تو وہ اتنی

ہیں کہ کبھی تمہارا اندازہ احاطہ نہیں کرسکتا۔

قوتوں کا خزانہ اور بخششوں اور ربوبیتوں کا فیضان عام ہیں اور اپنی مجموعی صورت میں کائنات ہستی کی وہ "خارجی استعداد" ہے جو وجود کے لیے خلق و تسویہ کا سامان مہیا کرتی اور ہمیشہ اس کے انتظار میں چشم براہ رہتی ہے۔ لیکن خارج کی اس استعداد سے صرف وہی اشیا فائدہ اٹھا سکتی اور اپنے حصے کی بخشش پا سکتی ہیں، جن کے اندر خود ان کے "اندر کی استعداد" وجود میں آگئی ہے یہ اندرونی استعداد باہر کے کارخانہ استعداد کی تاثیر کے لیے بمنزلہ انفعال ہے۔ جب تک انفعال کا لب سوال وا نہ ہوگا، فعل و تاثیر کا جواب فیضان، حرکت میں نہیں آسکتا۔

بیج کی مثال دہقان ایک بیج اٹھاتا ہے اور زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب دیکھو، اس بیج کے بار آور ہونے کے لیے قدرت الٰہی نے کس طرح اپنا تمام کارخانہ ہستی مہیا کر دیا ہے۔ سورج منتظر ہے کہ اپنی گرمی اس کے لیے وقف کر دے۔ بادل طیار ہے کہ اپنے ذخیروں کا منہ کھول دے۔ زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لیے وا کر دے، لیکن اس تمام کارخانۂ بخشش سے وہ جبھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جب کہ خود اس کے اندر کی استعداد صحیح و صالح ہو۔ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ تمام کارخانۂ بخشش و نوال اس کے لیے بیکار رہو گیا۔ سورج اپنا دہکتا ہوا تنور رکھنے پر بھی اسے گرم نہ کر سکے گا۔ بادل اگر اپنا تمام ذخیرہ آب ختم کر ڈالے جب بھی اسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔

پھر ایک صالح بیج جب زمین میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے، تو اس کے اندر کی استعداد ظاہر ہوتی ہے اور اندر ہی اندر پکنے اور بڑھنے لگتی ہے۔ اس وقت وہ ایک چھوٹا سا وجود ہوتا ہے جس کے اندر باریک ذرّوں اور ریشوں کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی لیکن انھیں ذرّوں اور ریشوں کے اندر اس کی آنے والی ہستی کی ساری بڑائیاں اور عظمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ حتّٰی کہ کہا جا سکتا ہے ایک عظیم اور تناور درخت کی ساری ٹہنیاں اور پتّے اور اس کے ہزاروں پھول اور پھل انھیں ذرّوں اور باریک ریشوں کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ وہ بتدریج نشو و نما پاتا ہے اور یکے بعد دیگرے تخلیق و تسویہ کے مختلف درجوں سے گزرتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ ہو چکتا ہے تو وہ وقت آ جاتا ہے جب زمین کی سطح چاک ہوتی ہے اور اس کی پہلی شاخ باہر نکلتی ہے چنانچہ وہ ابھرتا ہے اور کائنات فطرت کے جس کارخانۂ فیضان سے زمین کے اندر اکتساب فیض کر رہا تھا، اب اس سے زمین کی سطح پر بخشش و نوال حاصل کرنے لگتا ہے۔ اس وقت تم دیکھتے ہو کہ عالم نباتات کا یہ جوان نوخاستہ سرو قد کھڑا ہے اور کارخانۂ فطرت کے ہر سامان سے زندگی اور قوت کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اب تم اس کی ہستی کا اعتراف کرتے ہو لیکن تم بھول جاتے ہو کہ باہر کی استعداد اس کے لیے جو کچھ بہم پہنچا رہی ہے یہ دراصل اسی استعداد کا جواب اور نتیجہ ہے جو زمین کے اندر اس کی داخلی طبیعت نے پیدا کر لی تھی۔

عالم حیوانات کی مثال عالم حیوانات میں دیکھو تو یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ حیوان اور انسان کا جو وجود عالم ہستی میں قدم رکھتا ہے اور بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی منزلیں طے کرتا ہے

دراصل یہ وہی وجود ہے جو پہلے خود اپنی ہستی کے اندر تخلیق و تکمیل کی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اگر اس کی داخلی استعداد کا دور، صحت اور قوت کے ساتھ ختم نہ ہوتا تو اس کی خارجی استعداد کا یہ دور، وجود ہی میں نہ آتا۔ وہ پہلے شکم مادر میں جنین کا ابتدائی مادہ تھا پھر اندر ہی اندر بڑھنے اور پھیلنے لگا۔ تدریج تخلیق و تسویہ کی مختلف منزلیں وجود میں آئیں۔ پہلے چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جنھوں نے ایک جونک کی سی شکل اختیار کر لی۔ پھر یہ جونک بڑھتے بڑھتے گوشت کا ایک لوتھڑا بن گئی۔ لوتھڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچا بننا شروع ہوا اور ڈھانچے پر گوشت پوست کا غلاف چڑھ گیا۔ پھر گوشت اور ہڈیوں کا یہ مجموعہ نظم و تناسب کے ایک ایسے سانچے میں ڈھل گیا کہ شکل و ہیئت کی تمام باریکیاں اور خال و خط کی ساری دلآویزیاں مکمل ہوگئیں پھر جب اندر ہی اندر تکمیل و تسویہ کے یہ تمام مراتب طے ہوگئے تو یہ وجود اس قابل ہوا کہ شکم مادر سے باہر قدم نکالے اور تم نے دیکھا کہ خلقت اور ہستی کا ایک زندہ اور مستعد وجود تمہارے سامنے ہے، ثم انشانٰہ خلقاً آخر، فتبارك الله احسن الخالقین[1] (مومنون ۱۴)

بہرحال دنیا میں ہر چیز کی تخلیق و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کارخانۂ فیضان فطرت سے اکتساب فیض کی صحیح استعداد پیدا ہو اور اس استعداد کے ظہور کا پہلا محل اندرونی ہے، دوسرا بیرونی۔ جب تک کوئی چیز اپنے اس پہلے دور میں صحیح استعداد پیدا نہیں کرے گی، دوسرے دور کی استعداد پیدا نہیں کر سکتی۔ خارج کے نشوونما کے لیے داخل کا نشوونما، بمنزلہ سبب و علت ہے۔ جب تک سبب موجود نہ ہوگا، نتائج ظہور میں نہیں آئیں گے۔

جماعت کی داخلی استعداد

فرد اور جماعت دونوں کا ایک ہی حال ہے۔ یہ افراد و اشیا کی مثالیں تھیں۔ انھی کو جماعتوں اور قوموں پر بھی منطبق کرو۔ اشیا و افراد کی طرح "جماعت" بھی پیدا ہوا کرتی ہے اس کی تخلیق، نشوونما اور ترقی و تکمیل کے لیے بھی بعینہٖ وہی قوانین ہیں، جو اشیا و افراد کے لیے ہیں، جس طرح فطرت الٰہی کی ربوبیت نے مخلوقات کی زندگی اور نشوونما کے لیے اپنی بخششوں کے بادل زمین پر پھیلا دیے ہیں۔ ہر شے زندگی دینے والی، ہر شے پرورش کرنے والی اور ہر شے وجود و کمال تک لے جانے والی ہے ٹھیک اسی طرح "جماعت" اور "امت" کے ظہور و نشو کے لیے بھی ہر طرح کی بخششوں اور ہر طرح کی فیض رسانیوں کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ ربوبیت اس کے ظہور کا انتظار کرتی اور بخشش فطرت اس کے قدم اٹھانے کی راہ تکتی ہے، لیکن جس طرح افراد و اشیا کے لیے فطرت کا تمام سامانِ فیض صرف اسی حالت میں مفید ہو سکتا ہے جب کہ خود ان کے اندر صحیح و صالح استعداد موجود ہو۔ اسی طرح "جماعت" کا مولود بھی وقت کے فیضان اور قومی و مرزبومی ماحول کی بخششوں سے اسی حالت میں فائدہ

---

[1] کس طرح اسے بالکل ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا تو کیا ہی برکتوں والی ہستی ہے اللہ کی، پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر پیدا کرنے والا۔

اٹھا سکتا ہے جب کہ خود اس کے اندر اکتساب و انفعال کی صحیح استعداد موجود ہو۔ پھر جس طرح اس استعداد کی تکمیل کا پہلا مرحلہ داخلی ہے، دوسرا خارجی۔ اسی طرح جماعتوں اور قوموں کے مزاجی استعداد کے لیے بھی پہلا مرحلہ داخلی ہے دوسرا خارجی۔ کوئی جماعت، کوئی قوم، انسان کی کوئی ہیئت اجتماعیہ کشمکش حیات کی کامیابیاں حاصل نہیں کرسکتی، اگر پہلے ایک تخم اور جنین کی طرح اپنی داخلی استعداد کی منزل طے نہیں کرلیتی۔ اس کی داخلی تخلیق و تکمیل کا بھی ایک معین وقت اور وقت کی معین مقدار ہے۔ اگر ایک جماعت وجود و کمال کا پُورا درجہ حاصل کرنا چاہتی ہے تو ناگزیر ہے کہ پہلے داخلی استعداد کی تکمیل کا وقت بسر کرلے۔ اس کے بعد خارج کے اعمال و فتوح کا دروازہ خود بخود اس پر کھل جائے گا، کیونکہ خارج کی تمام کامرانیاں اسی کی داخلی استعداد کی تکمیل کا نتیجہ و ثمرہ ہوتی ہیں۔

قرآن حکیم کی اصلاح "تزکیہ"

جس طرح اشیا و افراد کے جسم کی داخلی استعداد کا دارومدار ان کے اندر ہی اندر نشوونما پانے اور اندر ہی اندر پکنے پر ہے، اسی طرح فرد اور جماعت کی دماغی اور اخلاقی استعداد کا دارومدار ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت پر ہے جسے قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں "تزکیہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ "تزکیۂ اخلاق و نفس" سے مقصود یہ ہے کہ ایک جماعت کو بہ حیثیت ایک جماعت کے جس طرح کے ذہن و مزاج کی ضرورت ہے، وہ اس کے ایک ایک فرد کے اندر پیدا کر دیا جائے اور اس رسوخ و نفوذ کے ساتھ پیدا کر دیا جائے۔ گویا ایک آہنی سانچا ہے کہ ہر فرد کا دل و دماغ اسی میں ڈھال دیا گیا ہے جس طرح عالم اجسام میں جسم کی بہتر خلقت بہتر نشوونما جماعتی طاقت اور برتری کا باعث ہوتی ہے۔ یہی اخلاق "جماعت" کی زندگی کی اصلی استعداد ہے۔ اسی استعداد سے وہ سب کچھ پاتی ہیں اور بغیر اس استعداد کے کچھ بھی نہیں کرسکتیں۔ تزکیۂ نفس کا عمل یہی استعداد پیدا کرتا ہے۔ اس کی تولید و تکمیل، جماعتوں اور قوموں کی داخلی استعداد ہے۔

جماعتی ذہن و اخلاق

"جماعت" کی داخلی استعداد کے لیے جس ذہنی و اخلاقی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اگرچہ فرداً فرداً ہر جماعت سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا سارا زور "جماعتی ذہن و اخلاق" کی طرف ہوتا ہے یعنی وہ جماعت کے لیے ذہن و اخلاق کا ایک خاص مزاج پیدا کر دینا چاہتی ہے چونکہ یہ مزاج پیدا نہیں ہوسکتا، جب تک جماعت کا ہر فرد اپنا انفرادی ذہن و اخلاق معدوم کرکے جماعتی مزاج پیدا نہ کرلے، اس لیے وہ ذہن و عمل کا ایک خاص سانچا ڈھال لیتی ہے پھر تمام افراد کا ذہن و اخلاق اسی میں ڈھالنا شروع کر دیتی ہے یہاں تک کہ تمام افراد کی ذہنی و اخلاقی خصوصیات ایک ہی انداز اور روش کی ہو جاتی ہیں اور اپنے بے شمار انفرادی اختلافات رکھنے پر بھی ذہن و اخلاق کی طبیعت میں یک قلم تماثل اور تشابہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی خواہشیں یکساں نہیں ہوسکتیں اور یکساں نہیں ہوتیں۔ ان کی طبیعتوں کی عام روش ایک طرح کی نہیں ہوسکتی اور ایک طرح کی نہیں ہو جاتی۔ وہ اپنی سمجھ میں، اپنی رائے میں، اپنی زندگی و معیشت کے تمام معاملات میں ایک نہیں ہو جا سکتے اور ایک نہیں ہو جاتے

لیکن وہ ذہن وعمل کی ان ساری باتوں میں جو جماعتی زندگی کی بنیادیں اور اخلاق و سیرت کی فضیلت کا معیار ہیں، اس طرح یکساں اور یک نگاہ و عمل ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، سب کے اندر ایک ہی دماغ کام کر رہا ہے اور سب کے اندر ایک ہی روح بول رہی ہے۔

یہ موقع نہیں ہے کہ اطناب سے کام لیا جائے، ورنہ ضرورت تھی کہ ان اخلاق وخصائص میں سے ایک ایک چیز کی شرح و تفصیل کی جاتی اور واضح کیا جاتا کہ قرآن و سنت نے جماعتی طبیعت کے کیا کیا بنیادی اوصاف بتلائے ہیں اور اس کی داخلی استعداد کے ارکان و مبانی کیا کیا ہیں۔

بہرحال اشیا و افراد کی طرح جماعات و اقوام میں بھی زندگی کی اصلی سرچشمگی ان کی داخلی استعداد میں پنہاں ہوتی ہے نہ کہ خارجی اعمال میں۔ کیونکہ خارج کے اعمال اس سے زیادہ نہیں ہیں کہ داخلی استعداد کے لازمی نتائج و ثمرات ہیں۔

داخلی استعداد کا دور

ظہور اسلام کا پہلا دور جو بعثت سے شروع ہو کر ہجرت پر ختم ہوا اور جس کا نقطۂ تکمیل ہجرت کا معاملہ تھا، دراصل جماعت کی داخلی استعداد کا دور تھا اور اس لیے ظہور اسلام کی تمام فتح مندیوں اور کامرانیوں کا مبدء یہی دور تھا، نہ کہ مدنی زندگی کا دوسرا دور۔ بلاشبہ دنیا کی ظاہر بین نگاہوں میں یہ مصیبتوں کا دور اور بے چارگیوں اور درماندگیوں کا تسلسل تھا لیکن بباطن امت مسلمہ کی ہر آنے والی فتحمندی اسی کی مصیبتوں اور کلفتوں کے اندر نشوونما پا رہی تھی۔ یہی مصیبتیں تھیں جو "جماعت" کے ذہن واخلاق کے لیے تعلیم و تربیت کا مدرسہ اور تزکیہ نفوس و ارواح کی امتحان گاہ تھیں۔ بدر کے فتح مند اسی کے اندر سبق لے رہے تھے۔ فتح مکہ کے کامران اسی کے اندر بن اور ڈھل رہے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یرموک اور قادسیہ کی پیدائش بھی اسی کی آزمائشوں اور خود فروشیوں میں ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس جہاد کو تو صرف جہاد کہا جو مدنی زندگی میں اسلحۂ جنگ سے کرنا پڑا تھا، لیکن نفس واخلاق کے تزکیہ و تربیت کا جو جہاد اس سے پہلے دور میں ہو رہا تھا اسے "جہاد کبیر" سے تعبیر کیا کیونکہ فی الحقیقت بڑا جہاد یہی جہاد تھا: فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھاداً کبیراً۔ فرقان: ۵۲ [۱]

بالاتفاق سورہ فرقان مکی ہے۔ مکی زندگی میں جس بڑے جہاد کا حکم دیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ وہ قتال کا جہاد نہ تھا، صبر و استقامت اور عزم و ثبات کا جہاد تھا اور انہی اوصاف میں جماعت کی داخلی استعداد کی اصلی بنیادیں تھیں۔

تکمیل کار کا اعلان

ہجرت کا واقعہ اس دور کی مصیبتوں کی انتہا تھا، اس لیے اس کی برکتوں اور سعادتوں کی بھی آخری تکمیل تھا۔ صحابۂ کرام اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے اور کیونکر بے خبر ہو سکتے تھے

---

[۱] سو منکروں کی بات نہ مان اور ان سے جہاد کر اس کے (قرآن) کے ساتھ بڑا جہاد۔

جب کہ ان کی دماغی تربیت کی اصلی رُوح اسی معاملہ میں مضمر تھی؛ پس جب یہ سوال سامنے آیا کہ اسلامی سنہ کی ابتدا کس واقعے سے کی جائے، تو انھیں کسی ایسے واقعہ کی جستجو ہوئی جو امت کے قیام و اقبال کا اصلی سرچشمہ ہو۔ آنحضرت صلعم کی پیدایش کا واقعہ یقیناً سب سے بڑا واقعہ تھا لیکن اس کے تذکار میں شخصیت سامنے آتی تھی شخصیت کا عمل سامنے نہیں آتا تھا۔ بعثت کا واقعہ بھی سب سے بڑا واقعہ تھا لیکن وہ معاملہ کی ابتدا تھی، انتہا و تکمیل نہ تھی۔ بدر کی جنگ اور مکہ کی فتح عظیم واقعات تھے لیکن وہ اسلام کی فتح و اقبال کی بنیاد نہ تھے۔ کسی دوسری بنیاد کے نتائج و ثمرات تھے۔ یہ تمام واقعات ان کے سامنے آئے، لیکن ان میں سے کسی پر بھی طبیعتیں مطمئن نہ ہو سکیں۔

بالآخر جب ہجرت کا واقعہ سامنے آگیا، تو سب کے دلوں نے قبول کر لیا، کیونکہ انھیں یاد آگیا، اسلام کے ظہور و عروج کا مبداء حقیقی اسی واقعہ میں پوشیدہ ہے اور اس لیے یہی واقعہ ہے جسے اسلامی تاریخ کا مبدءُ بننا چاہیے۔

مدینہ کی فتح

پھر یہ حقیقت کسی درجہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ظہور اسلام کی تمام فتح مندیوں میں سب سے پہلی فتح مدینہ کی فتح تھی اور اس کی تکمیل ہجرت ہی کے واقعہ سے ہوئی تھی۔ مدینہ کے ساتھ "فتح" کا لفظ سن کر تعجب ہُوا ہوگا کیونکہ تم صرف اسی فتح کے شناسا ہو جو جنگ کے میدانوں میں حاصل کی جاتی ہے، لیکن تمھیں معلوم نہیں کہ میدان جنگ کی فتح سے بھی بڑھ کر دلوں کی آبادیوں اور روحوں کی اقلیموں کی فتح ہے اور اسی فتح سے میدان جنگ کی فتح مندیاں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ عین اس وقت جب کہ اسلام کا داعی اپنے وطن اور اہل وطن کی شقاوتوں سے مایوس ہو گیا تھا، باشندگان یثرب کی ایک جماعت پہنچتی ہے اور رات کی تاریکی میں پوشیدہ ہو کر اپنی روح کا ایمان اور دل کی اطاعت پیش کرتی ہے۔ اس وقت دنیوی جاہ و جلال کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ سیف و سنان کی ہیبت و جبروت کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سرتا سر غربت اولیٰ کی بے سرو سامانیاں اور عہد مصائب و محن کی درماندگیاں ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ یثرب کی پُوری آبادی اس کے سامنے جھک جاتی ہے اور ایمان کے ایسے جوش اور عشق و اطاعت کی ایسی خود فروشیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے طیار ہو جاتی ہے جو تاریخ عالم کے کسی بڑے سے بڑے فاتح اور شہنشاہ کو بھی میسر نہ آئی ہوگی۔

دلوں اور روحوں کی اس فتح و تسخیر سے بڑھ کر بھی اور کوئی فتح ہو سکتی تھی؛ لیکن یہ فتح کیونکر ہُوئی؟ دور ہجرت کے آلام و محن میں اس کا آغاز ہُوا اور ہجرت نے اس فتح کی تکمیل کر دی۔

واقعۂ ہجرت اور فتح و نصرت الٰہی

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے واقعہ ہجرت کا ذکر اس طریقہ پر کیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بے سرو سامانی و غربت کے اس عمل ہی میں فتح و نصرت الٰہی کی سب سے بڑی معنویت پوشیدہ تھی؛

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ، إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا، وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔

(توبہ: ۴۰)

غار کے دو ساتھیوں میں سے جب ایک نے دوسرے سے کہا: غم و رنج نہ کرو یقیناً خدا ہمارے ساتھ ہے اور اس کی مشیت و حکمت ہمارے لیے فتح و نصرت کی راہ باز کرنے والی ہے پھر ایسا ہوا کہ خدا نے اپنی تسکین و طمانیت اس پر اتاری اور فتح و نصرت کے ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنھیں دنیا کی ظاہر بیں اور حقیقت ناآشنا آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان سرکشوں کی بات جو انکار کرتے تھے، ہمیشہ کے لیے پست ہو گئی اور کلمہ حق کو سربلندی اور کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ آیت سورہ براۃ کی ہے۔ سورہ براۃ بالاتفاق اس وقت نازل ہوئی جب اسلام کی ظاہری فتح مندیاں تکمیل تک پہنچ چکی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تمام فتح مندیوں کے ظہور کے بعد بھی اس کی ضرورت باقی تھی کہ واقعۂ ہجرت کی معنوی فتح مندی یاد دلائی جائے۔

باب ۳۲

قبا سے مدینہ منورہ

قبا میں ورود

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، رسول اللہ ۸۔ ربیع الاول ۱۳ھ نبوی (۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) کو بعد دوپہر قبا پہنچے اور ایک درخت کے سایے میں تشریف فرما ہوئے۔ انصار دوپہر تک انتظار کر کے واپس جا چکے تھے۔ ایک یہودی اپنے قلعے پر چڑھا تو مرکب مبارک کو دیکھ کر قرائن سے پہچان لیا۔ ساتھ ہی پکار کر کہا کہ اے اہل عرب! تمہیں جس ذی شان ہستی کا انتظار تھا وہ آ گئی۔ یہ سنتے ہی انصار بے تابانہ گھروں سے نکل پڑے۔ باقی بستیوں اور آبادیوں میں بھی خبر پہنچ گئی ہو گی۔ ہر فرد کی زبان پر تھا، "رسول اللہ (صلعم) تشریف لے آئے!" "محمد (صلعم) تشریف لے آئے"۔ یہ کلمات بار بار دہرائے جاتے تھے۔ بے شک و شبہ پوری آبادی کی طبعی کیفیت یہی ہو گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورود مبارک سے بڑا واقعہ اور کیا ہو سکتا تھا؟

صدیق رضؓ کا انداز تعارف

جو انصار سب سے پہلے آپ کی خدمت سے مشرف ہوئے تھے، ان میں سے غالباً کوئی بھی نہ تھا جس کی آنکھیں اس وقت تک آپ کے جمال جہاں افروز سے منور ہو چکی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے انھیں رسول اللہ صلعم کو پہچاننے میں پریشانی سے سابقہ پڑا۔ ادب کا تقاضا یہ نہ تھا کہ علی الاعلان پوچھتے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف بار بار سب کی نظریں اٹھتی تھیں۔ اگرچہ وہ رسول اللہ صلعم سے دو سال چھوٹے تھے، مگر جسم کے نحیف اور ضعیف تھے اور ان کے بال بھی زیادہ سفید ہو گئے تھے۔ گویا بظاہر سن رسیدہ نظر آتے تھے۔ صدیقؓ نے یہ کیفیت بھانپ لی۔ اس وقت تک دھوپ حضور صلعم کے فرق مبارک کے قریب پہنچ چکی تھی۔ جاں نثار صدیقؓ فوراً اٹھے اور آپ پر اپنی چادر کا سایہ کر دیا۔ تعارف کی یہ نہایت ادب پرور مگر نہایت پیاری اور دل آویز ادا تھی، جس سے سب پر آشکارا ہو گیا کہ مقصود کا گوہر شب چراغ کون ہے۔

قیام مبارک

رسول اللہ صلعم قبا میں کلثوم بن الہدمؓ[1] کے ہاں فروکش ہوئے، جو بنی عمرو بن عوف میں سے تھے۔ مہاجرین کی خاصی تعداد وہیں ٹھہری ہوئی تھی مثلاً ابوعبیدہ، مقداد، خباب، صفوان، عیاض، عبداللہ بن مخرمہ، وھب بن سعد، معمر بن ابی سرح، عمیر بن عوف (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپؐ سعدؓ بن خیثمہ

---

[1] کلثوم بن الہدم بہت سن رسیدہ تھے۔ رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری سے تھوڑا عرصہ بعد وفات پائی۔

کے ہاں اترے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کا قیام تو کلثومؓ بن الہدم ہی کے ہاں تھا، مگر ملاقاتیوں کی سہولت کے خیال سے آپؐ نے سعدؓ بن خیثمہ کے مکان کو بیٹھک تجویز فرما لیا تھا کیونکہ سعدؓ کی شادی نہیں ہوئی تھی اور مہاجرین میں سے بن بیاہے اسی مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے ان کے مکان کو "بیت العزابؐ" کہا جاتا تھا یعنی بن بیاہوں کا بیان۔

حضرت علیؓ حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلعم کے بعد تین روز مکہ مکرمہ میں گزارے۔ جس کا ذرّہ ذرّہ اس وقت اسلام و مسلمین کا دشمن ہو رہا تھا۔ حسب ارشاد حضور صلعم تمام امانتیں ایک ایک کر کے واپس کیں۔ اس فرض کی بجا آوری کے بعد وہ بھی راہ ہجرت میں گامزن ہوئے اور قبا میں پہنچ کر رسول اللہ صلعم کے ساتھ ٹھہر گئے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ قبا میں حضرت علیؓ کا قیام ایک یا دو راتیں رہا یعنی وہ رسول اللہ صلعم سے دو یا تین روز بعد قبا پہنچے۔

اسوۂ مبارکہ اب آپ اسوۂ مبارکہ پر ایک نظر بازگشت ڈال لیجیے:

۱۔ اگرچہ اہل مکہ پیام حق کی وجہ سے آپؐ کے جانی دشمن ہو رہے تھے، لیکن اکثر لوگ امانتیں آپؐ ہی کے پاس رکھتے تھے، کیونکہ جس حد تک امانت و دیانت کا تعلق ہے ان کی نگاہوں میں آپؐ سے برتر درجہ کسی کو حاصل نہ تھا۔

۲۔ جب کفار قریش نے آپؐ کے لیے مکہ مکرمہ کی فضا اس درجہ مصیبت خیز بنا دی کہ وہاں نہ محض قیام ہی ناممکن ہو گیا بلکہ آپؐ کے لیے بنفس نفیس لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کا بھی کوئی موقع نہ رہا تو آپؐ نے حضرت علیؓ کے ذمے یہ اہم کام لگا دیا۔ اس طرح واضح فرما دیا کہ امانت کی حفاظت و صیانت محض حالات کی سازگاری پر موقوف نہیں۔ انتہائی ناسازگاری میں بھی اسے بہر حال اصل مالک کے حوالے کرنا چاہیے۔

سوچیے کہ جس اقدس و اطہر وجود مبارک نے مادی امانتوں کے تعلق میں یہ درخشاں معیار قائم فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہدایت انسانوں تک پہنچانے میں کس درجہ محتاط، پاکباز اور حق کوش ہو گا۔

قبا میں مدّت قیام ارباب تاریخ و سیر نے اس موقع پر رسول اللہ صلعم کے قیام کی مدت صرف چار روز بتائی ہے آپؐ دو شنبہ کو بعد دوپہر پہنچے تھے (۸۔ ربیع الاول) سہ شنبہ، چہار شنبہ اور پنج شنبہ گزار کر جمعہ کو (۱۲۔ ربیع الاوّل ۱ھ مطابق ۲۴۔ ستمبر ۶۲۲ء) دوپہر سے قبل مستقل قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

صحیح بخاری میں قیام کی مدت دس روز سے کچھ زیادہ بیان کی گئی ہے (بضع عشرۃ لیلۃ)۔ چونکہ اس روایت کے

لہ "عزاب"، عزب (ع۔ ز۔ ب) کی جمع۔ یعنی وہ مرد جس کی بیوی نہ ہو۔ آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ محمد عاصم صاحب کے بیان کے مطابق، مسجد قبا سے متصل جنوب میں یعنی جانب قبلہ دو گھر بنے ہوئے ہیں جن کی چھت گنبد کی شکل کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک گھر اس جگہ بنا جہاں کلثوم بن الہدم کا گھر تھا اور دوسرا اس جگہ جہاں سعد بن خیثمہ رہتے تھے۔ (سفرنامۂ ارض القرآن ص ۲۰۳)

مطابق بھی روانگی جمعہ کے دن ہوئی اس لیے کل مدت قیام بارہ روز بنی۔

بظاہر چار ہی دن کا قیام قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مستقل قیام گاہ کا فیصلہ حضور صلعم پہلے ہی فرما چکے تھے اور وہاں پہنچ کر مختلف انتظامات کے سلسلے میں فوری اقدامات ضروری تھے۔ پھر قبا کی آبادی اس مقام سے دور نہ تھی، جہاں مستقل قیام ہونے والا تھا۔ حضور صلعم جب چاہتے بہ آسانی آ سکتے تھے اور بارہا تشریف لاتے رہے۔

مستقل قیام گاہ

انصار کے ہر قبیلے اور ہر خاندان کی دلی آرزو تھی کہ انھیں میزبانی کا شرف بخشا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ ان قبیلوں اور خاندانوں میں سے جن کی حیثیت مسلمان ہونے کے اعتبار سے برابر تھی کسی کو بلاوجہ ترجیح دینا ممکن نہ تھا اور مصلحت بھی اس کی متقاضی نہ تھی، لہٰذا رسول اللہ صلعم نے پہلے ہی سے فیصلہ فرما رکھا تھا کہ آپ اپنے جد امجد عبد المطلب کے ننھیال میں ٹھہریں گے۔ اس رشتے کے پیش نظر سب نے بہ طیب خاطر حضور صلعم کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا۔

یہ الگ بات ہے کہ مختلف بستیوں میں اس قیام کو اک گونہ مرکزی حیثیت حاصل تھی جہاں ٹھہرنے کا ارادہ حضور صلعم نے فرمایا تھا۔ اسی کا نام آگے چل کر "مدینۃ النبی" یا "مدینۃ الرسول" مشہور ہو گیا، جو عام زبانوں پر "مدینہ" رہ گیا۔

اس میں توسیع کا دور آیا تو آس پاس کی چھوٹی چھوٹی بستیاں اور آبادیاں یا محلے شہر میں ضم ہوتے گئے۔ جو آبادیاں اور بستیاں ذرا فاصلے پر تھیں، ان کی مستقل حیثیت برقرار رہ گئی، مثلاً قبا، جس کا فاصلہ کم و بیش تین میل تھا۔

مسجد کی بنیاد

دوران قیام قبا میں رسول اللہ صلعم نے سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کا انتظام فرمایا۔ تکمیل ہجرت کے بعد یہ پہلی مسجد تھی جس کی بنیاد حضور صلعم کے دست مبارک سے رکھی گئی۔ اسی مسجد کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لمسجد اُسّس علی التقویٰ من اول یوم احق ان تقوم فیہ، فیہ رجالٌ یحبون ان یتطہّروا و اللہ یحب المطہرین۔ (توبہ: ۱۰۸)

جس مسجد کی بنیاد روز اول سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، وہی اس کی حقدار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں (اور بندگان الٰہی آپ کے پیچھے نماز پڑھیں)، وہ جو پسند کرتے ہیں کہ پاک صاف رہیں (ظاہراً و باطناً) اور اللہ بھی پاک و صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس مسجد کی عمارت بالکل سادہ تھی اور رسول اللہ صلعم بہ نفس نفیس اس کی تعمیر میں شریک رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں عمارت مسجد کی تجدید ہوئی اور اس میں توسیع کر دی گئی۔ ولید بن عبد الملک اموی کے عہد میں حضرت عمرؒ بن عبد العزیز مدینہ منورہ کے گورنر تھے۔ انھوں نے نئی عمارت بنوائی اور ایک کونے میں ماذنہ تعمیر کرا دیا۔ موجودہ عمارت ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۰ء) میں بنی تھی۔ یہ عثمانی سلطان محمود خاں کا عہد حکومت تھا۔ واضح رہے کہ اس آیت کے مفہوم میں

مسجد النبیؐ بھی شامل ہے، جو "شدرحال" والی حدیث میں مسجد حرام اور مسجد اقصٰی کے بعد تیسری مسجد ہے۔

نماز جمعہ ۱۲۔ ربیع الاول سلہ (۲۴ ستمبر ۶۲۲ء) کو بروز جمعہ آپؐ قبل دوپہر قبا سے روانہ ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے موکب مبارک کی رفتار تیز نہ تھی کیونکہ انصار ادگرد سے جوق در جوق آکر راستے کے دونوں جانب کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔ بنی سالم بن عوف کے محلے میں پہنچے تو نماز جمعہ کا وقت ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے وہیں جمعہ پڑھا۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں جمعہ پہلے سے پڑھا جاتا تھا، لیکن یہاں حضور صلعم کی یہ پہلی نماز جمعہ تھی۔

اس موقع پر آپؐ نے ایک خطبہ بھی ارشاد فرمایا جس کے مختلف ٹکڑے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

الحمد لله احمده و استعينه و استغفره و استهديه و اومن به و لا اكفره و اعادى من يكفره و اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و ان محمداً عبده و رسوله ارسله بالهدىٰ والنور و الموعظة على فترة من الرسل و قلة من العلم وضلالة من الناس و انقطاع من الزمان و دنو من الساعة و قرب من الاجل۔

حمد و ستائش صرف خدا کے لیے ہے۔ میں اسی کی حمد کرتا ہوں اسی سے مدد مانگتا ہوں۔ اسی سے بخشش و ہدایت کا طلبگار ہوں میرا ایمان اسی پر ہے۔ اس کی نافرمانی کرنے والوں سے عداوت رکھتا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ یکتا ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اللہ نے محمدؐ کو ہدایت اور نور و نصیحت کے ساتھ ایسے زمانے میں بھیجا جب مدتوں سے کوئی رسول دنیا میں نہیں آیا تھا۔ علم گھٹ گیا تھا۔ گمراہی بڑھ گئی تھی۔ اسے آخری زمانے میں قیامت کے قرب اور اجل موعود کی نزدیکی میں بھیجا گیا

بہترین نصیحت، بہترین ذکر

من يطع الله و رسوله فقد رشد و من يعصهما فقد غوى و فرّط و ضلّ ضلالاً بعيداً۔ اوصيكم بتقوى الله فانه خير ما اوصى به المسلم المسلم ان يحضه على الآخرة و ان يامره بتقوى الله فاحذروا ما حذركم الله من نفسه ولا افضل من ذالك نصيحة و لا افضل من ذالك ذكراً۔

جس نے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کی وہی راہ یاب ہے جس نے ان کی نافرمانی کی وہ راستے سے بھٹک گیا قصوروار ٹھہرا اور سخت گمراہی میں پھنس گیا۔ میں تمہیں اللہ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ بہترین نصیحت جو مسلمان مسلمان کو کر سکتا ہے یہی ہے کہ اسے آخرت پر آمادہ کرے اور اللہ سے تقویٰ کے لیے کہے۔ لوگو! جن باتوں سے خدا نے دور رہنے کا حکم دیا ہے ان سے بچو۔ نہ اس سے بڑھ کر کوئی نصیحت ہے، اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر ہے

تقویٰ

و انّ تقوی اللّٰه لمن عمل به علی وجلٍ و مخافةٍ من ربّه عون صدقٍ علیٰ ما تبغون من امر الاٰخرة و من یصلح الذی بَینهٗ و بین اللّٰه من امره فی السّرِ و العلانیة لا ینوی بذالك اِلاّ وجه اللّٰه یکن لهٗ ذکراً فی عاجل امرهٖ و ذخراً فیما بعد حین یفتقر المرء الیٰ ما قدّم ......

امور آخرت میں جس شخص کا دل خدا کے خوف سے معمور ہو تقویٰ اس کے لیے بہترین مددگار ثابت ہوگا اور جب کوئی شخص خلوص نیت سے خدا اور اپنے درمیان معاملات خفیہ ہوں یا ظاہر، درست کرلے گا تو ایسا کرنا اس کے لیے دنیا میں ذکر اور موت کے بعد ذخیرے کا کام دے گا۔ جب انسان کو اعمال کی ضرورت پیش آئے گی۔

و ان تقوی اللّٰه یُوَقِّیْ مَقْتَهٗ وَ یُوَقِّیْ عقوبَةَ و یوقی سَخطه و انّ تقوی اللّٰه تبیض الوجوه و یَرضِی الرّبّ و یرفع الدّرجة۔

تقویٰ ہی ہے جو اللہ کی بیزاری، عذاب اور غصے کو دور کرتا ہے تقویٰ ہی ہے جس سے چہرے درخشاں ہوتے ہیں، خدا کی رضا ملتی ہے، درجہ بلند ہوتا ہے۔

سچے اور جھوٹے میں امتیاز

خذوا بحظکم و لا تفرطوا فی جنب اللّٰه و قد علّمکم اللّٰه کتابه و نهج لکم سَبیله لِیَعلمَ الذین صَدَقوا و یَعلم الکاذبین۔ فاحسنوا کما احسن اللّٰه الیکم ......

حظ اٹھاؤ۔ حقوق اللہ میں فروگزاشت نہ ہونے پائے اس نے تمھیں اپنی کتاب سکھائی، اپنا راستہ دکھایا تاکہ سچے اور جھوٹے الگ ہوجائیں۔ اللہ نے تمھارے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے۔ تم بھی لوگوں سے اچھا برتاؤ کرو۔

لا قوة الاّ باللّٰه فاکثروا ذکر اللّٰه و اعلموا لما بعد الیوم .... اللّٰه اکبر و لا قوة الا باللّٰه العلی العظیم۔[1]

نیکیاں اللہ کی مدد سے ہیں۔ اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔ آیندہ زندگی کے لیے کچھ کر رکھو......... خدا سب سے بڑا اور ہیں نیکی کرنے کی قوت اسی سے ملتی ہے جو عظمت والا بلندی والا ہے۔

[1] یہ خطبہ طبری کے حوالے سے ابن کثیر نے بھی نقل کیا ہے اور قاضی سلیمان مرحوم نے "رحمۃ للعالمین" کے حصہ اول میں بھی دیا ہے۔

جس مقام پر جمعہ کی یہ نماز ہوئی تھی وہاں بعد میں ایک مسجد بطور یادگار تعمیر ہو گئی۔ وہ اب بھی وادی رانوتا کے کنارے مدینہ منورہ اور قبا کے راستے پر موجود ہے۔

انصار کی شانِ خدا کاری

نماز سے فارغ ہو گئے تو بنی سالم بن عوف (خزرج) میں سے عِتبانؓ بن مالک اور عباسؓ بن عبادہ بن نضلہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہمیں میزبانی کا شرف عطا فرمائیے۔ ہم تعداد، سروسامان اور عزت میں زیادہ ہیں۔ آپؐ نے ناقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اس کا راستہ چھوڑ دیجیے۔ یہ خدا کی طرف سے مامور ہے۔ آگے بڑھے تو بنی بیاضہ (خزرج) کا محلہ آ گیا۔ وہاں سے زیادؓ بن اور فروہؓ بن عمرو نے بھی شان فدا کاری سے میزبانی کی التجا کی۔ رسول اللہ صلعم نے ان سے بھی وُہی فرمایا جو بنی سالم سے فرما چکے تھے۔ آگے بنی ساعدہ کی طرف سے سعدؓ بن عبادہ اور المنذرؓ بن عمرو، بنی حارث کی طرف سے سعدؓ بن ربیع، خارجہؓ بن زید اور عبداللہؓ بن رواحہ نے بھی پُورے جاں نثارانہ انداز میں درخواستیں پیش کیں۔ حضور صلعم کی زبان مبارک سے پہلے ارشاد گرامی کا اعادہ ہوتا رہا۔

منزلِ مقصود

آخر بنو عدی بن النجار کا محلہ آ گیا۔ رسول اللہ صلعم کے جد امجد عبدالمطلب کی والدہ ماجدہ اسی خاندان سے تھیں۔ یہاں بھی حضور صلعم نے قیام گاہ کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ بنی عدی میں سے سُلیطؓ بن قیس اور ابو سلیطؓ بن خارجہ حاضر ہوئے، کہا ہم آپ کے ننھیال ہیں۔ حضور صلعم نے ان سے بھی یہی فرمایا کہ ناقہ کا راستہ چھوڑ دیجیے۔ یہ خدا کی طرف سے مامور ہے۔ آخر ناقہ، بنی مالک بن النجار کے احاطے میں پہنچ کر اس مقام پر بیٹھ گئی، جہاں بعد میں مسجد النبیؐ کا مشرقی دروازہ بنا۔ مگر آپؐ اترے نہیں اور مہار ناقہ کی گردن پر ڈال دی۔ وہ اٹھی، ذرا آگے چل کر پلٹی اور دوبارہ اسی مقام پر بیٹھ گئی، جہاں پہلے بیٹھی تھی۔ اب کے جسم ہلایا اور اس انداز میں جم کر بیٹھ گئی، جیسے سانڈنیاں اور اونٹ مستقل نشست کے وقت بیٹھتے ہیں۔ ساتھ ہی گردن زمین پر رکھ دی۔ اب رسول اللہ صلعم اترے۔ پاس حضرت ابو ایوبؓ خالد بن زید انصاری کا مکان تھا۔ انھوں نے ناقہ کا پالان اتار لیا اور حضور صلعم ان ہی کے ہاں ٹھہر گئے۔ اس پر کسی کو بھی رنج نہ ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ناقہ کے ذریعے سے فیصلہ فرما دیا تھا۔ چنانچہ جب تک مسجد کے ساتھ حضور صلعم کے لیے حجرے نہ بن گئے، آپؐ ابو ایوبؓ ہی کے مکان پر تشریف فرما رہے۔

ابو ایوبؓ کی آرزو تھی کہ رسول اللہ صلعم بالائی منزل میں قیام فرمائیں۔ انھوں نے عرض بھی کیا: میں اسے بے ادبی سمجھتا ہوں کہ آپؐ نچلی منزل میں ہوں اور میں اُوپر رہوں۔ فرمایا: ہمارے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ہمارے پاس آتے جاتے رہیں گے، سہولت اسی میں ہے کہ ہم نچلے حصے میں رہیں۔ ایک روز اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا۔ حضرت ابو ایوبؓ اور ان کی اہلیہ نے سارا پانی لحاف میں جذب کر لیا تاکہ کوئی قطرہ چھت کے

نیچے ٹپکنے پائے، جس سے حضور صلعم کو تکلیف پہنچے۔ پھر رسول اللہ صلعم حضرت ابو ایوبؓ کی التجا قبول فرما کر بالائی منزل میں منتقل ہو گئے۔

حضرت ابو ایوبؓ کا شرف حضرت ابو ایوب انصاری بڑے عظیم القدر صحابی تھے۔ تاہم رسول اللہ صلعم کی میزبانی نے ان کا شرف اتنا بڑھا دیا تھا کہ جب وہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بصرہ گئے اور حضرت ابن عباسؓ وہاں خلیفہ کی طرف سے نائب تھے تو انھوں نے اپنا مکان پورے سامان کے ساتھ حضرت ابو ایوبؓ کے لیے خالی کر دیا اور خود دوسری جگہ جا رہے۔ جب حضرت ابو ایوبؓ نے واپسی کا قصد فرمایا تو حضرت ابن عباسؓ نے بیس ہزار اشرفیاں اور چالیس خادم بطور ہدیہ پیش کیے۔

جب امیر معاویہؓ کے عہد میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو حضرت ابو ایوبؓ بھی اس فوج میں شامل تھے۔ آپ نے محاصرۂ قسطنطنیہ ہی کے دوران میں وفات پائی اور وصیت کی کہ ان کی میت فصیل سے قریب تر لے جا کر دفن کی جائے اسی پر عمل ہوا۔ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تو حضرت ابو ایوبؓ کے مرقد مبارک کا سراغ لگا کر وہاں مقبرہ تعمیر کرایا اور ساتھ ہی عالی شان مسجد بنوائی۔ عثمانی سلاطین کے جلوس کی رسم تبرکاً اسی مسجد میں ادا کی جاتی تھی۔

حضرت ابو ایوبؓ کا یہ مکان مغیرہ بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام نے ایک ہزار دینار میں خریدا۔ اسے درست کرایا اور فقرأ مدینہ کے لیے وقف کر دیا۔

ترانہ ہائے خیر مقدم قبا سے منزل مقصود تک رسول اللہ صلعم کا یہی سفر مبارک تھا جس میں انصار کی معصوم بچیاں یہ ترانہ گاتی رہیں:

طلع البدر علینا	ماہ کامل کا طلوع ہو گیا
من ثنیات الوداع	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
وجب الشکر علینا	ہم پر خدا کا شکر واجب ہے
ما دعی للہ داع[1]	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں۔

---

[1] قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری نے "طلع البدر" کی جگہ "اشرق البدر" لکھا ہے نیز دو شعروں میں مندرجہ ذیل شعر کا اضافہ کیا ہے:

ایہا المبعوث فینا	اے خدا کے بھیجے ہوئے تو ہم میں
جئت بالامر المطاع	واجب الاطاعت کے حکم سے آیا ہے

"ثنیات الوداع" سے مراد قبا کے جنوبی جانب کا پہاڑ ہے جس کی گھاٹیوں تک لوگ مہمانوں کو رخصت کرنے کے لیے جایا کرتے تھے۔

ایسا ہی ایک مقام مدینہ کے شمالی جانب بھی تھا۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں:

جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور (یہ شعر) گانے لگیں (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۲۵۰)

بنی نجار کی بچیوں کا ترانہ یہ تھا:

نحن جوار من بنی نجار — ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں

یاحبذا محمداً من جار — ہم کیا خوش نصیب ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ہمسائے ہیں۔

رسول اللہ صلعم نے ان بچیوں سے پوچھا: "تم مجھ کو چاہتی ہو؟" بولیں: "ہاں"۔ فرمایا: "میں بھی تمھیں چاہتا ہوں"۔[1]

سنہ ہجری سنہ ہجری کے معارف پر مولانا پوری تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اسلامی سنہ کے تعین کا سوال اٹھا تو اس کی ابتدا واقعۂ ہجرت ہی سے ٹھہرائی گئی۔ جو اسلام کی تاریخ کا انقلابی موڑ تھا۔ رسول اللہ صلعم ۸۔ ربیع الاول ۱۳ ہجری کو بعد دوپہر قبا پہنچے تھے۔ یہ نبوت کے تیرھویں سال کا آخری دن تھا۔ ۹۔ ربیع الاوّل سے چودھواں سال شروع ہوا۔ اسی دن سے سنہ ہجری کی ابتدا ہوئی۔ گویا ہجرت کے پہلے سال میں دو مہینے اور آٹھ دن کی کمی رہ گئی۔ لیکن عام حساب کے لیے اس کی ابتدا محرم ہی سے مانی جاتی ہے۔ اگرچہ بعض اصحاب نے حساب زیادہ سے زیادہ صحیح رکھنے کے لیے حضور صلعم کے پہنچنے ہی کے دن سے شمار ضروری سمجھا جیسا کہ آگے کئی مقامات پر اس کا ذکر آئے گا۔ (مولاناؒ)

---

[1] سیرۃ النبیؐ (جلد اول ص ۲۵۹)

مدنی زندگی

باب ۳

مدنی زندگی کا ابتدائی دور

مسجد النبیؐ مستقل قیام گاہ پر پہنچ کر رسول اللہ صلعم نے سب سے پہلے قبا کی طرح مسجد کی بنیاد رکھی، کیونکہ خدا کے سچے اور نیک بندوں کے لیے ہر آبادی میں تقدم اسی عمارت کو حاصل ہے، جہاں وہ اپنے خالق و مالک کی عبادت کر سکیں۔ حضرت ابو ایوبؓ کے مکان کے سامنے ایک جگہ خالی پڑی تھی۔ جس میں جھاڑیاں، کھجور کے چند درخت یا ٹُنڈ، مشرکوں کی چند قبریں یا کھنڈر سے تھے۔ وہاں اُونٹ بھی بٹھائے جاتے تھے، کھجوریں بھی خشک کی جاتی تھیں۔ آبادی میں مکانوں کے درمیان خالی جگہ ہو تو ہمسایے اس سے وقتی فائدے اٹھاتے رہتے ہیں۔ یہ بنی نجّار کے دو یتیموں، سہل اور سُہیل ابنائے عمرو کی ملکیت تھی، جو حضرت اسعدؓ بن زرارہ کی نگرانی میں تھے۔ رسول اللہ صلعم کو یہ جگہ مسجد کے لیے موزوں نظر آئی۔ چنانچہ آپؐ نے اسے قیمتاً خریدنے کی خواہش کی۔ بنی نجّار ہی نہیں زمین کے مالک بھی اسے بہ طیب خاطر ہبہ کر دینے پر آمادہ تھے، لیکن حضور صلعم نے بہ اصرار قیمت ادا فرمائی۔ پھر اسے صاف اور ہموار کر کے مسجد مقدس کی داغ بیل ڈال دی۔ اس کی تعمیر میں خود بہ نفس نفیس برابر شریک رہے۔

کچی اینٹوں اور ان گھڑ پتھروں کی دیواریں تھیں۔ کھجور کی شاخوں کے چھپر بنا کر چھت پر ڈال کر اوپر مٹی پھیلا دی گئی تھی۔ ستونوں کا کام کھجور کے تنوں سے لیا گیا۔ فرش خام تھا۔ مینہ برستا اور چھت سے پانی ٹپکتا تو فرش کیچڑ کی شکل اختیار کر لیتا۔

مدینہ منورہ میں جہاں کوئی ندی یا نالہ بہتا ہے، زمین کے اندر سے باریک اور سُرخ رنگ نہایت ملائم بجری نکل آتی ہے۔ ایسی بجری اب بھی مسجد مبارک کے صحن میں بچھی ہوئی ہے۔ صحابۂ کرام یہی بجری جھولیوں میں بھر بھر کر لے آتے۔ اس طرح فرش رفتہ رفتہ ایسا بن گیا کہ چھت ٹپکنے پر کیچڑ کی شکل اختیار نہ کرتا۔

مسجد کا رُخ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا، کیونکہ اس وقت تک کعبۂ مکرمہ قبلہ نہیں قرار پایا تھا۔

بعد کے تغیرات خلافت صدیقی میں مسجد کی عمارت خراب ہو گئی تو ٹھیک پہلے جیسی عمارت از سر نو بنوا دی گئی۔ خلافت فاروقی میں توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی تو ویسی ہی مزید عمارت کا اضافہ ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں منقوش پتھروں کی دیواریں چونے سے چنوائی گئیں اور ساگوان کی لکڑی چھت کے لیے استعمال ہوئی۔ رفتہ رفتہ ظاہری تکلفات بڑھتے گئے۔ ولید بن عبد الملک نے عالی شان عمارت بنوائی۔ عباسیوں کے عہد میں توسیع ہوئی۔ مما لیک مصر نے بھی تحسین عمارت میں سرگرمی سے حصّہ لیا۔ عثمانی سلاطین کے عہد میں جو عمارت بنی اس میں خوبی یہ تھی کہ

اگرچہ سرسری نظر سے دیکھنے والوں کو عمارت کی یکسانی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا تاہم ستون ایسے بنائے گئے تھے کہ ہر عہد کی مسجد کے حدود کا اندازہ بآسانی ہو جاتا تھا۔ آخری توسیع آل سعود کے عہد میں ہوئی جس سے شمالی جانب عمارت کے طول و عرض میں خاصا اضافہ ہو گیا۔

عثمانیوں کے عہد میں مسجد کے پانچ دروازے تھے، باب جبریل اور باب النسا مشرقی جانب، باب السلام اور باب الرحمہ مغربی جانب اور باب مجیدی شمالی جانب۔ اب دس دروازے ہیں، مشرقی جانب باب عبدالعزیز کا اضافہ ہوا ہے۔ شمالی جانب باب عثمانؓ اور باب عمرؓ بن الخطاب کا، مغربی جانب باب صدیقؓ اور باب سعود کا۔

ازواج مطہرات کے حجرے

مسجد مقدس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلعم نے ازواج مطہرات کے لیے حجرے تعمیر کرائے۔ تعمیر مسجد کے وقت آپؐ کے نکاح میں صرف حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ تھیں۔ لہٰذا مسجد کی مشرقی سمت صرف دو حجرے بنے جو نو دس دس فٹ چوڑے اور پندرہ پندرہ فٹ لمبے تھے۔ کچی دیواریں اور کھجور کے چھپروں کی چھت جو اتنی اونچی تھی کہ آدمی ہاتھ اوپر اٹھاتا تو چھت کو جا لگتا۔ دروازوں پر شروع میں کمبل پڑا رہتا تھا۔ پھر ایک ایک کواڑ کے دروازے لگ گئے تھے۔ رات کو عموماً چراغ نہیں جلتا تھا۔

پھر جیسے جیسے ازواج آتی گئیں ان کے لیے الگ حجرے بنتے گئے۔ مسجد کے مشرقی جانب جگہ نہ رہی تو حجروں کا سلسلہ شمالی جانب شروع ہو گیا۔ کچھ حجرے مسجد کی جنوبی جانب بھی تھے۔ مشرقی جانب غالباً حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ کے حجروں کے درمیان ایک حجرہ حضرت فاطمہؓ کا بھی تھا۔ ان سب کی حالت فی الجملہ یکساں تھی یا تو کچی دیواریں تھیں یا کھجور کی ٹہنیاں کھڑی کر کے ان پر مٹی لیپ دی گئی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مکان مسجد کی مغربی جانب اس مقام پر تھا، جہاں اب باب صدیقؓ ہے۔

حفاظت الٰہیہ

اب ان حجروں میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا۔ ولید بن عبدالملک اموی کے عہد میں توسیع مسجد کے لیے ازواج مطہراتؓ کے حجرے توڑے گئے تو اہل مدینہ زار زار رو رہے تھے کہ کاش ان حجروں کو اصل حالت میں محفوظ رکھا جاتا تا کہ دنیا دیکھتی، ہمارے رسول پاک صلعم نے حیات طیبہ کس زہد و سادگی میں بسر فرمائی۔ البتہ حضرت عائشہؓ کے حجرے کا صرف وہ حصہ محفوظ ہے جہاں رسول اللہ صلعم، صدیقؓ اور فاروقؓ کے مرقد ہائے مبارک ہیں۔ یہ حصہ حضرت عائشہؓ کے حجرے کے اس حصے سے الگ کر دیا گیا تھا جہاں آپؓ رہتی تھیں۔ جب تک حضرت عائشہؓ زندہ رہیں کسی کو رسول اللہ صلعم اور آپؐ کے رفیقوں پر سلام عرض کرنے کے لیے اندر حاضر ہونے کا شوق ہوتا تو آپؓ (حضرت عائشہؓ) سے اجازت لے لیتا ورنہ عموماً لوگ باہر ہی سے سلام عرض کر کے چلے جاتے۔

۱۷ رمضان ۵۸ھ (۱۳ جولائی ۶۷۸ء) کو حضرت عائشہؓ کا انتقال ہو گیا تو حجرے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

۸۸ھ (۷۰۷ء) میں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز مدینہ منورہ کے گورنر تھے۔ انھوں نے حجرے کے ارد گرد پنج گوشہ

دیواریں بنوا دیں جن پر چھت کے بجائے برنجی جالیاں تان کر غلاف ڈلوا دیا۔ اس عمارت میں نہ کوئی دروازہ تھا اور نہ کوئی کھڑکی۔ پھر حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی عمارت کے باہر کچھ جگہ چھوڑ کر ایک مربع عمارت بنائی گئی، جس پر موجودہ سبز گنبد قایم ہے۔ اسے قبۂ خضرا کہتے ہیں۔ دراصل گنبد پر سیسے کی موٹی چادر چڑھا کر اوپر گہرا سبز رنگ پھیر دیا گیا ہے۔ مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ بارش کا پانی گنبد پر اثر انداز نہ ہو۔ پنج گوشہ عمارت کی دیواریں خوب صورت پردے میں مستور ہیں۔ اس کے اندر حجرہ اپنی اصل صورت میں اب تک محفوظ ہے۔ قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری پہلی مرتبہ حج کے لیے گئے تھے تو انھوں نے پوری چھان بین کے بعد تحریر فرمایا تھا:

سرورِ عالم، فخرِ عالم سید ولد آدم کا کچا حجرۂ مبارک اب تک اصل صورت اور اصل حالت میں قایم ہے دنیا میں کسی اور نبی یا رسول کے گھر اور قبر کی حفاظت قدرت الٰہیہ کی جانب سے ایسی نہیں ہوئی[1]

صفہ و اصحابِ صفہ

صحن مسجد کے اندر مشرقی حصہ میں ایک چبوترہ سا بنا کر اس پر سائبان ڈال دیا گیا تھا، جسے صُفّہ کہتے تھے۔ یہاں وہ غریب مہاجرین پڑے رہتے تھے جن کا کوئی کاروبار یا گھر بار نہ تھا۔ ان کا بیشتر وقت عبادت، تلاوت قرآن اور رسول اللہ صلعم کی صحبت با برکت میں گزرتا۔ ارشادات سُنتے، انھیں محفوظ رکھتے اور دوسروں تک پہنچاتے۔ انھی میں سے حضرت ابو ہریرہؓ بھی تھے۔ صحابہؓ کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ لاتے اور مسجد میں لٹکا دیتے۔ لیکن اصحاب صُفّہ صرف وہی کھجوریں کھاتے جو ٹپک ٹپک کر گرتیں۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں:

آنحضرت صلعم کے پاس جب کہیں سے صدقے کا کھانا آتا تو مسلّم ان کے (اصحاب صفہ کے) پاس بھیج دیتے۔ جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے اور ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت صلعم ان کو مہاجرین اور انصار میں تقسیم کر دیتے، یعنی اپنے اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے......[2]

ان کے لیے ایک معلم مقرر تھا جس کے پاس جا کر پڑھتے۔ اسی بنا پر ان میں سے اکثر قاری کہلاتے۔ دعوت اسلام کے لیے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے۔ بئر معونہ کے واقعہ ہائلہ میں سترّ آدمی اصحاب صفہ ہی میں سے بھیجے گئے تھے۔[3]

اذان

نماز کے اوقات مقرر تھے۔ لیکن نمازیوں کو بلانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ صحابۂ کرام خود ہی وقت کا اندازہ کر کے مسجد میں پہنچ جاتے۔ اس طرح بعض اصحاب کو جو پہلے آ جاتے اجتماع کا انتظار کرنا پڑتا۔ دوسری اسلامی عبادات کی طرح نماز کی حقیقی حیثیت بھی اجتماع ہی میں نمایاں ہو سکتی تھی۔ نماز

---

[1] سفرنامہ حجاز (الھاد الی سبیل الرشاد) ص ۲۴۹ [2] سیرۃ النبیؐ حصہ اول ص ۲۷۲ [3] سیرۃ النبی حصہ اول ص ۲۷۳۔

کے لیے بلانے کے سلسلے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی پیروی میں ناقوس یا گھنٹہ بجانے کی تجویزیں سامنے تھیں لیکن کسی پر طبیعت جمتی نہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ کسی آدمی کو مقرر کر دیا جائے جو بلند آواز سے اوقات نماز کا اعلان کر دیا کرے۔ رسول اللہ صلعم نے یہی تجویز پسند فرمائی۔ پھر عبداللہؓ بن زید بن ثعلبہ خزرجی نے عرض کیا کہ مجھے خواب میں اذان کے لیے چند کلمات کی ہدایت ہوئی ہے۔ ٹھیک اسی قسم کا خواب حضرت عمرؓ کو بھی آیا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ بلالؓ کی آواز بلند ہے اسے یہ کلمات بتائے جاؤ اس کی ندا دور دور تک سنائی دے گی۔

رکعات نماز میں اضافہ

نماز مکہ معظمہ میں فرض ہوئی تھی، لیکن مغرب کے سوا جس کی تین رکعتیں ابتدا سے مقرر تھیں، باقی نمازوں میں دو دو رکعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ پھر ظہر، عصر اور عشا، میں دو دو رکعتوں کی جگہ چار چار رکعتیں مقرر ہو گئیں۔ صبح اور مغرب کی نمازیں پہلی حالت پر قائم رہیں۔ سفر میں مغرب کے سوا تمام نمازوں کی رکعتیں دو دو رکھی گئیں۔

دیکھیے جماعتی زندگی کی صورت پیدا ہوتے ہی کس طرح ایک ایک معاملے کی تکمیل ہونے لگی۔

تحویل قبلہ

ابتدا ہی سے نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کرنے کا حکم تھا۔ بیت المقدس مکہ مکرمہ سے شمالی جانب تھا۔ رسول اللہ صلعم نماز ادا فرماتے تو ایسے مقام پر قیام کرتے، جہاں سے دو قبلے (بیت الحرام اور بیت المقدس) سامنے رہیں۔ مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوئے تو دونوں قبلوں کو سامنے رکھنے کی صورت باقی نہ رہی کیونکہ بیت المقدس مدینہ منورہ سے جانب شمال اور بیت الحرام (کعبہ مکرمہ) جانب جنوب تھا۔ رسول اللہ صلعم کی آرزو تھی کہ قبلہ وہی مقدس گھر ہو جائے جو دنیا میں خدا کی عبادت کا پہلا گھر تھا اور جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعمیر سے شرف دوام حاصل ہوا تھا۔ غرض مدینہ منورہ کے ابتدائی سولہ سترہ مہینے تک بیت المقدس ہی قبلہ رہا۔ شعبان ۲ھ (فروری ۶۲۴ء) میں یا اس سے کسی قدر پہلے کعبہ مکرمہ قبلہ مقرر ہو گیا اور اسلام نے ابراہیمی مرکز پر استواری اختیار کر لی۔ اس وقت سے تمام مسجدوں کا رخ کعبہ مکرمہ کی طرف پھیر دیا گیا۔ مدینہ منورہ میں اب تک ایک مسجد موجود ہے، جس میں عارضی قبلے (بیت المقدس) اور مستقل قبلے (کعبہ مکرمہ) دونوں کے نشان موجود ہیں اور اسے مسجد قبلتین کہتے ہیں۔

فرضیت رمضان

ہجرت کے دوسرے سال غزوۂ بدر سے پہلے رمضان شریف کے روزے فرض ہوئے۔ اسی ماہ مبارک میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی تھی (الشھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن)۔ رسول اکرم صلعم ہر مہینے میں تین روزے ضرور رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں یہودیوں کو عاشورے کا روزہ رکھتے دیکھا تو فرمایا: اس روز حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعونیوں کے ظلم و جور سے نجات حاصل ہوئی تھی، اس لیے ہم یہ روزہ رکھنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کے روزے فرض قرار دے دیے۔ ان کے

علاوہ بھی حضور صلعم نفلی روزے رکھتے رہتے تھے اور آپ کے اتباع میں صحابہ بھی نفلی روزے رکھتے رہتے تھے .... رسول اللہ صلعم کا منشائے مبارک یہی تھا کہ نیکی کے کاموں میں اعتدال اور میانہ روی ملحوظ رہے تاکہ زندگی کے تمام وظیفے بوجہ احسن ادا ہوتے رہیں۔ نیکی کے لیے دل میں رغبت کا جذبہ فروغ پائے اور کسی بھی اعتبار سے کوئی امر بار محسوس نہ ہو۔ خود آپ کا معاملہ سب سے الگ تھا۔

دو عظیم القدر ہستیوں کی وفات

رسول اللہ صلعم کو مدینہ منورہ تشریف لائے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ پہلے کلثومؓ بن الہدم نے وفات پائی، جنھیں قبا میں حضور صلعم کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ بہت سن رسیدہ تھے۔ پھر اسعدؓ بن زرارہ کا انتقال ہوگیا، جو انصار کے ان چھ قدوسیوں میں بھی شریک تھے جن کے ساتھ ربط ضبط یثرب میں تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنا تھا۔ پھر وہ عقبہ اولی اور عقبہ ثانیہ دونوں میں موجود تھے اور عقبہ ثانیہ میں جو بارہ نقیب مقرر ہوئے تھے، ان میں سے ایک اسعدؓ بن زرارہ بھی تھے۔ انھی کے ہاں حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ معلم دین کی حیثیت میں مہمان ہوئے تھے۔ انھی کی کوششوں سے یثرب میں اسلام پھیلا تھا۔ انھی کے ہاں جمعہ کی نماز ہوتی تھی۔

یہ دونوں موتیں یہودیوں اور دو دلے مسلمانوں کی آزمایش کا سبب بن گئیں۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

لا املك لنفسي و لا لصاحبي من الله شيئاً۔ — مجھے خدا کی مشیت کے خلاف اپنی ذات کے لیے یا اپنے کسی دوست کے لیے کوئی اختیار حاصل نہیں۔

حضرت اسعدؓ کی وفات پر بنی نجار نے عرض کیا کہ ان کی جگہ کوئی نقیب مقرر فرما دیجیے۔ حضور صلعم نے فرمایا: آپ لوگ میرے ننھیال ہیں اور آپ کے تمام معاملات کی اصلاح کے لیے میں خود موجود ہوں اور میں ہی آپ کا نقیب ہوں۔

اہل بیت کی آمد

رسول اللہ صلعم نے حضرت زیدؓ کو پانسو درہم دے کر مکہ مکرمہ بھیج دیا تھا تاکہ ام المومنین حضرت سودہؓ اور صاحبزادیوں کو لے آئے۔ بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا نکاح ان کے خالہ زاد بھائی ابو العاص بن الربیع سے ہوا تھا، وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا اور اس نے حضرت زینبؓ کو روک رکھا تھا۔ دوسری صاحبزادی رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت شوہر کے ساتھ حبش میں تھیں۔ حضرت عایشہؓ سے نکاح ہو چکا تھا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ زیدؓ مکہ مکرمہ پہنچے۔ حضرت سودہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ کو لے آئے۔ حضرت عایشہؓ اپنے بھائی عبداللہ اور دوسرے افراد خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ آ گئیں۔

عبداللہ بن سلام

عبداللہ بن سلام جس کا اصل نام حُصَین تھا، مدینہ منورہ کا ایک ذی علم اور دولت مند یہودی تھا۔ سعید الفطرت ہونے کے باعث رسول اللہ صلعم کا ذکر سنتے ہی اسلام کی طرف

مائل ہو گیا۔ تبا ہیں حضور صلعم کی زیارت کے لیے پہنچا تو اہل خانہ کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ تمام یہودی حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ عرض کیا، یا رسول اللہ آپ بالفعل میرا اسلام ظاہر نہ فرمائیں۔ میں چھپ جاتا ہوں آپ یہودیوں سے میرے متعلق پوچھیں۔ اگر وہ میرے متعلق اچھی رائے دیں تو فرمائیں کہ اگر وہ اسلام قبول کرلے تو کیا تم سب اسلام قبول کرلو گے؟

چنانچہ رسول اللہ صلعم نے عمائد یہود کو بلا کر اسلام کی تلقین کی۔ ساتھ ہی حُصَین (عبداللہ) کے متعلق پوچھا۔ یہودی بولے، وہ ہمارا سردار ہے، سردار کا بیٹا ہے۔ اس کے علم و فضل کی بھی تعریف کی۔ رسول اللہ صلعم نے پوچھا؛ اگر وہ اسلام قبول کرلے تو کیا آپ لوگ بھی اس کی پیروی کریں گے؟ انھوں نے جواب دیا؛ نعوذ باللہ ایسا ہو سکتا ہے کہ حُصَین اسلام قبول کرلے! اس پر حُصَین باہر نکل آیا اور اپنے ہم قوموں کو سمجھایا کہ محمد صلعم وہی نبی ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں آیا ہے۔ انکار کی طرف قدم نہ بڑھاؤ۔ یہودی یہ سن کر مبہوت رہ گئے۔ پھر بولے، اس کی بات ہم نہیں مانتے۔ یہ جھوٹا ہے۔ بہ ہرحال ممتاز یہودیوں میں سے حُصَین نے بےتکلف اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہ صلعم نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔

مُخَیرِیق کا اسلام

مُخَیرِیق بھی ایک ممتاز اور دولت مند یہودی تھا۔ وہ بھی ابتدا ہی میں مسلمان ہو چکا تھا۔ غزوۂ اُحد[1] کے موقع پر اس نے اپنے ہم قوموں سے کہا کہ محمد (صلعم) کے لیے لڑنا ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ یہودی بولے کہ آج سبت ہے یعنی شنبے یا ہفتے کا دن ہے۔ مُخَیرِیق کو اس جواب پر سخت غصہ آیا وہ ہتھیار اٹھا کر لڑائی کے لیے نکل پڑا اور وصیت کر دی کہ اگر میں مارا جاؤں تو میری ملکیت میں جو کچھ ہے وہ سب رسول اللہ صلعم کے حوالے کر دیا جائے۔

عجیب اتفاق یہ ہے کہ مُخَیرِیق نے جنگ اُحد میں شہادت پائی اور جو کچھ کہا تھا اس پر اپنے خون سے مہر توثیق ثبت کر دی؛

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔	ایمان والوں میں سے کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھلایا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے۔ پھر کوئی تو پورا کر چکا اپنا ذمہ اور کوئی ہے راہ دیکھ رہا اور بدلا نہیں ایک ذرہ۔

(الاحزاب؛ ۲۳)

---

[1] جنگ اُحد ۱۔ شوال ۳ھ (۳۱۔ مارچ ۶۲۵ء) کو ہوئی تھی۔ اس روز شنبہ تھا جو یہودیوں کا سبت تھا یعنی یوم تعطیل۔ لیکن وہ اس دن کو عذر اور بہانے کے طور پر استعمال کرتے رہتے تھے۔

حضرت سلمانؓ کا اسلام

حضرت سلمانؓ بھی اسلام لے آئے۔ تلاش حق میں انتہائی مشقتیں اٹھاکر کامیابی حاصل کرنے کا یہ عجیب واقعہ ہے۔ آپ کا اصل وطن ایران کے مشہور مرکزی شہر اصفہان کے حوالی میں تھا۔ والد خاصے بڑے زمیندار تھے اور بیٹے کو بدرجۂ غایت محبت کے باعث گھرہی میں بند رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ سلمانؓ باہر نکلے اور نصرانیوں کے ایک کلیسا کے پاس سے گزرے تو ان لوگوں کا طریق عبادت آتش پرستوں کے طریق عبادت سے بہتر نظر آیا اور اس کا ذکر والد سے بھی کر دیا۔ والد نے بیٹے کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ سلمانؓ نے نصرانیوں سے ربط ضبط پیدا کر کے شام جانے کا قصد کر لیا تاکہ نصرانیوں میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ خفیہ خفیہ گھربار چھوڑ کر نکل پڑے اور شام میں ایک اسقف کے پاس رہے۔ پھر موصل[1]، نصیبین[2] اور عموریہ[3] میں پہنچے۔ آخری مقام کے نیک دل نصرانی نے وصیت کی کہ دین ابراہیمی کے مطابق ایک نبی کے مبعوث ہونے کا وقت قریب آگیا ہے، لہذا عرب پہنچو، مدینہ منورہ کی بعض نشانیاں بھی بتا دیں۔ چنانچہ سلمانؓ نے عرب کا قصد کر لیا۔ جس قافلے کے ساتھ وہ آئے تھے، اس کے کارفرماؤں نے سلمانؓ کو غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ پھر بنی قریظہ میں سے ایک یہودی سلمانؓ کو مدینہ منورہ لے آیا۔ رسول اللہ صلعم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ پہنچے تو حضرت سلمانؓ بھی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پھر حضور صلعم ہی کے ارشاد کے مطابق اپنے مالک سے آزادی کی شرطیں طے کیں اور صحابہ کرام نیز حضور صلعم کی امداد سے وہ شرطیں پوری کر کے آزاد ہوئے۔ غزوۂ خندق (احزاب) میں حضرت سلمانؓ شریک تھے۔ مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے خندق کھودنے کی تجویز حضرت سلمانؓ ہی نے پیش کی تھی۔ (مولف)

---

[1] عراق کا مشہور شہر ہے جو دجلہ کے کنارے واقع ہے۔ [2] جزیرہ یعنی شمالی عراق کا ایک چھوٹا سا دریا ہرماس ہے جو شمالی جانب سے بہتا ہوا آتا ہے اور دریائے فرات میں مل جاتا ہے اس دریا کے ابتدائی حصے پر نصیبین واقع ہے گویا یہ بھی عراق ہی کا ایک شہر ہے۔

[3] عموریہ، اناطولیہ (ایشیائے کوچک) کا قدیم شہر جسے معتصم عباسی کے عہد میں مسلمانوں نے فتح کیا تھا۔

باب ۳۴

مواخات مہاجرین و انصار

تعمیر ملت کا سنگ بنیاد

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ۔

(انفال، ۶۳)

تزکیۂ اخلاق کا پیغمبرانہ عمل مولانا فرماتے ہیں :

"دنیا میں کوئی کام انسانوں کے لیے اس سے زیادہ مشکل نہیں کہ بکھرے ہوئے انسانی دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں پرو دے اور یہ کام تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، جب معاملہ ایسے انسانوں کا ہو، جو صدیوں سے باہمی جنگ و جدل کی آب و ہوا میں پرورش پاتے رہے ہوں اور جن کے نفسیاتی سانچوں میں باہمی آمیزش و ائتلاف کا کوئی ڈھنگ باقی نہ رہا ہو۔"

"پیغمبر اسلام (صلعم) کا ظہور ایسے ہی لوگوں میں ہوا تھا، مگر ابھی ان کی دعوت پر دس بارہ ہی برس گزرے تھے کہ مدینہ میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا، جو اس اعتبار سے بالکل ایک نئی قسم کی مخلوق تھا۔ وہ جب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، باہمی کینہ و انتقام کے مجسمے تھے، لیکن جونہی مسلمان ہوئے محبت و سازگاری کی ایسی پاکی و قدوسیت ابھر آئی کہ ان کا ہر فرد دوسرے کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کیلیے مستعد ہو گیا۔"

"فی الحقیقت یہی وہ تزکیۂ اخلاق کا عمل ہے، جو ایک پیغمبرانہ عمل تھا اور جو پیغمبر اسلام کی تعلیم و تربیت نے انجام دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی باہمی الفت ایک ایسی نعمت ہے جسے خدا نے اپنا خاص انعام قرار دیا ہے۔ افسوس ان پر، جو اس نعمت سے محرومی پر قانع ہو گئے اور اس کے لیے اپنے اندر کوئی جلن محسوس نہیں کی۔ آج باہمی الفت کی جگہ باہمی مخاصمت مسلمانوں کی سب سے بڑی پہچان ہو گئی ہے۔ اسی کو انقلاب حال کہتے ہیں۔" (ترجمان جلد دوم ص ۷۰-۶۹)

نومسلموں کا بھائی چارہ "اسلام کی دعوت نے باہمی الفت و سازگاری کی جو روح پھونک دی تھی اس کا ایک عجیب و غریب منظر تاریخ نے آج تک محفوظ

رکھا ہے۔ یہ نومسلموں کا بھائی چارہ تھا، جسے عربی میں "مواخات" کہتے ہیں یعنی اسلام کے رشتے سے ایک نومسلم دوسرے نومسلم کا بھائی ہوجاتا تھا۔ پھر ساری باتوں میں دونوں ایک دوسرے کی شرکت و ملکیت کے ویسے ہی حقدار ہوجاتے، جیسے حقیقی بھائی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک اگر مرجاتا تو دوسرا اس کا وارث ہوجاتا تھا۔"

"یہ مواخات دو مرتبہ ہوئی۔ ایک دفعہ مکہ میں اور یہ صرف مہاجرین کے درمیان ہوئی تھی، دوسری مرتبہ مدینہ میں اور یہ مہاجرین و انصار کے درمیان ہوئی تھی، یعنی مکہ کے جو لوگ ہجرت کرکے آئے ان میں اور مدینہ کے نومسلموں میں۔ ایک قول کے مطابق یہ نوّے آدمی تھے اور ایک قول کے مطابق سو... جو لوگ ایمان لائے، اپنا گھر بار چھوڑا، جان و مال سے راہ حق میں جہاد کیا تو خواہ وہ کسی قبیلے اور کسی حلقے کے ہوں ایک ہی برادری کے افراد ہوگئے یعنی جاں نثارانِ حق کی برادری کے۔ ان کا ہر فرد دوسرے فرد کا کارساز و رفیق ہے اور اسی کارسازی و رفاقت پر تمھاری ساری کامیابیوں کا دار و مدار ہے۔"

(ترجمان جلد دوم ص ۱۷۔۷۲)

مواخات کی ضرورت

مہاجرین کا تعلق مکہ مکرمہ سے تھا۔ ان میں سے اکثریت کی تعلیم و تربیت اور تزکیۂ اخلاق پر خاصی مدت گزر چکی تھی۔ وہ مصائب کے ان خوفناک طوفانوں میں زندگی کے کئی سال گزار چکے تھے، جن کا ایک معمولی سا ریلا بھی انسانوں کو زیادہ سے زیادہ بلند ہمت اور پختہ کار بنا دینے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ وہ خود دار و غیور انسان تھے۔ حوصلے فلک بوس، عزائم محکم، مقاصد کی قدوسیت پر اٹل ایمان، ایسے لوگوں کے سامنے زندگی کا کوئی بھی نقشہ آجاتا، انھیں اپنے لیے مناسب مقام پیدا کرلینے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ انھیں یہ بھی یقین تھا کہ انسانی زندگی کا جو نظام وہ بروئے کار لانا چاہتے ہیں اسے ہر حال میں کامیاب ہونا ہے اور عالم انسانیت کے لیے خیرات و برکات کی بہاروں کے ایک ایسے مبارک دور کا آغاز ہوجائے گا جس کی کوئی مثال اس وقت کی تاریخی یادداشتوں میں نہیں پہنچی تھی۔ ان کی ذاتی ضرورتیں اس درجہ قلیل و مختصر تھیں کہ کوئی بھی حالت پیش آجاتی، انھیں قطعاً پریشانی سے سابقہ نہ پڑتا۔ وہ اس غرض سے گھر بار اور املاک چھوڑ کر نہیں آئے تھے کہ نئی سرزمین میں پہنچتے ہی انھیں ویسی ہی املاک مل جائیں گی۔ البتہ وہ ہر خطّے کے آدمیوں کو جلد سے جلد حقیقی انسان بنتے دیکھنے کے لیے یقیناً مضطرب و بے قرار تھے اور اسلام کا اصل مقصد یہی تھا، اس کے سوا کچھ نہ تھا۔

اگرچہ انصار کو اسلام سے وابستگی اختیار کیے ہوئے مختصر سی مدت گزری تھی لیکن وہ کسی بھی خصوصیت میں مہاجرین سے پیچھے نہ تھے بلکہ ان کی روح ایثار و قربانی نے بے تامل جن جن شکلوں میں ظہور کیا، اس سے زمانے بھرپور

آشکارا ہوگیا کہ انصار کی کوئی نظیر نہ ان سے پیشتر کی کسی آبادی میں دیکھی گئی، نہ اس کے بعد کسی خطے میں ویسا کوئی قدوسی گروہ نظر آیا۔ شاید یہی روح ایثار انصار کی برگزیدگی کا اصل سبب ٹھہری اور انھیں اسلام و مسلمین کی پناہ گاہ بننے کا دائمی شرف حاصل ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ انسان اخلاقی و روحانی ارتقا کے مراحل طے کرتے ہوئے کتنی ہی بلندی پر پہنچ جائیں تاہم وہ خویشی و یگانگی کے معین سہاروں سے ہمیشہ کے لیے بے تعلق و بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ کسی نہ کسی وقت روح کی گہرائیوں سے ایسی لہریں اٹھ کر سطح پر آجاتی ہیں جنھیں ہم اپنایت کے احساس کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کرسکتے۔ غالباً روح انسانی کی یہی فطری پیاس تھی جس کی تسکین کے لیے مواخات کا انتظام کیا گیا۔

چند بدیہی حقائق

بہرحال اس طرح:

۱۔ مہاجرین کے دل میں بے اطمینانی اور پریشانی پیدا ہونے کا جو امکان تھا، اس کے انسداد کے لیے حسن تدبیر کے ذریعے سے جو کچھ ہوسکتا تھا اسے بوجہ احسن پورا کر دیا گیا۔ نتیجے پر نظر رکھی جائے تو اللہ کے فضل سے وہ بہت امید افزا ثابت ہوا۔

۲۔ حقیقی بھائیوں اور قریبی عزیزوں میں بھی مختلف اسباب کی بنا پر رنجشیں پیدا ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں، لیکن راہ خدا میں جس مواخات کا انتظام ہوا تھا اس میں ایسا کوئی امکان سامنے نہ آیا اور نہ آسکتا تھا بلکہ آگے چل کر اس کے دوررس اثرات عملاً ختم کیے گئے۔

۳۔ بھائی چارے کے رشتے حقیقی اور خونی رشتوں کے مقابلے میں آزمایش کی ہر منزل پر بدرجہا زیادہ کامیاب رہے۔

۴۔ مہاجرین و انصار کے درمیان زیادہ سے زیادہ یکجہتی پیدا کرنے اور باہمی اتحاد کو مستحکم بنانے کے قوی اثرات بالاہتمام پیش نظر رہنے چاہئیں۔

اجتماع اور مواخات

مسجد نبویؐ کی تعمیر مکمل ہوچکی تو حضرت انسؓ بن مالک کے گھر میں رسول اللہ صلعم نے مہاجرین و انصار کو جمع کیا۔ اس اجتماع میں نوّے یا ایک سو اصحاب موجود تھے، جن میں سے نصف مہاجرین اور نصف انصار تھے۔ حضور صلعم نے فرمایا:

تاخوا فی اللہ اخوین اخوین[1] — اللہ کی راہ میں دو دو آدمی بھائی بھائی بن جائیں۔

پوری فہرست اسماء کہیں سے نہ مل سکی جو نام مختلف روایتوں سے معلوم ہوسکے، وہ درج ذیل ہیں:

---

[1] ابن ہشام القسم الاول (جلد اول و دوم ص ۵۰۵)

مہاجرین	انصار
ابوبکر صدیق رضہ	خارجہ رضہ بن زید بن الحارث
عمر فاروق رضہ	عتبان رضہ بن مالک
ابو عبیدہ رضہ بن الجراح (عامر بن عبیداللہ)	سعد رضہ بن معاذ
عبدالرحمن رضہ بن عوف	سعد رضہ بن الربیع
زبیر رضہ بن العوام	سلمہ رضہ بن سلامہ بن وقش
طلحہ رضہ بن عبیداللہ	کعب رضہ بن مالک
عثمان رضہ بن عفان	انس رضہ بن ثابت
سعید رضہ بن زید	ابی رضہ بن کعب
مصعب رضہ بن عمیر	ابو ایوب رضہ
ابو حذیفہ رضہ بن عتبہ بن ربیعہ	عباد رضہ بن بشر
عمار رضہ بن یاسر	حذیفہ رضہ بن الیمان العبسی
ابوذر غفاری رضہ	منذر رضہ بن عمرو
حاطب رضہ بن ابی بلتعہ	عُویم رضہ بن ساعدہ
سلمان رضہ فارسی	ابوالدرداء رضہ (عویمر بن ثعلبہ)
بلال رضہ	ابو رویحہ رضہ عبداللہ بن عبدالرحمن الخثعمی

بعض ناموں کے متعلق روایات میں اختلافات ہیں۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم نے علی رضہ بن ابی طالب کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا ھٰذا اخی " (یہ میرا بھائی ہے) حالانکہ اسے اس مواخات کا جزو قرار نہیں دیا جا سکتا جس کا انتظام مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔ پھر حمزہ رضہ اور زید رضہ بن حارثہ کی مواخات کا ذکر ہے۔ یہ مکی مواخات ہو تو ہو، مدنی مواخات نہیں ہو سکتی، جس میں ایک فریق مہاجر اور دوسرا فریق انصاری تھا۔ جعفر رضہ بن ابی طالب اور معاذ رضہ بن جبل کے بھائی چارے کا ذکر بھی ملتا ہے، حالانکہ مدنی مواخات کے وقت جعفر رضہ بن ابی طالب حبش میں تھے۔ وہ چھ سات سال بعد مدینہ منورہ پہنچے اور خیبر میں رسول اللہ صلعم کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔

ہر خونی رشتے سے بڑھ کر

بہرحال اس مواخات نے فریقین میں محبت کا ایک عجیب و غریب جذبہ برانگیختہ کر دیا تھا۔ مولانا آزاد مرحوم فرماتے ہیں:

"مسلمانوں میں اسلامی مواخات کا ایسا ولولہ پیدا ہو گیا تھا کہ خون کے عزیزوں سے کہیں زیادہ رشتۂ حق

کے ان عزیزوں کو اپنا سمجھنے لگے تھے۔ حتّٰی کہ اگر ایک مرجاتا تو رشتۂ مواخات کا بھائی اس کا وارث سمجھا جاتا۔ انھوں نے سارے پرانے رشتے بھلا دیے تھے۔ صرف ایک ہی رشتے کی لگن باقی رہ گئی تھی۔ یعنی سب اللہ کے رسول کے فدائی اور سب اسی کے حسن جہاں آرا پر سب کچھ نثار کر دینے والے ہیں،

توئخل خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش برید ند و در تو پیوستند[1]

آخر سورۂ انفال میں حکم صادر ہوا،

وَ اُولُو الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ۔

اور رہا تی رہے) قرابت دار تو وہ اللہ کے حکم میں ایک دوسرے کی میراث کے زیادہ حقدار ہیں (یعنی باہمی بھائی چارے میں ان کے حقوق فراموش نہ کیے جائیں)

انصار کی شانِ ایثار

مواخات ہو چکی تو ہر انصاری نے اپنے مہاجر بھائی کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا اور کہہ دیا کہ اس میں نصف آپ کا اور نصف ہمارا ہے۔ مثلاً عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ربیع کے بھائی قرار پائے تھے، جو انصار میں سب سے زیادہ دولت مند سمجھے جاتے تھے انھوں نے اپنے مہاجر بھائی سے یہ بھی کہہ دیا کہ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جسے آپ پسند کریں طلاق دے دیتا ہوں عدت گزر جانے کے بعد اس سے شادی کر لینا، لیکن عبدالرحمٰنؓ نے احسان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجیے چنانچہ انھوں نے بنو قینقاع کے بازار میں گھی اور پنیر سے تجارت کی ابتدا کی۔

رفتہ رفتہ ان کی تجارت کی یہ ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے۔ ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس دن مدینہ میں پہنچتا تھا، تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی[2]

انصار کے پاس نخلستان اور کھیت تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلعم سے درخواست کی کہ یہ چیزیں ہمارے مہاجر بھائیوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ حضور صلعم کو علم تھا کہ مہاجرین کا پیشہ صرف تجارت ہے۔ وہ کھیتی باڑی اور باغبانی کے فن سے بالکل ناآشنا ہیں۔ لہٰذا آپؐ نے یہ درخواست قبول نہ فرمائی۔ پھر انصار نے عرض کیا کہ سارے کام ہم کریں گے، جو پیداوار ہو اس میں سے نصف حصہ مہاجرین کو ملے۔

یہ ابتدائی دور کے غیر معمولی حالات تھے۔ جنگ بدر کے بعد حالات بالعموم طبعی صورت اختیار کرنے لگے تو غیر معمولی

---

[1] ترجمان القرآن جلد دوم ص ۷۰ [2] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۲۸۶۔

تدابیر میں تخفیف شروع ہوگئی، اس لیے کہ مستقل نظام تو فطری مبانی ہی پر قایم کیا جا سکتا تھا۔

بنو نضیر کے اخراج پر ان کی زمینیں اور باغ قبضے میں آئے تو رسول اللہ صلعم نے چاہا کہ یہ مہاجرین میں تقسیم کر دیے جائیں اور انصار کے عطیات لوٹا دیے جائیں مگر انصار نے عرض کیا کہ ہمارے کھیت اور نخلستان بھی مہاجرین ہی کے پاس رہیں اور بنو نضیر کی املاک بھی انھی میں تقسیم کر دی جائیں۔

خیبر فتح ہوگیا تو غیر معمولی انتظامات کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی اور انصار کے عطیات انھیں واپس کر دیے گئے۔

مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں،

انصار نے مہاجرین کی بھائی اور برادری کا جو حق ادا کیا، دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

بحرین جب فتح ہُوا تو آنحضرت صلعم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔ انھوں نے عرض کی پہلے ہمارے بھائی مہاجروں کو اتنی ہی زمین عنایت فرمایئے، تب ہم لینا منظور کریں گے[1]

مہاجرین کی خودداری

مہاجرین نے بھی معاً اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کپڑے کا بیوپار سنبھال لیا۔ حضرت عثمانؓ قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی تجارت وسعت پا کر ایران تک جا پہنچی تھی۔ دوسرے صحابہؓ نے بھی جو مشغلہ اپنے لیے مناسب سمجھا، اختیار کر لیا۔ شاید بہت ہی محدود تعداد ایسے مہاجرین کی ہو گی، جنھیں ابتدائی دَور میں ایسا کام نہ مل سکا، جس سے وہ اپنی ضرورتیں بہ سہولت پوری کر سکتے۔

مہاجرین کے لیے مکانوں کا انتظام یوں ہُوا کہ انصار نے اپنی مختلف آبادیوں اور محلوں میں افتادہ زمینیں مہاجر بھائیوں کے حوالے کر دیں تاکہ ان میں ضرورت کے مطابق مکان بنا لیں۔ بعض کے لیے بنے ہوئے مکانات خالی کر دیے گئے۔ یہ ایسی ضرورت تھی، جس کا پُورا کرنا کسی کے لیے خاص بوجھ نہ تھا۔ کسی انصاری بھائی پر زیادہ بوجھ ڈالنا غالباً کسی بھی مہاجر کے نزدیک مناسب نہ تھا۔ انصار کے ایثار و عطا کا جذبہ برابر قایم و استوار بلکہ روبہ افزایش رہا اور اس وجہ سے مہاجرین کی خودداری، عادتِ محنت و مشقت اور کسبِ معاش میں انہاک و سرگرمی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ پھر "جیش العسرت" کے لیے سروسامان کا وقت آیا تو مہاجرین نے اس میں فراخ دلی سے حصہ لیا۔

یؤثرون علیٰ انفسہم

بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم کے پاس ایک مہمان آیا۔ آپ نے ازواجِ مطہرات کی طرف کسی کو بھیجا۔ معلوم ہوا کہ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ صرف پانی تھا اور اس سے مہمانداری کا حق ادا نہیں ہوسکتا تھا۔ آخر آپؐ نے فرمایا کہ کون اس شخص کو ساتھ لے جائے گا اور مہمانداری کی خدمت سرانجام دے گا؟ انصار میں سے ایک نے ہامی بھری اور مہمان کو ساتھ

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل ص ۲۷۔

لے گیا۔ سوء اتفاق سے اس کے گھر میں بھی صرف اتنی غذا تھی جس سے چھوٹے بچوں کی تسکین ہو جاتی۔ شوہر اور بیوی نے باہم طے کر لیا کہ کھانا پکایا جائے۔ بچوں کو کچھ کھلائے بغیر سلا دیا جائے۔ پھر دستر خوان بچھا کر کھانا مہمان کے آگے رکھ دیا جائے اور چراغ درست کرنے کے بہانے گل کر دیا جائے۔ میاں بیوی بھی شریک طعام ہو جائیں، مگر کچھ نہ کھائیں۔ البتہ مہمان کو یقین رہے کہ وہ کھا رہے ہیں۔ صبح کو وہ انصاری رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ آپ دونوں (میاں بیوی) کے کام پر بہت خوش ہوا اور یہ آیت نازل فرمائی:

وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (سورہ حشر، ۹)

اور جو لوگ جگہ پکڑ رہے ہیں اس گھر میں اور ایمان میں ان سے پہلے، وہ محبت کرتے ہیں اس سے جو وطن چھوڑ کر آئے ان کے پاس اور نہیں پاتے تنگی اس چیز سے جو مہاجرین کو دی جائے اور مقدم رکھتے ہیں ان کو اپنی جان سے اور اگرچہ ہو اپنے اوپر فاقہ اور جو بچایا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔

تاریخ عالم کا درخشاں ترین دور

اس آیت میں خاص اسی انصاری گھرانے نہیں پورے گروہ انصار کے جذبات و اخلاق عالیہ کی تصویر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی ہے۔ قوموں کی سرگزشتوں کے اوراق سب کے سامنے ہیں، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کی ہر سرگزشت کا ایک ایک ورق دیکھ جائیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ اکا دکا فرد کہیں کہیں مل جائیں، جن کا وجود بالکل غیر معمولی نظر آئے، لیکن کسی سرگزشت میں گروہ در گروہ ایسے افراد قطعاً نہیں ملیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعلمین صلعم کے حسن تربیت کی بدولت مدینہ منورہ کے اندر جمع کر دیے تھے۔ ایسے ہی اخلاق و اوصاف اور ایسے ہی محاسن و محامد قوموں کو پستی و گمنامی کی تاریکی سے اٹھا کر انسانیت عالیہ کی انتہائی اوج گاہوں پر پہنچا دیتے ہیں اور وہ آنے والی نسلوں کے لیے دائمی روشنی کے مینار بن جاتی ہیں۔ کیا اس حقیقت سے کسی کو اختلاف کی جرأت ہو سکتی ہے کہ دس سال کی مختصر سی میعاد میں جس قوم نے خدا کے پاک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زیر سایہ پرورش پائی تھی، اسے ایک صدی کے اندر اندر خدا نے وقت کی معلوم دنیا کے بہترین خطوں کی تقدیریں سونپ دیں اور انسانی زندگی کے ہر دائرے میں فطری کارفرمائی کے ایسے وسائل بروئے کار آ گئے جن سے پیشتر کی دنیا یکقلم ناواقف تھی؟ افسوس کہ بعد کے مسلمان اس عظیم القدر میراث کی نگہداشت کے اہل ثابت نہ ہوئے اور امامت کا منصب ان سے چھن گیا تاہم دور امامت آج بھی اسی طرح ایوان تاریخ میں درخشاں ہے جس طرح تیرہ سو سال پیشتر درخشاں تھا اور ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ ہمارے لیے اس کی درخشانی پر فخر زیبا نہیں، ہاں اپنے آپ کو اس درخشانی کا مرکز و مورد بنا سکیں تو البتہ اپنی اس نیک بختی اور سعد اختری پر بارگاہ باری تعالیٰ میں سجدہ ریز رہنا عین تقاضائے عبودیت ہے۔ (مولف)

باب ۳

استحکام امن و دفاع مدینہ

مدینہ منورہ کی کیفیت مواخات کا تعلق صرف مسلمان مہاجرین و انصار سے تھا لیکن رسول اللہ صلعم یثرب میں تشریف فرما ہوئے تھے تو وہاں مسلمانوں کے علاوہ بھی مختلف گروہوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ مثلاً:

۱۔ وہ عرب (اوس اور خزرج) جو اس وقت تک حلقۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے اور اصطلاحاً انھیں مشرک ہی سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں یہ لوگ تیزی سے گھٹتے گئے۔ یہاں تک کہ بظاہر بالکل ختم ہو گئے۔

۲۔ منافقین: یہ لوگ عرفاً مسلمان سمجھے جاتے تھے، لیکن ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ دل سے نہ مسلمانوں کے ساتھ تھے اور نہ مشرکین میں داخل تھے۔ ہر معاملے میں وقتی ذاتی مصلحتوں پر کاربند رہتے تھے۔ جماعت مسلمین کو ان سے گزند ضرور پہنچتا رہا۔ فائدہ کبھی نہ پہنچا۔ تاہم ان کے ادعائے اسلام کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا اور دل چیر کر بھی دکھا دیتے تو کیوں کر پتا چل سکتا تھا کہ وہ حقیقۃً مسلمان ہیں۔ بہرحال ان پر کسی بھی حال میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی تعداد بھی بظاہر خاصی تھی۔ مثلاً غزوۂ احد کے موقع پر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے ساتھ جو تین سو افراد مسلمانوں سے الگ ہو کر مدینہ منورہ لوٹ گئے تھے، وہ بظاہر منافقین ہی تھے۔

۳۔ یہودیوں کے تین گروہ جن کی تعداد چار پانچ ہزار سے کم نہ ہو گی۔ یعنی بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ لوگ مذہباً ہی نہیں، نسلاً بھی مہاجرین و انصار سے مختلف تھے۔

حالات کا تقاضا جب تک ان تمام آبادیوں کو امن و امان کے مشترکہ مقاصد کے لیے متحد و متفق نہ کر دیا جاتا، پیش آنے والی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی کیا امید رکھی جاسکتی تھی، جن کا زیادہ سے زیادہ صحیح اندازہ رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات ہی کو تھا؛ اگر وہ مشکلات موجود نہ ہوتیں، جو قریش کی وجہ سے پیدا ہوئیں اور کم از کم چھ سال کے شب و روز صرف انھی مشکلات کی آغوش میں پرورش پانے والے مصائب سے مقابلے کے لیے وقف ہو گئے۔ پھر بھی نسل و مذہب کے اعتبار سے جو متفرق و مختلف آبادیاں پہلو بہ پہلو بیٹھی تھیں، ان سے کیونکر توقع رکھی جاسکتی تھی کہ وہ ایک وحدت کی حیثیت میں شہری بہبود کے لیے کوئی قدم اٹھا سکیں گی؛

یہ بھی ظاہر ہے کہ انھیں مشترکہ مقصد کی خاطر دوش بدوش عملی جدوجہد کے لیے آمادہ و مستعد کر دینے کی صرف ایک صورت تھی اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنے شہری، مذہبی اور ثقافتی حقوق کے تحفظ کا یقین کامل دلایا جاتا۔ اس غرض سے رسول اللہ صلعم نے جو دستور العمل جلد از جلد مرتب فرما دیا، وہ محض یہی نہیں کہ چودہ سو سال پیشتر کی ایک نہایت اہم دستوری دستاویز ہے، بلکہ وضع و ہیئت کے اعتبار سے بھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف گروہوں اور جماعتوں کی طبیعتوں اور رجحانوں کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اشتراک کا ایسا جامع اور تمام پہلوؤں پر حاوی منصوبہ تیار کر لینا بجائے خود ایک غیر معمولی معجزہ تھا۔

مشترکہ نظام کار

چنانچہ اس ضروری معاملے پر رسول اللہ صلعم کی توجہ گرامی سب سے پہلے مبذول ہوئی۔ دین حق کی دعوت کا سلسلہ جاری تھا، تاہم اس کا اختیار و قبول ہر فرد اور ہر گروہ کی مرضی پر موقوف تھا۔ کسی کو جبراً دائرۂ اسلام میں داخل کرنا اصولاً غلط تھا۔ کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد جو اعمال منظور و مطلوب تھے، ان کا صدور صحیح عقیدے کے دل نشین ہونے ہی پر موقوف و منحصر تھا۔ کسی کو خوف یا طمع کی بنا پر ہم نوا بنا لینے سے نہ وہ حقیقۃً مسلمان بن سکتا تھا، نہ اس سے وہ اعمال سرزد ہونے کی امید رکھی جا سکتی تھی، جن کا متقاضی اسلام تھا۔ نہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا کیونکہ خوف و طمع کے اسباب زائل ہوتے ہی وہ پہلی حالت پر لوٹ جاتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دوسرے مرکز سے زیادہ خوف یا زیادہ طمع کے اسباب فراہم کر دیے جاتے تو وہ ادھر ڈھلک جاتا۔

یہ نظام کار محض اسی اعتبار سے خاص توجہ اور خاص دل بستگی کا مستحق نہیں کہ اس زمانے میں وجود پذیر ہوا، جب ملکی یا بین الملی دستاویزوں کا رواج تک نہ تھا اور جس دور کے لیے وضع ہوا تھا اس میں خاصی مدت تک کامیاب رہا۔ اس اعتبار سے بھی حد درجہ قابل قدر ہے کہ جن اصحاب کے پیش نظر اہم کام ہوتے ہیں، وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی زیادہ سے زیادہ اشتراک کے اصول مرتب کر سکتے ہیں، بشرطیکہ خلوص و حسن نیت کے ساتھ ہر گروہ کے طبعی حقوق کا واقعی احترام منظور رہو اور کسی گروہ کو لفظی ہیر پھیر کے ذریعے سے پھندے میں پھانسنے کا خیال نہ ہو۔ ہر گروہ کے طبعی حقوق خوش دلی کے ساتھ مان لینے میں کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ حق پرست اور صالح جماعت ان حالات میں بھی تدریجاً سب سے آگے نکل جائے گی۔ محض اقتدار کے پجاری بہتر سے بہتر شرائط کے ساتھ بھی چند قدم آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور کبھی نہیں ہوئے۔

بنیادی مقاصد

رسول اللہ صلعم نے مدینہ منورہ کی مختلف آبادیوں کے درمیان اشتراک و تعاون کے لیے جو نظام مرتب فرمایا اس کے بنیادی مقاصد کسی خاص توضیح کے محتاج نہیں۔ مثلاً:

۱۔ ہر آبادی فی الجملہ پرسکون زندگی بسر کرنے کی خواہاں ہوتی ہے تاکہ وہ یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ کسب

معاش میں مصروف رہے۔ زیادہ سے زیادہ کمائے، اولاد کی بہتر سے بہتر تربیت کرے اور معاشرے کے تعلق میں ضروری واجبات بوجہ احسن انجام دے۔ بدامنی طبعاً کسی بھی سلیم الفطرت انسان کے نزدیک پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی۔

۲۔ ہر فرد اور گروہ کے جو عقائد و مراسم ہیں، ان پر کوئی نامناسب پابندی عائد نہ ہو۔

۳۔ فتنہ و فساد کے ہر سرچشمے کا دہانہ بند کیا جائے۔

۴۔ بیرونی حملوں اور یورشوں کی روک تھام اس لیے ضروری ہے کہ اس سے نہ صرف داخلی امن ہی برباد ہوتا ہے بلکہ لوگوں کے وسائل معاش، تربیت اولاد، تحفظ مال و جان اور ادائے واجبات معاشرہ کا ہر نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زندگی کی پوری فضا بے یقینی کے طوفانوں کی جولاں گاہ بن جاتی ہے۔ جب تک انسان کی فطرت مسخ نہ ہو جائے وہ ایسی صورت حال پیدا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

یہ مقاصد اس تحریر پر بار بار غور کرنے سے آپ پر بے تکلف آشکارا ہوتے جائیں گے۔

اصل دستور العمل

اصل دستور العمل کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ اس نے "صحیفہ" کے نام سے شہرت پائی۔ آپ اسے "نوشتہ" "معاہدہ" یا "اقرار نامہ" کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے "حکم نامہ" قرار دیا ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا، جو نبی ہیں، ایک نوشتہ یا معاہدہ ہے، قریش اور اہل یثرب میں ایمان لانے والوں اور ان کے توابع کے لیے، جو ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

۱۔ یہ سب، ان لوگوں کے مقابلے میں ایک ملت (سیاسی وحدت) متصور ہوں گے، جو اس نوشتے کی پابندی میں شریک نہیں۔

۲۔ قریش میں سے جو لوگ ہجرت کر کے آئے وہ پیشتر کے دستور کے مطابق خون بہا مل کر ادا کریں گے اور اپنے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے، تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۳۔ بنو عوف حسب سابق اپنا واجب الادا خون بہا خود مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ ادا کر کے چھڑائے گا، تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۴۔ بنو حارث بن خزرج حسب سابق اپنا واجب الادا خون بہا خود مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ ادا کر کے چھڑائے گا، تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

بنو ساعدہ حسب سابق اپنا واجب الادا خون بہا خود مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ ادا کر کے

چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۔ بنو جشم حسب سابق اپنا واجب الادا خون بہا خود دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ ادا کر کے چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۷۔ بنو نجار حسب سابق اپنا واجب الادا خون بہا خود دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ ادا کر کے چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۸۔ بنو عمرو بن عوف حسب سابق اپنا واجب الادا خون بہا خود مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۹۔ بنو نبیت (اوس) حسب سابق اپنا واجب الادا خون بہا خود مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۰۔ بنو اوس حسب سابق اپنا واجب الادا خون مل کریں گے اور ہر گروہ اپنا قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۲ء تا ۱۰ء تک ہر فقرے کی عبارت ایک ہے البتہ گروہوں کے نام بدلتے گئے ہیں)

شعار و شان اہل ایمان

۱۱۔ ایمان والے لوگ اپنے میں سے کسی ایسے شخص کو جو مفلس ہو یا قرض کے بوجھ سے دبا ہوا ہو امداد دیے بغیر نہ رہیں گے تاکہ اس کا خون بہا یا فدیہ بخوبی ادا ہو جائے۔

۱۲۔ کوئی ایمان والا اپنے کسی ایمان والے بھائی سے اجازت لیے بغیر اس کے مولیٰ (معاہداتی بھائی) سے معاہدہ نہ کرے گا۔

(یعنی ایمان والوں کے درمیان کسی طرح کی غلط فہمی پیدا ہونے کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔)

۱۳۔ پرہیزگار ایمان والے ہر اس شخص کی مخالفت کے لیے متحد رہیں گے، جو سرکشی اختیار کرے۔ ظلم، گناہ اور تعدّی کے ہتھکنڈوں سے کام لے۔ ایمان والوں کے درمیان فساد پھیلائے۔ ایسے شخص کی مخالفت میں ایمان والوں کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھیں گے۔ اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی ہو۔

۱۴۔ کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کافر (حربی) کے بدلے میں قتل نہ کرے گا اور نہ کسی ایمان والے کے خلاف کسی کافر (حربی) کو امداد دے گا۔

۱۵۔ خدا کا عہد اور ذمہ ایک ہی ہے۔ ایمان والوں میں سے کوئی معمولی سا فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا۔ ایمان والے دوسروں کے مقابلے میں باہم بھائی بھائی ہیں۔

۱۶۔ یہودیوں میں سے جو ہمارا اتباع کرے گا، اسے امداد اور مساوات حاصل ہوگی، نہ ان میں سے کسی پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

۱۷۔ ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ راہ خدا میں جنگ ہو تو کوئی ایمان والا دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا۔ یہ صلح سب ایمان والوں کے لیے برابر اور یکساں ہونی چاہیے۔

۱۸۔ ان تمام گروہوں کو جو ہمارے ساتھ ہو کر لڑیں گے، نوبت بہ نوبت آرام کا موقع دیا جائے گا۔

۱۹۔ ایمان والوں کو خدا کی راہ میں جو نقصانِ جان اٹھانا پڑے، اس کا بدلا وہ مل کر لیں گے۔

۲۰۔ بلاشبہ پرہیزگار ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

قریش پناہ سے مستثنیٰ

۲۱۔ کوئی مشرک (جو اس معاہدے میں شریک ہے) قریش کے مال و جان کو پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی ایمان والے کے آڑے آئے گا۔

۲۲۔ جو شخص کسی ایمان والے کو قتل کرے گا اور اس کا ثبوت بھی مل جائے گا تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ بجز اس صورت کے کہ مقتول کے خون بہا لینے پر راضی ہو جائے۔ تمام ایمان والوں پر لازم ہے کہ اس کی تعمیل کے لیے اٹھیں۔ اس کے سوا ان کے لیے کوئی صورت جائز نہ ہوگی۔

۲۳۔ کسی ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل کے مندرجات کا اقرار کر چکا ہو۔ نیز وہ خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، ہرگز جائز نہ ہوگا کہ کوئی نئی بات نکال کر فتنہ انگیزی کے ذمہ دار کی حمایت کرے یا اسے پناہ دے۔ جو اس کی حمایت کرے گا یا پناہ دے گا، وہ قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور غضب کا مستوجب ٹھہرے گا، جہاں کوئی فدیہ یا بدلا قبول نہ کیا جائے گا۔

۲۴۔ اگر اس دستور العمل کی پابندی کرنے والوں میں کسی معاملے کے متعلق اختلاف پیدا ہو جائے تو اس سلسلے میں اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے۔

یہودیوں کے حقوق

۲۵۔ یہودی جب تک ایمان لانے والوں کے ساتھ ہو کر دشمن کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے، اپنے مصارف بھی خود ہی برداشت کرتے جائیں گے۔

۲۶۔ بنو عوف کے یہودی ایمان والوں کے ساتھ ایک امت (سیاسی وحدت) متصور ہوں گے۔ یہودی اپنے دین پر رہنے کے مجاز ہیں اور مسلمان اپنے دین پر، خواہ موالی ہوں یا اصل۔ البتہ جو لوگ ظلم یا زیادتی کے مرتکب ہوں گے وہ اپنی ذات اور گھرانے کے سوا کسی کو مصیبت میں نہیں ڈالیں گے۔

۲۷۔ بنو نجار کے یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو یہود بن عوف کے ہیں۔
(یعنی جن کا ذکر دفعہ ۲۶ میں آچکا ہے)

۲۸۔ یہود بنی حارث کے بھی وہی حقوق ہوں گے، جو یہود بنی عوف کے ہیں۔

۲۹۔ یہود بنی ساعدہ کے بھی وہی حقوق ہوں گے، جو یہود بنی عوف کے ہیں۔

۳۰۔ یہود بنی جشم کے بھی وہی حقوق ہوں گے، جو یہود بنی عوف کے ہیں۔

۳۱۔ یہود بنی اوس کے بھی وہی حقوق ہوں گے، جو یہود بنی عوف کے ہیں۔

۳۲۔ یہود بنی ثعلبہ کے بھی وہی حقوق ہوں گے، جو یہود بنی عوف کے ہیں۔ البتہ جو ظلم یا زیادتی کے مرتکب ہوں گے، وہ اپنی ذات یا گھرانے کے سوا کسی کو مصیبت میں نہ ڈالیں گے۔

۳۳۔ جفنہ بنو ثعلبہ کی شاخ ہیں، لہذا یہود بنی جفنہ کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو یہود بنی ثعلبہ کے ہیں۔

۳۴۔ بنو شطیبہ[۱] کے حقوق بھی وہی ہوں گے، جو یہود بنی عوف کے ہیں۔ وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

۳۵۔ بنو ثعلبہ کے موالی کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو اصل کے لیے بیان کیے جا چکے۔

۳۶۔ یہود کی تمام شاخوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو اصل کے لیے بیان کیے جا چکے۔

دفاع اور انسدادِ ظلم

۳۷۔ کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر جنگ کے لیے نہ نکلے۔

۳۸۔ زخم کا بدلا لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ جو شخص خونریزی کا مرتکب ہو تو ذمہ داری اس پر اور اس کے گھرانے پر عائد ہوگی، بجز اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو اور خدا اس کے ساتھ ہے۔

۳۹۔ یہود اپنے خرچ کے ذمہ دار ہوں گے، مسلمان اپنے خرچ کے ذمہ دار ہوں گے۔

۴۰۔ اس معاہدے کے شرکا کے خلاف جو بھی جنگ کرے گا تو وہ (یعنی یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی پر کاربند رہیں گے۔ ان کا شیوہ وفاداری ہوگا، نہ کہ عہد شکنی۔

۴۱۔ کسی شخص کو حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے گا اور مظلوم کو بہرحال مدد دی جائے گی۔

۴۲۔ یہود جب تک ایمان والوں کے ساتھ ہو کر جنگ کرتے رہیں گے، اپنے مصارف جنگ کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

حرمت مدینہ منورہ

۴۳۔ یثرب کا میدان[۲] اس دستور العمل کے شرکا کے نزدیک مقدس و محترم ہوگا۔

۴۴۔ پناہ گیر کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے گا جو پناہ دہندہ کے ساتھ ہو رہا ہو۔ نہ

---

[۱] البدایہ والنہایہ میں ہے "بنو شطنہ" (جلد سوم ص ۲۲۵) [۲] اس میدان سے مراد ہے، وہ قطعۂ زمین جس کے شمال اور جنوب میں پہاڑ ہیں یعنی ثور و عیر۔ مشرق و مغرب میں حرے ہیں یعنی حرۂ واقم اور حرۂ وبرہ۔ رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری کے وقت اس میں متعدد آبادیاں یا محلے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ پورا میدان حرم پاک کی طرح مقدس و محترم قرار پایا۔

اسے نقصان پہنچایا جائے گا، نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

۴۵۔ کسی عورت کو اس کے کنبے والوں کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔

۴۶۔ شرکائے معاہدہ کے درمیان کوئی نئی بات ہو یا کسی معاملے میں نزاع رونما ہو جائے جس سے فساد کا اندیشہ ہو تو اسے اللہ تعالیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اس دستور العمل میں جو کچھ درج ہے خدا کو پسند ہے کہ اس کی پابندی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور وفا شعاری سے کی جائے۔

۴۷۔ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی اور نہ اس شخص کو جو ان کا معاون ہو۔

۴۸۔ اگر کوئی یثرب پر حملہ آور ہو تو یہودیوں اور مسلمانوں پر ایک دوسرے کی امداد لازم ہوگی۔

تعاون اور مذہبی جنگ

۴۹۔ اگر یہودیوں کو صلح کر لینے اور اس میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی تو وہ اسے قبول کریں گے۔ اگر یہودی کسی سے صلح کریں گے اور مسلمانوں کو شرکت کی دعوت دیں گے تو ان کے لیے بھی اسے قبول کر لینا لازم ہوگا بجز اس صورت کے کہ کوئی دین کے سلسلے میں جنگ کرے (یعنی مذہبی جنگ میں کسی فریق پر تعاون کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی)

۵۰۔ ہر گروہ کے حصے میں اسی رخ کی مدافعت آئے گی جو اس کے بالمقابل ہو۔

۵۱۔ اوس کے یہودیوں کو خواہ وہ موالی ہوں یا اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہ معاہدہ قبول کرنے والوں کو حاصل ہیں۔

۵۲۔ یہ نوشتہ یا معاہدہ کسی ظالم یا مجرم کے آڑے نہ آئے گا۔ جو جنگ کے لیے نکلے وہ بھی اور جو گھر میں بیٹھا رہے وہ بھی، امن کا حقدار ہوگا۔ صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو ظلم یا جرم کے مرتکب ہوں۔

۵۳۔ خدا اس کا حامی اور نگہبان ہے جو عہد و اقرار میں وفا شعار اور پرہیزگار ہو اور خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے حامی اور نگہبان ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا تبصرہ

ڈاکٹر حمید اللہ اس معاہدے یا دستور العمل کو جسے "صحیفہ" کا نام دیا گیا، دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور قرار دیتے ہیں[۱] اور فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں مکہ ایک منظم شہری ریاست تھا، جہاں مختلف اغراض و مقاصد کے لیے کم و بیش پچیس سرکاری عہدے تھے۔ اس کے برعکس یثرب میں، جس نے آگے چل کر مدینہ منورہ کا نام پایا اس وقت نراج کی کیفیت تھی۔ یعنی کوئی منظم حکومت نہ تھی۔ عرب (اوس و خزرج) بارہ قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یہودی دس قبیلوں میں منقسم تھے

---

[۱] "عہد نبوی میں نظام حکمرانی" (ص ۷۴)

ہر قبیلے کا ایک الگ رَواج تھا۔ وہ اپنے اپنے سقیفے[1] یا ساحتان میں اپنے اپنے امور طے کیا کرتا تھا۔ رسول اللہ صلعم تشریف لائے تو متعدد ضرورتیں تھیں، جنھیں پُورا کیے بغیر چارہ نہ تھا مثلاً،

ا۔ اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین۔

۲۔ مہاجرین مکہ کے توطن اور بسر بود کا انتظام۔

۳۔ شہر کے غیر مسلم عربوں، خصوصاً یہودیوں سے سمجھوتا۔

۴۔ شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

یہ دستور العمل انھی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مرتب ہوا تھا[2]۔

یہ دستور العمل جس صورت میں ہم تک پہنچا، اس سے سرسری نظر میں بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگرچہ اس کے بنیادی اصول پہلے سے طے کر لیے گئے ہوں، تاہم اس کی تکمیل میں کچھ نہ کچھ وقت لگا۔ بعض امور کی تکرار سے واضح ہوتا ہے کہ مختلف قبیلوں اور گروہوں سے الگ الگ بات چیت کر کے دفعات ایسے انداز میں لکھی گئیں کہ وہ سب کے لیے اطمینان و دلجمعی کا باعث ہوں۔ مثلاً،

ا۔ دفعہ ۲۵ میں ذکر ہے کہ یہودی جب تک مسلمان کے ساتھ ہو کر لڑتے رہیں گے، اپنے مصارف خود برداشت کریں گے۔ دفعہ ۳۹ میں اس کا اعادہ ہے اور اسے بلاوجہ یا اتفاقی نہیں سمجھا جا سکتا۔

۲۔ یہودیوں کے حقوق کا مسئلہ قبیلہ وار اور شاخ وار دفعہ ۲۶ سے دفعہ ۳۶ تک جاتا ہے لیکن یہود اوس کا ذکر دفعہ ۴۵ میں الگ آیا ہے۔ حالانکہ دفعہ ۳۱ میں بھی ان کا ذکر آ چکا تھا۔

۳۔ اختلاف کی صورت میں پہلے دفعہ ۲۴ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ خدا اور رسول اللہ صلعم کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ پھر دفعہ ۴۶ میں یہی ذکر آیا ہے۔

اصل نکتہ جس پر سب سے بڑھ کر توجہ ہونی چاہیے، یہ ہے کہ ہر گروہ کے جائز حقوق کی حفاظت میں قطعاً تامل نہ کیا گیا اور اشتراکِ عمل کی ایک خوشگوار صورت پیدا کر لی گئی۔ اگرچہ یہودیوں نے اپنی فطرت و عادت کے مطابق جلد ہی عہد شکنی اور بدمعاملگی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ کبھی مسلمانوں کی تنظیم ان کچلے

---

[1] یہ تصور غالباً سقیفہ بنی ساعدہ پر مبنی ہے، جہاں رسول اللہ صلعم کی وفات پر انصار جمع ہو گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں ہر چھوٹی بڑی آبادی سہولتِ اجتماع کے لیے کوئی نہ کوئی مشترکہ مکان بنا لیتی ہے۔ مثلاً تکیے، چاوڑیاں وغیرہ۔ اسی قسم کا مکان سقیفہ بنی ساعدہ تھا۔ اغلب یہی ہے کہ ایسے مکان یثرب کی ہر آبادی میں ہوں، اگرچہ ان کے ذکر کی نوبت نہیں آئی۔

[2] عہد نبوی کا نظام حکمرانی (ص ۸۰ - ۸۲)

ہوا بنی۔ کبھی قریش کی انگیخت نے انھیں بدعہدی پر آمادہ کیا۔ کبھی ذاتی منافع اور رعب و اقتدار میں کمی انھیں پریشان کرنے لگی۔ آخران کے تمام مقاصد و مطامع انھی کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جل کر خاکستر ہوگئے۔ حسن نیت، حسنِ معاملت اور ایفائے عہد کے مقابلے میں بدنیتی، بدعملی اور بدعہدی کا انجام ہمیشہ یہی ہوا اور یہی ہوگا۔

غزوات

اذن قتال

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا

کفار قریش کے بے پناہ ظلم

اب ذرا غور فرمالیجیے کہ مسلمانوں کو قتال کی اجازت کن حالات میں ملی؛ ابتدائے دعوت سے انھیں جو کٹھن منزلیں پیش آئیں، ان کا اجمالی نقشہ یہ ہے،

۱۔ دعوت حق کے ساتھ ہی مسلمانوں پر جور و ظلم کا لا متناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ خود رسول اللہ صلعم کو ہر قسم کے آزار پہنچائے گئے۔ خصوصاً پیروانِ حق کے اس قدوسی گروہ پر انسانیت سوز ستمگاریوں میں کوئی کسر حتی الامکان اٹھا نہ رکھی گئی۔ جو غریب، ضعیف اور بے یار و مددگار تھے صرف اس لیے کہ وہ خدائے برحق کی پرستش کرتے تھے، جو یگانہ و یکتا ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی کی دعوت دیتے تھے، لیکن کسی کو جبراً ہم عقیدہ نہیں بناتے تھے۔

۲۔ پیروان حق کی حالت زیادہ رنج افزا ہوئی تو وہ حضور صلعم کے ارشاد کے مطابق ہجرت کرکے حبش چلے گئے، مگر کفار قریش نے انھیں حبشہ سے نکلوانے کے لیے ایک وفد تحفوں کے ساتھ دربار حبش میں بھیجا۔

۳۔ طائف میں اوباشوں نے حضور صلعم پر پتھر برسائے، جس سے پیشانی مبارک کا خون پائے مبارک تک پہنچ گیا۔

۴۔ تیرہ سال تک ہر قسم کی سختیاں صبر سے برداشت کر لی گئیں۔ جب ان کا خاتمہ ہوتا نظر نہ آیا تو گھر بار چھوڑ کر مکہ مکرمہ سے اڑھائی سو میل شمال کی ایک بستی میں چلے گئے اور رسول اکرم صلعم نے جن خوفناک مصائب میں ہجرت فرمائی وہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔

۵۔ اتنی دور جانے کے باوجود قریش نے مدینہ منورہ کے یہود سے ساز باز کی۔ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں کو کہا کہ تم لوگوں نے ہمارے آدمی (رسول اللہ صلعم) کو پناہ دی۔ یا تو خود اس کے خلاف جنگ کرو اور اسے نکال دو، ورنہ خدا کی قسم ہم لاؤ لشکر کے ساتھ تم پر حملہ کریں گے۔ تمھارے مردوں کو مار دیں گے اور تمھاری عورتوں کو اپنے لیے جائز سمجھیں گے۔

۶۔ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا ابتدائی دور اس حالت میں گزرا کہ وہ ہر وقت ہتھیار پہنے رہتے تھے کہ خدا جانے کس وقت حملہ ہو جائے۔ راتوں کو پہرے دیتے اور معمولی سا کھٹکا بھی ہوتا تو دیکھ بھال کے لیے نکل پڑتے۔

مقابلے میں عزم کی منزل

ظاہر ہے "مظلومی میں صبر" کا دور گزر چکا تھا اور اب "مقابلے میں عزم" کی منزل پیش آ گئی تھی۔ نیز دفاع کی اجازت دے دی گئی۔ جس پر سورۂ حج کی ارتیسویں،

انتالیسویں اور چالیسویں آیات مشتمل ہیں یعنی :

اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ۝ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۝ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

جو لوگ ایمان لائے ہیں یقیناً اللہ (ظالموں کے ظلم وتشدد) سے ان کی مدافعت کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ امانت میں خیانت کرنے والوں کو کہ کفران نعمت کر رہے ہیں کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ جن مومنوں کے خلاف ظالموں نے جنگ چھیڑ رکھی ہے اب انھیں بھی (جواب میں) جنگ کی رخصت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے گھروں سے نکال دیے گئے۔ ان کا کوئی جُرم نہ تھا مگر صرف یہ کہ وہ کہتے ہیں ہمارا پروردگار اللہ ہے اور دیکھو اگر اللہ بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا (اور ایک گروہ کو دُوسرے گروہ پر ظلم و تشدد کے لیے بے روک چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں[۱] جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔

[illegible]گ کا اذن مولاناؒ فرماتے ہیں: ان آیات میں : مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھا سکتے ہیں۔ بالاتفاق یہ پہلی آیت ہے جو "اذن قتال" کے بارے میں نازل ہوئی۔

اس سے پہلے قریش مکہ کا یہ ظلم بیان کر دیا تھا کہ انھوں نے مسلمانوں پر حج کی راہ بند کر دی ہے[۲] جس کا انھیں کوئی حق نہیں۔ اب یہاں صاف صاف لفظوں میں واضح کر دیا کہ جواز قتال کی علت کیا ہے؟ فرمایا بانھم ظلموا، اس لیے

---

[۱] صوامع، یعنی خانقاہیں، بیع، مسیحوں کی عبادت گاہیں یعنی گرجے، صلوٰت یہودیوں کی نمازگاہیں۔ "زرقانی" کے مطابق "اذن قتال" کی تاریخ ۱۲۔ صفر ۲ھ (۱۵۔ اگست ۶۲۳ء) تھی۔ تقویم کے مطابق اس روز دوشنبہ تھا یعنی پیر۔ [۲] بہ اشارہ سورۂ حج کی آیت ۲۵ کی طرف ہے؛

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور وہ اللہ کی راہ سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

مسلمان مظلوم ہیں اور مظلوم کا حق ہے کہ ظالم کے مقابلے میں اپنا بچاؤ کرے۔

یہ مظلوم تیرہ برس تک قریش مکہ کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے رہے۔ بالآخر ترک وطن پر مجبور ہوئے لیکن غربت میں بھی انھیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ آخر ان کا قصور کیا تھا؟ صرف یہ کہ، یقولوا ربّنا اللہ وہ کہتے تھے کہ ہم اپنے یقین کے مطابق اپنے پروردگار کو یاد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دوسروں کو مجبور نہیں کرتے کہ ہمارا اعتقاد تسلیم کرلیں۔ لیکن دوسرے ہمیں کیوں مجبور کرتے ہیں کہ اپنے اعتقاد سے دست بردار ہو جائیں؟

اس کے بعد واضح کیا کہ یہ مظلوموں کا قدرتی حق ہے۔ اگر وہ اس حق سے محروم کر دیے جائیں تو دنیا میں انسانی ظلم و استبداد کی مدافعت کا کوئی سامان نہ رہے۔ جس گروہ کی بن پڑے، دوسرے گروہ کے اعتقاد و عمل کی آزادی ہمیشہ کے لیے پامال کر ڈالے۔ چنانچہ فرمایا، یہاں اللہ نے ایک جماعت کے ہاتھوں دوسری جماعت کے ظلم و تشدد کو رفع کرنے کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ اگر یہ سلسلہ مدافعت بعض بہ بعض نہ ہوتا تو دنیا میں خدا پرستی کا خاتمہ ہو جاتا۔ کسی گروہ کی عبادت گاہ انسانی ظلم و استبداد کے ہاتھوں محفوظ نہ رہتی۔

سورۂ توبہ کی ابتدائی آیتیں

فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں سورۂ توبہ کی ابتدائی تیس یا چالیس تک آیتیں نازل ہوئیں اور پیغمبر اسلام (صلعم) نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کو ذی قعدہ میں مکہ بھیجا کہ حج کے موقع پر بطور اعلان عام کے یہ آیات مشتہر کر دیں۔ یعنی:

۱۔ جن جماعتوں نے بدعہدی کی ان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں رہا۔ تاہم اچانک ان پر حملہ نہیں کیا جاتا۔ چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے، حج کے دن سے شروع ہو کر ۱۰۔ ربیع الآخر کو ختم ہوگی[۱] اس عرصے میں ان کو نقل و حرکت کا پورا امن حاصل ہوگا۔ لیکن اس کے بعد جنگ کی حالت تصور کی جائے گی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۶)

اللّٰہِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ ؕ وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۠

لوگوں کو روکتے ہیں۔ نیز مسجد حرام کی زیارت سے مانع ہیں کہ جسے ہم نے بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے عبادت گاہ ٹھہرایا ہے۔ خواہ وہاں (مکہ مکرمہ) کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے اور جو بھی مسجد حرام میں راستی سے سرتابی کر کے ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

[۱] یہ مہلت یوم حج ۹ھ (۱۹ مارچ ۶۳۱ء) سے ۱۰۔ ربیع الآخر ۱۰ھ (۱۹۔ جولائی ۶۳۱ء) تک تھی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

۲۔ جن جماعتوں نے بدعہدی نہیں کی ان کے معاہدے اپنی جگہ قائم ہیں۔

۳۔ حرم کعبہ اب شرک کی تمام آلودگیوں سے پاک کر دیا گیا ہے جو مشرکین عرب نے پیدا کر دی تھیں۔ آیندہ یہ عبادت گاہ صرف اہل توحید و ایمان کے لیے ہو گی۔ کوئی مشرک آیندہ سال سے اس کا قصد نہ کرے۔ (التوبہ ۲۸)

سورۂ توبہ کی ساتویں آیت سے تیرھویں آیت تک یہ حقیقت واضح کر دی کہ دشمنوں کی پے در پے عہد شکنیوں اور ظلم و عداوت کی انتہا نے کس طرح اعلان جنگ ناگزیر بنا دیا۔ فرمایا: جن لوگوں نے بار بار عہد کیے اور

(بقیہ ص ۲۵۷)

واضح رہے کہ اس مدت سے جہاں یہ مقصود تھا کہ انھیں اچانک حالت جنگ سے سابقہ نہ پڑ جائے، وہاں یہ بھی مقصود تھا کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے روش و طریق سلوک میں مطلوب و اطمینان بخش تبدیلی کرنا چاہیں تو کر لیں۔ گویا اس صورت میں بھی مصالحت و مفاہمت کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ ان کی سابقہ روش کو ہر اعتبار سے ناقابل برداشت قرار دے دیا گیا تھا۔

لے اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ط اَتَخْشَوْنَهُمْ ج فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ع مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنھوں نے اپنے عہد و پیمان اور قسمیں توڑ ڈالیں جنھوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے باہر نکالنے کے منصوبے کیے۔ پھر تمھارے خلاف لڑائی میں پہل بھی انھی کی طرف سے ہوئی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر مومن ہو تو اللہ اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ اس کا ڈر تمھارے دل میں بسا ہو۔ مسلمانو! ان سے جنگ کرو۔ اللہ تمھارے ہاتھوں انھیں عذاب دے گا۔ رسوائی میں ڈالے گا ان پر تمھیں فتح مند کرے گا اور جماعت مومنین کے سارے دکھ دور کرے گا ان کے دل کی جلن جاتی رہے گی پھر جس پر چاہے گا اپنی رحمت سے لوٹ آئے گا۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر بات میں حکمت رکھنے والا ہے۔ (مسلمانو) کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ اتنے ہی میں چھوڑ دیے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی تو اللہ نے ان لوگوں کو پوری طرح آزمایش میں ڈالا ہی نہیں، جنھوں نے تم سے جہاد کیا ہے اور اللہ، اس کے رسول اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

بار بار خلاف ورزی کی۔ پھر صلح حدیبیہ کا آخری عہد بھی ظالمانہ طریق پر پامال کیا۔ اب ان کا عہد کیونکر عہد سمجھا جا سکتا ہے؟[1] ہاں جو فریق اس عہد پر قایم رہے تو یقیناً ان کا عہد اپنی جگہ قایم ہے۔ اسلام کسی حال میں بھی بد عہدی جائز نہیں رکھ سکتا۔

فرمایا: ان کی دلی عداوت کا یہ حال ہے کہ اگر اب بھی قابو پائیں تو ایک مومن کو زندہ نہ چھوڑیں[2] لوگوں کے خلاف اعلان جنگ نہ کیا جاتا تو نتیجہ یہ نکلتا کہ مسلمان دائمی خطرے میں چھوڑ دیئے جاتے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لڑائی کا جو حکم دیا گیا اس کا تعلق بھی صرف ان مشرک جماعتوں سے تھا جو عرب میں دعوت اسلام کی پامالی کے لیے لڑ رہی تھیں، نہ کہ دنیا جہان کے مشرکوں کے ساتھ۔[3] چنانچہ اول سے آخر تک خطاب خاص جماعتوں سے ہے۔

انتقام و انقطاع سے کامل برأت

پھر غور کرو قرآن ہر جگہ اس جنگ کا مقصد کیا قرار دیتا ہے جس کی اجازت اس نے دی؟ سورۂ توبہ کی آیت ۱۲ میں فرمایا: لَعَلَّهُمْ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۸)

بِالْكُفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ۔ (توبہ ۱۳-۱۷)

مومنوں کے سوا کسی کو اپنا پوشیدہ دوست بنایا ہے۔ جیسے کچھ بھی تمہارے اعمال ہیں۔ خدا ان سب کی خبر رکھنے والا ہے مشرکوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کی مسجدیں ایسی حالت میں آباد کریں جب وہ اپنے کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔ ان کے سارے عمل اکارت گئے اور وہ عذاب آتش میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

[1] اشارہ ہے اس ٹکڑے کی طرف:

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ ۔ (توبہ: ۷)

یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو۔

[2] كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ (توبہ: ۸)

ان مشرکوں کا عہد کیونکر عہد ہو سکتا ہے جب ان کا یہ حال ہے کہ آج تم پر غلبہ پا جائیں تو نہ تمہاری قرابت کا پاس کریں، نہ عہد و پیمان کا۔

[3] البتہ اگر آج یا کسی زمانے میں مشرکوں اور مخالفوں کے گروہ دعوت اسلام کی پامالی کے لیے ویسی ہی صورت اختیار کریں جیسی مشرکین عرب نے اختیار کر رکھی تھی تو مسلمانوں کے لیے اس حکم پر عمل پیرا ہونے کے سوا چارہ نہ رہے گا۔

ینتھون[1] تاکہ ظلم و بدعہدی سے باز آجائیں۔

اسی طرح سورۂ انفال کی آیت ۵۷ میں ہے لعلھم یذکرون[2] "تاکہ یہ عبرت پذیر ہوں۔

یعنی دفاعی جنگ بھی انتقام کے خیال سے یا دنیوی انقطاع و تغلب کے لیے نہیں۔ محض اس لیے ہے کہ ارباب ظلم و تشدد اپنی بدکرداری سے باز آجائیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ناگزیر حالت سے زیادہ ایک لمحے کے لیے بھی قرآن نے جنگ کا قیام جائز نہیں رکھا۔

سورۂ توبہ کی آیت ۱۴ میں چھ باتیں فرمائیں:[3]

۱۔ یعذبھم اللہ بایدیکم : تمہارے ہاتھوں انھیں عذاب ملے گا۔

۲۔ ویخزھم : اور وہ رسوا ہوں گے۔

۳۔ وینصرکم علیھم : اور تم ان پر فتح پاؤ گے۔

۴۔ و یشف صدور قوم مومنین : مومنوں کے دلوں میں انھی مصیبتوں اور اندوہوں کے جتنے داغ ہیں سب دور ہوجائیں گے۔

۵۔ ویذھب غیظ قلوبھم : ان کے دلوں کی جلن نکل جائے گی۔

۶۔ و یتوب اللہ علیٰ من یشاء : جنھیں توبہ ملنی ہے وہ تائب ہوں گے۔

خدا کا لکھا پورا ہوا

چنانچہ غور کرو کس طرح یہ باتیں حرف بہ حرف پوری ہوئیں:

۱: مشرکین عرب کی ہستی ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔

---

[1] پوری آیت یہ ہے:

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ۔ (توبہ: ۱۲)

اگر یہ اپنے عہد و پیمان جو خود کرچکے ہیں توڑ ڈالیں اور تمہارے دین کو برا بھلا کہیں تو ان کفر کے سرداروں سے جنگ کرو ان کی سوگند، سوگند نہیں تاکہ ظلم و بدعہدی سے باز آجائیں۔

[2] پوری آیت یہ ہے:

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِى الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔

اگر تم لڑائی میں انھیں پاؤ تو ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہیں (مشرکین مکہ) انھیں بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوں۔ شکست سے عبرت پکڑیں۔

[3] یہ آیت پچھلے صفحے پر حاشیے میں نقل ہوچکی ہے۔

ب : انھی مسلمانوں کے ہاتھوں جو بیس برس تک مشرکوں کے ظلم سہتے رہے تھے، ان کی قوت کا خاتمہ ہوگیا۔

ج : ان کی رسوائی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگئی۔

د : پھر مسلمانوں کے دلوں کو مظلومیت و بے چارگی کے سارے دکھوں سے کبھی نہ شفا کامل مل گئی کہ پچیس برس کے اندر وہ کرۂ زمین کی سب سے اشرف اور بہتر مخلوق تسلیم کیے گئے۔

باب ۴

مصالحتی اور دفاعی مہمیں

(ہجرت سے غزوۂ بدر تک)

رسول اللہ صلعم نے ہجرت کے بعد مختلف سمتوں میں چھوٹی چھوٹی مہمیں بھیجنے کا انتظام فرما دیا تھا۔ بعض مہموں کی سرکردگی آپؐ نے بہ نفس نفیس فرمائی۔ ان میں سے بعض کو "سریتے" اور بعض کو "غزوے" کہا جاتا ہے۔ وُہ تفصیلات کے متقاضی نہ تھے، چونکہ ان کی بنیادی حیثیت مصالحت یا انسداد جنگ کی تھی۔ اس لیے ان کا ذکر کم سے کم الفاظ میں کر دینا مناسب سمجھا گیا۔ میں نے ان کے صرف اہم واقعات کی طرف اشارے کیے ہیں۔

غزوۂ ابوا — رسول اللہ صلعم صفر ۲ھ (اگست ۶۲۳ء) میں مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ سعدؓ بن عبادہ کو قائمقام مقرر فرما دیا۔ آپؐ نے ودّان کا قصد کیا، جو ابواؔ[1] کے پاس ہے۔ یہ دونوں مقام ضلع فرع میں واقع ہیں اور دونوں کے درمیان چھ یا آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ اسی لیے حضور صلعم کے اس غزوے کو "غزوۂ ابوا" بھی کہتے ہیں اور "غزوۂ ودّان" بھی۔ ابوا وہی مقام ہے جہاں مستند روایت کے مطابق حضور صلعم کی والدۂ ماجدہ نے یثرب سے مراجعت پر وفات پائی تھی اور آپ وہیں دفن ہوئی تھیں۔

یہاں حضور صلعم نے بنو ضمرہ بن عبد مناف (بن کنانہ) سے معاہدہ فرمایا، جس پر بنو ضمرہ کے رئیس مخشی بن عمرو نے دستخط کیے تھے۔ یہ پہلا غزوہ تھا جس میں حضور صلعم بہ نفس نفیس شریک ہوئے۔

حضرت عبیدہ کی مہم — ابوا سے واپسی پر رسول اللہ صلعم نے ماہ صفر کے باقی دن اور ربیع الاول کا مہینا مدینہ منورہ میں گزارے۔ ربیع الآخر ۲ھ (مطابق اکتوبر ۶۲۳ء) میں عبیدہ بن الحارث کو ساٹھ یا اسّی شتر سواروں کے ساتھ بھیجا اور وہ ثنیۃ المرّہ[2] کے پاس ایک چشمے پر پہنچ گئے جہاں قریش کی ایک جمعیت عکرمہ بن ابی جہل (ایک روایت کے مطابق مکرز بن حفص) کی سرکردگی میں موجود تھی لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ البتہ سعدؓ بن ابی وقاص نے

---

[1] مکہ اور مدینہ کے درمیان رابغ ایک مشہور مقام ہے۔ یہاں سے شمال کی جانب چلیں تو 'ابوا' پہنچ جائیں گے۔ رابغ سے شمال میں راس مستورہ تمام نقشوں میں ملتی ہے۔ اس کے پاس ابوا ہے۔ مدینہ منورہ سے اس کا فاصلہ اسّی یا ایک سو میل ہوگا۔ [2] ثنیۃ المرّہ ایک پہاڑ ہے جس کا ذکر سفر ہجرت میں بھی آیا ہے۔ سب نے المرّہ بہ تشدید لکھا ہے، لیکن یاقوت نے تخفیف را کی تصریح کی ہے۔

جو اس مہم میں شامل تھے، ایک تیر چلایا۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا تیر تھا۔ قریش کے ساتھ مقدادؓ بن عمرو اور عتبہ بن غزوان بھی تھے۔ وہ اسلام قبول کر چکے تھے لیکن ان کے لیے رسول اللہ صلعم کے پاس پہنچنے کی کوئی صورت نہیں بنی تھی۔ اس مہم سے فائدہ اٹھا کر وہ دونوں مسلمانوں کے پاس پہنچ گئے۔ عتبہ بن غزوان وہی ہیں جنھوں نے آگے چل کر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں بصرہ کی بنیاد رکھی تھی۔

حضرت حمزہؓ کی مہم

حضور صلعم نے عبیدہ بن الحارث کو بھیجنے کے بعد حضرت حمزہؓ کو تیس سواروں کے ساتھ عیص کی جانب ساحل بحر پر بھیجا۔ ان کی مڈبھیڑ قریش مکہ کے تین سواروں سے ہوگئی جو ابوجہل کی قیادت میں تھے۔ لیکن لڑائی نہ ہوئی، کیونکہ مجدی بن عمرو الجہنی دونوں فریقوں میں حائل ہوگیا۔ مجدی کے تعلقات دونوں سے بہت اچھے تھے۔ عبیدہؓ یا حمزہؓ کی مہموں کے تمام شرکا مہاجرین تھے۔ انصار میں سے کوئی نہ تھا۔

غزوہ بواط

ربیع الآخر ۲ھ (اکتوبر ۶۲۳ء) میں خود حضور صلعم مدینہ منورہ پر سائبؓ بن عثمان بن مظعون کو قائمقام بنا کر بواط گئے جو رضوی کا ایک مقام ہے اور لوٹ آئے۔ اس سلسلے میں کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ بواط (بہ فتح یا بہ ضم ب) جُہینہ کے علاقے کا ایک پہاڑ ہے جس کی دو بلند چوٹیاں ہیں۔ اس وجہ سے اسے "بواطان" بھی کہتے ہیں۔

غزوہ عُشیرہ

جمادی الاولیٰ ۲ھ (مطابق نومبر ۶۲۳ء) میں حضور صلعم نے ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کو قائمقام بنا کر عُشیرہ کا سفر اختیار کیا جو بطن ینبوع میں ہے، آپ نے جمادی الاولیٰ کے باقی ایام اور جمادی الاخریٰ کے کچھ دن وہیں گزارے۔ اس اثنا میں بنومدلج سے مصالحت کی جو بنوضمرہ کے حلیف تھے۔ بنوضمرہ کے بعد بنومدلج سے مصالحت میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ مولانا شبلی مرحوم نے روض الانف اور زرقانی کے حوالے سے قبائل کے ساتھ مصالحت کا جو نمونہ پیش کیا ہے، اس کے اہم اجزا یہ ہیں:

۱۔ قبائل کا جان و مال محفوظ رہے گا۔

۲۔ جو ان پر حملہ آور ہوگا اس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی، سوائے اس صورت کے کہ قبائل اللہ کے دین کے خلاف لڑیں۔

۳۔ رسول اللہ صلعم جب انھیں مدد کے لیے بلائیں گے تو وہ امداد کو آئیں گے۔

ظاہر ہے، اس قسم کے معاہدوں کا مقصد محض یہ تھا کہ قبائل مسلمانوں کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جائیں اور قریش کو جارحانہ اقدامات میں ان سے کوئی مدد نہ مل سکے۔ اس کے دو فائدے تھے:

۱۔ مسلمانوں کے لیے مدینہ منورہ کے آس پاس خصوصاً اس مقام پر جہاں سے قریش کے قافلے گزرتے رہتے تھے۔ امن و مصالحت کا حلقہ مضبوط و مستحکم اور وسیع ہو جاتا۔

۲۔ خود قبائل کے درمیان رزم و پیکار کا سلسلہ رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا۔

غزوۂ بدر الاولیٰ

غزوۂ عُشیرہ سے مراجعت پر دس روز گزرے تھے کہ کُرز بن جابر الفہری نے مدینہ منورہ کی چراگاہ پر حملہ کر دیا۔ کچھ درخت کاٹے، ایک آدمی کو شہید کیا اور کچھ جانور پکڑ کر لے گیا۔ رسول اللہؐ اس کے تعاقب میں نکلے، یہاں تک علاقہ بدر کی اس وادی تک پہنچ گئے، جس کا نام سفوان ہے۔ لیکن کرز بچ کر نکل گیا۔ لہٰذا آپ مراجعت فرما ہوئے۔

اس غزوے کو "بدر الاولیٰ" بھی کہتے ہیں کیونکہ حضور صلعم بدر تک گئے اور غزوۂ سفوان بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ اس خاص وادی کا نام ہے جہاں تک آپؐ نے تعاقب کیا تھا۔

سعدؓ بن ابی وقاص کی مہم

پھر آپؐ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو آٹھ مہاجروں کے ساتھ بھیجا اور وُہ خرار تک گئے۔ جو جحفہ کے قریب ایک وادی ہے یعنی رابغ کے شمال میں۔ خیال ہے کہ یہ مہم بھی کُرز ہی کے تعاقب میں بھیجی گئی تھی۔ لیکن کُرز نہ ملا۔ نہ کوئی لڑائی ہوئی اور سعدؓ بخیر و عافیت لوٹ گئے۔

عبداللہ بن جحش کی مہم

رجب سنہ ۲ھ کے اواخر میں عبداللہ بن جحش کو آٹھ آدمیوں کے ساتھ ایک مہم پر بھیجا۔ سفر کی سمت بتا دی اور ایک تحریر حوالے کر دی کہ دو روز کے بعد اسے دیکھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا۔ عبداللہ نے دو روز کے بعد تحریر دیکھی۔ اس میں فرمایا گیا تھا کہ نخلہ پہنچو اور وہاں قریش کی کارروائیوں یا ان کے قافلے کی دیکھ بھال کرو اور ضروری خبریں ہمیں پہنچاؤ لیکن رفیقوں میں سے کسی کو اس کی مرضی کے خلاف عمل پیرائی پر مجبور نہ کرو۔

عبداللہ نے تمام ساتھیوں پر واضح کر دیا کہ جسے شہادت کی آرزو ہو، وہ ساتھ رہے۔ لیکن کسی نے بھی اختلاف نہ کیا البتہ سعدؓ بن ابی وقاص اور عتبہؓ بن غزوان کا اونٹ گم ہو گیا۔ یہ دونوں اس کے تعاقب میں پیچھے رہ گئے۔ باقی اصحاب نخلہ میں جا اترے۔ ان کے پاس سے قریش کا ایک قافلہ گزرا جس کے اونٹوں پر منقّی، چمڑا اور دوسرا تجارتی سامان لدا ہوا تھا۔ عمرو بن الحضرمی بھی اس قافلے کے ساتھ تھا۔

قافلۂ قریش کے آدمیوں نے ان مہاجرین کو دیکھا تو ان پر ہیبت چھا گئی۔ عُکاشہ بن مِحصَن کا سر مُنڈا ہوا تھا تو سمجھا کہ یہ لوگ عمرہ کر کے آ رہے ہیں، لہٰذا ان سے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

ابن جحشؓ کا فیصلہ اور واپسی

عبداللہ بن جحش نے ساتھیوں سے کہا کہ اگر آج رات ان پر حملہ نہ کیا تو کل یہ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور ان پر ہاتھ نہ اٹھایا جا سکے گا۔ اگر آج ان پر حملہ کیا گیا تو یہ رجب کا آخری دن ہے[1] اگر ان میں سے کوئی قتل ہُوا تو یہ قتل ماہ حرام میں ہو گا[2]۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ یہ لوگ مکہ پہنچتے ہی

---

[1] ۳۰۔ رجب سنہ ۲ھ مطابق ۲۷۔ جنوری ۶۲۴ء یوم جمعہ۔ [2] معلوم ہے کہ عربوں کے نزدیک رجب کا مہینا حرمت والے چار مہینوں میں شامل تھا، جن میں قتل ممنوع تھا۔

قریش کو مہاجرین کے حالات بتائیں گے اور وہ موقع پر پہنچ کر فتنہ برپا کریں گے۔ غرض غور و فکر کے بعد حملے کا فیصلہ ہوا۔ واقد تیمی کے تیر سے عمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ عثمان بن عبداللہ اور الحکم بن کیسان کو قید کر لیا گیا نوفل بن عبداللہ بچ کر نکل گیا۔ عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھی قافلے کے اونٹوں اور قیدیوں کو لے کر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ ابن جحش نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ رسول اللہ صلعم کے لیے الگ کر لیا، باقی ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ مدینہ منورہ پہنچ کر پوری سرگزشت بارگاہ رسالت میں پیش کر دی۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمھیں حرمت کے مہینے میں قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ چنانچہ مال غنیمت اور قیدیوں کا معاملہ معرض التوا میں پڑ گیا۔

باری تعالیٰ کا فیصلہ

پھر یہ آیت نازل ہوئی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ

(سورہ بقرہ: ۲۱۷)

اے پیغمبر! لوگ پوچھتے ہیں کہ جو مہینا حرمت کا مہینا سمجھا جاتا ہے اس میں لڑائی کرنا کیسا ہے۔ کہہ دو کہ اس میں لڑنا بڑی بُرائی کی بات ہے (مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ) انسان کو اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام میں نہ جانے دینا، نیز وہاں کے بسنے والوں کو نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برائی ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلعم نے خمس لے لیا۔ مال غنیمت بانٹ دیا اور سعدؓ و عتبہؓ کی بہ سلامت واپسی کے بعد مکی قیدیوں کا فدیہ لے کر انھیں رہا کر دیا۔ قیدیوں میں سے الحکم بن کیسان نے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ ہی میں رہا۔ بئر معونہ کے واقعے میں شہادت پائی۔ دُوسرا قیدی یعنی عثمان بن عبداللہ مکہ میں بہ حالتِ کفر مر گیا۔

عمرو بن حضرمی ہی کے قتل کو ابوجہل نے مختلف تدبیروں سے غزوۂ بدر کا بنیادی سبب بنا لیا تھا، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ (مولف)

غزوۂ بدر

باب ۳۵

غزوۂ بدر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ (آل عمران: ۱۲۳)

—(۱)—

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر اڑھائی سو میل شمال میں چلے آئے تھے تاکہ اطمینان سے دین حق کی تبلیغ کر سکیں لیکن قریش کی عداوتوں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔

ابن ابیّ سے ساز باز قریش نے سب سے پہلے عبداللہ بن ابی اور اس کے ہم نواؤں کو ساز باز کے لیے چُنا۔ یہ لوگ مدینہ منورہ کے بڑے عرب قبیلوں اوس و خزرج دونوں میں سے تھے اور اس وقت تک انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ قریش نے انھیں لکھا کہ تم نے ہمارے جس آدمی کو اپنے ہاں ٹھہرا لیا ہے، اس سے لڑو اور نکال دو یا ہم سب یکبارگی تم پر حملہ کر دیں گے۔ تمھارے جوانوں کو قتل کریں گے اور عورتوں کو اپنے قبضے میں لے آئیں گے۔

ابن ابیّ اور اس کے ساتھیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کا ارادہ کیا۔ آپ کو اطلاع ملی تو بہ نفس نفیس ان لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور سمجھایا کہ قریش نے تم سے داؤ کھیلا ہے۔ اگر لڑو گے تو اپنے فرزندوں اور بھائیوں سے لڑو گے جو مسلمان ہو چکے ہیں۔ دونوں طرف نقصان تمھارا ہی ہوگا لیکن اگر تمھیں قریش سے لڑنا پڑا تو یہ غیروں سے مقابلہ ہوگا۔ حضورؐ کا یہ ارشاد اس درجہ دل نشیں تھا کہ وہ لڑائی کے ارادے سے دست بردار ہو گئے۔

یہودیوں سے جوڑ توڑ اس کے بعد قریش نے مدینہ منورہ کے یہودیوں سے سازش کی۔ جب یہودیوں کو اپنے ساتھ ملا چکے، حالانکہ وہ معاہدۂ مدینہ یعنی "صحیفہ" میں شریک ہو چکے تھے، تو مسلمانوں کو کہلا بھیجا کہ مکہ سے صاف بچ نکلنے پر مغرور نہ ہو جانا، ہم اب بھی تمھیں چھوڑیں گے نہیں۔

ساتھ ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ربیع الاول ۲ھ (ستمبر ۶۲۳ء) میں ایک قریشی سردار کرز بن جابر الفہری مدینہ منورہ پہنچا جو مویشی میدان میں چر رہے تھے، انھیں پکڑ کر لے گیا۔ تعاقب کیا گیا مگر صاف بچ کر نکل گیا۔ یہ اس امر کا اعلان تھا کہ قریش مسلمانوں کو مدینۂ منورہ میں بھی اطمینان کا سانس نہ لینے دیں گے اور مدت تک یہ حال رہا کہ رسول اللہ

---

[۱] اور اللہ بدر کے میدان جنگ میں تمھیں فتح مند کیا تھا حالانکہ تم بڑی گری ہوئی حالت میں تھے۔

صلی اللہ علیہ وسلم راتیں جاگ جاگ کر گزارا کرتے تھے۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "آج کوئی اچھا آدمی پہرا دیتا" چنانچہ سعدؓ بن ابی وقاص نے رات بھر پہرا دیا، تب آپ نے آرام فرمایا۔

دو موثر جوابی تجویزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ کی حفاظت کے لیے دو موثر تجویزیں سوچیں: اول قریش کی شامی تجارت کا راستہ مخدوش بنانے کا فیصلہ، دوم مدینہ منورہ کے آس پاس جو قبیلے رہتے تھے، ان سے امن و امان کے معاہدوں کے لیے سعی و کوشش۔ چنانچہ امن و امان کے معاہدوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

قریش جنگ پر تُلے بیٹھے تھے اور اس کے لیے مصارف کی تجویز یہ سوچی گئی کہ اہل مکہ کے پاس جو سرمایہ تھا وہ شام جانے والے قافلے کے حوالے کر دیا جائے اور اس سفر تجارت میں جتنا منافع ہو وہ پورے کا پورا مسلمانوں کے خلاف سروسامان جنگ کی تیاری میں لگایا جائے۔ یہی تجارتی قافلہ تھا جس پر حملہ ابتدا میں مسلمانوں کے پیش نظر تھا اور سورۂ انفال میں "احدی الطائفتین" سے ابتدا میں یہی قافلہ سمجھا گیا، جس میں ایک ہزار اونٹ تھے اور پچاس ہزار دینار کا سامان تجارت تھا۔

تجارتی قافلے پر حملے کا مسئلہ اس باب میں قافلے کو حملے کا ہدف تسلیم کرنے سے گریز اں ہونا سراسر تکلف ہے۔ قریش اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ قائم تھی اور حالت جنگ میں دشمن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا قطعاً مستوجب طعن نہیں ہو سکتا۔ جن بزرگوں نے اس باب میں "تکلفات" فرمائے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے حقیقی صورت حال پیش نظر نہیں رکھی اور صرف اس خیال سے متاثر ہو گئے کہ کہیں مسلمانوں پر غارت گری کا الزام عائد نہ ہو جائے، لیکن پیش بندی کے طور پر دشمن کو نقصان پہنچانا اور اسے جنگ کے معاملے میں بے دست و پا بنا دینا ہر اعتبار سے درست اور جائز ہے اور یہ سب کے نزدیک تدابیر جنگ میں سے ایک موثر تدبیر ہے۔ "الفتنۃ اشد من القتل"، "و الفتنۃ اشد من القتل" کا مطلب بھی یہی ہے۔

خدا جانے اس بدیہی حقیقت سے اعراض کیوں مناسب سمجھا گیا؟ یہ غارت گری نہ تھی۔ ایک جانی دشمن کے لبریز عناد منصوبوں کو ناکام و نامراد بنانے کی کوشش تھی۔ کیا یہ حقیقت نہ تھی کہ قریش مکہ ان املاک پر قابض ہو گئے تھے جو مہاجرین چھوڑ کر گئے تھے، قریش کے حملے اور چھاپے جاری تھے حالانکہ مسلمان نہ قریش سے لڑنے کے خواہاں تھے، نہ کسی اور سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ قافلے پر حملہ جارحانہ حرکت نہ تھی بلکہ یہ سراسر دفاعی اقدام تھا جو حالت جنگ کے دوران میں کیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مشیت ایزدی نے تجارتی قافلے پر حملے کے بجائے جنگ بدر کا سروسامان کر دیا، جسے قرآن مجید "یوم الفرقان" سے تعبیر کرتا ہے یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلے کا دن۔

معذرت آمیز انداز کیوں؟ اصل میں کسی بھی معاملے کے متعلق معذرت آمیز انداز اختیار کرنا ضعف موقف کا

نشان ہوتا ہے اور جب موقف ضعیف اختیار کر لیا جائے تو اسے دلائل کے زور اور الفاظ کی فراوانی سے مستحکم نہیں بنایا جا سکتا۔ معہذا مسئلہ کے بنیادی حقائق آفتاب جہان تاب کی طرح درخشاں ہوں تو ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے معذرت کا پہلو اختیار کر لینا سراسر حیرت افزا ہے۔

ابوسفیان کا الارم

بلاشبہ رسول اللہ صلعم قریش کے تجارتی قافلے کی مراجعت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے طلایہ گردستے بھیجتے رہتے تھے۔ ایسی ہی کوئی اطلاع پا کر مدینہ منورہ سے نکلے۔ ادھر ابوسفیان بھی جو سالار قافلہ تھا، بے خبر اور غافل نہ تھا۔ اسے بھی تشویش تھی کہ مسلمان اس کی تلاش میں ہوں گے۔ جو لوگ راستے میں ملتے تھے ان سے پوچھ گچھ کے بعد اطمینان کے بغیر قدم آگے نہیں بڑھاتا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان راستے کا چکر لگا رہے ہیں تو اس نے بدر پہنچنے سے پیشتر ہی ضمضم غفاری کو مکہ مکرمہ بھیج دیا تاکہ قریش کو خبر کر دے، قافلہ خطرے میں ہے اور اس کے بچاؤ کے لیے جو کچھ کیا جا سکے، جلد از جلد کر لو۔ اس وقت تک کوئی بدیہی اور قریبی خطرہ اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔

موکب رسالت کی حرکت

مدینہ منورہ سے رسول اللہ صلعم کے روانہ ہونے کی تاریخ ابن اسحاق کے مطابق ۸۔ رمضان ۲ھ (۴ یا ۵۔ مارچ ۶۲۴ء) ہے۔ دن دوشنبہ یعنی پیر کا تھا۔ یہ بیان تقویم کے عین مطابق ہے۔ ابن سعد نے تاریخ روانگی ۱۲۔ رمضان ۲ھ (۸۔ مارچ ۶۲۴ء) بتائی ہے اور لکھا ہے کہ دن شنبہ یعنی ہفتے کا تھا۔

منازل سفر

اس سفر میں رسول اللہ صلعم جن مقامات سے گزرے ان کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے، عقیق، ذوالحلیفہ (موجودہ آبار علی) اولات الجیش، تربان، ملل[1]، عمیس الحمام[2]، صخیرات الیمامہ، سیالہ، فج الروحا[3]، شنوکہ، عرق الظبیہ، سجسج[4]، منصرف، النازیہ، وادی رحقان، صفرا[5]، وادی ذفران۔ اسی مقام پر پہلی مرتبہ رسول اللہ کو اطلاع ملی کہ قریش مکہ کا لشکر تجارتی قافلے کی حفاظت کے لیے آ رہا ہے۔ یہاں تک "طائفتین" میں سے صرف ایک پیش نظر تھا، یعنی تجارتی قافلہ، دوسرے کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہ تھا۔ اب دونوں طائفے منظر عام پر آ گئے تھے قرآن مجید کا ارشاد ہے،

---

[1] مدینہ منورہ سے بیس میل [2] وفاالوفا میں اسے عُمیس بھی لکھا ہے [3] یہیں بئرالروحا ہے جو مدینہ منورہ سے چالیس میل بتایا جاتا ہے بعض کہتے ہیں کہ چھتیس میل ہے [4] یہاں سے مکہ مکرمہ جانے والا راستہ بائیں جانب چھوڑ کر آپ نے دائیں جانب کا راستہ اختیار کیا۔ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک کے راستوں کی کیفیت معلوم نہیں۔ ترکوں کے عہد حکمرانی میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان جو راستہ "طریق سلطانی" کے نام سے مشہور تھا، اسے سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ سے پہلی منزل آبار علی تھی، دوسری بئر درویش، تیسری مسیجد، جسے بئر عباس بھی کہتے ہیں۔ یہیں سے رسول اللہ صلعم نے طریق مکہ چھوڑا اور دائیں جانب کا راستہ لیا۔ [5] صفرا کو پھر بائیں ہاتھ چھوڑا اور دائیں جانب چلتے ہوئے ذفران پہنچے۔

اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم۔ حب اللہ نے تم سے وعدہ فرمایا تھا کہ دشمن کے دونوں گروہوں میں سے ایک ضرور تمھارے ہاتھ آئے گا۔

ذفران ہی کی منزل میں وہ مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جسے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ تجارتی قافلے کے بجائے لشکر قریش سے مڈبھیڑ کی نوبت آئی تو کیا کرنا چاہیے۔

مسلمان طلایہ گرد رسول اللہ صلعم نے ایک روایت کے مطابق صفرا سے، دوسری روایت کے مطابق مدینہ منورہ سے بسبس بن عمرو الجہنی اور عدی بن ابی الزغبا کو تجارتی قافلے کی خبریں لانے کے لیے بدر بھیج دیا تھا۔[1] وُہ بدر پہنچے، پانی کے پاس اونٹ بٹھائے اور مشکیزہ بھرنے لگے۔ اس اثنا میں دو لڑکیاں پانی لینے کے لیے آ رہی تھیں اور جھگڑ بھی رہی تھیں۔ ایک کا قرض دوسری کے ذمے تھا اور قرض خواہ تقاضا کر رہی تھی۔ دوسری نے جواب دیا کہ کل پرسوں قافلہ آنے والا ہے۔ میں ان کے پاس مزدوری کر کے تیرا قرض ادا کر دوں گی۔ مجدی بن عمرو الجہنی نام ایک شخص وہیں تھا یہ پہلے بھی قریش اور مسلمانوں کی لڑائیاں رکوا چکا تھا۔ اس نے قافلے کے آنے کی تصدیق کی اور دونوں لڑکیوں کا جھگڑا ختم کرا دیا۔ بسبس اور عدی کے لیے اتنی خبر کافی تھی اور یہی خبر انھوں نے رسول اللہ صلعم تک پہنچا دی۔

قافلہ بچ نکلا ان کے جانے کے بعد ابو سفیان بدر پہنچا اور مجدی سے پوچھا کہ کیا تم نے کسی کی آہٹ پائی ہے؟ مجدی نے بتایا کہ دو سوار آئے تھے اور اونٹ بٹھا کر انھوں نے پانی مشکیزے میں بھرا تھا۔ ابو سفیان اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ پہنچا۔ مینگنیاں اٹھا کر توڑیں۔ ان میں کھجور کی گٹھلیوں کے ریزے دکھائی دیے۔ یہ اہل مدینہ کے اونٹوں کا خاص چارہ تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان قافلے کی تلاش میں ہیں۔ چنانچہ وہ تیزی سے قافلے کی طرف لوٹا اور بدر سے اس کا رُخ پلٹا کر اس راستے پر چل دیا جو ساحل بحر کے ساتھ تھا، یعنی بدر کو اس نے بائیں ہاتھ چھوڑ دیا۔

حکمت الٰہی اب حکیم مطلق کی حکمت نوازی ملاحظہ ہو کہ پہلے دشمن کا ایک گروہ پیش نظر تھا یعنی قافلہ اور دوسرے کا گمان بے شک ہو گا، لیکن اس کا وجود یقینی نہ تھا پھر دونوں گروہ منظر عام پر آ گئے۔ اب پہلے گروہ یعنی قافلے نے معمولی سا نشان خطر دیکھ کر راستہ بدل لیا اور وہ منظر عام سے غائب ہو گیا۔ دشمن کا جو گروہ پہلے غائب تھا اور صرف اس لیے وجود پذیر ہوا تھا کہ قافلے کو گزند نہ پہنچنے دے، وہ قافلے کے سلامت نکل جانے کے باوصف ابو جہل کے اصرار کی بنا پر واپس نہ ہُوا بلکہ دندناتا ہوا بدر آیا تاکہ آس پاس کے قبیلوں پر اپنی قاہری و جباری کا رعب جمائے۔ ان دو گروہوں میں سے ایک کے ہاتھ آنے کا خدائی وعدہ ایسے انداز میں پورا ہوا کہ جنگ بدر سے اسلامی تاریخ میں حق کی فتح اور باطل کی شکست و ریخت کا دروازہ کھل گیا۔

منازل قریش یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ قریش کو مکہ مکرمہ سے نکل کر بدر پہنچنے میں آٹھ دن لگے۔ منازل کی مجمل کیفیت یہ ہے:

---

[1] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان طلایہ گردوں کو دو مرتبہ بھیجا گیا؛ ایک مرتبہ مدینہ منورہ سے اور دوسری مرتبہ راستے سے۔

۱۔ مکہ مکرمہ اور عُسفان کے درمیان ابوجہل نے پُورے لشکر کے لیے دس اونٹ ذبح کیے۔

۲۔ عُسفان — امیہ بن خلف نے نو اونٹ ذبح کیے۔

۳۔ قُدَید — سہیل بن عمرو نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۴۔ قُدَید سے قریش سمندر کی طرف چلے جہاں میٹھا پانی تھا وہاں کے قیام میں شیبہ بن ربیعہ نے نو اونٹ ذبح کیے۔

۵۔ جُحفہ — عتبہ بن ربیعہ نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۶۔ ابوا — ابناء حجاج نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۷۔ ابوا اور بدر کے درمیان۔ عباس نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۸۔ بدر — ابوالبختری نے دس اونٹ ذبح کیے۔

ذَفران کی مجلس قریش کی آمد کے متعلق اطلاع پاتے ہی رسول اللہ صلعم نے صحابہ کو جمع کیا تاکہ آئندہ کے متعلق ان کی رائے معلوم ہو جائے۔ سب سے پہلے ابوبکرؓ نے موثر تقریر کی۔ پھر عمرؓ بولے۔ بعد میں مقدادؓ بن عمرو نے کہا:

یارسول اللہ! اللہ آپ کو جو کچھ فرمائے، وہی کیجیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم، ہم وُہ نہ کہیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ: اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون[1]۔ اس خدا کی قسم جس نے حق کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا۔ اگر آپ برک الغماد[2] تک بھی چلے جائیں تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے یہاں تک کہ آپ وہاں پہنچ جائیں۔

حضور صلعم نے یہ سن کر تعریف فرمائی اور دعا کی، لیکن ابوبکرؓ، عمرؓ اور مقدادؓ تینوں مہاجرین میں سے تھے۔ حضور صلعم انصار کی رائے سننا چاہتے تھے کیونکہ خیال تھا شاید انصار نے حفاظت کی ذمہ داری صرف مدینہ منورہ کے لیے اٹھائی تھی، چنانچہ آپ نے پھر فرمایا مجھے مشورہ دو۔ اب سعدؓ بن معاذ[3] اٹھے اور کہا:

یارسول اللہ شاید آپ ہم سے خطاب فرما رہے ہیں۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے۔ آپ کی تصدیق کی اور گواہی دی کہ آپ جو تعلیم لائے ہیں وُہ سچی ہے۔ ہم آپ کی فرمانبرداری اور اطاعت کے پختہ وعدے کر چکے۔ آپ جس طرف ارادہ فرمائیں، تشریف لے چلیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو

---

[1] تم چلے جاؤ اور تمہارا خدا چلا جائے تم دونوں وہاں لڑنا۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ [2] برک الغماد یمن میں ہے اور مکہ مکرمہ سے پانچ منزل کی مسافت ہے۔ عربوں کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مسافت کی یہ بھی ایک تعبیر تھی۔ [3] حضرت انسؓ کی روایت میں سعدؓ بن معاذ کی جگہ سعدؓ بن عبادہ ہے۔

ہادی کے ساتھ مبعوث کیا۔ اگر آپ سمندر بھی ہمارے سامنے سے آئیں اور اس میں داخل ہوں تو ہم آپ کے ساتھ داخل ہو جائیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم اسے ناپسند نہیں کرتے کہ کل آپ ہمیں لے کر دشمنوں سے مقابل ہوں۔ ہم جنگ میں استوار اور مقابلے میں سچے ہیں۔ امید ہے خدا آپ کو ہماری طرف سے ایسے کارنامے دکھائے، جن سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ آپ اللہ کی برکت سے چلیے

حضور صلعم سعدؓ کی تقریر سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا
چلو اور خوش ہو جاؤ کہ اللہ نے میرے ساتھ دونوں گروہوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے اور میں گویا اس وقت قریش کے پچھڑنے کے مقامات دیکھ رہا ہوں۔

ذفران سے رسول اللہ صلعم روانہ ہوئے تو ان گھاٹیوں میں سے گزرے جنھیں الاصافر کہتے ہیں۔ پھر الدبہ نام بستی میں قیام فرمایا۔ بعد ازاں حنان کو دائیں جانب چھوڑا، یہ ایک ٹیلا ہے جو بڑے پہاڑ کی مانند ہے اور آپ نے بدر کے قریب نزول فرمایا۔ شام ہوئی تو علیؓ، زبیرؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص کو ایک جماعت کے ساتھ بدر کے چشمے کی جانب روانہ فرمایا کہ کچھ خبریں لے آئیں۔ وہ دو غلاموں کو گرفتار کر لائے جو لشکر قریش کے لیے پانی لانے کی خدمت پر مامور تھے۔ ان سے ابوسفیان کے متعلق پوچھا تو جواب ملا ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ پھر انھیں زدوکوب کیا تو دونوں نے اقرار کر لیا کہ ہم ابوسفیان کے ملازم ہیں۔ اس پر انھیں چھوڑ دیا۔

رسول اللہ صلعم نماز پڑھ رہے تھے۔ سلام پھیرا تو فرمایا کہ جب انھوں نے سچ کہا تو تم نے مارا، جب جھوٹ کہا تو چھوڑ دیا
پھر آپ بنفس نفیس مخاطب ہوئے، فرمایا: مجھے قریش کے متعلق بتاؤ۔
غلام: اس ٹیلے کے پیچھے ہیں، جو دور نظر آ رہا ہے۔
اس سے ان کا اشارہ اس ٹیلے کی طرف تھا، جس کا نام عقنقل ہے اور اس طرف کے ناکے کو "العدوۃ القصویٰ" کہتے ہیں۔

پھر فرمایا: وہ لوگ کتنے ہیں؟
غلام: بہت ہیں۔
فرمایا: کھانے کے لیے روزانہ کتنے اونٹ ذبح کیے جاتے ہیں؟
غلام: کسی روز نو، کسی روز دس۔
اس جواب سے حضور صلعم نے اندازہ فرما لیا کہ لشکر قریش کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے اور یہ اندازہ بالکل درست تھا کیونکہ قریش کی تعداد ساڑھے نو سو بیان کی گئی ہے۔
فرمایا: قریش کے سربرآوردہ لوگوں میں سے کون کون ہیں؟

غلام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوالبختری بن ہشام، حکیم بن حزام، نوفل بن خویلد، حارث بن عامر، طعیمہ بن عدی، نضر بن حارث، زمعہ بن الاسود، ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف، سہیل بن عمرو، عمرو بن عبدود۔
یہ سن کر رسول اللہ صلعم نے اپنے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے مقابلے کے لیے ڈال دیے ہیں۔

حضور صلعم بدر پہنچ کر پہلے قریبی چشمے پر اُتر گئے۔ حُباب بن منذر نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا یہ مقام ایسا ہے جہاں اللہ نے آپؐ کو اتارا ہے؟ فرمایا: نہیں۔ یہ ایک رائے ہے۔ حُبابؓ نے گزارش کی کہ یہ اچھا مقام نہیں۔ آگے تشریف لے چلیے۔ ہم اس چشمے کے پاس اتریں گے جو قریش سے قریب ہے۔ اس کے پیچھے جتنے چشمے ہیں، انھیں ناکارہ بنا دیں گے اور چشمے کے پاس حوض بنا کر اس میں پانی بھر لیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم حُبابؓ کی رائے کو صحیح قرار دیتے ہوئے آگے بڑھے اور قریش کے قریب جو چشمہ تھا، اس کے پاس نزول فرمایا۔ (مولف)

باب ۴۲

غزوۂ بدر

—(۲)—

موقع ومحل بدر

بدر مدینہ منورہ سے قریباً اسّی میل مغرب مائل بہ جنوب اس شاہراہ پر واقع ہے جو زمانۂ قدیم سے شام اور مکہ مکرمہ کے درمیان تجارتی قافلوں کی جولاں گاہ رہی ہے۔ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جانے کے اور راستے بھی ہیں، جن میں سے بعض کا فاصلہ نسبتہً کم ہے مگر لوگ بدر ہو کر بھی آتے جاتے تھے اور حال میں جو پختہ سڑک موٹروں کے لیے حرمین شریفین کے درمیان بنائی گئی ہے۔ وہ بدر سے ہوتی ہوئی گئی ہے۔ بحیرہ احمر کے ساحل سے اس مقام کا فاصلہ دس بارہ میل سے زیادہ نہ ہوگا۔

بدر بیضوی شکل کے ایک میدان میں واقع ہے جسے چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس میدان کا طول ساڑھے پانچ میل اور عرض چار میل کے قریب ہے۔ ارد گرد کے پہاڑوں کے نام الگ الگ ہیں۔ مشرقی جانب کے پہاڑوں یا ٹیلوں کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ شمال وجنوب میں دو سفیدی مائل ٹیلے ہیں اور دُور سے ریت کے بلند تودے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے شمالی ٹیلے کا نام "العدوۃ الدنیا" (قریب کا ناکا) اور جنوبی ٹیلے کا نام "العدوۃ القصویٰ" (دُور کا ناکا) ہے۔ آخری ٹیلے کے پاس جو اونچا ٹیلا ہے اسے عقنقل کہا جاتا ہے۔ مغربی جانب کا ٹیلا "جبل اسفل" کہلاتا ہے۔ یہاں سے سمندر صاف نظر آتا ہے۔ سورۂ انفال میں بہ سلسلۂ غزوۂ بدر مسلمانوں اور قریش مکہ کے ٹھہرنے کی جگہوں کا ذکر یُوں کیا گیا ہے،

و اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصویٰ والرکب اسفل منکم۔ (آیت: ۴۲)	یہ وہ دن تھا کہ تم قریب کے ناکے پر تھے۔ ادھر دشمن دُور کے ناکے پر تھا اور قافلہ تم سے نچلے حصے میں (یعنی سمندر کے کنارے) نکل گیا تھا۔

گویا پہلے دو نام یا تو نزول قرآن سے پیشتر موجود تھے یا پھر قرآن میں مذکور نام رکھ لیے گئے۔ البتہ "جبل اسفل" کا نام بظاہر یقینی طور پر نزول قرآن کے بعد رکھا گیا یا مشہور ہو گیا۔ قرآن میں "اسفل" کا تعلق پہاڑ سے نہیں، تجارتی قافلے کے نکل جانے کی سمت وجہت سے ہے، مگر وہ پہاڑ کے نام کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ سنا ہے کہ مشرقی جانب کے پہاڑ زیادہ بلند ہیں۔ ممکن ہے اس وجہ سے مغربی جانب کے پہاڑ کے لیے "جبل اسفل" نام موزوں سمجھ لیا گیا ہو، لیکن بلاشبہ یہ عجائبات تسمیہ میں سے ہے۔

آبادی کی کیفیت آبادی بظاہر خاصی بڑی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں کہ کئی سو مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں جنھیں مقامی اصطلاح میں "قصر" (جمع قصور) کہتے ہیں۔ دو مسجدیں عام نمازوں کے لیے ہیں۔ مسجد جامع جہاں نماز جمعہ ہوتی ہے اس مقام پر ہے جہاں غزوۂ بدر کے روز رسول اللہ صلعم کے لیے "عریش" یعنی سائبان بنایا گیا تھا۔ یہ بلند مقام تھا، اس لیے وہاں سے پورے میدان کا ہر حصہ صاف نظر آتا تھا۔ اس مسجد کو "مسجد العریش" بھی کہتے ہیں اور "مسجد الغمامہ" بھی۔ آخری نام کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ اس نام کی ایک مسجد مدینہ منورہ میں بھی ہے۔ کتبے کے مطابق یہ مسجد "خوش قدم" کے زیر اہتمام ۱۲۔ ربیع الاوّل ۹۰۶ھ (۵۔ اکتوبر ۱۵۰۰ء) میں بنی تھی۔ یہی سال ہے، جب مصر کے برجی مملوک حکمرانوں میں سے اشرف قانصوہ غوری مسند نشین ہوا تھا اور اسی کو اس سلسلے کا آخری حکمران سمجھنا چاہیے۔ پھر مملوک سلطنت اور عباسی خلافت دونوں عثمانی سلطان سلیم کے حوالے ہو گئیں اور ترکوں کے دورِ خلافت کا آغاز ہوا۔ "خوش قدم" حکومت مصر کی طرف سے سرکاری تعمیرات کا مہتمم تھا۔

ترکوں کے عہد حکومت میں شریف عبدالمطلب نے بدر میں ایک مستحکم قلعہ بنوایا تھا مگر بعد میں دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث وہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ چونکہ بدر ایک بڑا تجارتی مرکز اور مشہور شاہراہ تجارت کا نہایت اہم مقام تھا، اس لیے وہاں زمانہ جاہلیت میں بھی ہر سال میلہ لگتا تھا جو یکم ذی قعدہ تک رہتا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں کہ آج کل ہر جمعہ کو یہاں بازار لگتا ہے۔ اس میں لوگ دُور دُور سے اشیا بغرض فروخت لے آتے ہیں مثلاً گھی، چمڑا یا چمڑے کی بنی ہوئی مختلف چیزیں، روغن بلساں، کمل، عبائیں، اونٹ، بھیڑ بکریاں وغیرہ بعض اوقات گائیں بھی اس بازار میں آجاتی ہیں۔

میدان اور زمین میدان سنگلاخ ہے، یعنی سنگریزے یا چھوٹے چھوٹے گول پتھر جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں البتہ جنوبی و مغربی حصے کی زمین نرم ہے۔ یہاں ریگ رواں اکٹھی ہو جاتی ہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر بھی یقیناً اکٹھی ہو گئی ہو گی۔ اسی لیے روایتوں میں ہے کہ پیر دھنس دھنس جاتے تھے۔ لڑائی میدان کے اسی حصے میں ہوئی تھی۔ سورۂ انفال میں اس موقع پر افضال باری تعالیٰ میں سے بعض کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

اِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ۔ (آیت: ۱۱)	جب ایسا ہوا تھا کہ اس نے (یعنی اللہ نے) چھا جانے والی غنودگی تم لوگوں پر طاری کر دی تھی کہ یہ اس کی طرف سے (یعنی اللہ کی طرف سے) تمھارے لیے تسکین و بے خوفی کا سامان تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ تمھیں پاک و صاف ہونے کا موقع دے دے اور تم سے شیطانی وسوسوں کی ناپاکی دُور کر دے۔ نیز تمھارے دلوں کی ڈھارس

بندھ جائے اور (ریتلے میدان میں) تمھارے قدم جما دے۔

اس آیت مبارکہ کے آخری ٹکڑے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ زمین نرم تھی۔ قدم اس میں دھنس رہے تھے۔ بارش ہوئی تو ریت کی تہ جم گئی اور پیر دھنسنے کا معاملہ ختم ہوگیا۔ قریش مکہ اس جانب مزید نشیب میں تھے۔ لہٰذا بارش نے مسلمانوں کے پڑاؤ میں تو زمین کو لڑائی کے لیے موزوں بنا دیا۔ طبقات ابن سعد میں ہے: "مسلمان اڑتی ہوئی بالو پر اترے تھے۔ بارش ہوئی، جس سے وہ کوہِ صفا کی مانند ہوگئی۔ لوگ اس پر آسانی سے دوڑ سکتے تھے۔"[1] قریش کا پڑاؤ نشیب میں ہونے کے باعث دلدل کی شکل اختیار کر گیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں کہ اب اس مقام پر سرسبز نخلستان ہے۔ گویا اس حصے کی جو کیفیت نظر بظاہر غزوۂ بدر کے موقع پر ہوگی، اب باقی نہیں رہی۔

چشمے اور باغات بدر میں کنوئیں بھی ہیں اور چشمے بھی۔ بڑا چشمہ جس کی حیثیت آغاز میں زمین دوز نہر کی ہے۔ آبادی کی مسجدوں تک پہنچتے پہنچتے سطح پر آگیا ہے۔ یہ دونوں مسجدوں کے پاس سے گزرتا ہے یا کہنا چاہیے کہ مسجدیں اس کے کنارے بنائی گئی ہیں۔ اس لیے یہ چشمہ نمازیوں کے لیے وضو گاہ کا کام دیتا ہے۔ اسی سے نخلستانوں، باغوں اور کھیتوں کی آبیاری بھی ہوتی ہے۔ نخلستان میلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سبزیاں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا بیان ہے، مدینہ منورہ سے بدر تک کا راستہ بھی بہت سرسبز ہے۔ بدر اور حمرا کے درمیان گھنا جنگل ہے جسے عیص کہتے ہیں۔ غالباً یہ وہی مقام ہو، جس کا ذکر حضرت حمزہؓ کے سریہ سیف البحر میں آیا ہے۔ نیز جہاں صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابو بصیرؓ مقیم ہو گئے تھے اور مکہ مکرمہ کے مظلوم مسلمان ان کے پاس جمع ہونے لگے تھے۔ ان کی وجہ سے قریش کی تجارتی شاہراہ خطرے میں پڑ گئی تھی اور انھوں نے دلی کی رضامندی کے بغیر مدینہ منورہ پہنچے ہوئے مسلمانوں کو واپس کر دینے کی جو شرط معاہدۂ حدیبیہ میں لکھوائی تھی، اسے خود منسوخ کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ بے شک رسول اللہ صلعم ان مسلمانوں کو اپنے پاس بلا لیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے مدینہ و بدر کے درمیان میٹھا پانی بہ کثرت ملتا ہے۔ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے لیے عمدہ چراگاہیں ہیں۔ اونٹ کی سواری سے دس گھنٹے میں مدینہ منورہ سے بدر پہنچ جاتے ہیں اور موٹر میں زیادہ سے زیادہ اڑھائی تین گھنٹے کا راستہ ہوگا۔

آویزش گاہ حق و باطل یہی وہ مقام ہے جسے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے حق و باطل کے درمیان تصادم کی

---

[1] جلد دوم ص ۲۵۔

پہلی امتحان گاہ بنایا۔ حق کو ظاہری وسائل و اسباب کی فرومایگی کے باوصف کامرانی و فیروزمندی سے سرفراز کیا اور باطل کو ساز و سامان کی فراوانی، نیز تعداد کی کثرت کچھ فائدہ نہ پہنچا سکی۔ وہ سر کے بل شکست فاحش کے غار میں گر گیا اور اس کی پیشانی پر ذلت و نامرادی کی آسمانی مہریں لگ گئیں۔ غزوۂ بدر سے باطل کی جانکنی کا دور شروع ہوا۔ چھ سال کے بعد قریش مکہ کی زبانوں پر اسی وجود مقدس و مزکی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کریمی و رحیمی کے ترانے جاری تھے، جس کی دعوت حق کو روکنے کے لیے وہ لوگ بہ زعم خود عرصۂ روزگار تنگ کر دینے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔

فریقین کی کیفیت

اصل جنگ زیادہ تفصیل کی محتاج نہیں، لیکن فریقین کی قوتوں کا موازنہ اور حرب و ضرب کا عام منظر مع نتائج پیش کر دینا ضروری ہے کیونکہ مولانا نے جنگ پر صرف سرسری تبصرہ فرمایا ہے۔

سب سے پہلے فریقین کے قوائے جنگ کا نقشہ سامنے لائیے:

(۱) رسول اللہ صلعم کے صحابہ کرام کی تعداد تین سو سے کسی قدر زاید تھی۔ یہ تعداد مختلف روایتوں میں تین سو پانچ سے تین سو انیس تک بتائی گئی ہے۔ ان میں سے مہاجرین چوہتر یا چھہتر تھے، باقی سب انصار تھے۔ ان کے ساتھ دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔ گھوڑوں میں سے ایک مقدادؓ بن عمرو کا تھا، دوسرا مرثد بن ابی مرثد الغنوی کا تھا۔ اس سلسلے میں زبیرؓ بن العوام اور مصعب بن عمیر کے نام بھی آئے ہیں۔ ہر اونٹ کی سواری میں تین تین افراد شریک تھے اور باری باری سوار ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلعم کے شریک مرکب ایک حضرت علیؓ تھے اور دوسرے ابو لبابہؓ جنھیں الروحا سے مدینہ منورہ کے قائم مقام کی حیثیت میں واپس کر دیا گیا تھا۔ دونوں نے حضور صلعم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم خوشی سے پیدل چلیں گے، آپ سواری فرمائیں۔ فرمایا: نہ تم دونوں پیادہ روی میں مجھ سے زیادہ طاقت ور ہو اور نہ میں ثواب حاصل کرنے سے بے نیاز ہوں۔ یعنی پیدل چلنے کا ثواب زیادہ ہے تو میں اسے کیوں چھوڑوں؟ یہ ہے نبوی قیادت اور نبوی مساوات۔ مسلمان لیڈر ان بنیادی امور سے بالکل غافل ہو گئے ہیں اور انھوں نے اپنی برتری کے لیے سیکڑوں بہانے تلاش کر لیے ہیں، جو صرف فکر و نظر کے فریب ہیں۔

(۲) قریش کے لشکر کی تعداد کم از کم ساڑھے نو سو تھی اور ان کے ساتھ ایک سو گھوڑے تھے۔ اونٹوں کی کثرت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ہر منزل پر وہ نو یا دس اونٹ ذبح کرتے چلے آئے تھے۔ زرہیں اور باقی ساز و سامان جنگ بھی ان کے پاس بہت زیادہ تھا لیکن ریت کی دیواریں اٹھا لینا ممکن ہو تو ہو، مادی ساز و سامان کی زیادتی باطل کو کیونکر اور کب تک قائم و استوار رکھ سکتی ہے، جس کی فطرت ہی نیست و نابود ہونا اور جھاگ کی مانند اڑ جانا ہو۔ اس کے غلبہ پا لینے کا کیا سوال ہے؟ البتہ حق کو اپنے اثبات کے لیے آزمایش کی مختلف منزلوں سے گزرے بغیر چارہ نہیں۔

دعائیں سعدؓ بن معاذ نے رسول اللہ صلعم کے لیے ایک ٹیلے پر سائبان سا بنا دیا تھا۔ ابوبکرؓ حضور صلعم کے ساتھ تھے۔ سعدؓ بن معاذ دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ آپؐ نے رات دعاؤں میں گزار دی۔ مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے:

یہ عجیب منظر تھا۔ اتنی بڑی وسیع دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی .... آنحضرت صلعم پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی۔ دونوں ہات پھیلا کر فرماتے تھے: "خدایا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے آج پورا کر۔" محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر کندھے سے گر گر پڑتی تھی اور آپؐ کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ کبھی سجدے میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ خدایا اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو پوجا نہ جائے گا۔[1]

صف بندی صبح ہی صبح آپؐ نے صف بندی کی۔ تیر دست مبارک میں تھا۔ اس سے صفیں سیدھی کرتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے گئے۔ جو آگے تھا اسے پیچھے کرتے، جو پیچھے تھا اسے آگے بڑھنے کا حکم دیتے۔ اسی موقع پر سوادؓ بن غزیہ کا واقعہ پیش آیا۔ سوادؓ صف سے آگے بڑھے ہوے تھے۔ حضور صلعم نے تیر سے ان کے بطن کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا سوادؓ برابر ہو جاؤ۔ سوادؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! آپ نے مجھے تکلیف دی۔ آپؐ کو اللہ نے حق و عدل کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، مجھے بدلہ دیجیے۔ آپ نے بطن مبارک سے کپڑا اٹھا دیا اور فرمایا: سوادؓ بدلہ لے لے۔ سوادؓ نے بے تابانہ بطن مبارک چوم لیا۔ پوچھا: یہ کیا؟ عرض کیا، جنگ کا معاملہ ہے شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ جی چاہا کہ آپؐ کی جلد مبارک سے میری جلد مس کرے۔ حضور صلعم نے دعاے خیر دی۔

صف بندی کے بعد پھر سائبان یعنی عریش میں جا کر مصروف دعا ہو گئے۔

قریش نے بھی صف بندی کر لی تو عمیر بن وھب کو مسلمانوں کی تعداد معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ اس نے گھوڑے پر ہر طرف چکر لگایا۔ یہ بھی دیکھا کہ اسلامی لشکر کا کوئی حصہ چھپا ہوا تو نہیں۔ پھر بتایا کہ کم و بیش تین سو آدمی ہیں مگر ایسے ہیں کہ ان میں سے کوئی اس وقت تک نہ مرے گا، جب تک تم میں سے کسی کو مار نہ لے گا۔ پھر بتاؤ اس کے بعد تمھارے لیے زندگی میں کیا لطف ہو گا؟

ابوجہل کی فتنہ انگیزی حکیم بن حزام نے عتبہ سے کہا حضرمی کے قتل کی بنا پر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ اس کا خون بہا دے دیجیے۔ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ عتبہ تیار ہو گیا۔ ابوجہل نے سنا تو ایک طرف عتبہ کو بے ہمتی کا طعنہ دیا، دوسری طرف حضرمی کے بھائی کو اکسا دیا۔ اس نے کپڑے پھاڑے اور بھائی کا

---

[1] سیرۃ النبیؐ ص ۲۹۷ - ۲۹۸۔

ماتم شروع کر دیا۔ یوں پہلے بھی ابوجہل ہی قریش کو بدر لایا تھا حالانکہ قافلہ بچ نکلنے کی اطلاع پا کر وہ واپس جا رہے تھے۔ اب جنگ روکنے کے لیے سازگار صورت حال پیدا ہو رہی تھی، اسے بھی برباد کرنے کا ذمہ دار ابوجہل ہی ٹھہرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی یہی تھی، حق کا یہ سب سے بڑا دشمن باطل کو تصادم پر نہ محض اکسائے، بلکہ اسے یقینی بنا دے۔ جنگ کی آگ بھڑکے اس کا ایندھن خود بھی بنے اور دوسرے بڑے بڑے ساتھیوں کو بھی بنائے۔

جنگ

جنگ کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ دستور کے مطابق پہلے شیبہ، اس کا بھائی عتبہ اور اس کا بیٹا ولید میدان میں نکلے۔ مسلمانوں کی طرف سے عوفؓ اور معوذؓ، ابنائے عفرا اور عبداللہؓ بن رواحہ مقابلے کے لیے اٹھے، مگر رسول اللہ صلعم نے انھیں روک دیا اور اپنے خاندان میں سے حمزہؓ، علیؓ اور عبیدہؓ بن حارث کو بھیجا۔ عتبہ، شیبہ اور ولید تینوں مارے گئے۔ لیکن عبیدہؓ بھی سخت زخمی ہوئے۔ حضرت علیؓ انھیں کندھے پر اٹھا کر لائے۔ مدینہ منورہ واپس ہوتے ہوئے راستے میں وفات پائی۔ قریش میں سے عبیدہ بن سعید بن العاص لوہے میں ڈوبا ہوا نکلا۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ زبیرؓ بن العوام نے تاک کر برچھا آنکھوں میں مارا۔ عبیدہ گرا اور ختم ہوگیا۔

پھر عام لڑائی شروع ہوگئی۔ قریش مکہ کے کئی اکابر پے در پے مارے گئے۔ معاذؓ اور معوذؓ ابنائے عفرا نے عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے پوچھا کہ ابوجہل کون ہے؟ جب معلوم ہوگیا تو دونوں نوجوان بازوں کی طرح جھپٹے اور صفوں کو چیرتے ہوئے ابوجہل کے پاس جا پہنچے۔ جاتے ہی ایسا سخت وار کیا کہ ابوجہل گر گیا۔ اس کے بیٹے عکرمہ نے پیچھے سے معاذ کے بازو پر تلوار ماری جس سے ہاتھ کٹ گیا لیکن تسمہ لگا رہا۔ نوجوان معاذؓ نے کٹا ہوا ہاتھ پاؤں تلے دبا کر تسمہ بھی الگ کر دیا کیونکہ وہ جنگ میں حائل ہو رہا تھا۔ پھر عبداللہؓ بن مسعود نے ابوجہل کا سر کاٹا۔

رسول اللہ صلعم نے تاکید فرما دی تھی کہ بعض لوگ بادل ناخواستہ ساتھ آئے ہیں لہٰذا انھیں قتل نہ کیا جائے۔ ان میں عباس اور ابوالبختری بھی شامل تھے۔ صحابہؓ نے ان احکام کی پوری تعمیل کی۔ ابوالبختری اس لیے مارا گیا کہ وہ تنہا جان بخشی پر راضی نہ ہوا اور اپنے رفیق کو بھی بچانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اجازت لازم تھی۔

امیہ بن خلف کو عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بچا لینا چاہا لیکن بلالؓ اسے دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔ انصار کو خبر دی، چنانچہ امیہ اور اس کا بیٹا دونوں مارے گئے۔

غرض قریش مکہ کے ستر آدمی مارے گئے۔ ان میں بڑے بڑے سردار شامل تھے۔ مثلاً شیبہ، ابوجہل (عمرو بن ہشام)، ابوالبختری (العاص بن ہشام)، زمعہ بن الاسود، امیہ بن خلف، منبّہ بن الحجاج وغیرہ۔ ستر ہی اسیر ہوئے جن میں حضور صلعم کے چچا عباس، داماد ابوالعاص بن الربیع اور علیؓ کے بھائی عقیل بھی تھے۔

شہدائے بدر

صحابہ کرام میں سے چودہ شہید ہوئے، ان میں سے چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے تھے۔

مہاجرین : ۱۔ عبیدہؓ بن حارث بن المطلب۔

۲۔ عُمیر ابن ابی وقاص، سعد بن ابی وقاص کے بھائی تھے۔ رسول اللہ صلعم مدینہ منورہ سے نکلتے وقت کم عمری کی بنا پر عُمیر کو واپس کر دینا چاہتے تھے لیکن وہ رو پڑے۔ اس لیے ساتھ لے لیا۔ شہادت کے وقت صرف سولہ سال کی عمر تھی۔

۳۔ عُمیر بن عبد عمرو بن نضلہ خزاعی۔

۴۔ مہجع (حضرت عمرؓ کے [illegible] غلام) جنگ بدر کے پہلے شہید غالباً یہی تھے۔

۵۔ صفوان بن بیضا۔

۶۔ عاقل بن البکیر اللیثی۔

انصار : ۷۔ عُمیر بن الحمام کھجوریں کھا رہے تھے۔ رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے جہاد کی فضیلت سُنی تو کھجوریں پھینک دیں۔ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلوار نکالی اور کئی آدمیوں کو مار کر خود بھی شہادت پائی۔

۸۔ سعدؓ بن خیثمہ (اوسی انصاری)

۹۔ مبشر بن عبد المنذر (" ")

۱۰۔ یزید بن حارث (خزرجی انصاری)

۱۱۔ رافع بن المعلیٰ (" ")

۱۲۔ حارثہ بن سراقہ (" ")

۱۳۔ عوف بن عفرا (" ")

۱۴۔ مُعوِّذ بن عفرا (" ")

لاشوں کی تدفین

اپنے شہدا کو تو دفن کرنا ہی تھا۔ رسول اللہ صلعم کا دستور تھا کہ کوئی بھی لاش کہیں نظر آجاتی تو اسے دفن کرا دیتے۔ چنانچہ قریش کی تمام لاشیں آپؐ نے ایک گہرے گڑھے میں ڈلوا کر اوپر مٹی کی تہ جموا دی۔ امیہ بن خلف کی لاش پھول گئی تھی کیونکہ اس نے زرہ پہن رکھی تھی۔ لوہے کی زرہ نے حدت آفتاب کا عمل تیز کر دیا، اس لیے اسے گڑھے تک لے جانا ممکن نظر نہ آیا تو جہاں لاش پڑی تھی وہیں اس پر مٹی ڈلوا دی۔

ابولہب کسی وجہ سے جنگ میں شریک نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے ایک مقروض کو چار ہزار درہم کے بدلے میں بھیج دیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد بیمار ہوا اور بڑی ہی بُری حالت میں مرا۔

حضور صلعم کی دُعائیں

میں نے بعض امور کا تذکرہ نظر انداز کر دیا کیونکہ وہ سیرت کی عام کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً کنکریاں پھینکنے اور "شاہت الوجوہ" (چہرے بگڑ گئے) فرمانے کا واقعہ یا ملائکہ مقدسہ کی

اعانت و نصرت کا واقعہ۔ قرآن مجید میں ہے: و ما جعله الله الا بشریٰ ولتطمئن به قلوبکم۔

رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے کئی دعائیں مذکور ہیں مثلاً بدر کی طرف تشریف فرمائی کے وقت ایک مقام پر دعا فرمائی: "یا اللہ یہ لوگ (یعنی صحابہ کرام) بھوکے ہیں، انھیں سیر کر۔ یہ برہنہ ہیں، انھیں لباس عطا فرما۔ یہ پیدل چل رہے ہیں، ان کے لیے سواری کا انتظام کر دے۔"

دیکھیے مال دنیا کے لیے حضور صلعم کی دعا محض کفایت تک محدود رہی آگے نہیں بڑھی۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں میدان جنگ سے بار بار رسول اللہ صلعم کو دیکھنے آتا تھا: آپؐ سجدے میں گرے ہوئے تھے اور "یا حیُّ یا قیوم" فرما رہے تھے۔ آگے کوئی لفظ سننے میں نہیں آ رہا تھا۔

جنگ میں فتح پائی اور ابوجہل کا سر حضور صلعم کے پاس آیا تو تین مرتبہ فرمایا: الله الذی لا اله الا هو (اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں) پھر کہا: الله اکبر، الحمد لله الذی صدق وعده و نصر عبده وهزم الاحزاب وحده۔ (اللہ کے لیے حمد و شکر ہے جس نے اپنا وعدۂ نصرت سچ کر دکھایا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور تمام گروہوں کو اس یگانہ و یکتا نے شکست دے دی)

دیکھا! یہاں بھی اپنے رفیقوں کی فداکاری، شان عزیمت و استقامت، بے مثل بہادری، مقاصد حق کے لیے بے دریغ جانبازی یا ایسی کسی چیز کا ذکر نہ کیا حالانکہ ان میں سے ہر معاملہ روز روشن کی طرح آشکارا تھا۔ خدا کی حمد و ستایش کی۔ جس نے فتح عطا فرمائی، و ما النصر الا من عند الله۔

سفر مراجعت

رسول اللہ صلعم تین روز بدر میں قیام فرما رہے۔ پھر قیدیوں اور مال غنیمت کے ساتھ منزل بہ منزل مراجعت فرمائی۔ اسیران قریش میں سے دو دین کے بڑے دشمن تھے اور ان سے مسلمانوں کو بے حد اذیت پہنچ چکی تھی۔ انھیں قتل کرا دیا۔ صفرا میں پہنچے تو مال غنیمت بہ حصہ مساوی تقسیم فرمایا۔ اپنا حصہ بھی صحابہ کے برابر تھا۔ اس سلسلے میں اس شمشیر کا ذکر ضروری ہے جس نے ذوالفقار کے نام سے بڑی شہرت پائی۔ یہ اسی جنگ میں ہاتھ میں آئی تھی اور رسول اللہ صلعم کے لیے رکھ لی گئی۔ اونٹوں میں سے ایک اونٹ ابوجہل کی ملکیت میں سے رسول اللہ صلعم کو ملا تھا، جس کی ناک میں چاندی کا حلقہ تھا۔ یہ اونٹ حدیبیہ روانہ ہوتے وقت قربانی کے جانوروں میں شامل کر لیا گیا تھا اور معاہدۂ حدیبیہ کے بعد اسے ذبح کیا گیا۔ صفرا میں نضر بن حارث بن کلدہ کو سزائے موت ملی۔ عرق الظُبیہ میں پہنچے تو عقبہ بن معیط کو قتل کی سزا دی۔

قاصدان فتح

مدینہ منورہ پہلے ہی دو قاصد بھیج دیے تھے۔ مدینہ منورہ کے لیے زیدؓ بن حارثہ اور عالیہ کے لیے عبداللہؓ بن رواحہ کو۔ زیدؓ بن حارثہ مدینہ منورہ پہنچے تو حضرت عثمانؓ اور دوسرے لوگ حضرت رقیہؓ کی تدفین سے فارغ ہو چکے تھے۔

رسول اللہ صلعم بدر کی طرف روانہ ہوئے تو حضورؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ (اہلیہ عثمانؓ) سخت بیمار تھیں۔ اسی

وجہ سے عثمانؓ کو اہلیہ کی تیمار داری کے لیے چھوڑنا پڑا۔ یہ رکنا اضطراری تھا اس لیے عثمانؓ کا حصہ برابر رکھا گیا۔ اسی طرح بعض اور صحابہ بھی کارہائے خاص پر مامور تھے، ان کا حصہ بھی غازیان بدر کے ساتھ تھا۔ حضرت رقیہؓ کی وفات عین جنگ بدر کے دن یا ایک روز بعد ہوئی۔

قیدیوں سے حسن سلوک

مدینہ منورہ پہنچتے ہی اسیران جنگ کو مختلف اصحاب میں تقسیم کر دیا گیا کیونکہ کوئی خاص قیدخانہ تو تھا نہیں جہاں انھیں رکھا جاتا۔ ان میں سے ابوعزیز بن عُمیر (برادر مصعبؓ بن عمیر) کا بیان ہے کہ مجھے جن کے حوالے کیا گیا وہ ناشتے یا کھانے کے وقت روٹی میرے حوالے کر دیتے تھے اور خود کھجوریں کھاتے۔ مجھے شرم محسوس ہوتی، روٹی واپس کرتا مگر وہ پھر میرے حوالے کر دیتے۔

یہ رسول اللہ صلعم کی تعلیم و تربیت اور ارشاد خصوصی کا کرشمہ تھا۔

پھر ایک اور منظر دیکھیے۔ ایک روز مصعبؓ بن عمیر بھائی کے پاس سے گزرے تو اس کے حوالے داروں سے کہا، اسے خوب گرفت میں رکھنا۔ اس کی ماں بڑے ساز و سامان والی ہے۔ شاید وہ اس کا فدیہ دے کر چھڑا لے۔

ابوعزیز بولا، بھائی صاحب! کیا آپ کو میرے متعلق یہی وصیت ہوئی ہے؟ مصعبؓ بولے: تو میرا بھائی نہیں، یہ لوگ میرے بھائی ہیں۔

ابوعزیز کی والدہ نے جو مصعبؓ کی بھی والدہ تھی پوچھا کہ کسی قیدی کا زیادہ سے زیادہ فدیہ کتنا دیا گیا ہے؟ بتایا گیا: چار ہزار۔ اس نے چار ہزار درہم دے کر بیٹے کو رہا کرا لیا۔

فدیے کی مختلف صورتیں

غور و مشورہ کے بعد قرار پایا:

۱۔ اسیروں سے فدیہ لے کر انھیں رہا کر دیا جائے۔

۲۔ فدیہ کی زیادہ سے زیادہ رقم چار ہزار درہم فی کس رکھی گئی ہے لیکن اتنی استطاعت صرف تھوڑے ہی لوگوں میں تھی۔

۳۔ اس بڑی رقم کے بعد بعض کے لیے تین ہزار، بعض کے لیے دو ہزار اور بعض کے لیے ایک ہزار مقرر ہوگئے۔

۴۔ جن کی استطاعت اتنی بھی نہ تھی، مگر وہ پڑھے لکھے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو رہا کر دیے جائیں۔ زیدؓ بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

۵۔ جو کچھ بھی نہیں دے سکتے تھے۔ انھیں محض احسان رکھ کر چھوڑ دیا گیا۔

چنانچہ حضرت عباسؓ اور رسول اللہ صلعم کے دوسرے خاندانی افراد سے بھی باقاعدہ فدیہ لیا گیا۔ ابوالعاص بن ربیع (رسول اللہ صلعم کے داماد یعنی حضرت زینبؓ کے شوہر) بھی شامل تھے۔ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے حضرت زینبؓ کو فدیہ کی رقم کے لیے کہلا بھیجا۔ اس رقم میں حضرت خدیجہؓ کا وہ ہار بھی آیا تھا جو مرحومہ نے بیٹی کو شادی کے موقع پر دیا تھا۔ رسول اللہ صلعم کی نظر مبارک سے یہ ہار گزرا تو بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں، بے اختیار

سے مبارک سے آنسو بہ نکلے۔ فرمایا:

تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو۔

چنانچہ یہ ہار بے تامل واپس کر دیا گیا اور اس کی قیمت ابو العاص کے فدیے میں محسوب ہو گئی۔

ابو العاص پھر سامان تجارت لے کر شام گئے۔ اس وقت حضرت زینبؓ مدینہ منورہ آ چکی تھیں۔ واپسی کے وقت ان کا قافلہ لٹ گیا لیکن ایک ایک چیز محفوظ رہی۔ ابو العاص مدینہ منورہ پہنچ کر زینبؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر ان کی ہر چیز واپس کر دی گئی۔ وہ مکہ مکرمہ گئے، سب کی ایک ایک چیز لوٹائی اور خود واپس آ کر مسلمان ہو گئے۔

مسئلہ تاریخ غزوہ

آخر میں تاریخ کا مسئلہ رہ جاتا ہے جو ذرا سی خلش کا باعث ہے۔ زیادہ تر دن جمعہ کا بتایا گیا ہے اور تاریخ ۱۷۔ رمضان ۲ھ۔ اگر ۱۷۔ رمضان کو درست تسلیم کر لیا جائے تو یہاں کی کتب تقویم کے مطابق دن منگل کا ثابت ہوتا ہے۔ مصر کے بعض مورخوں نے دن بدل کر جمعہ کے بجائے منگل اختیار کر لیا ہے۔ میرے نزدیک دن میں بھول چوک کا امکان کم اور تاریخ میں زیادہ تھا۔ اتفاق سے طبقات ابن سعد میں ابو ایوبؓ انصاری کا ایک بیان مل گیا کہ رمضان کے سترہ دن گزر چکے تھے اور تیرہ دن باقی تھے یا گیارہ دن باقی تھے اور انیس دن گزر چکے تھے[1] تقویم کے مطابق رمضان ۲ھ کی ابتدا ۲۶۔ فروری ۶۲۴ء سے ہوئی۔ اس روز یک شنبہ تھا لہذا ۱۷۔ کو منگل اور ۱۹۔ کو جمعرات ہوگی۔ روایت کی بنا پر ایک روز کا تقدم و تاخر ممکن ہے، نہ کہ چار روز کا۔ میرا اندازہ ہے کہ غالباً ۱۹۔ والی روایت ہی درست ہو۔ و اللہ اعلم بالصواب۔ (مولف)

---

[1] جلد دوم ص ۲۱۔

۲۰م:

غزوۂ بدر

(مولانا کے ارشادات)

—(۳)—

ظہور دعوت اور اس کے نتائج

مکہ میں جب پیغمبر اسلام کی دعوت کا ظہور ہوا تو قدرتی طور پر دو گروہ پیدا ہوگئے۔ ایک ان لوگوں کا تھا جنھوں نے یہ دعوت قبول کی دوسرا پوری قوم اور اس کے سرداروں کا جو اس کے مخالف تھے۔ غور کرو، دونوں میں بنائے نزاع کیا تھی؟

پیروان دعوت کہتے تھے، انھیں حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھیں اختیار کریں۔ مخالف کہتے تھے انھیں یہ حق حاصل نہیں یعنی وہ انسان کے اعتقاد و ضمیر کی آزادی تسلیم نہیں کرتے تھے، چاہتے تھے، بزور شمشیر مسلمانوں کو ان کے اعتقاد سے پھرا دیں۔

پیغمبر اسلام صلعم نے تیرہ برس تک ہر طرح کے مظالم برداشت کیے۔ آخر جب مکہ میں زندہ رہنا دشوار ہوگیا، تو مدینہ چلے آئے لیکن قریش مکہ نے یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ پے در پے حملے شروع کر دیے۔

اب پیغمبر اسلامؐ کے سامنے تین راہیں تھیں:

۱۔ جس بات کو حق سمجھتے تھے، اس سے دست بردار ہو جائیں۔

۲۔ اس پر قائم رہیں مگر مسلمانوں کو قتل ہونے دیں۔

۳۔ ظلم و تشدد کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور نتیجہ خدا کے ہاتھ چھوڑ دیں۔

انھوں نے تیسری راہ اختیار کی اور نتیجہ وہی نکلا جو ہمیشہ نکل چکا ہے، یعنی حق فتحمند ہوا اور ظالموں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

قرآن نے جس لڑائی کو جائز رکھا اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

احکام جنگ

چونکہ لڑائی کی حالت پیش آگئی تھی اس لیے اس کے ضروری احکام بیان کر دیے گئے۔ اسی سورت (الانفال) میں اور اس کے بعد کی سورت میں تذکیر و موعظت کا مرکز یہی حالت ہے۔

۱۔ مال غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے، وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیے کہ جو جس کے ہاتھ پڑ گیا وہ اسی کا ہو گیا، بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیے، وہ اسے جماعت میں تقسیم

کرے گا۔

۲۔ امن کی حالت ہو یا لڑائی کی، لیکن مسلمانوں کو باہمدگر صلح و صفائی کے ساتھ رہنا چاہیے

۳۔ ہر حال میں تقوی اور اطاعت ان کا منصب ہے بغیر اس کے کامیابی ممکن نہیں۔

۴۔ سچا مومن وُہ ہے جس کی رُوح خدا پرستی سے معمور رہتی ہے۔ جس کا ایمان گھٹنے کی جگہ برابر بڑھتا رہتا ہے، نماز قایم رکھتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کبھی نہیں تھکتا۔

۵۔ یہ آیت[1] اس باب میں قاطع ہے کہ قرآن کے نزدیک ایمان کی ہر حالت یکساں نہیں۔ وہ گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے، نفسِ تصدیق کے لحاظ سے سب برابر ہیں، کیفیت و یقین میں تفاوت ہے۔

۶۔ عرب جاہلیت میں دستور تھا کہ لڑائی میں جو مال جس کے ہاتھ لگ جاتا، وہ اسی کا سمجھا جاتا تھا۔ رومیوں میں بھی ایسا ہی دستور تھا اور آج کل بھی یورپ کی تمام قوموں میں ایسا ہی قانون رائج ہے۔ جس شہر پر فوج حملہ کرکے فتح کر لیتی ہے، ایک خاص وقت تک اسے لوٹنے کا حق ہوتا ہے چنانچہ ہندوستان میں انگریزی فوج نے سرنگاپٹم، بھرت پور اور حیدر آباد سندھ کو بے دریغ لوٹا اور غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی فتح ہوئی تو سات دن تک فوجوں کو لوٹ مار کی اجازت دے دی گئی تھی، لیکن قرآن نے یہ حکم دے کر کہ مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے، حکومت (یعنی اسٹیٹ) کا ہے۔ لڑنے والوں کا، سپاہیوں کی ذاتی طمع و حرص کے ابھرنے کی راہ روک دی۔ چونکہ یہ نئی قسم کی سختی تھی، اس لیے ناگزیر تھا کہ لوگوں پر شاق گزرے۔ پس پہلے تقویٰ اور اطاعت کی تلقین کی پھر سچے مومنوں کی شان بتلائی۔

مختلف معارف

اس معاملے یعنی غنیمت کو بھی ویسا ہی معاملہ سمجھو جیسا جنگ بدر میں پیش آیا تھا۔ لوگوں کی خواہش دوسری تھی۔ اللہ کے رسول کا فیصلہ دُوسرا تھا، بالآخر سب نے دیکھ لیا کہ حق بات وہی تھی جو اللہ کے رسول نے چاہی تھی۔

---

[1] سورۂ انفال کی آیت ۲:
إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ

مومنوں کی شان تو یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسا کرتے ہیں۔

معاملہ یہ تھا کہ ہجرت کے دوسرے سال جب رؤسائے مکہ نے مدینہ پر حملہ کیا، تو اسی زمانے میں ان کا ایک تجارتی قافلہ بھی شام سے مکہ آ رہا تھا اور مدینہ کے قرب وجوار سے ہو کر گزرنے والا تھا[1]۔ پیغمبر اسلام نے وحی الٰہی سے مطلع ہو کر فرمایا: ایک گروہ مکہ سے آ رہا ہے، دوسرا قافلہ ہے۔ ان دو میں سے کسی ایک سے ضرور جنگ ہو گی اور تم کامیاب ہو گے چونکہ قافلے کے ساتھ بہت تھوڑے آدمی تھے اس لیے مسلمانوں کی خواہش تھی کہ اسی سے مقابلہ ہو۔ مکہ والی فوج سے نہ لڑیں کیونکہ خود بڑی ہی کمزوری اور بے سروسامانی کی حالت میں تھے مگر پیغمبر اسلام نے لوگوں کے ان خیالات کی کچھ پروانہ کی اور حملہ آوروں کے مقابلے کا فیصلہ کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تین سو تیرہ بے نواؤں نے رؤسائے مکہ کے پورے لشکر کو شکست دے دی۔

آیت ۷ (الانفال) میں "غیر ذات الشوکۃ" سے قافلے والی جماعت مراد ہے۔ آیت ۶ (الانفال) میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ ایک فریق نے پیغمبر اسلام فیصلہ مان لیا تھا، مگر دل میں سخت ہراساں تھا۔ نکلا تو اس طرح ڈرتا ہوا نکلا، گویا موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔

فرشتوں کا معاملہ

آیت ۹-۱۰ (الانفال) سے واضح ہو گیا کہ فرشتوں والی بات صرف اس لیے تھی کہ کمزور مسلمانوں کے دل قرار پا جائیں۔ یہ بات نہ تھی کہ لڑائی کی فتح مندی میں اسے کچھ

---

[1] بدر مدینہ منورہ سے اسّی میل کے فاصلے پر ہے اور ساحل بحر بدر سے قریب ہے۔ مولانا کا مقصد یہ نہیں کہ تجارتی قافلے کا راستہ مدینہ منورہ سے بہت قریب تھا۔ مراد بظاہر یہ ہے کہ مقابلتہً قریب تھا۔

[2] وَ اِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِیْنَۙ۔ لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَ یُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَۚ

اور (مسلمانو) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے تم سے وعدہ فرمایا تھا (دشمنوں) کی دو جماعتوں میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ ضرور آئے گی اور تمہارا حال یہ تھا کہ چاہتے تھے، جس جماعت میں لڑائی کی طاقت نہیں (یعنی قافلے والی) وہ ہاتھ آجائے اور خدا چاہتا تھا اپنے وعدے کے ذریعے حق کو ثابت کر دے اور دشمنانِ حق کی جڑ بنیادیں کاٹ کر رکھ دے۔ یہ اس لیے تھا کہ حق کو حق کر کے اور باطل کو باطل کر کے دکھلا دے۔ اگرچہ ظلم و فساد کے مجرم ایسا ہونا پسند نہ کریں۔

[3] اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ۔ وَ مَا

جب تم نے اپنے پروردگار سے فریاد کی تھی کہ ہماری مدد کر اور اس نے تمہاری فریاد سن لی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں

(باقی ص ۲۸۹ پر)

دخل ہو۔ چنانچہ محققین تفسیر وحدیث اسی طرف گئے ہیں کہ فرشتوں کا نزول مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے ہوا تھا۔ لڑائی میں ان کی شرکت ثابت نہیں۔ نہ اس کی کوئی ضرورت پیش آئی تھی اور آیت ۱۲ (الانفال) میں "فاضربوا" کا خطاب مسلمانوں سے ہے، نہ کہ فرشتوں سے۔

مسلمانوں کے دلوں کو تھامے رکھنے کے لیے جو فرشتوں کا نزول ہوا، اس کی حقیقت کیا تھی؟ تو یہ معاملہ بھی عالم غیب کے حقائق سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم اپنے ذہن و ادراک سے اس کی حقیقت معلوم نہیں کر سکتے۔

بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کی حالت بڑی ہی بے بسی اور کمزوری کی تھی۔ تین سو تیرہ آدمی لڑنے کے قابل تھے اور ان کا بھی یہ حال تھا کہ ایک آدمی کے سوا کسی کے پاس گھوڑا نہ تھا پس قدرتی طور پر لوگ ہراساں ہوئے اور رجودل کے کچے تھے انھیں طرح طرح کے وسوسے ستانے لگے۔ پھر بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ پانی کی جگہ ایک ہی تھی اس پر دشمن قابض ہو گیا۔ علاوہ بریں زمین ریتلی تھی۔ پاؤں دھنس دھنس جاتے تھے۔ دشمن سوار تھے ان کا کچھ نہ بگڑتا۔ مسلمان پیدل تھے ان کے پاؤں نہ جمتے۔

اہل حق کا اطمینان قلب

آیت ۱۱ (الانفال) میں فرمایا: غور کرو، خدا کی کارسازی نے کس طرح یہ ساری مشکلیں حل کر دیں؟ اس نے دلوں کو چین دینے کے لیے تم سب پر نیند غالب کر دی، اٹھے، تو دل کا سارا خوف و ہراس دور ہو چکا تھا چنانچہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: بدر کی پہلی رات کوئی نہ تھا جو آرام سے سو نہ گیا ہو۔ ہاں آنحضرت صلعم رات بھر عبادت کرتے رہے (بیہقی فی الدلائل) اور معلوم ہے، جس کے دل میں خوف و خطر ہو، وہ کبھی آرام سے سو نہیں سکتا۔ پس اس نیند کا طاری ہو جانا بے خوفی کا القا تھا۔ پھر عین موقع پر بارش ہو گئی اور افراط کے ساتھ سب کو پانی میسر آ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ نہا دھو کر صاف ستھرے ہو گئے کوئی نہ تھا جو چست و چاق اور تازہ دم نہ ہو گیا ہو۔ بارش کی وجہ سے ریت بھی جم کر سخت ہو گئی۔ پاؤں کے دھنس دھنس جانے کا اندیشہ جاتا رہا۔ اپنی کامیابی کی طرف سے بے اعتمادی و مایوسی جو دراصل شیطانی وسوسے کی ناپاکی تھی اب کسی کے

(بقیہ ص ۲۸۸)

جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔

ایک ہزار فرشتوں سے کہ یکے بعد دیگرے آئیں گے تمھاری مدد کروں گا اور اللہ نے جو یہ بات کی، اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ (تمھارے لیے) خوشخبری ہو اور تمھارے مضطرب دل قرار پا جائیں ورنہ مدد تو ہر حال میں اللہ ہی کی طرف سے ہے بلاشبہ وہ سب پر غالب آنے والا اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

دل میں باقی نہ رہی۔

معنوی قویٰ کی درستی آجکل فن جنگ میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سپاہیوں کی سپرٹ یعنی معنوی قویٰ درست رکھے جائیں۔ یہاں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

صرف اس بات نے کہ پانی کی ضرورت باقی نہ رہی، ریت میں دھنسنے کا خطرہ جاتا رہا اور نہا دھو لینے کی وجہ سے جسم میں تازگی آگئی، لوگوں کے اندر جس درجہ خود اعتمادی اور سرگرمی پیدا کر دی ہوگی، اس کا اندازہ صرف اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ جنگ واٹرلو کے تمام مورخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸۔ جون ۱۸۱۵ء کی درمیانی رات میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا کیونکہ اس صورت میں نپولین کو بارہ بجے تک زمین خشک ہونے کا انتظار نہ کرنا پڑتا، سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوخر کے پہنچنے سے پہلے ویلنگٹن کو شکست ہو جاتی۔

واٹرلو میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا، لیکن بدر میں نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ اُلٹ جاتا۔ اسی طرح پیغمبر اسلام نے اپنی دُعا میں اشارہ کیا تھا؛ اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ فلا تعبد فی الارض۔ خدایا! اگر خدام کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہو گئی تو کرۂ ارضی میں تیرا سچا عبادت گزار کوئی نہیں رہے گا۔

حق و باطل میں امتیاز الانفال و۲۹ سے معلوم ہوا جو جماعت متقی ہوگی اس میں حق و باطل اور خیر و شر کے امتیاز کی ایک خاص قوت پیدا ہو جائے گی اور اس لیے کبھی باطل و شر کی طرف قدم نہیں اٹھائے گا۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اسی اعتبار سے صدر اوّل کے مسلمانوں کا کیا حال تھا؛ عرب کے صحرانشیں جن کی ساری زندگیاں اُونٹ چرانے میں بسر ہوئی تھیں، یکایک ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں کی قسمتوں کے مالک ہو گئے لیکن خیر و شر میں امتیاز کی ایک ایسی قوت ان کے قبضے میں آگئی تھی کہ جو کچھ کرتے تھے اور جس طرح کرتے تھے وہ حق و عدالت اور خیر و سعادت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

وہ زمانہ کیا ہُوا جب، مری آہ میں اثر تھا
یہی چشم خوں فشاں تھی یہی دل، یہی جگر تھا

---

[1] یعنی مسلمانو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو (اور اس کی نافرمانی سے بچو) تو وہ تمہارے لیے (حق و باطل میں) امتیاز کی ایک قوت پیدا کر دے گا اور تم سے تمام برائیاں دُور کر دے گا اور بخش دے گا اللہ تو بہت بڑا فضل کرنے والا ہے۔

خدا کی مخفی تدبیریں "الانفال" ۳۰[1] پر غور کرو۔ انسان اپنے جہل و غفلت کی سرشاریوں میں کیا سوچتا ہے اور حکمت الٰہی کی مخفی تدبیروں کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ ہجرت سے پہلے قریش مکہ نے منصوبے باندھے تھے تو کیا ایک لمحے کے لیے بھی انھیں آنے والے نتائج کا گمان ہو سکتا تھا؟ مگر کس طرح خود انھی کے ظلم و عداوت نے ان کا سارا سروسامان کر دیا؟ اگر ظلم نہ ہوتا تو ہجرت بھی نہ ہوتی اور اگر ہجرت نہ ہوتی تو وہ تمام نتائج بھی ظہور میں نہ آتے جو ہجرت سے ظہور میں آئے۔ ایسی ہی صورت حال قانون الٰہی کی مخفی تدبیر ہے جو انسانی ظلم و فساد کی ساری تدبیریں ملیا میٹ کر دیتی ہے۔

دین کا نشہ حق جب بدر میں مٹھی بھر بے سروسامان جنگ کے لیے نکلے تو منافق اور کچے دل کے آدمی اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکے، بجز اس کے کہ کہیں، انھیں ان کے دین کے نشے نے مغرور کر دیا ہے۔ بات اگرچہ بطور طعنہ کہی گئی تھی لیکن ایک لحاظ سے غلط بھی نہ تھی۔ بلاشبہ یہ دین ہی کا نشہ تھا، لیکن نشۂ باطل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی معجزانہ بلاغت نے آیت (۴۹ الانفال[2]) میں ان کا قول نقل کر کے رد نہیں کیا، بلکہ صرف یہ کہا کہ من یتوکل علی اللہ[3]

صلح و امن آیت ۶۱ اور ۶۲[4] (الانفال) نے کیسے قطعی لفظوں میں قرآن کی دعوت امن کا اعلان کر دیا ہے؟ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب جنگ بدر کے فیصلے نے مسلمانوں کی فتح مندی آشکارا کر دی تھی اور تمام جزیرۂ عرب ان کی طاقت سے متاثر ہونے لگا تھا۔ حکم ہوا، جب کبھی دشمن صلح و امن کی طرف جھکے، چاہیے کہ بلا تامل تم بھی جھک جاؤ۔ اگر اس کی نیت میں فتور ہوگا تو ہوا کرے، اس کی وجہ سے صلح و امن کے قیام میں ایک لمحے کے لیے بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔

خدا کی خاص نعمت دنیا کا کوئی کام انسان کے لیے اس سے زیادہ مشکل نہیں کہ بکھرے ہوئے انسانی دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں پرو دے اور یہ کام تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، جب معاملہ ایسے انسانوں کا ہو جو صدیوں سے باہمی جنگ و جدال کی آب و ہوا میں پرورش پاتے رہے ہوں اور جن کے

---

[1] اشارہ آنحضرت صلعم کے بارے میں منکرین قریش کی مخفی تدبیروں کی طرف ہے۔ [2] اور جب ایسا ہوا تھا کہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، کہنے لگا تھا، ان مسلمانوں کو تو دین نے مغرور کر دیا ہے۔ [3] اور جس کسی نے اللہ پر بھروسا کیا تو اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ [4] اور دیکھو اگر دشمن صلح کی طرف جھکیں تو چاہیے تم بھی اس طرف جھک جاؤ اور ہر حال میں اللہ پر بھروسا رکھو...... اگر ان کا ارادہ یہ ہوگا کہ تجھے دھوکا دیں تو اندیشے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ کی ذات تیرے لیے کافی ہے۔

نفسیاتی سانچوں میں باہمی آمیزش و اشتعلت کا کوئی ڈھنگ باقی نہ رہا ہو۔

پیغمبر اسلام صلعم کا ظہور ایسے ہی لوگوں میں ہوا تھا، مگر ابھی ان کی دعوت پر دس بارہ ہی برس گزرے تھے کہ مدینہ میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو اس اعتبار سے بالکل ایک نئی مخلوق تھی۔ وہ جب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے باہمی کینہ و انتقام کا مجسمہ تھے لیکن جونہی مسلمان ہوئے، محبت و سازگاری کی ایسی پاکی و قدوسیت ابھر آئی کہ ان میں کا ہر فرد دوسرے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے مستعد ہو گیا۔

فی الحقیقت یہی وہ تزکیہ اخلاق کا عمل ہے جو ایک پیغمبرانہ عمل تھا اور جو پیغمبر اسلامؐ کی تعلیم و تربیت نے انجام دیا اور اس کی طرف آیت ۶۳ (الانفال) میں اشارہ فرمایا ہے[1]۔

اس سے معلوم ہوا، مسلمانوں کی باہمی الفت ایک ایسی نعمت ہے جسے خدا نے اپنا خاص انعام قرار دیا ہے۔ افسوس ان پر، جو اس نعمت سے محرومی پر قانع ہو گئے اور اس کے لیے اپنے اندر کوئی جلن محسوس نہیں کی۔ آج باہمی الفت کی جگہ باہمی مخاصمت مسلمانوں کی سب سے بڑی پہچان ہو گئی ہے۔ اسی کو انقلاب حال کہتے ہیں۔

اسیران جنگ

جنگ بدر میں جب دشمن قید ہوئے تو سوال پیدا ہوا، اس بارے میں کیا کرنا چاہیے؟ چونکہ اس وقت مسلمان بڑی ہی تنگی و افلاس کی حالت میں تھے۔ اس لیے عام رائے یہ تھی کہ قیدیوں کے لیے فدیہ مانگا جائے اور جب تک فدیہ وصول نہ ہو قیدی رہا نہ کیے جائیں۔ بعض صحابہ کی رائے ہوئی کہ انھیں قتل کر دینا چاہیے۔ حضرت عمرؓ بھی انھی میں سے تھے لیکن آنحضرت صلعم نے عام رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا اور قیدیوں کے لیے فدیہ طلب کیا گیا۔ جن قیدیوں کے لیے فدیہ نہیں ملا وہ روک لیے گئے۔

اس پر آیت ۶۷ (الانفال) نازل ہوئی۔ فرمایا: دنیا میں نبی اس لیے نہیں آتے کہ ان کے پیرو دشمنوں کو قید رکھ کر فدیے کا روپیہ لیں بلکہ مقصود اصلی دعوت حق کا اعلان ہوتا ہے۔ پس نبی کو سزاوار نہیں کہ جب تک اس کی دعوت ملک میں ظاہر و غالب نہ ہو جائے، اسیران جنگ کو فدیہ کے لیے روکے رکھے۔ تمھاری نظر متاع دنیا پر ہے اور خدا نے تمھارے لیے آخرت کا انعام پسند کیا ہے[2]۔

---

[1] اللہ ہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے، جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا (انفال: ۶۳) [2] قرآن سے یہی پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے مسلمانوں کو آگاہ و خبردار کیا گیا ہے یعنی ان کا اصل مقصود مال یا فدیہ نہیں جسے "متاع دنیا" کہا گیا بلکہ دعوت حق کی اشاعت و سطوت ہے محض یہ بتانا تھا کہ لڑائیوں کا مقصد مال غنیمت، اسیران جنگ اور فدیہ نہیں، صرف دعوت حق کی پیش برد ہے نیز اس میں رکاوٹوں اور مزاحمتوں کا ازالہ ہے۔

چنانچہ اس کے بعد آیت ۷۰ (الانفال) نے معاملہ بالکل صاف کر دیا۔ فرمایا: جو قیدی فدیہ کے لیے دیں گے ان سے کہہ دو کہ اگر تمھاری نیتیں صاف ہیں تو تمھارے لیے کوئی کھٹکا نہیں۔

جہاں تک اسیرانِ جنگ کا تعلق ہے، سورۂ محمد کی آیت ۴ نے آخری حکم دے دیا ہے "فاما منّا و اما فداً" یعنی آیندہ یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دیا کرو فدیہ لے کر، جیسی مصلحتِ وقت ہو۔

چھ ضروری باتیں سورۂ انفال کی آیت ۴۵ سے آیت ۴۷ تک چھ باتوں پر زور دیا جو فتح و کامرانی کا اصل سرچشمہ ہیں:

۱۔ فاثبتوا: ثابت قدم رہو، کیونکہ میدان جنگ کی ساری کامیابی اسی کے لیے ہوتی ہے جو آخر تک ثابت قدم رہے۔

۲۔ واذکروا اللہ کثیراً: اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو، کیونکہ جسم کا ثبات دل کے ثبات پر موقوف ہے اور دل اسی کا مضبوط رہے گا جو اللہ پر کامل ایمان رکھتا ہے۔

۳۔ و اطیعو اللہ و رسولہ: اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور رسول کے بعد اپنے امام و سردار کی، کیونکہ بغیر اطاعت (ڈسپلن) کے کوئی جماعت کامیاب نہیں ہوسکتی۔

۴۔ و لا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم: باہمی نزاع سے بچو، ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور بات بگڑ جائے گی۔

۵۔ واصبروا ان اللہ مع الصّٰبرین: کتنی ہی مشکلات پیش آئیں، جھیلتے رہو، بالآخر جیت اسی کی ہے، جو زیادہ جھیلنے والا ہو۔

۶۔ و لا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطراً و ریاء الناس و یصدون عن سبیل اللہ: کافروں کا سا چلن اختیار نہ کرو۔ جو ایمان و راستی کی جگہ گھمنڈ اور دکھاوے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، تمھارے کاموں کی بنا خدا پرستانہ عجز و اخلاص پر ہونی چاہیے[1]

---

[1] یہ نصیحتیں غزوۂ بدر کے سلسلہ ذکر میں کی گئی ہیں اس لیے انھیں یہاں درج کر دینا مناسب معلوم ہوا۔ میں نے اصل آیات کے ٹکڑے ساتھ ملا دیے۔ مولانا کو "ترجمان" میں اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ آیتیں حواشی کے سامنے تھیں۔

باب ۴

مصالحتی اور دفاعی مہمیں

(بدر سے احد تک)

غزوۂ الکدر

رسول اللہ صلعم نے بدر سے مراجعت کے بعد مدینہ منورہ میں سات دن سے زیادہ قیام نہیں فرمایا تھا کہ اطلاع ملی قبیلہ بنو سُلیم مدینہ منورہ پر یورش کی تیاریاں کر رہا ہے۔ مناسب یہی سمجھا گیا کہ غنیم کو اجتماع کی مہلت دیے بغیر اس کے خلاف پیش قدمی کی جائے۔ چنانچہ آپؐ نے سِباعؓ بن عُرفطہ غفاری کو مدینہ منورہ پر قائمقام مقرر فرمایا بعض روایتوں میں ابن ام مکتوم کی قائمقامی کا ذکر ہے اور خود الکدر[1] پہنچ گئے جو بنو سُلیم کی اجتماع گاہ تھا۔ بنو سلیم رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری کی اطلاع پاتے ہی منتشر ہو گئے۔ حضور صلعم تین روز الکدُر میں قیام فرما رہے۔ پھر مدینہ منورہ واپس ہو گئے۔

غزوۂ سویق

ابو سفیان بدر سے مکہ مکرمہ پہنچا تھا تو قسم کھائی تھی کہ جب تک بدر کے مقتولین کا بدلا نہ لے لے گا، نہ غسل جنابت کرے گا اور نہ سر میں تیل ڈالے گا۔ چنانچہ وہ جلد از جلد بدلا لینے کے قصد سے دو سو شتر سوار لے کر روانہ ہوا اور مدینہ منورہ سے دس بارہ میل پر ٹھہر گیا۔ پھر خود مدینہ جا کر بنو نضیر میں سے حیی بن اخطب کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ نہ کھولا تو سلام بن مشکم کے گھر پہنچا جو بنو نضیر کا رئیس اور خزینہ دار تھا وہاں پُر تکلف کھانا کھایا شراب پی۔ راز کی تمام باتیں سنیں۔ بعد ازاں اپنے ساتھیوں کو لے کر عُرَیض پر چھاپہ مارا جو مدینے کے شمال میں تین میل پر قنات کے پاس ایک مقام تھا۔ وہاں چند درخت جلائے۔ ایک انصاری کو جو کھیت میں سویا ہوا تھا نیز اس کے حلیف کو قتل کیا۔ گھاس کے کچھ انباروں اور گھاس پھوس کے چند مکانوں کو آگ لگائی۔ یوں اپنے خیال کے مطابق قسم پوری کر کے بھاگ نکلا۔ رسول اللہ صلعم کو اطلاع ملی تو مدینہ منورہ پر ابو لبابہؓ بشیر بن عبد المنذر کو قائمقام مقرر کر کے ابو سفیان کے تعاقب میں نکل پڑے اور قرقرۃ الکدر تک تشریف لے گئے، لیکن ابو سفیان ہاتھ نہ آیا۔ اس کے پاس رسد کے لیے ستو تھے جن کے بورے راستے میں پھینکتا گیا۔ یہ بورے صحابہؓ نے اٹھا لیے۔ ستّو کو عربی میں سویق کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے غزوے کا

---

[1] یاقوت کے بیان کے مطابق "الکدر" اور "مدینہ منورہ" کے درمیان تقریباً چھیانوے میل کا فاصلہ ہے۔ (معجم البلدان جلد ۷، ص ۲۲۴)

یہ واقعہ اوائل شوال ۲ھ کا ہونا چاہیے (مطابق اپریل ۶۲۴ء)۔

نام سویق مشہور ہوا۔ یہ ذی قعدہ ۲ھ (مئی ۶۲۴ء) کا واقعہ ہے۔

غزوۂ ذی امر

غزوہ سویق سے واپس آکر حضور صلعم نے ذی حجہ ۲ھ اور محرم ۳ھ کے مہینے مدینہ منورہ ہی میں گزارے پھر اطلاع ملی کہ ذی امر[1] میں جو دیار غطفان میں ہے مدینہ منورہ پر حملے کے لیے قبائلیوں کا اجتماع ہو رہا ہے چنانچہ صفر ۳ھ (اگست ۶۲۴ء) میں آپ نے اس طرف (۲۲۔اگست ۶۲۴ء۔ ۱۲ ستمبر ۶۲۴ء) کا قصد فرمایا اور صفر کا پورا مہینا اسی[2] میں گزرا لیکن کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری کی اطلاع پاتے ہی قبائلی لوگ پہاڑوں میں بھاگ گئے یاقوت نے اس غزوے کی تاریخ ربیع الاول ۳ھ لکھی ہے۔

غزوۂ بحران

حضور صلعم نے ربیع الاول ۳ھ کا مہینا مدینہ منورہ گزارا۔ پھر قریش مکہ سے جنگ کا ارادہ فرما کر مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ ابن ام کلثوم کو قائم مقام مقرر فرمایا۔ بحران پہنچے جو فرع کے ضلع میں حجاز کی کان تھی۔ اس کا فاصلہ مدینہ منورہ سے کوئی ایک سو میل کے قریب ہوگا۔ ربیع الآخر اور جمادی الاول ۳ھ کے مہینے آپ نے ادھر ہی گزارے[3] لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئی۔

زید بن حارثہ کی مہم

رسول اللہ صلعم نے زید بن حارثہ کو ایک جیش کا سرلشکر بنا کر قردہ[4] بھیجا۔ واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد قریش نے شام کی تجارت کا عام راستہ ترک کر کے وہ راستہ اختیار کر لیا تھا، جو مدینہ منورہ کے مشرقی جانب تھا اور اسے طریق عراق کہتے ہیں۔ بنی بکر بن وائل میں سے فرات بن حیان نام ایک شخص کو رہنمائی کے لیے ساتھ لے لیا تھا۔ زید بن حارثہ کی مہم کا مقصد یہی تھا کہ اس قافلے کو لوٹا جائے تاکہ مغربی راستے کی طرح قریش مشرقی راستے سے بھی تجارتی مال نہ لے جا سکیں۔ زیدؓ بن حارثہ کو قریش کا تجارتی قافلہ مل گیا، جس میں صفوان بن امیہ اور غالباً ابوسفیان بھی تھا اس قافلے کے پاس زیادہ تر چاندی تھی۔ زیدؓ نے چاندی اور دوسرا مال چھین لیا لیکن اہل قافلہ ان کے قبضے میں نہ آسکے۔ مال لے کر زیدؓ مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ قافلے کی خبر رسول اللہ صلعم تک کیونکر پہنچی۔ نُعیم بن مسعود غطفانی اپنے یہودی دوست کنانہ بن ابی الحقیق نضری سے ملنے آیا۔ نعیم اس وقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس نے قافلۂ قریش کا ذکر کنانہ سے کیا۔ وہاں ایک مسلمان بھی موجود تھا جس نے یہ خبر رسول اللہ صلعم تک پہنچائی۔ یہ جمادی الاولیٰ ۳ھ (نومبر ۶۲۵ء) کا واقعہ ہے۔ زیدؓ بن حارثہ کے ساتھ ایک سو شتر سوار تھے۔ (مولف)

---

[1] دیارِ غطفان میں، جو مدینہ منورہ سے شمالی جانب ہے، ایک مقام۔ غالباً مدینہ سے تین منزل ہوگا یعنی چھتیس یا چالیس میل۔ [2] معجم البلدان جلد اول ص ۳۴۳۔ [3] ربیع الآخر ۳ھ کا آغاز ۲۱۔ ستمبر ۶۲۴ء سے ہوا اور جمادی الاولیٰ ۳ھ، ۱۸۔ نومبر ۶۲۴ء کو ختم ہوا۔ [4] نجد کی جانب ایک چشمہ جو مدینہ منورہ سے دو یا تین روز کی مسافت پر ہے۔

غزوۂ اُحد

إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿ (آل عمران: ۱۴۰)

(اگر تم نے (احد کی لڑائی میں) زخم کھایا ہے تو دشمنوں کو بھی تو ویسے ہی زخم (بدر میں) لگ چکے ہیں۔ دراصل ہار جیت کے یہ اوقات ہیں، جنھیں ہم انسانوں میں ادھر ادھر پھراتے رہتے ہیں (کبھی میدانِ جنگ کا فیصلہ ایک گروہ کے حق میں ہوتا ہے، کبھی دوسرے کے حق میں) علاوہ بریں یہ حادثہ اس لیے تھا کہ اس بات کی آزمایش ہو جائے، کون سچا ایمان رکھنے والا ہے، کون نہیں، نیز اس لیے کہ تم میں ایک گروہ کو (ایام و وقائع کے نتیجوں اور عبرتوں کا) شاہد حال بنا دے اور اللہ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)۔

باب ۴۲

غزوۂ اُحد

(۱)

قریش مکہ کا انتقام

غزوۂ احد کی بنیاد تو اسی وقت پڑ گئی تھی جب قریش بدر میں شکست فاش کھا کر مکہ واپس پہنچے تھے۔ ان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور اس کی تسکین کی خاطر وہ ہر ممکن اقدام کے لیے دیوانے ہو رہے تھے۔

ابن ہشام اور طبقات ابن سعد کا بیان ہے کہ قریش بدر سے کٹے لوٹے تو جس تجارتی قافلے کی حفاظت کے لیے وہ نکلے تھے اور ابوجہل کی فتنہ انگیزی کے باعث غزوۂ بدر پیش آیا تھا، اس کے افراد دار الندوہ میں ٹھہرے ہوئے تھے چنانچہ چند اکابر نے ابوسفیان سے کہا کہ محمد (صلعم) نے تم میں سے اچھے آدمیوں کا قلع قمع کر دیا ہے، اس لیے روپے سے ہماری امداد کرو تاکہ ہم اپنے مقتولین کا بدلا لے سکیں[1]۔ ابوسفیان نے اپنی طرف سے اور خاندان عبد مناف کی طرف سے اسے منظور کر لیا۔

قافلے میں ایک ہزار اونٹ تھے اور پچاس ہزار دینار کا مال تھا۔ اصل سرمایہ مالکوں کو لوٹا دیا گیا۔ منافع رکھ لیا گیا اور وہ بہ حیثیت مجموعی پچاس ہزار تھا۔ مندرجہ ذیل آیت میں اسی طرف اشارہ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ (انفال: ۳۶)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، وہ اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکیں تو یہ لوگ آیندہ بھی اسی طرح خرچ کریں گے۔ پھر وقت آئے گا (کہ یہ مال خرچ کرنا) ان کے لیے پچھتاوا ہو جائے گا بالآخر وہ مغلوب ہو جائیں گے۔

جنگ کی تیاری

صفوان بن امیہ جنگ کے لیے تیاری میں پیش پیش تھا۔ ابوعزہ شاعر جنگ بدر کے قیدیوں میں شامل تھا۔ اس کے پاس فدیے کے لیے کچھ نہ تھا۔ رسول اللہ صلعم سے ملتجی ہوا کہ میں کثیر العیال اور ضرورت مند ہوں، اس وقت مجھ پر احسان فرمائیں۔ رسول اللہ صلعم نے اسے احسان رکھ کر رہا کر دیا۔

---

[1] ابن ہشام القسم الثانی (ص ۶۰) نیز طبقات ابن سعد۔ جلد دوم (ص ۳۶-۳۷)

وہ قریش کی نئی تیاریوں میں شرکت کے لیے تیار نہ تھا لیکن صفوان بن امیہ نے لالچ دے کر ساتھ بلا لیا۔ اسی نے اور مسافع بن عبد مناف نے بنو کنانہ کو قریش کی معیت پر آمادہ کرنے کے لیے انتہائی سرگرمی سے کام کیا۔

جُبیر بن مُطعِم کا ایک حبشی غلام وحشی نام تھا جسے حبشیوں کے طریق پر حربہ پھینکنے میں بہ درجہ کمال مہارت تھی۔ جُبَیر نے اس سے کہا کہ اگر تو محمد (صلعم) کے چچا حمزہؓ کو قتل کر دے گا تو میرے چچا طعیمہ بن عدی کا بدلا پورا ہو جائیگا اور تو میری طرف سے آزاد ہو گا۔

ہند بنت عتبہ (زوجہ ابوسفیان) بھی اپنے والد عتبہ بن ربیعہ کے انتقام کی طلبگار تھی، اس نے بھی وحشی کو خوش کرنے کا وعدہ کر لیا تھا، بہ شرطیکہ وہ حمزہؓ کو قتل کر دے۔ چنانچہ ہند میدان جنگ میں بھی وحشی کے پاس سے گزرتی تو کہتی، ابو دسمہ[1] میرا کلیجا بھی ٹھنڈا کر اور اپنا بھی۔ یعنی میرے بدلے کا بھی انتقام کر دے اور خود بھی غلامی سے آزاد ہو جا۔

ابو عامر راہب بھی جس کے لیے "فاسق" کا موزوں لقب اسی زمانے میں عام ہو گیا تھا، اس انگیخت میں قریش کا ساتھی تھا۔ جنگ کے لیے ساتھ آیا۔ مجوزہ میدان جنگ میں جا بجا گڑھے کھدوائے اور غالباً کھجور کی پتلی پتلی شاخیں رکھ کر مٹی ڈلوا دی تاکہ کسی کو پتا نہ چل سکے۔ ایسے ہی ایک گڑھے میں رسول اللہ صلعم اتفاقیہ گر گئے تھے۔

قریش کی فوج

قریش کی تیاریوں کے متعلق تمام خبریں عباس کے ذریعے سے رسول اللہ صلعم کو مل گئیں، جو اگرچہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر رسول اللہ صلعم کی خیر خواہی میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتے جو ان کے امکان میں تھا۔

بہر حال قریش مکہ کی فوج تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی جس میں اہل تہامہ اور بنو کنانہ بھی شامل تھے۔ ان میں سے سات سو زرہ پوش تھے، دو سو گھوڑے، تین ہزار اونٹ اور پندرہ عورتیں ساتھ تھیں۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں:

> لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوش جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں۔ جس لڑائی میں خاتونیں ہوتی تھیں، عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوئی تو عورت بے حُرمت ہو گی[2]۔

اگرچہ جنگ حُنین میں عورتوں، بچوں بلکہ مال کا بھی ساتھ ہونا مخالفوں کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکا اور دُرَید بن صمۃ کی رائے درست ثابت ہوئی تھی کہ جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ میدان جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔

---

[1] وحشی کی کنیت [2] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل (ص ۳۴۴)

ممتاز خواتین قریش قریش کے ساتھ جو عورتیں آئی تھیں، وہ نہایت معزز گھرانوں کی تھیں۔ نیز ان کے دل مقتول اقربا کے جوش انتقام سے لبریز تھے۔ مثلاً،

۱۔ ہند، قریش مکہ کے سالار اعظم ابوسفیان کی بیوی تھی۔ اس کا باپ عُتبہ بدر میں مارا گیا تھا۔

۲۔ ام حکیم بنت حارث، ابوجہل کی بھتیجی اور عکرمہ بن ابی جہل کی بیوی، یہ ابوجہل کا بدلا لینا چاہتی تھی۔

۳۔ فاطمہ بنت ولید، خالد کی بہن، حارث بن ہشام برادر ابوجہل کی بیوی۔ ابوجہل کے علاوہ اپنے باپ ولید کے بدلے کی خواہاں تھی۔

۴۔ برزہ بنت مسعود ثقفی، صفوان بن امیہ کی بیوی، اُمیہ کے انتقام کی غرض سے آئی تھی۔

۵۔ رَیطہ بنت ملبہ بن الحجاج، عمرو بن العاص کی بیوی، اپنے باپ کے انتقام کے لیے۔

۶۔ خناس، مصعبؓ بن عُمیر کی مشرکہ ماں اپنے مشرک فرزند ابوعزیز کے ساتھ۔

قریش ذوالحلیفہ میں آ اترے تو رسول اللہ صلعم نے فضالہ کے بیٹوں انس اور مونس کو بھیجا کہ ضروری معلومات فراہم کر لائیں۔ وہ واپس ہوئے تو بتایا کہ قریش نے اپنے اونٹ اور گھوڑے العُریض میں چھوڑ دیے تھے، جب وہاں سے روانہ ہوئے تو گھاس بالکل ختم ہو چکی تھی۔ پھر حبابؓ بن منذر کو بھیجا گیا۔ وہ قریش کے لشکر میں داخل ہو کر تعداد کا صحیح اندازہ کر لائے۔ قریش اس جگہ ٹھہر گئے تھے، جو مدینہ منورہ کے شمال مغرب میں بئر رومہ اور غابہ کے درمیان تھی۔ یہاں انھیں پانی بھی حسب ضرورت مل سکتا تھا۔ جانور چرانے کی بھی سہولت تھی۔ جنگ خندق میں بھی وہ اسی جگہ ٹھہرے تھے۔

رسول اللہ صلعم نے شہر میں پہرے کا مکمل انتظام کرا دیا۔ سعدؓ بن معاذ، اُسَیدؓ بن حُضَیر اور سعدؓ بن عبادہ نے مسلح ہو کر خود رسول اکرم صلعم کے دروازے پر پہرہ دیا۔

مشورہ اور فیصلہ پھر صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا گیا۔ مہاجرین و انصار میں سے اکابر کی رائے یہ تھی کہ عورتوں اور بچوں کو گڑھیوں (آطام) میں بھیج دیا جائے، جن کی تعداد مدینے میں خاصی تھی اور خود شہر میں مورچے بنا کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ رسول اللہ صلعم کی رائے مبارک بھی یہی تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی کی رائے بھی یہی تھی، جسے طبری کے بیان کے مطابق پہلی مرتبہ مشورے میں شریک کیا گیا تھا۔ لیکن نوجوانوں کی بڑی تعداد نے شہر سے باہر نکل کر مقابلے پر زور دیا۔ ان کے جوش اور گرمیٔ خون کا تقاضا یہی تھا۔ آخر اندازہ ہوا کہ کثرت اسی رائے کے حق میں ہے۔

جمعہ کا دن تھا، حضور صلعم نے نماز جمعہ پڑھائی۔ جہاد پر وعظ فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ جب تک صبر کرو گے، مدد ہو گی۔ پھر آپ مکان میں تشریف لے گئے، زرہ پہنی، جنگ کا دوسرا سر و سامان لیا۔ لوگ صفیں باندھے آپ کے

منتظر تھے۔ اسی اثنا میں سعدؓ بن معاذ اور اُسیدؓ بن حُضیر نے نوجوانوں سے کہا کہ باہر نکل کر مقابلے پر اصرار مناسب نہ تھا۔ بہتر ہے کہ اب بھی معاملہ حضور صلعم کے سپرد کر دو۔ خود نوجوانوں کو بھی اپنے اصرار پر پشیمانی ہُوئی۔ رسول اللہ صلعم مسلح ہوکر برآمد ہُوئے تو باہر نکل کر مقابلے پر اصرار کرنے والے تمام لوگوں نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم اپنی رائے سے دست بردار ہوتے ہیں۔ آپؐ کو جو مناسب معلوم ہو، و

حضور صلعم نے فرمایا:

پیغمبر کے لیے زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے، جب تک اللہ اس کے اور دشمن کے درمیان فیصلہ نہ کر دے۔

جب تک معاملہ مشورے کی منزل میں تھا۔ رائے بدلی جا سکتی تھی۔ جب فیصلہ ہو چکا تو اب رائے بدلنا اور معاملے کو از سرِ نو معرضِ گفتگو میں ڈالنا مناسب نہ تھا۔ یہ طریقہ عزیمت وہمت کے لیے ضعف و نا استواری کا باعث ہو سکتا تھا۔

مدینہ منورہ کی آبادی

مدینہ منورہ کے مشرق، مغرب اور جنوب میں کھجور کے گھنے باغ تھے، ان میں سے گزرتے ہُوئے کسی بستی یا محلہ پر حملہ آسان نہ تھا، کیونکہ باغوں میں سے دشمن کا صرف ایک ایک آدمی بمشکل آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس صورت میں حملہ آور بہ آسانی مارے جاتے۔ صرف شمالی جانب سے حملہ ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قریش نے شمالی و مغربی جانب پڑاؤ ڈالا تھا۔

پھر پوری آبادی ایک مقام پر نہ تھی بلکہ پہاڑوں کے درمیان وسیع میدان میں بکھری ہُوئی بستیاں یا محلّے آباد تھے۔ بعض قبیلوں نے اپنی زمینوں اور باغوں کے پاس آبادی کا انتظام کر لیا تھا اور کئی دو منزلہ گڑھیاں بنالی گئی تھیں۔ وہ ہر خطرے کے وقت بچّوں اور عورتوں کو گڑھیوں کی بالائی منزلوں پر پہنچا دیتے اور خود فارغ البال ہوکر حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے۔

اسلامی لشکر

مدینہ منورہ سے رسول اللہ صلعم عصر کے وقت نکلے۔ آپؐ نے تین نیزے طلب فرمائے اور تین جھنڈے بنائے۔ ایک حبابؓ بن منذر کو عطا ہُوا، دُوسرا اُسیدؓ بن حُضیر کو اور تیسرا علیؓ بن ابی طالب کو عنایت فرمایا۔

حضور صلعم گھوڑے پر سوار ہُوئے۔ کمان کندھے پر ڈالی، نیزہ ہاتھ میں لیا۔ مسلمانوں کی کل تعداد اس وقت ایک ہزار تھی، جن میں عبداللہ بن ابی کے تین سو آدمی بھی شامل تھے۔ لشکر میں صرف ایک سو آدمی زرہ پوش تھے۔

لے تاریخ کے مسئلے پر آگے چل کر بحث ہوگی۔

سعدؓ بن معاذ اور سعدؓ بن عبادہ مرکب مبارک کے آگے آگے دوڑ رہے تھے۔ باقی لشکری دائیں بائیں اور پیچھے تھے۔ حضور صلعم نے مشرقی جانب کے حرّے یعنی حرۂ واقم کے دامن کا راستہ اختیار فرمایا۔ جدھر بنی عبد الاشہل کی بستی تھی۔ جب آپؐ مقام شوطؐ[1] میں پہنچے تو عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ عذر یہ پیش کیا کہ میری رائے کے مطابق مدینے کے اندر رہ کر مقابلہ نہیں کیا گیا۔[2] گویا اسلامی لشکر کے افراد صرف سات سو رہ گئے۔ ساتھ دو گھوڑے تھے۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ رسول اللہ صلعم شیخین میں شب باش ہوئے۔[3] محمد بن مسلمہ کو پچاس آدمیوں کے ساتھ پہرہ داری پر مامور فرمایا گیا۔ یہ اصحاب رات بھر لشکر کے گرد گشت کرتے رہے۔ رات کے پچھلے حصے میں ابو خیثمہ حارثی کو رہبر بنایا اور احد کی جانب روانہ ہوئے۔ "القنطرہ" پہنچے تو نماز کا وقت ہو گیا۔ وہیں آپؐ نے بلالؓ کو اذان کا حکم دیا اور نماز پڑھائی۔ پھر جبل اُحد کے پاس اس مقام پر پہنچ گئے، جسے بظاہر پہلے سے فوج کی ترتیب کے لیے تجویز فرما رکھا تھا۔

جبل اُحد

جبل اُحد مدینے کے شمال میں قریباً تین میل پر شرقاً غرباً بخط مستقیم پھیلا ہوا ہے۔ اس کی جنوبی جانب وسط میں نعل نما خلا ہے، جو خاصا وسیع ہے یعنی یہاں سے پہاڑ پیچھے کی طرف ہٹ گیا ہے۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ صلعم: نزل الشعب من احد فی عدوۃ الوادی الی جبل. (یعنی آپؐ ایک گھاٹی میں اترے۔ یہ مقام وادی قنات سے پہاڑ کی جانب اونچائی میں واقع ہے) جہاں سے یہ خلا یا جھکاؤ شروع ہوتا ہے وہاں سے جبل احد کے ساتھ ساتھ وادی قنات گزرتی ہے جس میں بارش کے ساتھ خاصا پانی بہنے لگتا ہے۔ بارش نہ ہو تو یہ عموماً خشک ہوتی ہے۔ قنات کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی طرف ہے۔ خلا کی زمین قنات سے اونچی ہے اس کے عین سامنے وادی کے جنوبی کنارے پر ایک چھوٹا سا ٹیلا ہے، جسے جبل عینین کہتے ہیں، یعنی دو چشموں والا ٹیلا۔ کیونکہ اس سے دو چشمے نکلتے ہیں۔ جنگ احد کے بعد اسے "جبل الرماۃ" بھی کہنے لگے۔ یعنی وہ ٹیلا جس پر تیر اندازوں کا مورچہ تھا۔

---

[1] احد اور مدینہ کے درمیان زیادہ سے زیادہ تین میل کا فاصلہ ہے۔ اس میں کئی چھوٹی بڑی آبادیاں یا محلے تھے۔ ایک مقام "شوط" بھی تھا جو مدینے کے شمال مشرق میں شیخین کے قریب تھا۔ دائیں جانب حرّے پر بنی عبد الاشہل کا محلہ تھا۔ اس سے آگے بنی حارثہ کی آبادی تھی۔ [2] طبقات ابن سعد کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن ابی جمعہ کو نہیں ہفتے کو اس مقام سے الگ ہوا جو "القنطرہ" مشہور تھا (جلد دوم ص ۳۹) [3] جلد دوم۔ ص ۳۹۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلے دو گڑھیاں تھیں۔ اب وہاں دو گنبد کی مسجد بن گئی ہے۔

رسول اللہ صلعم نے احد کے اسی جھکاؤ کو صف بندی کے لیے منتخب فرمایا۔ پشت پر پہاڑ تھا۔ سامنے جبل عینین پر پچاس تیر انداز مقرر فرمادیے جن کی سالاری عبداللہؓ بن جبیر کو سونپی اور تاکید فرمادی کہ ہمیں فتح ہو یا شکست، مگر تیر اندازوں کو کسی بھی حالت میں جگہ نہ چھوڑنی چاہیے۔ وہ ٹیلے پر بدستور جمے رہیں اور مقررہ مورچے سے ادھر ادھر نہ ہوں۔

تیر اندازوں کے مورچے کی اہمیت قریش مغربی جانب سے صف بند ہو کر لڑائی کے لیے آسکتے تھے، کیونکہ ان کی لشکر گاہ مغرب ہی کی جانب تھی۔ مسلمانوں کے لیے فعل نما خلا میں صف بند ہو کر دشمن کے مقابلے کے لیے مغربی جانب کا رُخ کر لینا ناگزیر تھا۔ صرف ایک خطرہ تھا کہ جب گھمسان کا رن پڑے تو مبادا کوئی فوج مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دے۔ اس طرح وہ دو لشکروں کے درمیان گھر جائیں۔ جبل عینین کے تیر اندازوں کا اولین وظیفہ یہی قرار دیا گیا تھا کہ وہ عقب سے حملہ کرنے والی ہر فوج کو روکیں اور اس کا رخ پلٹ دیں۔ مسلمان مغربی جانب دشمن کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کتنی ہی دُور نکل جاتے، اگر ان کا عقب محفوظ رہتا تو کوئی خطرہ ان کے لیے پریشانی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر خدانخواستہ قریش، کثرت تعداد کی بنا پر مسلمانوں کو دھکیلتے ہوئے جھکاؤ کی طرف لے آتے تو جبل عینین کے تیر انداز اپنی قادر اندازی سے قریش کے لشکر میں بھی افراتفری ڈال سکتے تھے اور اپنے بھائیوں سے دشمن کا دباؤ ڈھیلا کر سکتے تھے۔

غرض تیر اندازوں کے دو وظیفے تھے اور دونوں کو جنگ میں انتہائی اہمیت حاصل تھی،

۱۔ مسلمانوں کے عقب کو ہر حملہ آور سے محفوظ رکھنا۔

۲۔ قریش کا دباؤ بڑھے تو اس کی قوت کو درہم برہم کرنے کے لیے امداد دینا۔

یہ دونوں وظیفے اصل مورچے پر قائم و استوار رہنے ہی سے پورے ہو سکتے تھے۔ اسی لیے رسول اللہ صلعم نے تاکید فرمادی تھی کہ لڑائی کا انجام خواہ کچھ ہو مگر تیر انداز کسی بھی حالت میں جگہ نہ چھوڑیں۔ طبقات کے بیان کے مطابق ان سے کہہ دیا گیا تھا:

> اگر تم دیکھو کہ ہمیں مال غنیمت مل رہا ہے تو ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا اور اگر تم دیکھو کہ ہم قتل ہو رہے ہیں تو ہماری مدد نہ کرنا[1]

مطلب یہ کہ اپنے مورچے پر جمے ہوئے جو کچھ کر سکو کرتے رہنا، لیکن مورچہ چھوڑ کر عام لشکروں میں نہ ملنا۔

قریش کی صف آرائی قریش کی صف آرائی کے متعلق جو تفصیلات روایات میں ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

---

[1] طبقات جلد دوم ص ۴۰

رسالہ دو سو گھوڑوں پر مشتمل تھا۔ ایک سو گھوڑے لشکر کے میمنہ پر تھے اور ایک سو میسرہ پر۔ میمنہ پر خالد بن ولید مامور ہوئے جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ میسرہ عکرمہ بن ابی جہل کے حوالے کر دیا گیا۔ ایک سو تیر اندازوں کی کمان عبداللہ بن ربیعہ کو سونپی گئی۔ قلب کی فوج آگے بڑھی تو اس کے پیچھے عورتیں دفیں بجا بجا کر اور اشعار گا گا کر مردوں کو جوش دلا رہی تھیں۔ یہ رجز بہ اختلاف الفاظ ہر کتاب میں درج ہے:

نحن بنات طارق   نمشی علی النمارق

ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں   ہم قالینوں پر چلتی ہیں

ان تقبلوا نعانق   ان تدبروا نفارق

آگے بڑھ کر مقابلہ کرو گے تو تمہارے گلے لگ جائیں گی   پیٹھ پھیرو گے تو تم سے جدا ہو جائیں گی

فراق غیر وامق

جدائی ایسی ہوگی جو نفرت کرنے والے کی ہوتی ہے

قریش نے علم طلحہ بن ابی طلحہ کو دیا، جو عبدالدار کے خاندان سے تھا۔ رسول اللہ صلعم نے یہ سنا تو اسلامی علم مصعبؓ بن عمیر کے حوالے کر دیا۔ وہ بھی عبدالدار کے خاندان سے تھے۔

آغازِ جنگ

جنگ کی ابتدا ابو عامر "فاسق" سے ہوئی۔ وہ قبیلہ اوس میں سے تھا۔ خدا جانے اسے کیوں یہ خیال ہو گیا تھا کہ میرے ہم قوم مجھے دیکھتے ہی رسول اللہ صلعم کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اس کے ساتھ متفرق آدمیوں کا ایک گروہ تھا۔ انصار نے اسے دیکھتے ہی کہا: "او فاسق! خدا تجھے بینائی سے محروم کر دے۔" اس نے اور اس کے ساتھیوں نے پتھر بھی پھینکے۔ پھر یہ کہتا ہوا لوٹ گیا کہ میرے دور ہو جانے کے باعث میری قوم کے خیالات بگڑ گئے ہیں۔

ابو سفیان نے طلحہ بن ابی طلحہ سے کہا کہ بدر میں بھی ہمارا جھنڈا عبدالدار ہی کے پاس تھا۔ وہاں ہم پر جو مصیبت آئی اس کا ذکر غیر ضروری ہے۔ لوگ جھنڈا ہی دیکھ کر میدان جنگ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ جھنڈا جگہ سے ہٹ جائے تو سب کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ اے بنو عبدالدار یا تو اطمینان دلاؤ کہ جھنڈے کو بہر حال بلند رکھو گے یا اسے چھوڑ دو تاکہ ہم خود سنبھال لیں۔ بنو عبدالدار نے جھنڈے کی حفاظت کے متعلق پورا اطمینان دلایا اور اس فرض کی بجا آوری میں خاندان کے بیشتر افراد کٹوا دیے۔

بنو عبدالدار کی تباہی

مسلمان تیر اندازوں نے قبیلہ ہوازن کا رخ پھیر دیا تو طلحہ بن ابی طلحہ (علمدار قریش) نے جوش کے عالم میں کہا کہ کوئی ہے جو مجھ سے جنگ کرے؟ علیؓ بن ابی طالب آگے بڑھے اور ایسی ضرب لگائی کہ طلحہ کی کھوپڑی پھٹ گئی اور وہ گر گیا۔ اس کے بعد جھنڈے کی حفاظت میں بنو عبدالدار کو

شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ طلحہ کے بھائی عثمان بن ابی طلحہ کو حمزہؓ نے اور ابو سعید بن ابی طلحہ کو سعدؓ بن ابی وقاص نے قتل کیا۔ طلحہ کے تین بیٹے ــــ مسافع، کلاب اور جُلاس ــــ یکے بعد دیگرے مارے گئے۔ پھر خاندان عبدالدار میں سے ارطاۃ بن عبد شرجبیل اور قاسط بن شریح نیز خاندان کا ایک غلام "صواب" موت کے گھاٹ اترے۔ گویا اس خاندان نے جھنڈے کی حفاظت میں باری باری نوجانیں دیں۔ قریش ہزیمت اٹھا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور انھیں میدان جنگ سے نکال دیا۔ ساتھ ہی مال غنیمت جمع کرنے لگے۔

عین اس موقع پر جبل عینین کے تیراندازوں نے مورچہ چھوڑ دیا۔

تیراندازوں کی غلطی

تیراندازوں کے سرعسکر عبداللہ بن جُبیر اپنے ساتھیوں کو بار بار رسول اللہ صلعم کا ارشاد یاد دلاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہیں تو حضور صلعم کے حکم سے تجاوز نہ کروں گا۔ باقی سب کو بھی اس فرمان کا پورا پاس تھا لیکن وہ کہتے تھے کہ اس فرمان کا مطلب یہ نہیں کہ دشمن میدان جنگ بھی چھوڑ دے تو بدستور مورچے پر جمے رہو۔ چنانچہ چالیس تیرانداز جبل عینین سے اتر کر مال غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہوگئے اور صرف دس اپنے سرعسکر کے ساتھ مورچے پر قائم و استوار رہے۔ اسی غلطی نے دشمن کو ایک ایسی تدبیر پر عمل پیرائی کا موقع دے دیا جس سے مسلمانوں کی بدیہی فتح، شدید جانی نقصان میں بدل گئی۔

خالد بن ولید کا حملہ

خالد بن ولید کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی جنگی صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں۔ انھوں نے فوراً بھانپ لیا کہ اپنی شکست کی تلافی کا بہترین ذریعہ کیا ہے۔ چنانچہ فوراً اپنا رسالہ لے کر جبل احد کی شمالی جانب سے ہوتے ہوئے مشرقی سمت آگئے۔ جبل عینین اور احد کے درمیان سے ان مسلمانوں پر حملہ کر دیا جن کا رُخ بھاگنے والے قریش کے تعاقب میں مغربی جانب تھا، نیز وہ مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے۔ عکرمہ بن ابی جہل بھی خالد کے ساتھ ہوگیا۔

ایسے ہی حملے کی روک تھام کے لیے تیرانداز جبل عینین پر بٹھائے گئے تھے۔ لیکن انھوں نے رسول اللہ صلعم کے تاکیدی حکم کی تعبیر ظاہری حالات کے پیش نظر ایسے انداز میں کر لی، جس سے ان کی نیت پر تو کوئی زد نہیں پڑتی تھی، تاہم اس نقصان کا اندازہ کون کرسکتا ہے جو اس تعبیر سے اسلامی لشکر، ملت اسلامیہ اور خود مقاصد تبلیغ اسلام کو پہنچا۔ پھر یہی تعبیر قریش مکہ کی مزاحمت کو ختم کرنے میں موجب تاخیر ہوئی، جو اسلام اور عربوں کے درمیان ایک دیوار کی حیثیت میں کھڑے ہوگئے تھے۔

خالد کا حملہ اس درجہ ناگہانی تھا گویا یکایک ایک بجلی مسلمانوں کے خرمن تنظیم و ترتیب پر آگری اور ان کی شاندار فتح شدید نقصان میں بدل گئی۔ جن چالیس تیراندازوں نے مورچہ چھوڑنے کی غلطی کی تھی، کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا انجام کیا ہوا، لیکن جن دس نیک بختوں نے عبداللہ بن جُبیر کی سرکردگی میں مورچہ نہیں چھوڑا تھا وہ سب شہادت پا گئے۔[۱]

---

[۱] ڈاکٹر حمیداللہ نے لکھا تھا کہ احد کے مشرقی گوشے اور جبل عینین کے درمیان جو فاصلہ اب ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ پچاس تیرانداز (باقی اگلے صفحہ پر)

نزولِ آفات جب تک جبل عینین کا مورچہ قائم تھا، مسلمان جس طرف بڑھتے تھے، گرد و پیش موت بکھیرتے جاتے تھے۔ خالد کے حملے نے صورت حالات بالکل منقلب کر ڈالی۔

حمزہؓ بن عبدالمطلب ارطاۃ بن عبد شرحبیل کو قتل کر کے سباع بن عبدالعزیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عین اس وقت وحشی نے حملے سے پیداشدہ افراتفری دیکھ کر جبل عینین کے پاس سے حربہ حمزہؓ کی طرف پھینکا، جو ناف سے اوپر ان کے پیٹ میں گھسا اور ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل گیا۔ وہ لڑکھڑائے، گرے اور جاں بحق ہو گئے۔

مصعبؓ بن عُمیر اسلامی فوج کے علمدار تھے۔ ان کا داہنا ہاتھ کٹ گیا تو علم بائیں ہاتھ سے تھام لیا۔ وہ بھی قلم ہو گیا تو علم کو سینے سے لگا لیا۔ اسی حالت میں انھیں عمرو بن قمیئہ نے شہید کر دیا۔ مصعبؓ شکل اور وضع قطع میں رسول اللہ صلعم سے مشابہ تھے۔ اسی بنا پر ابن قمیئہ نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ محمد (صلعم) کو قتل کر آیا ہے۔

ابو عامر فاسق کفر و شرک کی حمایت میں مصروف تگ و دو تھا، لیکن اس کے فرزند ارجمند حنظلہؓ جان ہتھیلی پر رکھے راہِ حق میں سرگرم جہاد تھے۔ اتفاقیہ حنظلہؓ کی مڈبھیڑ ابو سفیان سے ہو گئی۔ قریب تھا، ابو سفیان کا خاتمہ حنظلہؓ کے مقدس ہاتھوں سے ہو جاتا کہ مشرکین میں سے شداد بن الاسود نے حنظلہؓ کو شہید کر ڈالا۔ (مولف)

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰۶) وہاں سے حملہ کرنے والے کو روک نہیں سکتے تھے۔ اس لیے اغلب ہے یا تو مشرقی گوشے کے ساتھ ساتھ پہاڑ کا ایک حصہ ہو جو گزشتہ چودہ سو سال میں باقی نہ رہا یا نخلستان ہوں۔

باب ۳۴

غزوۂ اُحد

(۲)

مسلمانوں کے تین گروہ

خالد کے اس حملے نے مسلمانوں میں جو ابتری پیدا کی اس کی وجہ سے وہ تین گروہوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ میدان سے بھاگ گیا۔ ان میں سے بعض مدینہ پہنچے اور بعض اس سے بھی آگے مشرقی جانب نکل گئے۔ روایتوں میں دو مقاموں کا ذکر آیا ہے۔ اول "منقیٰ" دوم "جلعب"۔ یہ دونوں "اعوص" نام مقام کے قریب بتائے گئے ہیں اور اعوص مدینہ منورہ کے مشرق میں کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ دوسرے گروہ نے میدان تو نہ چھوڑا، لیکن رسول اللہ صلعم کی شہادت کی خبر ان پر بجلی بن کر گری اور تعطل کی سی کیفیت طاری کر دی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یکایک کیا صورت پیش آگئی اور اس عالم میں کیا کرنا چاہیے؟ تیسرا گروہ رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات کے گرد اسی طرح جاں نثاری اور فداکاری میں سرگرم عمل تھا، جس طرح پروانے شمع پر جان قربان کرتے وقت گردوپیش کے حالات سے بالکل بے پروا ہوتے ہیں۔ اس گروہ میں ابوبکرؓ، علیؓ، سعدؓ بن ابی وقاص اور مہاجرین و انصار میں سے اور لوگ شامل تھے۔

رسول اللہ صلعم کو چشم زخم

خود رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات بھی چشم بد کے زخم سے محفوظ نہ رہی۔ سعدؓ بن ابی وقاص کے بھائی عتبہ بن ابی وقاص نے جو مسلمان نہیں ہوا تھا حضور صلعم کا نیچے کا داہنا دانت شہید کر دیا اور اسی کی ضرب سے لب مبارک پر بھی زخم آیا۔ عبداللہ بن شہاب نے پیشانی مبارک کو زخمی کیا۔ عمرو بن قمیئہ نے ایک پتھر اس زور سے مارا کہ خود کی دو کڑیاں رخسار مبارک میں گھس گئیں۔ ایسے ہی حالات میں زبان حق ترجمان پر یہ الفاظ آئے: "وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے، جو اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگین کرتی ہے۔" پھر آپؐ کی شفقت و رحمت بے پایاں یہی فرماتی رہی: "اے خدا میری قوم کو راہ ہدایت دکھا دے۔ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں یا انھیں معاف کر دے۔"

ابو عامر فاسق نے جو گڑھے خفیہ کھدوائے تھے اور مسلمانوں کو ان کا پتا نہیں لگ سکا تھا۔ ان میں سے ایک میں رسول اللہ صلعم بھی گر گئے۔ علیؓ بن ابی طالب نے آپؐ کا دست مبارک پکڑا۔ طلحہؓ بن عبیداللہ نے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ ابو عبیدہؓ بن الجراح نے دانتوں سے خود کی کڑیاں یکے بعد دیگرے کھینچ کر نکالیں اور اس عمل میں ان کے آگے کے دو دانت گر گئے۔ ابو سعیدؓ الخدری کے والد مالکؓ بن سنان نے چہرہ مبارک سے خون چوس کر نکالا۔

انسانی فداکاری کے معجزے

رسول اللہ صلعم کے پاس تھوڑے سے صحابہ رہ گئے تھے۔ اسلامی لشکر میں خالد کے حملے سے افراتفری پیدا ہوئی تو قریش از سر نو منظم ہو کر حملوں پر آمادہ ہو گئے۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا، کون اپنی جان اللہ کی راہ میں نثار کرتا ہے؛ ایک انصاری جن کا نام ایک روایت میں زیاد بن السکن اور دوسری روایت میں عمارہ بن زیاد بن السکن آیا ہے، پانچ یا سات انصار کو لے کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک ایک نے لڑتے لڑتے جان دے دی۔ سب سے آخر میں زیاد بن السکن یا عمارہ بن زیاد بن السکن زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا، اسے میرے قریب لے آؤ۔ پھر اس پاک باز مجاہد نے اپنا رخسار پائے مبارک پر رکھ لیا۔ اسی حالت میں وہ جاں بحق ہوا۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں؛

آنحضرت صلعم نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے۔ کچھ کچھ جان باقی تھی۔ قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دے دی۔

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیازمندے
کہ بوقت جان سپردن بہ سرش رسیدہ باشی[1]

ام عمارہؓ (نسیبہ بنت کعب المازنیہ) نے بھی بڑی دلیری سے رسول اللہ صلعم کی حفاظت کا حق ادا کیا۔ تلوار سے عمرو بن قمیئہ کے کئی ضربیں لگائیں۔ لیکن اس نے دو زرہیں پہن رکھی تھیں۔ اس لیے محفوظ رہا۔ خود ابن قمیئہ نے ام عمارہ کے کندھے پر شدید زخم لگایا جس کا نشان مدت العمر باقی رہا۔ یہی ام عمارہؓ ہیں جن کے فرزند حبیبؓ بن زید بن عاصم نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا تھا[2]

ابو دجانہؓ نے اپنے جسم کو رسول اللہ صلعم کے لیے ڈھال بنا دیا تھا۔ تیر پر تیر کھاتے گئے۔ حتیٰ کہ جسم چھلنی ہو گیا، مگر ذرا بھی جنبش نہ کی تاکہ کوئی تیر حضور صلعم تک نہ پہنچنے پائے۔ طلحہؓ نے بھی یہ فرض بوجہ احسن انجام دیا۔

سعدؓ بن ابی وقاص کو رسول اللہ صلعم تیر دیتے جاتے تھے، ساتھ ہی فرماتے جاتے تھے، ارم فداك ابی و امی (میرے ماں باپ قربان، چلاتے جاؤ)۔ سعدؓ مدت العمر اس محبت بھرے ارشاد مقدس پر فخر کرتے رہے۔ ابن قمیئہ نے رسول اللہ صلعم پر ایک سخت وار کیا۔ اس وار کو طلحہؓ نے اپنے برہنہ ہاتھ پر روکا، جس سے ہاتھ کٹ گیا اور ابن قمیئہ

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۳۴۹۔ [2] مسیلمہ کو قتل کرنے والے دو شخص تھے۔ ایک وحشی، دوسرے حبیبؓ بن زید۔ خود وحشی کا بیان ہے کہ میں مسیلمہ کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھا تو ایک انصاری بھی بڑھے۔ میں نے حربہ مسیلمہ پر پھینکا اور وہ اس کے لگ گیا۔ انصاری نے بھی نہایت تیزی سے تلوار کا وار کیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم دونوں میں سے کس کے وار سے مسیلمہ کا خاتمہ ہوا۔ (ابن ہشام القسم ثانی ص ۷۲-۷۳)

گئے اور کا زور کم ہو گیا، نیز رسول اللہ صلعم نے دو زرہیں پہن کر رکھی تھیں۔ اس لیے آپ بفضل اللہ گزند سے محفوظ رہے۔

انسؓ اور ابن عوفؓ

انسؓ بن مالک کے چچا انسؓ بن نضر بعض صحابہ کے پاس پہنچے، جو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے ان میں عمرؓ اور طلحہؓ بن عبید اللہ بھی تھے۔ پوچھا، آپ لوگ کس لیے بیٹھے ہیں؟ جواب ملا کہ رسول اللہ صلعم شہید ہو گئے۔ انسؓ نے کہا، پھر آپ کے بعد زندگی کس کام کی؟ اٹھو اور اس مقصد کے لیے مر مٹو، جس کے لیے رسول اللہ صلعم مر مٹے۔ یہ کہتے ہی انسؓ کفار سے جنگ میں مشغول ہو گئے اور جب تک شہادت نہ پا گئے، قتال سے نہ رُکے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے جسم پر کم و بیش ستر زخم تھے۔ نعش پہچانی نہیں جاتی تھی۔ انسؓ کی ہمشیر نے انگلیاں دیکھ کر پہچانا۔

عبد الرحمٰنؓ بن عوف کے منہ پر ایک پتھر لگا جس سے ان کا اگلا دانت ٹوٹ گیا اور بیس یا اس سے بھی زیادہ زخم لگے۔ بعض زخم پاؤں پر لگے تھے، جن کی وجہ سے وہ لنگڑے ہو گئے۔

مسلمانوں کو بشارت

جس صحابی نے سب سے پہلے رسول اللہ صلعم کو پہچانا وہ کعبؓ بن مالک تھے۔ انھوں نے پکار کر کہا، مسلمانو! بشارت ہو، یہ رسول اللہ ہیں۔ جو صحابہ مایوس اور دل شکستہ بیٹھے تھے، یہ بشارت سنتے ہی ان کے جسموں میں گویا از سر نو جان پڑ گئی۔ وہ سب حضور صلعم کی طرف دوڑے۔ حضور صلعم گھاٹی کی طرف چلے۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، طلحہؓ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، حارثؓ بن صمہ اور بعض دوسرے مسلمان آپؐ کے ساتھ تھے۔ آپؐ چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے۔ طلحہؓ بن عبید اللہ نیچے بیٹھے اور ان کی مدد سے حضور صلعم چٹان پر چڑھے۔ قریش کا ایک گروہ پہاڑ پر چڑھ آیا تھا۔ عمرؓ بن خطاب اور بعض دوسرے اصحاب نے زبردست مقابلہ کر کے اس گروہ کو پہاڑ سے اترنے پر مجبور کر دیا۔ علیؓ بن ابی طالب اپنی سپر میں احد کے چشمے سے، جس کا نام مہراس تھا، پانی لائے اور رسول اللہ صلعم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ کو اس میں سے بدبو آئی لہٰذا پانی پیا نہیں، البتہ اس سے چہرۂ مبارک کا خون دھویا۔

حُسیلؓ اور ثابت

حذیفہؓ کے والد ماجد حُسیلؓ بن جابر (الیمان) اور ثابت بن وقش بہت سن رسیدہ تھے۔ انھیں عورتوں اور بچوں کے ساتھ گڑھی میں بٹھا دیا گیا تھا۔ انھوں نے باہم بات چیت کر کے طے کیا کہ ہماری عمریں تو اب پوری ہو چکی ہیں کیوں نہ تلواریں لے کر نکلیں اور مسلمانوں سے جا ملیں۔ شاید اللہ تعالیٰ شہادت کا شرف بخشے۔

چنانچہ دونوں بزرگ تلواریں لے کر نکل پڑے۔ ثابتؓ بن وقش تو مشرکوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے، لیکن حُسیلؓ بن جابر کو غلط فہمی سے مسلمانوں ہی نے شہید کر دیا۔ انھیں خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ حُسیلؓ جنگ کے لیے آ گئے ہیں یہی سمجھتے رہے کہ قریش مکہ میں سے کوئی شخص ہے۔ رسول اللہ صلعم نے خون بہا دلانا چاہا لیکن حذیفہؓ نے معاف کر دیا۔

اُصَیرمؓ

بنی عبد الاشہل میں سے عمروؓ بن ثابت بن وقش "اُصیرم" کر کے مشہور تھے۔ وہ تحویل اسلام پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلعم جنگ کے لیے نکلے تو اُصیرم نے خود ہی اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں میں شامل ہو کر لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ عبد الاشہل کے آدمی میدان جنگ میں اپنے مقتولین ڈھونڈ رہے تھے۔ اُصیرم کو سخت زخمی دیکھا تو حیران ہوئے کہ انھیں کیا چیز یہاں لائی۔ خود اُصیرم سے پوچھا تو انھوں نے کہا، میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا۔ پھر تلوار لے کر لڑتا رہا اور اب جو میری حالت ہے وہ آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ یہ کہہ کر وفات پا گئے۔ رسول اللہ صلعم نے حالات سنے تو فرمایا: انہ من اھل الجنۃ۔ (وہ جنتیوں میں سے ہے)۔

عمروؓ بن الجموح

عمروؓ بن الجموح لنگڑے تھے۔ آپ کے چار بہادر فرزند غزوۂ احد میں شریک تھے اور والد کو روکتے تھے۔ عمروؓ حضور صلعم کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ میرے بیٹے روک رہے ہیں، لیکن خدا کی قسم میری تمنا ہے کہ لنگڑے پن ہی کی حالت میں جنت کی سرزمین روندتا پھروں۔ حضور صلعم نے فرمایا، "تمھیں اللہ نے معذور قرار دیا ہے تم پر جہاد فرض نہیں"۔ بیٹوں سے فرمایا کہ تم والد کو منع نہ کرو۔ چنانچہ عمروؓ بن الجموح جنگ میں شریک ہوئے اور شہادت پائی۔ آپ کے ساتھ ایک فرزند خلاد، دو غلاموں —— سلیم اور ابو ایمن —— نیز عبد اللہ بن عمرو بن حرام (برادر اہلیہ عمرو بن الجموح) بھی شہید ہوئے۔ عمروؓ کی اہلیہ ہندؓ بنت عمرو بن حرام شوہر، بیٹے اور بھائی کی نعشیں میدان اُحد سے اونٹ پر لاد کر مدینے لا رہی تھی، راستے میں اونٹ بیٹھ گیا اور نہ چلا۔ آخر تمام نعشیں پھر میدان اُحد میں پہنچائی گئیں جہاں عمروؓ بن الجموح اور عبد اللہؓ بن عمرو بن حرام کو ایک قبر میں دفن کیا گیا۔

سعدؓ بن الربیع

سعدؓ بن الربیع مدینے کے رؤسا میں سے تھے۔ انھیں عبد الرحمٰنؓ بن عوف کا بھائی بنایا گیا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ سعدؓ بن ربیع کی خبر لاؤ۔ ایک انصاری میدان میں گئے۔ ہر طرف آوازیں دیں، کوئی جواب نہ ملا۔ پھر خیال آیا کہ رسول اللہ صلعم کا نام لے کر پکارنا چاہیے۔ یہ آواز سعدؓ کے کان میں پڑے تو شاید جواب دیں۔ چنانچہ انصاری بھائی نے پکار کر کہا سعدؓ بن الربیع کہاں ہیں، مجھے رسول اللہ صلعم نے ان کے پاس بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی سعدؓ کے تن نیم مُردہ میں بجلی کی لہر دوڑ گئی، دھیمی آواز میں جواب دیا: میں یہاں ہوں۔

انصاری بھائی نے سعدؓ کو مقتولین میں پایا۔ ان پر نزع کی حالت طاری تھی۔ ان سے کہا گیا کہ رسول اللہؐ نے آپ کی حالت دریافت کی ہے۔ سعدؓ بولے: رسول اللہ صلعم کی خدمت میں میرا اسلام عرض کرنا اور کہنا کہ خدا نے رسولوں کو ان کے پیرووں کی قربانی اور اخلاص کی وجہ سے جو ثواب ملا کرتا ہے، آپ کو وہ ثواب تمام نبیوں سے

بڑھ چڑھ کر ملے۔ قوم سے کہنا کہ تم میں زندگی کا سانس ہوتے ہوئے رسول اللہ صلعم کو خدانخواستہ کوئی تکلیف پہنچ گئی تو خدا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے، کیونکہ تم نے لیلۃ القدر میں رسول اللہ صلعم پر فدا ہونے کی بیعت کی تھی۔ یہ کہتے ہی عالم بقا کو سدھارے۔ جسم پر صرف نیزے کے بارہ زخم تھے۔

ابی بن خلف

رسول اللہ صلعم چٹان پر چڑھ گئے تو ابی بن خلف آپؐ کا پتا لگا کر یہ کہتا ہوا آ پہنچا کہ اگر" محمد (صلعم) بچ گئے تو میں زندہ نہ رہوں"۔ مسلمان چاہتے تھے کہ انھیں ابی سے لڑنے کی اجازت ہو حضورؐ نے فرمایا: اسے آنے دو۔ وہ قریب آیا تو آپؐ نے نیزہ لے کر اس کی گردن پر مارا۔ وہ گھوڑے سے لڑکھڑا کر گیا۔ اگرچہ بظاہر زخم معمولی معلوم ہوتا تھا لیکن ابی پکار پکار کر کہہ رہا تھا قتلنی و اللہ محمد (خدا کی قسم! مجھے محمد (صلعم) نے قتل کر دیا) چنانچہ واپسی پر بمقام سرف[1] میں مر گیا۔

رسول اللہ صلعم کی تلوار

اس غزوے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: میں اپنی تلوار اسے دوں گا جو اس کا حق ادا کرے۔ دوسرے اصحاب کے علاوہ زبیرؓ بن العوام کو اس تلوار کی خواہش خصوصیت سے تھی، لیکن وہ ابو دجانہؓ کو دے دی گئی۔

ابو دجانہؓ کے پاس ایک سرخ پٹی تھی۔ وہ جب اسے نکال کر سر پر باندھ لیتے تھے تو ان میں ایک خاص جوش پیدا ہو جاتا تھا اور کوئی ان کے مقابلے پر سلامت نہ رہ سکتا تھا۔ تلوار لے کر انھوں نے سرخ پٹی سر پر باندھ لی اور حمد کے ترانے گاتے ہوئے میدان جنگ میں نکل پڑے۔ جدھر رخ کرتے تھے افراتفری مچ جاتی تھی۔ زبیرؓ کو بطور خاص خیال تھا کہ دیکھیں ابو دجانہؓ کون سے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ ابو دجانہؓ صفوں کو چیرتے ہوئے بڑھے تو ابو سفیان کی اہلیہ ہند سامنے آ گئی جو مردوں کو جوش دلا رہی تھی۔ ابو دجانہؓ نے ہند پر تلوار اٹھائی تو اس نے چیخ ماری اور مردوں کو امداد کے لیے بلایا۔ مگر کوئی نہ آیا۔ اس اثنا میں ابو دجانہؓ نے خود تلوار نیچی کر لی۔ بعد میں زبیرؓ نے ابو دجانہؓ سے پوچھا کہ پہلے تلوار اٹھائی، پھر نیچی کیوں کر لی۔ جواب ملا، میرا دل اس پر راضی نہ ہوا کہ رسول اللہ صلعم کی تلوار عورت پر چلاؤں اور عورت بھی وہ جس کا محافظ کوئی مرد نہ ہو۔

زبیرؓ کہتے ہیں اس وقت میں سمجھا کہ ابو دجانہؓ نے رسول اللہ صلعم کی تلوار کا حق جس طرح ادا کیا، شاید میں نہ کر سکتا۔

اللہ اعلیٰ واجل

ابو سفیان اور اس کے ساتھی میدان میں پھر پھر کر رسول اللہ صلعم، ابو بکرؓ اور عمرؓ کی نعشیں تلاش کرتے رہے۔ پھر ابو سفیان پہاڑ پر چڑھ کر اس مقام کے قریب پہنچا،

---

[1] یہ مقام مکہ مکرمہ سے چھ یا آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔

جہاں مسلمانوں تک اس کی آواز جا سکتی تھی۔ اس نے پہلے پوچھا، مسلمانو! تم میں محمد (صلعم) ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: کوئی جواب نہ دیا جائے۔ پھر باری باری ابوبکرؓ اور عمرؓ کے متعلق پوچھا۔ کچھ جواب نہ ملا تو ابوسفیان نے کہا کہ سب مارے گئے۔ زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ عمرؓ چپ نہ رہ سکے اور بولے: دشمن خدا، تو جھوٹ کہتا ہے۔ ہم سب زندہ ہیں۔ یہ سن کر کہا: پھر ابن قمیئہ جھوٹ کہتا ہے کیونکہ میں تمھیں اس سے زیادہ سچا سمجھتا ہوں۔

پھر ابوسفیان نے اپنے خاص بت ھبل کا نام لے کر کہا: تیرے لیے سربلندی ہو۔ رسول اللہ صلعم کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں نے نعرہ لگایا: "اللہ اعلیٰ و اجل"۔ ابوسفیان نے کہا: "لنا عزیٰ و لا عزیٰ لکم (ہمارے لیے عزیٰ ہے تمھارے لیے کوئی عزیٰ نہیں)"۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: کہو، اللہ مولانا ولا مولا لکم (اللہ ہمارا مددگار ہے تمھارا مددگار کوئی نہیں)"۔

پھر وہ یہ کہتا ہُوا رخصت ہو گیا کہ ہمارے اور تمھارے درمیان آیندہ سال انھی دنوں میں بہ مقام بدر جنگ کا وعدہ رہا۔

شہدا کی تدفین

لڑائی عملاً ختم ہو گئی لیکن قریش مکہ شقاوت و بے دردی سے باز نہ رہے۔ انھوں نے مقدس اسلامی شخصیتوں کی نعشوں کو بگاڑا جن میں سے حمزہؓ، عبداللہؓ بن جحش اور مصعبؓ بن عُمیر بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس میں سب سے پیش پیش ابوسفیان کی اہلیہ ہند تھی۔ حمزہؓ کی ہمشیر حضرت صفیہؓ کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو وہ نعش دیکھنے کے لیے آئیں۔ رسول اللہ صلعم نے نعش کی حالت کے پیش نظر انھیں روکا۔ وہ بولیں: میں ماجرا سُن چکی ہوں، لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ چنانچہ بھائی کی لاش کے ٹکڑے دیکھے اور انا للہ و انا الیہ راجعون کہہ کر دعاے مغفرت کرتی ہُوئی لوٹ گئیں۔

رسول اللہ صلعم نے تمام شہدا کو اُحد کے دامن میں دفن کرا دیا۔ بعض قبروں میں دو دو شہیدوں کو رکھا گیا۔ انھیں غسل بھی نہ دیا گیا اور اس وقت نماز جنازہ بھی نہ پڑھی گئی۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں:

آٹھ برس کے بعد...... جب آپؐ ادھر سے گزرے تو بے اختیار آپؐ پر رقت طاری ہُوئی۔ اس طرح آپؐ نے پُر درد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو[1]

مصعبؓ بن عُمیر کا سر ڈھانکتے تو پاؤں کھل جاتے۔ پاؤں ڈھانکتے تو سر کھل جاتا۔ آخر پاؤں کو اذخر کی گھاس ڈال کر چھپایا گیا۔

بعد میں ایک مرتبہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے سامنے افطاری کے لیے کھانا آیا تو شاید ذرا پُرتکلف تھا۔ یہ دیکھتے

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۵۴

ہی انہیں اُحد کا زمانہ یاد آ گیا، جب بدنوں کو چھپانے کے لیے گھاس کاٹ کاٹ کر ڈالتے تھے۔ عبدالرحمٰنؓ بیتاب ہو کر رونے لگے اور کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے۔

شہداء کی تعداد شہدائے اُحد کی تعداد عموماً ستر بتائی جاتی ہے۔ "المشاہد" میں جو تعداد بیان کی گئی ہے اس کی مختصر کیفیت یہ ہے:

مہاجرین	۵
انصار (خزرج)	۵۴
انصار (اوس)	۳۶
متفرق اصحاب	۱۳
	۱۰۸

یہ کل ایک سو آٹھ بنتے ہیں[۱]۔ متفق علیہ تعداد جو ستر بتائی جاتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعض اصحاب کے نام اس میں نہیں آئے۔

مسئلہ تاریخ غزوۂ احد کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے۔ "ابن ہشام"، "جوامع السیرۃ" وغیرہ کے مطابق یہ غزوۂ ۱۵ شوال ۳ھ (۲۱۔ مارچ ۶۲۵ء) کو پیش آیا۔ دن ہفتے کا تھا۔ طبقات ابن سعد میں اس کی تاریخ ۷۔ شوال ۳ھ (۲۳۔ مارچ ۶۲۵ء) مرقوم ہے۔ اس روز بھی ہفتہ ہی تھا۔

عام کیفیت مسلمانوں کے لیے غزوہ اُحد کا نتیجہ بہت بڑے صدمے کا باعث تھا۔ خصوصاً انصار میں سے بہت سے جلیل القدر اصحاب نے شہادت پائی تھی۔ بایں ہمہ اسلام اور رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اسے الفاظ کا لباس پہنانا ناممکن نہیں۔ ایک انصاری خاتون کا ذکر آپ نے کئی مرتبہ پڑھا ہوگا کہ صحابہ کرام میدان احد سے لوٹے تو وہ خاتون حالات معلوم کرنے کے لیے احد کی طرف آ رہی تھی۔ جب اسے بتایا گیا کہ تیرا باپ، بھائی اور شوہر شہید ہو گئے تو اس نے بے تابانہ پوچھا، رسول اللہ صلعم کا کیا حال ہے؟ بتایا گیا کہ آپ بفضل اللہ بخیریت ہیں تو وہ بے اختیار بولی:

کل مصیبۃٌ بعدك جلل

آپ زندہ ہیں تو سب مصیبتیں ہیچ ہیں:

میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہِ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

[۱] "المشاہد" مطبوعہ نولکشور (ص ۵۲ - ۸۵)

حضرت سعدؓ بن معاذ رئیس اوس کے بھائی عمروؓ بن معاذ اُحد میں شہید ہو گئے تھے۔ رسول اللہ صلعم سعدؓ و عمروؓ کی سن رسیدہ والدہ سے ان کے بیٹے کی تعزیت کرنا چاہتے تھے۔ سعدؓ بن معاذؓ خود والدہ کو آپؐ کے پاس لے آئے تاکہ آپؐ ان کے پاس جانے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ آپؐ نے بیٹے کی شہادت پر اظہار ہمدردی فرمایا تو والدۂ سعدؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ جب آپؐ سلامت ہیں تو ہمیں کیا غم ہے؟

پھر شہدائے اُحد کی قدر و منزلت کے باب میں کیا کہا جائے؟

سعدؓ بن ربیع کی صاحبزادی امّ سعدؓ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ سے ملاقات کے لیے آئی تو خلیفۂ وقت نے امّ سعدؓ کے لیے کپڑا بچھایا اور اس پر بٹھایا۔ عمرؓ آئے اور پوچھا: یہ کون ہیں؟ خلیفہ نے جواب دیا کہ اس کی صاحبزادی ہیں جو رسول اللہ کے نزدیک تم سے اور مجھ سے بہتر تھا۔ پوچھا: یا خلیفۂ رسول اللہ وہ کیونکر؟ فرمایا: اس نے رسول اللہ صلعم کے زمانے میں جنت کا راستہ لیا اور ہم تم یہیں باقی رہ گئے۔

شکست یا فتح

زیادہ تر لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُحد میں شکست ہُوئی۔ میرے نزدیک یہ تاثر صحیح نہیں۔ بلاشبہ اس جنگ میں تیراندازوں کے جیش کی غلطی کے باعث مسلمانوں کا جانی نقصان بہت ہُوا لیکن شکست وُہ ہوتی ہے جس میں شکست خوردہ میدان چھوڑ دیتا ہے۔ اُحد میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ قریش مکہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا کر رخصت ہو گئے۔ اگلے روز مسلمانوں نے حمراء الاسد تک قریش کا تعاقب کیا اور تین روز وہاں ٹھہرے رہے، اس لیے اُحد کو شکست قرار دینے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ (مولف)

بابِ

غزوۂ اُحد

— (۳) —

(مولاناؒ کے ارشادات)

صبر و تقویٰ جنگ بدر و اُحد کے نتائج نے ثابت کر دیا تھا کہ صبر و تقویٰ کے بغیر کبھی نصرت و کامرانی حاصل نہیں ہو سکتی۔

صبر سے مقصود یہ ہے کہ مشکلات و مصائب کا مقابلہ ہمت و ثابت قدمی کے ساتھ کیا جائے۔ تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ احتیاط و پرہیزگاری کی رُوح پیدا ہو۔ جنگ بدر کے موقع پر یہ دونوں قوتیں موجود تھیں، اس لیے مسلمانوں کی مُٹھی بھر تعداد نے دشمن کی بہت بڑی تعداد کو شکست دے دی لیکن اُحد کے میدان میں ایک گروہ نے کمزوری دکھائی، وہ صبر و تقویٰ کی آزمائش میں پُورا نہ اُترا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نقصان ہُوا۔

اصولی مہمات سورۂ آل عمران میں (جہاں احد کا ذکر آیا ہے) متعدد اصولی مہمات واضح کی گئی ہیں،

۱۔ جنگ احد کے موقع پر کثرت رائے سے یہ بات قرار پا گئی تھی کہ شہر سے نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ مسلمان نکلے۔ منافقوں نے لوگوں کو بہکانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو قبیلے بددل ہو گئے۔ اس طرح ابتدا ہی سے صبر اور تقویٰ کی رُوح کمزور پڑ گئی۔ اس کا نتیجہ وہی ہونا تھا جو آخر پیش آیا۔

۲۔ ضمناً اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ ظلم و کفر کرنے والوں کی بدعملیاں کتنی ہی سخت کیوں نہ ہوں، لیکن ہادی و مصلح کو ان کی ہدایت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور نہ رحمت و بخشش کی طلب کے سوا کوئی اور جذبہ اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ بخشنا یا نہ بخشنا خدا کا کام ہے اور اسی پر چھوڑ دینا چاہیے۔

جنگ اُحد میں خود پیغمبر اسلام پر دشمنوں نے پے در پے حملے کیے اور انھیں ہلاک کر ڈالنا چاہا۔ تاہم خدا نے پسند نہیں کیا کہ دشمنوں کی ہدایت و بخشش کی طلب کے سوا کوئی جذبہ ان کے قلب مطہر میں پیدا ہو (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

۳۔ اے پیروانِ دعوت حق! جو ٹھوکر تمھیں احد میں لگی ہے۔ اگر چاہتے ہو کہ اس سے عبرت پکڑو تو چاہیے کہ ان آلودگیوں سے پاک و صاف ہو جاؤ جو تمھارے دلوں میں کمزوری کا روگ پیدا کرنے والی ہیں۔ از انجملہ مال و دولت کی حرص ہے جب تک یہ روگ دلوں میں موجود ہے، جاں فروشی کی سچی رُوح پیدا نہیں ہو سکتی۔

۴۔ پیغمبر اسلام (صلعم) نے ایک خاص گھاٹی پر جو نقشۂ جنگ میں بڑی اہمیت رکھتی تھی ایک جماعت متعین کردی (مراد ہے جبل عینین پر) اور کہہ دیا تھا کہ اس جگہ سے نہ ہلیں لیکن جب مسلمانوں کے فتح مندانہ مقابلہ نے دشمنوں کے پاؤں اکھاڑ دیے تو یہ جماعت (بجز دس آدمیوں کے) مالِ غنیمت لُوٹنے کی طمع میں بے قابو ہوگئی اور مورچہ چھوڑ کر لوٹ مار شروع کردی۔ دشمنوں نے جب یہ حال دیکھا تو فوراً پلٹ پڑے اور بے خبری میں حملہ کردیا۔ یہی حادثہ ہے جس نے مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل دی تھی[1]

۵۔ چونکہ مورچہ چھوڑنے والوں کی لغزش کا اصلی سبب مال و دولت کی طمع تھی اور مال و دولت کی طمع کا ایک بڑا آلہ سود کا لین دین تھا۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ یہاں اس کا ذکر کیا گیا۔ سُود در سُود کی وجہ سے بڑی بڑی رقمیں قرضداروں کے سر چڑھ گئی تھیں۔ قدرتی طور پر ان کا چھوڑنا لوگوں پر شاق گزرتا تھا۔ پس حکم الٰہی ہُوا کہ تمہارے دلوں کے "تزکیے کے لیے اس بات میں سب سے بڑی آزمایش ہے۔ سُود در سود کی وجہ سے کتنی ہی رقم قرضداروں پر کیوں نہ چڑھ گئی ہو، اسے یک قلم چھوڑ دو۔

۶۔ علاوہ بریں جنگ اُحد کی شکست کا اصلی سبب یہ تھا کہ نظام و اطاعت یعنی ڈسپلن کی رُوح پُوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ اب کسی ایسی بات پر زور دیا جائے جس کی فوری تعمیل میں اطاعت و فرمانبرداری کی پوری پوری آزمایش ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ یہ آزمایش سُود لینے کی ممانعت سے زیادہ اور کسی بات میں نہیں ہوسکتی تھی۔ سود کی حرمت سے قرضخواہوں کو ایک ایسی بات چھوڑ دینی پڑتی تھی جسے صدیوں سے اپنا جائز حق سمجھتے آئے تھے اور ان کے مال و دولت کی افزایش کا یہ سب سے بڑا ذریعہ تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فرمایا: و اطیعوا اللہ والرسول لعلکم تفلحون۔

امامت کے بعض مہمات اس سلسلے میں پیغمبر اسلام (صلعم) سے خطاب، موعظت اور منصب امامت کی بعض اصولی مہمات:

---

[1] مولاناؒ نے غالباً اختصار کے خیال سے معاملہ کھول کر بیان نہ کیا۔ لڑائی احد کے دامن میں ہُوئی تھی۔ قریش کا رخ مشرق کی طرف تھا اور مسلمانوں کا مغرب کی طرف۔ احد کے سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا جس پر رسول اللہ صلعم نے تیرانداز مقرر کر دیے تھے تاکہ دشمن عقب سے مسلمانوں پر حملہ نہ کرسکیں۔ مسلمانوں نے قریش کو شکست دے دی تو ان تیراندازوں کی اکثریت نے خلاف ہدایت جگہ چھوڑ دی۔ یہ دیکھ کر خالد بن ولید نے (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہُوئے تھے) سواروں کے ساتھ احد کی شمالی جانب سے ہوتے ہوئے عقب سے حملہ کیا۔ اس میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ نیز مُنی بمالی نقصان کی زیادتی کو شکست قرار دینا مناسب نہیں۔

ا - یہ اللہ کی بڑی ہی رحمت ہے کہ تمہارے دل میں نرمی اور مزاج میں سرتاسر شفقت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگوں کے دل تمہاری طرف بے اختیار نہ کھنچتے جس طرح اب کھنچ رہے ہیں۔

ب - جنگ کے بعد میں ایک گروہ کی لغزش بڑی ہی سخت لغزش تھی تاہم تمہاری شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ عفو و درگزر سے کام لو

ج - تمہارا طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ صلح و جنگ کا کوئی معاملہ بغیر مشورے کے انجام نہ پائے۔

د - اس بارے میں دستور العمل یہ ہے کہ پہلے جماعت سے مشورہ کرو پھر مشورے کے بعد کوئی ایک بات ٹھان لو اور جب ایک بات ٹھان لی تو اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ۔ شوریٰ اپنے محل اور وقت میں ضروری ہے عزم اپنے محل اور وقت میں۔ جب تک مشورہ نہیں کیا ہے، فیصلہ و عزم کا سوال نہیں اٹھتا لیکن جب مشورے کے بعد عزم کر لیا گیا تو وہ عزم ہے۔ کوئی رائے، کوئی نکتہ چینی اور کوئی مخالفت اسے متزلزل نہیں کر سکتی۔ امام کے لیے ضروری ہے کہ جماعت سے مشورہ کرے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ صاحب عزم ہو۔

منافقوں کا معاملہ

جنگ احد کا معاملہ منافقوں کے لیے جو مخلص مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے زندگی بسر کر رہے تھے ایک فیصلہ کن آزمائش تھا۔ اس موقع پر ان کا نفاق پوری طرح کھل گیا۔ جنگ کے ابتدائی مشورے سے لے کر جنگ کے بعد تک کوئی موقع ایسا نہیں آیا کہ فتنہ پروری سے باز رہے ہوں۔ جب کثرت رائے سے یہ بات قرار پائی کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے تو لوگوں کو بہکانے لگے کہ باہر نکل کر لڑنا موت کے منہ میں جانا ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ اچھا شہر کی مدافعت کرو تو لگے طرح طرح کے حیلے بہانے کرنے۔ کہتے تھے ہمیں امید نہیں کہ لڑائی کی نوبت آئے۔ اگر امید ہوتی تو ضرور تیاری کرتے۔ پھر جب لوگوں کی کمزوری اور نافرمانی سے شکست ہوگئی تو انھیں فتنہ و شرارت کا نیا موقع ہاتھ آگیا۔ کبھی کہتے یہ سب کچھ اسی لیے ہوا کہ ہماری بات نہیں مانی گئی۔ کبھی کہتے روز روز کی لڑائیوں سے کیا فائدہ؟ نجات اسی میں ہے کہ دشمنوں کو راضی کر لیا جائے۔ مقصود یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے دلوں میں مایوسی اور ہراس پیدا کر دیں اور ان کی کوئی بات بھی ٹھیک طور پر نہ بن پائے۔

اُحد کے میدان سے جاتے ہوئے دشمن کہہ گئے تھے کہ آئندہ سال پھر آئیں گے اور آخری فیصلہ کر کے جائیں گے۔ دوسرے سال جب وہ وقت آیا تو مسلمان تیار ہو کر باہر نکلے لیکن دشمنوں کا کوئی پتا نہ تھا۔ انھیں مکہ سے نکلنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ مسلمان چند دن انتظار کر کے خوش دل اور کامیاب واپس آ گئے لیکن اس موقع پر بھی منافقوں نے دشمن سے مل کر ہر طرح کی شرارتیں کیں۔ دشمن چاہتے تھے کہ ڈر جانے کی ذلت ان کے حصے میں نہ آئے، مسلمانوں کے حصے میں آئے اور یہ جبھی ہو سکتا تھا کہ مسلمان جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوں۔ چنانچہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے مخبر بھیجے گئے اور بہت سی جھوٹی افواہیں مشہور کر دی گئیں۔ منافق انھیں پھیلاتے اور مسلمانوں کو سرگرمی سے باز

رکھنا چاہیے۔ یہاں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور منافقوں کو آخری مہلت دی گئی ہے کہ اپنی منافقانہ روش سے باز آجائیں ورنہ وقت آگیا ہے کہ اللہ ان کے چہروں پر سے نفاق کا پردہ اٹھا دے گا۔

ان آیات میں منافقوں کی جو نفسیاتی حالت دکھائی گئی ہے وہ کوئی مخصوص صورت حال نہیں۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ جماعت کے کمزور اور مذبذب افراد ہمیشہ ایسی ہی صورت پیدا کر دیا کرتے ہیں۔

ایک ضروری نکتہ جس طرح جنگ بدر کی فتح مندی سے مسلمانوں کی تربیت مدِنظر تھی اسی طرح جنگ اُحد کی عارضی شکست میں بھی تربیت کا پہلو پوشیدہ تھا۔ ایک دوڑنے والے کی مشق کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہوتا کہ بے روک ٹوک دوڑتا چلا جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک دو مرتبہ گر گر کر گرنے اور سنبھلنے کا سبق بھی سیکھ لے۔ بدر کی فتح مندی نے استعداد و سعی کی برکتیں دکھا دی تھیں۔ ضرورت تھی کہ اب کمزوری و تغافل کے نتائج کا بھی تجربہ ہو جائے چنانچہ اُحد کے حادثہ نے یہ مقصد پُورا کر دیا۔

بدر کی فتح اور تائید الٰہی کی بشارتوں نے بہت سے مسلمانوں میں ایک طرح کی بے پروائی اور غفلت پیدا کر دی تھی۔ وُہ سعی و تدبیر کی کاوشوں سے بے حس ہو گئے تھے اور سمجھنے لگے تھے کہ ہم کوشش کریں یا نہ کریں ہر حال میں ہمارے لیے فتح ہی فتح ہے۔ اس طرح کی خام خیالیاں ابتدائی فتح مندیوں کے بعد پیدا ہو جایا کرتی ہیں لیکن یہ ایک خطرناک حالت تھی اس کا نتیجہ غفلت و غرور تھا اور ضروری تھا کہ اس کی نشو و نما روک دی جائے۔ پس احد کے تجربوں نے مسلمانوں کو بتلا دیا کہ خدا کی تائید و نصرت کا وعدہ برحق ہے لیکن اس کے تمام کاموں کی طرح اس کی تائید و نصرت کے بھی سنن و قوانین ہیں اور ضروری ہے کہ انھی کے مطابق نتائج بھی ظہور میں آئیں جو جماعت کمزوری و غفلت میں مبتلا ہو جائے گی صبر و ثبات میں پُوری نہیں اترے گی اور جو اطاعت و نظام میں کچّی ہو گی وہ خدا کی تائید و نصرت کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

فتح و نصرت کے حقدار جب مسلمانوں کی بڑی تعداد مضطرب ہو کر بھاگنے لگی تو پیغمبر اسلام (صلعم) چند جاں نثاروں کے حلقہ میں کھڑے پکار رہے تھے: الیّ عباد اللہ! الیّ عباد اللہ! خدا کے بندو: میری طرف آؤ، میری طرف آؤ۔ تم کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ ان آیات میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

جو لوگ ایمان و اخلاص میں پکّے تھے اور محض صورت حال کے فوری اثر نے انھیں گھبرا دیا تھا۔ وہ پیغمبر اسلام کی آواز سُنتے ہی چونک اُٹھے۔ انھیں ایسا محسوس ہُوا جیسے اچانک ایک مدہوشی کی سی حالت طاری ہو گئی اور اس مدہوشی میں سارا خوف و ہراس فراموش ہو گیا۔ چنانچہ وہ فوراً پلٹے اور نہ صرف دُشمنوں کو میدان جنگ سے بھگا ہی دیا، بلکہ حمراء الاسد نامی مقام تک جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے، ان کے تعاقب میں بڑھے چلے گئے لیکن جو لوگ دل کے

کچے یا منافق تھے، انھیں اپنی جانوں ہی کی فکر لگی رہی۔ وہ کہتے تھے جو کچھ ہُوا، اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اگر خدا فتح و نصرت دیتا تو ایسی حالت پیش ہی کیوں آتی؟ قرآن کہتا ہے۔ یہ عہد جاہلیت یعنی عرب کے قبل از اسلام زمانے کے سے خیالات ہیں اور ان دلوں میں نہیں گزر سکتے، جو اسلام کی تعلیم سے روشن ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ فتح و نصرت اللہ ہی کے ہاتھ ہے لیکن وہ فتح و نصرت انھی کو دیتا ہے جو صبر و تقویٰ میں پکے ہوتے ہیں۔

اصل کام

اعدائے حق اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تمھیں ایسی راہ پر لگانا چاہتے ہیں کہ راہ حق سے بیدل ہو جاؤ۔ وہ تمھیں دشمنوں کی کثرت و طاقت کے افسانے سنا کر مرعوب کرنا چاہتے ہیں، لیکن اگر تم راہِ حق میں ثابت قدم رہے اور انسانی طاقتوں کی جگہ اللہ کی کارسازی و رفاقت پر بھروسا رکھا تو وہ وقت دُور نہیں جب تمھاری ہیبت سے ان کے دل کانپ اٹھیں گے۔

اس اصل عظیم کی طرف اشارہ کہ جن لوگوں کے سامنے اعتقاد و ہدایت کی کوئی روشن اور ثابت حقیقت نہیں ہوتی اور خدا کو چھوڑ کر اعتماد و پرستش کے بہت سے ٹھکانے بنا لیتے ہیں، ان کے اندر عزم و یقین کی وہ رُوح پیدا نہیں ہو سکتی، جو اہل حق و ایمان کے لیے مخصوص ہے۔ وُہ جب کبھی کسی ایسی جماعت کے مقابلے میں نکلیں گے جو ایمان و یقین کی رُوح سے معمور ہو گی تو خواہ کتنی ہی طاقت و شوکت رکھتے ہوں لیکن کبھی اسے مرعوب نہیں کر سکیں گے۔

نزول قرآن کے وقت مسلمانوں کی جو جماعت پیدا ہو گئی تھی اس کے مقابلے میں مشرکین عرب کا یہی حال تھا۔ وہ تعداد میں بہت اور سر و سامان میں طاقتور تھے، مگر ایمان و یقین کی رُوح سے محروم تھے۔ مسلمان تعداد میں تھوڑے اور سر و سامان سے محروم تھے مگر ایمان و یقین کی رُوح سے معمور تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلت کی ہیبت سے کثرت کے دل کانپ اٹھے اور مُٹھی بھر انسانوں نے عرب کی پُوری آبادی کو شکست دے دی۔

منافقین تمھیں جنگ احد کی شکست یاد دلا کر ڈرا رہے ہیں تاکہ آیندہ دشمنوں کے مقابلے کی جرأت نہ کرو، لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اُحد کے میدان میں جو کچھ پیش آیا تھا اس کی حقیقت کیا ہے؟ خدا کا وعدۂ نصرت اس موقعے پر بھی پُورا ہوا تھا اور دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے تھے لیکن جب تم نے عین حالت جنگ میں حکم رسولؐ کی نافرمانی کی اور ایک گروہ مالِ غنیمت لُوٹنے کی طمع میں مورچہ چھوڑ کر تتر بتر ہو گیا تو میدانِ جنگ کی ہوا پلٹ گئی اور فتح ہوتے ہوتے شکست ہو گئی۔ پس یہ جو کچھ ہُوا، دشمنوں کی طاقت و کثرت سے نہیں ہوا، جس سے منافق تمھیں ڈرا رہے ہیں بلکہ تمھاری نافرمانی اور بے ہمتی سے ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دشمنوں کی طاقت و کثرت سے مرعوب ہو، بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ اپنے اندر صبر اور تقویٰ کی سچّی رُوح پیدا کرو۔

مصلحتیں اور حکمتیں

تمھیں جنگ احد میں جو ٹھوکر لگی ہے تو چاہیے کہ اس سے عبرت پکڑو اور آیندہ کے لیے اپنے اعمال کی نگہداشت کرو۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی کوفت میں ایسے کھو جاؤ کہ آیندہ

سے بیٹے ہمت ہار بیٹھو۔ یہ جنگ کا میدان ہے کبھی ایک فریق جیتا ہے کبھی دوسرے کی باری آتی ہے۔ بدر میں تمہاری چوٹ ان پر لگی تھی، اُحد میں ان کی چوٹ تم پر لگ گئی لیکن جماعتوں کی کشمکش کی تاریخ میں ایک دو میدانوں کی ہار جیت کیا اہمیت رکھتی ہے؟ اصل چیز جو سوچنے کی ہے وہ تمہارے دلوں کی ایمانی قوت ہے۔ اگر تمہارے اندر ایمان کی سچی رُوح موجود ہے تو پھر دنیا میں رفعت و سربلندی صرف تمہارے ہی لیے ہے۔

علاوہ بریں یہ حادثہ اگرچہ بظاہر شکست ہے لیکن بہ باطن چند در چند مصلحتیں اور حکمتیں رکھتا ہے۔ ازاں جملہ یہ کہ کھرے کھوٹے کی آزمایش ہو گئی۔ جو منافق اور کچّے دل کے آدمی اسلامی جمعیت میں ملے ہُوئے تھے ان کے چہرے بے نقاب ہو گئے اور ازانجملہ یہ کہ لوگوں کو جنگ کے نازک اور فیصلہ کن معاملات کا ذاتی تجربہ ہو گیا۔ تجربے اور مشاہدے کے بعد ان کے قدم زیادہ محتاط ہو جائیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بعض مسلمانوں کے دلوں میں کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں، وہ اس ٹھوکر کے لگنے سے دُور ہو گئیں اور ان کا عزم و ایمان زیادہ مضبوط اور بے داغ ہو گیا۔
(مولف)

باب ۴

اُحد سے حدیبیہ تک

—(۱)—

غزوہ حمراء الاسد

غزوۂ احد ۱۵۔ شوال ۳ھ (۳۱۔ مارچ ۶۲۵ء) کو ہوا تھا۔ ہفتے کا دن تھا۔ اگرچہ قریش کا لشکر میدان جنگ سے روانہ ہو گیا تھا لیکن خطرہ تھا کہ وہ لوگ دوبارہ حملہ نہ کر دیں۔ اس لیے رات کو مدینہ منورہ میں پہرے کا زبردست انتظام کیا گیا۔ ۱۶۔ شوال ۳ھ (یکم اپریل ۶۲۵ء) کو رسول اللہ صلعم نے قریش کے تعاقب کا حکم صادر فرمایا۔ یہ بھی صراحت کر دی کہ صرف وہی لوگ اس مہم میں شریک ہوں جو غزوۂ احد میں شریک تھے۔ چنانچہ مجروحین پٹیاں باندھے ہوئے مہم تعاقب میں شریک ہوئے۔ خود رسول اللہ صلعم بھی ساتھ تھے۔ آپ نے حمراء الاسد میں قیام فرمایا جو مدینہ منورہ سے آٹھ میل مکہ مکرمہ کے راستے پر ہے۔ اس رات مقام نزول میں جگہ جگہ آگ جلائی گئی تاکہ دیکھنے والے کو معلوم ہو، بڑا لشکر ٹھہرا ہوا ہے۔ اگرچہ قبیلہ بنوخزاعہ مسلمان نہیں ہوا تھا، مگر وہ لوگ فی الجملہ مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔ معبد خزاعی رسول اللہ صلعم سے ملنے کے لیے آیا۔ واپس ہوا تو دیکھا کہ قریش الرَّوحا میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور پلٹ کر فیصلہ کن حملے کے مسئلے پر بحث ہو رہی ہے۔ معبد نے ان سے کہا کہ میں نے ایسا ہیبت انگیز لشکر کبھی نہیں دیکھا جیسا محمد (صلعم) کے ساتھ ہے اور وہ حمراء الاسد میں ہیں۔ یہ سن کر قریش مکہ روانہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلعم پیر اور منگل (۱۷ اور ۱۸۔ شوال ۳ھ) کو حمراء الاسد میں قیام فرما رہے اور بدھ (۱۹۔ شوال) کو مراجعت فرمائی۔

ابوسلمہؓ کی مہم

ذی قعدہ اور ذی حجہ ۳ھ کے مہینے اطمینان سے گزر گئے۔ پھر اطلاع ملی کہ قبیلہ بنو اسد کے رئیس طلیحہ اور سلمہ فرزندان خویلد اپنی قوم کو رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ کی دعوت دے رہے ہیں۔ حضور صلعم نے اس فتنے کو دبانے کی غرض سے ابوسلمہؓ عبداللہ بن عبدالاسد کو ڈیڑھ سو صحابہ کے ساتھ محرم ۴ھ (جون ۶۲۵ء) میں بھیجا اور فرمایا کہ بنو اسد کو اجتماع اور مقابلے کی مہلت نہ دینا۔ ابوسلمہؓ یلغار کرتے ہوئے علاقہ بنو اسد میں[۱] پہنچ گئے۔ انھیں دیکھتے ہی قبیلے کے لوگ منتشر ہو گئے اور ابوسلمہؓ اونٹ اور بکریاں لے کر صحیح و سالم مدینہ منورہ لوٹ گئے۔

---

[۱] میں بنو اسد کا علاقہ ٹھیک ٹھیک متعین نہ کر سکا۔ روایتوں میں قَطَن نام ایک پہاڑ کا ذکر آیا ہے، جہاں سے پانی کے چشمے نکلتے ہیں اور اسے ضلع فَید میں بتایا گیا ہے۔ اس بنا پر میرا اندازہ ہے کہ یہ علاقہ نجد کی جانب، مدینہ منورہ کے شمال مشرق میں ہونا چاہیے۔

ابوسلمہؓ غزوۂ اُحد میں زخمی ہو گئے تھے۔ مرہم پٹی سے زخم مندمل ہو گیا تھا۔ اس مہم میں تگ ودو اور محنت ومشقت کے باعث زخم پھر ہرا ہو گیا اور یہی امر اس ممتاز مجاہد اسلام کی موت کا باعث ہوا۔ ابوسلمہؓ رسول اللہ صلعم کے رضاعی بھائی بھی تھے۔

عبداللہ بن اُنیس کا کارنامہ

قبیلہ بنو لحیان کا رئیس سفیان بن خالد بڑا ہی فتنہ انگیز اور مفسد شخص تھا۔ اسے ہر وقت ایسی تدبیریں سُوجھتی رہتی تھیں، جن سے گردوپیش جنگ کی آگ بھڑکے اور خود اسے فائدہ پہنچے۔ چنانچہ اس نے بھی مدینہ منورہ پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آخر رسول اللہ صلعم نے مجبور ہو کر اس فتنہ کو کسی نہ کسی طرح ختم کرنے کا فیصلہ فرمالیا۔ اس کا وطن عُرنہ تھا جو مکہ سے زیادہ دُور نہ تھا اور قریش سے اس کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔

اس مقصد کے لیے عبداللہ بن اُنیس کو چُناگیا، جو سفیان بن خالد کا حلیہ معلوم کر لینے کے بعد ۵ محرم ۴ھ (۱۷ جون ۶۲۵ء) کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو گئے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے تلوار لی اور بطن عُرنہ میں پہنچ کر سفیان بن خالد کو دیکھا مختلف قبیلوں کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ مجھ سے مخاطب ہوا تو میں نے کہا کہ قبیلہ خزاعہ سے ہوں۔ سنا تھا کہ تم محمد (صلعم) کے خلاف جتھا تیار کر رہے ہو۔ میں نے سوچا کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہو جاؤں۔ سفیان نے کہا کہ بیشک میں تیاری کر رہا ہوں۔ یوں خود اس کی زبان سے تصدیق ہو گئی کہ وہ حملے کا منصوبہ تیار کر چکا ہے۔

عبداللہؓ بن اُنیس کہتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ باتیں کرتا گیا۔ میری باتیں اسے شیریں معلوم ہوئیں۔ یہاں تک کہ اس کا خیمہ آ گیا۔ ساتھی الگ ہو گئے۔ سب سو گئے تو میں نے اسے قتل کر کے سر اٹھا لیا اور پہاڑ کے غار میں داخل ہو گیا۔ لوگوں نے مجھے بہت ڈھونڈا، مگر مجھ تک نہ پہنچ سکے اور واپس چلے گئے۔ پھر میں رات کو چلتا اور دن کو چھپ رہتا۔ اسی طرح مدینے پہنچ گیا۔

رسول اللہ صلعم سے میں مسجد میں ملا۔ مجھے دیکھتے ہی آپؐ نے فرمایا: تمہارا چہرہ فلاح پائے۔ میں نے بھی عرض کیا، یا رسول اللہ آپؐ کا چہرہ فلاح پائے۔ پھر میں نے پوری سرگزشت سنا دی۔ اس وقت آپؐ کے دست مبارک میں عصا تھا۔ وہی مجھے عطا کرتے ہوئے فرمایا: اسے پکڑ کر جنت میں چلے جاؤ۔

یہ عصا عبداللہؓ بن اُنیس کے پاس رہا۔ وفات کا وقت قریب آیا تو گھر والوں کو وصیت کی کہ عصا کفن میں رکھ دیا جائے۔ عبداللہؓ بن اُنیس اس مہم سے اٹھارہ روز کے بعد ۲۳ محرم ۴ھ (۵ جولائی ۶۲۵ء) کو مدینہ منورہ واپس آئے تھے۔

واقعہ رجیع

اس دردناک واقعے کی ابتدا میرے اندازے کے مطابق بنو لحیان کے رئیس سفیان بن خالد سے ہوئی۔ جب اس نے سنا کہ قریش اُحد میں کامیاب ہو کر آئے ہیں تو وہ مبارکباد دینے

کے بیٹے کو پہنچا۔ وہاں اس نے سُلافہ بنت سعد کے بَین سنے جو طلحہ کی بیوی تھی۔ طلحہ بن ابی طلحہ غزوہ احد میں قریش کا علمبردار تھا۔ وہ خود، اس کے دو بھائی اور تین بیٹے اس غزوے میں مارے گئے تھے۔ سُلافہ ان سب کو رو رہی تھی چونکہ اس کا بیٹا مسافع بن طلحہ، عاصمؓ بن ثابت کے تیر سے مارا گیا تھا، اس لیے اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ عاصمؓ بن ثابت کی کھوپری میں شراب پیے گی اور اس کھوپری کے عوض ایک سو اونٹ دینے کے لیے تیار رہتی۔

یہ امر سفیان کی کمند حرص و آز کے لیے تازیانہ بن گیا۔ شیطنت تو اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ قریش کے مختلف گھرانے اپنے مقتولوں کا بدلا مسلمانوں سے لینے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ کیوں نہ مسلمانوں کی کسی جماعت کو کسی بہانے سے بلا کر قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ انعام حاصل کیا جائے۔

بنو لحیان خود تو مسلمانوں کو بلا نہیں سکتے تھے، عضل و قارہ کے لوگوں سے ساز باز کر کے ان کے ذریعے سے کچھ مسلمان تعلیم اسلام کے لیے بلانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس اثنا میں سفیان بن خالد مارا گیا تاہم بنو لحیان نے اصل منصوبے کے مطابق عمل جاری رکھا۔ مسلمانوں کو قریش کے ہاتھ فروخت کر کے روپیہ اور مال حاصل کرنے کے علاوہ اب انھیں اپنے رئیس کے قتل کا بدلا بھی لینا تھا۔

عضل و قارہ کی دغا بازی

چنانچہ عضل و قارہ کے سات آدمی رسول اللہ صلعم کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی کہ ہمارے لوگ اسلام کی طرف مائل ہیں۔ کچھ آدمی مقرر فرما دیے جائیں جو ہمیں قرآن پڑھائیں اور اسلامی شریعت سکھائیں۔ چونکہ سُلافہ بنت سعد نے عاصمؓ بن ثابت کی کھوپری میں شراب پینے کی قسم کھا رکھی تھی، اس لیے ان آدمیوں نے عاصمؓ بن ثابت سے بطور خاص درخواست کی کہ آپ ضرور ساتھ چلیں۔ رسول اللہ صلعم نے مندرجہ ذیل اصحاب کو بھیجا:

۱۔ عاصمؓ بن ثابت بن ابی الاقلح
۲۔ مرثدؓ بن ابی مرثد الغنوی
۳۔ خالدؓ بن بکیر اللیثی
۴۔ خُبیبؓ بن عدی
۵۔ زیدؓ بن الدثنہ
۶۔ معتبؓ بن عبید
۷۔ عبداللہؓ بن طارق

بعض روایتوں میں دس اصحاب کے بھیجنے کا ذکر ہے، لیکن نام صرف سات ہی ملتے ہیں۔ بعض کے نزدیک

اس جماعت کے امیر عاصمؓ بن ثابت تھے اور بعض کے نزدیک مرثدؓ بن ابی مرثد، اس لیے بعض اس واقعے کو "بعث رجیع" سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض "سریہ مرثد بن ابی مرثد الغنوی" کہتے ہیں۔

عضل و قارہ نے مدینے سے روانگی کے ساتھ ہی بنو لحیان کو خفیہ خفیہ اطلاع بھیج دی تھی کہ ہم مسلمانوں کو لارہے ہیں، تم آجاؤ۔ چنانچہ ان میں سے دو سو آدمی تیار ہو کر آ گئے جن میں سے ایک سو تیر انداز تھے۔ جب مبلغین و معلمین اسلام کی یہ مقدس جماعت رجیع کے چشمے پر پہنچی جو عسفان اور مکہ کے درمیان ہے تو دشمن نمودار ہو گئے اور جو کچھ پیش آنے والا تھا اس کا اندازہ ہو گیا۔

صحابہ کرام نے جنگ کی۔ چار شہید ہو گئے تو باقی تین اصحاب کو قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ کوئی تکلیف نہ دی جائیگی چنانچہ خُبَیبؓ بن عدی، زیدؓ بن الدثنہ اور عبد اللہؓ بن طارق نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔ حوالگی کے ساتھ ہی ظالموں نے تینوں کو جکڑ لیا۔ عبد اللہؓ بن طارق نے "مر الظہران" میں اپنے آپ کو چھڑا لیا لیکن انھوں نے بھی شہادت پائی۔ چنانچہ ان کی قبر مر الظہران ہی میں ہے۔ خُبَیبؓ کو حارث کے بیٹوں نے اور زیدؓ کو صفوان بن امیہ نے خرید لیا۔ حارث نیز صفوان بن امیہ کا باپ غزوۂ بدر میں مارے گئے تھے اور ان کے بدلے میں یہ لوگ خُبَیبؓ اور زیدؓ کو شہید کرنا چاہتے تھے۔

خُبَیبؓ کی شہادت

سزائے موت دینے کے لیے حضرت خُبَیبؓ کو تنعیم لے گئے، جو شمالی جانب حد حرم پر ہے تاکہ حد حرم سے باہر سزا دی جائے۔ انھوں نے دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر بولے، اگر دشمنوں کو یہ گمان نہ ہوتا کہ خُبَیبؓ نے موت کے خوف سے نماز کو طول دیا تو جی چاہتا تھا کہ دیر تک نماز پڑھتا۔ پھر کچھ شعر پڑھے جن میں سے آخری دو یہ ہیں:

فو اللہ ما ارجو اذا مت مسلماً
علی ایّ جنب کان فی اللہ مصرعی[1]

(بخدا جب میں مسلمان کی حیثیت میں جان دے رہا ہوں
تو کچھ پروا نہیں کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو گرتا اور کیونکر جان دیتا ہوں)

---

[1] اس شعر کا متن مختلف کتابوں میں ابن ہشام کے اس متن سے مختلف ہے مثلاً سیرۃ النبیؐ میں ہے:

و ما ان ابالی حین اقتل مسلماً — علی ای شق کان للہ مصرعی

(جلد اول ص ۳۶۱)

جوامع السیرۃ ابن حزم:

و لست ابالی حین اقتل مسلماً — علی ای شق کان فی اللہ مضجعی (ص ۱۰۸)

وذالک فی ذات الالٰہ و ان یشأ
یبارک علی اوصال شلوٍ ممزّع

"یہ جو کچھ ہے خالصتہً خدا کے لیے ہے۔ اگر وہ چاہے
تو جسم کے پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کر دے۔"

سزائے موت سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنے کا طریقہ حضرت خُبیبؓ بن عدی ہی سے جاری ہوا۔

زیدؓ کی شہادت

زیدؓ کو بھی شہادت کے لیے تنعیم ہی میں لائے۔ صفوان نے اپنے غلام نسطاس کو حکم دیا کہ اسے قتل کر دے۔ اس وقت ابوسفیان نے زیدؓ سے پوچھا:

"سچ کہنا، اگر اس وقت تمہارے بدلے میں محمد (صلعم) قتل کیے جاتے تو کیا تم اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے؟"

زیدؓ نے عشقِ رسولؐ کی سیہ مستی میں جواب دیا:

"خدا کی قسم! میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ میرے بچاؤ کے بدلے میں رسول اللہ صلعم کے پائے مبارک خلشِ خار سے آشنا ہوں۔"

ابوسفیان کی زبان پر بے تکلف یہ الفاظ آ گئے:

"اللہ! میں نے کسی شخص کو کسی دوسرے آدمی سے ایسی محبت کرتے نہیں دیکھا جیسی اصحابِ محمد کو محمد سے ہے۔"

خدا کی حفاظت

کافروں نے عاصمؓ بن ثابت کا سر کاٹنے کی بڑی کوشش کی تاکہ سُلافہ کے پاس لے جائیں اور ایک سو اونٹ معاوضے میں پائیں۔ لیکن بھڑوں نے اس مقدس شہید کی نعش کے گرد ایسا حلقہ باندھ لیا کہ کسی کو قریب آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پھر یکایک بارش کا ریلا آیا، جس میں لپٹی ہوئی وہ نعش خدا جانے کہاں پہنچ گئی۔

رسول اللہ صلعم کے لیے واقعہ رجیع خصوصیت سے رنج افزا تھا۔ ایسے مقدس اور پاک نفس بزرگ جو انسانیتِ عالیہ کے زیور تھے، اس غداری، بے وفائی اور بے دردی سے شہید کیے گئے، لیکن جب تعصب ضمیر کے آئینے کو بالکل سیاہ کر دیتا ہے اور نیک و بد کی تمیز اٹھ جاتی ہے بلکہ نیکی سے بڑھ کر بدی محبوب و مرغوب نظر آتی ہے تو اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔

واقعہ بئر معونہ

رجیع کا واقعہ صفر ۴ھ میں پیش آیا تھا (جولائی ۶۲۵ء)۔ اسی قسم کا مگر اس سے زیادہ نقصان رساں واقعہ اسی مہینے بہ مقام بئر معونہ پیش آیا۔ بئر معونہ پانی کا ایک کنواں ہے جو بنی سُلیم کی ملکیت میں ہے لیکن بنی عامر کے علاقے اور بنی سُلیم کے علاقے کے درمیان ہے۔ البتہ حرہ بنی سُلیم سے زیادہ نزدیک ہے۔ یہ مکہ و مدینہ کے اس راستے پر آتا ہے جسے "طریق شرقی" کہتے ہیں۔

[1] ابو براء عامر بن مالک کلابی رسول اللہ صلعم کے پاس آیا۔ حضور صلعم نے اسے دعوت اسلام دی۔ نہ تو اس نے اسلام قبول کیا اور نہ اسے رد کیا۔ یہ درخواست پیش کر دی کہ اگر آپ کچھ اصحاب اہل نجد کی طرف بھیجیں تو امید ہے وہ دعوت اسلام قبول کر لیں۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ مجھے اہل نجد کی طرف سے اطمینان نہیں۔ ابو براء نے کہا کہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں ضامن ہوتا ہوں۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ اس موقع پر رعل و ذکوان کے لوگ بھی آئے تھے اور ان کی درخواست بھی یہی تھی کہ تبلیغ و تعلیم کے لیے کچھ آدمی بھیج دیے جائیں۔

حضور صلعم نے صفر ۴ھ (جولائی ۶۲۵ء) میں ستر اصحاب کو بھیج دیا اور ان پر منذرؓ بن عمرو انصاری کو امیر بنایا جو حضرت عمر فاروقؓ کے خسر اور عاصمؓ بن عمرؓ کے نانا تھے۔

ابن ہشام[1] اور جوامع السیرۃ[2] میں ہے کہ صرف چالیس آدمی بھیجے تھے۔

جب یہ اصحاب بئر معونہ پر پہنچے تو حرامؓ بن ملحان[3] کو رسول اللہ صلعم کے نامۂ مبارک کے ساتھ قبیلہ بنو عامر کے رئیس عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ اس بے درد نے نامہ مبارک بھی نہ سنا اور ایک آدمی کو اشارہ کر دیا، جس نے پیچھے سے حرامؓ بن ملحان کے نیزہ مارا اور وہ شہید ہو گئے۔ پھر عامر بن طفیل نے اپنے قبیلے یعنی بنو عامر کو پکارا کہ اٹھو اور سب کو قتل کر دو۔ انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ابو براء جو ذمہ داری اٹھا کر آئے ہیں، اسے بے وقعت نہیں بنائیں گے۔ بنو عامر سے مایوس ہو کر عامر بن طفیل نے بنو سُلیم میں سے عُصَیَّہ، رِعل اور ذکوان کو پکارا۔ انھوں نے ہلہ کر کے سب کو شہید کر ڈالا۔ صرف تین افراد بچ رہے۔ ایک کعبؓ بن زید جو زخمی ہو گئے تھے لیکن زندگی باقی تھی۔ قبائلیوں نے انھیں مُردہ سمجھ لیا۔ ان کے زخم اچھے ہو گئے اور انھوں نے غزوۂ خندق میں شہادت پائی۔ دو آدمی اونٹ چرانے اِدھر اُدھر نکل گئے تھے یعنی امیہ بن عمرو ضمری اور منذرؓ بن محمد۔

ایک اور شہادت

ان دونوں نے چیلیں فضا میں منڈلاتی دیکھیں تو اندازہ کر لیا کہ ہمارے ساتھی شہید کر دیے گئے پھر دونوں نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ایک رائے یہ تھی کہ جلد سے جلد مدینہ منورہ پہنچ کر حضور صلعم کی خدمت میں اطلاع پہنچائی جائے۔ منذرؓ بن محمد نے کہا کہ میں تو اس مقام سے بھاگنے کے لیے تیار نہیں، جہاں ہمارے امیر منذرؓ بن عمرو شہید ہوئے۔ چنانچہ منذرؓ بن محمد لڑ کر شہید ہو گئے۔ عمروؓ بن امیہ ضمری کو عامر بن طفیل نے خود یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے قبیلہ مضر میں سے کسی کو آزاد کرنے کی منت مان رکھی ہے۔

شہدائے رجیع کی طرح شہدائے بئر معونہ بھی بڑے مقدس بزرگ تھے۔ صرف قرآن سیکھتے اور پڑھتے۔ جنگل سے

---

[1] ابن ہشام القسم الثانی (ص ۱۸۴) [2] جوامع السیرۃ (ص ۱۷۹) [3] حرامؓ بن ملحان حضرت انسؓ بن مالک کے ماموں یعنی ان کی والدہ ام سُلیم کے بھائی تھے۔

لکڑیاں کاٹ کر یا چن کر لاتے اور انھیں بیچ کر کھانے پینے کی ضرورتیں پوری کرتے۔ ابن حزم نے ان میں سے حارث بن الصمہ، حرام بن ملحان، عروہؓ بن اسماء، خود امیر جماعت منذرؓ بن عمرو، عامرؓ بن فہیرہ (حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام جو سفر ہجرت میں حضور صلعم کے ہمراہ تھے) وغیرہ کا ذکر بطور خاص کیا ہے[1] عامرؓ کو ایک شخص نے نیزہ مارا تھا، جو جسم کے دوسری طرف جا نکلا۔ وہ یہ کہتے ہوئے گر گئے "فزت و رب الکعبة" (خدائے کعبہ کی قسم میں تو مراد کو پہنچ گیا) یہ الفاظ ایسے پُر تاثیر تھے کہ قاتل خود مدینہ منورہ پہنچ کر مسلمان ہو گیا۔ (مولف)

---

[1] جوامع السیرۃ ص ۱۷۹

باب ۶

اُحد سے حُدیبیہ تک

—(۲)—

عمرو بن امیہ کی غلطی

عمروؓ بن امیہ ضمری واپس مدینے آ رہے تھے۔ راستے میں انھیں دو آدمی ملے جو سوئے ہوئے تھے۔ عمروؓ نے سمجھا کہ ان کے رفیقوں کے قاتل ہیں لہذا انھیں قتل کر دیا حالانکہ وہ بنی عامر میں سے تھے جن کے ساتھ رسول اللہ صلعم کا عہد تھا اور انھوں نے اپنے رئیس کی پکار پر بھی ابو برا کا عہد قائم رکھا تھا۔ لہذا رسول اللہ صلعم نے اطلاع ملتے ہی ان دو کا خون بہا بھجوا دیا۔

بہت بڑا حادثہ

ایک روایت کے مطابق پچاس اور دوسری روایت کے مطابق اسّی مومنین مخلصین کی شہادت بہت بڑا اور حد درجہ الم انگیز حادثہ تھی۔ رسول اللہ صلعم کو اس کا سخت قلق ہوا۔

مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں :

آنحضرت صلعم کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا۔

غزوۂ بدر الموعد

اُحد سے واپس ہوتے ہوئے ابو سفیان نے کہا تھا کہ آئندہ سال اسی مہینے میں بمقام بدر مقابلہ ہوگا۔ رسول اللہ صلعم کے ایماء مبارک پر حضرت عمر فاروقؓ نے جواب اثبات میں دے دیا تھا۔ چنانچہ ذی قعدہ ۴ھ کا آغاز (اوائل اپریل ۶۲۶ء) قریب آیا تو رسول اللہ صلعم بدر پہنچنے کے لیے نکل پڑے۔ آپؐ کے ساتھ پندرہ سو غازی اور دس گھوڑے تھے۔ ذی قعدہ کا چاند طلوع ہوتے ہی بدر میں میلہ شروع ہو جاتا تھا اور وہاں عرب تجارت ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلعم بدر میں ۸۔ ذی قعدہ (۱۲۔ اپریل ۶۲۶ء) تک قیام فرما رہے۔ ابوسفیان دو ہزار کا لشکر لے کر نکلا۔ گھوڑے ساتھ تھے۔ لیکن مرالظہران پہنچ کر اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ اس نے کہا قریش کے لیے شادابی اور ہریالی کا سال مناسب ہے کیونکہ اونٹ سبزہ اور درختوں کے پتے کھائیں گے۔ لوگ ان کا دودھ پی کر گزارہ کر لیں گے۔ اب خشک سالی ہے۔ یہ وقت لڑائی کے لیے مناسب نہیں۔ چنانچہ وہ سب واپس چلے گئے۔ رسول اللہ صلعم بھی ۸۔ ذی قعدہ کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

اس غزوے کو "بدر موعد"، "بدر ثانیہ" یا "بدر آخرہ" بھی کہتے ہیں۔

غزوۂ ذات الرقاع

کوئی تاجر مدینہ منورہ میں اپنا سامان لایا تو اس نے خبر دی کہ غطفان میں سے انمار و ثعلبہ یا بنو محارب و ثعلبہ نے مقابلے کے لیے کچھ گروہ جمع کیے ہیں۔ یہ خبر سُن کر

حضور صلعم حضرت عثمانؓ کو قائمقام مقرر فرما کر ۱۰۔ محرم ۵ھ (۱۱۔ جون ۶۲۶ء) کو نجد کی سمت روانہ ہو گئے۔ جدھر ان قبیلوں کا علاقہ تھا۔ آپؐ کے ساتھ بعض روایات کے مطابق چار سو اور بعض کے مطابق سات سو اصحاب تھے۔ آپؐ چلتے چلتے "ذات الرقاع" پہنچ گئے۔ "ذات الرقاع" کی متعدد تعبیرات ہیں،

۱۔ ایک پہاڑ ہے جس میں مختلف رنگ کے قطعے ہیں۔

۲۔ ایک درخت کا نام ہے۔

۳۔ برچھوں میں پیوند لگے ہوئے تھے، اس لیے غزوے کا نام ذات الرقاع پڑ گیا۔

۴۔ پتھروں پر چلتے چلتے پاؤں پھٹ گئے تھے اور صحابہ نے چندیاں لپیٹ لی تھیں اس لیے یہ غزوہ، غزوۂ ذات الرقاع کہلایا۔

بہر حال آپ مطلوب مقام پر پہنچے تو عورتوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ کیونکہ مرد بھاگ کر پہاڑوں پر چلے گئے تھے مختلف جماعتیں مختلف سمتوں میں تلاش کے لیے بھیجی گئیں لیکن کوئی نہ ملا۔ تاہم نماز خوف پڑھی کہ مبادا عبادت گزاری سے فائدہ اٹھا کر دشمن اچانک حملہ کر دیں۔ پہلے ایک فریق نے دو رکعتیں پڑھیں اور دوسرا فریق پہرہ دیتا رہا۔ پھر دوسرے فریق نے نماز ادا کی اور پہلا فریق پہرے پر متعین رہا۔ ۲۵۔ محرم ۵ھ (۲۲۔ جون ۶۲۶ء) کو رسول اللہ صلعم مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

غزوۂ دُومۃ الجندل

اطلاع ملی تھی کہ دومۃ الجندل میں بہت بڑی جماعت ہے جو شتر سوار ادھر سے گزرتے ہیں، ان پر یہ لوگ ظلم کرتے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ مدینے پر حملہ کریں۔

رسول اللہ صلعم ۲۵۔ ربیع الاول ۵ھ (۲۴۔ اگست ۶۲۶ء) کو ایک ہزار مسلمانوں کے ساتھ دومۃ الجندل کے قصد سے روانہ ہوئے۔ سباع بن عُرفطہ انصاری کو قائمقام بنایا۔ آپؐ رات کو سفر کرتے، دن کو کہیں چھپ رہتے لیکن دومہ کی جمعیت حضور صلعم کے پہنچنے سے پیشتر ہی منتشر ہو گئی اور آپؐ ۲۰۔ ربیع الاول ۵ھ (۱۸۔ ستمبر ۶۲۶ء) کو مدینہ منورہ آ گئے۔

غزوۂ مُریسیع

خزاعہ میں سے ایک قبیلہ بنو المصطلق تھا، جس کا مرکزی چشمہ مُریسیع[1] تھا۔ بنو المصطلق کے رئیس حارث بن ابی ضرار نے اپنے زیر اثر عرب قبیلوں کو رسول اللہ (صلعم) کے خلاف جنگ کی دعوت دی۔ حضور صلعم نے اس خبر کی تصدیق کرائی۔ درست ثابت ہوئی تو زیدؓ بن حارثہ کو قائمقام بنایا اور ۲۔ شعبان ۵ھ (۲۷۔ دسمبر ۶۲۶ء) کو بنو المصطلق کی تادیب کے لیے روانہ ہو گئے۔ حارث بن ابی ضرار کو

---

[1] یہ مقام فرع سے دس بارہ میل بتایا جاتا ہے اور فرع مدینہ منورہ سے قریباً چھیانوے میل کے فاصلے پر ہے۔

حضور صلعم کی روانگی کا علم ہو گیا۔ اس کے ساتھی عرب الگ ہو گئے۔ وہ خود بھی بھاگ گیا۔ رسول اللہ صلعم کے لیے مُریسیع کے گھاٹ پر خیمہ نصب کیا گیا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ اس سفر میں ساتھ تھیں۔ جو لوگ موقع پر موجود تھے، انھوں نے مقابلہ کیا۔ ان میں سے دس مارے گئے اور باقی گرفتار ہو گئے۔

قیدیوں میں سے بعض کو کچھ لیے بغیر چھوڑ دیا گیا۔ بعض سے فدیہ لیا گیا۔ غرض قبیلہ بنو المصطلق کی کوئی بھی عورت ایسی نہ تھی جو قید رہی ہو یا واپس نہ ہوئی ہو۔

ام المومنین جویریہؓ

حارث بن ابی ضرار کی صاحبزادی جویریہ بھی قیدیوں میں تھیں۔ انھوں نے گرفتار کرنے والوں سے مکاتبت کر لی۔ یہ معاملہ رسول اللہ صلعم تک پہنچا تو آپؐ نے جویریہؓ سے فرمایا کہ اگر چاہو تو میں پوری رقم دے کر آزاد کرا لیتا ہوں اور تمھیں اپنی زوجیت میں لے لیتا ہوں۔ جویریہؓ نے اسے منظور کر لیا اور انھیں ام المومنین کا درجہ عظیمہ ملا۔

ایک روایت میں ہے کہ خود حارث بن ابی ضرار نے حاضر ہو کر بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ میری بیٹی کنیز نہیں رہ سکتی۔ آپؐ اسے آزاد کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ معاملہ جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دو۔ جویریہؓ نے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں رہنا پسند کیا اور نکاح ہو گیا۔ بعض روایتوں میں ہے حضرت جویریہؓ کا فدیہ اس کے باپ نے ادا کیا تھا۔

جویریہؓ کے ام المومنین بننے کی پہلی برکت یہ ہوئی کہ تمام قیدی رہا کر دیے گئے، اس لیے کہ جس خاندان یا قبیلے میں رسول اللہ صلعم کا نکاح ہو گیا تھا اس کا کوئی فرد غلام نہیں رہ سکتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ میری نظر میں ایسی کوئی خاتون نہیں جو اپنی قوم کے لیے اتنی بابرکت ثابت ہوئی ہو، جتنی جویریہؓ بنو المصطلق کے لیے ثابت ہوئیں۔

اس سفر میں بعض اور واقعات بھی پیش آئے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ نیز اس غزوے کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے۔ رسول اللہ صلعم اس سلسلے میں اٹھائیس روز مدینہ منورہ سے باہر رہے اور رمضان شریف کا چاند ہوا تو واپس ہوئے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ جویریہؓ کا والد فدیے کا مال لے کر مدینہ منورہ پہنچا۔ اس میں اونٹ بھی تھے۔ دو اونٹ اس نے وادی عقیق میں چھپا دیے۔ پھر رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں اپنی بیٹی کا فدیہ لے کر آیا ہوں۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: وہ دو اونٹ کہاں ہیں جنھیں فلاں گھاٹی میں چھپا دیا ہے؟ حارث بن ابی ضرار ہکا بکا رہ گیا اور اس نے بے اختیار کلمۂ شہادت پڑھا۔ جویریہؓ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے حارث کو پیغام نکاح دیا اور حارث نے چار سو درہم پر نکاح کر دیا۔

غزوۂ بنو لحیان

باقی غزوات میں سے ایک بنو لحیان کے خلاف تھا جو واقعہ رجیع کے ذمہ دار تھے۔ رسول اللہ صلعم ربیع الاول ۶ھ[1] میں مدینہ سے روانہ ہوئے۔ دو سو آدمی اور بیس گھوڑے ساتھ تھے۔ رات کو چلتے اور دن کو چھپے رہتے۔ آپؐ بطن غران میں پہنچے۔ اس کے اور عسفان کے درمیان پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ بطن غران ہی میں اصحاب رجیع کو غداری کی مصیبت سے سابقہ پڑا تھا۔ بنو لحیان خوف کے مارے پہاڑ کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔ حضور صلعم عسفان تک گئے۔ سواروں کو ابوبکرؓ کی سرکردگی میں آگے بھی بھیجا۔ پھر آپؐ واپس ہو گئے۔

غزوۂ غابہ

غابہ جو مدینہ منورہ سے آٹھ میل کے قریب شمال میں ہے وہاں چراگاہ میں حضور صلعم کی اونٹنیاں چرا کرتی تھیں۔ ایک غفاری مرد و عورت ان کے نگران تھے۔ اچانک عیینہ بن حصن نے غطفان کے رسالے کے ساتھ ان پر چھاپا مارا۔ نگران کو مار کر اونٹنیاں ہنکا لے گیا۔ سلمہؓ بن الاکوع کو یہ خبر سب سے پہلے ملی۔ انھوں نے تعاقب کیا۔ بڑے نادر انداز تھے۔ تاک کر تیر مارتے اور دشمن کو بے بس کر دیتے۔ رسول اللہ صلعم بھی ایک جیش لے کر پہنچ گئے لیکن غزوۂ غابہ میں سب سے بڑا کارنامہ سلمہؓ بن الاکوع ہی کا ہے۔

غزوۂ ذی قرد

اسے غزوۂ ذی قرد بھی کہتے ہیں کیونکہ چھاپا مارنے والوں نے چشمہ ذی قرد پر پانی پیا تھا۔ پھر رسول اللہ صلعم نے وہاں پہنچ کر ایک دن اور ایک رات قیام فرمایا۔ اس میں دو صحابیوں نے شہادت پائی۔ ایک محرز بن نضلہ الاخرم نے دوسرے کا نام غالباً وقاص تھا۔

ثمامہ بن اثال

رسول اللہ صلعم کی بھیجی ہوئی ایک جماعت نجد کی طرف سے بنو حنیفہ کے ایک رئیس ثمامہ بن اثال کو گرفتار کر لائی۔ رسول اللہ صلعم نے اسے مسجد کے ایک ستون سے بندھوا دیا۔ جب اس طرف سے حضور صلعم کا گزر ہوا تو پوچھا: ثمامہ کیا حال ہے؟ ثمامہ نے کہا: محمد (صلعم) اگر قتل کرو تو ایک مستحق کو قتل کرو گے۔ چھوڑ دو گے تو ایک شکر گزار کو چھوڑو گے۔ روپیہ چاہو تو بتا دو، دے دیا جائے گا۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی یہی بات ہوئی۔ تیسرے روز آپؐ نے ثمامہ کو چھوڑ دیا۔ ثمامہ ایک درخت کے پاس گئے، غسل کیا اور واپس آ کر مسلمان ہو گئے۔ پھر عرض کیا:

> خدا کی قسم، جتنی آپ کے چہرے سے نفرت تھی اتنی کسی چہرے سے نہ تھی۔ آج جتنی آپ کے چہرے سے محبت ہے، اتنی کسی چہرے سے نہیں۔ کوئی دین میری نظروں میں اتنا برا نہ تھا جتنا آپ کا دین۔

---

[1] ربیع الاول ۶ھ تقویم کے مطابق ۲۱ جولائی ۶۲۷ء سے شروع ہوئی۔

پھر اجازت لے کر ثمامہؓ نے عمرہ ادا کیا اور وطن کی طرف مراجعت فرمائی۔ مکہ میں غلہ یمامہ ہی سے آتا تھا ثمامہؓ نے کہہ دیا کہ اے اہل مکہ اب رسول اللہ صلعم کی اجازت کے بغیر ایک دانہ بھی نہ آئے گا آخر اہل مکہ نے رسول اللہ صلعم سے عرض کر کے غلہ حاصل کرنے کا انتظام کیا۔ (مولف)

غزوۂ خندق

باب ۴

غزوۂ خندق

(۱)

تاریخ کا مسئلہ

غزوۂ خندق، جسے غزوۂ احزاب[1] بھی کہتے ہیں اواخر شوال ۵ھ[2] میں شروع ہوا۔ اس کے جاری رہنے کی مدت کے باب میں اختلاف ہے۔ طبقات ابن سعد میں ایک روایت ہے کہ محاصرہ چوبیس راتیں جاری رہا۔ دوسری روایت میں ہے کہ محاصرے میں پندرہ راتیں گزریں۔ رسول اللہ صلعم ۸۔ ذی قعدہ کو پیر کے دن خندق پر پہنچے[4] اور چہار شنبہ کو خندق سے اٹھ کر مدینہ منورہ آ گئے۔ اس وقت ماہ ذی قعدہ کے اختتام میں سات راتیں باقی تھیں[5] گویا اصل غزوہ ۸۔ ذی قعدہ ۵ھ کو شروع ہوا، ۲۳۔ ذی قعدہ ۵ھ کو ختم ہو گیا[6]۔

بعض اصحاب کا بیان ہے کہ غزوۂ خندق شوال ۴ھ میں پیش آیا لیکن یہ سال ہجرت کے حساب میں اختلاف کا معاملہ ہے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے یعنی رسول اللہ صلعم ربیع الاول میں مدینہ منورہ پہنچے تھے۔ بعض اصحاب سال کا حساب ربیع الاول سے ربیع الاول تک کرتے تھے اس حساب سے یہ واقعی چوتھا سال تھا، لیکن عام حساب آغاز سال یعنی یکم محرم سے شروع ہو گیا تھا اس حساب کے مطابق اسے پانچواں سال ماننے میں تامل کی کوئی وجہ نہیں۔ گویا یہ اختلاف حقیقۃً اختلاف نہیں صرف حساب سنین کے دو مختلف طریقوں کا اختلاف ہے، جو جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔

مدت محاصرہ کا معاملہ

مدت محاصرہ میں اختلاف کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ تمام حملہ آور گروہ ایک ہی دن نہیں پہنچے ہوں گے۔ ان کی آمد میں کم یا زیادہ تقدم و تاخر ضرور ہوا ہو گا۔ سب کے آ جانے کے بعد ان کے قائدوں نے باہم مشورے کیے ہوں گے تاکہ حملوں کا منصوبہ مکمل کر لیں۔ پھر مدینہ پہنچتے ہی انھوں نے خندق دیکھی ہو گی۔ یہ تدبیر دفاع عربوں کے لیے بالکل نئی تھی۔ انھیں سوچ سمجھ کر کوئی ایسی صورت نکالنے کی ضرورت پیش آئی ہو گی، جس سے کام لے کر اہل مدینہ کو جی بھر کر نقصان پہنچا سکیں۔ میرا خیال ہے کہ بنو قریظہ کو اٹھا کر میدان جنگ میں لانے کی

---

[1] اسے غزوۂ خندق اس وجہ سے کہتے ہیں کہ دفاع کے لیے خندق کھودی گئی تھی جو عربوں کے لیے نئی چیز تھی۔ "احزاب" حزب کی جمع ہے یعنی گروہ۔ چونکہ اس غزوے میں مخالفین کے بہت سے گروہ شامل ہو گئے تھے، اس لیے یہ "غزوۂ احزاب" کہلایا۔ [2] تقویم کے مطابق اواخر مارچ ۶۲۳ء۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے انتہائی چھان بین کے بعد آغاز غزوہ کی تاریخ مارچ ۶۲۷ء بتائی ہے [3] طبقات ابن سعد طبع بیروت ص ۶۳۔ [4] طبقات جلد دوم ص ۶۷۔ (۳۱۔ مارچ ۶۲۷ء) [5] طبقات جلد دوم ۷۰۔ [6] ۱۵۔ اپریل ۶۲۷ء بروز چہار شنبہ۔

تدبیر بھی اسی وقت سوجھی ہوگی، جب خندق نے ان کے لیے یورش عام کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ غرض بعض اصحاب نے محاصرہ کا حساب احزاب کے پہلے لشکر کی آمد سے شروع کیا اور بعض کو اس حساب کا آغاز اس وقت سے مناسب معلوم ہوا، جب احزاب کے اقدامات جنگ کی ابتدا ہوئی۔ یعنی یہ اختلاف بھی کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔

صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ کی ابتدا اواخر شوال میں ہوئی اور چوبیس روز کے بعد یہ ۲۲۔ ذی قعدہ ۵ھ کو بروز چہارشنبہ ختم ہوگیا۔

یہود و مشرکین کا ساز باز

اس غزوے کے اصل محرک قبیلہ بنو نضیر کے چند اکابر تھے مثلاً سلام بن ابی الحقیق نضری، حیی بن اخطب نضری، کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق نضری۔ ہوذہ بن قیس وائلی اور ابو عمارہ وائلی بھی ان کے ساتھ تھے۔

معلوم ہے کہ قبیلہ بنو نضیر کو ربیع الاول ۴ھ (اگست ۶۲۵ء) میں اس وجہ سے مدینہ چھوڑنا پڑا تھا کہ ان کی فتنہ انگیزیاں اور عہد شکنیاں ناقابل برداشت ہو چکی تھیں۔ ان میں سے اکثر خیبر جا بسے۔ بعض شمال و مغرب میں دوسرے مقامات پر چلے گئے۔ ان کے کینے اور عناد کی آگ بدستور مشتعل رہی۔ چنانچہ وہ پہلے قریش کے پاس مکہ مکرمہ پہنچے اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کی دعوت دی۔ جب قریش نے جو مشرک تھے پوچھا کہ یہود! تم اہل کتاب ہو۔ بتاؤ ہمارا دین بہتر ہے یا محمد (صلعم) کا؟ تو ان یہود نے قریش کی خوشامد اور چاپلوسی میں بے تکلف کہا کہ تمھارا دین مسلمانوں کے دین سے یقیناً بہتر ہے۔

سورہ نسا میں بظاہر اسی کی طرف اشارہ ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا۝ (۴ : ۵۱ - ۵۲)

کیا تم ان لوگوں کا حال نہیں دیکھتے، جنھیں کتاب اللہ (کے علم) میں سے ایک حصہ دیا گیا تھا کس طرح وہ بتوں اور شریر قوتوں کے معتقد ہو گئے ہیں اور کافروں کی نسبت کہتے ہیں "مسلمانوں سے تو کہیں زیادہ یہی لوگ سیدھے راستے پر ہیں" یقین کرو یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی پھٹکار پڑی اور جس کسی پر اس کی پھٹکار پڑی تو ممکن نہیں کسی کو اس کا مددگار پاؤ۔

قریش کو ہم نوا بنا کر یہ یہودی اکابر غطفان کے پاس پہنچے اور انھیں بھی قریش کی تیاری کا ذکر کر کے آمادۂ جنگ کر لیا۔ کچھ لالچ بھی دے دیا۔

ظاہر ہے کہ تمام گروہ مل کر بہت بڑی جنگی قوت میدان میں لا سکتے تھے اور مسلمانوں کے لیے کھلے میدان میں ان کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ ایک مصیبت یہ بھی کہ نضری یہودیوں کے بھائی بند یعنی بنو قریظہ مدینہ میں مقیم تھے اور ان کے متعلق اطمینان نہ تھا کہ مناسب موقع پائیں گے تو اس صورت میں بھی بدعہدی سے باز رہیں گے۔

دفاع کا انتظام

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا کہ کینہ و عداوت کی گھنگور اور پُرشور گھٹائیں ہر طرف سے مدینہ کی طرف بڑھنے والی ہیں تو دفاع کی تدبیروں پر متوجہ ہو گئے۔ شہر کی مشرقی، جنوبی اور مغربی جانب سے حملے کا امکان بہت کم تھا۔ ان اطراف میں گھنے باغات تھے جن میں سے کوئی بڑی فوج گزر کر شہر تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مختلف آدمی ایک ایک کی قطاریں باندھ کر آ سکتے تھے اور انھیں راستے ہی میں ختم کر دینا مشکل نہ تھا۔ صرف شمالی سمت میں دشمن کی روک تھام کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس حصّے کی حفاظت کے لیے حضرت سلمانؓ فارسی نے خندق کھودنے کی تجویز پیش کی، جس کا دستور ایران میں تھا۔

یہ تجویز منظور کر لی گئی کیونکہ اس دور کے وسائل حملہ و ہجوم کے پیش نظر خندق بچاؤ اور روک تھام کا ایک موثر ذریعہ تھی۔ بلاشبہ حملہ آوروں میں سے کچھ آدمی گھوڑے کدا کر خندق سے گزرتے ہوئے اندر آ سکتے تھے اور آئے، مگر انھیں آسانی سے موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا، جیسا کہ اتارا گیا۔ سب سے بڑا اور بطورِ خاص قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ خندق کھُد جانے کی وجہ سے شہر پر شبخون کا خطرہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے شبخون کا خطرہ بھی ظاہر فرمایا تھا۔

خندق

جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں (نومبر ۱۹۶۹ء) واقعہ خندق پر ایک ہزار تین سو بیالیس سال گزر چکے ہیں۔ اتنی لمبی مدت میں اس خندق کے برائے نام آثار بھی باقی رہ جانے کی کون سی صورت تھی؟ اس لیے یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنی لمبی، کتنی چوڑی اور کتنی گہری تھی۔ اس بارے میں مختلف اندازے کیے گئے ہیں مثلاً:

۱۔ دس آدمیوں کی ہر ٹکڑی کے ذمّے چالیس ذراع یعنی ساٹھ فٹ یا بیس گز خندق لگائی گئی تھی۔ تین ہزار آدمی اس کے سرانجام میں شریک تھے اور چھ روز میں خندق تیار ہو گئی۔[1]

۲۔ ہر دس آدمیوں کے ذمّے بیس گز لگا دینے کی بنا پر ڈاکٹر حمید اللہ کا اندازہ یہ ہے کہ خندق چھ ہزار گز لمبی تھی یعنی قریباً ساڑھے تین میل۔ چونکہ دشمن کے سوار گھوڑے کدا کر خندق عبور کرنے میں عموماً ناکام رہے تھے اور ایک مرتبہ ایک سوار خندق کے اندر ہی گر گیا تھا، اس وجہ سے اندازہ کر لیا گیا کہ یہ دس گز چوڑی اور دس گز گہری ہو گی۔[2]

۳۔ ایک تازہ اندازہ یہ ہے کہ خندق پانچ ہزار ذراع (ہاتھ) لمبی تھی یعنی ساڑھے سات ہزار فٹ یا ایک میل اور سات سو چالیس گز۔ اس کی گہرائی کا اندازہ سات ذراع یا ساڑھے دس فٹ اور چوڑائی کا اندازہ نو ذراع یا ساڑھے تیرہ فٹ

---

[1] طبری اور بعض دوسری روایتیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں کہ بعض بیانوں کے مطابق کھدائی تین ہفتوں تک جاری رہی (عہد نبوی کے میدان جنگ ص ۲۹) میرا خیال ہے کہ یہ کھدائی اصل خندق کی نہ ہو گی بلکہ ان خندقوں کی ہو گی جو شہر والوں نے اپنے محلوں یا آطام کی حفاظت کے لیے کھودی تھیں۔ [2] عہد نبوی کے میدان جنگ ص ۲۷، ۲۸

کیا گیا ہے[1]۔ اتنا مسلّم ہے کہ خندق حرۂ شرقی کے اس مقام سے شروع ہوئی تھی جو "شیخین" کہلاتا تھا اور جبلِ سلع تک ضرور آئی، لہٰذا اس کے اتنے طول میں تو کسی کے لیے کلام کی گنجائش ہی نہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے فرمایا ہے کہ مختلف محلوں کے باشندوں نے دیکھا دیکھی اپنی حفاظت کے لیے خندق بڑھالی تھی۔ یوں شہر کے مغرب میں بھی دو اڑھائی میل خندق کھُد گئی بلکہ بعض آطام (قلعہ نما عمارات مدینہ) کے اردگرد بھی خندقیں کھودلی گئیں مثلاً واقدی کا بیان ہے کہ قُبا میں بھی بعض قبائل نے اپنے آطام کی حفاظت کے لیے خندقیں تیار کرلی تھیں[2]۔

رسول اللہ صلعم کی نگرانی حالات نازک تھے۔ مدینہ منورہ میں موسم سخت سردی کا تھا۔ غذائی سامان کی بہت کمی تھی پھر خندق کھودنے کے لیے نہ نوکر موجود تھے نہ مزدور۔ راہِ حق کے جن مجاہدوں کو عساکرِ احزاب کی بلا سے بے درماں سے لڑنا تھا، انھیں کو خندق تیار کرنی تھی۔ رسول اللہ صلعم کام کی اہمیت کے پیشِ نظر بہ نفسِ نفیس موقع پر موجود رہے بلکہ آپ کے لیے خیمہ جبلِ ذباب پر لگ گیا تھا۔ آپ صحابہ کرام کے برابر خندق کھودنے اور مٹی باہر نکالنے کا کام انجام دیتے تھے جیسا کہ مختلف روایات سے واضح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلعم مسلسل نگرانی، شب بیداری اور محنت و مشقت سے چُور ہو کر تھوڑی دیر آرام کے لیے لیٹ گئے اور نیند آگئی تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سرہانے کھڑے ہوگئے تاکہ لوگوں کو پاس نہ آنے دیں، نہ پاس سے گزرنے دیں، مبادا حضور صلعم کے آرام میں خلل آئے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کپڑوں میں مٹی اٹھا اٹھا کر باہر ڈالتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک روز خندق میں سخت زمین آگئی جہاں کدال کام نہیں دیتے تھے۔ حضور صلعم خود اترے شکمِ مبارک پر پتھر بندھا ہوا تھا کیونکہ تین روز سے کچھ نہ کھایا تھا۔ آپ نے کدال چلایا تو وہ سخت زمین ریت کا تودہ بن گئی[3]۔ کھدائی کی مٹی خندق کے کناروں ہی پر ڈالی گئی ہوگی۔ یقین ہے کہ اس سے خندق کی گہرائی میں چند فٹ کا اضافہ ضرور ہو گیا ہوگا اگرچہ اس حالت میں بھی تیس فٹ کی گہرائی تسلیم کرنا مشکل ہے۔

غرض اصل خندق، جو شہر کی حفاظت کے لیے کھودی گئی، حرۂ شرقی سے جبلِ سلع تک تھی۔ مغربی جانب کی خندق وہی ہوگی جو باشندوں نے اپنے اپنے محلوں کی حفاظت کے لیے کھودی۔ ایک بیان مظہر ہے کہ وادی بطحان جو شہر کے مغربی حصے سے گزرتی ہے، اپنا اصل بہاؤ بدل کر اس جگہ سے گزرنے لگی جہاں خندق کھودی گئی تھی[4]۔

غنیم کی تعداد غنیم کی تعداد کے متعلق بیانات مختلف ہیں۔ کم سے کم تعداد دس ہزار بتائی گئی ہے[5]۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ چوبیس ہزار سے زائد تھی[6]۔

---

1. فصول من تاریخ المدینۃ المنورہ ص ۲۰۰ 2. عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ 3. بخاری کتاب المغازی، غزوۂ خندق 4. عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ ص ۲۰ 5. طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۶۶
6. فتح الباری بحوالہ سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۶

بعض تفصیلات بھی مختلف کتابوں میں ملتی ہیں مثلاً :

۱۔ قریش اور ان کے حلیف عرب چار ہزار تھے، سالار اعلیٰ ابوسفیان بن حرب تھا۔ ان کے ساتھ تین سو گھوڑے اور ڈیڑھ ہزار اونٹ تھے۔

۲۔ بنو سلیم مرالظہران (موجود وادی فاطمہ) میں قریش سے ملے۔ ان کی تعداد سات سو تھی۔ سالار سفیان بن عبد شمس تھا۔

۳۔ فزارہ (غطفان) پورے قبیلے کے قابل جنگ آدمی شامل تھے۔ سالار عُیَینہ بن حصن ان کے ساتھ ایک ہزار اونٹ تھے۔

۴۔ بنو مرہ چار سو، سالار الحارث بن عوف۔

۵۔ اشجع، چار سو، سالار مسعود بن رُخَیلہ۔

۶۔ بنو اسد، سالار طلحہ بن خُوَیلد الاسدی[1]

اور قبیلے بھی شامل تھے جن کی تفصیل نہیں ملی۔ باہم مشورے سے تمام گروہوں کے تین جیش بنا لیے گئے تھے :

۱۔ قریش اور ان کے حلیف : سالار ابوسفیان بن حرب۔

۲۔ غطفان : سالار عُیَینہ بن حصن فزاری۔

۳۔ بنو اسد : طلحہ بن خُوَیلد۔

ابوسفیان کو سالار کل بھی مان لیا گیا تھا۔

غنیم کی قیام گاہیں

اتنے بڑے ہجوم کے لیے ایک جگہ ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا دو قیام گاہیں تجویز ہوئیں۔ قریش کا لشکر بئر رومہ کے شمال میں اس مقام پر ٹھہرا تھا، جہاں وادی قنات اور وادی عقیق کا اتصال ہوتا ہے جنگ احد میں بھی قریش نے اسی جگہ قیام کیا تھا۔ غطفان اور ان کے حلیف جبل احد کی مغربی جانب اس جگہ ٹھہرے تھے جہاں وادی قنات اور وادی بطحان ملتی ہیں۔ اس مقام کا نام "ذنب نقمی" تھا۔ اس طرح دونوں گروہ قریب بھی تھے کہ باہم مشورہ کر سکیں اور الگ الگ بھی۔

نقشہ سامنے رکھ کر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حلقۂ مدینۂ منوّرہ کی تمام بستیوں (یا محلوں) میں سے دو بستیاں خندق سے باہر رہ گئی تھیں۔ ایک وُہ بستی جسے منازل بنی حارثہ کہتے تھے۔ یہ حرۂ شرقی پر منازل عبدالاشہل کے شمال میں تھی۔ دوسری بستی یثرب تھی جس کی وجہ سے اس حلقے کی تمام آبادیوں کو باہر کے لوگ یثرب کہتے تھے۔ یہ جبل سلع کے شمال مغرب میں تھی اور اب بھی وہیں ہے۔ یہاں بھی گھنے باغ تھے اور اب بھی ہیں۔ اس بستی کے شمال میں وادی قنات اور مغرب میں

---

[1] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۶۶

وادی بطحان بہتی ہے۔ یہ دونوں وادیاں یثرب کے شمالی و مغربی گوشے میں مل جاتی ہیں۔ عبدالقدوس انصاری نے جو کتاب ”آثارالمدینۃ المنورہ“ کے نام سے ۱۹۳۵ء میں چھاپی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نقشہ بھی تھا جس میں حلقۂ مدینہ کی تمام بستیوں کے مقامات دکھائے گئے ہیں۔ اس میں یثرب کا مقام وہی ہے، جو اوپر بتایا گیا ہے[1]۔ راقم الحروف ۱۹۲۵ء میں مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوا تھا تو جبل سلع سے یثرب کا نشان اسی سمت بتایا گیا تھا۔ اگرچہ وہاں تک جانے کی مہلت میسر نہ آئی۔

یہ بستیاں اس وجہ سے باہر رہ گئی تھیں کہ انھیں خندق کے اندر لایا جاتا تو اسے بہت آگے بڑھ کر کھودنا ناگزیر تھا اس طرح خندق بہت طویل ہو جاتی جسے پیشِ نظر فرصت میں پورا کر لینا ممکن نہ تھا بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خندق ان بستیوں کے لیے مفید دفاع ہوتی یا نہ ہوتی، مدینہ منورہ کا دفاع یقیناً خطرے میں پڑ جاتا۔

مجھے کئی مرتبہ خیال آیا کہ سورۂ احزاب کی آیت ۱۳ شاید اسی بستی کے کسی گروہ سے متعلق ہو، جس کا نام یثرب تھا اور اب تک یثرب[2] ہے۔ آیت یہ ہے:

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْھُمْ یٰٓاَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ یَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْھُمُ النَّبِیَّ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ ۚ وَمَا ھِیَ بِعَوْرَۃٍ ۚ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا۔

اور جب کہنے لگی ایک جماعت اے یثرب والو تمہارے لیے ٹھکانا نہیں سو پھر چلو اور رخصت مانگنے لگا ایک فرقہ ان میں نبی سے کہنے لگا ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں پڑے۔ ان کی کوئی غرض نہیں مگر بھاگ جانا۔

آزمائش کا خوفناک وقت

اس وقت کے حالات بڑے پریشان کن تھے۔ بہت بڑی جمعیت حملہ آور ہوئی تھی جتنی عرب میں پیشتر کبھی کسی مقام پر جمع نہیں ہوئی تھی۔ مقابلے میں صرف تین ہزار مجاہد تھے اور وہ بیچارے پہلے خندق کھودتے کھودتے خاصی مشقت اٹھا چکے تھے۔ اب شدید سردی میں انھوں نے جگہ جگہ خندق کی پہرہ داری سنبھال لی تھی تاکہ غنیم کسی جگہ بڑی تعداد میں اندر نہ گھس آئے۔ پھر یہ معلوم نہ تھا کہ عداوت و عناد کا یہ طوفان کب تک مدینہ منورہ کو گھیرے رہے گا۔ ایک بڑی مصیبت بنو قریظہ کی تھی جو بڑے اطمینان سے عوالی کے مشرقی جانب وادی مہزور کے جنوبی کنارے پر مقیم تھے اور انھوں نے دفاع میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا، حالانکہ ان میں لڑنے والوں کی تعداد خاصی تھی اور سامانِ جنگ کی بھی ان کے پاس کمی نہ تھی۔ اگر وہ غنیم سے مل جاتے تو پورے حلقے کی بستیاں شدید خطرے میں پڑ جاتیں۔ وہ تیار بھی ہو گئے تھے اور قدم بھی اٹھا لیا تھا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا مگر قدرت کی طرف سے ایک غیر متوقع رکاوٹ کا انتظام ہو گیا۔

---

[1] آثار المدینۃ المنورہ مع نقشہ۔ کتاب میں یثرب کا مقام بھی تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ (ص ۱۵۵) [2] ابن ہشام میں ہے کہ ”ان بیوتنا عورۃ“ کے الفاظ اوس بن قیظی کے تھے جو بنو حارثہ میں سے تھا۔

غرض اہل حق کے لیے وہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کا نقشہ قرآن مجید نے اس طرح کھینچ دیا ہے کہ اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا:

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ (احزاب: ۱۰-۱۱)

جب وہ (غنیم) تمہارے اوپر کی طرف سے (شمال) اور تمہارے نیچے کی طرف سے (جنوب) تم پر آ گئے اور جب آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور کلیجے دہشت کے مارے منہ میں آ گئے اور تم اللہ کے متعلق طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آ گیا اور وہ زور سے لرزنے لگے۔

مومنوں کی شان

لیکن مومنوں کے لیے آزمائش و امتحان کے ایسے اوقات حقیقتہً ایمان کے بڑھنے اور پختہ تر ہونے کے اوقات ہیں:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ۔ (احزاب: ۲۲، ۲۳، ۲۴)

اور جب مومنوں نے گروہ دیکھے تو کہا یہی وہ ہے جس کا وعدہ اللہ نے اور اس کے رسول نے کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔ مومنوں کے ایمان اور اطاعت کا درجہ بلند تر ہو گیا۔ مومنوں میں کتنے مرد ہیں جنھوں نے سچ کر دکھلایا جس بات کا عہد اللہ سے کیا تھا پھر کوئی تو ان میں پورا کر چکا اپنا ذمہ اور کوئی ہے کہ ان میں راہ دیکھ رہا ہے اور بدلا نہیں ایک ذرہ بھی تاکہ صادقوں کو اللہ صدق کا بدلہ دے۔

کیفیتِ جنگ

بہرحال غنیم کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پیشتر خندق مکمل ہو چکی تھی۔ عورتوں اور بچوں کو مختلف قلعہ نما عمارتوں میں پہنچا دیا گیا۔ عبداللہؓ ابن مکتوم کو مدینہ منورہ کا انتظام سونپا۔ رسول اللہ صلعم تین ہزار مجاہدین کے ساتھ خندق پر جم گئے۔ خود حضور صلعم کا مرکز جبل سلع کے پاس تھا کیونکہ زیادہ خطرہ شمال و مغرب ہی کی طرف سے تھا جدھر دشمن کے لشکروں کی قیام گاہیں تھیں۔ صحابہ کرام کی مختلف ٹکڑیاں خندق کے مختلف حصوں کی پہرہ داری پر مامور تھیں۔ خندق دیکھتے ہی غنیم کے لیے یورش عام کی امید تو باقی نہیں رہی تھی۔ قریش میں سے ابوسفیان، خالد بن ولید، عمرو ابن العاص، ہبیرہ بن ابی وہب اور ضرار بن الخطاب فہری نے باریاں مقرر کر لی تھیں۔ کسی دن کوئی اور کسی دن کوئی جیش لے کر خندق پر پہنچ جاتا۔ لڑائی تیر اندازی اور سنگباری تک محدود رہ گئی تھی یا وحشی نے ایک روز وہی حربہ استعمال کیا تھا، جس سے حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تھے۔

کبھی کبھی قریش کے بعض جنگجو گھوڑوں پر سوار ہو کر خندق کے مختلف حصوں کا جائزہ لیتے کہ کہیں سے چوڑائی کم ہو تو

گھوڑے کدا کر اندر پہنچ جائیں۔

عمرو بن عبدوَد کا قتل

چنانچہ ایک روز عکرمہ بن ابی جہل، نوفل بن عبداللہ، ضرار بن الخطاب فہری، ہبیرہ بن ابی وہب اور عمرو بن عبدوَد خندق عبور کر کے اندر آ گئے اور ابن عبدوَد نے لڑائی کے لیے پکارا۔ وہ عرب کے مشہور بہادروں میں سے تھا اور تنہا ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ اگرچہ نوّے برس کی عمر ہو چکی تھی تاہم سب اس سے خوف کھاتے تھے۔ حضرت علیؓ مقابلے کے لیے نکلے۔

ابن عبدوَد کا قول تھا کہ کوئی شخص مجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے گا تو ایک ضرور مان لوں گا۔ حضرت علیؓ نے اس قول کی تصدیق اسی سے کرائی۔ پھر پہلی درخواست یہ کی کہ اسلام قبول کرلے۔ ابن عبدوَد نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؓ نے دوسری درخواست یہ کی کہ لڑائی سے واپس چلا جا۔ یہ بھی منظور نہ ہوئی۔ تیسری درخواست اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ معرکہ آرائی کے لیے تیار ہو جا۔ ابن عبدوَد نے ہنستے ہوئے کہا کہ مجھے امید نہ تھی، اس آسمان کے نیچے کوئی شخص مجھ سے یہ درخواست بھی کرے گا۔

ابن عبدوَد گھوڑے سے اتر آیا اور پوچھا، تم کون ہو؟ جب حضرت علیؓ نے نام بتایا تو وہ بولا کہ میں تم سے نہیں لڑنا چاہتا۔ حضرت علیؓ بولے، میں تو لڑنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ابن عبدوَد نے غصے میں آ کر سر پہ تلوار کا وار کیا۔ حضرت علیؓ نے وار سپر پہ روکا مگر ابن عبدوَد کی ضرب سپر کو کاٹتی ہوئی حضرت علیؓ کی پیشانی پر نشان چھوڑ گئی۔

مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں؛

قاموس میں ہے کہ حضرت علیؓ کو "ذوالقرنین" بھی کہتے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے۔ ایک عمرو بن عبدوَد کے ہات کا اور ایک ابن ملجم کا۔[1]

پھر حضرت علیؓ نے وار کیا تو ان کی تلوار ابن عبدوَد کا شانہ کاٹتی ہوئی نیچے اتر آئی اور وہ گر گیا۔ ساتھ ہی حضرت علیؓ نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

ضرار اور ہبیرہ نے حملہ کیا لیکن جب ذوالفقار کا ہات بڑھا تو پیچھے ہٹنا پڑا۔ نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گرا۔ صحابہ نے تیر مارنے شروع کیے۔ اس نے کہا، مسلمانو! میں شریفانہ موت چاہتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے اس کی درخواست منظور کی اور خندق میں اتر کر تلوار سے مارا کہ شریفوں کے شایان تھا۔[2] (مؤلف)

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۳۹۳ [2] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۳۹۳

باب ۴۸

غزوہ خندق

—(۲)—

طبقات ابن سعد میں ہے کہ جب ابن عبدوُد کے ساتھیوں کو معلوم ہوا کہ وُہ مارا گیا تو پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ وہ سوار تھے، اس لیے گھوڑے انھیں بچا کر لے گئے۔ زبیر بن العوام نے تلوار سے نوفل بن عبداللہ پر حملہ کیا اور اسے مار کر دو ٹکڑے کر دیا۔[1]

ایک اور بیان ہے:

نوفل بن عبداللہ مخزومی صف جنگ سے بھاگا اور گھوڑے سے خندق میں جا گرا۔ مجاہدین اس کو سنگسار کرنے لگے۔ وہ چیخا کہ اس سے تو قتل ہی کرنا بہتر ہے۔ علی مرتضیٰؓ خندق میں کود پڑے اور ذوالفقار کے ایک ہی وار سے اس کو دو کر دیا۔[2]

اس بیان کا تتمہ یہ ہے:

زبیر بن العوام نے عین جنگ میں عکرمہ بن ابی جہل اور ہبیرہ بن ابی وہب کو ایسی ڈانٹ بتائی کہ وُہ دونوں بدحواس ہو کر بھاگے۔ ہبیرہ کی زرہ اور عکرمہ کا بھالا گر گیا۔ بھاگتے کی لنگوٹی بھلی۔ زبیرؓ نے زرہ اور بھالا اٹھا لیا۔[3]

"رحمۃ للعالمین" میں ہے کہ اہل مکّہ نے نوفل کی لاش کے لیے دس ہزار درہم پیش کیے۔ حضور صلعم نے فرمایا: لاش دے دو، قیمت درکار نہیں۔[4]

شدید مقابلہ

جس روز عمرو بن عبدوُد اور نوفل بن عبداللہ مارے گئے۔ اس سے دوسرے روز قریش نے زبردستی لاش اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ بہت بڑا لشکر لے کر خندق کے دوسری طرف پھیلا دیا۔ جس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے ادھر قریش کا لشکر بھی زیادہ تھا۔ خالد بن ولید بھی اس لشکر میں تھے اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں:

حملے کا یہ دن بہت سخت تھا۔ تمام دن لڑائی رہی۔ کفار ہر طرف سے تیروں اور پتھروں کا مینہ برسا رہے تھے

---

[1] طبقات جلد دوم ص ۶۸ [2] "المشاہد" مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۰۸۔ خندق میں کود کر اتر جانے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کی گہرائی دس گز یعنی تیس فٹ نہ ہوگی، کم ہوگی۔ [3] المشاہد ص ۱۰۸ [4] جلد اول ص ۱۷۳۔

اور ایک دم کے لیے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی۔ یہی دن ہے جس کا ذکر حادیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم کی متصل چار نمازیں قضا ہوئیں۔ متصل تیراندازی اور سنگباری کے باعث جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا۔[۱]

غرض شام تک یہ جوش و خروش جاری رہا۔ پھر قریش اپنی قیام گاہ کی طرف چلے گئے اور مسلمان رسول اللہ صلعم کے خیمے کی طرف واپس ہوئے صرف اسید بن حضیر دوسرے مسلمانوں کے ساتھ خندق پر موجود رہے۔ خالد بن ولید اور کچھ آدمی جا کر پلٹ آئے اور از سرِ نو لڑائی شروع کر دی۔ یہی موقع ہے جب وحشی (قاتل سید نا حمزہؓ) نے اپنا چھوٹا نیزہ کھینچ کر طفیلؓ بن النعمان کے مارا جو بنی سلمہ میں سے تھے اور انھیں شہید کر دیا۔ پھر وہ چلے گئے۔[۲]

حضرت سعدؓ بن معاذ کا مجروح ہونا

غزوۂ خندق کا ایک نہایت افسوسناک اور رنج افزا واقعہ یہ ہے کہ سعدؓ بن معاذ جو قبیلہ اوس کے سردار اور انصار مدینہ کا فولادی بازو تھے۔ زخمی ہوئے اور یہی زخم ان کی وفات کا باعث ہوا۔

حضرت عائشہؓ جس قلعہ نما عمارت میں تھیں، اسی میں حضرت سعدؓ کی والدہ ماجدہ بھی تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے سعدؓ کو میدانِ جنگ میں جاتے ہوئے دیکھا تو زرہ اس قدر چھوٹی تھی کہ ان کے دونوں ہاتھ باہر تھے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ دیکھ کر سعدؓ کی والدہ سے کہا، کاش زرہ لمبی ہوتی جس سے ہاتھ بھی محفوظ ہو جاتے۔ سوءِ اتفاق دیکھیے کہ حبان بن قیس معروف بہ ابن العرقہ[۳] نے تاک کر سعدؓ کی کلائی میں تیر مارا جس سے رگ اکحل[۴] کٹ گئی۔

زخمی ہوتے ہی حضرت سعدؓ نے دعا کی کہ باری تعالیٰ اگر ہمارے اور قریش کے درمیان لڑائیاں باقی ہیں تو مجھے زندہ رکھ! کیونکہ مجھے قریش ہی کے خلاف جہاد سب سے بڑھ کر پسند ہے۔ انھوں نے رسول اللہ صلعم کو اذیت پہنچائی۔ اگر قریش کے ساتھ لڑائیاں ختم ہو گئیں تو مجھے شہادت عطا کر اور مرنے سے پیشتر بنو قریظہ کی جانب سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا۔

سعدؓ کی یہ دعا بارگاہ باری تعالیٰ میں منظور ہوئی۔ قریش پھر کوئی لڑائی نہ کر سکے اور سعدؓ کی زندگی ہی میں بلکہ ان کی ثالثی سے بنو قریظہ کا فیصلہ ہو گیا۔ پھر اسی زخم کے باعث سعدؓ نے شہادت پائی۔[۵]

غطفان سے تصفیے کا معاملہ

حالات اس درجہ اضطراب افزا تھے کہ رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک میں خیال پیدا ہوا، انصار کے لیے یہ بہت بڑی مصیبت ہے اور اس میں تخفیف کی کوئی صورت نکالی جائے۔

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۰۳۔ مولانا شبلی نے حاشیے میں لکھا ہے، اس امر میں محدثین کا سخت اختلاف ہے کہ چار نمازیں قضا ہوئیں یا ایک اور چار قضا ہوئیں تو ایک ہی دن یا چار دن کی ملا کر زرقانی میں یہ بحث مفصل ہے۔ [۲] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۶۸ [۳] عرقہ حبان کی ماں تھی جس کا نام قلابہ تھا مگر عرقہ کے لقب سے معروف تھی اور حبان اسی کی نسبت سے ابن العرقہ کہلایا۔ [۴] اکحل وہ رگ جسے ہفت اندام کہتے ہیں کیونکہ اس کی فصد سے سر، سینہ، پشت، دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کا خون جاری ہو جاتا ہے۔ [۵] طبقات، ابن ہشام جوامع السیرۃ وغیرہ۔

چنانچہ حضور صلعم نے غطفان کے ساتھ اس شرط پر معاہدہ کر لینا چاہا کہ مدینہ منورہ کی پیداوار کا ایک ثلث انھیں دے دیا جائے اور وہ چلے جائیں۔ سعدؓ بن معاذ اور سعدؓ بن عبادہ سے جو انصار کے رئیس تھے مشورہ کیا تو انھوں نے عرض کیا کہ اگر یہ خدا کا حکم ہے تو ہمیں انکار کی مجال نہیں، لیکن اگر یہ رائے ہے تو جب ہم حالتِ کفر میں تھے، اس وقت بھی کسی کو ہم سے خراج طلب کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ اب ہم ایسی حالت کیونکر قبول کر سکتے ہیں؟

حضور صلعم نے انصار کا استقلال دیکھ کر یہ سلسلہ جنبانی روک دی۔

بنو قریظہ کی بدعہدی

محاصرے میں خاصے دن گزر چکے تھے کہ غزوۂ خندق کا نہایت نازک دور آ گیا، جس کے لیے ساز باز غالباً آغاز ہی سے خفیہ خفیہ شروع ہو چکا تھا۔ خندق کی وجہ سے یورش عام کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہی تھی۔ صرف یورش عام ہی کے سلسلے میں غنیم کو کثرت تعداد کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتی تھی۔ متبادل صورت یہ تھی کہ جو یہودی اکابر قریش و غطفان وغیرہ کو اٹھا کر لائے تھے ان سے کہا جاتا کہ اب مدینہ کے یہودیوں کو اٹھاؤ۔ وہ اندر سے جنگ شروع کریں اور مسلمان ادھر متوجہ ہوں تو لشکر احزاب کسی نہ کسی مقام سے خندق پاٹ کر اندر آ جائے۔ اس طرح مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔

چنانچہ حیی بن اخطب نضری بنو قریظہ کے پاس پہنچا۔ بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد نے جب سنا کہ حیی بن اخطب آ رہا ہے تو اپنے قلعے کا دروازہ بند کر لیا اور چیخ چیخ کر پکارنے کے باوجود نہ کھولا۔ یہی جواب دیا کہ میں محمد (صلعم) سے عہد کر چکا ہوں۔ اسے توڑنے کے لیے ہرگز تیار نہیں اور میں نے ان سے صداقت اور وفا سے عہد کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔

آخر حیی بن اخطب نے مہمانداری میں بخل کا طعنہ دے کر دروازہ کھلوایا اور کہا کہ میں تیرے لیے زمانے کی عزت اور انسانوں کا سمندر اٹھا لایا ہوں۔ قریش اور غطفان اپنے سرداروں اور رئیسوں کے ساتھ آ گئے ہیں۔ کعب نے جواب دیا کہ تو میرے لیے زمانے کی ذلت لایا ہے اور ایسا بادل جس کا پانی ختم ہو چکا ہے۔ وہ گرجتا برستا ضرور ہے، مگر اس میں ہے کچھ نہیں۔ اے حیی، مجھے میری حالت پر چھوڑ دے۔ آخر حیی بن اخطب نے یہ عہد کر کے کعب کو پیمان شکنی پر آمادہ کر لیا کہ اگر قریش اور غطفان محمد (صلعم) کا خاتمہ کیے بغیر چلے گئے تو میں تیرے قلعے میں آ بیٹھوں گا اور جو حالت تم پر گزرے گی، وہی مجھ پر بھی گزرے گی۔

بشارت فتح و نصرت

رسول اللہ صلعم کو یہ اطلاع ملی تو سعدؓ بن معاذ رئیس اوس اور سعدؓ بن عبادہ رئیس خزرج کو تحقیق احوال کے لیے بھیجا۔ عبداللہؓ بن رواحہ اور خواتؓ بن جبیر بھی ساتھ گئے۔ رسول اللہ صلعم نے تاکید کر دی کہ معاملہ دگرگوں دیکھو تو اشارے سے بات کرنا تاکہ مسلمانوں کی دل شکنی نہ ہو۔ چاروں صاحبوں نے کعب بن اسد رئیس قریظہ سے بات کی لیکن اس کا رنگ بدل چکا تھا اور وہ کعب نہیں رہا تھا جو حیی بن اخطب سے کہہ چکا تھا کہ میں نے محمد (صلعم) سے صداقت اور وفا سے عہد کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ سعدؓ بن معاذ نے اسے برا بھلا بھی کہا۔ انجام بد سے بھی ڈرایا مگر کعب کا دل عہد شکنی کے ساتھ یہ خواب دیکھنے لگا تھا کہ باہر سے جو بھاری لشکر آیا ہے وہ مسلمانوں کو ختم کر دے گا اور جلا وطن

یہودی پھر سے مدینہ منورہ میں آباد ہو جائیں گے اور عہد ماضی کا اقتدار حاصل کریں گے۔

یہ اصحاب واپس آئے تو رسول اللہ صلعم سے صرف اتنا عرض کیا کہ عضل وقارہ یعنی عضل وقارہ کی طرح بنو قریظہ نے بھی غداری کے لیے قدم اٹھایا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے پکار کر مسلمانوں کو اللہ کی فتح و نصرت کی بشارت سنائی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور صلعم جو کچھ دیکھ رہے تھے، اس کا اندازہ دوسرے کیونکر کر سکتے تھے یقیناً اس میں شبہ نہیں کہ بنو قریظہ کی غداری سے قریش و غطفان کو کچھ فائدہ نہ پہنچا اور ان کی اپنی تقدیر کے افق پر تاریکی چھا گئی۔

نعیمؓ بن مسعود اشجعی

عین اس موقع پر نعیمؓ بن مسعود اشجعی بارگاہ رسالت میں پہنچا اور عرض کیا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں، لیکن میرے ہم قوموں یا کسی دوسرے کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اگر میں کوئی خدمت انجام دے سکوں تو حاضر ہوں۔ ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نعیمؓ کو حسنِ تدبیر سے کام لے کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کیلیے فرمایا اور ساتھ ہی کہا "الحرب خدعۃ"۔ اگر ایسا ہوا تو اس پر بھی اعتراض کی کوئی وجہ نہیں۔ میدانِ جنگ میں دشمن کو شکست دینے کی کوئی بھی موثر تدبیر ممنوع نہیں۔ جہاں دشمن کا قتل جنگ کے اہم مقاصد میں داخل ہے، وہاں اس کے نظم میں اختلال پیدا کرنا کیوں نامناسب سمجھا جائے؛ اگرچہ ایک گروہ نے روایت کے اس حصے کو ضعیف قرار دیا ہے۔ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ نعیمؓ نے یہ کام خود انجام دیا۔

اس کی سب سے بڑی اور قوی ترین دلیل یہ ہے کہ نعیمؓ خود آیا۔ اسے بلایا نہیں گیا تھا اور کسی کو معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کا کوئی کام انجام دینے کے لیے تیار ہو گا۔ دوسرے جو صورت حال اس وقت مدینہ منورہ میں رونما ہو چکی تھی اس میں اصل کام کا اندازہ ہر شخص کو ہو گا یعنی جب شہر کے باہر سے ہجوم عظیم کے ساتھ شہر کے اندر سے بھی ایک قوی گروہ مخالفت کے لیے تیار ہو گیا تھا تو اس صورت میں مخلص مسلمان یا مسلمانوں کے ہمدرد کے لیے راہِ عمل اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ دونوں گروہوں میں تفرقہ ڈلوا دے؛ نعیمؓ نے یہی کیا۔

دشمنوں میں تفرقہ

نعیم بہت دانشمند، دُور اندیش، ضابطہ اور مخلص آدمی تھا۔ اس نے خود غور و فکر کے بعد اسلام قبول کیا۔ کسی کو اس حقیقت سے آگاہ نہ کیا۔ خود ہی اندازہ کر لیا کہ دشمن میں تفرقہ ڈالنے کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے اور اسی پر عمل پیرا ہوا۔ پہلے وہ بنو قریظہ کے پاس پہنچا جن سے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ ان سے کہا: میں نے سنا ہے تم نے بدعہدی کی اور قریش و غطفان سے مل گئے۔ میرے نزدیک تو یہ اچھا نہیں کیا۔ قریش و غطفان باہر سے آئے ہیں۔ ان کے اہل و عیال گھروں میں ہیں۔ یہاں سے اٹھیں گے تو اطمینان سے گھروں میں جا بیٹھیں گے۔ تم لوگوں کو یہاں محمد (صلعم) اور مسلمانوں کے ساتھ رہنا ہے۔ تمہارے بال بچے اور املاک یہیں ہیں۔ یہ باہر کے لوگ تمہیں اپنے وطنوں سے کیا مدد دے سکیں گے؟ نیز اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ یہ محمد (صلعم) کا قطعی فیصلہ کیے بغیر چلے نہ جائیں گے؟ بہتر یہ ہے کہ ان سے کچھ آدمی بطور یرغمال طلب کرو، جو اس بات کے ضامن ہوں کہ جب تک محمد (صلعم) کا فیصلہ نہ ہو گا

قریش و غطفان یہاں سے نہیں جائیں گے۔

یہ پیشِ نظر صورت حال کی نہایت صحیح اور دانشمندانہ تعبیر تھی جو بنو قریظہ پر آشکارا ہوئی تو انھوں نے جان لیا کہ مناسب و درست راہ عمل یہی ہے۔

پھر نعیمؓ قریش کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ بنو قریظہ اپنی عہد شکنی پر پشیمان ہو رہے ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ پیدا ہو چکا ہے کہ تم کوئی فیصلہ کیے بغیر یہاں سے چلے جاؤ گے تو ان کا کیا بنے گا؛ لہٰذا انھوں نے طے کر لیا ہے کہ تم سے یرغمال مانگیں۔ میرے نزدیک تمھارے لیے یہ شرط قبول کرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے وہ یرغمال لے چکنے کے بعد انھیں مسلمانوں کے حوالے کر کے عہد شکنی کی تلافی کر دیں۔ ایسی ہی باتیں نعیمؓ نے اپنے قبیلے کے لوگوں سے کہیں۔ یہ تدبیر موثر ثابت ہوئی اور فریقین کے دل میں جو وسوسے موجود تھے وہ بہت جلد ایک دوسرے پر قوی بے اعتمادی کی شکل اختیار کر گئے

پریشانی در پریشانی

اب احزاب کے لیے کئی پریشانیاں جمع ہو گئیں مثلاً:

۱۔ بنو قریظہ کو قریش و غطفان پر بھروسا نہیں رہا تھا اور قریش و غطفان بنو قریظہ سے سخت بدظن ہو گئے تھے۔

۲۔ احزاب کے ہجوم عظیم کے لیے غذا مہیا کرنے میں سخت دقتیں شروع ہو گئیں جو سامان وہ ساتھ لے کر آئے تھے، ختم ہو چکا تھا یا ختم ہو رہا تھا اور مزید سامان ہاتھ آنا مشکل تھا۔ انھیں فتح مدینہ پر بھروسا ہو گا۔ وہ بظاہر غیر یقینی ہو گئی تھی۔

۳۔ خندق نے ان کے لیے یورش عام کر کے جلد از جلد فیصلہ کر لینے کا کوئی امکان نہیں چھوڑا تھا۔

اس پر ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ جب بنو قریظہ سے جنگ کے لیے نکلنے پر اصرار کیا گیا تو انھوں نے اول بطور ضمانت یرغمال مانگے، دوسرے یہ عذر پیش کر دیا کہ آج سبت ہے اور سبت کے دن لڑنا ہمارے لیے ممنوع ہے۔ ہم پہلے سبت کی بے حرمتی کر کے آسمانی سزا کا ہدف بن چکے ہیں۔

یرغمال مانگنے سے نعیم بن مسعود کے بیان کی توثیق ہو گئی اور انھوں نے یرغمال دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ادھر بنو قریظہ پر واضح ہو گیا کہ یہ لوگ صرف ہمیں خراب کرنا اور اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں اور ہماری مستقل امداد و حفاظت کے لیے کچھ کرنے پر آمادہ نہیں۔

خوفناک آندھی

قریش و غطفان دل برداشتہ تو تھے ہی، بنو قریظہ کی امداد کے بل پر جو امیدیں پیدا ہوئی تھیں وہ بھی ھباءً منثورا ثابت ہوئیں۔ اسی اثنا میں ایک رات نہایت خوفناک آندھی آئی جس سے ان کے کیمپوں میں کھلبلی مچ گئی۔ طنابیں ٹوٹ گئیں۔ خیمے اکھڑ گئے۔ ہنڈیاں چولھوں سے الٹ الٹ کر گر گئیں۔ ریت اور کنکر اس زور سے اڑتے کہ انسانوں اور جانوروں کے آنکھ، کان اور نتھنے بھر گئے۔ یہ قدرت کی طرف سے آخری ضرب تھی، جس کے بعد مختلف گروہ مدینہ منورہ کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ بنو قریظہ جو اسلحہ بندی کی تیاریاں کر رہے تھے

اپنے اپنے ٹھکانوں میں لوٹ گئے۔ غالباً انھیں خیال بھی نہ ہوگا کہ ایک نازک وقت میں جو بدعہدی کی تھی، اس کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

اس احسان الٰہی کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا تاکہ مسلمان رہتی دنیا تک اسے یاد کر کے حمد و شکر میں سجدہ ریز ہوتے رہیں۔

یا ایھا الذین آمنوا اذکروا نعمت اللہ علیکم اذ جاء تکم جنود فارسلنا علیھم ریحاً و جنوداً لم تروھا وکان اللہ بما تعملون بصیرا۔

اے ایمان والے لوگو اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب تم پر لشکر آپڑے تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور ایسے لشکر جو تمھیں دکھائی نہیں دیتے تھے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔

رسول اللہ صلعم کی پیشگوئی بخاری میں ہے کہ احزاب ناکام و نامراد لوٹ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نغزوھم و لا یغزوننا[1]

اب ہم ان پر یعنی قریش پر چڑھائی کریں گے، وہ ہم پر چڑھائی نہیں کرسکیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے یہ پیشگوئی حرفاً حرفاً پوری کر دی۔ اس کے بعد قریش کا ہر قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹتا گیا۔ ان کے بعض بہترین آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا مثلاً خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاص، جو آگے چل کر ملت اسلامیہ کے شہرۂ آفاق سپہ سالار بن گئے۔ فلپ حتی نے تاریخ عرب میں اعتراف کیا ہے؛

خالدؓ بن الولید اور عمروؓ ابن العاص کو عراق، ایران، شام اور مصر میں جن فوجی مہموں سے سابقہ پڑا انھیں نہایت شاندار انداز میں پایۂ تکمیل پر پہنچایا گیا۔ ان کا مقابلہ نپولین، ہنی بال اور سکندر کی مہموں سے کیا جائے تو وہ (خالد اور عمرو کی مہمیں) کمتر نہیں بہتر ثابت ہوں گی۔[2]

رسول اللہ صلعم کی نبوی فراست نے حقیقت حال کا اندازہ اس وقت فرما لیا تھا جب اصل ارشاد کی توثیق کے آثار میں سے کوئی بھی نمودار نہ ہوا تھا۔ یہ خاصۂ نبوت تھا۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ قریش جتنی زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کرسکتے تھے وہ فراہم ہوچکی تھی اور اس میں سب سے بڑا حصہ نفری یہودیوں کی مساعی کا تھا۔ ایسی قوت دوبارہ فراہم نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ ناکامی کے باعث قریش کی ہوا اکھڑ گئی تھی۔ ان کی ساکھ زائل ہوچکی تھی پھر ان کے لیے چڑھائی کا کون سا امکان تھا؛ چڑھائی کا امکان ہی نہیں یقین صرف مسلمانوں کے لیے تھا اور ایک ہی سال کے بعد تاریخ کے صفحات نے اس کا روشن ثبوت مہیا کر دیا تھا۔

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ خندق [2] تاریخ عرب مصنفہ فلپ حتی انگریزی صفحہ ۱۴۲

ایک ایمان افروز واقعہ دوران محاصرہ میں خدا جانے کتنے ایمان افروز واقعات پیش آئے ہوں گے یہاں صرف ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ رسول اللہ صلعم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ دوسری مستورات کے ساتھ جس قلعہ نما عمارت میں مقیم تھیں، وہ بنو قریظہ کی آبادی سے قریب تھا۔ حضرت حسانؓ کو وہاں مستورات کی حفاظت کیلیے مقرر کر دیا گیا تھا۔ جب بنو قریظہ عہد شکنی پر آمادہ ہو گئے تو حضرت صفیہؓ نے دیکھا کہ ایک یہودی عمارت کے اردگرد پھر کر حملے کے مناسب مواقع کا سراغ لگا رہا ہے۔ حضرت صفیہؓ نے حضرت حسانؓ سے کہا کہ اسے قتل کر دو ورنہ یہ اپنے بھائی بندوں کو پتا دے دے گا

حضرت حسانؓ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا جس نے ان میں اس قدر جُبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس بنا پر اپنی معذوری ظاہر کی کہ میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا۔ حضرت صفیہؓ نے خیمے کی چوب اٹھالی اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ حضرت صفیہؓ چلی آئیں اور حسانؓ سے کہا ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ۔ حسانؓ نے کہا جانے دیجیے مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت صفیہؓ نے کہا اچھا جاؤ اور اس کا سر کاٹ کر قلعے کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہو جائیں، لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہؓ ہی کو انجام دینی پڑی۔ اس طرح یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ قلعے میں کچھ فوج متعین ہے[1]۔

شہدائے خندق غزوۂ خندق کے شہدا کی فہرست یہ ہے:

۱۔ انس بن اوس (بنی عبدالاشہل)

۲۔ عبداللہ بن سہل (〃 〃)

۳۔ طفیل بن النعمان (بنی سلمہ بن خزرج)

۴۔ ثعلبہ بن عنمہ (〃 〃)

۵۔ کعب بن زید (بنی دینار بن النجار بن الخزرج)

چونکہ حضرت سعدؓ بن معاذ نے بھی غزوۂ خندق ہی میں لگے ہوئے زخم کے باعث کئی روز بعد شہادت پائی، اس وجہ سے وہ بھی غزوۂ خندق کے شہدا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی وفات کی تفصیل غزوۂ بنو قریظہ کے آخر میں آئے گی۔ قریش کے صرف تین یا چار آدمی مارے گئے:

۱۔ منبہ بن عثمان یا عثمان بن منبہ (بنی عبدالدار میں سے) عثمان بن منبہ کی روایت ابن ہشام کی ہے۔

۲۔ نوفل بن عبداللہ (بنی مخزوم میں سے)

۳۔ عمرو بن عبد وُد (بنی عامر بن لوی میں سے)

۴۔ حسل بن عمرو بن عبد وُد (بنی عامر بن لوی میں سے)

آخری قتل پر اتفاق نہیں ہے (مولف)

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۹۵۔

باب ۴۹

یہود مدینہ کی سرگزشت

—(۱)—

یہود مدینہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ ان میں سے بنو قینقاع کے کھیت یا باغات نہ تھے۔ یا تو وہ تجارت کرتے تھے یا زرگری۔ ان کی آبادی بھی بنو نضیر یا بنو قریظہ کی طرح الگ نہ تھی۔ عرب ہی کی آبادیوں میں وہ بھی رہتے تھے۔ ممکن ہے مختلف مقامات پر ان کے کئی خاندان اکٹھے بستے ہوں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک مقام پر لکھا ہے۔ یہ لوگ مدینے میں اسلامی آبادی کے اندر ہی رہتے تھے[1] دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ قینقاع کی بستی تو آجکل محض میدان ہے[2] اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر بنو قینقاع کے مکانات تھے وہاں پھر مکان نہ بنے اور وہ حصہ میدان کی شکل میں باقی رہ گیا۔

باقی دونوں یہودی قبیلوں کے باغات بھی تھے اور کھیت بھی۔ بنو نضیر کی بستی جنوبی سرے پر تھی اور وادی مذینیب کے دونوں کنارے اس آبادی سے مزین تھے اور اس بستی کے پاس ہی جنوبی جانب ایک ٹیلے پر کعب بن اشرف کا قلعہ تھا، جس کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔

بنو قریظہ کی بستی بنو نضیر کے شمال میں عوالی سے مشرقی جانب وادی مہزور کے جنوبی کنارے پر واقع تھی۔

اخلاقی و عملی حالت عام یہودیوں کی طرح مدینہ منورہ کے یہودی بھی خاصے مالدار تھے۔ یہودیوں کی بستیاں شمالی جانب دُور دُور تک تمام تجارتی شاہراہوں پر موجود تھیں، ان میں باہم تجارتی روابط قائم تھے اور ہر مقام کے یہودی ان روابط سے کم و بیش مالی فائدہ اٹھاتے تھے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کے عرب و شام میں بین الملی اور بین الملکی تجارت پر عملاً یہودیوں ہی کا قبضہ تھا۔ ساتھ ہی وہ تمام اخلاقی اور عملی بیماریاں بھی ان کے درمیان عام تھیں، جو ہمیشہ انسانی گروہوں کے لیے طاعون اور ہیضے کی وباؤں کی مانند مہلک رہیں۔ مثلاً سُود کھانا، جھوٹ بولنا، سازشیں کرنا، الٰہی احکام میں ذاتی فائدے کے لیے ردوبدل کر لینا، عناد، بغض وغیرہ۔ ہجرت تک مدینے کے عرب یعنی اوس و خزرج یہودیوں سے دبے ہوئے تھے، کیونکہ اول

---

[1] عہد نبوی کے میدان جنگ ص ۳۹ [2] عہد نبوی کے میدان جنگ ص ۴۰

وہ یہودیوں کے مقروض رہتے تھے اور قرض کے سلسلے میں عورتوں، بچوں تک کو رہن رکھ دیتے تھے۔ دوم یہودی اہل کتاب تھے اور دوسرے گروہوں کے مقابلے میں اصحاب علم و ہنر مانے جاتے تھے۔ جن عربوں کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے، وہ منت مان لیتے تھے کہ اب بچہ پیدا ہوگا تو اسے یہودی بنا دیں گے۔ اس قسم کا سلسلہ یہودیوں ہی کے کہنے پر شروع ہوا ہوگا اور ایسے کئی بچے تھے جو نسلاً عرب تھے، مگر والدین کے ضعفِ اعتقاد اور حق ناشناسی کی بنا پر یہودی بن گئے۔

کفران نعمت رسول اللہ صلعم نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی آبادی کے تمام گروہوں کے درمیان "صحیفہ" کے نام سے ایک معاہدہ کرا دیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ شہر کے داخلی صلح و امن میں کوئی خلل نہ آنے پائے اور باہر سے کوئی خطرہ نمودار ہو تو تمام گروہ مل کر اور متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔ اس معاہدے میں یہودیوں کی مساوی حیثیت قائم رکھی گئی تھی اور ان کے تمام شہری و مذہبی حقوق کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ ایسے معاہدے کی خلاف ورزی وہی گروہ کر سکتا تھا جسے اپنی اور اپنے بال بچوں کی جائے قیام کا امن مطلوب نہ ہوتا اور باہم خونریزی و بدامنی کا بیج بونا چاہتا یا بیرونی دشمنوں کی عداوت آرائی اور نفرت انگیزی کو زیادہ قوت پہنچانا اپنا نصب العین بنا لیتا۔

تاہم یہودیوں کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ جھوٹ، خیانت، غداری اور عہد شکنی سے کبھی باز نہیں رہ سکتے۔ ممکن ہے، شروع میں انھیں خیال ہو کہ مسلمانوں کے لیے مدینہ منورہ میں قدم جما لینے کا کوئی امکان نہیں۔ قریش ان کے تعاقب میں پہنچیں گے اور حق و صداقت کی ان کلیوں کو کھلنے سے پیشتر ہی مسل کر رکھ دیں گے۔ غالباً اسی وجہ سے انھیں دوسری مقامی آبادیوں کے ساتھ معاہدۂ صلح و دفاع میں شریک ہوتے وقت تامل نہ ہوا۔ قریش کی طرف سے یہودیوں اور منافقوں کے پاس تہدید آمیز پیغامات بھی آنے لگے تھے کہ مسلمانوں کو جلد ختم کر دو ورنہ سخت سزا کے مستوجب ٹھہرو گے ان کی یورشیں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ جنگ بدر میں لشکر اور ساز و سامان کی کثرت کے باوجود قریش کی شکست نے یہود کو چونکا دیا۔ اب انھیں نظر آنے لگا کہ اگر اسلامی تنظیمات بے خلش جاری رہیں تو وہ مستقل اقتدار خاک میں مل جائیگا جو پشت ہا پشت سے ان کی قوم کو اوس و خزرج پر حاصل تھا۔ وہ حقیقتاً اپنے آپ کو وہاں کے حکمران و فرمانروا سمجھتے تھے اور اوس و خزرج ان کے علدار و کارگزار تھے۔

سازشیں اور شرارتیں بہرحال انھوں نے شرارتوں، ایذا رسانیوں اور سازشوں کا ایک منظم سلسلہ شروع کر دیا مثلاً،

۱۔ اوس و خزرج میں تفرقہ ڈال کر خانہ جنگی کی وہی آگ بھڑکانے کی کوشش کی جو چند سال پیشتر تک دونوں گروہوں کی بربادی کا باعث بن چکی تھی اور وہ یہودیوں کے دست نگر بن کر رہ گئے تھے۔

۲۔ اسلام کے خلاف عداوت کے جنون نے انھیں انتہائی پستی میں گرا دیا تھا۔ یہاں تک اہل کتاب ہونے کے

باوجود مشرکین کے مسلک کو پیروانِ اسلام کے طور طریقے سے بہتر اور قابل ترجیح بتاتے تھے۔ گویا ان کا تصور حق وصداقت ہی منقلب ہو گیا تھا اور اہل کتاب ہونے کا دعویٰ بھی محض برائے نام رہ گیا تھا، جس کی حقیقی حیثیت کوئی نہ تھی۔

۳۔ وہ اس کے لیے بھی تیار تھے کہ اسلام قبول کر لیں، کچھ عرصہ بعد مرتد ہو جائیں تاکہ اسلام کے وقار و اعتماد پر ضرب لگے۔ عوام سمجھیں کہ اگر یہ دین سچا ہوتا تو اسے قبول کرنے کے بعد چھوڑا کیوں جاتا؛

۴۔ رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات کے خلاف منصوبہ بندیوں میں بھی انھیں تامل نہ تھا۔ یہاں تک کہ حضور صلعم رات کے وقت گھر سے نکلتے تو مسلمانوں کو یہودیوں کے ہاتھوں آپ کی جان کا خطرہ رہتا۔ حضرت طلحہؓ بن براءؓ مرنے لگے تو وصیت کر دی کہ اگر میرا دم رات کے وقت نکل جائے تو رسول اللہ صلعم کو خبر نہ کرنا مبادا آپ جنازے کے لیے تشریف لائیں اور میری وجہ سے آپ پر یہودیوں کے ہاتھوں کوئی حادثہ گزر جائے۔

منافقین مدینہ بھی، جن کا سردار عبداللہ بن ابی تھا، یہودیوں کے حلیف اور معاون تھے۔ قریش مکہ انھیں برابر اکساتے رہتے تھے کہ "ہمارے صاحب" (یعنی رسول اللہ صلعم) سے لڑو۔ ساتھ دھمکیاں بھی دیتے کہ تمھارے پاس ہتھیار ہیں، قلعے ہیں، اگر نہ لڑے اور ہمیں آنا پڑا تو تمھارے ساتھ یہ کریں گے، وہ کریں گے۔

بنو قینقاع

بہرحال تینوں یہودی قبیلوں میں سے سب سے پہلے بنو قینقاع نے میدان مخالفت میں قدم رکھا اور ابن سعد کے بیان کے مطابق جنگ بدر ہو چکی تو انھوں نے بغاوت وحسد کا مظاہرہ کیا، عہد و پیمان توڑ ڈالے اور یہودیوں میں ان سے زیادہ بہادر کوئی گروہ نہ تھا۔[1]

ابن سعد نے اسے نصف شوال کا واقعہ قرار دیا ہے جو ہجرت کا بیسواں مہینا تھا (یعنی شوال ۲ھ) اور دن سبت بتایا[2] یعنی ہفتہ۔

کشمکش میں ابتدا بنو قینقاع ہی سے ہوئی۔ ایک عرب خاتون کسی یہودی دکاندار سے سودا لینے گئی۔ دکان پر اور بھی یہودی بیٹھے تھے۔ کسی نے خاتون کی بے خبری میں اس کے لباس زیریں کا ایک گوشہ کانٹے سے اوپر کے کپڑوں میں ٹانک دیا۔ وہ چلی تو برہنہ ہو گئی اور اس نے چیخ ماری۔ یہودی اس پر ہنسنے لگے۔ ایک مسلمان نے یہ کیفیت دیکھی تو شریروں کو مارنے کے لیے دوڑا۔ یہودی دکاندار کشمکش میں مارا گیا۔ باقی یہودیوں نے غیور مسلمان کو شہید کر ڈالا۔ رسول اللہ

---

[1] طبقات کبیر جلد دوم ص ۲۹۔ [2] طبقات کبیر جلد دوم ص ۲۸-۲۹۔ لیکن یہاں یہ عرض کر دینا چاہیے کہ تقویم کے مطابق ہفتے کا دن ۱۵۔ شوال کو نہیں ۱۲ یا ۱۳ شوال کو تھا۔ اس حساب کے مطابق عیسوی تاریخ ۷ یا ۸۔ اپریل ۶۲۴ء بنتی ہے۔ اگر ۱۵۔ شوال فرض کی جائے تو اپریل کی دسویں تاریخ ہونی چاہیے۔

کو اس افسوسناک واقعے کی اطلاع ملی تو بنو قینقاع کے رؤسا و اکابر کو جمع کر کے نرمی سے سمجھایا کہ آپ لوگوں نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے، یہ اچھا نہیں۔ شرارتیں چھوڑ دو اور خدا سے ڈرو۔ وہ لوگ اپنے آدمیوں کی حرکت پر اظہار ندامت کے بجائے، جو شرافت کا بدیہی تقاضا تھا، غرور و تکبر پر اتر آئے اور بولے، بدر کی فتح پر مغرور نہ ہو جانا۔ ہم سے سابقہ پڑے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ لڑنے والے کیسے ہوتے ہیں۔

یقین ہے کہ بنو قینقاع نے یہ روش بنو نضیر، بنو قریظہ اور منافقین مدینہ کی شہ پر اختیار کی ہوگی اور انھیں بھروسا ہوگا کہ اگر مسلمانوں نے جنگ کی تو تمام یہودیوں اور منافقوں کی طرف سے پوری امداد ملے گی۔ آخر رسول اللہ صلعم کو حکم دینا پڑا کہ بنو قینقاع کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا جائے انجام کار ان لوگوں کے تکبر و شجاعت کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ ایک انگلی بھی ان کی حمایت میں نہ اٹھ سکی اور وہ اس پر راضی ہو گئے کہ رسول اللہ صلعم جو فیصلہ فرمائیں گے انھیں منظور ہوگا۔ عبداللہ بن ابی نے جو بظاہر مسلمان اور دل سے یہودیوں کا حامی تھا درخواست کی کہ انھیں جلا وطن کر دیا جائے۔ یہ درخواست منظور ہو گئی اور بنو قینقاع مدینہ منورہ سے نکل کر جا بلقا کے ایک مقام اذرعات میں بسے۔ وہ تاجر یا زرگر تھے۔ جہاں بھی جاتے اپنا کاروبار جاری رکھ سکتے تھے۔ ان میں سات سو جنگجو تھے اور تین سو کے پاس فولادی زرہیں تھیں[1]۔

یہ واقعہ جنگ بدر سے چند روز کم ایک مہینا بعد پیش آیا اور عجیب اتفاق ہے کہ بدر کے بعد مدینے کو دو بڑی جنگیں پیش آئیں اول اُحد، دوم خندق۔ بدر کے بعد بنو قینقاع نکلے۔ اُحد کے بعد بنو نضیر کو جلا وطن کیا گیا اور خندق کے بعد بنو قریظہ کا فیصلہ ہو گیا۔

کعب بن اشرف

کعب بن اشرف بھی ابتدائی اسلامی دور میں مدینہ منورہ کا ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو شر و فساد پھیلانے میں تنہا ایک بڑے گروہ اور کثیر الافراد قبیلے سے کم نہ تھا۔ اس کا باپ قبیلہ طے میں سے تھا جس نے بنو نضیر کے رئیس ابو رافع سلام ابن الحقیق کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ اسی نضری یہودی عورت کا بیٹا کعب تھا، جس نے بنو نضیر کی آبادی سے جنوبی جانب ایک ٹیلے پر قلعہ بنا لیا تھا۔ وہ دولت مند تھا۔ باپ کی وجہ سے عربوں میں اور ماں کی وجہ سے یہودیوں میں اسے وسیع اثر و رسوخ حاصل تھا۔ سب سے آخر میں یہ کہ مشہور شاعر تھا اور اس زمانے میں شاعروں کو عموماً سب لوگ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ زندگی کے ظاہری اسباب کی سازگاری کے ساتھ بہت بد اخلاق، خود پسند، متکبر اور اسلام دشمن تھا۔ یہودی علماء کے لیے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلعم وہی نبی ہیں، جس کے آنے کی خبر یہودیوں کے صحیفوں میں دی گئی ہے تو کعب نے ان کے وظیفے بند کر دیے۔ جب ان علماء نے اپنی غلطی کا اقرار کیا تو وظیفے جاری کیے۔ اگرچہ وہ بھی مدینہ منورہ کے

---

[1] "جوامع السیرۃ" ابن حزم ص ۱۵۴

ابتدائی عہد نامہ صلح و امن میں شریک تھا، مگر شروع ہی سے اس نے قریش مکہ اور دوسرے اسلام دشمن عناصر سے خاص روابط پیدا کر لیے تھے۔ قریش کے جو سردار جنگ بدر میں مارے گئے تھے، ان کے مرثیے لکھ کر چالیس آدمیوں کے ساتھ مکہ مکرمہ گیا۔ مرثیے پڑھ کر خود بھی رو یا اور قریش کو بھی رُلایا۔ ساتھ ہی قریش سے عہد لیا کہ اس جنگ کا بدلہ لیں گے۔ واپس آ کر رسول اللہ صلعم کی ہجو میں اشعار کہے۔ شعر کہہ کہہ کر لوگوں کو آپؐ کے خلاف بھڑکاتا۔ اپنے قصیدوں کی تشبیب میں مسلم خواتین کا ذکر نہایت نازیبا طریق پر کرتا۔ دولت مند اور با اقتدار شخص کی حِس اخلاق مر جائے اور خوف خدا اس کے دل سے نکل جائے تو وہ سب کے لیے آفت کا پرکالہ بن جاتا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم تاریخ یعقوبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ کعب نے رسول اللہ صلعم کو دھوکے سے قتل کرا دینا چاہا تھا۔

اس روایت کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں (ذکر کعب بن اشرف) میں عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ کعب نے آنحضرت صلعم کو دعوت میں بلایا اور لوگوں کو متعین کر دیا کہ جب آپؐ تشریف لائیں تو دھوکے سے آپؐ کو ہلاک کر دیں[1]

کعب کا قتل اس فتنۂ عظیمہ کا خاتمہ ناگزیر ہو گیا تو محمدؓ بن مسلمہ نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ ابو نائلہ سلکانؓ بن سلامہ بن وقش، عبادؓ بن بشر بن وقش، حارثؓ بن اوس بن معاذ اور ابو عبسؓ بن جبر ساتھ ہو گئے۔

ابو نائلہؓ سلکان بن سلامہ کعب کے رضاعی بھائی تھے۔ معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے وہی دن کے وقت کعب سے ملے اور کہا کہ "ہمارے صاحب" (رسول اللہ صلعم) ہم سے صدقہ مانگتے ہیں اور ہم تنگ دست ہیں۔ مہربانی فرما کر ہمیں کھانے کے لیے وسق دو وسق غلہ دے دو۔ کعب یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور بولا: ابھی کیا ہوا ہے وہ دن دُور نہیں جب تم بیزار ہو کر اسے چھوڑ دو گے۔

ابو نائلہ: خیر اب تو ہم محمد (صلعم) کی اتباع اختیار کر چکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلے کا انجام کیا ہوتا ہے، تم یہ بتاؤ کہ قرض دو گے یا نہیں؟

کعب: دے دوں گا بشرطیکہ کوئی چیز رہن رکھو۔

ابو نائلہ: کیا چیز؟

کعب: اپنی عورتیں رہن رکھ دو[2]۔

---

[1] سیرۃ النبی ص ۴، ۳۔ [2] اس سے ظاہر ہے کہ اول کعب حد درجہ اوباش و بدکار تھا، دوم اس زمانے کے اہل مدینہ کے نزدیک عورتیں کس درجہ بے حقیقت تھیں جنھیں ضرورت کی کسی جنس کے لیے گرو کر دینے میں بھی کسی کو تامل نہ تھا۔ اگر یہ رواج عام نہ ہوتا تو کعب کو ایسی بات زبان پر لانے کی جرأت نہ ہوتی۔

ابو نائلہؓ: تمہارے حسن و جمال کے سبب سے ہمیں اپنی عورتوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

کعب: پھر بچے رہن رکھ دو۔

ابو نائلہؓ: اس سے تو ہم عرب میں بدنام ہو جائیں گے کہ دس دو وسق غلے کے لیے بچے رہن رکھ دیے۔ البتہ ہتھیار رہن رکھ سکتے ہیں، حالانکہ ہمیں آج کل ان کی بہت ضرورت ہے۔[1]

کعب اس پر راضی ہو گیا اور ابو نائلہ نے واپس جا کر رفیقوں کو سب کچھ بتا دیا۔ چاندنی رات میں یہ سب نکل کر کعب کے قلعے کے پاس پہنچے۔ اسے آواز دی۔ بیوی نے روکا کہ رات کو کہاں جا رہے ہو؟ لیکن کعب نے کہا کہ میرا بھائی ابو نائلہؓ اور محمدؓ بن مسلمہ ہیں۔ قلعہ سے باہر نکل کر تمام رفیق کعب کے ساتھ ٹہلتے رہے۔ کعب نے عطر لگا رکھا تھا جس کی لپٹیں دور دور تک جا رہی تھیں۔ محمدؓ بن مسلمہ نے کہا، تمہارے سر سے بڑی عمدہ خوشبو آ رہی ہے۔ اجازت دو تو ذرا سونگھ لوں۔ کعب نے کہا سونگھ لو۔ بس اس کا سر پکڑتے ہی ساتھیوں سے کہا کہ اب اسے ختم کر دو۔ چنانچہ تلواریں اس پر پڑیں اور وہ ختم ہو گیا۔[2] جانبازوں نے اس کا سر کاٹ لیا۔ مرتے وقت کعب نے اس زور سے چیخ ماری کہ اردگرد کے یہودی قلعوں میں آگ روشن ہو گئی۔ اسی وقت ابو نائلہؓ، محمدؓ بن مسلمہ اور دوسرے ساتھی لمبا چکر لگاتے ہوئے مدینہ پہنچے اور رسول اللہ صلعم کی خدمت میں مہم کے کامیاب انجام کی کیفیت پیش کر دی۔

نیا معاہدہ یہودی دوسرے روز کعب کے مارے جانے کی شکایت لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلعم نے کعب کی تمام فتنہ انگیزیاں ایک ایک کر کے گنا دیں۔ چنانچہ وہ چپ چاپ لوٹ گئے۔ یہ بھی واضح تھا کہ اگر کعب کو کھلم کھلا قتل کرنے کی کوشش کی جاتی تو جنگ چھڑ جاتی اور خدا جانے اس میں کتنی جانیں تلف ہوتیں۔ پھر کعب اسی طرح مارا گیا، جس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان لینے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

---

[1] کچھ نہ کچھ گرو رکھنا ضروری تھا۔ ابو نائلہؓ نے اسلحہ کی ضرورت بدا اہمیت بھی جتا دی۔ نیز جنس لینے کی غرض سے آنے کے لیے ہتھیار ساتھ لانے کے سلسلے میں کعب کی رضامندی بھی لے لی۔ یہ خدا ساز تدبیر تھی۔ [2] روایت میں ہے کہ کعب کی موت "مِغول" سے ہوئی۔ جو اس کے پیٹ میں گھونپی گئی اور شانے میں اتر گئی۔ "مِغوَل" کے متعلق صراح میں ہے: "تیغ کارد کہ درمیان عصا تازیانہ دارند۔" اردو میں اسے غالباً گپتی کہتے ہیں۔ یعنی وہ باریک تلوار جو دستی چھڑی میں چھپی ہوتی ہے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ کعب سے ابتدائی گفتگو طبقات ابن سعد کے مطابق ابو نائلہؓ نے کی تھی، جو اس کے رضاعی بھائی تھے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ بعض سیرت نگاروں نے یہ گفتگو محمد بن مسلمہ سے منسوب کی ہے۔ ممکن ہے ابتدائی گفتگو میں ابو نائلہؓ اور محمدؓ بن مسلمہ دونوں شریک ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے وفد سے یہ بھی فرمایا تھا کہ بہتر ہو اگر آیندہ تم لوگ امن و امان کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو جاؤ اور فتنہ و فساد کی تخم ریزی سے محترز رہو۔ چنانچہ ان کی رضامندی سے نیا معاہدہ لکھا گیا جس میں یہودیوں نے امن و تعاون سے رہنے کا اقرار نئے سرے سے کر لیا۔[1] (مولف)

---

[1] طبقات کبیر جلد دوم ص ۴۴ نیز سنن ابو داؤد باب کیف کان اخراج الیہود۔

باب ۵

یہود مدینہ کی سرگزشت

—(۲)—

بنو نضیر بنو نضیر کی سرکشی اور عناد و عداوت کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب مسلمانوں کو جنگ اُحد میں شدید نقصان پہنچ چکا تھا۔ نیز بئر معونہ اور رجیع کے نہایت دردناک حادثے پیش آچکے تھے، جن میں بہت سے صحابہ کرام بلا وجہ انتہائی بیدردی سے شہید کیے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے ان حوادث سے مدینہ منورہ کے تمام دشمنانِ اسلام کو یقین ہو گیا تھا کہ اب مسلمانوں میں پہلے جیسا دم خم باقی نہیں رہا۔

کشمکش کی ابتدا کے متعلق دو روایتیں ہیں:

پہلی روایت ایک یہ ہے کہ عمرو بن امیہ ضمری، بئر معونہ کے حادثے سے بچ کر آ رہے تھے تو راستے میں انھیں قبیلہ بنو عامر کے دو آدمی ملے، یہ قبیلہ رسول اللہ صلعم سے بھی معاہدہ کر چکا تھا اور بنو نضیر کا بھی معاہد تھا۔ عمرو بن امیہ اس حقیقت سے آگاہ نہ تھے، انھوں نے سمجھا، یہ وہی لوگ ہیں جو میرے بھائیوں کو شہید کر چکے ہیں۔ لہٰذا موقع پاتے ہی دونوں کو مار ڈالا اور مدینہ منورہ آ کر پورا واقعہ بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا۔ حضور صلعم خفا ہوئے کہ وہ لوگ تو ہمارے معاہد تھے۔ ان کا رئیس عامر بن طفیل تو یقیناً بئر معونہ کے واقعہ ہائلہ کی ذمہ داری میں شریک تھا، لیکن اس کے قبیلے نے اس رنج افزا حرکت میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا، لہٰذا حضور صلعم نے فرمایا کہ ان کا خون بہا دینا چاہیئے جس میں بنو نضیر کے لیے حصّہ دینا ضروری تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم رقم کے انتظام کے لیے بنفسِ نفیس بنو نضیر کی بستی میں تشریف لے گئے۔ ان لوگوں نے بظاہر رسول اللہ صلعم کا خیر مقدم کیا۔ ایک دیوار کے سایے میں بٹھا دیا اور کہا کہ ابھی رقم کا انتظام کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی طے کر لیا کہ آپ کو آزار پہنچانے یا قتل کرنے کا اس سے بہتر موقع کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایک آدمی بھاری پتھر لے کر چھت پر چڑھ جائے اور اوپر سے آپ پر پتھر گرا دے۔

عمرو بن حجاش نضری نے اوپر سے پتھر گرانے کی خدمت اپنے ذمے لی۔ سلام بن مشکم نے روکا کہ اوّل یہ اس عہد کے خلاف ہے جو ہم میں اور ان میں ہو چکا ہے۔ دوم تم نے جو ارادہ کیا اس کی خبر انھیں (رسول اللہ صلعم کو) ہو جائے گی۔ سلام بن مشکم کی رائے درست ثابت ہوئی۔ ادھر پتھر گرانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں ادھر رسول اللہ صلعم اچانک اٹھے۔ لوگوں نے سمجھا کوئی خاص امر اس کا باعث ہوا۔ آپ مدینہ منورہ چلے آئے۔ جو صحابہ کرام ساتھ گئے تھے وہ بھی کچھ عرصہ انتظار کر کے لوٹ آئے۔ حضور صلعم سے تشریف لے آنے کے متعلق پوچھا تو فرمایا:

یہود نے بدعہدی کا ارادہ کیا تھا۔ اللہ نے مجھے خبر دے دی اور میں اٹھ کر چلا آیا۔[۱]

دوسری روایت

دوسری روایت یہ ہے کہ قریش مکہ نے بنو نضیر کو لکھا تم محمد (صلعم) کو قتل کردو ورنہ ہم تمھارے خلاف جنگ کریں گے۔ اس دھمکی کو باس عمل پہنانے کے لیے بنو نضیر نے ایک خاص منصوبہ بنایا۔ رسول اللہ صلعم کو پیغام بھیجا کہ ہم اپنے مذہبی علما کا تبادلہ خیالات آپ سے کرانا چاہتے ہیں۔ اگر صداقت ہم پر واضح ہوگئی تو اسلام قبول کریں گے، لہذا آپ بھی تیس آدمیوں کے ساتھ تشریف لے آئیں۔ ہمارے بھی تیس علماء موجود ہوں گے جو مذہبی گفتگو کریں گے۔

منصوبہ یہ تھا کہ اپنے علماء کو پوشیدہ طور پر خنجروں سے مسلح کر دیں تاکہ مناسب وقت دیکھتے ہی وہ رسول اللہ صلعم کو قتل کر دیں۔ ایک خاتون نے اپنے انصاری بھائی کو نضری یہودیوں کے اس خفیہ منصوبے سے آگاہ کر دیا۔

نکل جانے کا حکم

ان روایتوں میں تضاد نہیں۔ دونوں اپنی جگہ درست ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے پہلے رسول اللہ صلعم خون بہا کی رقم کے سلسلے میں بنو نضیر کے پاس گئے ہوں اور ان کے ارادۂ بد سے بذریعہ وحی آگاہ ہو کر چلے آئے ہوں۔ پہلا منصوبہ ناکام رہ گیا تو بنو نضیر نے دوسرا منصوبہ تیار کر لیا جس کا قبول ہو جانا زیادہ قرین قیاس تھا۔ جو صحابہ بئر معونہ میں شہید ہوئے تھے وہ بھی تو تبلیغ و تعلیم اسلام ہی کے لیے گئے تھے۔ پھر یہودیوں نے بعد تحقیق قبول اسلام پر آمادگی ظاہر کی تو اسے قبول کیوں نہ کیا جاتا؟ لیکن پہلی بدعہدی کے بعد دوسری بدعہدی کی اطلاع بھی قبل از وقت مل گئی تو یہ منصوبہ بھی ناکام ہوگیا۔ رسول اللہ صلعم نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم معاہدہ نہ لکھ دو میں تم پر اعتبار نہیں کرسکتا۔ لیکن بنو نضیر راضی نہ ہوئے۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں:

> آپ (رسول اللہ صلعم) یہود بنو قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی۔ انھوں نے تعمیل کر دی۔ بنو نضیر کے لیے یہ نظیر موجود تھی کہ ان کے برادرانِ دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے لیکن وہ کسی طرح معاہدہ کرنے پر راضی نہ ہوئے۔[۲]

مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام تفصیل سنن ابن داؤد میں ہے۔ تعجب ہے کہ ارباب سیرت اس روایت سے بے خبر ہیں۔[۳]

سیرۃ النبی کے مطابق بنو نضیر نے آخر یہ پیغام بھیجا کہ رسول اللہ صلعم تین آدمی لے کر آئیں۔ یہودی بھی تین ہی عالم لے کر آئیں گے۔ ساتھ ہی کہا کہ اگر یہ علماء ایمان لے آئیں گے تو ہم بھی اسلام اختیار کرلیں گے۔

آپ (رسول اللہ صلعم) نے منظور فرمایا لیکن راہ میں آپ کو ایک صحیح ذریعے سے معلوم ہوا کہ یہود تلواریں

---

[۱] طبقات جلد دوم [۲] سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۶ [۳] سیرۃ النبی جلد اول حاشیہ ص ۳۷۶

پانچ سو کر تیار ہیں کہ جب آپ تشریف لائیں تو آپ کو قتل کر دیں[1]

اس کے بعد رسول اللہ صلعم نے محمد بن مسلمہ کے ہاتھ بنی نضیر کو کہلا بھیجا کہ تم لوگ میرے شہر سے نکل جاؤ تم نے جس بدعہدی کا قصد کیا، وہ کیا۔ میں تمھیں دس دن کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد جو نظر آئے گا اس کی گردن مار دی جائے گی[2]۔

رئیس المنافقین کا بے بنیاد وعدہ

یہودی اس پر تیار ہو گئے تھے۔ انھوں نے نکل جانے کی تیاری کر لی تھی اور ذوالجدر[3] میں اپنے معاونوں کے پاس قاصد بھیج دیا تھا کہ تیز چلنے والے اونٹ کرایے پر لیے جائیں جن پر اسباب لاد کر نکل جائیں۔ اس موقع پر ابن ابی کی منافقت نے بنو نضیر کے لیے ایک سہارا مہیا کرنے کی کوشش کی یعنی اس نے کہلا بھیجا کہ شہر چھوڑ کر نہ نکلو، اپنے قلعوں میں جا بیٹھو۔ میرے ساتھ دو ہزار ہم قوم ہیں، انھیں لے کر تمھارے قلعوں میں آ جاؤں گا۔ بنو قریظہ اور غطفان بھی تمھاری مدد کریں گے[4]۔ قرآن مجید سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ (سورہ حشر: ۱۲)

تم نے دیکھا منافق، اہل کتاب میں سے اپنے کافر بھائیوں کو کہتے ہیں کہ اگر تم نکلو گے تو ہم بھی ساتھ نکلیں گے اور ہم تمھارے باب میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے اور اگر تم سے کوئی لڑا تو ہم بھی تمھاری مدد کو آئیں گے۔

لیکن یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد تھا لہٰذا قرآن مجید میں فرمایا گیا: "واللہ یشهد انهم لکاذبون" (اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ یعنی منافق جھوٹے ہیں۔) ان کا جھوٹ عالم آشکارا ہو کر رہا۔

یہودیوں نے اس وعدے کو صحیح سمجھا۔ انھوں نے نکلنے سے انکار کر دیا اور جو مہلت انھیں دی گئی تھی اس سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس وجہ سے محاصرہ ناگزیر ہو گیا۔ وہ تیر اور پتھر لے کر قلعوں پر چڑھ گئے۔ محاصرہ پندرہ روز جاری رہا۔ اسی اثنا میں نہ عبداللہ بن ابی کے دو ہزار ہم قوم ان کی مدد کو پہنچے، نہ بنو قریظہ اور غطفان نے ان کے حق میں انگلی تک اٹھانے کی ہمت کی۔ آخر بنو نضیر کو سامان جنگ اور غیر منقولہ املاک یعنی باغات اور کھیت چھوڑ کر باقی مال اسباب لے جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ دروازوں کی چوکھٹیں تک اکھاڑ کر ساتھ لے گئے۔ بنو نضیر کے رئیس حیی بن اخطب، ابو رافع بن ابو الحقیق وغیرہ خیبر میں جا بسے۔ وہی جنگ خندق کا باعث بنے اور بنو قریظہ کی بربادی کے ذمہ دار بھی وہی تھے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ وہ لوگ چھ سو اونٹوں کے قافلے کے ساتھ گاتے بجاتے نکلے۔ ان کے املاک غیر منقولہ ان مہاجرین میں تقسیم ہو گئے

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۷۶-۲۷۷ [2] طبقات کبیر جلد دوم ص ۵۷ [3] ذوالجدر قبا کی سمت (جنوبی سمت) ایک چراگاہ تھی جو مدینہ منورہ سے چھ میل کے فاصلے پر تھی۔ [4] طبقات کبیر جلد دوم ص ۵۷۔

جن کے پاس گزارے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور اس باب میں انصار سے استصواب کر لیا گیا تھا۔

بنو قریظہ جنگ خندق کے بعد بنو قریظہ کا معاملہ پیش آیا جن کے جرائم سنگینی میں بنو قینقاع اور بنو نضیر سے بھی بڑھ گئے تھے۔

۱۔ بنو قریظہ دوسرے گروہوں کی طرح ابتدائی معاہدے میں شریک تھے۔ مگر اسلام کا عروج دیکھ کر ان کی روش بھی بدل گئی۔

۲۔ صحیح مسلم میں ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر کی طرح بنو قریظہ نے بھی رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ کی تھی۔ حضور صلعم نے بنو نضیر کو جلا وطن کر دیا، مگر بنو قریظہ پر احسان کیا اور رہنے دیا۔ اس کا مطلب ظاہر یہ ہے کہ بنو قریظہ بھی بنو نضیر کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو چکے تھے، مگر رسول اللہ صلعم ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے معاہدے کی تجدید کر دی، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ گویا از سر نو یقین دلا دیا کہ وہ پہلے عہد پر قائم و استوار رہیں گے۔

۳۔ جنگ خندق کے دوران میں حیی بن اخطب بنو قریظہ کے رئیس کعب بن اسد کو عہد شکنی پر آمادہ کرنے کے لیے آیا تو کعب بن اسد نے اس سے کہا تھا "مجھے میری حالت پر چھوڑ دو۔ میں نے محمد (صلعم) سے وفائے عہد اور صداقت کے سوا کچھ نہیں پایا۔" یہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف تھا کہ رسول اللہ صلعم کی طرف سے بنو قریظہ کے ساتھ بوجہ کمال ایفائے عہد ہوا۔ بہ ایں ہمہ کعب بن اسد حملہ آوروں کی کثرت تعداد کا مفصل حال سن کر عہد شکنی پر آمادہ ہو گیا حالانکہ اس کا عہدی فرض یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر حملہ آوروں سے لڑتا۔

۴۔ معاہدے کی ضرورت حالت امن کے لیے نہیں، حقیقتاً حالت ہجوم و جنگ ہی کے لیے تھی۔ اس حالت کے لیے بنو قریظہ کے ساتھ عہد کسی کام نہ آیا اور وہ مخالفوں کا ساتھ دینے پر اتر آئے۔

۵۔ قرآن مجید نے واضح اور روشن الفاظ میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ بنو قریظہ نے بیرونی حملہ آوروں کی امداد کی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ مِن صَيَاصِيهِمْ۔ (۳۳: ۲۶)	اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان کی (بیرونی حملہ آوروں کی) امداد کی تھی، انھیں ان کے قلعوں سے نکال دیا۔

گویا بنو قریظہ نے جنگ میں باقاعدہ حصہ لیا، اگرچہ اس کا پیمانہ کچھ ہو۔ جب بیرونی حملہ آور مایوس ہو کر محاصرہ چھوڑ گئے تو بنو قریظہ اپنے قلعوں میں جا بیٹھے۔

۶۔ رسول اللہ صلعم کو ان یہود کی عہد شکنی کی اطلاع ملی تو انصار کے رئیسوں سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ اور دو اور صاحبوں کو تحقیق احوال کے لیے بھیجا۔ قبیلۂ اوس سے بنو قریظہ کے گہرے تعلقات تھے۔ ان اصحاب نے جا کر حالت اور بھی خراب دیکھی، بنو قریظہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا: کون محمد (صلعم)، ہمارے اور ان کے درمیان

کوئی عہد و پیمان نہیں۔ سعدؓ بن معاذ اس صریح بدعہدی اور خیرہ چشمی کو برداشت نہ کر سکے اور انھیں بُرا بھلا کہتے ہُوئے لوٹے۔

قطعی فیصلے کی ساعت

ان حقائق کے علاوہ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ معاملہ چند افراد کا نہیں، ایک بہت بڑی آبادی اور قوم کا تھا جو چاروں طرف سے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی اور اس کا مستقل وجود معرض خطر میں تھا۔ نیز عام یہودیوں کی طرح بنو قریظہ کی بھی یہ حالت تھی کہ صرف اسی وقت تک بادل ناخواستہ معاہدے کے پابند رہتے، جب تک حالات گردوپیش ان کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ساز گار معلوم نہ ہوتے۔ جونہی دیکھتے کہ مسلمانوں پر ضرب لگانے کا اچھا موقع نکل آیا ہے، انتہائی دشمنی کے لیے تیار ہو جاتے۔ حالانکہ رسول اللہ صلعم کی طرف سے وفائے عہد اور صداقت کی گواہی خود انھوں نے علی الاعلان دی۔ ایسے وفا نا آشنا اور معاند گروہ کو مسلمانوں کے پہلو میں رہنے دیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ مدینہ منورہ کی آبادی کا امن مستقل طور پر خطرے میں پڑا رہتا۔ مسلمان جب بھی کسی ناگزیر جنگ کے لیے باہر نکلتے، ان کے اہل و عیال کے لیے یہودیوں کی طرف سے بدعہدی کا کھٹکا مستقل طور پر لگا رہتا۔ چنانچہ یہودیوں کے اس تیسرے اور آخری گروہ کے قطعی فیصلے کی ساعت بھی آ پہنچی۔ (مولف)

باب ۱۱

یہود مدینہ کی سرگزشت

(۲)

بنو قریظہ کا محاصرہ

رسول اللہ صلعم اور مسلمان ۲۳۔ ذی قعدہ ۵ھ کو خندق سے اٹھ کر مدینہ منورہ آئے۔ اسی روز حضرت علیؓ کو عَلَم دے کر مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے بنو قریظہ کی طرف بھیج دیا گیا اور ندائے عام کا انتظام فرما دیا گیا بلکہ یہاں تک تاکید تھی کہ اگر کسی نے نمازِ عصر نہ پڑھی ہو تو بنو قریظہ کی بستی کے پاس پہنچ کر پڑھے۔ یوں بنو قریظہ کا محاصرہ شروع ہو گیا۔

ابتدا میں تو انھیں اپنے مضبوط قلعوں کا بڑا گھمنڈ تھا لیکن چند روز کے بعد محاصرے کی سختی نے انھیں پریشان کر دیا۔ اس حالت میں ان کے رئیس کعب بن اسد نے اپنے ہم قوموں کے سامنے تین تجویزیں پیش کیں اور ان سے کہا کہ ان میں سے جو تجویز اچھی معلوم ہو، اختیار کر لیں:

۱۔ ہم محمد (صلعم) پر ایمان لے آئیں اور اس کی تصدیق کریں۔ تم پر آشکارا ہو چکا ہے کہ وہ نبی مرسل ہے۔ ہماری کتابوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اس طرح تمھاری جانیں، تمھارے مال، تمھاری اولاد اور تمھاری عورتیں محفوظ ہو جائیں گی۔
یہودیوں نے جواب دیا کہ ہم تورات کو نہیں چھوڑ سکتے۔

۲۔ کعب نے کہا، اس سے انکار ہے تو میری تجویز یہ ہے کہ اپنے بال بچوں اور عورتوں کو قتل کر دیں۔ تلواریں سونت کر محمد (صلعم) اور آپؐ کے ساتھیوں پر جا پڑیں۔ پھر اللہ ہمارے اور محمد (صلعم) کے درمیان جو فیصلہ کر دے، کر دے، مارے گئے تو مارے گئے۔ ہمارے اخلاف موجود ہی نہ ہوں گے کہ ان کے بارے میں کچھ اندیشہ ہو۔ اگر غالب آ گئے تو میری جان کی قسم عورتیں اور بچے خدا اور دے گا۔ یہودی بولے: ان مساکین کو قتل کرنے کے بعد جینے میں کیا لطف ہو گا۔

۳۔ کعب نے کہا کہ اگر یہ تجویز بھی منظور نہیں تو پھر میری رائے یہ ہے کہ آج سبت (ہفتہ) کی رات ہے۔ محاصرین بالکل مطمئن ہوں گے کہ ہم سبت کو نہیں لڑتے۔ رات کو نکل کر مسلمان پر شبخون مارو۔
یہودیوں نے کہا کہ ہم سبت کی بے حرمتی نہیں کریں گے۔

ابو لبابہؓ کا معاملہ

پھر بنو قریظہ نے حضور صلعم سے درخواست کی کہ ابو لبابہؓ کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ ہم اپنے متعلق ان سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ بشیرؓ بن عبدالمنذر کی کنیت ابو لبابہؓ تھی اور نام کہ بجائے

کنیت سے زیادہ معروف ہیں۔ انھیں بنی عمرو بن عوف سے رشتۂ اخوت تھا۔ بنو عمرو بن عوف قبیلۂ اوس کے حلیف اور اوس بنو قریظہ کے حلیف تھے۔ اس حلیفی کے علاوہ ابو لبابہؓ کے روابط بنو قریظہ سے بہت زیادہ ہوں گے کہ انھیں بلایا گیا۔ وہ بنو قریظہ کے پاس پہنچے تو مرد، عورتیں اور بچے ان کے گرد جمع ہو کر رونے لگے اور پُوچھا: کیا ہم بلا شرط اطاعت قبول کر لیں؟ ابو لبابہؓ نے اثبات میں جواب دیا۔ ساتھ ہی انگلی سے گلے کی طرف اشارہ کر دیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ قتل کیے جاؤ گے۔ یہ اشارہ ارادی نہیں بالکل اضطراری تھا اور ہجوم جذبات کے عالم میں انسان سے عموماً ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔

بہرحال ابو لبابہؓ کو حرکت سرزد ہو جانے کے بعد احساس ہُوا کہ یہ خیانت تھی۔ یعنی بے وجہ ایک بات رسول اللہ صلعم اور مسلمانوں سے منسوب کر دی۔ اس پر وہ اتنے نادم ہُوئے کہ چپ چاپ مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے جکڑ کر بندھوا لیا اور عہد کر لیا کہ جب تک رسول اللہ صلعم دست مبارک سے نہ کھولیں گے، برابر بندھا رہوں گا۔ حضور صلعم کو علم ہُوا تو فرمایا: کاش ابو لبابہؓ میرے پاس آتے اور میں ان کے عفو کی دعا بارگاہ الٰہی میں کرتا۔

غرض ابو لبابہؓ کی اہلیہ نماز کے اوقات میں انھیں کھول دیتیں۔ ادائے نماز کے بعد پھر باندھ دیتیں۔ چھ روز اسی طرح گزر گئے۔ پھر ان کے بارے میں آیت نازل ہوئی اور ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ رسول اللہ صلعم نے بہ نفس نفیس انھیں کھول کر رہا کیا۔

بنو قریظہ کی حوالگی پندرہ روز کے بعد بنو قریظہ نے بلا شرط حوالگی قبول کر لی۔ اس کے بعد روایات میں نفس مضمون نہیں مگر اجمال و تفصیل کا اختلاف ہے:

۱۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ قبیلہ اوس کے لوگ دوڑے دوڑے بارگاہ نبوی میں پہنچے اور عرض کیا، یا رسول اللہ بنو قریظہ ہمارے حلیف ہیں۔ آپ نے ہمارے خزرجی بھائیوں کے حلیف (بنو قینقاع) کے ساتھ جو معاملہ کیا، وہ آپ کی نظر میں ہے۔ حضور صلعم نے فرمایا: کیا تم اس سے خوش ہو گے کہ یہ معاملہ تمھارے ہی قبیلے کے کسی آدمی کو سونپ دیا جائے۔ انھوں نے عرض کیا، کیوں نہیں، حضور صلعم نے فرمایا: تو سعدؓ بن معاذ سے ملو۔

بعض سیرت نگاروں نے واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے۔

۲۔ طبقات ابن سعد کی روایت ہے کہ بنو قریظہ نے سعدؓ بن معاذ کی ثالثی پر حوالگی اختیار کی[1] قاضی سلیمان مرحوم فرماتے ہیں کہ بنو قریظہ نے:

قبیلہ اوس کے مسلمانوں کو جن سے ان کا پہلے سے رابطہ تھا بیچ میں ڈالا اور نبی صلعم سے منوا لیا کہ بنو قریظہ کے معاملے میں سعدؓ بن معاذ کو...... حَکَم (سرپنچ اور منصف) تسلیم کیا جائے۔ جو فیصلہ محمدؐ کرے،

---

[1] طبقات کبیر جلد دوم ص ۷۷

خدا کا نبی اسے منظور کرے[1]

۳۔ صحیح بخاری میں ہے؛

فنزلوا علی حکمه فرد الحکم الی سعد[2]۔

بنو قریظہ رسول اللہ صلعم کے حکم پر راضی ہو کر قلعوں سے نکل آئے۔ رسول اللہ صلعم نے فیصلہ سعدؓ کے سپرد کر دیا۔

۴۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضور صلعم نے سعدؓ سے کہا؛

ان هؤلاء نزلوا علی حکمك۔

یہ لوگ (بنو قریظہ) تیرے فیصلے پر راضی ہو کر قلعے سے نکل آئے ہیں۔[3]

۵۔ فتح الباری میں ابن حجر فرماتے ہیں؛

وقع فی کثیر من السیر انهم نزلوا علی حکم سعد۔

سیرت کی اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ بنو قریظہ نے پہلے ہی سعد بن معاذ کو حکم اور ثالث منظور کیا تھا۔

سعدؓ کا فیصلہ

غرض خواہ یہ مانا جائے کہ بنو قریظہ نے سعد کو حَکَم مان کر حوالگی اختیار کی، خواہ یہ مانا جائے کہ بلا شرط ہتھیار ڈالے اور وہ رسول اللہ صلعم کے فیصلے پر راضی ہو گئے۔ خود رسول اللہ صلعم نے یہ فیصلہ سعدؓ کے حوالے کر دیا۔ اس بارے میں آخری فیصلے کے مجاز سعدؓ بن معاذ قرار پائے۔

سعدؓ جب سے زخمی ہوئے تھے، رسول اللہ صلعم نے انھیں رُفَیدہ کے خیمے میں بھجوا دیا تھا جو مسجد النبیؐ سے قریب ہی تھا۔ رُفَیدہ اسلمی بنو نجار کی ایک صالح خاتون تھیں، جو بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ اس غرض کے لیے ایک خیمہ لگایا تھا، جسے شفا خانے کی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت سعدؓ کو اول تو علاج کی خاطر وہاں بھجوا دیا تھا، دوسرے یہ مقام رسول اللہ صلعم کی قیام گاہ سے بہت نزدیک تھا اور رسول اللہ صلعم کو سعدؓ کی دیکھ بھال اور مزاج پُرسی میں سہولت تھی۔ ان کا زخم اچھا ہو رہا تھا۔

قبیلہ اوس کے لوگ سعدؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ حلیفوں کے بارے میں اچھا فیصلہ کرنا۔ پھر انھیں سوار کرا کے اس جگہ لائے جہاں مسلمان جمع تھے۔ رسول اللہ صلعم بھی اس مجمع میں تشریف فرما تھے۔ سعدؓ نے راستے ہی میں اپنے ہم قوموں کا اصرار دیکھ کر کہا تھا:

سعد کے لیے وقت آ گیا ہے کہ وہ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی کچھ پروا نہ کرے۔

---

[1] رحمۃ للعالمین ص ۱۷۰ [2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب و مخرجہ الی بنو قریظہ و محاصرتہ ایاہم [3] صحیح بخاری کتاب الجہاد والسیر۔

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ سعدؓ کے ہم قوموں کے لیے چنداں حوصلہ افزا نہیں ہو سکتے تھے۔ سعدؓ مجمع میں پہنچے اور بتایا گیا کہ آپ ثالث مقرر ہوئے ہیں تو انھوں نے پہلے اپنے ہم قوموں سے پوچھا: کیا تم اللہ سے عہد کرتے ہو کہ میں جو فیصلہ کروں گا وہی قائم رہے گا۔" سب نے اثبات میں جواب دیا، پھر سعدؓ اس طرف کے لوگوں سے مخاطب ہوئے جس طرف رسول اللہ صلعم تشریف فرما تھے اور اپنا سوال دہرایا لیکن حضور صلعم کے احترام میں آپ کی طرف تعین کے ساتھ اشارہ نہ کیا تاہم حضور صلعم نے بنفس نفیس اثبات میں جواب دیا۔ پھر جو فیصلہ فرمایا وہ صحیح بخاری کے الفاظ میں یہ ہے:

إنّ تُقتَلَ المُقَاتِلَةَ و ان تُسبَی النّساء والذریۃ و ان تقسم اموالھم[1] — لڑنے والے قتل کر دیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا جائے اور ان کے مال تقسیم ہو جائیں۔

رسول اللہ صلعم نے یہ سن کر سعدؓ سے فرمایا کہ تم نے بنو قریظہ کے بارے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے جو آسمانوں سے آیا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں: "لقد حکمت فیھم بحکم اللہ من فوق سبعۃ ارقعۃ"

تورات کا حکم

حضور صلعم کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ یہ تورات کا حکم ہے اور سب کے نزدیک وہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اس کی تصدیق تورات سے ہوتی ہے۔ کتاب استثناء میں ہے:

جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لیے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گزار بن کر تیری خدمت کریں اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ لڑنا چاہے تو اس کا محاصرہ کرنا اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا اور عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لیے رکھ لینا۔ (باب ۲۰ آیات ۱۰-۱۴)

بالکل اسی قسم کا نقشہ گنتی باب ۳۱ میں پیش کیا گیا ہے یعنی حضرت موسیٰؑ نے خدائی فرمان کے مطابق بنی اسرائیل کو مدیانیوں سے جنگ کا حکم دیا۔ انھوں نے سب مردوں کو قتل کیا۔ پانچ بادشاہوں کو مارا، بعور کے بیٹے بلعام کو ختم کیا۔ عورتوں، بچوں اور مال اسباب کو لے آئے۔ حضرت موسیٰؑ اپنے سرداروں پر خفا ہوئے اور کہا سب لڑکوں کو قتل کرو۔ جو عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں، انھیں قتل کرو، صرف کنواری لڑکیوں کو زندہ چھوڑو۔ (گنتی باب ۳۱، آیات ۱-۱۹) اسی لیے حی بن اخطب نضری نے جو اپنے وعدے کے مطابق بنو قریظہ کے ساتھ آ گیا تھا، قتل سے پہلے اعتراف کیا تھا:

لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یہ ایک حکم الٰہی تھا۔ ایک سزا تھی، جو خدا نے بنو اسرائیل پر لکھی تھی۔[2]

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی، باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب و مخرجہ الی بنو قریظہ و محاصرتہ ایاھم۔ [2] سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۰۱۔

سزا کا معاملہ ویسے بھی احوال و ظروف اس وقت ایسے تھے کہ یہی سزا دی جا سکتی تھی۔ جب انھوں نے کم و بیش پانچ سال میں ایک ایک لمحہ مسلمانوں کے خلاف تدبیر آرائیوں اور منصوبہ بندیوں میں گزارا تھا۔ نہایت نازک وقت میں ان کی ہستی مٹا دینے پر بے تکلف تل گئے تھے اور عہد و پیمان کے وجود ہی سے انکار کر بیٹھے تھے۔ ان کی سزا کیا ہو سکتی تھی؛ جنھیں پہلے نکالا گیا تھا، کیا وہ خیبر میں قدم جما کر ہزاروں کا لشکر فراہم کر کے نہیں چڑھا لائے تھے جس سے مدینہ منورہ کی زمین دہل گئی تھی؛ جانی دشمن اپنی انتہائی سعی و کوشش کے تمام تیر چلا کر ناکام ہو جائے تو اس کے لیے طلب رحم کا مطلب لازماً یہ ہو گا کہ اس زہریلے سانپ کے لیے پھر ڈسنے کا موقع مہیا کر دیا جائے۔ ہاں! اگر بنو قریظہ محاصرے سے پیشتر ہی اپنے جرائم کا اعتراف کر کے معافی مانگتے تو اغلب تھا، انھیں بھی رخصت کر دیا جاتا یا کوئی نرم سزا دی جاتی مگر انھوں نے بدعہدیوں کے بعد جنگ میں بھی تامل نہ کیا۔ جب ہر دائرے میں ناکامی سے سابقہ پڑا تو نتائج کی ذمہ داری غالب پر نہیں، مغلوب ہی کی گردن پر رہتی ہے۔

مقتولین کی تعداد میں اختلاف ہے۔ بعض چھ سو اور سات سو کے درمیان بتاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک صحیح تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی۔

سعدؓ بن معاذ کی وفات سعدؓ بن معاذ نے زخمی ہوتے ہی دعا کی تھی کہ اے خدا اگر قریش کے ساتھ اور کوئی جنگ ہونے والی ہے تو مجھے زندہ رکھ کیونکہ مجھے یہی پسند ہے کہ ان کے خلاف جہاد کروں، جنھوں نے تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دی۔ جھٹلایا اور وطن سے نکالا۔ اگر کوئی جنگ نہیں تو مجھے شہادت عطا کر لیکن اس وقت تک نہ مروں جب تک بنو قریظہ کے انجام سے دل ٹھنڈا نہ کر لوں۔

ان کا زخم رُفَیدہ خاتون کے علاج سے اچھا ہو رہا تھا۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ وہ کروٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے ایک بکری اُوپر سے گزری اور اس کے کھُر سے زخم کو ٹھیس لگ گئی۔ وُہ پھر کھل گیا اور خشک نہ ہو سکا۔ یہی وفات کا باعث ہوا۔ سعدؓ کی وفات انصار کے اس رئیس کی وفات تھی جو ابتدائے اسلام سے آخری دم تک اللہ کی راہ میں ایثار و قربانی کا بے مثال پیکر بنے رہے تھے۔ جابرؓ کہتے ہیں:

سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اھتز العرش الرحمٰن لموت سعد بن معاذ۔	میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے، سعد کی موت سے رحمٰن کا عرش ہل گیا۔

تاریخ کا معاملہ یہ مسلّم ہے کہ ۲۳؍ ذی قعدہ ۵ھ کو بنو قریظہ کا محاصرہ شروع ہوا اور پندرہ روز جاری رہا۔ گویا ۷؍ ذی حجہ (۲۰۔ اپریل ۶۲۷ء) کو آخری فیصلہ ہو چکا تھا۔ ابن ہشام نے محاصرے کی مدّت پچیس روز بتائی ہے۔

فتح مبین

باب ۵

صلح حُدیبیہ اور بیعت رضوان

(۱)

اداے عمرہ کا عزم مبارک ذی قعدہ ۶ھ میں رسول اللہ صلعم نے اداے عمرہ کا قصد فرمایا۔ حرم پاک ہی کی عبادت کے سلسلے میں عربوں نے چار مہینوں کو حرمت کے مہینے قرار دے رکھا تھا۔ ان میں سے رجب کا مہینا الگ تھا، جس میں عموماً عمرہ ادا کیا جاتا تھا۔ ذی قعدہ، ذی حجہ اور محرم کے مہینے مسلسل تھے۔ ان میں حج وعمرہ دونوں کی بجاآوری ہوتی تھی۔ ان مہینوں میں جدال وقتال، قتل و غارت، فتنہ و فساد کے تمام سلسلے رک جاتے تھے۔ دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ نہ انھیں راستوں میں گزند پہنچتا، نہ حرم سے روکا جاتا۔ رسول اللہ صلعم نے ذی قعدہ کا مہینا اسی لیے انتخاب فرمایا تھا کہ یہ حرمت کا مہینا تھا۔ ورنہ اداے عمرہ کے لیے کسی خاص مہینے یا وقت کی کوئی قید نہ تھی۔ صحابہؓ بھی ساتھ تیار ہوگئے۔ ان کی تعداد تیرہ سو سے سترہ سو تک بیان کی جاتی ہے۔ زیادہ تر بیانات چودہ سو کے حق میں ہیں یا "جوامع السیرۃ" کے بیان کے مطابق تعداد تیرہ سو اور پندرہ سو کے درمیان تھی۔

مدینہ منورہ سے روانگی رسول اللہ صلعم نے غسل فرما کر احرام باندھا، مدینہ منورہ پر عبداللہؓ ابن ام مکتوم کو قائم مقام بنایا[۱]۔ یکم ذی قعدہ ۶ھ کو روانہ ہوئے۔ دوشنبے کا دن تھا[۲]۔ ازواج مطہرات میں سے آپؐ کے ہمراہ حضرت ام سلمہؓ تھیں۔ قربانی کے لیے ستر اونٹ ساتھ لیے تھے۔ ان میں سے ایک ابوجہل کا اونٹ تھا، جس کی ناک میں چاندی کا حلقہ تھا اور یہ بدر کے مال غنیمت میں سے تھا۔ ذوالحلیفہ (موجودہ آبار علی) پہنچ کر قربانی کی رسمیں ادا کی گئیں۔ ان میں سے دو رسمیں بطور خاص قابل ذکر ہیں: اول "اِشعار" یعنی اونٹ کے کوہان میں خفیف سا زخم لگا دینا، دوم "تقلید" یعنی جانوروں کے گلے میں قلادے یا پٹے ڈالنا، جن میں لوہے کے نعل ہوتے تھے۔ ان علامتوں یا نشانیوں سے مقصود یہ تھا کہ ہر شخص دیکھتے ہی پہچان جائے، یہ قربانی کے جانور ہیں، جو حرم پاک کی نذر ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے کوئی انھیں چھیڑتا نہ تھا۔

تیروں اور تلواروں کے سوا کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ تلواریں چمڑے کے میانوں میں تھیں، کیونکہ مقصود

---

[۱] یہ طبقات ابن سعد کا بیان ہے۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ نُمیلہ بن عبداللہ اللیثی کو قائم مقام بنایا تھا۔ [۲] ہمارے ہاں اس روز تاریخ ۱۳۔ مارچ ۶۲۸ء تھی اور دن اتوار کا تھا، لیکن ایک روز کا تقدم و تاخر ہرگز قابل توجہ نہیں۔

سے ڈرا دھمکا کرنا تھا، نہ کہ جنگ میں الجھنا۔ ویسے بھی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ قریش کو ہر ممکن ذریعے سے یقین دلا دیا جاتا کہ ہم امن طریق پر حرم پاک کی زیارت کے سوا کچھ مطلوب نہیں۔

قریش کا عزم مزاحمت رسول اللہ صلعم نے احتیاطاً بشر بن سفیان الکعبی[۱] کو قریش کے عزائم کی خبر لانے کے لیے آگے بھیج دیا تھا۔ حضور صلعم عُسفان کے قریب پہنچے تو بشر بن سفیان نے واپس آ کر اطلاع دی کہ قریش کو آپ کی تشریف آوری کی اطلاع مل چکی ہے اور انھوں نے آس پاس کے تمام قبیلوں سے کہہ دیا ہے کہ آپ کو روکا جائے۔ خود بھی لاؤ لشکر کے ساتھ ذی طویٰ[۲] میں آ بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ کو ہرگز حرم میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ دو سو سواروں کو خالد بن ولید (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہُوئے تھے) کی سرکردگی میں کراع الغمیم[۳] بھیج دیا ہے[۴]۔

ارشاد رسالت رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

قریش کا بُرا ہو۔ انھیں جنگ کھا گئی ہے۔ اگر وہ اس معاملے کو مجھ پر اور عربوں پر چھوڑ دیں تو ان کا کیا بگڑتا ہے؟ اگر عرب مجھے ختم کر دیں گے تو قریش کا مقصد خود بخود پورا ہو جائے گا۔ اگر خدا مجھے عربوں پر غلبہ عطا کرے گا تو وہ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ اگر داخل نہ ہوں گے تو جب تک ان میں قوت ہو گی، جنگ کریں گے۔ پھر قریش کس وہم میں مبتلا ہیں؟ خدا نے مجھے جس کام کے لیے مبعوث کیا ہے خدا کی قسم میں اس کے لیے برابر جہاد کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ خدا اسلام کو غالب کر دے یا مجھے موت آ جائے[۵]۔

راستہ بدل کر حُدیبیہ پھر ارشاد ہوا، کوئی ہے جو مجھے اس راستے کو چھوڑ کر جس پر قریش ہیں، کسی دوسرے راستے سے لے چلے؟ قبیلہ اسلم میں سے ایک آدمی نے ہامی بھری۔ وہ گھاٹیوں میں سے ہوتا ہوا ایک سخت پتھریلے راستے سے لے چلا جسے طے کرنا سخت مشقت کا باعث تھا۔ یہ راستہ طے ہو گیا تو حضور صلعم نے فرمایا: سب "نستغفر اللہ و نتوب الیہ" (ہم اللہ سے بخشش کے خواستگار ہیں اور اس کے بعد توبہ کرتے ہیں) کہو۔

---

[۱] بعض نے اس کا نام بُسر لکھا ہے [۲] مکہ مکرمہ کے پاس ایک مقام [۳] کراعَ الغمیم ایک وادی ہے، جو عسفان سے آٹھ میل جانب جنوب (یعنی جانب مکہ مکرمہ) ہے۔ [۴] روایتوں میں ہے کہ خالد بن ولید یا عکرمہ بن ابوجہل کو سواروں کا افسر بنایا گیا تھا۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں کہ سواروں میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی شامل تھا (سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۱۳) [۵] ابن ہشام: القسم الثانی (جزء ثالث و الرابع ص ۳۰۸)۔

بنی اسرائیل کو "قولوا حطة" کا حکم دیا گیا تھا تو اس کا مطلب بھی یہی تھا لیکن وہ اس پر کاربند نہ ہوئے۔ قریش کے سواروں کو معلوم ہو گیا کہ حضور صلعم نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہے تو وہ تیزی سے قریش کے پاس پہنچ گئے۔

رسول اللہ صلعم دشوار گزار راستے سے ہوتے ہوئے ثنیۃ المرار پہنچے جو حدیبیہ[1] کے پاس ہے۔ وہاں پہنچ کر حضور صلعم کی سواری بیٹھ گئی۔ ہرچند اٹھانے کی کوشش کی گئی، مگر نہ اٹھی۔ یہ خدا کی طرف سے نشان تھا کہ یہیں قیام ہونا چاہیے۔ وہیں آپؐ ٹھہر گئے۔

قریش کے پاس پیغام

سب سے پہلے قبیلۂ خزاعہ کا رئیس بدیل بن ورقا اپنی قوم کے چند سواروں کے ساتھ خدمت مبارک میں پہنچا اور عرض کیا کہ قریش نے لڑ مرنے کا حلف اٹھایا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے۔ صرف زیارت و طواف کی نیت سے آئے ہیں۔ جو ہمیں روکے ناچار اس سے لڑنا پڑے گا۔ بدیل نے واپس جا کر حقیقت حال قریش کے گوش گزار کر دی۔ قریش کی طرف سے مکرز بن حفص اور حلیس بن علقمہ بھی آئے۔ خصوصاً حلیس بن علقمہ قربانی کے ستر اونٹ دیکھ کر متاثر ہوا اور اس نے واپس جا کر قریش سے کہا کہ تمھیں کسی کو کعبہ مکرمہ کی زیارت و طواف سے روکنے کا حق نہیں۔ اگر اجازت نہیں دیتے تو میں متحدہ لشکر کو لے کر الگ ہو جاؤں گا۔ اس پر عروہ بن مسعود ثقفی نے کہا میں جا کر صورت حال کا اندازہ کرتا ہوں۔

عروہ بن مسعود

عروہ نے آکر بات چیت کی۔ سب سے پہلے کہا کہ قریش چیتے کی کھالیں پہنے ہوئے ہیں۔ وہ عہد کر چکے ہیں کہ تمھیں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اگر اپنی قوم کو مار کر غلبہ حاصل کر لیا تو یہ کون سا اچھا کارنامہ ہوگا۔ آیا اس سے پہلے کسی عرب کے متعلق سنا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو یوں تباہ کیا ہو؟ اگر لڑائی کا رنگ بدلا تو یہ متفرق لوگ جو تمھارے ساتھ ہیں، تمھیں تنہا چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے۔

حضرت صدیقؓ پاس کھڑے تھے۔ انھیں عروہ کی یہ بات اس درجہ گراں گزری کہ بے اختیار گالی زبان پر آگئی۔ ساتھ ہی کہا: تجھے کیا معلوم ہمیں رسول اللہ صلعم سے کیسی محبت ہے؟ ہم آپؐ کو تنہا چھوڑیں گے؟

---

[1] حدیبیہ وہی مقام ہے جسے آج کل شمیسی کہتے ہیں۔ جدہ کی طرف سے مکہ مکرمہ جائیں تو یہ عین حد حرم پر واقع ہے۔ مقام وہی ہے صرف نام بدل گیا ہے۔ مکہ مکرمہ سے اس کا فاصلہ بائیس تئیس کیلومیٹر یا قریباً چودہ میل ہے۔ اس جگہ دو بلند مینار حد حرم کا نشان بتا رہے ہیں۔ رسول اللہ صلعم اسی مقام پر قیام فرما ہوئے تھے۔ یہیں قریش کے قاصد اور نمایندے آتے رہے تھے۔ یہیں بیعت رضوان ہوئی تھی۔ یہیں معاہدۂ حدیبیہ لکھا گیا تھا۔ یہاں مسجد پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس کے پڑھنے میں مختلف اصحاب سے غلطی ہوئی اس کی تاریخ ۱۲۵۵ھ یعنی ۱۸۳۹ء ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد بیعت رضوان کے مقام پر سلطان محمود ثانی عثمانی کے عہد میں بننی شروع ہوئی مگر اس کی تکمیل سے پیشتر ہی سلطان کا انتقال ہو گیا اور عمارت مسجد کی تکمیل سلطان عبدالمجید خاں کے عہد میں ہوئی۔ یہ محمد خان نہیں محمود خان ہے۔ محمود خان ثانی عثمانی یا سلطان محمود مصلح۔

عروہ نے پوچھا یہ کون ہے؟ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: ابن ابوقحافہ (ابوبکر صدیقؓ)۔ عروہ بولا: ان کا مجھ پر ایک احسان ہے جس کا بدلا ابھی تک چکا نہیں سکا۔ اگر یہ احسان نہ ہوتا تو اس سخت کلامی کا جواب ضرور دیتا۔[1]

گفتگو میں عربوں کا عام قاعدہ تھا کہ متکلم مخاطب کی داڑھی تک ہاتھ لے جاتا۔ عروہ کا ہاتھ بھی اسی دستور کے مطابق وقتاً فوقتاً رسول اللہ صلعم کی ریش مبارک تک پہنچ جاتا تھا۔ مغیرہؓ بن سعد[2] جو عروہ کا قریبی رشتہ دار تھا، خود پہنے اور تلوار لیے حضور صلعم کے پیچھے کھڑا تھا۔ اسے عروہ کا یہ طریقہ سخت ناگوار گزرا۔ بےتاب ہو کر بولا: "اپنا ہاتھ ہٹا لے ورنہ یہ واپس نہ جاسکے گا۔" عروہ نے یا تو مغیرہ کو خود پہچان لیا یا پوچھ کر معلوم کر لیا۔ پھر کہا: "او دغاباز! کیا میں نے تیری دغابازی کا معاملہ درست کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہیں کر رہا؟"[2]

عروہ کا تاثر

بہرحال عروہ کوئی بات طے تو نہ کر سکا اور غالباً اس غرض سے آیا بھی نہیں تھا، لیکن دانش مند، دور اندیش اور حقیقت شناس آدمی تھا۔ واپس گیا تو خاصا متاثر ہو گیا۔ جاتے ہی قریش سے کہا: میں نے قیصر، کسریٰ اور نجاشی کے دربار بھی دیکھے ہیں لیکن عقیدت و وارفتگی کے وہ مناظر کہیں نہیں دیکھے جو محمد (صلعم) کے اصحاب میں نظر آئے۔ میں نے ایسی جمعیت دیکھی ہے جو کسی بھی قیمت پر محمد (صلعم) کو نہ چھوڑے گی۔ اب جو رائے چاہو قائم کرو۔

قریش کی طرف سے کوئی قطعی اطلاع نہیں ملی تھی، اس لیے رسول اللہ صلعم نے خراش بن امیہ خزاعی کو فیصلہ کن جواب لانے کے لیے بھیجا اور سواری کے لیے اپنا ایک اونٹ مرحمت فرمایا جس کا نام "ثعلب" تھا۔ قریشیوں نے اونٹ کو مار ڈالا۔ خراش کو بھی قتل کر دینا چاہتے تھے۔ مگر متحدہ گروہ نے اسے بچا لیا جو مختلف عناصر سے مرکب تھا اور وہ قریش کی امداد کے لیے آیا تھا۔

قریش کے حبش کا معاملہ

قریش مکہ برابر غیظ و غضب کا اظہار کیے جا رہے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک لشکر اس مقام کی طرف بھیج دیا جہاں رسول اللہ صلعم قیام فرما تھے۔ اس کی تعداد چالیس سے اسی تک بیان کی جاتی ہے اور انھیں تاکید کر دی کہ اکا دکا مسلمان مل جائے تو اسے قتل کر دینا۔

---

[1] دورِ جاہلیت میں عروہ کے ذمے ایک خون بہا لگا تھا جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دس جوان گائیں بطور امداد دی تھیں۔ یہ اسی احسان کی طرف اشارہ ہے۔ [2] مغیرہ اور عروہ کے درمیان قریبی رشتہ تھا۔ ایک دفعہ مغیرہ کو کسی وفد کے ساتھ مقوقس کے پاس مصر بھیجا گیا جہاں مقوقس نے مغیرہ کے بجائے ساتھیوں کی زیادہ آؤ بھگت کی۔ اس پر مغیرہ کو رنج ہوا۔ لوٹتے وقت نشے کی حالت میں اس نے اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ عروہ نے اس قبیلے کو خون بہا پر راضی کر لیا تھا اور خود ہی خون بہا ادا کیا تھا۔

لیکن یہ پورا گروہ گرفتار ہوگیا۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو معاف فرما دیا اور انھیں واپس جانے کی اجازت دے دی۔

سورۂ فتح کی آیت ۲۴ میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے:

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا۔

اور وہی خدا جس نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے وادی مکہ میں روک رکھے بعد اس کے کہ تمھیں ان پر قابو دے دیا تھا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھنے والا ہے۔

قریش کے ہاتھ یوں روکے کہ وہ جیش جس غرض سے آیا تھا، اس کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ مسلمانوں کے ہاتھ یوں روکے گئے غلبہ و استیلاء کے باوجود ان لوگوں کو جو بے وجہ حملے کے مجرم تھے اور حملہ بھی بے خبری کے عالم میں کیا گیا تھا کچھ سزا نہ دی۔

رسول اللہ صلعم کی طرف سے قریش کے لیے یہ ایک اور روشن ثبوت تھا کہ حضورؐ کی آمد کا مقصد و مدعا لڑائی یا خونریزی نہیں صرف زیارت و طواف بیت اللہ ہے۔

بیعت رضوان

خراش بن امیہ کے بعد رسول اللہ صلعم نے حضرت عمرؓ کو بھیجنا چاہا مگر انھوں نے عذر کیا کہ مکہ مکرمہ میں میرے قبیلے یعنی بنو عدی بن کعب کا کوئی آدمی نہیں جو میری حمایت کرسکے۔ اس وجہ سے حضرت عثمانؓ کو ان کے ایک عزیز ابان بن سعید کے زیر حمایت بھیجا گیا جن کے قبیلے کو اس وقت قریش میں درجۂ ریاست و سالاری حاصل تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اشراف قریش کو بتایا جائے ہمارا مقصد جنگ نہیں صرف حرم پاک کی زیارت، طواف اور اجلال و اکرام ہے۔

حضرت عثمانؓ نے پیغام پہنچا دیا۔ پھر ان سے کہا گیا کہ آپ بیت اللہ کا طواف کرلیں مگر حضرت نے تنہا طواف کرنا منظور نہ کیا اور کہا اس وقت تک طواف نہ کروں گا جب تک رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھی طواف نہ کریں گے۔

حضرت عثمانؓ کو مکہ مکرمہ میں روک لیا گیا۔ ادھر یہ افواہ اڑ گئی کہ عثمانؓ شہید کردیے گئے۔ اس وقت رسول اللہ صلعم ایک درخت کے سایے میں تشریف فرما تھے۔ یہ سنتے ہی فرمایا: اب ہم اس مقام سے اس وقت تک نہ ہٹیں گے، جب تک قریش سے جنگ نہ کرلیں گے۔ ساتھ ہی صحابہ کرام کو بیعت کی دعوت دی۔ چنانچہ تمام جاں نثاروں نے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر بیعت کی۔ ایک صاحب نے ایک مرتبہ پر قناعت نہ کی، بلکہ تین مرتبہ بیعت کا شرف حاصل کیا۔ بیعت اس بات پر لی گئی تھی کہ لڑنا پڑا تو ہر حال میں ثابت قدم رہیں گے۔ حضور صلعم نے اپنے بائیں دست مبارک کو حضرت عثمانؓ کا دایاں ہاتھ قرار دے کر ان کی جانب سے بھی بیعت کی۔ یہی بیعت ہے، جسے قرآن مجید کی برکت سے ذکر دوام حاصل ہوا۔

ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا۔ (سورۃ فتح: ۱۸)	خدا مومنوں سے راضی ہوا۔ جب وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا۔ پس ان پر سکون و اطمینان اتارا اور فتح قریب عطا کی۔

اس بیعت کی کیفیت چھپی نہیں رہ سکتی تھی قریش کو اس کا علم ہُوا تو ان پر یقیناً ہراس طاری ہو گیا ہوگا انھیں صلح پر مائل کرنے کے لیے یہ بیعت بھی ایک موثر عامل ثابت ہوئی۔ (مولف)

باب ۴۵

صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان

—(۲)—

سہیل بن عمرو اور صلح نامہ

رسول اللہ صلعم فرما چکے تھے کہ قریش میرے ساتھ صلح کرلیں اور میرا معاملہ عربوں پر چھوڑ دیں۔ عرب مجھ پر غلبہ پالیں گے تو قریش کا مقصد خود بخود پورا ہو جائے گا۔ اور مجھے اللہ تعالیٰ غلبہ عطا کرے گا تو عرب گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ اب قریش نے صلح کی مستقل گفتگو کے لیے سہیل بن عمرو کو مختار بنا کر بھیجا۔ مندرجہ ذیل شرطوں پر فیصلہ ہو گیا:

۱۔ دس سال تک لڑائی موقوف رہے گی۔ لوگ امن کی زندگی بسر کریں گے اور اس اثنا میں ایک دوسرے کے ہاتھ رکے رہیں گے۔

۲۔ مسلمان اس سال لوٹ جائیں، آیندہ سال آئیں اور تین دن مکہ میں رہ کر زیارت و طواف کریں۔ شرط یہ ہے کہ وہ صرف تلواریں لے کر آئیں، جو میانوں میں ہوں اور میان تھیلوں وغیرہ میں رہیں۔

۳۔ قریش کا کوئی آدمی ولی کی اجازت کے بغیر محمد (صلعم) کے پاس پہنچ جائے گا تو اسے قریش کی طلب پر واپس کر دیا جائے گا۔ محمد (صلعم) کا کوئی آدمی قریش کے پاس آجائے گا تو اسے واپس نہ کیا جائے گا۔

۴۔ فریقین ایک دوسرے سے بدعہدی یا خیانت نہ کریں گے۔ دلوں کی کدورتیں دلوں ہی میں رہیں گی، ظاہر نہ کی جائیں گی۔

۵۔ جو فرد یا قبیلہ چاہے محمد (صلعم) سے اور جو چاہے قریش سے معاہدہ کر سکتا ہے۔ گویا وہ لوگ فریقین کی طرف سے شامل معاہدہ سمجھے جائیں گے۔

تحریر میں رکاوٹیں

یہ صلح نامہ لکھتے وقت بھی کچھ دقتیں پیش آئیں۔ حضرت علیؓ کتابت پر مامور ہوئے تھے۔ انھوں نے صلح نامہ کی پیشانی پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا۔ سہیل نے اس پر اعتراض کیا کیونکہ عربوں کا عام قاعدہ "باسمك اللّٰهمّ" لکھنا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "باسمك اللّٰهم" ہی لکھو۔ پھر یہ عبارت لکھی گئی کہ ان شرطوں پر محمد رسول اللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی۔ سہیل نے کہا کہ اگر ہم آپ کو "رسول اللہ" مانتے تو جھگڑا ہی کیوں ہوتا؟ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: بے شک میں اللہ کا رسول ہوں، لیکن یہاں لکھ دو "محمد" بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی۔"

ابوجندلؓ کا واقعہ غرض سہیل کی دونوں باتیں مان لی گئیں کیونکہ ان کی حیثیت محض ذیلی اور ضمنی تھی، لیکن عین اسی موقع پر ایک اور اضطراب انگیز واقعہ پیش آ گیا۔ جس نے صحابہ کرام میں اک گونہ اشتعال پیدا کر دیا۔ سہیل بن عمرو کے فرزند ارجمند ابوجندلؓ مسلمان ہو چکے تھے اور انھیں زنجیریں پہنا کر قید کر دیا گیا تھا۔ وہ کسی طرح قید سے نکل کر زنجیریں پہنے ہوئے حدیبیہ پہنچ گئے۔ سہیل نے ابوجندلؓ کو دیکھتے ہی مطالبہ کیا کہ معاہدے کی شرط کے مطابق اسے واپس کر دو۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ ابھی تو تحریر مکمل نہیں ہوئی۔ سہیل نے کہا پھر صلح کی بات پوری نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اسے میری خاطر اجازت دے دو۔ مکرز بن حفص، سہیل کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا اچھا ہم اجازت دیتے ہیں مگر سہیل اڑ گیا اور اس نے انکار کر دیا۔ ابوجندلؓ نے کہا، مسلمان بھائیو! میں اتنی تکلیفیں جھیل چکا ہوں کیا مجھے دشمن کے سپرد کر دو گے؟

یہ بات مسلمانوں کے لیے انتہائی اضطراب کا باعث بن گئی مگر حضور صلعم کا ارشاد ہوا: ابوجندلؓ! صبر کرو، اللہ جلد تم لوگوں کے لیے کشایش کی کوئی سبیل نکال دے گا۔

حضرت عمرؓ کا جوش یہی موقع ہے جب حضرت عمرؓ جوش کے عالم میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور یوں سوال و جواب ہوئے:

عمرؓ: کیا ہمارے رسول، اللہ کے پیغمبر نہیں؟

ابوبکرؓ: کیوں نہیں؟

عمرؓ: کیا ہم مسلمان نہیں؟

ابوبکرؓ: کیوں نہیں؟

عمرؓ: پھر دین کے معاملے میں یہ ذلت کیوں گوارا کی جا رہی ہے؟

ابوبکرؓ: عمرؓ! رسول اللہ کا دامن تھامو۔ میں گواہی دیتا ہوں، وہ اللہ کے رسول ہیں۔

عمرؓ: میں بھی گواہی دیتا ہوں، وہ اللہ کے رسول ہیں۔

پھر ایسی ہی گفتگو رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔ آپؐ نے آخر میں فرمایا: میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔

حضرت عمرؓ کو اس گفتگو پر، جو عالم اضطرار میں ان سے ہوئی تھی، سخت پشیمانی ہوئی۔ امام زہری کے بیان کے مطابق حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں برابر نمازیں پڑھتا، روزے رکھتا، صدقے دیتا اور غلام آزاد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ امید پیدا ہوئی، میرا معاملہ بخیر انجام پائے گا۔

شرطوں کی حقیقت اصل معاہدے کے بنیادی اور اساسی پہلو پر مختصر سا تبصرہ آیندہ ملے گا۔ لیکن اکثر مسلمان جن

شرطوں پر بہت زیادہ پریشان ہوئے۔ وہ یہ تھیں کہ قریش کی طرف سے کوئی فرد بلا اجازتِ ولی مدینہ چلا جائے گا تو اسے واپس کرنا ہوگا اور مدینہ منورہ سے جو آئے گا، اسے واپس نہ کیا جائے گا۔

بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان شرطوں میں بھی کوئی پریشان کن بات نہ تھی۔ البتہ ظاہر الفاظ میں سبکی کا ایک پہلو محسوس ہوتا تھا۔ خود رسول اللہ صلعم نے عمرؓ کے جواب میں فرمایا تھا،

میرا جو آدمی جائے گا، وہ ضرور منافق ہوگا۔ اس کا جانا ہی اچھا ہے۔ البتہ جس مسلمان کو ہم واپس کریں گے تو اس کے لیے خداوند کریم جلد سامان کر دے گا۔[1]

کیا یہ حقیقت نہیں کہ مدینہ منورہ سے دانستہ مکہ مکرمہ آنے والے شخص کا معاملہ دو حالتوں سے خالی نہیں سمجھا جاسکتا تھا؟ یا تو اس کے دماغ میں فتور ہوتا یا دل میں۔ یعنی یا تو اسے سلامت ہوش و حواس سے عاری مانا جاتا یا دینی نقطۂ نگاہ سے منافق قرار دیا جاتا۔ دونوں صورتیں حقیقتہً مستحق اعتنا نہ تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسی مثال ہی نہیں ملتی، کسی نے مدینہ منورہ سے مکہ کا قصد کیا ہو۔

باقی رہا مدینہ منورہ سے قریش کے طلب کردہ آدمی کو واپس کرنے کا معاملہ تو معلوم ہے کہ جو مسلمان مکہ مکرمہ میں رہ گئے ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے تبلیغ اسلام کا انتظام فرما دیا۔ گویا ایسے لوگ بجائے خود مرکز تبلیغ بن گئے یا انھوں نے باہر نکل کر اور مکہ و مدینہ دونوں سے الگ رہ کر ایک مرکز بنا لیا، جو انجام کار قریش کے لیے اس درجہ مصیبت خیز بن گیا کہ انھوں نے خود یہ شرط ختم کر دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گویا یہ شرط حقیقتہً اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کی تقویت و توسیع اور قریش کی پشیمانی کا باعث بنی۔ یہاں میں صرف ایک ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

مکہ میں تبلیغ اسلام

ابو جندلؓ کے متعلق مولانا قاضی سلیمان مرحوم لکھتے ہیں،

ابو جندلؓ نے زندان مکہ میں پہنچ کر دین حق کی تبلیغ شروع کر دی۔ جو کوئی اس کی نگرانی پر مامور ہوتا وہ (ابو جندلؓ) اسے توحید کی خوبیاں سناتا، اللہ کی عظمت و جلال بیان کر کے ایمان کی ہدایت کرتا۔ خدا کی قدرت کہ ابو جندلؓ اپنے سچے ارادے اور سعی میں کامیاب ہو جاتا اور وہ شخص مسلمان ہو جاتا۔ قریش اس دوسرے ایمان لانے والے کو بھی قید کر دیتے۔ اب یہ دونوں مل کر تبلیغ کا کام اسی قید خانے میں کرتے۔

الغرض اسی طرح ایک ابو جندلؓ کے قید ہو کر مکہ مکرمہ رہ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال کے اندر قریباً تین سو اشخاص ایمان لے آئے۔

---

[1] اصح السیر ص ۱۷۷

اب قریش پچھتائے کہ ہم نے کیوں عہدنامے میں ان ایمان والوں کو واپس بھیجنے کی شرط درج کرائی، پھر انھوں نے مکہ کے چند منتخب شخصوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کہ ہم عہدنامے کی اس شرط سے دست بردار ہوتے ہیں۔ ان نومسلموں کو اپنے پاس بلا لیجیے۔

ابو بصیرؓ

ابو بصیرؓ (عتبہ بن اُسید) کا واقعہ بھی ایمان افروز ہے۔ یہ نیک طینت مسلمان ہوکر مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ قریش نے اسے واپس لانے کے لیے دو آدمی بھیج دیے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ابو بصیرؓ واپس جاؤ، ہم معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اس نے عرض کیا کہ کفار قریش مجھے تکلیفیں اور اذیتیں دیں گے۔ ایمان سے برگشتہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا معاہدے کی پابندی لازم ہے۔ تمھارے لیے خدا کوئی نہ کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ چنانچہ ابو بصیرؓ کو واپس جانا پڑا۔ اس نے راستے میں موقع پاکر ایک آدمی کو قتل کر دیا دوسرا فریاد لے کر رسول اللہؐ کی بارگاہ میں پہنچا۔ پیچھے ابو بصیرؓ بھی حاضر ہو گیا اور عرض کیا کہ آپ نے عہد کے مطابق اپنی طرف سے مجھے واپس کر دیا۔ میرے لیے خدا نے مخلصی کی ایک صورت پیدا کر دی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ میں اب مدینہ میں نہیں رہتا۔

چنانچہ وہ عیص[1] چلا گیا جو مکہ مکرمہ اور شام کے راستے کا ایک مشہور مقام ساحل بحر کے قریب ہے اور ڈاکٹر حمیداللہ کے بیان کے مطابق حمرا اور بدر کے درمیان جنگل میں ایک مقام ہے۔ پھر ابو جندلؓ اور دوسرے مسلمان بھی رفتہ رفتہ ابو بصیرؓ کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے قریش کے قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ ایک مرتبہ ابوالعاص بن ربیع بن عبد شمس کا قافلہ شام سے آ رہا تھا۔ ابو بصیرؓ، ابو جندلؓ اور ساتھی ابوالعاص سے بخوبی واقف تھے۔ وہ مکہ کے ممتاز گھرانے کا فرد تھا اور اس کا نکاح رسول اللہ صلعم کی صاحبزادی حضرت زینب سے ہوا تھا۔ اگرچہ اسلام نہ لانے کی وجہ سے میاں بیوی میں مفارقت ہو گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ابوالعاص کا سامان تو لوٹ لیا مگر قافلے کے کسی فرد کو کوئی گزند نہ پہنچائی۔ ابوالعاص نے مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت زینب کے ذریعے سے معاملہ حضور صلعم تک پہنچایا۔ صحابہ کے مشورے سے ابوالعاص کا سامان واپس کر دینے کا فیصلہ ہوا۔ ابو بصیرؓ، ابو جندلؓ اور رفیقوں کو اطلاع ملی تو انھوں نے ایک ایک چیز واپس کر دی حتیٰ کہ اونٹوں کی مہاریں بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئیں۔ ابوالعاص یہ سب کچھ لے کر مکہ پہنچا، ہر فرد کا روپیہ پیسا یا مال واپس کیا۔ پھر مدینہ پہنچ کر مسلمان ہو گیا۔ کہا کہ اگر پہلے اسلام قبول کر لیتا تو سمجھا جاتا کہ میں لوگوں کے مال میں تغلب وتصرف کے بعد مسلمان ہو گیا ہوں۔

شرط ختم ہوگئی

مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں،

---

[1] یہ مقام مدینہ منورہ سے چار رات کی مسافت پر تھا۔

قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت صلعم کو لکھ بھیجا کہ معاہدے کی اس شرط سے ہم باز آتے ہیں۔ اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے۔ ہم اس سے تعرض نہ کریں گے۔[۱]

گواہان معاہدہ اصل معاہدے پر ابن ہشام کے مطابق مندرجہ ذیل اصحاب نے بطور گواہ دستخط ثبت کیے: ابوبکر صدیقؓ، عمرؓ ابن الخطاب، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، عبداللہؓ بن سہیل بن عمرو، بکرز بن حفص، محمودؓ بن مسلمہ۔ علیؓ بن ابی طالب کاتب معاہدہ تھے۔ طبقات میں ابو عبیدہؓ بن الجراح اور حویطب بن عبد العزیٰ کے نام بھی مرقوم ہیں۔

بنو خزاعہ نے اعلان کر دیا کہ ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہیں۔ بنو بکر نے کہہ دیا کہ ہم قریش کے عہد میں ان کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اونٹ قربان کیے جو ساتھ لائے تھے اور حلق کرایا۔ صحابہ کرام نے بھی حضور صلعم کی پیروی کی۔ بعض نے حلق کرایا اور بعض نے قصر پر اکتفا کیا۔

واپسی پر راستے میں سورہ فتح نازل ہوئی، اس میں ان نشانیوں کا ذکر تھا، جن کے ظہور کی ساعت قریب آ پہنچی تھی۔

عمرۃ القضاء رسول اللہ صلعم حسب معاہدہ حدیبیہ ذی قعدہ ۶ھ میں عمرہ ادا کیے بغیر لوٹ گئے تھے۔ ذی قعدہ ۷ھ[۲] میں دوبارہ تشریف لائے۔ اس مرتبہ آپ کے ساتھ دو ہزار صحابہؓ کرام تھے۔ اونٹوں کے علاوہ گھوڑے بھی ساتھ تھے اور ہدی کے لیے ساٹھ اونٹ ساتھ لے لیے تھے۔ "طبقات" کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم مرالظہران میں اترے۔ اسلحہ بطن یاجج[۳] میں بھیج دیے جہاں سے حرم کے بت نظر آنے تھے[۴]۔ چونکہ تلواروں کے سوا کوئی ہتھیار ادائے عمرہ کے وقت ساتھ نہیں لینا تھا۔ اس لیے اوس بن خولی انصاری کو ایک سو رفیقوں کے ساتھ ان کی حفاظت کے لیے متعین فرما دیا۔ باقی تمام اصحاب رسول اللہ صلعم کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ حضور صلعم قصویٰ پر سوار تھے اس کی مہار عبداللہؓ بن رواحہ نے تھام رکھی تھی اسی حالت میں طواف اور سعی سے فارغ ہوئے۔ پھر مروہ کے پاس قربانی کی۔ اہل مکہ آس پاس کے پہاڑوں پر چلے گئے تھے۔ حضور صلعم کے ارشاد کے مطابق بلالؓ نے مسجد حرام میں اذان بھی کہی۔

حضور صلعم کے لیے چمڑے کا خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ اسی میں آپ نے قیام مکہ کے تین دن گزارے۔ پھر ایک جماعت کو اسلحہ کی حفاظت کے لیے یاجج بھیج دیا تاکہ پہلے محافظین بھی عمرہ ادا کر لیں۔ تین روز پورے ہو گئے تو آپ نے مکے سے روانہ ہو کر سرف میں مقام کیا جو شمال میں آٹھ میل ہے۔ مدینہ منورہ لوٹتے تو حج کا مہینا شروع ہو گیا تھا۔

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۲۴ [۲] ذی قعدہ ۷ھ تقویم کے مطابق ۲۔ مارچ ۶۲۹ء سے شروع ہوا [۳] یاجج کے متعلق معجم البلدان میں ہے کہ ایک مقام جو مکہ مکرمہ سے آٹھ میل ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت خبیبؓ کو سولی دی گئی تھی اور یہ مسجد تنعیم سے دو میل ہے وہاں ایک مسجد بن گئی تھی جو مسجد شجرہ کہلاتی تھی۔ ابن ہشام کے حواشی میں ہے، اسم موضع بمکہ جہاں سے حرم کے بت نظر آتے تھے وہ مقام مکہ سے زیادہ دور نہ ہونا چاہیے۔ [۴] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۱۲۱۔

اسی سفر میں حضور صلعم نے حضرت میمونہؓ بن حارث سے نکاح کیا۔ یہ نکاح عباسؓ کی تحریک سے ہوا تھا، جن کی اہلیہ ام الفضل میمونہؓ کی ہمشیر تھیں۔

یہی دور ہے جس میں تاریخ اسلام کے دو ممتاز سالاروں۔ خالد اور عمرو ابن العاص نے اسلام قبول کیا جن کی جنگی مہموں کو فلپ حتیّ نے نپولین، سکندر اور ہنی بال کی جنگی مہموں سے بھی برتر قرار دیا ہے[1] (مولف)

---

[1] تاریخ عرب (انگریزی) ص ۱۴۲۔

عالمی دعوتِ تبلیغ کا آغاز

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (مائدہ : ۶۷)

اے پیغمبر، تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے، اسے (پروردگار کے بندوں تک) پہنچا دو۔

باب ۳۵

سلاطین و رؤسا کو دعوت اسلام

—(۱)—

عالمگیر رسالت رسول اللہ صلعم کا پیغام حق صرف عرب کے لیے نہیں، پوری کائنات انسانیت کے لیے تھا، جیسا کہ قرآن مجید کے ارشادات سے واضح ہے:

۱- قُلْ يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (اعراف: ۱۵۸)

(اے پیغمبر) کہو: اے افراد نسل انسانی، میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔

۲- وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۤفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ (سبا: ۲۸)

اور ہم نے تجھے تمام افراد نسل انسانی کے لیے خوشخبری پہنچانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

۳- هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ (فتح: ۲۸)

خدا وہی ہے جس نے اپنے رسول کو روشن دلیلوں اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ تمام دینوں پر غلبہ حاصل کرلے۔

احادیث سے اس کی مزید توثیق ہوتی ہے مثلاً رسول اللہ صلعم نے دوسرے پیغمبروں کے مقابلے میں اپنی چند خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ایک خصوصیت یہ بھی بیان فرمائی کہ "بعثت الی الناس کافۃ" دوسری روایت میں اس مضمون کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں: "بعثت الی الخلق کافۃ" یعنی مجھے پورے عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے۔

ایک اور پہلو اس معاملے پر غور کا ایک اور پہلو بھی ہے:

۱- دین حق میں خدا "رب العٰلمین" ہے، یعنی تمام جہانوں یا کائنات کا پروردگار۔ اس کا دائرہ ربوبیت پوری کائنات کو اپنے دامن رحمت میں سمیٹے ہوئے ہے، جس کی لاتناہی وسعتوں اور پہنائی کا سرسری اندازہ بھی پیش کرنے سے ہمارا علم حساب و اعداد یک قلم درماندہ ہے اور حال میں خلائی سفروں سے جو کچھ اب تک سامنے آیا ہے، اس کی روشنی میں تو کچھ زبان پر لانا ہی ممکن نہیں رہا۔

دین حق کا رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) "رحمۃ للعٰلمین" ہے یعنی جہانوں یا پوری کائنات کے لیے

سراسر رحمت کی بشارت۔

۳۔ دینِ حق کی کتاب یعنی قرآن مجید "ذکر للعٰلمین" ہے یعنی جہانوں کے لیے وعظ و نصیحت کا سرچشمہ۔

۴۔ دینِ حق کا مرکز مشہور یعنی کعبہ "مبارکا و ھدی للعٰلمین" ہے۔ یعنی سب کے لیے برکات و ہدایت کا سرمایہ۔

غرض اس دین کا کوئی بھی بنیادی پہلو ایسا نہیں جو کسی ایک خطے یا حلقے یا گروہ انسانیت تک محدود ہو۔ ہر پہلو کی حیثیت عالمی و آفاقی ہے اور یہ عالمیت و آفاقیت اصل پیغام کے عالمگیر و آفاق گیر ہونے کی روشن ترین دلیل ہے۔

اصل وظیفہ رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ اسی پیغام حق کے لیے وقف رہا۔ چونکہ آپ کی رسالت عالمی و آفاقی تھی، اس لیے انتظامات تبلیغ بھی خاص اہتمامات کے متقاضی تھے، مگر قریش کے جوشِ عداوت وعناد نے آغاز ہی میں ایسے افسوسناک حالات پیدا کر دیے کہ پہلے مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی جماعت کو وطن چھوڑ کر حبش میں پناہ لینی پڑی تاکہ وہ ظلم وستم کی اس آگ سے محفوظ رہے جو قریش نے مکے اور اس پاس کے علاقوں میں بھڑکا رکھی تھی اور اطمینان سے خدائے واحد کی عبادت کر سکے۔ بعض اصحاب نے حبش میں کئی سال گزار دیے اور مخلص مومنوں کا آخری قافلہ اس وقت حبش سے مدینہ منورہ پہنچا جب ہجرت کا ساتواں سال شروع ہو چکا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کے قبول کے لیے اہل یثرب کے دل کھول دیے اور مسلمانوں کے لیے ایک نیا مامن میسر آ گیا، جو مکے سے اڑھائی سو میل شمال میں تھا۔ رسول اللہ صلعم اور صحابہ وہاں چلے گئے تاکہ اپنا اصل وظیفہ بہ اطمینان پورا کریں۔ قریش نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور رزم و پیکار کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ قریش کی عداوت دیکھ کر بعض دوسرے قبیلے بھی مسلمانوں کے نئے مرکز یعنی مدینہ منورہ پر یورشوں کے منصوبے تیار کرنے لگے، تاکہ مال بھی ملے اور قریش مکہ کی نظروں میں اعتبار بھی بڑھے، جنھیں تولیت کعبہ کے باعث پیروں اور مرشدوں کی حیثیت حاصل تھی۔ قریش خود بھی ایسی ہر حرکت کی حمایت و حوصلہ افزائی کے لیے آمادہ رہتے تھے۔

رسول اللہ صلعم نے مشکلات کے ان ہجوم میں بھی تبلیغ اور تعلیم و تزکیہ کا سلسلۂ مقدسہ جاری رکھا، مگر جو دلجمعی اور یکسوئی لازم تھی، اس کا انتظام معاہدۂ حدیبیہ کے بعد ہی ہوا، جس کے مطابق قریش دس سال کے لیے جنگ سے دست بردار ہو چکے تھے۔ اگرچہ جلد ہی ان کی طرف سے نقض عہد ہوا، جو فتح مکہ کا مقدمہ بن گیا۔ پھر عرب کے بیشتر گروہوں نے اسلام قبول کر لیا یا وہ جزیہ ادا کرنے کا اقرار کرتے ہوئے اسلام کی حفاظت میں آ گئے۔

مُہرِ نبوی اور دعوت نامے رسول اللہ صلعم معاہدۂ حدیبیہ کے بعد حج کے مہینے میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچے تو مختلف سلاطین و رؤسا کے لیے قاصد تجویز فرمائے اور دعوت نامے لکھوائے۔

عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ اگر مکاتیب یا دعوت ناموں پر مُہر نہ ہو تو سلاطین و رؤسا انھیں معتبر سمجھتے ہیں اور نہ پڑھتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے چاندی کی ایک سادہ سی مُہر بنوالی، جس پر صرف تین لفظ کندہ تھے۔ سب سے نیچے "محمد"، اس سے اوپر "رسول" اور سب سے اوپر "اللہ"۔[1] رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ میں یہی مہر تمام نامہ ہائے مبارک یا فرامین رسالت پر لگتی رہی۔ حضور صلعم کے بعد یہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے قبضے میں آئی، پھر حضرت عمرؓ فاروق اس کے محافظ بنے۔ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے یہ ایک کنویں میں گر گئی۔ ہر چند اسے تلاش کیا گیا مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔

سب سے پہلے چھ دعوت نامے تیار کیے گئے، جو مختلف ممالک کے حکمرانوں تک پہنچانے کی غرض سے قاصدوں یا کہنا چاہیے سفیروں کے سپرد ہوئے۔ یہ دعوت نامے محرم ۷ھ میں ایک ہی دن روانہ کیے گئے تھے۔[2] چونکہ اواخر محرم میں رسول اللہ صلعم خیبر روانہ ہو گئے تھے، اس لیے اغلب یہی ہے کہ دعوت نامے اوائل محرم میں روانہ کیے گئے ہوں۔ ان میں سے ایک ایک کی کیفیت الگ الگ بیان کی جاتی ہے۔

شاہ حبش

سب سے پہلا مکتوب گرامی اصحمہ شاہ حبش کے نام تھا، جس کا لقب نجاشی تھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ نیگوش کا معرب ہے اور یہ مکتوب گرامی عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ بھیجا گیا تھا۔ اس کے آغاز میں حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی کیفیت اسلامی نقطۂ نگاہ سے ٹھیک ٹھیک واضح کر دی گئی تھی۔ جس حصے کا تعلق دعوت اسلام سے تھا، وہ درج ذیل ہے:

انّی ادعوک الی اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ والموالاۃ علی طاعتہ و ان تتبعنی و تومن بالذی جاءنی فانّی رسول اللّٰہ و انّی ادعوک و جنودک الی اللّٰہ عزّ و جلّ و قد بلغت و نصحت فاقبلوا نصیحتی و السلام علی من اتبع الھدی۔

اب میں تجھے اس خدا کی طرف بلاتا ہوں جو یگانہ و یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کی فرمانبرداری پر موالات کی دعوت دیتا ہوں اور یہ کہ تو میری پیروی کرے اور اس (مقدس تعلیم) پر ایمان لائے، جسے میں لے کر آیا۔ میں اللہ کا رسول ہوں۔ تجھے اور تیرے لشکروں کو خدائے عزّوجل کی طرف بلاتا ہوں۔ میں نے پیغام حق پہنچا دیا۔ نصیحت کر دی۔ میری نصیحت قبول کر۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کا پیرو ہو۔

اس مکتوب کی بعض نقلوں میں کچھ اور عبارت بھی ہے۔ مثلاً حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا گیا ہے:

---

[1] مُہر کی شکل یہ تھی (اللہ / رسول / محمد)

[2] محرم ۷ھ کی ابتدا ۱۱۔ مئی ۶۲۸ء سے ہوئی۔ قاضی سلیمان مرحوم منصورپوری نے "رحمۃ للعالمین" میں لکھا ہے کہ ۱ محرم ۷ھ کے ماہ محرم کی پہلی تاریخ تھی" یعنی ۱۱۔ مئی ۶۲۸ء (ص ۱۹۶) اور حوالہ "خصائص الکبریٰ" جلد دوم (بہ روایت ابن ابی شیبہ) کا دیا ہے۔ میں یہ کتاب نہ دیکھ سکا۔

میں نے تمہارے پاس اپنے چچیرے بھائی جعفرؓ کو بھیجا ہے، جن کے ہمراہ اور مسلمان بھی ہیں جب وہ تیرے پاس آئیں تو ان کی مہمانداری کر۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ عبارت محرم ۶ھ کے مکتوب گرامی کی نہیں ہو سکتی کیونکہ حضرت جعفرؓ اس سے کم و بیش پندرہ سال پیشتر حبش جا چکے تھے۔ اتنی مدت کے بعد ان کی مہمانداری کے لیے کچھ فرمانے کا کون سا محل تھا؟ نیز حضرت جعفرؓ اور دوسرے مہاجرین حبش کے متعلق رسول اللہ صلعم کے پاس برابر اطلاعات پہنچتی رہتی ہوں گی۔

پھر حضور صلعم کے دعوتی مکتوب کا جو عکس شائع ہوا ہے اس میں یہ عبارت موجود نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ حضرت جعفرؓ ہجرت کر کے حبش گئے ہوں تو رسول اللہ صلعم نے نجاشی کے نام کوئی مکتوب عنایت فرمایا ہو اور اس میں مندرجہ بالا الفاظ شامل ہوں۔ نجاشی کے جوابی معروضے سے بھی اس امر کی توثیق ہوتی ہے۔

نجاشی کا جواب نجاشی نے بے تامل اسلام قبول کر لیا اور اپنے جوابی معروضے میں لکھا کہ یا رسول اللہ آپ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے، میں زمین و آسمان کے پروردگار کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ (حضرت مسیحؑ) رتی بھر بھی اس سے زیادہ نہیں۔ آپ کے عزاد بھائی اور ان کے رفیق ہمارے مقرب ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ میں نے ان تمام باتوں کو بخوبی سمجھ لیا ہے جو آپ نے ہم تک پہنچائیں۔ اللہ رب العلمین کے لیے اسلام قبول کیا اور آپ کے عزاد بھائی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اگرچہ بظاہر قبول اسلام اور بیعت کا یہ معاملہ خلوت میں پیش آیا تھا، لیکن ایسی خبریں چھپی کیونکر رہ سکتی ہیں چنانچہ مختلف اصحاب نے لکھا ہے کہ نجاشی کے قبول اسلام پر پادری بگڑ بیٹھے اور انھوں نے ایک بڑے مخالفانہ مظاہرے کا انتظام کر دیا، جس میں اصحمہ نجاشی کو حسن تدبیر سے کام لینا پڑا۔ یعنی اسلام پر وہ قائم و استوار رہا مگر پادریوں کو اطمینان دلا کر مظاہرہ ختم کرا دیا۔ چونکہ حبش کی کوئی مستند یا غیر مستند تاریخ پیش نظر نہیں۔ اس لیے تفصیلاً کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اصحمہ نجاشی کے اسلام کا سب کو یقین تھا جس کی نماز جنازہ رسول اللہ صلعم نے غائبانہ ادا فرمائی تھی۔

ضروری تصریح بعض اہل علم کا بیان ہے کہ عمروؓ بن امیہ ضمری کے ہاتھ جو دعوت نامۂ اسلام حبش بھیجا گیا تھا وہ اصحمہ نجاشی کے نام نہ تھا بلکہ دوسرے نجاشی کے نام تھا جس نے اسلام قبول نہ کیا۔

اغلب ہے اصحمہ کی وفات کے بعد نئے نجاشی کے نام بھی دعوت نامۂ اسلام عمروؓ بن امیہ ضمری ہی کے ہاتھ بھیجا گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے قبول اسلام سے انکار کر دیا ہو، لیکن اس سے اصحمہ کے نام دعوت نامۂ اسلام بھیجنے یا اس کے اسلام لانے کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ

۱۔ اصل دعوت نامے میں اصحمہ بن ابجر کا نام موجود ہے۔

۲۔ اس کے جواب میں قبول اسلام کا جو عریضہ بھیجا گیا، وہ اصحمہ ہی کی طرف سے ہے۔

۳۔ یہ معلوم ہے کہ اصحمہ کی وفات پر غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی جیسا کہ صحیح بخاری کی کتاب "الجنائز" میں مذکور ہے اور شارحین بخاری اسے ۹ھ یا ۸ھ کا واقعہ قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا یہ مان لینے میں کوئی امر مانع نہیں کہ محرم ۷ھ کا دعوت نامہ اصحمہ ہی کے نام تھا۔

دوسرا مکتوب گرامی دعوت نامۂ اسلام کے علاوہ رسول اللہ صلعم نے ایک اور مکتوب بھی عمروؓ بن امیہ ضمری کے حوالے کیا تھا جو شاہِ حبش ہی کے نام تھا۔ اس میں دو ضروری باتوں کا ذکر تھا،

۱۔ ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان سے نکاح کا پیغام۔

۲۔ مہاجرین کو واپس بھیج دینے کا انتظام۔

ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان کا نکاح عبیداللہ بن جحش اسدی سے ہوا تھا، جو عبداللہ بن جحش جیسے فدائی اسلام کا بھائی تھا۔ ام حبیبہؓ اور عبیداللہ دونوں نے اسلام کی خاطر حبش ہجرت کی۔ حبش پہنچ کر عبیداللہ نے عیسائیت قبول کر لی اور ام حبیبہؓ ان سے الگ ہو گئیں۔ کچھ عرصہ بعد عبیداللہ فوت ہو گیا اور ام حبیبہؓ جو دینِ حق پر قائم واستوار تھیں، بظاہر بے رفیق و مددگار رہ گئیں۔ رسول اللہ صلعم کا مکتوب گرامی نجاشی کو ملا تو اس نے ایک لونڈی کے ذریعے سے یہ پیغام ام حبیبہؓ تک پہنچایا۔ انھوں نے خالد بن سعید اموی کو وکیل مقرر فرما دیا اور پیغامِ نکاح لانے والی لونڈی کو چاندی کے دو کنگن اور انگوٹھیاں دیں۔ شام کے وقت نجاشی نے جعفرؓ بن ابی طالب اور دوسرے مسلمانوں کو جمع کر کے خود نکاح پڑھایا اور رسول اللہ صلعم کی طرف سے مہر کے چار سو دینار خود خالد بن سعید کے حوالے کیے[1] جو ام المومنین کے وکیل تھے۔ یہ رقم ام المومنین کو ملی تو انھوں نے پچاس دینار مزید اس لونڈی کو دیے جو نکاح کا پیغام لے کر آئی تھی۔ یوں رملہؓ بنت ابوسفیان جو اپنی صاحبزادی کی وجہ سے ام حبیبہؓ کہلائیں، ام المومنین کے زمرۂ مقدسہ میں داخل ہو گئیں۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ نکاح ۶ھ میں ہوا لیکن بظاہر یہ حساب کا اختلاف ہے۔ جس کا ذکر کئی مرتبہ آ چکا ہے۔ یعنی جو لوگ سنین ہجرت کا آغاز ربیع الاول سے کرتے ہیں ان کے نزدیک یہ واقعہ ۶ھ ہی کا ہے۔ حقیقۃً یہ نکاح عام طریق حساب کے مطابق ۷ھ ہی میں ہوا تھا۔

نکاح کے بعد دعوت ولیمہ کا انتظام بھی نجاشی ہی نے کیا تھا۔

---

[1] بعض روایتوں میں نو سو دینار کا ذکر ہے۔ بعض نے چار ہزار دینار بتائے ہیں۔ ابوداؤد میں چار ہزار درم منقول ہیں۔ زہری کی روایت میں چالیس اوقیہ کا ذکر ہے۔ تفصیل نہیں بتائی گئی۔ اگر چالیس اوقیہ چاندی فرض کی جائے تو کل رقم سولہ سو درم بنے گی۔ لیکن صحیح روایت چار سو دینار کی ہے (سیرۃ النبی جلد دوم ص ۱۶ ۴۔ حاشیہ)

مہاجرین کی واپسی کا انتظام

نجاشی نے مہاجرین کی واپسی کے لیے بھی کشتیوں کا انتظام کر دیا۔ ام المومنین ام حبیبہؓ بھی ان کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچیں۔ بلکہ چند کشتیوں میں نجاشی نے اپنے بیٹے ارہا کو بھی حبشی سپاہیوں کے ساتھ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں بھیجا۔ ان میں سے بعض ڈوب گئیں۔ بعض صحیح سلامت منزل مقصود پر پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ جب حبش کی یہ سفارت مدینہ آئی تو ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی:

یہ حبشی سپاہی بعض جنگوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک رہے۔ سمہودی نے تاریخ مدینہ[1] میں یہاں تک لکھا ہے کہ نجاشی کے بیٹے نے حضرت علیؓ سے موالات یا بھائی چارہ اختیار کر لیا اور حبشہ واپس جا کر تخت نشین ہونے سے انکار کر دیا.... آنحضرت صلعم نے بھی نجاشی کو کچھ تحفے بھیجے مگر اس عرصے میں اس نجاشی[2] کا انتقال ہو گیا۔ امام مسلم لکھتے ہیں کہ اس کے جانشین کو آنحضرتؐ نے ایک تبلیغی خط لکھا مگر اس کا انجام معلوم نہیں۔[3]

یہی وہ مکتوب ہے جس کا تعلق صحیح مسلم کی حدیث انسؓ سے ہے۔[4] (مولف)

---

[1] "وفا الوفا" [2] اصحمہ بن ابجر [3] عربی حبشی تعلقات (شائع کردہ ادارہ ترقی تعلیم اسلامی حیدر آباد دکن) صفحہ ۱۵۔ [4] یعنی صحیح مسلم کی حدیث عن انسؓ میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے شاہ حبش کو دعوت نامہ اسلام بھیجا مگر اس نے اسلام قبول نہ کیا۔ یہ اصحمہ بن ابجر نہ تھا بلکہ اس کا جانشین تھا۔ حدیث انسؓ میں اسی کا ذکر ہے۔

باب ۵۵

سلاطین و رؤسا کو دعوتِ اسلام

—(۲)—

قیصر روم کے نام

دوسرا دعوت نامہ ہرقل قیصر روم کے نام تھا۔ اس کے لیے دحیہ بن خلیفۃ الکلبی کو قاصد یا سفیر مقرر کیا گیا۔ رسول اللہ صلعم کے عام مکاتیب گرامی کی طرح یہ مکتوب بھی ہر تکلف سے پاک و مبرّا اور صرف حرف مطلب پر مشتمل تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

انی ادعوك بدعاية الاسلام اسلم تسلم، یوتك الله اجرا مرتين فان توليت فان عليك اثم الاريسيين: ديا اهل الكتب تعالوا الى كلمة سواء بيننا و بينكم الا نعبد الا الله و لا نشرك به شيئا و لا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون۔

میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں اسلام قبول کر لے۔ تمام آفتوں سے محفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھے دوگونہ اجر عطا فرمائے گا اور اگر روگردانی کی تو تیری پوری رعایا کا وبال تیری گردن پر رہے گا۔" اے اہل کتاب (اختلاف و نزع کی ساری باتیں چھوڑ کر) اس بات پر آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں طور پر مسلّم ہے یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کسی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی انسان سے ایسے برتاؤ کا روادار نہ ہو گویا خدا کو چھوڑ کر اسے پروردگار بنا لیا۔ پھر اگر اس سے روگردانی کرو تو گواہ رہنا کہ ہم خدا کے فرمانبردار بندے ہیں یعنی اسی کو ماننے والے ہیں۔

دوہرے اجر کا مطلب ہے کہ ایک خود اسلام قبول کرنے کا اجر، دوسرے رعایا کے لیے قبول اسلام کا دروازہ کھول دینے کا اجر۔ اور روگردانی کی حالت میں اپنی محرومی کے علاوہ رعایا کے وبال سے بھی مفر نہ ہوگا۔ اس دعوت میں توحید پر اشتراک عمل کا بلاوا ہے۔ یہ سورۂ آل عمران کی چونسٹھویں آیت ہے۔

رسول اللہ صلعم نے دحیہؓ کو تاکید فرما دی تھی کہ یہ مکتوب حاکم بصریٰ کے ذریعے سے پیش کیا جائے۔ دحیہؓ نے اسی ہدایت پر عمل کیا۔ قیصر اس زمانے میں بیت المقدس آیا ہُوا تھا۔ دحیہؓ نے مکتوب گرامی حارث غسانی حاکم بُصریٰ کی وساطت سے قیصر کے پاس بھجوا دیا۔ ہرقل اس سے بہت متاثر ہُوا۔ جو لوگ عرب کے حالات سے واقف تھے، ان سے بھی مختلف باتیں پُوچھیں۔ اتفاق سے وہاں ابو سفیان ایک قافلے کے ساتھ تجارت کے لیے پہنچا ہُوا تھا۔

قیصر نے ابوسفیان سے گفتگو میں بہت سے سوالات کیے۔ اس وقت تک ابوسفیان قریش مکہ کا لیڈر تھا۔ اس کے باوجود اسے کوئی ایسی بات نہ مل سکی، جسے رسول اللہ صلعم کے خلاف بطور الزام پیش کر سکتا۔ قیصر کو بظاہر حضور صلعم کی صداقت کا پختہ یقین ہوگیا۔

پھر اس نے رومیہ کے حاکم اور اسقف ضغاطر کے نام ایک خط دحیہؓ کو دے کر بھیجا کہ اس کی رائے معلوم کرے۔ ضغاطر کے نام ایک مکتوب خود رسول اللہ صلعم نے بھی دیا تھا۔ ضغاطر نے رسول اللہ صلعم کی رسالت کی تصدیق کی۔ لیکن قیصر پادریوں کی مخالفت سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اسلام قبول کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔

ضغاطر کی شہادت

ضغاطر کے پاس قیصر کی طرف سے مکتوب رسالت یا اس کا مضمون پہنچ چکا تھا۔ خود دحیہؓ نے بھی ضغاطر کے نام کا مکتوب اس کے حوالے کر دیا۔ وہ راست باز، حق شناس اور حق گو آدمی تھا۔ عبادت کے وقت کلیسا میں پہنچ کر ایک پُرزور تقریر کی جس میں کہا:

رومیو! ہمارے پاس احمد رسول اللہ (صلعم) کا مکتوب آیا ہے، جس میں ہمیں اللہ تعالیٰ کے دین حق کی دعوت دی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور احمد خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

اس سلسلے میں اور باتیں بھی کہی ہوں گی جو کسی کتاب میں محفوظ نہ ہو سکیں اور ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ سامعین یکایک جوش میں آ گئے اور ضغاطر کو مار مار کر شہید کر ڈالا۔

مژدۂ وصل تو کو، کز سر جاں برخیزم
طائر قدسم و از دام جہاں برخیزم

خسرو پرویز شاہنشاہ ایران کے نام

تیسرا دعوت نامہ ایران کے مشہور شاہنشاہ خسرو پرویز کے نام تھا، جو فرہاد و شیریں کے سلسلے میں ہمارے فارسی اور اردو ادبیات کی ایک معروف شخصیت بنا ہوا ہے۔ یہ بھی دوسرے دعوت ناموں کی طرح نہایت سادہ اور مختصر تھا۔ اسے ذیل میں من و عن درج کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس، سلامٌ علی من اتبع الھدیٰ و اٰمن باللہ و رسولہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول	اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ اللہ کے رسول محمد (صلعم) کی طرف سے کسریٰ کے نام جو ایران کا حکمران ہے۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، جسے پورے عالم

اللّٰہ الی الناس کافۃ لینذر من کان حیا اسلم تسلم فان ابیت فعلیك اثم المجوس۔

انسانیت کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ جو لوگ زندہ ہیں انھیں بدعملیوں کے نتائج سے ڈرا دیا جائے۔ اسلام قبول کر لے تمام آفات سے محفوظ ہو جائے گا۔ اگر انکار کرے تو پوری مجوسی قوم یعنی اس وقت کے اہل ایران کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

یہ دعوت نامہ لے جانے کے لیے عبداللہؓ بن حذافہ سہمی مقرر ہوئے۔ رسول اللہ صلعم نے انھیں تاکید فرما دی تھی کہ دعوت نامہ حاکم بحرینؓ[1] کے پاس لے جائیں اور اس کی وساطت سے کسریٰ کے دربار میں پیش کریں۔ عبداللہؓ بن حذافہ نے اس ہدایت پر حرفاً حرفاً عمل کیا۔ جب یہ خسرو کے دربار میں پیش ہوا تو وہ محض رسول اللہ صلعم کا اسم گرامی اپنے نام سے پہلے دیکھ کر مشتعل ہو گیا، کیونکہ ساسانیوں کے مقررہ آداب کے مطابق ساسانی شاہنشاہ کا نام ہر حال میں پہلے آنا چاہیے تھا۔ عربوں کے طریق مکتوب نگاری کے مطابق کاتب اپنا نام پہلے اور مکتوب الیہ کا نام بعد میں لکھتا تھا اور یہی طبعی و فطری طریق تھا۔

پرویز کی سیہ نصیبی

پھر یہ مئی ۶۲۸ء کا واقعہ ہے۔ جب پرویز رومیوں پر غیر معمولی فتوحات کے بعد پے درپے شکستیں کھاتا ہوا اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لیے شدید تشویشات میں مبتلا تھا۔ ۱۲۔ دسمبر ۶۲۷ء کو نینوی میں آخری خوفناک شکست نے اس پر اک گونہ وحشت کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات ہر فرد کے احساسات میں غیر معمولی ذکاوت پیدا کر دیتے ہیں اور وہ کسی بھی معاملے کو معمولات و مروجات کے رنگ میں دیکھنے کے قابل نہیں رہتا بلکہ ہر معاملے کو اس رنگ میں دیکھتا ہے، گویا جو کچھ اس کے سامنے آ رہا ہے، وہ اس کی شکستوں، ہزیمتوں اور بے چارگیوں کے ہجوم میں دل پر چرکے لگانے کے لیے باہتمام خاص تیار کیا جا رہا ہے۔

پرویز نے جوش غیظ و اشتعال میں نامہ مبارک چاک کر ڈالا۔ رسول اللہ صلعم کو یہ اطلاع ملی تو فرمایا: خدا اس کے اقتدار سلطنت کو پارہ پارہ کرے۔ یہی ہوا۔ پہلے پرویز کا ورق تقدیر ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ پھر وہ جس سلطنت کے عزّ و دو

---

[1] بحرین سے مراد وہ جزیرے نہیں، جو خلیج فارس میں قطر اور الحسا کے درمیان سمندر میں واقع ہیں اور جنھیں آج کل بحرین کہتے ہیں، بلکہ اس سے مراد دولت سعودیہ کا وہ علاقہ ہے، جو ساحل خلیج فارس پر واقع تھا۔ موجودہ صوبہ الحسا اسی کا ایک حصہ تھا۔ اب یہ نام جزیروں کے لیے مخصوص ہو گیا۔ بحرین رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں ساسانیوں کا باج گزار تھا۔

شوکت میں نامہ مبارک چاک کرنے کی جسارت پر آمادہ ہوا تھا وہ تختۂ قرطاس کی طرح پارہ پارہ کر دی گئی۔

نامہ مبارک چاک کرنے کے بعد پرویز نے یمن کے نائب الحکومت باذان کو حکم دیا کہ حجاز کے مدعی نبوت کو ہمارے پاس بھیجا جائے۔ باذان نے دو آدمی ایک خط دے کر مدینہ منورہ بھیجے، جن میں سے ایک کا نام تہرمانہ تھا۔ حضور صلعم خط لے کر مسکرائے اور فرمایا، کل مجھ سے جواب لینا۔ وہ دوسرے روز حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

"اپنے صاحب (باذان) کو یہ خبر پہنچا دو کہ اس کے رب (پرویز) کو میرے رب (اللہ تعالیٰ) نے قتل کر دیا۔" یہ واقعہ سہ شنبہ کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ (مطابق ۱۴ ستمبر ۶۲۸ء) کو پیش آیا۔ رات کی سات گھڑیاں گزری تھیں[1] (یعنی دو گھنٹے اور اڑتالیس منٹ)

جب کسی قوم پر بدبختی کا دور آتا ہے تو وہ اپنے ہاتھوں اپنا سب کچھ برباد کر ڈالتی ہے۔ شیرویہ نے باپ یعنی خسرو کو اس لیے قتل کر دیا کہ وہ شکستیں کھا رہا تھا اور صلح کے لیے تیار نہ تھا۔ شیرویہ نے بادشاہ بنتے ہی رومیوں کی شرطیں مان کر صلح کر لی۔ شیرویہ نے باپ کو اس لیے قتل کیا ہوگا کہ عسکری اور کشوری سب لوگ اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ پھر شیرویہ نے خاندان کے ایک ایک مرد کو چن چن کر قتل کیا تاکہ کوئی مدعی سلطنت باقی نہ رہے۔ صرف وہی ایک دو بچے جو اس کی دسترس سے باہر تھے۔ لیکن خود بھی چھ ماہ کے اندر اندر گناہوں کا گراں بار پشتارہ اٹھا کر اس عالم میں پہنچ گیا، جہاں محاسبۂ نیک و بد سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں۔

والیٔ مصر — چوتھا دعوت نامہ مُقَوقِس[2] کے نام تھا جو اسقف اعظم کے منصب پر فائز تھا اور قیصر نے ۶۳۱ء میں اسے ملکی نظم و نسق کے لیے اپنی طرف سے نمایندہ بنا دیا تھا۔ اس دعوت نامے کے لیے حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے اپنے آپ کو پیش کیا اور حضور صلعم نے فرمایا: "بارك الله فيك يا حاطب" (حاطب خدا تجھے برکت سے نوازے) اس دعوت نامے کی عبارت بھی وہی تھی جو قیصر روم کے دعوت نامے کی تھی اور وہ اوپر نقل ہو چکا ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد (جلد اول ص ۲۶۰) میں نے طبقات ہی کا بیان پیش نظر رکھا۔ لیکن جو آدمی مدینہ منورہ بھیجے گئے، ان کے ناموں میں خاصا اختلاف ہے۔ مثلاً سیرۃ النبیؐ میں "بابویہ" اور "خرخسرہ" نام درج ہیں (جلد اول ص ۴۳۲) یہی نام "بلاغ مبین" میں آئے ہیں۔ نیز لکھا ہے انھیں دعوت اسلام دی۔ لبیں ترشوائیں، داڑھیاں بڑھوائیں اور پندرہ روز کے بعد جواب دیا (ص ۱۳۶-۱۳۷) "رحمۃ للعالمین" میں ہے کہ باذان نے ایک فوجی دستہ مامور کیا جس کا افسر "خرخسرو" تھا۔ ایک ملکی افسر ساتھ روانہ کیا جس کا نام "بانویہ" تھا (جلد اول ص ۲۰۹) [2] مقوقس، کسریٰ اور قیصر کی طرح لقب ہے۔ اس کا نام بعض انگریزی تاریخوں میں سائرس ہے۔ بعض مسلم مصنفین نے "جریج بن بنی" لکھا ہے (رحمۃ للعالمین ص ۲۰۳ نیز "بلاغ مبین" ص ۱۴۷ بہ حوالہ اسد الغابہ) بعض نے اسے نسلاً رومی لکھا ہے لیکن کہا ہے کہ اس کی ماں قبطی تھی، آگے چل کر اس نے عمروؓ بن العاص فاتح مصر سے جو شرطیں طے کیں ان سے دل پر یہی اثر پڑتا ہے کہ وہ قبطی تھا اور رومیوں کے ساتھ اسے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔

سیوطی نے "حسن المحاضرہ" میں لکھا ہے حاطبؓ سکندریہ پہنچے تو مقوقس کشتی پر دریائے نیل میں سیر کر رہا تھا۔ حاطبؓ نے بھی ایک کشتی کرایے پرے لی تاکہ نامۂ مبارک جلد سے جلد مقوقس کے پاس پہنچ جائے۔ مقوقس نے پوچھا کہ اگر تمھارا نبی سچا ہے تو خدا سے یہ دعا کیوں نہیں مانگتا کہ اسے وطن سے نکالنے والے مخالفین تباہ ہو جائیں؟

حاطبؓ نے بے توقف جواب دیا کہ آپ کے عقیدے کے مطابق یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی اور سولی ہی پر ان کی موت واقع ہوئی۔ انھوں نے خدا سے دعا مانگ کر دشمنوں کو ہلاک کیوں نہ کرا دیا؟

مقوقس نے جواب دیا کہ بے شک تو خود بھی دانا ہے، اور جس کا تو سفیر ہے وہ بھی دانا اور حکیم ہے۔

پھر نامۂ مبارک کو ہاتھی دانت کی دو تختیوں کے درمیان رکھوا کر سرکاری خزانے میں محفوظ کرا دیا۔ رسول اللہ صلعم کے لیے ایک عریضہ بڑے اچھے انداز میں لکھا۔ اس میں کہا کہ یہ تو مجھے علم تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے لیکن میرا گمان تھا، وہ شام میں ظاہر ہوگا۔ ساتھ ہی حضور صلعم کی خدمت میں دو معزز قبطی لڑکیاں، قیمتی کپڑا اور ایک خچر بھیجا۔ یہی خچر دلدل کے نام سے مشہور ہے جو رسول اللہ صلعم کے بعد حضرت علیؓ کے پاس رہا۔[1]

لڑکیوں میں سے ایک حضرت ماریہؓ تھیں، جو رسول اللہ صلعم کے صاحبزادے ابراہیمؑ کی والدہ تھیں، دوسری سیرینؓ جنھیں حضور صلعم نے حسانؓ کے سپرد فرما دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دلدل جیسا خچر اس زمانے میں عرب کے اندر کوئی نہ تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اسے تحفۂ خاص کے طور پر بھیجا گیا۔

حاکم یمامہ

پانچواں دعوت نامہ ہوذہ بن علی حاکم یمامہ کے نام تھا۔ یہ سلیط بن قیس بن عمرو العامری کے ذریعے سے بھیجا گیا تھا۔ یمامہ آجکل دولت سعودیہ کا حصہ ہے۔ اس کے حدود اربعہ یہ تھے: شمال میں نجد، مغرب میں حجاز و یمن، جنوب میں احقاف و ربع الخالی، مشرق میں عمان، بحرین اور خلیج فارس۔ بحرین و یمن کی طرح یمامہ بھی ساسانیوں کے زیر اثر آ گیا تھا۔ لیکن ہوذہ اور اس کے ہم قوم عرب تھے۔ ہوذہ کے نام جو دعوت نامہ بھیجا گیا، وہ بہت مختصر تھا۔ آغاز میں فرمایا گیا تھا کہ دین اسلام عرب و عجم میں ہر جگہ پہنچے گا اور غالب رہے گا۔ پھر وہی دو لفظ تھے جو دعوت ناموں میں عموماً آئے یعنی اسلم، تسلم۔ اسلام قبول کر لے تو محفوظ رہے گا۔

ہوذہ نے نامۂ مبارک بھی پڑھا پھر حضور صلعم کے سفیر کی ایک نہایت پُر تاثیر تقریر بھی سُنی۔ یعنی یہ کہ تو ایک بڑی قوم کا سردار ہے، تیری توجہ سے تیری قوم ایمان کی سعادت کبریٰ حاصل کر سکتی ہے۔ میں تجھے بہترین چیز یعنی اسلام قبول کر لینے کا مشورہ دیتا ہوں اور بدترین چیز یعنی کفر سے بچاتا ہوں۔ اللہ کی عبادت کے لیے کہتا ہوں اور شیطان کی

---

[1] بعض روایتوں میں ایک غلام اور ہزار مثقال سونے وغیرہ کا بھی ذکر ہے لیکن مقوقس کے خط سے صرف ان تحائف کی توثیق ہوتی ہے جو متن میں درج ہیں۔

عبادت سے روکتا ہوں۔

لیکن ہوذہ اسلام کی دولت سرمدی سے محروم رہا اور حضور صلعم فتح مکہ اور غزوۂ حنین و طائف سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے تو اطلاع ملی کہ ہوذہ فوت ہو گیا ہے۔ اس کی قوم کے ایک وفد نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا، جس کا ذکر موقع پر آئے گا۔

حارث بن ابی شمر غسانی

چھٹا دعوت نامہ شجاعؓ بن وھب اسدی کے ذریعے سے حارث بن ابی شمر غسانی کو بھیجا گیا تھا۔ حارث کا مرکز دمشق تھا، مگر جب شجاعؓ پہنچے تو حارث سخت مصروف تھا، کیونکہ قیصر ہرقل بیت المقدس آرہا تھا اور اس کے لیے جا بجا رسد اور استقبال کے انتظامات حارث ہی کے ذمے تھے۔ شجاعؓ نے حارث کے ایک حاجب سے روابط استوار کر لیے۔ اس نے رسول اللہ صلعم کے مفصل حالات سن کر اسلام قبول کر لیا۔ پھر دمشق کے ایک دربار میں نامۂ مبارک پیش ہوا۔ اس میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ پر ایمان لے آ، وہ یگانہ و یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ تیرا ملک تیرے پاس محفوظ رہے گا۔

حارث نے کہا کہ میرا ملک مجھ سے کون چھین سکتا ہے؟ پھر قیصر کو لکھا کہ مجھے عرب پر حملہ کی اجازت دی جائے۔ نیز گھوڑوں کی نعل بندی کا حکم دے دیا۔ مگر قیصر کی طرف سے جواب آیا کہ بالفعل یہ ارادہ ترک کر دو اور بیت المقدس پہنچو۔ پھر حارث نے ایک سو مثقال[1] سونا شجاعؓ بن وھب کو دینے کا حکم صادر کیا۔ حاجب نے جو خفیہ خفیہ مسلمان ہو چکا تھا، زادِ راہ اور پارچے دیے۔

حارث کی وفات ۸ھ میں ہوئی یعنی جس سال مکہ مکرمہ فتح ہوا۔

مزید قاصد

محرم ۷ھ میں ایک ہی وقت یہ چھ قاصد بھیجے گئے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مثلاً:

۱۔ عبد اللہؓ بن حذافہ جو خسرو پرویز کے نام کا دعوت نامہ لے کر گئے تھے، ان کے ہاتھ ایک دعوت نامہ ہرمزان کے نام بھی بھیجا گیا تھا جو اس علاقے کا حکمران تھا جسے آجکل خوزستان کہتے ہیں۔ اہواز، سوس، رام ہرمز اور تستر یا شُشتر[2] مشہور شہر تھے غالباً اسی کو ایک زمانے میں "سوسیانہ" کہتے تھے۔ یہ نامہ گرامی بھی بہت مختصر تھا۔ ہرمزان نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اسلام قبول کر لیا۔

۲۔ ایک دعوت نامہ علاءؓ بن حضرمی کے ہاتھ منذر بن ساویٰ حاکم بحرین کے نام بھیجا گیا تھا۔ یہ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ منذر بن ساویٰ اور اس کے بہت سے ہم قوموں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضور صلعم نے علاءؓ بن حضرمی کو زکوٰۃ و

---

[1] مثقال ساڑھے چار ماشے کا ہوتا تھا۔ گویا ایک سو مثقال سونا تقریباً اڑتیس تولے ہوا۔

[2] عرب "تستر" کہتے ہیں اور ایرانی "ششتر"۔

صدقات اور غیر مسلموں سے جزیے کی تحصیل کے لیے مقرر فرما دیا۔ ایک نامہ مبارک بعد میں ابوہریرہؓ کے ہاتھ بھی بھیجا گیا تھا۔

۳۔ ایک دعوت نامہ جبلہ بن ایہم غسانی کو بھیجا گیا تھا۔ اس نے بہ رضا و رغبت اسلام قبول کر لیا۔ سنہ ۱۴ھ (اوائل ۶۳۶ء) میں وہ حج کے موقع پر مکہ مکرمہ پہنچا۔ طواف میں جبلہ کی چادر کا ایک گوشہ اتفاقیہ ایک بدوی عرب کے پاؤں تلے دب گیا۔ جبلہ نے بے تامل بدوی کے طمانچہ رسید کیا۔ معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا تو فیصلہ ہوا کہ جبلہ کو بدلہ دینا ہوگا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شہزادے کی عزت عامی شخص کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی۔ جب معلوم ہوا کہ قانون شریعت کی نگاہ میں شاہ و گدا کے درمیان کوئی تمیز نہیں تو وہ رات کو چھپ کر نکلا اور شام پہنچا اور وہاں سے مسیحی بن کر قسطنطنیہ چلا گیا مگر تمام عمر اس حرکت پر حسرت و افسوس کے آنسو بہاتا رہا۔

۴۔ ایک دعوت نامہ جیفر بن جلندی حاکم عمان کے نام ذی قعدہ ۸ھ (فروری ۶۳۰ء) میں بھیجا گیا۔ یہ عمروؓ بن العاص لے گئے تھے۔ جیفر کا بھائی عبد بہت صالح اور نیک تھا۔ پھر دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا، اور اسلامی احکام جاری کر دیے۔ اس میں نیکی اور سعادت کا زیادہ تر حصہ دار عبد ہی تھا۔

۵۔ ایک دعوت نامہ مسعودؓ بن سعد کے ہاتھ فروہؓ بن عمرو الجزامی کے نام بھیجا گیا جو قیصر روم کی طرف سے معان[1] کا گورنر تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ ایک گھوڑا، ایک سفید خچر، ایک عربی گدھا اور عمدہ پارچات بطور تحفہ بھیجے ان میں ایک عبا سندس کی تھی، جس کا حاشیہ سنہری تاروں سے مزین تھا۔ اس پر پادریوں میں شور برپا ہوا۔ قیصر نے فروہؓ کو اسلام سے منحرف کرنا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ لہذا پہلے اس مرحوم کو قید کیا، پھر فلسطین کے ایک چشمے کے پاس جس کا نام عفرا تھا اسے قتل کرا دیا۔ فروہؓ نے راہِ حق میں یہ تمام آفتیں صابرانہ برداشت کر لیں۔

دین حق پر فروہؓ کے ثبات و استواری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سزائے موت کے وقت یہ شعر اس کی زبان پر تھا:

بلّغ سراة المسلمین بانّنی — مسلمان سرداروں تک میری یہ بات پہنچا دو

سلمٌ لربّی اعظمی و مقامی — کہ پروردگار کی راہ میں میرا جسم اور میری عزت نثار رہیں۔

متفرق دعوت نامے

ان کے علاوہ بے شمار دعوت نامے تھے، جن کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہیں، ان کے صرف نام لکھے جاتے ہیں:

---

[1] معان آجکل اردن میں شامل ہے۔

۱۔ ہلال بن امیہ (بحرین کا ایک رئیس)

۲۔ امیر بصریٰ۔ یہی نامۂ گرامی تھا جسے پہنچانے کے لیے حارث بن عمیر تجویز ہوئے تھے مگر شرحبیل حاکم موتہ نے انھیں راستے ہی میں شہید کرا دیا۔ اسی وجہ سے موتہ کی جنگ پیش آئی۔

۳۔ اکیدر حاکم دومۃ الجندل

۴۔ قبیلہ بنی کلب اور اس کے سردار اصبغ بن عمرو۔

۵۔ ذوکلاع اور ذوعمرو کے قبیلے کا خاندان۔

۶۔ حکمرانان حمیر کے افراد و خاندان۔

۷۔ سرداران حضرموت۔

۸۔ سردار ازد

۹۔ الیخت سردار حجر۔

۱۰۔ بنی حارثہ۔

۱۱۔ بنی عذرہ۔

۱۲۔ شاہ سمادہ۔

۱۳۔ امرائے بنی وائل۔

۱۴۔ بنی زہیر

۱۵۔ مختلف سرداران عرب جن کی تعداد چوالیس اور پچاس کے درمیان ہے۔

یہ ان دعوت ناموں کی سرسری کیفیت ہے جو مختلف روایتوں میں محفوظ رہ گئے۔ حقیقی تعداد اور کیفیت کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے؟ (مولف)

غزوۂ خیبر

باب ۵۶

غزوۂ خیبر

خیبر خیبر مدینہ منورہ کے شمال میں کم و بیش ایک سو ساٹھ کلو میٹر یا تقریباً ایک سو میل کے فاصلے پر ہے۔ طبقات ابن سعد میں یہ فاصلہ آٹھ برید یا بارہ میل فی برید کے لحاظ سے چھیانوے میل بتایا گیا ہے۔ یہاں ہر طرف لاوے کی جلی ہوئی پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان سات وادیاں ہیں۔ ان وادیوں میں ایک سو کے قریب چشمے تھے۔ ان کے علاوہ کنوئیں بھی تھے۔ پورا خطہ نہایت سرسبز و شاداب تھا، جہاں کھجور، انگور، ترنج، لیمو اور انجیر کے باغات تھے۔ فصلیں بھی خوب ہوتی تھیں۔ سفرنامہ "ارض القرآن" میں ہے:

> خیبر کی وسعت اور شادابی اس سے کہیں زیادہ تھی، جس کا ہم اپنے ذہن میں تصور رکھتے تھے۔ عرب کی سرزمین میں یہ عجیب بات ہے کہ جہاں لاوے کی جلی ہوئی پہاڑیاں (حرّات) زیادہ ہیں، وہاں نخلستان اتنے ہی گھنے ہیں۔ مدینہ طیبہ میں بھی جہاں دو طرفوں میں لاوے کی جلی ہوئی پہاڑیاں ہیں، وہاں کھجور کے باغ بکثرت پائے جاتے ہیں۔[۲]

فتنہ انگیزی کا سرچشمہ یہودی خیبر میں بھی غالباً اسی زمانے میں آبسے تھے جب انھیں فلسطین سے نکالا گیا تھا ان کی آبادیاں فدک، وادی القریٰ اور تیما میں بھی تھیں۔ تین قبیلے یثرب میں تھے، جن کی سرگزشت اوپر بیان کی جا چکی ہے، لیکن ان کی قوت کا سب سے بڑا مرکز خیبر ہی تھا۔ بنو نضیر بھی مدینہ منورہ سے نکل کر خیبر ہی میں آباد ہوئے اور انھوں نے وہاں ممتاز ترین حیثیت حاصل کر لی۔ پہلے حیئ بن اخطب کو رئیس مان لیا گیا تھا وہ مارا گیا تو ابو رافع بن ابی الحقیق ان کا رئیس بن گیا۔ یہی یہودی تھے جنھوں نے ۵ھ میں غطفان، قریش وغیرہ کو برانگیختہ کر کے ایک زبردست فوج کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرایا تھا اور محاصرے کے دوران میں بنو قریظہ کو بدعہدی پر آمادہ کر کے نہایت نازک صورت پیدا کر دی تھی۔ اب وہ دوبارہ ساز باز کر کے ایک بڑی فوج کے ساتھ مدینہ پر یورش کی تیاریاں کر رہے تھے اس وجہ سے خیبر پر اقدام ناگزیر ہو گیا۔

غطفان وغیرہ سے ساز باز "رحمۃ للعالمین" کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم کو حدیبیہ سے مراجعت فرمائے ایک مہینے سے بھی کم عرصہ ہوا تھا کہ یہود خیبر کے عزم یورش کا علم ہوا، یعنی وُہ جنگ

---

[۱] جلد دوم ص ۱۰۶ [۲] ص ۲۲۸ نیز ص ۲۳۰ -

احزاب کی ناکامی کا بدلہ لینے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت و قوت بحال کرنے کے لیے نئی جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے قبیلہ بنوغطفان کے چار ہزار جنگجو بہادروں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور معاہدہ یہ تھا کہ اگر مدینہ فتح ہو گیا تو پیداوار خیبر کا نصف حصہ ہمیشہ بنوغطفان کو دیتے رہیں گے۔ مسلمان محاصرے کی سختی کو جو پچھلے ہی سال جنگ احزاب میں اٹھانی پڑی تھی ہنوز نہیں بھولے تھے۔ اس لیے... اتفاق ہو گیا کہ اس حملہ آور دشمن کو آگے بڑھ کر لینا چاہیے۔[۱]

خیبر کی نصف پیداوار بہ شرط فتح مدینہ دے دینا ہرگز کوئی بڑی شرط نہ تھی کیونکہ مدینہ کا ملاً یہودیوں کے قبضے میں آ جاتا اوس و خزرج بھی وہاں سے نکل جاتے۔ پھر یہودیوں کے لیے غطفانیوں کو ختم کر دینے کی تدبیریں اختیار کرنا بھی مشکل نہ تھا۔

مولانا شبلی مرحوم نے صورت حال کی کیفیت پوری تفصیل سے بیان فرماتے ہوئے لکھا ہے:

سلام (ابن الحقیق) نے (جو یہودیوں کا رئیس تھا) خود جا کر قبیلہ غطفان اور ان کے آس پاس کے قبیلوں کو اسلام کے مقابلے کے لیے آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج لے کر مدینہ پر حملے کی تیاریاں کیں...... سلام کے بعد یہودیوں نے اسیر بن زرام (جو سلام کے بعد یہودیوں کا امیر چنا گیا تھا) کو مسند ریاست پر بٹھا دیا....... اسیر نے غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کیا اور ایک فوج گراں تیار کی آنحضرت صلعم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے افواہ پر اعتماد نہیں کیا بلکہ عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا کہ خود خیبر جا کر اصل واقعے کی تحقیق کریں۔ چنانچہ وہ چند آدمیوں کو لے کر خیبر گئے اور چھپ کر خود اسیر کی زبانی اس کی مصلحتیں اور تدبیریں سنیں........

مولانا شبلی فرماتے ہیں، یہود خیبر غطفان سے اسلام کے مقابلے کے لیے سازش کر رہے تھے اور منافقین مدینہ انھیں مسلمانوں کے متعلق خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلعم یہود سے معاہدہ کے خواہاں تھے۔ مگر وہ بدگمان قوم تھی رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے انھیں کہلا بھیجا کہ مسلمانوں سے نہ ڈرنا۔ مٹھی بھر آدمی ہیں، جن کے پاس ہتھیار تک نہیں۔ غطفان کا ایک قوت ور قبیلہ بنو فزارہ تھا۔ وہ یہود کے ساتھ حملے میں شرکت کے لیے تیار ہو گیا۔ رسول اللہ صلعم نے انھیں لکھا کہ اہل خیبر کی مدد سے باز آؤ، لیکن بنو فزارہ نے انکار کر دیا۔[۲]

خیبر کی طرف اقدام

رسول اللہ صلعم نے سنہ ۷ھ میں عرفطہ غفاریؓ[۳] کو مدینہ منورہ میں قائمقام مقرر کیا۔ ازواج مطہرات میں سے حضرت ام سلمہؓ ساتھ تھیں۔ فوج کی تعداد سولہ سو تھی، جن میں سے دو سو سوار تھے۔

---

[۱] جلد اول ص ۲۵۸-۲۸۶ [۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۳۸-۴۴۰ [۳] بعض نے لکھا ہے کہ نمیلہ بن عبداللہ اللیثی کو مقرر کیا گیا تھا مثلاً جوامع السیرۃ ص ۲۱۱- نیز ابن ہشام القسم الثانی ص ۳۲۸)

حضور صلعم نے فرمایا تھا کہ صرف وہ لوگ شریک ہوں جو حدیبیہ کی بیعت رضواں میں شریک تھے۔ کچھ خواتین بھی شریک ہوئی تھیں۔ حضور صلعم نے پوچھا، تم کس کے حکم سے اور کس کے ساتھ آئیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہم زخمیوں کے لیے دوائیں بھی لائی ہیں نیز تیر اٹھا کر دیں گی۔ بعد فتح خیبر مال غنیمت میں ان کا حصہ بھی لگایا گیا۔

یہ اقدام محرم ۷ھ میں ہوا[1] طبقات ابن سعد میں جمادی الاولیٰ ۷ھ مذکور ہے[2]۔ ایک اختلاف سال کا بھی ہے یعنی بعض نے محرم ۶ھ لکھا ہے[3]، لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ اختلاف صرف حساب کا ہے۔ جن اصحاب کے نزدیک سنہ ہجرت کا آغاز ربیع الاول سے ہوا، ان کے حساب کے مطابق یہ ہجرت کا چھٹا سال تھا جسے ماہ صفر کے اختتام پر ختم ہونا تھا۔ جو سنہ ہجرت کی ابتدا محرم سے مانتے تھے (اور سہولت حساب کے خیال سے یہی مناسب سمجھا تھا) ان کے نزدیک یہ ساتواں سال تھا۔

اس جنگ کے لیے رسول اللہ صلعم نے تین خاص جھنڈے تیار کرائے (یعنی رایت)۔ پہلے چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں استعمال ہوتی تھیں۔ تین میں سے ایک حبابؓ بن منذر کو دوسرا سعدؓ بن عبادہ کو اور تیسرا حضرت علیؓ کو عطا ہوا جس کا رنگ سفید تھا اور یہ حضرت عائشہؓ کی چادر مبارک سے تیار ہوا تھا۔

منزل مقصود میں نزول راستے کی منزلیں کسی نے تفصیل سے بیان نہیں کیں۔ ابن ہشام میں صرف دو منزلوں کا ذکر ہے۔ ایک عصر پہاڑ[4] اور دوسرا صہبا کا، جو خیبر کے قریب تھا۔ یہاں عصر کے وقت قیام ہوا۔ رسد میں سب کے لیے ستو تھے۔ رسول اللہ صلعم نے بھی وہی گھول کر پیے۔ پھر خیبر کے نزدیک پہنچ کر وادی رجیع میں نزول فرمایا جو خیبر اور غطفان کی آبادیوں کے درمیان ہے۔ اسی کو مستقل لشکر گاہ قرار دیا۔ اس کا ایک بدیہی فائدہ یہ تھا کہ غطفان اہل خیبر کی امداد کے لیے نکلنے سے باز رہے۔ حضرت عثمانؓ کو اسلامی فوج کے اس مرکز کی کمانداری سونپی گئی۔

سنت نبوی یہ بھی تھی کہ رات کے وقت کسی پر حملہ نہیں کیا جاتا تھا۔ حضور صلعم یہ دعا پڑھ کر اطمینان سے استراحت فرما ہوئے، ہر بستی میں داخلے کے وقت یہ دُعا پڑھنا عادت شریف میں داخل تھا۔

---

[1] محرم ۷ھ کی ابتدا ۱۱ مئی ۶۲۸ء سے ہوئی۔ [2] جلد دوم ص ۱۰۶ جمادی الاولیٰ ۷ھ کا آغاز ۶ ستمبر ۶۲۸ء سے ہوا۔ [3] جوامع السیرة ص ۲۱۱۔ [4] اس کی صحیح کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ ابن ہشام کے حاشیے میں ہے کہ یہ مدینہ منورہ اور وادی الفرع کے درمیان ایک پہاڑ ہے۔ اگر اس سے مشہور وادی فرع مراد لی جائے تو یہ بداہتہً غلط ہے کیونکہ یہ مدینہ سے خاصی دُور جنوب مغرب میں ہے اور جانا شمالی جانب تھا۔ اگر شمالی جانب کی کوئی اور وادی فرع بھی ہے تو اس کی درستی میں کلام نہیں۔ ایک فرع مدینہ منورہ سے قریب چھوٹا سا قریہ ہے۔ غالباً یہاں اسی کا ذکر ہے۔

اللھم انا نسئلك خیر ھذہ القریۃ و خیر اھلھا و خیر ما فیھا۔ نعوذ بك من شر اھلھا و شر ما فیھا۔

اے اللہ! ہم تجھ سے اس بستی کی، بستی والوں کی اور جو کچھ اس میں ہے اس کی بھلائی چاہتے ہیں اور بستی کی برائیوں، بستی والوں کی برائیوں اور جو کچھ اس میں ہے اس کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

حدی خوانی سفر خیبر میں رسول اللہ صلعم نے عامر بن اکوع سے جو مسلمہ بن عمرو بن اکوع کے چچا تھے، فرمایا کہ ہمیں حدی کا کوئی گیت سناؤ۔ عامر نے حدی سنائی اس کے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:

اللھم لو لا انت اھتدینا	اے خدا! اگر تیری رحمت راستہ نہ دکھاتی تو ہم ہدایت نہ پاتے
و لا تصدقنا و لا صلینا	ہدایت نہ پاتے تو خیرات نہ دیتے اور نہ نماز پڑھتے۔
فاغفر فداءً لك ما ابقینا	اے خدا ہم تجھ پر فدا ہوں، جو احکام ہم بجا نہ لا سکے۔
و القین سکینۃ علینا	انھیں معاف فرما دے اور ہم پر اپنی طرف سے اطمینان و آسایش نازل فرما
ان الذین قد بغوا علینا	جن لوگوں نے ہم پر دست درازی کی ہے
اذا ارادوا فتنۃ ابینا	اور فتنہ انگیزی کے درپے ہیں، ہم ان سے دبتے نہیں۔
و ثبت الاقدام ان لاقینا	اگر ان سے (ظالموں اور فتنہ انگیزوں سے) ہماری مڈبھیڑ ہو جائے تو ہمیں ثابت قدم رکھ
و نحن علیٰ فضلك ما استغنینا	اور ہم تیرے فضل و کرم سے بے نیاز نہیں۔ یعنی فضل و کرم کے ہر لحظے محتاج ہیں۔

حضور صلعم نے حدی سن کر فرمایا: یرحمك اللہ (اللہ تجھ پر رحم فرمائے)۔ حضرت عمرؓ نے اسے جنگ میں عامرؓ کی شہادت کا نشان بتایا۔ واقعی عامرؓ خیبر کے شہدا میں شامل تھے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

خیبر کے قلعے جنگ کی کیفیت بیان کرنے سے پیشتر خیبر کے قلعوں کا ذکر ضروری ہے کیونکہ جنگ قلعوں ہی سے متعلق رہی، جو یکے بعد دیگرے فتح ہوئے۔ ان کی تعداد بلکہ بعض کے اسماء میں بھی اختلاف ہے نیز ہر قلعے کے موقع و محل کے متعلق بھی کوئی مستند اور واضح روایت نہیں ملتی۔

تعداد کے سلسلے میں سیرۃ النبیؐ کا بیان یعقوبی کی تصریح کے مطابق یہ ہے کہ قلعے چھ تھے: سالم (۱)، قموص (۲)، نطاۃ (۳)، قصارہ (۴)، شق (۵) اور مربطہ (۶)۔ ان سب میں قموص نہایت مضبوط و محفوظ قلعہ تھا۔ مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا، اسی قلعے کا رئیس تھا۔ ابن ابی الحُقَیق کا خاندان، جس نے مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی، یہیں رہتا تھا۔[1]

---

[1] جلد اول ص ۲۴۴۔

عجیب امر یہ ہے کہ ان قلعوں میں ناعم کا کوئی ذکر نہیں لیکن جب جنگ کا ذکر چھڑا تو فرمایا کہ یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام پر پہنچایا، غلہ قلعہ ناعم میں یکجا کیا۔ فوجیں نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں۔[1]

"اصح السیر" میں ہے کہ خیبر آٹھ قلعوں کا مجموعہ تھا۔ النطاۃ، الشق اور الناعم ایک جانب، الکتیبہ، الوطیح اور السلالم دوسری جانب، سب سے مستحکم قلعہ قموص تھا، جو ابی الحُقیق کا قلعہ تھا۔ نطاۃ کے پاس ایک قلعہ صعب بن معاذ کا تھا۔[2]

ظاہر ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے "ایک جانب" اور "دوسری جانب" کے کچھ معنی نہیں۔

طبقات ابن سعد میں یہ قلعے مذکور ہیں، النطاۃ، الصعب بن معاذ، الناعم، الزبیر، ابی، النزار، القموص، الوطیح، السلالم۔[3]

قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری نے قلعے دس بتائے ہیں اور ان کی کیفیت بھی ذرا تفصیل سے بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان قلعوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو آبادی کے دائیں بائیں واقع تھے۔

۱۔ قلعہ ناعم، قلعہ نطاۃ، قلعہ صعب بن معاذ، قلعہ الزبیر۔ یہ چاروں حصون (قلعے) نطاۃ کہلاتے تھے۔

۲۔ قلعہ شق، قلعہ النزار، قلعہ ابی۔ ان تینوں کو شق کہا جاتا تھا۔

۳۔ قموص، وطیح، سلالم۔ یہ تینوں کُتیبہ کے نام سے مشہور تھے۔

دائیں بائیں کا معین محل اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ آبادی کی واضح کیفیت پیش نظر ہو۔ آبادی کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں گیا۔ سفرنامہ "ارض القرآن" میں ہے کہ خیبر کی آبادی سے ملحق ایک میدان جانب شمال دیکھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں جنگ ہوئی تھی۔ میدان میں "البشر" نام ایک آبادی ہے۔ اس کے شمال میں قلعہ ناعم، مشرق میں وطیح، شمال مغرب میں نطاۃ و کتیبہ، مغرب میں شق اور جنوب مغرب میں سلالم تھا۔

اس سے صرف یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ آبادی کے جانب شمال جو میدان ہے اس میں قلعوں کی کیفیت یہ تھی، لیکن آبادی کے تعلق میں ان قلعوں کی حیثیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ بیان وقائع جنگ کے سلسلے میں محکم ثابت نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ وادیاں باہم منفصل ہیں خواہ فاصلہ کم ہو یا زیادہ۔ اسی طرح ہر وادی کے کھیت اور باغات منفصل ہوں گے اس وجہ سے اغلب ہے کہ ہر آبادی کی حفاظت کے لیے الگ الگ قلعے بنائے گئے ہوں۔ لیکن یہ محض قیاس ہے اور ایسے اہم معاملے کا فیصلہ قیاس کی بنا پر نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا بیان ڈاکٹر حمید اللہ نے "اسلامک ریویو" کے ایک مقالے میں وادی خیبر کا نقشہ بھی دیا ہے

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۴۵ [2] ص ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ [3] جلد دوم ص ۱۰۶

جو ان کے کسی یورپی دوست نے کھینچا تھا۔ اس میں شمالاً جنوباً لاوے کے اونچے حرّے ہیں۔ بیچ میں وسیع وادی خیبر ہے۔ اس کی مختلف وادیاں نقشے میں واضح نہیں کی گئیں۔ جنوب میں دورِ حاضر کا قصبہ خیبر ہے۔ اس سے تھوڑی دور شمال میں قصرِ مرحب ہے۔ یہ شاید قلعہ قموص کا مقام ہو۔ آبادی سے مشرقی جانب باغات ہیں[1]۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا قلعے بے ترتیبی سے بنے ہوئے تھے یا ان کی تعمیر ایسے طریقے پر کی گئی تھی کہ بہ حیثیت مجموعی وہ حلقۂ دفاع بن جائیں۔ ہر حلقہ الگ الگ قبیلے کا تھا۔ اس نقشے میں جو کچھ بھی ہے بالکل واضح ہے، لیکن افسوس کہ اس سے جنگ کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکتیں۔

جنگ سب سے پہلے جنگ قلعوں کے اس مجموعے پر ہوئی، جسے نطاۃ کہتے تھے اور جس میں نطاۃ کے علاوہ ناعم، زبیر اور صعب شامل تھے۔ مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ پہلے اسلامی فوجیں قلعہ ناعم پر بڑھیں[2]۔ دوسری روایت میں ہے کہ یہودیوں نے اہل و عیال کو ایک پرانے قلعے میں رکھا، غذائی جنسیں ناعم اور صعب میں جمع کیں۔ فوجیں نطاۃ میں فراہم ہوئیں۔

یہودی اندر سے تیر اور پتھر مارتے تھے۔ مسلمان انھی کے تیر اٹھا اٹھا کر ان کے خلاف چلاتے تھے۔ محمودؓ بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے ناعم پر حملہ کیا۔ شدید گرمی کا موسم تھا، وہ ذرا دم لینے کے لیے قلعہ کی دیوار کے ساتھ بیٹھ گئے۔ کنانہ بن ابی الحقیق نے مرحب کے مشورے کے مطابق اوپر سے بھاری پتھر یا چکی کا پاٹ محمودؓ کے سر پر گرا دیا۔ اسی صدمے کے باعث محمودؓ نے تیسرے روز وفات پائی۔

بہرحال ناعم اور نطاۃ جلد فتح ہو گئے۔ پھر شق اور صعب مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔ غالباً قلعہ صعب کی تسخیر کے سلسلے میں عامر بن اکوع اور مرحب کی جنگ ہوئی تھی۔ مرحب نے عامر پر تلوار کا وار کیا جسے بہادر عامر نے سپر پر روکا اور خود مرحب کی ٹانگوں پر زور سے تلوار ماری لیکن تلوار چھوٹی تھی، مرحب تک پہنچ نہ سکی اور ضرب اس زور کی تھی کہ تلوار خود عامر کی ران پر آ لگی۔ اسی زخم سے ان کی شہادت واقع ہوئی۔ قلعہ قموص کی تسخیر میں خاصی تاخیر ہوئی اور اس کا محاصرہ بیس روز جاری رہا۔ ناعم یا نطاۃ سے ایک یہودی پکڑا آیا تھا جس نے زمین دوز ذخیرۂ اسلحہ و اجناس کی اطلاع دی۔

رسول اللہ صلعم روزانہ فوج کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لاتے تھے، قلعہ قموص کے محاصرے میں آپؐ کو دردِ سر کا عارضہ ہو گیا۔ مختلف اصحاب اس قلعے کی تسخیر کے لیے بھیجے جاتے رہے۔ آخر رسول اللہ صلعم نے ایک روز فرمایا کہ کل میں علم اسے دوں گا، جو خدا اور اس کے رسولؐ کو چاہتا ہے، خدا اور اس کا رسولؐ بھی اسے چاہتے ہیں۔ مولانا شبلی

---

[1] یہ مقالہ اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے بعض دوسرے مقالے مجھے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی مہربانی سے ملے۔

[2] جلد اول ص ۴۴۵

مرحوم لکھتے ہیں؛

یہ رات نہایت امید و انتظار کی رات تھی۔ صحابہؓ نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی کہ دیکھیے یہ تاجِ فخر کس کے ہاتھ آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر حکومت اور سرداری کی تمنا کبھی نہیں کی، لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علیؓ میں مذکور ہے، انھیں خود اعتراف ہے، اس موقع کی تمنا میں ان کی خودداری قائم نہ رہ سکی[1]۔

صبح حضرت علیؓ کو بلایا گیا۔ وہ آشوب چشم کے باعث جنگ سے معذور تھے۔ رسول اللہ صلعم نے ان کی آنکھوں پر لعاب دہن لگایا۔ دُعا کی اور علَم عنایت فرمایا۔ نیز ارشاد ہوا: نرمی سے ان پر اسلام پیش کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمھاری ہدایت سے اسلام لے آئے تو سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

یعنی جنگ کے موقع پر بھی دعوت اسلام ہی کو مقدم رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اصل مقصود اسلام اور ہدایت حق ہے نہ کہ جنگ۔ مرحب دو زرہیں پہنے، دو عمامے باندھے اور ان پر خود رکھے، دو تلواریں لٹکائے اور نیزہ لیے رجز پڑھتا ہُوا نکلا۔ اس کا بھائی حارث پہلے مارا جا چکا تھا۔ اس لیے وہ جوشِ انتقام میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے زور سے سر پر تلوار کی ایسی ضرب لگائی جو سر کو کاٹتی ہُوئی دانتوں تک اتر گئی۔ پھر مرحب کا بھائی یاسر مقابلے کے لیے نکلا۔ اسے حضرت زبیرؓ نے قتل کر دیا۔

بہرحال بیس روز کے بعد قلعہ قموص مسخر ہو گیا۔ باقی قلعوں والے مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ یہودی اہل و عیال کے ساتھ نکل جائیں۔ مال، زمین اور سامانِ حرب میں سے کوئی چیز ساتھ نہ لیں اور کسی نے کوئی چیز چھپائی تو حفاظت کا ذمہ باقی نہ رہے گا۔

کنانہ بن ابی الحقیق نے اونٹ کی کھال کے تھیلے میں اپنا زر و زیور، جواہرات وغیرہ بھر کر ایک ویرانے میں دفن کر دیا تھا۔ رفیقوں نے ہرچند کہا کہ اسے چھپانا مناسب نہیں۔ صاف صاف بتا دے مگر وُہ انکار کرتا رہا۔ آخر یہ راز کھل گیا مگر کنانہ کو موت کی سزا محمودؓ بن مسلمہ کے قتل کی بنا پر دی گئی۔ جیسا کہ طبری میں تصریح ہے[2]۔ اس نے محمودؓ کو جنگ میں نہیں بلکہ اس حالت میں اوپر سے پتھر گرا کر مارا تھا جب وہ دم لینے کی غرض سے دیوار کے سایے میں بیٹھے تھے۔

صلح کے بعد یہودیوں نے درخواست کی کہ زمین ہمارے حوالے کر دی جائے، ہم پیداوار کا نصف حصہ برابر دیتے رہیں گے۔ یہ درخواست منظور ہُوئی۔ رسول اللہ صلعم عبداللہؓ بن رواحہ کو نصف حصہ وصول کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔ وہ پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہودیوں سے کہتے کہ جو حصہ چاہو، لے لو۔ وہ اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے: زمین

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد دوم ص ۴۴۶، ۴۴۷ [2] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۴۲

اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں [۱]۔

دو بلند پایہ شہید اسود راعی خیبر میں یہودیوں کی بکریاں اجرت پر چرایا کرتے تھے۔ وہ ایک روز رسول اللہ صلعم کی خدمت میں پہنچے اور شوق سے اسلام قبول کیا۔ پھر لڑائی کے لیے نکل پڑے اور بہادرانہ لڑ کر شہادت پائی۔ قبول اسلام کے بعد ایک بھی نماز کا وقت نہ ملا تاہم حضور صلعم کے ارشاد کے مطابق وہ بہت اونچے درجے پر فائز ہوئے۔ اس طرح ایک اعرابی اونٹ چرایا کرتا تھا، اسے مال غنیمت میں سے حصہ دیا گیا تو لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں تو شہادت کا آرزومند ہوں۔ اس نے بھی شہادت پائی۔

بعض فقہی احکام جنگ خیبر بعض فقہی احکام کی تبلیغ فرمائی ہیں،

۱۔ پنجہ دار پرند حرام ہوئے۔

۲۔ درندے حرام ہوئے۔

۳۔ گدھا اور خچر حرام ہوئے۔

۴۔ لونڈیوں کے سلسلے میں تمتع کو استبرا سے مقید کر دیا گیا۔ یعنی حاملہ سے وضع حمل تک، ورنہ تین ماہ تک تمتع ناجائز قرار پایا۔

۵۔ چاندی اور سونے کی خرید بہ تفاضل حرام ہوئی۔

۶۔ بعض روایات کے مطابق متعہ بھی اسی جنگ میں حرام ہوا۔

جانی نقصان خیبر کی جنگ میں ترانوے یہودی مارے گئے جن میں ان کے بڑے بڑے سردار شامل تھے۔ پندرہ مسلمان شہید ہوئے۔ عامرؓ بن اکوع نے اپنے ہی ہاتھ سے اتفاقی زخم لگنے کے باعث شہادت پائی۔ ایک صحابی بشر بن براالخزرجی زہر آلود گوشت کھانے کے باعث فوت ہو گئے۔

فدک، وادی القریٰ اور تیما خیبر کے بعد فدک کے یہود نے صلح نامہ خیبر کے مطابق تمام شرطیں منظور کر لیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ان سے نصف زمین لے لی گئی اور نصف انھی کے قبضے میں چھوڑ دی گئی۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو حجاز سے نکالا تو فدک کے یہودیوں کو نصف زمین کی قیمت دی گئی۔

پھر مسلمان وادی القریٰ کی طرف بڑھے۔ وہاں معمولی لڑائی ہوئی۔ بعد میں خیبر کی شرائط کے مطابق صلح ہو گئی۔ تیما کے یہودیوں نے لڑے بغیر ہی وہ شرطیں قبول کر لیں۔

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۴۹

ام المومنین صفیہؓ جنگ خیبر کے قیدیوں میں حیی بن اخطب کی صاحبزادی صفیہ بھی تھیں۔ وحیہؓ کلبی نے ایک کنیز کی درخواست کی۔ حضور صلعم نے انھیں اختیار دے دیا کہ جو چاہیں لے لیں۔ انھوں نے صفیہ کو چنا صحابہؓ نے عرض کیا کہ صفیہ نضیر اور قریظہ کے رئیس کی صاحبزادی ہیں۔ آپ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں چنانچہ آپؐ نے وحیہؓ کو دوسری کنیز دے دی اور صفیہؓ کو آزاد کرکے ان سے خود نکاح کرلیا۔ اس طرح رئیسہ قریظہ و نضیر ام المومنین بن گئیں رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ مولانا شبلی مرحوم نے بالکل صحیح لکھا ہے:

حضرت صفیہؓ کے پاس خاطر، حفظ مراتب اور رفع غم کے لیے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی...

حُسن خلق، رحم، مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت ضروری اور بجا تھی[1]

ایک یہودیہ کا بغض صلح کے بعد سلام بن مشکم کی بیوی زینب نے رسول اللہ صلعم کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ فرطِ کرم سے دعوت قبول فرمالی تھی مگر ایک ہی لقمہ کھا کر دست مبارک کھینچ لیا۔ اور لقمہ اگل دیا۔ بشر بن براء خزرجی حضور صلعم کے ساتھ تھے۔ وہ فرط ادب سے لقمہ اگل نہ سکے اور نگل گئے۔ چنانچہ زہر جسم میں سرایت کرگیا اور تیسرے یا چوتھے دن وفات پائی۔ زینب کو بلاکر پوچھا گیا تو اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میرا خیال تھا، اگر آپؐ پیغمبر ہیں تو زہر اثر نہیں کرے گا، پیغمبر نہیں تو ہمیں آپ کے ہاتھ سے نجات مل جائے گی۔

بشر بن براء کی وفات کے بعد زینب قصاص میں قتل کی گئی۔

تقسیم غنیمت طبقات ابن سعد کا بیان ہے کہ جب خیبر فتح ہوگیا تو رسول اللہ صلعم نے:

اسے چھتیس حصوں پر تقسیم کیا، ہر حصے میں ایک سو سہم تھے۔ اس کا نصف (یعنی اٹھارہ حصے) آپؐ نے ملکی حوائج و ضروریات کے لیے الگ کرلیا، نصف کو مسلمانوں پر تقسیم کردیا۔ خود رسول اللہ صلعم کا حصہ بھی اسی نصف میں تھا[2]

گویا اٹھارہ حصوں کے (بہ حساب ایک سو سہم فی حصہ) اٹھارہ سو سہم ہوئے۔ پیادے کا ایک سہم اور سوار کے دو سہم تھے۔ چودہ سو پیادے اور دو سو سوار تھے۔ یوں اٹھارہ سو حصے پورے ہوگئے۔ (مولف)

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۵۱ [2] طبقات جلد دوم ص ۱۱۳-۱۱۴۔

غزوۂ موتہ

باب ۵۷

غزوۂ موتہ

محل وقوع کم و بیش ایک صدی پیشتر کی جغرافیائی تقسیمات کے مطابق موتہ شام کا ایک مشہور مقام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تاریخی سفینوں یا دورِ حاضر کی ان کتبِ سیرت میں، جو چار چھ سو سال پیشتر کی تاریخی اور جغرافیائی کتابوں کی بناء پر مرتب ہوئیں۔ اسے شام کا مقام بتایا گیا ہے[۱] لیکن گزشتہ پچاس ساٹھ سال میں یورپی استعمار کے کارفرما شام پر کئی مرتبہ قطع و برید کی مقراض چلا یا چلوا چکے ہیں، بلکہ اس عمل سے شمالی حجاز بھی محفوظ نہیں رہا۔ پہلے فلسطین کو شام سے الگ کیا گیا۔ پھر فلسطین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہودیوں کے لیے ایک ریاست پیدا کی گئی، جس کی وجہ سے شرق اوسط پر فتنہ و فساد اور آتشباری و خونریزی کی گھٹائیں مسلط ہیں۔ یہ ہو چکا تو شمالی حجاز کے دو علاقے یعنی عقبہ و معان الگ کر کے اردن کی بنیاد رکھی گئی، جس میں جنوبی شام بھی شامل ہوا نیز لبنان کو شام سے الگ کیا گیا۔

زمانۂ ماضی میں موتہ اور آس پاس کے مقامات کو فنِ شمشیر سازی میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ یہاں کی بنی ہوئی تلواریں "مشرفیہ" کہلاتی تھیں۔ جب حرب و ضرب میں تلوار سے بدرجہا زیادہ سریع الاثر آلات کا رواج ہو گیا تو شمشیر سازی کا فن محض موتہ ہی میں نہیں ہر جگہ افسانۂ پارینہ بن گیا اور اب عام اٹلسوں میں موتہ کا نام بھی نہیں ملتا۔

موجودہ کیفیت موجودہ حالت میں موتہ سلطنت اردن میں شامل ہے۔ اس سلطنت کے ایک علاقے کا نام بلقا ہے، جو دریائے اردن کے مشرقی کنارے کے ساتھ بحیرۂ لوط کے جنوبی سرے تک آتا ہے۔ موتہ بلقا کی جنوبی حد پر واقع ہے مفصل عربی اٹلسوں میں اسے بحیرۂ لوط کے جنوب و مشرق میں تھوڑے فاصلے پر دیکھنا چاہیے۔ یہ اس ریلوے لائن پر ہے جو معان سے اذرح اور کرک ہوتی ہوئی عمان جاتی ہے۔ اب اس کی اہمیت شمشیر سازی کی وجہ سے نہیں، عہد نبویؐ کی اس جنگ کے باعث ہے، جس میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب، حضرت زیدؓ بن حارثہ، حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ اور ان کے چند رفیقوں نے شہادت پائی تھی۔ بعد ازاں مقامِ جنگ میں ایک خوب صورت مزار بن گیا تھا، جو موتہ کے جنوب میں "المزار" کے نام سے موسوم ہوا۔ بائبل میں بلقا کو "موآب" کہا گیا ہے اور اسلامی تاریخوں میں اسے "مآب" لکھا ہے۔ "موآب" یا "مآب" حضرت لوطؑ کے فرزند اکبر کا نام تھا۔ نام سے ظاہر ہے کہ حضرت لوطؑ کے اس فرزند کی اولاد اسی حصے میں آباد ہوئی تھی۔

جنگ کا سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حاکموں اور رئیسوں کے نام اسلام کے دعوت نامے بھیجے تھے تو

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۶۳، "اصح السیر" ص ۲۳۵۔

ایک دعوت نامہ حارثؓ بن عمیر کے ہاتھ حاکم بُصریٰ کے نام بھی ارسال کیا تھا۔ حضرت حارثؓ بلقا میں سے گزرتے ہوئے بُصریٰ جا رہے تھے۔ موتہ کے عامل شُرحبیل بن عمرو غسانی نے انھیں روک لیا اور پوچھا کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ حضرت حارثؓ نے صاف صاف بتا دیا کہ میں رسول اللہ صلعم کا فرستادہ ہوں اور بُصریٰ جا رہا ہوں۔ خدا جانے شُرحبیل کے جی میں کیا آئی کہ اس نے حضرت حارثؓ کو شہید کرا دیا۔ کسی علاقے سے مسافرانہ گزر جانا قطعاً جرم نہ تھا اور حضرت حارثؓ نے تو بتا دیا تھا کہ میں سفیر ہوں۔ سفیر کا قتل بین الاقوامی معمولات کے مطابق صریح ظالمانہ فعل تھا۔ چنانچہ یہ حد درجہ رنج افزا واقعہ حضور صلعم کی طبع مبارک پر بہت گراں گزرا اور شُرحبیل کی تادیب کے لیے فوراً لشکر کی تیاری کا حکم صادر ہو گیا۔ راہِ خدا کے مجاہد ارشادِ نبویؐ کے مطابق جرف میں جمع ہو گئے، جو مدینہ منورہ سے تین میل شمال میں ہے۔

سالاروں کی نامزدگی حضور صلعم جرف پہنچے تو تین ہزار مجاہدین تیار تھے۔ فرمایا:

۱۔ سب کے امیر زیدؓ بن حارثہ ہیں۔

۲۔ اگر وہ قتل کر دیے جائیں تو جعفرؓ بن ابی طالب امیر ہوں۔

۳۔ وہ بھی قتل ہو جائیں تو امارتِ لشکر عبداللہؓ بن رواحہ کے حوالے کر دی جائے۔

۴۔ ابن رواحہؓ بھی قتل سے محفوظ نہ رہیں تو مسلمان جسے چاہیں، امیر چن لیں۔

پھر حضور صلعم نے سفید پرچم والا علم زید بن حارثہؓ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا: اس مقام تک جاؤ جہاں حارث بن عمیر نے ادائے فرض میں جان دی۔ وہاں جو لوگ ملیں، انھیں اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو جنگ کی ضرورت نہیں، اگر قبول نہ کریں تو ان سے لڑو اور خدا سے مدد طلب کرو۔

حضور صلعم ثنیۃ الوداع تک لشکرِ اسلام کے ساتھ تشریف لے گئے وہاں سے سب کو رخصت کیا۔ یہ جمادی الاولیٰ ۸ھ کا واقعہ ہے۔[۲]

غنیم کا لشکرِ عظیم لشکرِ اسلام مدینہ منورہ سے روانہ ہوا تو شُرحبیل کو بھی اطلاع مل گئی۔ اس کی تگ و دو اور سعی و کوشش سے بھاری لشکر فراہم ہو گیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ہرقل قیصرِ روم ایک لاکھ فوج کے ساتھ موآب میں موجود تھا اور ایک لاکھ جنگجو لخم، جذام، بلقین، بہرا، بلی وغیرہ قبائل میں سے جمع ہو گئے تھے۔ اسلامی لشکر کو معان پہنچ کر اس زبردست اجتماع کی اطلاع ملی۔ ضروری تھا کہ اس غیر متوقع صورتِ حال پر غور کر لیا جاتا۔ چنانچہ لشکر معان میں

۱؎ بُصریٰ موجودہ شام کے جنوبی و مغربی گوشے میں واقع ہے۔ یہ حجاز ریلوے کا ایک سٹیشن ہے اور وہاں سے ایک لائن مغربی جانب حیفا تک گئی ہے بحیرا راہب کے متعلق جس روایت کی تردید مولانا شبلی مرحوم نے تفصیل سے فرمادی (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۶۶ - ۱۶۹) وہ اسی مقام کا تھا۔ یہ قدیم آبادی ہے اور یہاں آثارِ قدیمہ موجود ہیں۔ ۲؎ جمادی الاولیٰ ۸ھ کا مہینا ۲۷۔ اگست ۶۲۹ء سے شروع ہوا۔ معین تاریخ کا علم نہ ہو سکا۔ ۳؎ جیسا کہ پہلے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ٹھہر گیا۔ بعض کی رائے تھی کہ رسول اللہ صلعم کو اس بڑے لشکر کے متعلق مفصل اطلاع دی جائے۔ آپ چاہیں تو کمک بھیج دیں یا جو حکم صادر فرمائیں اس پر عمل کیا جائے۔ دو راتیں اس رائے پر گفتگو ہوتی رہی۔

آخر عبداللہؓ بن رواحہ نے کہا کہ بھائیو! ہم تو شوقِ شہادت میں نکلے ہیں۔ اس کے پورا ہونے کی منزل سامنے ہے، اس کی جانب قدم بڑھانے میں تامل کیوں کیا جائے؟ ہم تعداد یا قوت کے بل پر نہیں لڑتے۔ فتح حاصل کریں گے تو وہ ہمارے لیے بھلائی ہے ہی۔ شہادت پائیں گے تو وہ بھی ہمارے لیے ایسی دولت ہے، جس کے ہم طلب گار ہیں۔

یہ رائے سنتے ہی بالاتفاق فیصلہ کر لیا گیا کہ انتظار کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور غنیم کی کثرتِ تعداد کا کچھ خیال دل میں نہ لانا چاہیے۔

جنگ

چنانچہ تین ہزار مجاہد مسلمان معان سے آگے بڑھے تو دشمن کا بڑا لشکر مشارف میں پہنچ گیا تھا جو موتہ سے چند میل پر تھا۔ اسلامی لشکر نے موتہ کو مرکز بنا لیا۔ اس کے پاس ہی کے وسیع میدان میں جنگ ہوئی۔

اسلامی لشکر کا میمنہ قطبہ بن قتادہ کے زیرِ قیادت تھا۔ میسرہ کی سالاری عبایہ بن مالک انصاری کی سپرد تھی۔

دستور کے مطابق پہلے زیدؓ بن حارثہ امیر لشکر اسلام علم اٹھا کر آگے بڑھے اور بڑی مردانگی سے لڑے۔ ان پر نیزوں اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی اور زخموں سے چور ہو کر شہادت پائی۔

جعفرؓ بن ابی طالب

پھر جعفرؓ بن ابی طالب نے علم سنبھال لیا۔ وہ آگے بڑھے۔ ان کا دایاں بازو کٹ گیا تو علم بائیں ہاتھ میں اٹھا لیا۔ وہ بھی کٹ گیا تو علم کو سینے سے لگا لیا۔ غرض جب تک زندگی کی رمق باقی رہی، علم کو سربلند رکھا۔ ایک تلوار کی ضرب ان کی کمر پر پڑی، جس سے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

عبداللہؓ بن عمرؓ بھی اس جنگ میں شریک تھے۔ ان کی ایک روایت ہے کہ جعفرؓ کے جسم پر نوّے سے زیادہ زخم تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں پچاس زخم گن گیا۔ وہ سب جسم کے اگلے ہی حصے میں تھے۔ گویا حضرت جعفرؓ پیہم زخم کھاتے رہے، تاہم منہ نہ موڑا۔

ان دو روایتوں پر حیران نہ ہونا چاہیے۔ پہلی روایت صرف سرسری اندازے پر مبنی ہے، دوسری میں گنتی کر کے بتایا گیا، لیکن گنتی مکمل نہ ہو سکی۔ جعفرؓ کی عمر صرف تینتیس سال کی تھی، جس میں سے خاصا لمبا وقت حبشہ میں گزرا۔ رضی اللہ عنہ۔

(بقیہ صفحہ ۴۱۴) بتایا جا چکا ہے "مو آب" علاقے کا نام تھا، جسے اب بلقا کہتے ہیں، خود قیصر غالباً اس علاقے کے مرکز میں ہوگا، جس کا نام "کیر مو آب" تھا اب وہ کرک کہلاتا ہے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ دمشق کی فوج کے متعلق تمام روایات جاسوسوں اور خبر رسانوں کی اطلاعات پر مبنی ہوں گی۔ غالباً انھوں نے تخمینہ پیش کیا ہوگا۔ صحیح تعداد کا علم انھیں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ دشمن کی فوج اسلامی فوج سے تیس چالیس گنا مزور تھی۔ باقی رہے صحیح اور معین اعداد تو ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسلامی روایات کے اعداد یہی ہیں۔ رومیوں یا غسانیوں کی روایات کو مستند قرار دینے کی کون سی وجہ ہے؟

عبداللہ ابن رواحہ پھر عبداللہؓ بن رواحہ نے علم اٹھایا، وہ بھی مردانگی سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے دل میں پہلے سے شوقِ شہادت سمایا ہوا تھا، زیدؓ بن ارقم بہ حالت یتیمی عبداللہؓ بن رواحہ کی نگرانی میں تھے اس سفر میں وہ بھی ساتھ تھے۔ کہتے ہیں راستے میں عبداللہ ایسے اشعار پڑھتے جاتے تھے، جن سے شہادت کی انتہائی آرزو کا اظہار ہوتا تھا۔ میں (زیدؓ بن ارقم) یہ اشعار سن کر رو پڑا۔ عبداللہؓ نے کوڑا اٹھا کر مجھے مارا اور کہا اگر اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب کرے تو اے لئیم اس میں تیرا کیا نقصان ہے؟

معلوم ہے کہ لشکر اسلام کو بے تامل جنگ کا مشورہ بھی عبداللہؓ ہی نے دیا تھا۔

ایک روایت ہے کہ سفر میں کھانے پینے کا انتظام اطمینان کے مطابق نہ ہو سکا۔ عبداللہؓ کے چچیرے بھائی نے ایک گوشت والی ہڈی پیش کی کہ کچھ کھا کر مضبوط کر لیں۔ عبداللہؓ نے تھوڑا سا گوشت دانت سے کاٹا۔ پھر دشمنوں کی آوازیں سنیں تو ہڈی پھینک دی اور اپنے آپ سے مخاطب ہو کر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ "ابھی تک تو دنیا ہی میں ہے؟" پھر لڑتے لڑتے شہادت حاصل کی۔

آخری دور عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت کے بعد جنگ کا آخری دور شروع ہوا اور یہیں سے اس جنگ کے نتائج کا معاملہ اختلاف کا باعث بنا۔ یکے بعد دیگرے تین سالاروں کے تقرر کا فرمان تو خود رسول اللہ صادر فرما چکے تھے۔ چوتھے سالار کا فیصلہ لشکر پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ طبقات ابن سعد میں ابو عامرؓ کی روایت ہے کہ عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت کے بعد مسلمان ہزیمت اٹھا کر بُری طرح بھاگے۔ ایسی حالت کبھی دیکھی نہ تھی۔ ان میں سے دو بھی یکجا نہ تھے۔ اس اثنا میں ایک انصاری علم اٹھا کر تیز دوڑے اور بھاگتی ہوئی اسلامی فوج کے تمام آدمیوں سے آگے نکل کر علم گاڑ دیا۔ پھر پکار کر کہا:

لوگو! میرے پاس آؤ۔ یہ سنتے ہی سب ان کے پاس جمع ہونے لگے۔ جب تعداد خاصی ہو گئی تو وہ (انصاری) علم اٹھا کر خالدؓ بن ولید کے پاس لے گئے۔ خالدؓ نے کہا کہ میں آپ سے علم نہیں لے سکتا آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ انصاری نے کہا واللہ میں نے تمہارے ہی لیے لیا ہے۔

یہ سن کر خالدؓ نے علم تھام لیا۔ پھر دشمن پر حملہ کر دیا۔ اللہ نے دشمن کو ایسی شکست دی کہ کبھی ایسی دیکھی نہیں گئی۔ مسلمانوں نے جہاں چاہا تلوار چلائی۔[۱]

موقع اور محل کے تمام قرائن سے اس بیان میں تائید ہوتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ اگر فتح دشمن کو حاصل ہوئی تو کیا یہ تعجب کا مقام نہیں کہ جو لشکر بہ اعتبار تعداد پچاسواں یا چالیسواں حصہ تھا، اسے

---

[۱] طبقات ابن سعد طبع بیروت جلد دوم ص ۱۳۰۔ ابن ہشام میں علم اٹھانے والے انصاری کا نام ثابت بن اقرم بتایا گیا ہے (القسم الثانی ص ۳۷۹)۔ "جوامع السیر" سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ (ص ۲۲۱)۔

شکست دے کر تعاقب نہ کیا گیا اور وہ لشکر خود غنیم کے ملک میں تھا؟

۲۔ سوچیے کہ فتح کے بعد کون سا امر دشمن کو تعاقب سے باز رکھ سکتا تھا، اور شکست کے بعد پورے لشکر کے صحیح سلامت بچ نکلنے کا کون سا امکان تھا؟

۳۔ جس شرحبیل بن عمرو غسانی حاکم موتہ نے حضرت حارث بن عُمیر کو شہید کرا دیا تھا، حالانکہ وہ نہتے ہوں گے کیونکہ سفارتی خدمات انجام دے رہے تھے، وہ شرحبیل اور اس کے ہم قوم اتنے رحمدل اور رقیق القلب کیونکر ہو گئے کہ انھیں کم و بیش ڈیڑھ لاکھ ہونے کے باوجود تین ہزار کا تعاقب کرنا منافی انسانیت معلوم ہوا تھا؟

شکست کی موید روایتیں

بلاشبہ بعض روایتیں ایسی موجود ہیں جن سے شکست کا پہلو نکالا جا سکتا ہے مثلاً جب لشکر مدینہ منورہ پہنچا اور لوگ حسب معمول اس کے استقبال کو آئے تو ایک گروہ نے اہل لشکر پر مٹی اور کنکر پھینکے۔ ساتھ ہی وہ کہتے جاتے تھے: "او فراریو! تم اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے!" لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ "فراری" نہیں، "کرّاری" یعنی پلٹ کر حملہ کرنے والے ہیں۔

اغلب ہے اہل مدینہ تک ابتدا میں ناقص یا خلاف حقیقت خبریں پہنچی ہوں۔ انھوں نے چھان بین اور تحقیق کیے بغیر ان پر اعتماد کر لیا ہو۔ آخر اس زمانے میں دور حاضر کی طرح خبریں حاصل کرنے کے وسیع وسائل تو موجود نہ تھے۔ ہمیشہ قاصدوں اور پیغام رسانوں ہی کی باتوں پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ اسی تاثر کے تحت یہ الفاظ کہے گئے لیکن رسول اللہ صلعم کے تردیدی ارشاد سے بڑھ کر الزام فرار کے بے بنیاد ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟

"اصح السیر" کا بیان

"اصح السیر" میں مولانا عبدالرؤف مرحوم داناپوری نے لکھا ہے:

ابن قیم کہتے ہیں کہ بخاری میں ہے، اس غزوے میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو شکست ہوئی۔[1] مگر صحیح وہ ہے جو ابن اسحاق لکھتے ہیں یعنی دونوں جماعتیں بلا فیصلہ الگ ہو گئیں۔ ابن ہشام زہری سے روایت کرتے ہیں... ہمیں تو یہی معلوم ہوا کہ جب خالدؓ امیر بنائے گئے تو خدا نے مسلمانوں کو فتح دی۔[2]

امام بخاری اور امام زہری کی روایات کو صحیح مانا جائے یا ابن اسحاق کی روایت کو، لیکن موتہ میں اسلامی لشکر کو شکست خوردہ قرار دینے کی کوئی وجہ معقول نظر نہیں آتی۔ ابن اسحاق زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ جنگ کا قطعی فیصلہ نہ ہوا۔ دونوں لشکر پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن رجعت یا پسپائی درست بھی مان لی جائے تو یہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے لشکر کے لیے باعث ذلت ہو سکتی ہے نہ کہ تین ہزار کے لیے؟ اور دشمن کا لشکر اپنے گھر میں لڑ رہا تھا۔ مسلمان کئی سو میل کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچے تھے۔

---

[1] طبقات میں اور روایتیں بھی ہیں اور ابو عامرؓ کی روایت بھی، جو یقیناً شکست نہیں فتح کی دستاویز ہے [2] اصح السیر ص ۲۴۸۔

حقیقتِ حال حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں پر یقیناً اضطراب طاری ہوگیا ہوگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کسی نئے امیر کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ جب ثابت بن اقرم انصاری کے حسنِ تدبیر، دوراندیشی اور مردانگی کی برکت سے خالدؓ بن ولید کی سالاری پر اتفاق ہوگیا تو انھوں نے منتشر لشکر کو اکٹھا کر کے اپنے صواب دید کے مطابق مرتب کیا ہوگا۔ پھر ایک دم اس زور سے حملہ کر دیا کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ پیچھے ہٹ کر مورچے پکڑنے پر مجبور ہوگیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سامنے سے یکایک ہٹ جانے کے بعد از سرِ نو ترتیب خاص کے ساتھ حملہ آور ہونے کے باعث دشمن نے سمجھ لیا ہو کہ یہ وُہ لشکر نہیں جو شکست کھا کر بھاگ گیا تھا بلکہ تازہ دم لشکر ہے جو کہیں گاہ سے نکل آیا ہے۔ ممکن ہے ایسے اور جوش بھی ادھر ادھر چھپے بیٹھے ہوں اور وہ یونہی خدا جانے کب تک نکلتے آئیں۔ اس پر اس کا سراسیمہ ہونا بالکل طبعی تھا اور وُہ بچاؤ کے لیے پیچھے ہٹ گیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ البتہ مسلمان دشمن کا تعاقب نہ کرسکے کیونکہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اگر ان کی حقیقی حیثیت کا دشمن کو اندازہ ہوجاتا تو یقیناً ایک بھی فرد اس مخمصے سے زندہ واپس نہ آسکتا۔

دائرۂ اسلام میں آنے کے بعد خالدؓ کی غیر معمولی حربی صلاحیتوں کی یہ پہلی جلوہ افروزی تھی۔ آگے چل کر اس نابغۂ حربیات نے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دیے، وہ تاریخ کے لیے سرمایۂ فخر ہیں۔ رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے خالدؓ کو "سیف اللہ" کا خطاب یونہی عطا نہیں ہُوا تھا۔

صحیح بخاری میں خود خالدؓ کی روایت ہے کہ جنگِ موتہ میں میرے ہاتھ سے نَو تلواریں ٹوٹیں اور صرف ایک یمنی تیغ میرے پاس رہ گئی۔[1]

شہدائے موتہ ابن حزم کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل اصحاب جنگِ موتہ میں شہید ہُوئے:

۱۔ زیدؓ بن حارثہ سالارِ اول
۲۔ جعفرؓ بن ابی طالب سالارِ دوم
۳۔ عبداللہؓ بن رواحہ سالارِ سوم
۴۔ مسعودؓ بن الاسود بن حارثہ بن نضلہ
۵۔ وہبؓ بن سعد بن ابی سرح
۶۔ عبادؓ بن قیس
۷۔ حارثؓ بن النعمان

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب غزوہ موتہ

۸۔ سُراقہ بن عمرو

۹۔ ابو کُلیب (بعض نے ابو کلاب لکھا ہے)

۱۰۔ جابرؓ بن عمرو (ابو کلیب کا بھائی)

۱۱۔ عمروؓ بن سعد

۱۲۔ عامرؓ بن سعد

بعض مصنفین نے شہدا کی تعداد میں چند نام بڑھا دیے ہیں مثلاً حضرت حارثؓ بن عُمیر کو بھی شہدائے موتہ میں شامل کر لیا ہے اور کل تعداد سترہ بتائی گئی ہے[۲]

شہدا کی تعداد بارہ ہو یا سترہ، لیکن اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا نقصان بہ لحاظ تعداد بفضل اللہ بہت کم تھا۔ باقی رہا شہدا کی عظمت و رفعت مرتبہ کے اعتبار سے نقصان کا معاملہ تو اس کا اندازہ مشکل ہے۔

حضور صلعم کا حزن و ملال

حضور صلعم کو تمام شہدا کا یکساں ملال تھا۔ زیدؓ اور جعفرؓ کی شہادت خصوصیت سے بہت حزن افزا تھی۔ زیدؓ وہ مقدس وجود تھا جس نے باپ اور چچا کے ساتھ جانے اور اپنے خاندان میں زندگی گزارنے پر حضور صلعم کی قدموں میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ حضور صلعم نے زیدؓ کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا اور اپنی پھپھیری بہن سے ان کی شادی کر دی تھی۔ حضرت جعفرؓ سے رسول اللہ صلعم کو اتنی محبت تھی کہ جب جعفرؓ حبشہ سے لوٹ کر مدینہ منورہ آئے اور شوق زیارت میں خیبر پہنچے جہاں حضور صلعم گئے ہوئے تھے تو حضور صلعم نے جعفرؓ کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے فرمایا، ہم کہہ نہیں سکتے ہمیں فتح خیبر کی زیادہ خوشی ہے یا جعفرؓ کے آنے کی۔

---

[۱] جوامع السیرۃ (ص ۲۲۲-۲۳۲) [۲] "المشاہد" مرتبہ مولوی رحمٰن علی مصنف علمائے ہند (ص ۱۴۳-۱۵۱) مصنف موصوف نے تمام شہدا کے حالات بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔

باب ۵

یہودیت، مسیحیت اور اسلام

مولاناؒ کی تصریحات

یہودی اور عیسائی

سورۂ توبہ کی آیت ۲۹[1] میں عرب کے ان یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی تمام معاہدات فسخ کرنے کا حکم دیا ہے جنھوں نے یکے بعد دیگرے معاہدوں کی خلاف ورزیاں کی تھیں اور مسلمانوں کے امن و عافیت کے خلاف ایک بہت بڑا خطرہ بن گئے تھے اور حکم دیا ہے کہ مشرکین عرب کی طرح ان کے خلاف بھی اب اعلان جنگ ہے۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو حجاز میں یہودیوں کی متعدد جماعتیں آباد تھیں لیکن عیسائیوں کی کوئی قریب آبادی نہ تھی۔ وہ یا تو یمن میں تھے یا عرب اور شام کے سرحدی علاقے میں۔ یہودیوں کا جو طرز عمل رہا، اس کی طرف اشارات گزر چکے ہیں[2]۔ عیسائیوں کی حالت یہودیوں سے مختلف رہی۔ ان کی طبیعت میں وہ جمود اور سختی نہ تھی جو یہودیوں میں طبیعت ثانیہ ہو چکی تھی، اس لیے جب انھوں نے اس دعوت کا حال سنا تو مخالفت کا جوش پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کی طرف مائل ہونے لگے۔ چنانچہ یمن[3] کے عیسائیوں نے ابتدا سے موافقانہ روش اختیار کی تھی اور اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیا تھا پھر اسلام نے خود بخود اپنی راہ وہاں نکال لی۔ انھی کے وفد سے مخاطبات ہوئے تھے جو سورۂ آل عمران میں گزر چکے ہیں۔

---

[1] آیت مع ترجمہ درج ذیل ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا ۔۔۔ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۔

اہل کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر۔ نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے اور نہ سچے دین ہی پر عمل پیرا ہیں تو ان سے بھی جنگ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیں اور حالت ایسی ہو جائے کہ ان کی سرکشی ٹوٹ چکی ہو۔

[2] یعنی بار بار بدعہدی اور وعدہ شکنی۔

[3] یمن سے مراد بظاہر نجران کے عیسائی ہیں جو اس زمانے میں یمن کا ایک حصہ مانا جاتا تھا۔

عرب سے باہر کے عیسائی

عرب سے باہر کے جن عیسائیوں تک اسلام کی دعوت پہلے پہل پہنچی، ان کا بھی یہی حال رہا۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے جو پادشاہ مسلمان ہوا وہ حبش کا عیسائی فرمانروا نیگوش تھا، جسے عرب نجاشی کہا کرتے تھے اور جس کی حق شناسی اور استعداد ایمانی کی مدح خود کلام الٰہی نے کی ہے (دیکھو مائدہ: ۸۳)[1]

اس عہد کے یہودیوں اور عیسائیوں کے اس اختلاف حال کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے اور اس کی علت بھی واضح کر دی ہے (دیکھو مائدہ: ۸۲)[2]

مسیحی ریاستوں کی جنگ و خوں ریزی

لیکن آگے چل کر جب اسلام کی دعوت زیادہ پھیل گئی تو وہ عیسائی ریاستیں جو عرب اور شام کے سرحدی علاقے میں قائم ہو گئی تھیں اور رومی حکومت کے ماتحت تھیں، اس تحریک کی ترقی گوارا نہ کر سکیں اور رومی شاہنشاہی کی پشت گیری سے مغرور ہو کر آمادۂ پیکار ہو گئیں۔ سب سے پہلا معاملہ حضرت حارثؓ بن عمیر کی شہادت کا پیش آیا۔ آنحضرت صلعم نے انھیں دعوت اسلام کا خط دے کر موتہ[3] بھیجا تھا جہاں کا رئیس شرحبیل بن عمرو غسانی تھا۔ اس نے انھیں (حارثؓ بن عمیر کو) بغیر کسی جرم و قصور کے قتل کرا دیا۔

---

[1] مائدہ کی آیت ۸۳ درج ذیل ہے:

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ۔

اور جب یہ (عیسائی) وہ کلام سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں جوش گریہ سے بہنے لگتی ہیں کیونکہ انھوں نے (اس کلام) کی سچائی پہچان لی ہے۔ وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں: خدایا ہم اس کلام پر ایمان لائے۔ پس ہمیں بھی انھی میں لکھ لے جو (تیری سچائی کی) گواہی دینے والے ہیں۔ تم ایمان والوں کی عداوت سب سے زیادہ سخت یہودیوں کو پاؤ گے نیز (عرب کے) مشرکوں کو۔

[2] لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ۖ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔

اور ایمان والوں کی دوستی میں سب سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں ہم نصاریٰ ہیں۔ اس لیے کہ ان میں پادری اور رہبان ہیں (یعنی عالم اور تارک الدنیا فقیر جو زہد و عبادت میں مشغول رہتے ہیں) اور اس لیے کہ ان میں گھمنڈ اور خود پرستی نہیں۔

[3] موتہ نہیں بصریٰ بھیجا تھا۔ موتہ بصریٰ کے راستے میں تھا جہاں شرحبیل سے سفیر کے قتل کا نازیبا فعل سرزد ہوا۔

اس صریح مددو ظلم نے پیغمبر اسلام کو جنگ پر مجبور کر دیا اور ایک فوج سنہ ۸ھ میں روانہ کی گئی۔ اس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ بھی شام میں مقیم تھا۔ اس سے رئیس موتہ نے مدد مانگی اور ساری فوج بھی میدان میں آگئی۔ تاہم فتح مسلمانوں ہی کی ہوئی۔

شامیوں اور رومیوں کا عزم یورش

اس واقعے کے بعد شام کے تمام عرب قبائل نے تہیہ کر لیا کہ مسلمانوں پر حملہ کریں اور شہنشاہ قسطنطنیہ نے بھی ان کی اعانت کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ شاہی فوجیں شام میں جمع ہونے لگیں اور پیغمبر اسلام (صلعم) کو خود دفاع کے لیے نکلنا پڑا۔ یہی دفاعی اقدام ہے جو غزوۂ تبوک کے نام سے مشہور ہوا، لیکن جب پیغمبر اسلام (صلعم) تبوک پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اس بے باکانہ اقدام نے دشمنوں کے ارادے پست کر دیے اور اب حملے کا ارادہ ملتوی ہو گیا ہے۔

اس سورۃ (سورۃ توبہ) کی یہ آیتیں اسی واقعہ کے بعد ہی نازل ہوئی تھیں اور چونکہ اب مسلمانوں پر اس جانب سے سخت حملہ ہونے والا تھا اور دوسری طرف عرب کے یہودی بھی اپنی سازشوں میں سرگرم تھے اس لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ مشرکین عرب کی طرح ان کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔

پس اس آیت میں "جنگ کرو" کے حکم سے مقصود جنگ کی یہی صورت ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے تمام یہودیوں اور عیسائیوں پر محض ان کے یہودی اور عیسائی ہونے کی وجہ سے حملہ کر دو۔ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں یا جزیہ نہ دیں جیسا کہ معترضین اسلام نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا مطلب صرف وہی قرار دے سکتا ہے جو پورے قرآن سے، پیغمبر اسلام (صلعم) کی زندگی سے، صحابہؓ کے حالات سے اور تاریخ اسلام سے یک قلم آنکھیں بند کرلے۔

حکم قتال کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ ان جماعتوں کو دعوت حق سے کیوں بغض ہوا اور کیوں راستی و عدالت سے منہ موڑ کر مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے درپے ہو گئے۔ چنانچہ پہلے اہل کتاب کا نام نہیں لیا بلکہ ان کے چار سلبی وصف بیان کیے[1] یعنی جن لوگوں کے اوصاف کا یہ حال ہے ان سے راستی و عدالت اور پاس عہد و قرار کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی اور وہ پیروان حق کی عداوت سے کبھی باز آنے والے نہیں۔ پس اگر ان سے جنگ نہ کی جائے تو چارۂ کار کیا ہے؟۔

فرمایا: باوجود اہل کتاب ہونے کے اب ان کا حال یہ ہے کہ نہ تو اللہ پر ایمان باقی رہا ہے نہ آخرت پر، زبان سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مومن ہیں، لیکن ان کا ہر عمل اعلان کرتا ہے کہ مومن نہیں پھر اللہ اور اس کے رسول نے جو کچھ حرام کر دیا تھا اب ان کے لیے حرام نہیں رہا کیونکہ اول تو ہوائے نفس سے حیلے نکال کر کتنی ہی حرام چیزیں حلال کر لیں، پھر حلت و حرمت کا حق بھی خدا اور رسول کی جگہ اپنے فقیہوں اور پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس دین حق کی انھیں

---

[1] چار سلبی وصف یہ ہیں: نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ یوم آخرت پر، نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنھیں اللہ کے رسول نے حرام ٹھہرایا اور نہ سچے دین پر عمل پیرا ہیں۔ مولاناؒ نے خود ان کی تشریح فرمادی ہے۔

حضرت موسیٰ اور مسیح علیہما السلام نے تعلیم دی تھی اسے یک قلم چھوڑ چکے ہیں۔

یہاں اہل کتاب کے ایمان کی اسی طرح نفی کی ہے جس طرح سورہ بقر میں کی ہے کہ و من الناس من یقول اٰمنّا باللّٰہ وبالیوم الاٰخر وما ھم بمؤمنین (۲ ؛ ۸)۔

لہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مومن نہیں۔

باب ۵۹

جزیہ

حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید و ھم صٰغرون

پیشتر کی حالت جزیہ ایک ٹیکس اور محصول تھا، جو رسول اللہ صلعم کے ظہور سے بہت پہلے رومی اور دوسرے حکمران مختلف محکوم گروہوں اور طبقوں سے وصول کرتے تھے اور یہ جن پر لگایا جاتا تھا یقیناً ان کی تذلیل مقصود ہوتی تھی۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ غیر مسلم طبقے بڑی بڑی رقمیں فاتحوں کی خدمت میں پیش کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے مگر انھیں یہ منظور نہ تھا کہ اس رقم کو "جزیہ" کہا جائے۔ وہ اسلامی حکومت کی حفاظت بخوشی قبول کر لینے پر آمادہ تھے اور اس سلسلے میں ضروری رقم بھی دینے کے لیے راضی تھے مگر "جزیہ گزار" کہلانا انھیں گوارا نہ تھا۔ حفاظت کے سلسلے میں کوئی ٹیکس ادا کرنا ان کے لیے بار نہ تھا مگر "جزیہ" کو وہ منافی وقار سمجھتے تھے کیونکہ سابقہ حکومتیں جزیے کو بہت بدنام کر چکی تھیں۔

مسلمانوں کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ کسی قوم پر تذلیل کی غرض سے جزیہ عائد کریں۔ بظاہر "جزیہ" کی اصطلاح اس لیے استعمال کی گئی کہ حفاظتی رقم کے لیے پیشتر سے یہ اصطلاح قرار پا گئی تھی اور صدیوں سے رائج تھی۔

تین صورتیں جو علاقے فتح ہو رہے تھے یا جہاں جہاں اسلامی عساکر کی پیش قدمی جاری تھی، وہاں غیر مسلموں کے لیے طبعاً تین صورتیں تھیں، جن میں سے وہ کسی ایک کو قبول کر سکتے تھے اور اسی پر ان کے ساتھ برتاؤ کا انحصار تھا۔

۱۔ وہ اسلام قبول کر لیں، جس کے بعد ان پر وہ تمام احکام عائد ہو جاتے تھے جو اسلامی حکومت میں مسلمانوں کے لیے واجب الامتثال تھے۔

۲۔ اسلامی حکومت کی حفاظت قبول کر لیں اور اس سلسلے میں جو واجبی سا ٹیکس واجب الادا ہو، ادا کرتے جائیں۔ یہ عرفاً "جزیہ" کہلاتا تھا۔

۳۔ پہلی دونوں صورتوں کو رد کر کے دشمنی اور مخالفت کے لیے تیار ہو جائیں اور ان کے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک ناگزیر ہو جاتا۔

افسوسناک تحریف جنگ و اقدام کی حالت میں آبادیوں اور گروہوں سے یہ استفسار بہرحال قرین عدل و انصاف اور مقاصد امن و حفظ کے عین مطابق تھا۔ اس کا مدعا یہ اور محض یہ تھا کہ عین حالت جنگ میں بھی

حرب و قتال کو صرف انھی گروہوں تک محدود رکھا جائے جو مقابلہ و مقاتلہ کے سوا کوئی صورت فیصلہ قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں، اگر بعض اصحاب نے اس استصواب کو ایک فارمولے کی شکل دے کر ایسے انداز میں پیش کیا گویا مسلمان مسلح ہو کر گھروں سے نکلتے تھے تو جو غیر مسلم راستے میں مل جاتا اس سے پوچھتے، کیوں بھئی اسلام قبول ہے؟ اگر وہ انکار کرتا تو کہتے کہ اچھا جزیہ دینا منظور کر لو۔ اس سے بھی انکار کرتا تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اس کی گردن اڑا دینے کے درپے ہو جاتے۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلَیہِ راجعون۔

یہ حقیقی صورت حال کی سراسر غلط اور کاملاً بے بنیاد تصویر تھی۔ تاریخ کا ہر صفحہ اس کا رد کر رہا ہے۔ اس صریح تحریف کا سبب یہ ہے کہ اصل معاملے کو سمجھنے کی کوشش نہ کی گئی اور اپنے دماغ سے ایک ایسی تعبیر پیدا کر لی گئی، جسے نہ دین حق سے کوئی مناسبت تھی اور نہ تاریخ اسلام سے اس کی توثیق و تائید ہوتی تھی۔

دائرہ استفسار

اس استفسار و استصواب کا تعلق صرف ان خطوں کے غیر مسلموں سے تھا جو دائرۂ جنگ میں آ جاتے تھے اور ہر گروہ کو حقیقت حال معلوم کیے بغیر دشمن سمجھ لینا سراسر خلاف انصاف قرار دے کر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ سب کے سامنے یہ تینوں صورتیں پیش کی جائیں۔ ان میں سے کسی ایک کا قبول کر لینا ان کے رویے پر منحصر و موقوف تھا۔ نہ دین قبول کر لینے میں جبر کی گنجایش تھی، نہ جزیہ وصول کر لینے کی حرص تھی۔ نہ کسی کو خواہ مخواہ جنگ میں الجھانے کا شوق تھا۔ تینوں میں سے کوئی ایک صورت ان غیر مسلموں کے اپنے صواب دید پر موقوف تھی۔ قبول اسلام مساوات کی دستاویز تھا۔ قبول جزیہ حفاظت کا پروانہ تھا اور قبول جنگ اس برتاؤ کی سند تھا جو دشمن کے ساتھ مجبوراً اختیار کرنا پڑتا تھا۔

حق شناسی

اسلامی فوجوں کے اس طریق عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ کثیر آبادیاں بے تامل قبول حفاظت پر آمادہ ہو گئیں اور جنگ کا دائرہ سمٹ کر صرف ان لوگوں تک محدود رہ گیا جو مسلح ہو کر لڑنے کے لیے خود تیار تھے یا احکام وقت و مقام کے فرامین کے باعث لڑنے کے سوا کوئی راستہ نہیں پاتے تھے۔

یہ مسلمانوں کی حق شناسی تھی۔ وہ لڑنے کے خواہاں نہ تھے لیکن فتنہ و فساد ختم کر کے امن قائم کر دینے کے سلسلے میں لڑائی ان کے لیے ناگزیر ہو جاتی تھی۔ وہ کسی کو بالجبر مسلمان نہیں بنا سکتے تھے کیونکہ جبر دین کے سلسلے میں جائز ہی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ دین کوئی نوالہ نہیں تھا جسے زبردستی کسی کے حلق میں ٹھونس دیا جاتا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کے عقائد و اعمال درست ہو جائیں اور وہ صراط مستقیم کی پابندی اختیار کر لے۔ یہ مقصد صحت عقائد کے بعد پرخلوص اعمال ہی سے حاصل ہو سکتا تھا۔

قبول اسلام

البتہ یہ درست ہے کہ بیشتر افراد نے مسلمانوں کے حسن عمل، حسن سلوک اور حسن خدمت خلق سے متاثر ہو کر خود بخود اسلام قبول کر لیا۔ کچھ طبقے ایک مدت تک مسلمانوں کے دوش بہ دوش زندگیاں گزار کر خود بخود اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔ بعض طبقات ایسے بھی تھے جو بدستور پہلے مذاہب پر قائم رہے اور مسلمانوں نے ان کے لیے حفاظت کا جو عہد کر لیا تھا اسے بے تامل پورا کیا گیا۔ کبھی کسی کا کوئی حق شہریت اختلاف مذہب کی بنا پر نہ چھنا۔ خصوصاً

ابتدائی دور کے مسلمانوں کے متعلق حق شناسی کی متعدد مثالیں خود مولاناؒ کے اہم مضامین و مقالات میں پیش ہو چکی ہیں۔

احترام آدمیت یہ بھی واضح رہے کہ مسلمانوں نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ اس اعتبار سے بھی بہ ہمہ وجوہ مستحسن تھا کہ اس میں تمام افراد اور گروہوں کی آزادیِ عقیدہ، آزادیِ رائے اور آزادیِ عمل کا احترام ملحوظ رکھا گیا اور ساتویں صدی مسیحی میں عقیدے، رائے اور عمل کی آزادی کے ایسے احترام کی مثال شاید ہی مل سکے، جو مسلمانوں نے دینِ حق کی پیروی میں پیش کی۔ اسی کو عرفِ عام میں "احترامِ آدمیت" کہا جاتا ہے محض قولی احترام نہیں بلکہ صحیح اور محکم عملی احترام۔ جن ادوار کو اہلِ یورپ روشنی اور تہذیب کے ادوار قرار دیتے ہیں ان کی سرگزشت کا ایک ایک صفحہ احترامِ آدمیت سے یک قلم چشم پوشی کی مثبت دستاویز ہے۔

جزیے کے سلسلے میں باقی ضروری امور خود مولاناؒ نے اپنے مختصر سے ارشادات میں پیش کر دیے ہیں۔ (مولف)

(یہاں سے آخر تک مولاناؒ کے ارشادات ہیں)

صاغرون کا مفہوم فرمایا، حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کر جزیہ دے دیں اور ان کا گھمنڈ ٹوٹ چکا ہو۔ نہ صرف عربی زبان میں بلکہ تقریباً ہر زبان میں یہ محاورہ موجود ہے کہ کسی چیز کو خود اپنے ہاتھ سے دے دینا رضامندی سے دینا ہوتا ہے مثلاً اردو میں کہیں گے "تم اپنے ہاتھ سے اٹھا کر جو دے دو گے، لے لیں گے" یعنی اپنی خوشی سے جو کچھ دے دو، وہی ہمارے لیے بہت ہے۔ ٹھیک یہی مطلب عربی میں بھی اس ترکیب کا ہوتا ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا منظور کر لیں اور ان کا گھمنڈ اور ظلم جس نے انسان کے امن و راحت کو خطرہ میں ڈال دیا تھا، باقی نہ رہے[1]

نجرانی مسیحی عربی میں "جزیہ" خراج کے معنی میں بولا گیا ہے جو اراضی سے وصول کیا جاتا ہے اور ٹیکس کے لیے بھی جو اشخاص پر عائد ہوتا ہے۔ ایران اور روم میں اس طرح کے ٹیکس لیے جاتے تھے اور عرب کے جن حصوں نے ان کی (یعنی ایران و روم کی) باج گزاری منظور کر لی تھی وہ اس طرح کے ٹیکسوں سے آشنا ہو گئے تھے چنانچہ یہی وجہ ہے نجران (یمن) کے عیسائیوں کا جب وفد آیا، تو اس نے خود یہ بات پیش کی کہ ہم مسلمان نہیں ہوتے لیکن اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ آپ ہم پر جزیہ مقرر کر دیں۔ غالباً یہ جزیہ لینے کا پہلا واقعہ ہے جو تاریخ اسلام میں پیش آیا۔ اس کے بعد بحرین کے یہودیوں اور

---

[1] امام شافعیؒ نے "کتاب الام" میں تصریح کی ہے، سمعت عدداً من اھل العلم یقولون الصغار، ان یجری علیھم حکم الاسلام یعنی میں نے متعدد اہلِ اسلام سے سنا ہے کہ "وھم صاغرون" کا مطلب یہ ہے: ان پر اسلامی حکومت کے قوانین جاری ہو جائیں یعنی وہ اسلامی حکومت کے قوانین کے آگے جھک جائیں۔ [2] خود "جزیہ" کا لفظ بھی ایران کی پیداوار ہے یعنی فارسی لفظ "گزیت" سے معرب ہوا ہے اس بارے میں مولانا شبلی نعمانیؒ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ زمانہ حال کی نہایت قیمتی اسلامی تحقیقات میں سے ہے۔

مجوسیوں سے جزیہ لیا گیا۔

یہاں "جزیہ" لینے کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ذکر میں آیا، لیکن اصلاً حکم تمام غیر مسلموں کے لیے ہے، جو اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا منظور کر لیں۔ چنانچہ صدر اول سے لے کر آخر تک اسلامی حکومتوں کا عمل اسی پر رہا۔ خود آنحضرت صلعم نے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا، صحابہ نے صابیوں سے لیا اور خلفائے بنو امیہ و عباسیہ کا سندھ کے ہندوؤں اور پیروان بدھ سے جزیہ لینا معلوم ہے۔

البتہ عرب کے غیر مسلموں کے بارے میں اختلاف ہوا اور امام ابو حنیفہؒ اور قاضی ابو یوسفؒ اس طرف گئے ہیں کہ ان سے جزیہ پر مصالحت نہیں ہو سکتی لیکن اس بارے میں صحیح مذہب جمہور ہی کا ہے یعنی عرب و عجم کی کوئی تفریق نہیں کیونکہ خود آنحضرت صلعم اور صحابہؓ کا عرب کے غیر مسلموں سے جزیہ لینا ایک مسلّم واقعہ ہے۔

باقی رہے مشرکین عرب، تو ان کا سوال عملاً پیدا ہی نہیں ہوا، کیونکہ سورہ براۃ کے نزول کے بعد تمام مشرکین عرب مسلمان ہو چکے تھے اور حکمتِ الٰہی کا فیصلہ یہی تھا کہ جاہلیت عرب کا شرک پھر یہاں سر نہ اٹھائے۔

قرآن نے غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم کیوں دیا؟ اس لیے کہ حق و انصاف کا مقتضا یہی تھا اور اس لیے کہ وہ چاہتا تھا، مسلمانوں کے نظام حکومت میں غیر مسلموں پر اتنا بوجھ نہ ڈالا جائے، جتنا بوجھ مسلمانوں کو اٹھانا پڑے گا۔

اسلام نے مسلمانوں پر جنگی خدمت فرض کر دی تھی یعنی آجکل کی اصطلاح میں فوجی قانون جبری تھا اور اس لیے ضروری تھا کہ جو غیر مسلم اسلامی حکومت کے ماتحت شہری زندگی بسر کریں، وہ بھی ملک کی حفاظت کے لیے جنگ میں شریک ہوں لیکن اسلام نے اسے اسلام کے خلاف سمجھا کہ اس بارے میں غیر مسلموں پر جبر کیا جائے۔ اس نے یہ بات ان کی مرضی پر چھوڑ دی اور کہا اگر خود اپنی خوشی سے چاہو تو جنگی خدمات میں مسلمانوں کی طرح شریک ہو۔ نہ شریک ہونا چاہو تو اس کے بدلے ایک سالانہ رقم ادا کیا کرو۔ یہی رقم تھی جو غیر مسلموں کے لیے "جزیہ" ہوئی۔

عقائد و جذبات کی آزادی

فی الحقیقت انسان کے عقائد و جذبات کی آزادی کا یہ ایسا اعتراف تھا جس کا اس عہد میں کوئی دوسری قوم تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ کے لیے نکلنا اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ لینا ہے۔ مسلمان مسلمانوں کو اس کے لیے مجبور کر سکتے ہیں لیکن انھیں کیا حق ہے کہ غیر مسلموں کو اس کے لیے مجبور کر دیں؟

چنانچہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں غیر مسلموں کو جو سرکاری فرامین دیے گئے ان میں ہم صاف صاف اس کی تصریح پاتے ہیں، جو فوج میں شریک ہوگا اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا، جو نہ ہوگا اس سے جزیہ لیا جائے گا۔ بعض فرمانوں میں یہاں تک سہولت دی ہے کہ اگر عام طور پر شریک نہیں ہوتے، صرف ایک برس شریک ہو گئے تو اس برس کی رقم معاف ہو جائے گی۔ طبری نے تاریخ میں اور بلاذری نے فتوح البلدان میں یہ فرامین نقل کیے ہیں۔

مسلمانوں پر ٹیکس

یہ تو پہلی علت ہوئی۔ دوسری علت کا یہ حال ہے کہ اسلام نے مسلمانوں پر کئی طرح کے ٹیکسوں کا بوجھ ڈال دیا تھا۔ زکوٰۃ انھیں ادا کرنی چاہیے۔ عام صدقات و خیرات میں انھیں حصہ لینا چاہیے۔ جنگ پیش آ جائے تو اس کا بوجھ بھی اٹھانا چاہیے۔ پس ضروری تھا کہ غیر مسلم رعایا پر بھی ایسا ہی بوجھ ڈالا جاتا کیونکہ جہاں تک آزادی و حقوق کا تعلق ہے ان میں اور مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا تھا، لیکن اسلام نے ایسا نہیں کیا۔ غیر مسلموں کو حقوق تو مسلمانوں ہی کی طرح دیے لیکن مالی بوجھ مسلمانوں کی طرح نہیں ڈالا۔ ان تمام ٹیکسوں کے بدلے جو مسلمانوں پر عائد کیے تھے، صرف ایک ہی ٹیکس کی ادائی ضروری ٹھہرائی، یعنی جزیہ کی اور وہ بھی انھیں معاف کر دیا جو فوجی خدمات کے لیے تیار ہو جائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فی الحقیقت غیر مسلموں کے لیے بوجھ بھی نہ رہا اور حقوق سب کے سب رہے یعنی اگر ایک غیر مسلم ذمی فوجی خدمات سے انکار نہ کرے (جو خود اسی کے وطن کی حفاظت کے لیے ہوگی) تو وہ اسلامی حکومت میں آزادی و حقوق کی ٹھیک ویسی ہی زندگی بسر کرے گا، جیسی ایک مسلمان بسر کر سکتا ہے لیکن مسلمانوں کی طرح اسے کوئی ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑے گا۔

کیا اس طرزِ عمل کی کوئی دوسری نظیر تاریخ عالم پیش کی جا سکتی ہے؟

موسیو لیبان کا قول

جہاں تک غیر مسلموں کے مذہبی، معاشرتی اور شہری حقوق کا تعلق ہے۔ موسیو لیبان کا یہ قول کفایت کرتا ہے کہ "اسلامی حکومت کے ماتحت غیر مسلم ذمیوں کو وہ سب کچھ حاصل تھا جو کسی قوم کو حاصل ہو سکتا ہے، البتہ صرف ایک بات کا حق نہ تھا یعنی وہ خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے۔" (مولف)

باب ۹

فتح مکّہ

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (سورہ فتح : ۱)

—(۱)—

فتح مبین صلح حدیبیہ اس لحاظ سے بھی فتح مبین تھی کہ مسلمانوں اور مشرکوں کے میل جول کا دروازہ کھلا۔ مشرکوں کے لیے کلام الٰہی سننے اور اس کی پاکیزہ تعلیم کے دل آویز عملی نمونے قریب سے دیکھنے کے مواقع پیدا ہوئے۔ ان نمونوں کا درخشاں ترین جوہر ہم جنسوں کی بہتری، بہبود، خیر خواہی اور دنیا و عقبیٰ کی فلاح و صلاح کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر کیوں کر ممکن تھا کہ ان کی تاثیر کا اعجاز اپنا کام نہ کرتا۔ یہی صلح تھی جس نے آگے چل کر فتح مکہ کا راستہ ہموار کر دیا۔

یہ صلح بجائے خود بھی "فتح مبین" تھی کیونکہ مذہبی امور میں ظلم و جبر اور کشت و خون کا سلسلہ شروع کرنے کے ذمہ دار قریش مکہ تھے، جو انسانوں کے اعتقاد و ضمیر کی آزادی کا حق تسلیم نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بندگان حق کو قوت کے بل پر راہ راست سے پھرا دیں۔ بدر، احد اور خندق کی لڑائیاں صرف اس لیے ہوئی تھیں کہ مسلمانوں کو دعوتِ اسلام پر لبیک کہنے اور اس پر قائم رہنے کا کوئی حق نہیں۔ رسول اللہ صلعم اور آپ کے پیروؤں نے تیرہ سال تک ہر قسم کے ظلم و ستم صابرانہ برداشت کیے۔ جب زندہ رہنا دشوار ہو گیا تو وہ گھر بار اور دنیوی مال و متاع چھوڑ کر شمال کی ایک بستی میں جا بسے جو مکہ سے اڑھائی سو میل دور تھی۔ مخالفین نے وہاں بھی انھیں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ان کے تیر، ان کی تلواریں اور ان کی برچھیاں برابر مسلمانوں کے سر و سینہ پر برستی رہیں۔ ہجرت کے بعد بھی چھ سال تک مسلمان جا بجا خون شہادت و جراحت میں تڑپتے رہے۔ حدیبیہ میں پہلی مرتبہ قریش مجبور ہوئے کہ کم از کم دس سال کے لیے صلح کر لیں۔ یوں انھوں نے پہلی مرتبہ اپنے موقف سے دست برداری اختیار کی اور مسلمانوں کو اطمینان سے دعوت حق کی پُرامن اشاعت کا موقع ملا۔ اس معاملے پر غور و فکر کا بنیادی پہلو یہ نہ تھا کہ جو شرطیں حدیبیہ میں طے ہوئی تھیں ان میں سے بعض کے الفاظ کی ظاہری حیثیت کیا تھی؛ بنیادی پہلو یہ تھا کہ آزادی اعتقاد و ضمیر کے بارے میں جبر و قوت کس کا موقف تھا۔ نیز کون اس موقف سے (عارضی طور پر ہی سہی) دست بردار ہوا تھا۔ صلح حدیبیہ اس اعتبار سے بھی یقیناً "فتح مبین" تھی۔

قریش کی عہد شکنی دراصل قریش ایک ایسے چکر میں پڑ گئے تھے، جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ انھیں سوجھتا نہ تھا

ان میں لڑنے کی تاب و تواں نہیں رہی تھی۔ ان کی معاش تجارت پر موقوف تھی۔ تجارت امن و اطمینان کی متقاضی تھی۔ لڑائیوں نے امن کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ اسلام کا حلقہ قریش کی سختیوں اور شدتوں کے باوجود پھیل رہا تھا۔ مدینہ منورہ میں اسلام کی تنظیمی معجز نمائی نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ دیکھنے والوں کو صاف نظر آ رہا تھا، اب آخری فیصلہ برسوں نہیں مہینوں کی بات ہے جھوٹے غرور و تکبر نے قریش میں اعتراف حقائق کی صلاحیت بھی باقی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ کھلم کھلا مقابلے سے پہلو بچاتے تھے، لیکن جہاں انھیں کوئی ایسا موقع نظر آ جاتا کہ چھپ چھپا کر مسلمانوں کے خلاف کینہ و بغض کا اظہار کر سکیں، وہاں رُکتے بھی نہیں تھے۔

صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ قبائل عرب فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ اسی وقت بنو خزاعہ نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان مدت سے رقابت چلی آتی تھی۔ صلح حدیبیہ ان دونوں پر بھی حاوی تھی جس طرح قریش مکہ اور مسلمانوں پر حاوی تھی۔ صلح پر اٹھارہ یا اُنیس مہینے گزر چکے تھے کہ رجب یا شعبان ۸ھ (اواخر اکتوبر تا اواخر دسمبر ۶۲۹ء) میں بنو بکر میں سے نوفل بن معاویہ نے اپنے قبیلے کے بہت سے افراد ساتھ لے کر بنو خزاعہ پر اچانک شبخون مارا۔ بنو خزاعہ نے حدِ حرم میں پناہ لی جہاں کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ حملہ آور رک گئے مگر نوفل نے کہا، تم لوگوں کو حدِ حرم میں چوریاں کرتے ہوئے باک نہیں، پھر اپنا خون بہا لینے میں کیوں رکتے ہو؟ یہ موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ چنانچہ حملہ جاری رہا یہاں تک کہ بنو خزاعہ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر بُدَیل بن ورقا اور اس کے مولیٰ رافع کے مکانوں میں پناہ لی۔

یہ حملہ قریش کے ساتھ خفیہ ساز باز کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ طبری کا بیان ہے کہ عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو نے صورتیں بدل کر بنو بکر کے ساتھ تلواریں چلائیں[۱]۔

قریش کے لیے تین صورتیں

بنو خزاعہ میں سے عمرو بن سالم نے پچیس ناقہ سواروں کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ کر بارگاہ رسالت میں فریاد کی۔ پھر بدیل بن ورقا نے حاضر ہو کر حالات عرض کر دیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت رنج ہوا۔ یہ صریح بدعہدی تھی، جس کے ذمہ دار قریش تھے، خواہ بنو بکر کی شر انگیزی قریش کے ایماء کا نتیجہ تھی یا یہ خود بنو بکر کے کسی بُعض کا فعل تھا۔ حضور صلعم نے ایک قاصد قریش کے پاس بھیجا اور مندرجہ ذیل تین صورتیں پیش فرمائیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کر لی جائے:

۱۔ مقتولوں کا خون بہا دلایا جائے۔

۲۔ قریش بنو بکر کی حمایت سے دست کشی کا اعلان کر دیں۔

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص (۴۶۶-۴۶۷)

۳۔ صاف صاف کہہ دیں کہ معاہدۂ حدیبیہ ٹوٹ گیا۔

قرطبہ بن عمر نے قریش کی طرف سے کہا کہ صرف تیسری صورت منظور ہے[1]، یعنی یہ کہ معاہدۂ حدیبیہ ٹوٹ گیا۔

وقت کا ماحول اپنی بڑائی کے غلط تصور اور بے بنیاد کبر و نخوت کی سرمستی میں ایسے الفاظ کہہ لینا آسان تھا، جب ان کے نتائج کا اندازہ ہوا تو قریش پر سخت پشیمانی کی حالت طاری ہو گئی۔ کوئی نتیجہ خیز تدبیر ان کے ذہن میں نہیں آئی تھی، غزوۂ خندق کے بعد رسول اللہ صلعم کی نبوی بصیرت نے قریش کے داخلی و خارجی احوال و ظروف کا اندازہ کرتے ہوئے فرمادیا تھا کہ "الآن نغزوهم و هم لا يغزوننا" یعنی آیندہ قریش کو ہمارے خلاف یورش کا حوصلہ نہ ہوگا، ہم ان کے خلاف جنگ کے لیے نکلیں گے۔ اس ارشادِ مقدس کی تصدیق وقت کے ماحول کی ہر زبان کر رہی تھی۔ صلح حدیبیہ قریش کی بے بسی پورے عرب پر آشکارا کر چکی تھی۔ بنو قریظہ کا بھی فیصلہ ہو چکا تھا جو مدینہ منورہ میں قریش کے لیے دست و بازو کا کام دے سکتے تھے بلکہ خیبر بھی مسخر ہو چکا تھا اور یہودیوں کی قوت پر حجاز میں آخری کاری ضرب لگ چکی تھی۔ جنگ موتہ میں راہ حق کے تین ہزار غازیوں کی مختصر سی جماعت مدینہ منورہ سے سیکڑوں میل شمال میں ایک لاکھ مخالفوں کو میدان جنگ سے ہٹ جانے پر مجبور کر چکی تھی۔ قریش کا اضطرار و اضطراب بے وجہ اور بے سبب نہ تھا۔

بے دلی کی تدبیریں غرض قریش نے ابوسفیان کو معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کے لیے مدینہ منورہ بھیج دیا۔ ان کے بچاؤ کا یہ واحد راستہ تھا۔ ابوسفیان سب سے پہلے اپنی صاحبزادی ام المومنین ام حبیبہؓ کے پاس پہنچا اور حضور صلعم کے بستر مبارک پر بیٹھنا چاہا۔ ام المومنین نے معاً یہ فرما کر بستر مبارک لپیٹ دیا کہ آپ مشرک ہیں اور یہ گوارا نہیں کہ آپ رسول اللہ صلعم کے بستر پر بیٹھیں۔ پھر ابوسفیان نے بارگاہ نبوی میں اپنا مدعا بیان کیا۔ آپؐ نے کچھ جواب نہ دیا۔ بعدازاں وہ یکے بعد دیگر حضرت صدیقؓ، حضرت فاروقؓ، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے امداد کا خواستگار ہوا۔ سب نے اس معاملے میں مداخلت سے معذوری ظاہر کر دی۔ آخر میں حضرت حسنؓ کو واسطہ بنا لینا چاہا، جن کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ پھر مسجد النبیؐ میں یہ اعلان کر کے مکہ مکرمہ روانہ ہو گیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔ اہل مکہ کو یہ حالات بے کم و کاست سنا دیے ان پر واضح ہو گیا کہ نہ یہ صلح ہے جس پر اطمینان سے بیٹھے رہیں اور نہ حالت جنگ ہے، جس کے لیے تیاری کر لیں۔

حاطبؓ کا واقعہ اسی اثنا میں اسلامی لشکر تیار ہو کر ۱۰ رمضان ۸ھ (یکم فروری ۶۳۰ء) کو روانہ ہو گیا۔ لیکن رسول اللہ صلعم نے پورا اہتمام فرما لیا تھا کہ اس لشکر کی کوئی خبر آخری وقت تک

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۶۷ مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ زرقانی نے مغازی ابن عائذ سے نقل کیا ہے۔

اہل مکہ کو خبر پہنچنے پائے۔ عام مصلحتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اس اعتبار سے بھی یہ تدبیر بے حد ضروری تھی کہ حرم پاک میں خونریزی نہ ہو اور محض لشکر کی نمایش ہی اہل مکہ کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دے۔

حاطبؓ بن ابی بلتعہ اللخمی نے ایک رقعہ خفیہ ایک عورت کے ہاتھ قریش کے پاس بھیج دیا، جس میں جنگی تیاریوں کا ذکر تھا۔ رسول اللہ صلعم کو اس کی اطلاع مل گئی۔ آپؐ نے علیؓ، زبیرؓ اور مقدادؓ کو بھیج دیا کہ روضۂ خاخ[1] پہنچ کر عورت سے رقعہ چھین لائیں۔ یہ رقعہ رسول اللہ صلعم کی بارگاہ میں پیش ہوا تو حاطبؓ کی اس حرکت پر سب کو حیرت ہوئی۔ حضور صلعم نے حاطبؓ سے پوچھا تو انھوں نے گزارش کی: یا رسول اللہ میرے معاملے میں عجلت نہ فرمائیے۔ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہوں۔ مرتد نہیں ہوا۔ میرے بیوی بچے مکہ مکرمہ میں ہیں۔ میں وہاں کا نہیں، باہر کا آدمی ہوں۔ قریش کا صرف حلیف ہوں۔ اپنے اقربا کی حفاظت کے خیال سے میں نے چاہا تھا کہ قریش پر احسان کر دوں۔ حضور صلعم نے یہ عذر سنتے ہی حاطب کو معافی سے مشرف فرمایا

حاطبؓ معزز اور مخلص صحابی تھے۔ جنگ بدر میں شریک رہے تھے۔ پھر انھیں دعوت نامۂ اسلام دے کر مقوقس کے پاس مصر بھیجا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ اگر حکم ہو تو حاطبؓ کی گردن اڑا دوں۔ رحمت عالم و عالمیان نے فرمایا: عمرؓ! تمھیں کیا معلوم، خدا نے اہل بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے کچھ مواخذہ نہیں۔

یعنی غزوۂ بدر میں شرکت نیکی اور خدمت حق کا اس درجہ عظیم القدر کارنامہ تھی جس کے سامنے ہر قسم کی خطائیں بالکل ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔

یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کا غصہ رقت میں بدل گیا اور بولے اللہ اور اللہ کا رسول (صلعم) بہتر جانتے ہیں۔

عباسؓ اور بعض دوسرے اقربا

اب حضرت عباسؓ اور بعض دوسرے اقربا پر آشکارا ہو چکا تھا کہ آخری فیصلے کی ساعت آ پہنچی ہے چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلعم کی بارگاہ میں حاضری کا فیصلہ کر لیا۔ ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب اور عبد اللہ بن ابی امیہ مکہ مکرمہ سے نکل کر ابوایں اسلامی لشکر سے مل گئے[2]۔ ابو سفیان رسول اللہ صلعم کے چچیرے بھائی تھے اور انھوں نے بھی حضرت حلیمہ سعدیہ کا دودھ پیا تھا۔ اس وجہ سے آپؐ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ عبد اللہ بن ابی امیہ، ام المومنین حضرت ام سلمہ کے سوتیلے بھائی رسول اللہؐ کی پھوپھی عاتکہ کے فرزند تھے۔ ان دونوں کو حضرت ام المومنین کی سفارش سے معافی مل گئی۔ ابو سفیان اپنی سابقہ روش پر اس درجہ پشیمان تھے کہ کہتے تھے، اگر معافی نہ ملی تو بال بچوں کو لے کر عرب کے ریگستانوں میں چلا جاؤں گا اور

---

[1] روضہ خاخ ذوالحلیفہ (موجودہ آبار علی) کے نزدیک مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کے راستے پر ہے اور مدینہ منورہ سے بارہ میل ہوگا۔

[2] ابن حزم کی "جوامع السیرۃ" میں ہے کہ نیق العقاب میں ملے تھے، جو جحفہ کے قریب ہے۔ (ص: ۲۲۷)

وہیں بھوک پیاس سے مرکھپ جاؤں گا۔ معافی کے بعد حضور صلعم کے ساتھ محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنی پہلی روشش پر ندامت کے باعث آپؐ کے سامنے سر نہیں اٹھاتے تھے۔ خود حضور صلعم نے فرمایا: ہیں امید ہے کہ ابو سفیانؓ ہمارے چچا حضرت حمزہؓ کے قائم مقام ثابت ہوں گے۔ جنگ حنین کے آغاز پر لشکر اسلام میں ابتری پھیلی تھی تو ابو سفیانؓ رسول اللہ صلعم کے گھوڑے کے ساتھ تھے اور وہ گنتی کے ان اصحاب میں تھے جو ابتدا میں اسلامی لشکر کے بکھر جانے پر رسول اللہ صلعم کے گرد ثابت قدمی سے جمے رہے۔

حضرت عباسؓ اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ روانہ ہوئے تھے اور ذوالحلیفہ میں رسول اللہ صلعم سے مل گئے۔ سامان وغیرہ مدینہ منورہ بھیج دیا اور خود اسلامی لشکر کے ساتھ مکہ لوٹ آئے[1]۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عباسؓ جحفہ میں رسول اللہ صلعم سے ملے تھے جو رابغ کے قریب ہے۔

ابو سفیان بن حرب کا اسلام

اسلامی لشکر مرّ الظّہران[2] پہنچا تو رسول اللہ صلعم کے فرمان کے مطابق فوج کے تمام دستوں نے الگ الگ آگ روشن کی تا کہ دیکھنے والوں کو دُور ہی سے فوج کی کثرت کا اندازہ ہو جائے اور لڑے بھڑے بغیر ہی معاملہ اختتام کو پہنچ جائے۔ حضرت عباسؓ کو تشویش تھی کہ اگر قریش نے اس لشکر کا مقابلہ کیا تو وہ مٹ جائیں گے۔ اس لیے وہ رسول اللہ صلعم کے سفید خچر پر سوار ہو کر نکلے کہ کوئی مل جائے تو اس کے ہاتھ قریش کو پیغام بھیج دیں، رسول اللہ صلعم سے معافی مانگو اور صلح کر لو۔

مکہ مکرمہ سے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے)، ابو سفیان بن حرب اور بُدیل بن ورقا اسلامی لشکر کی تحقیق کے لیے نکلے۔ وہ اراک[3] پہنچے تو اسلامی لشکر کی آگ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ بدیل نے کہا کہ یہ بنوخزاعہ کی آگ ہے۔ ابو سفیان بولا کہ بنوخزاعہ قلیل و ذلیل ہیں یہ آگ ان کی نہیں ہو سکتی۔ اس اثنا میں حضرت عباسؓ بھی وہاں آپہنچے تھے۔ انھوں نے ابو سفیان کی آواز پہچان لی تھی۔ بتایا کہ رسول اللہ صلعم اپنے اصحاب کے ساتھ ہیں، اب قریش کی خیر نہیں۔ ابو سفیان نے پوچھا کیا کیا جائے؟ حضرت عباسؓ بولے: میرے پیچھے خچر پر سوار ہو جاؤ۔ رسول اللہ صلعم کی بارگاہ میں پہنچ کر تمھارے لیے امان طلب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

غرض حکیم بن حزام اور بُدیل بن ورقا واپس چلے گئے۔ ابو سفیان کو حضرت عباسؓ اپنے پیچھے بٹھا کر لے گئے۔ جس آگ کے پاس پہنچتے، لوگ پوچھتے کون ہے؟ پھر رسول اللہ صلعم کے خچر اور حضرت عباسؓ کو پہچان کر بیٹھ جاتے۔ حضرت عمرؓ

---

[1] "جوامع السیرۃ" ص ۲۲۷ [2] جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ مقام آجکل وادی فاطمہ کہلاتا ہے "معجم البلدان" اور "وفا الوفا" میں اسے "مرّان" لکھا ہے۔ [3] یہ مکہ مکرمہ اور وادی فاطمہ کے درمیان ایک وادی ہے نیز کہا جاتا ہے کہ قبیلہ ہذیل کا ایک ٹیلا ہے۔

کی آگ کے سامنے پہنچے تو حضرت خود دیکھنے کے لیے نکلے اور ابوسفیان کو دیکھ کر بولے، یہ تو خدا کا دشمن ابوسفیان ہے۔ اس سے مخاطب ہو کر کہا، الحمد للہ کہ تجھ پر کسی شرط یا عہد کے بغیر قابو پانے کا موقع مل گیا۔ پھر تیزی سے بارگاہ نبویؐ کی جانب روانہ ہوئے کہ حضور صلعم سے اجازت لے لیں۔ اس اثنا میں حضرت عباسؓ خچر کو دوڑا کر پہلے حضور صلعم کی بارگاہ میں پہنچ گئے تھے۔ حضرت عمرؓ بھی جلد ہی جا پہنچے اور ابوسفیان کے قتل کی اجازت مانگی۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے ابوسفیان کو پناہ دے دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے مزید کچھ کہنا شروع کیا تو حضرت عباسؓ بولے، عمرؓ! اگر یہ بنی عدی بن کعب (حضرت عمرؓ کا قبیلہ) میں سے ہوتا تو تم یہ نہ کہتے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: عباسؓ! یہ آپ نے کیا کہا، خدا کی قسم آپ کا اسلام میرے نزدیک اپنے باپ خطاب کے اسلام سے زیادہ محبوب ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ کا اسلام رسول اللہ صلعم کو خطاب کے اسلام سے زیادہ عزیز ہے۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا: ابوسفیان کو اس وقت لے جاؤ اور صبح میرے پاس لانا۔

صبح ہوئی اور حضرت عباسؓ ابوسفیان کو لے کر حاضر ہوئے تو حضور صلعم نے فرمایا: ابوسفیان! بڑا افسوس ہے کیا تجھ پر اب تک یہ حقیقت آشکارا نہیں ہوئی کہ ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔

ابوسفیان: میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ کتنے حلیم اور کتنے کریم ہیں اور صلہ رحم کا آپ کو کس درجہ خیال ہے اب تو میرا گمان بھی یہی ہے کہ اگر اور کوئی معبود ہوتا تو ضرور ہماری مدد کرتا۔

رسول اللہ صلعم: بڑا افسوس ہے ابوسفیان، کیا ابھی تک یہ حقیقت تیرے ذہن نشین نہیں ہوئی کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

ابوسفیان: میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ کتنے حلیم اور کتنے کریم ہیں اور صلۂ رحم کا آپ کو کس درجہ خیال ہے۔ البتہ اس معاملے کے متعلق ابھی تک میرے دل میں تردد ہے۔

حضرت عباسؓ نے ابوسفیان سے کہا کہ اسلام قبول کر لے ورنہ لوگ ابھی تیری گردن اڑا دیں گے۔

ابوسفیان نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ پھر حضرت عباسؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ابوسفیان فخر کو پسند کرتا ہے اس لیے کسی خاص بات کا انتظام فرما دیجیے۔

حضور صلعم نے فرمایا: جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اسے امن ہے۔ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اسے امن ہے۔ جو مسجد حرام میں چلا جائے، اسے امن ہے۔ (مولف)

باب ۱۶

فتح مکّہ

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (سورۂ فتح : ۱)

—(۲)—

ابوسفیان کی مساعیِ امن

اسلامی لشکر ۲۰۔ رمضان ۸ھ (۱۱۔ فروری ۶۳۰ء) کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوا۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا کہ لشکر منزل مقصود کی طرف کوچ کرے تو ابوسفیان کو کسی مناسب مقام پر کھڑا کرکے اس کا نظارہ دکھا دیا جائے۔ اس سے مقصود نمائش نہ تھی۔ حاشا و کلا۔ مقصود محض یہ تھا کہ ابوسفیان کو یقین ہو جائے، جس قوت کے ساتھ رسول اللہ صلعم آئے ہیں اس کا مقابلہ بالکل بے سود ہوگا۔ جو جیش اپنے خاص پرچم کے ساتھ گزرتا ابوسفیانؓ عباسؓ سے پوچھتا کہ یہ کون ہیں؟ عباسؓ بتاتے جاتے۔ ابوسفیان اس وقت تک جدید الاسلام تھے اور ان کی نظر محض مادی طاقت وقوت پر تھی۔ اس لیے مرعوبیت کے عالم میں اسی کا ذکر کرتے۔ حضرت عباسؓ بتاتے جاتے کہ یہ نبوت کی طاقت ہے۔ انصار کی سالاری کا پرچم سعدؓ بن عبادہ کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے ابوسفیان کو دیکھتے ہی پکار کر کہا:

الیوم یوم الملحمہ، الیوم تستحل الکعبۃ۔ — آج گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔

یہ محض اک گونہ تعریض تھی، جس سے ایک پُرجوش مجاہد حق، قدیم دشمن کو دیکھ کر باز نہ رہ سکا اور غالباً حضرت سعدؓ بن عبادہ کو اس وقت تک ابوسفیانؓ کے اسلام کا بھی علم نہ تھا۔ رسول اللہ صلعم کو اس کا علم ہوا تو فرمایا:

کَذَبَ سَعدٌ ولکن ھٰذا یوم یعظم اللّٰہ فیہ الکعبۃ و یوم تکسٰی فیہ الکعبۃ[1] — سعدؓ نے غلط کہا۔ یہ ایسا دن ہے کہ اللہ تعالیٰ کعبے کی عظمت بڑھائے گا اور کعبے کو لباس پہنایا جائے گا۔

یہ بھی مذکور رہے کہ علم سعدؓ سے لے کر اس کے فرزند قیسؓ کے حوالے کر دیا گیا۔

غرض ابوسفیان یہ منظر دیکھتے ہی تیزی سے مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور پکار کر قریش سے کہا کہ محمد صلعم آ گئے اور کسی میں ان سے مقابلے کی طاقت نہیں۔ جو میرے گھر میں داخل ہو جائے اسے امن ہے۔

ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ یہ سن کر اتنے غصے میں آئی کہ شوہر کی مونچھ پکڑ لی اور چلائی کہ اسے بنی کنانہ

---

[1] بخاری، کتاب المغازی باب غزوۃ الفتح۔

اس کم بخت کو قتل کر دو۔ لوگ جمع ہو گئے۔ ابوسفیان نے پھر کہا، اس سے کچھ نہ ہو گا۔ محمدؐ کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا جو میرے گھر میں آجائے گا، اسے امن ہے۔ لوگوں نے کہا، سب تیرے گھر میں کیونکر سما سکتے ہیں؟ ابوسفیان نے کہا: جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے اسے امن ہے۔ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اسے امن ہے۔

مکہ مکرمہ میں داخلہ رسول اللہ صلعم کدا کی طرف سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ یہ اس ٹیلے کا نام ہے جو شہر کے بالائی حصے میں یعنی شمالی جانب ہے۔ اسی طرف جنت المعلی ہے جو کہ مکہ مکرمہ کا مشہور قبرستان ہے وہیں آپ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا۔ زبیرؓ بن العوام کو حکم ہوا کہ وہ اس راستے سے بڑھیں جو وادی فاطمہ سے آتا ہے اور شہر مکہ مکرمہ کی مغربی جانب واقع ہے۔ اسی راستے میں جدّہ کا راستہ مل گیا ہے۔ پھر جنوبی و مغربی گوشے سے یہ شہر کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ سعدؓ بن عبادہ والا لشکر اسی راستے سے کدا کی طرف مڑا تھا اور رسول اللہ صلعم کی خیمہ گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ خالدؓ بن ولید کو ہدایت فرمائی گئی کہ وہ مسفلہ یعنی مکہ مکرمہ کے زیریں حصے سے، جو جنوبی جانب تھا، شہر میں داخل ہوں۔ مکہ مکرمہ اور حوالی کے نقشے سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس طرح شہر میں آنے والے تمام راستوں پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ خونریزی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ حکیم بن حزام کے گھر کو بھی جائے امن قرار دے دیا گیا۔

حضور صلعم کے داخلے کی کیفیت یہ ہے کہ آپ ناقہ پر سوار تھے۔ آپ کے پیچھے زید بن حارثہ کا فرزند اسامہؓ تھا۔ حضور صلعم کا فرق مبارک جھکا ہوا تھا اور سورۂ فتح کی تلاوت فرما رہے تھے۔

بنی اسرائیل کے لیے شہر میں فتح مندانہ داخل ہونے کا حکم قرآن مجید میں دو مرتبہ یوں مذکور ہے:

۱۔ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ۔ (البقرہ، ۵۸)

اور کہا (اس وقت کی یاد بھی تمہارے اندر کوئی عبرت پیدا نہیں کر سکتی) جب ایک شہر کی آبادی تمہارے سامنے تھی، اور ہم نے حکم دیا تھا کہ اس آبادی میں (فتحمندانہ) داخل ہو جاؤ اور کھاؤ پیو، آرام چین کی زندگی بسر کرو۔ لیکن جب شہر کے دروازے میں قدم رکھو تو تمہارے سر اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہوں اور تمہاری زبانوں پر توبہ و استغفار کا کلمہ ہو۔ اگر تم نے ایسا کیا اللہ تمہاری خطائیں معاف کر دے گا۔

۲۔ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ (اعراف، ۱۶۱)

اور جب بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں جا کر آباد ہو جاؤ اور جس جگہ سے چاہو اپنی غذا حاصل کرو اور تمہاری زبانوں پر حطۃ کا کلمہ جاری ہو اور اس کے دروازے میں داخل ہو تو تمہارے سر (اللہ کے حضور) جھکے ہوئے ہوں ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے۔

"حطۃ" کے معنی ہیں، "الٰہی ہمیں گناہوں سے پاک کر دے"۔ اور معاملہ فلسطین کے اس شہر کا تھا جسے یریحو یا اریحا کہتے ہیں۔ یہ دریائے اردن کے مغربی کنارے پر واقع ہے لیکن یہودیوں نے اس ارشاد کو پس پشت ڈال دیا۔ آج بھی یہود کی کافر نعمتی کا یہی رنگ ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کفران نعمت کی پاداش میں ذلیل وخوار ہوئے۔ اس ارشاد باری کا مکمل عملی نمونہ رسول اکرم صلعم نے فتح مکہ کے دن پیش فرمایا اور ارشاد باری تعالیٰ پر صحیح اور مکمل نمونہ اس پاک رسول صلعم کے سوا کہاں مل سکتا ہے، جن کا اسوۂ حسنہ قیامت تک کے لیے عالم انسانیت کے سامنے ایک الٰہی آئینہ ہے۔

فتنہ انگیزوں کی مذبوحی حرکت

مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلعم کے داخلے کے وقت آبادی کے مختلف حصوں کی کیفیت مختلف تھی۔ بعض لوگ رفتہ رفتہ اس رائے پر آ گئے تھے کہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے پیروؤں سے کشمکش بالکل بے معنی ہے۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ لڑائیاں بند ہو جائیں اور تجارت کا کاروبار پہلے کی طرح اطمینان سے ہونے لگے۔ ایک گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو ابتدا سے مخالفت میں پیش پیش رہے تھے مگر مخالفت کا ہر قدم ان کے لیے وجہ پشیمانی بنتا رہا۔ اب یہ صورت حال ان کے لیے بیزاری کا باعث بن گئی تھی اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ختم ہو جائے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح ختم ہو۔ بیوقوف، کینہ توزوں اور حقیقت ناشناسوں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا، جو بہر حال فتنہ انگیزی پر تلا ہوا تھا، اگرچہ انجام کتنا ہی برا ہوتا۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم کے داخلے کے وقت بھی اس گروہ نے مخالفت نہ چھوڑی۔ سب سے الگ رہ کر اوباشوں کا جتھا فراہم کر لیا اور جبل خندمہ پر جا بیٹھے جو جبل بوقبیس کے مشرقی جانب مکہ مکرمہ کا مشہور پہاڑ ہے۔ ان میں سے عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو اور حماس بن قیس بن خالد کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے خالدؓ بن ولید کے لشکر میں سے کرزؓ بن جابر الفہری اور خنیس بن خالد بن ربیعہ کو شہید کر ڈالا جو لشکر سے الگ ہو کر کسی اور راستے پر ہو لیے تھے۔ حضرت خالدؓ کو اس واقعے کا علم ہوا تو پلٹے اور فتنہ انگیزوں کو قتل کرنے لگے۔ تیرہ مارے گئے، باقی بھاگ نکلے۔

حماس بن قیس کا واقعہ ایک لطیفہ بن گیا۔ وہ اپنے ہتھیار درست کرنے لگا تو بیوی نے پوچھا کہ کس سے لڑنے کا اہتمام ہے؟ بولا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب سے۔ بیوی نے کہا: ان کے سامنے یہ کچھ کام نہ دے سکیں گے۔ اس نے جواب میں ایک فخریہ شعر پڑھا اور روانہ ہو گیا۔ جب حضرت خالدؓ کے مقابلے سے بھاگ کر گھر پہنچا تو بیوی نے پوچھا وہ دعوے کیا ہوئے؟ اپنی کیفیت چند شعروں میں بیان کی جن کا ترجمہ یہ ہے:

کاش تو خندمہ میں ہوتی تو دیکھتی جب صفوان بھاگ گیا اور عکرمہ بھاگ گیا۔

اور ابویزید (سہیل بن عمرو) ستون کی طرح کھڑا رہ گیا مقابلے کے لیے جو تلواریں چمکیں

وہ بازو اور سر اڑا رہی تھیں۔ اور خرابی کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

ہمارے پیچھے "ہوُں" "ہوُں" کے آوازے تھے یہ سب کچھ دیکھتی تو اپنی زبان سے ملامت کا ایک حرف بھی نہ نکالتی۔

حرم پاک کی تطہیر حرم پاک میں بُت پرستوں نے تین سو ساٹھ بت جا بجا آراستہ کر رکھے تھے۔ حضور صلعم داخل ہوئے تو دست مبارک میں کمان تھی۔ اس کی نوک سے ہر بت کو گراتے جاتے۔ ساتھ ساتھ یہ آیت زبان مبارک پر جاری تھی:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ دیکھو حق ظاہر ہوگیا اور باطل نابود ہوا اور باطل اسی لیے تھا کہ نابود ہو کر رہے۔ (بنی اسرائیل، ۸۱)

جو بُت زیادہ بلندی پر نصب تھے اور وہاں تک دست مبارک نہیں پہنچ سکتا۔ انھیں گرانے کے لیے حضرت علیؓ کو دوش مبارک پر کھڑا کیا۔ حضرت علیؓ نے انھیں توڑا اور گرا دیا۔ اس طرح حرم پاک کی تطہیر بھی پایۂ تکمیل پر پہنچ گئی اور قریش پر یہ بھی آشکارا ہوگیا کہ بت کسی کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان کا ہدف بنا سکتے ہیں بلکہ اپنی جنبش کے لیے بھی انسانوں کے محتاج ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور فرشتوں کی تصویریں بھی مٹا دی گئیں۔ پھر آپؐ نے کعبے کا طواف کیا، دروازہ کھلوا کر اندر نماز ادا کی۔ اس وقت آپؐ کے ساتھ صرف اسامہؓ بن زید اور بلالؓ بن رباح تھے۔ بیت اللہ کی کلید عثمان بن طلحہ کے حوالے کر دی اور فرمایا قیامت تک یہ تمھارے ہی پاس رہے گی۔ حضرت بلالؓ نے کعبے میں پہلی مرتبہ مستقل حیثیت سے اذان دی۔

خطبۂ نبویہ قریش صحن مسجد میں صفیں باندھے آپؐ کا انتظار کر رہے تھے۔ آپؐ نے باب بیت اللہ کے دونوں بازو پکڑ کر فرمایا:

لا اله الا الله وحده لا شريك له، صدق وعده و نصر عبده هزم الاحزاب وحده۔ الاكلُّ ماثرةٍ او دمٍ او مالٍ يُدعىٰ فهو تحت قدمیّ هاتين إلّا سَدَانَةَ البيت وسقاية الحجاج۔ يا معشر قريش ان الله قد اَذهَبَ عنكم نخوة الجاهلية و تعظُّمها بالاٰباء۔ الناسُ من اٰدم و اٰدم من تراب۔

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یگانہ و یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پُورا کر دکھایا۔ اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور تمام مخالف جتھوں کو تنہا توڑ ڈالا۔ ہاں تمام مفاخر، تمام انتقامات، تمام خون بہا میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کے لیے پانی کا انتظام مستثنیٰ ہیں۔ اے قریش! جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

پھر یہ آیت پڑھی:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۔ (حجرات ، ۱۲)

لوگو ! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ تمھارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ تم ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ۔ خدا کے نزدیک زیادہ عزت کا مستحق وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ خدا دانا اور واقف کار ہے۔

دیکھیے ! الناس من آدم و آدم من تراب ؛ انسانی مساوات کے درس کے لیے کل سات الفاظ ہیں ، لیکن ان میں وہ سب کچھ آگیا جو مساوات کے باب میں کہا جا سکتا ہے اور مساوات کی بنیادی دلیل بھی پیش کر دی جس سے اختلاف کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ یعنی جب تمام انسان حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں تو وہ کالے ہوں یا گورے ، پیلے ، شرقی ہوں یا غربی ، کسی قوم کے ہوں ، کسی ملک کے ہوں ، کسی خطّے کے ہوں ، سب بھائی ہیں۔ بھائیوں میں اصولاً اونچ نیچ کا مطلب کیا ؟ انسانی عظمت کا انحصار نہ رنگ پر ہے ، نہ نسل و خاندان پر ، نہ دولت پر۔ اس کا انحصار صرف تقویٰ اور حسن عمل پر ہے۔ انسانوں کے لیے مسابقت کا میدان صرف تقویٰ ہے۔ ہر معاملے میں مسابقت ، رقابت اور حسد کا باعث ہوتی ہے لیکن تقویٰ میں ایسی کوئی چیز آ ہی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ وہ منافی تقویٰ ہوگی۔

عفو عام

پھر آپؐ قریش سے مخاطب ہوئے۔ پوچھا : تمھارا کیا خیال ہے کہ میں آج تم سے کیسا سلوک کرنے والا ہوں ؟ سب نے کہا ، آپؐ کریم ہیں ، کریم کی اولاد ہیں ۔ آپؐ سے صرف خیر اور بھلائی کی امید ہے۔ فرمایا : میں آج وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا : لا تثریب علیکم الیوم (آج میری طرف سے تم پر کوئی سرزنش نہیں) انتم الطلقاء (جاؤ آج تم سب آزاد ہو) ۔

تاریخ عالم کے اوراق کھنگال ڈالیے ، اس کمال حسن سلوک کی کوئی مثال نہیں مل سکے گی۔ یہ عفو عام ان لوگوں کے لیے تھا ، جو اکیس سال تک حضور صلعم اور آپؐ کے پیرووں کے خلاف اذیتوں ، دکھوں اور مصیبتوں کے وہ تمام طوفان برابر برپا کرتے رہے تھے جو ان کے بس میں تھے۔ ان کی تلواریں ، ان کی برچھیاں ، ان کے تیر مسلسل آپؐ پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر برستے رہے تھے۔ کیا خوب فرمایا مولانا آزاد مرحوم و مغفور نے اسوۂ حسنہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہ :

> مظلومی میں صبر ، مقابلے میں عزم ، معاملے میں راست بازی اور طاقت و اختیار میں درگزر ، تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے۔

یہی اسوۂ حسنہ قیامت تک ہر انسان کے لیے دنیا و آخرت میں فوز و فلاح کی ابدی دستاویز ہے۔

مکہ مکرمہ میں اسی موقع پر ایک واقعہ پیش آیا جو اس بنا پر بطور خاص قابل ذکر ہے کہ اس سے رسول اللہ صلعم کی رحیمی اور کریمی کی شان بوجہ احسن آشکارا ہوتی ہے۔ ایک شخص حضور صلعم سے کوئی بات کرنے کے لیے آیا۔ سامنے پہنچا تو ہیبت نبوت سے اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ حضور صلعم نے یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا :

هون علیك فانی لست بملك انما انا ابن امراة قریش، تاكل القدید۔ کچھ پروا نہ کرو۔ میں بادشاہ نہیں، قریش کی ایک غریب خاتون کا فرزند ہوں جو سُوکھا گوشت کھاتی تھی[1]

کعبے کی حُرمت فتح مکہ سے دوسرے روز بنو خزاعہ نے ہذیل کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ حضور صلعم نے پھر خطبہ دیا، فرمایا:

لوگو! اللہ تعالیٰ نے جس روز زمین و آسمان پیدا کیے، اسی روز مکہ کو مقام حرمت قرار دیا۔ یہ اس وقت سے برابر مقام حرمت چلا آ رہا ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گا۔ جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کے لیے جائز نہیں کہ مکہ میں کسی کا خون بہائے یا یہاں سے کوئی درخت کاٹے۔ مجھ سے پہلے کسی بھی شخص کے لیے مکہ حلال نہیں ہُوا اور نہ میرے بعد آنے والے کسی شخص کے لیے حلال ہوگا میرے لیے بھی صرف وقتی طور پر اس وجہ سے حلال ہوا کہ اہل مکہ پر اظہار غضب مقصود تھا۔ سن لو، اس وقت کے بعد حرمت کل کی طرح لوٹ آئی۔ جو بھی یہاں موجود ہے اور میری بات سن رہا ہے، اسے چاہیے کہ یہ حقیقت ان لوگوں تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔

پھر بنو خزاعہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ قتل بہت ہو چکا۔ اس میں کچھ نفع نہیں۔ تم نے جو قتل کیا، اس کا خون بہا میں دوں گا۔ اس کے بعد مقتول کے وارثوں کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہوگا۔ چاہیں قصاص لیں، چاہیں خون بہا وصول کریں۔

عفو سے مستثنیٰ لوگ جن لوگوں کو عفو عام سے مستثنیٰ رکھا گیا، ان کی تعداد بعض اصحاب نے سترہ تک پہنچائی ہے، جن میں سے گیارہ مرد اور چھ عورتیں تھیں کیونکہ ان کے ذمے خاص جرائم تھے۔ مثلاً

۱۔ عبدالعزیٰ بن خطل: اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے اسے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا اور انصار میں سے ایک مسلمان اس کے ساتھ کر دیا گیا۔ عبدالعزیٰ زود رنج اور تیز مزاج آدمی تھا۔ ساتھی سے ذرا کسی کام میں کوتاہی ہُوئی۔ عبدالعزیٰ نے غصے میں اسے شہید کر ڈالا اور صدقے کے جانور لے کر بھاگ گیا۔ اس لیے ان جرائم کی بنا پر قتل کی سزا تجویز ہوئی۔

۲۔ صفوان بن امیہ الجمحی: یہ اسلام و مسلمین کا سخت مخالف تھا۔ جبل خندمہ کی فتنہ انگیزی میں بھی پیش پیش تھا۔ فتح مکہ کے بعد بھاگ گیا۔ یمن کا قصد تھا۔ جدہ پہنچا تو عُمیر بن وہب نے حضور صلعم سے صفوان کے امن کی التجا کی۔

---

[1] بخاری بحوالہ "رحمۃ للعالمین" جلد اول ص ۳۴۰۔ عربوں میں یہ طریقہ رہا تھا کہ گوشت کو نمک لگا کر خشک کر لیتے تھے تاکہ مدت تک استعمال کریں۔ افغانستان اور ترکستان میں بھی یہ طریقہ رائج تھا گویا روزانہ تازہ گوشت کھانا انھیں نصیب نہ تھا۔

حضور صلعم نے اس التجا کو شرف قبول بخشا۔ عُمیر نے کسی نشان کے لیے درخواست کی۔ حضور صلعم نے اپنا عمامہ عطا فرمایا۔ یوں صفوان خدمت نبوی میں پہنچا اور عرض کیا، عُمیر کہتے ہیں کہ آپ نے معاف فرما دیا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ فرمایا: ہاں صحیح ہے۔ صفوان نے کہا کہ مجھے اسلام کے لیے دو مہینے کی مہلت دیجیے۔ فرمایا: تمہیں چار مہینے کی مہلت ہے۔ لیکن صفوان نے غزوۂ حنین کے وقت اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس جنگ میں رسول اللہ صلعم کو ایک سو زرہیں عاریۃً دی تھیں اس کی بیوی فاختہؓ بنت ولید پہلے مسلمان ہو گئی تھی۔

۳۔ عکرمہ بن ابی جہل: اسلام کے سب سے بڑے دشمن کا فرزند تھا۔ فتح مکہ تک ہر مخالفانہ تحریک میں سرگرمی سے شریک رہا۔ پھر بھاگ کر یمن چلا گیا۔ اس کی بیوی ام حکیم بنت الحارث بن ہشام نے جو ابو جہل کی بھتیجی تھی، اسلام قبول کر لیا۔ پھر حضور صلعم سے شوہر کے لیے معافی حاصل کی اور خود یمن جا کر عکرمہ کو لائی اور بارگاہ نبوی میں پیش کیا۔ مسلمان ہونے کے بعد عکرمہؓ اسلام کے ممتاز مجاہدین میں شامل رہے اور جنگ یرموک میں شہادت پائی۔

۴۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح: یہ حضرت عثمانؓ کا رضاعی بھائی تھا۔ اسلام قبول کیا۔ وحی کے کاتبوں میں شامل رہا۔ پھر مرتد ہو گیا اور جھوٹی باتیں کہہ کہہ کر لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے میں مصروف رہا۔ اس نے حضرت عثمانؓ کے پاس پناہ لی اور حضرت عثمانؓ ہی کی سفارش پر اسے معافی ملی۔ اس کی باقی زندگی اسلام کی خدمت میں گزری۔

۵۔ ھبار بن الاسود: یہ وہی شخص تھا جس کے ہاتھوں رسول اکرم صلعم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو ہجرت کے وقت سخت تکلیف پہنچی تھی اور اسی وجہ سے حضرت زینبؓ کی صحت مستقل طور پر خراب ہو گئی تھی۔ فتح مکہ کے بعد یہ چھپا رہا۔ آخر بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اپنے جرائم کے اعتراف کے ساتھ اظہار ندامت کیا اور مسلمان ہو گیا۔ حضور صلعم نے اسے بھی معافی دے دی۔

۶۔ کعب بن زہیر: فتح مکہ سے ایک سال بعد اپنے بھائی کے ساتھ رسول اللہ صلعم کے پاس آ کر اسلام قبول کیا اور اپنا مشہور قصیدہ پڑھا، جس کی ابتدا "بانت سعاد" سے ہوتی ہے اور وہ اسی نام سے مشہور ہے۔ حضور صلعم نے آپ کو چادر عنایت فرمائی۔

۷۔ وحشی: حضرت حمزہؓ کا قاتل، حاضر ہو کر مسلمان ہوا۔ آپ نے معافی دے دی مگر فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کر۔

۸۔ عبداللہ بن زبعریٰ کو بھی معافی مل گئی۔

تین اور آدمیوں کے نام مختلف روایتوں میں آئے ہیں وہ رسول اللہ صلعم کے حضور میں نہ پہنچ سکے اور باہر ہی باہر مارے گئے۔

مزید معافیاں

عورتوں میں سے ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ شدید مخالفوں میں سے تھی۔ یہاں تک کہ جب ابوسفیانؓ نے قریش کو مقابلہ نہ کرنے کا مشورہ دیا تو ان کی مونچھ پکڑ لی تھی۔ وہ عورتوں کے

گروہ میں شامل ہوکر آئی۔ قبول اسلام کے بعد کہا کہ میں ہند ہوں۔ حضور صلعم نے اسے بھی معاف فرما دیا۔

بہر حال جو ابتدا میں عفو عام سے مستثنیٰ رکھے گئے تھے اور وہ سنگین جرائم کے مرتکب ہو چکے تھے، ان میں سے صرف ابن خطل کا قتل دوہرے جرموں کا نتیجہ تھا، باقی دو یا تین مرد بارگاہ نبویؐ میں پہنچنے سے پہلے مارے گئے۔

حضرت علیؓ کی ہمشیر حضرت ام ہانیؓ کا شوہر ہبیرہ بن ابی وہب بھاگ کر یمن چلا گیا تھا وہیں بہ حالت کفر فوت ہوا لیکن حضرت ام ہانیؓ نے دو مخزومیوں کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ ان میں سے ایک حارث بن ہشام تھا اور دوسرا زہیر بن امیہ بن مغیرہ۔ حضرت علیؓ انھیں قتل کرنا چاہتے تھے۔ حضرت ام ہانیؓ نے یہ معاملہ بارگاہ نبویؐ میں پہنچایا۔ آپؐ نے فرمایا: جسے تم نے پناہ دی ہم نے پناہ دی اور جسے تم نے امن دیا ہم نے امن دیا۔ چنانچہ انھیں بھی معافی مل گئی۔ (مولف)

باب ۶۲

مجاہدین اسلام کا داخلہ مکہ مکرّمہ میں

(مولاناؒ کے ارشادات)

قریش کی بدعہدی

قریش مکہ نے جس طرح ظلم و تعدی میں کمی نہیں کی اسی طرح بدعہدی میں بھی اپنا مثال چھوڑ گئے۔ آخری معاہدہ صلح حدیبیہ کا تھا۔ اس میں ایک طرف مسلمان اور ان کے حلیف، دوسری طرف قریش اور ان کے حلیف۔ مسلمانوں کے ساتھ قبیلہ خزاعہ شریک ہوا، قریش کے ساتھ بنوبکر۔ صلح کی بنیادی شرط یہ تھی کہ دس برس تک دونوں فریق صلح دامن پر قائم رہیں گے لیکن ابھی دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ بنوبکر نے خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اُن کی مدد کی۔ حتٰی کہ خود سہیل بن عمرو حملے میں شریک ہُوا جس نے معاہدۂ حدیبیہ پر دستخط کیے تھے۔ بنوخزاعہ نے خانۂ کعبہ میں پناہ لی اور خدا کے نام پر امان مانگی۔ اس پر بھی بے دریغ قتل کیے گئے۔ چالیس آدمی بچ کر مدینہ پہنچے اور پیغمبرؐ اسلام کو اپنا حال زار سنایا۔

اب معاہدے کے رُو سے پیغمبرؐ اسلام کا فرض ہو گیا کہ قریش کی عہدشکنی برداشت نہ کریں۔ چنانچہ دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ انھوں نے کوچ کیا اور بغیر کسی قابل ذکر خونریزی کے مکہ کی فتح مبین ظہور میں آگئی۔

بتدریج اصلاح

اسلام نے ہر چیز کی تدریج اصلاح کی ہے۔ شراب بتدریج حرام ہُوئی، نمازیں بتدریج تغیرات کیے گئے۔ عرب کی قدیم جنگ جُو فطرت کی اصلاح بھی اسی اصول پر ہُوئی۔ غارتگری عرب کا عام شعار تھی اور صحابہؓ بھی دفعتاً اس قدیم عادت کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ آنحضرتؐ نے مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے اس طریقے کا انسداد کیا۔ غزوۂ خیبر میں اس کی تکمیل ہو گئی۔ غزوۂ خیبر کے بعد فتح مکہ کا مرحلہ پیش آیا تو اسلام کی تربیت یافتہ فوج اپنے قدیم آبائی گھر میں اس سکون و اطمینان کے ساتھ داخل ہُوئی کہ تمام عرب کو نظر آگیا، اسلام نے عرب کی فطرت اصلیہ بالکل بدل دی ہے، ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیاتہٖ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ و ان کانوا من قبل لفی ضلالٍ مبینٍ[1]۔

حضرت حاطبؓ کا واقعہ

آنحضرتؐ نے فتح مکہ کی تیاریاں شروع کیں تو حسن اتفاق سے پہلے ہی منزل پر بطور فالِ رحمت رفق و ملاطفت کے اظہار کا موقع پیش آگیا۔ حاطبؓ ایک بدری

---

[1] خدا نے امیوں میں انھیں میں سے رسول بھیجا وہ ان پر خدا کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے اخلاق کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے اور لوگ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (سورۂ جمعہ)

حاطب بن ابی بلتعہ تھے، جنھوں نے خفیہ طور پر قریش کو ایک خط لکھا تھا اور اسلامی تیاریوں کی خبر دے دی تھی۔ ان کا خط راستے ہی میں پکڑا گیا اور آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے کہا:

مجھے سزا دینے میں جلدی نہ کیجیے، اصل واقعہ سن لیجیے۔ میں قبیلہ قریش سے کوئی خاندانی تعلق نہیں رکھتا، صرف ان کا حلیف ہوں، لیکن بہت سے مہاجرین ان کے ساتھ خاندانی تعلقات بھی رکھتے ہیں، جن کی وجہ سے اپنے بال بچوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ میں نے چاہا کہ قریش پر ایک احسان کر دوں، جس کے صلے میں شاید میں بھی اسی قسم کی محافظت کا مستحق ہو جاؤں۔ میرا قصور صرف اتنا ہے ورنہ میں مرتد نہیں ہوا ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ آنحضرت صلعم سے ان کی گردن اڑا دینے کی اجازت چاہی لیکن آنحضرت صلعم نے شرکت بدر کی فضیلت کی بنا پر انھیں بالکل معاف کر دیا[1]۔

اس اولین واقعہ ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا سلوک ان لوگوں کے ساتھ کیسا تھا، جن کی وجہ سے اس کے مقاصد کو سخت سے سخت نقصانات پہنچ چکے تھے۔

رحمۃٌ للعلمین

حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے یقیناً بغیر کسی مخالفانہ قصد کے یہ کارروائی کی ہوگی، لیکن نیت کی صفائی اس نقصان عظیم کی کیا تلافی کر سکتی تھی جو اس خط کے پہنچنے سے اسلامی فوج پر وارد ہو سکتا تھا؛ جنگ کی حالت میں آج بڑی سے بڑی متمدن قوم بھی جو کچھ کر رہی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ فوجی رازوں کا افشاء اور جنگ کی حالت میں دشمن سے خط و کتابت ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ بایں ہمہ وجود مقدس حضرت رحمۃ للعلمین جو رحمت و رافت لے کر دنیا میں ظاہر ہوا تھا، اس کے آگے انسانی جرائم و معاصی کے بڑے بڑے سمندر بھی چند قطرہ ہائے آب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ اس کے نظائر اگر تم سننا چاہو تو ساری عمر اسی تذکرے میں بسر ہو سکتی ہے اور حاطبؓ بن بلتعہ کی معافی اس بحرِ رحمت کا ایک وزہ کرم ہے:

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

سورۂ ممتحنہ کی شان نزول

چنانچہ سورۂ ممتحنہ کی شان نزول یہی واقعہ ہے۔ حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا قصور معاف کر دیا گیا، لیکن ساتھ ہی آیندہ کے لیے حکمِ الٰہی نازل ہوا کہ جنگ کی حالت میں جو مسلمان دشمنوں سے تعلق رکھے گا، وہ اللہ کے نزدیک انھی میں سے سمجھا جائے گا۔

---

[1] بخاری جز ۵ ص ۱۴۵۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ (ممتحنہ ۱)

مسلمانو! اللہ کے اور مسلمانوں کے دشمنوں کو اپنا ایسا دوست نہ بناؤ کہ ان کے ساتھ محبت و انس سے پیش آنے لگو حالانکہ جو سچائی اللہ نے تمھاری طرف بھیجی ہے وہ اس سے انکار کر چکے ہیں اور اس کے دشمن ہیں۔

اسوۂ ابراہیمی

اس کے بعد مسلمانوں کو دین حنیفی کے اولین داعی حضرت ابراہیم خلیل علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے متبعین کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی تلقین کی ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ۔ (ممتحنہ ۴)

مسلمانو! حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں تمھارے لیے خدا دوستی اور حق پرستی کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ اب ہمیں تو تم سے اور تمھارے ان معبودان باطل سے، جنھیں تم پوجتے ہو، کوئی سروکار نہیں۔ ہم تمھارے کاموں سے بالکل انکار کرتے ہیں۔ اب تو ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان لاؤ اور حق کے آگے سر جھکا دو!

رمضان المبارک کا انتخاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے لیے رمضان المبارک کا زمانہ منتخب کیا جو اظہار تقویٰ و خشیت الٰہی کا بہترین مظہر ہو سکتا تھا۔ تمام عرب ایمان لانے کے لیے صرف فتح مکہ کا انتظار کر رہا تھا، اس لیے آپ نے نہایت اہتمام کے ساتھ تیاری کی۔ دس ہزار فوج کا اجتماع ہوا اور مدینہ سے (اللہ کی راہ میں) بھوک اور پیاس کے عالم میں اس نے مکہ کا رُخ کیا۔

سرداران قریش

قریش مکہ کو خبر ہوئی تو ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور بُدَیل بن ورقاء حالات دریافت کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ جب مقام مرّ الظہران[۱] میں پہنچے تو ان کو بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے نظر آئے۔ ابوسفیان نے کہا: یہ تو عرفہ کی آگ معلوم ہوتی ہے۔ بدیل بن ورقاء نے جواب دیا: یہ آگ قبیلہ بنوعمرو نے متفرق مقامات پر جلائی ہوگی۔ لیکن ابوسفیان نے نہ مانا اور اسی حیص بیص میں تھے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت آپہنچی اور ان تمام سرداران قریش کو گرفتار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لی گئی۔ اس طرح یکایک وعدۂ فتح الٰہی پورا ہو گیا۔

---

[۱] یہ مقام آج کل وادی فاطمہ کے نام سے معروف ہے اور اونٹوں کے قافلوں کے لیے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف پہلی منزل ہے۔

مجاہدین اسلام آنحضرت صلعم مکہ کی طرف بڑھے تو اپنے چچا عباسؓ سے فرمایا کہ ابو سفیان کو اسلامی لشکر کے جاہ و جلال کا منظر دکھاؤ! فوج روانہ ہوئی تو ہر قبیلے کا دستہ الگ الگ آنحضرت صلعم کے ساتھ چلتا تھا۔ ابو سفیان کے سامنے سے ایک دستہ گزرا تو اس نے حضرت عباسؓ سے پوچھا: یہ کون سا قبیلہ ہے؟ انھوں نے غفار کا نام لیا تو ابو سفیان نے کہا: مجھے ان سے کچھ مطلب نہیں" اسی طرح جہینہ، سعد بن ہذیم اور سلیم وغیرہ کے قبائل سامنے سے گزرے، لیکن وہ بالکل مرعوب نہ ہوا۔ اس کے بعد ایک عظیم الشان فوج سامنے آئی جس میں بالکل نئے لوگ اور نئے انداز سے چلنے والے مجاہدین تھے۔ ابو سفیان پر پہلی مرتبہ تعجب اور دہشت طاری ہوئی اور حضرت عباسؓ سے پوچھا کہ یہ لوگ کہاں کے ہیں اور کس قبیلے سے آئے ہیں؟ حضرت عباسؓ نے جواب دیا: یہ مدینہ کے انصار ہیں۔ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ۔

سعدؓ بن عبادہ کا واقعہ سعدؓ بن عبادہ نے ابو سفیان کی مرعوبیت دیکھ کر طنزاً کہا: آج ہی لڑائی کا اصل دن ہے اور آج خانۂ کعبہ کی حرمت حلال سمجھی جائے گی۔

اس کے بعد ایک چھوٹا سا دستہ گزرا جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کا جھنڈا زبیرؓ بن عوام کے ہاتھ میں تھا۔ جب آنحضرت صلعم ابو سفیان کے پاس آئے تو اس نے سعدؓ بن عبادہ کے دل شکن فقرے آپ کو سنائے۔ آپ نے فرمایا:

"سعد نے بالکل غلط کہا، آج تو خانۂ کعبہ کی چھنی ہوئی عزت از سرِ نو واپس دلائی جائے گی۔ آج اس پر غلاف چڑھایا جائے گا۔ آج کا دن لٹے ہوئے کو امن دلانے کا دن ہے۔"

شہر کا محاصرہ یہ کہہ کر آپ سورۂ فتح پڑھتے ہوئے آگے بڑھے۔ مقام حجونؓ[1] میں جھنڈا نصب کرنے کا حکم دیا۔ چاروں طرف سے مکہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ خالدؓ بن ولید نے دائیں طرف سے اور زبیرؓ بن عوام نے بائیں طرف سے حملہ کیا۔ ابو عبیدہؓ پیادہ فوج کو لے کر الگ حملہ آور ہوئے تھے۔

اب مکہ ہر طرف سے گھرا ہوا تھا اور مجاہدین اسلام کے سامنے جو شخص آتا فوراً تہ تیغ کر دیا جاتا۔ خود اسلامی فوج بالکل محفوظ تھی۔ صرف خالدؓ کی فوج کے دو شخص شہید ہوئے[2] لیکن قریش کے پُرغرور سروں کا ایک تودہ بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ ابو سفیان چیخ اٹھا:

"قریش کا سرسبز باغ بالکل اجاڑ دیا گیا۔ آج قریش کا خاتمہ ہے!"[3]

---

[1] شہر مکہ معظمہ کے شمالی حصے کی ایک پہاڑی کا نام، جس کے پاس جنت المعلیٰ کا قبرستان ہے۔ یہ حصہ حجون کہلاتا ہے۔
[2] بخاری جز ۵ ص ۱۴۶ [3] بخاری جز ۵ ص ۱۴۷۔

حکم امان اس پُرحسرت اور مایوسانہ فقرے پر جو اسلام کے سب سے بڑے معزز دشمن کی نامراد زبان سے نکلا تھا، رحمتِ کونینؐ کے دریائے کرم نے جوش مارا اور آپ نے امان کا حکم دے دیا۔

من دخل دار ابی سفیان فھو اٰمن و من القی السلاح فھو اٰمن و من اغلق بابہ فھو اٰمن۔

جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے، اس کے لیے امان ہے، جو شخص ہتھیار ڈال دے اس کے لیے امان ہے۔ جو شخص اپنا دروازہ بند کرے اس کے لیے امان ہے۔

اس فیاضانہ حکم سے انصار کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "آخر آپ کو اپنے قبیلے پر رحم آہی گیا"۔ آپ کو اس کی خبر ہوئی تو سب کو بلا کر فرمایا: "میں خدا کا ایک بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں۔ میں نے خدا کے بعد تمھاری طرف ہجرت کی ہے۔ میری موت تمھاری موت ہے اور میری زندگی تمھاری زندگی ہے۔ تم نے جو بدگمانی کی، وہ سچ ہے، لیکن معذور بھی تھے"۔ یہ صحیح مسلم کی روایت ہے[1]۔

دوسری روایت ابوداؤد میں ہے کہ جب آنحضرتؐ مقام مرّ الظہران میں پہنچے تو اسلامی لشکر کے جوش و خروش کو دیکھ کر حضرت عباسؓ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر قریش نے آپؐ سے امان طلب نہ کی تو سب کے سب ہلاک ہوجائیں گے۔ اس خیال سے وہ خچر پر سوار ہو کر آگے بڑھے کہ اگر کوئی شخص مل جائے تو اہل مکہ کو امان طلبی پر آمادہ کریں۔ راستہ میں ابوسفیان اور بدیل بن ورقا مل گئے۔ حضرت عباسؓ انھیں اپنے ساتھ لے آئے۔ دوسرے دن آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر ابوسفیان کو پیش کیا، جو فوراً اسلام لے آیا اور حضرت عباسؓ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ ابوسفیان یہ فخر حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اس کے گھر کو دارالامن بنا دیا جائے۔ آنحضرتؐ نے یہ درخواست منظور فرمائی، بلکہ امن عام کا حکم دے دیا،

من دخل دار ابی سفیان فھو اٰمن و من اغلق علیہ دارہ فھو اٰمن و من دخل المسجد فھو اٰمن۔

جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے اس کے لیے امن ہے، جو شخص اپنا دروازہ بند کرلے اس کے لیے امن ہے اور جو شخص مسجد (مسجد الحرام) میں پناہ لے اس کے لیے بھی امن ہے۔

چنانچہ اس امن سے اہل مکہ نے پورا فائدہ اٹھایا:

فتفرق الناس الی دورھم و الی المسجد[2]۔

جب دن بڑا تو لوگ پناہ لینے کے لیے مسجد (مسجد الحرام) اور اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے۔

---

[1] مسلم جلد ۲ ص ۸۶۔ کتاب الجہاد [2] ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۷، کتاب الجہاد۔

تمام سرداران قریش نے خانۂ کعبہ کے دامن میں پناہ لی تھی۔[1]

جان و مال کی حفاظت

حضرت ام ہانیؓ نے ایک مشرک کو پناہ دی اور آنحضرت صلعم سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص کی تخصیص نہیں، تم نے جس کو بھی پناہ دی ہے، وہ ہمارے امان میں داخل ہو گیا۔ غرض آپؐ کے عفو و کرم نے پُورے مکہ کو اپنے دامن میں چھپا لیا اور عین حالتِ جنگ میں بھی کسی نے کسی کے مال و اسباب کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ ابوداؤد میں ہے:

عن وھب، قال سالت جابراً ھل غنموا یوم الفتح شیئاً؟ قال لا۔[2]

وہب کہتے ہیں کہ میں نے جابر سے پوچھا کہ کیا صحابہ نے فتح مکہ کے دن کوئی چیز بطور مالِ غنیمت لوٹی تھی؟ انھوں نے کہا "نہیں"۔

یادگارہائے ضلالت کی بربادی

البتہ آنحضرتؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے عرب کی تمام یادگار ہائے ضلالت کو برباد کر دیا:

دخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم مکۃ یوم الفتح و حول البیت ستون و ثلثمائۃ نصب فجعل یطعنھا بعود فی یدہ و یقول جاء الحق و زھق الباطل۔[3]

آنحضرتؐ جب فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہُوئے تو اس وقت خانۂ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت نصب تھے، آپ ایک لکڑی یعنی کمان سے ان کو ٹھکراتے جاتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے کہ حق آیا اور باطل کو شکست ہُوئی!

لما قدم مکۃ ابی ان یدخل البیت و فیہ الاٰلھۃ فامر بھا فاخرجت فاخرج صورۃ ابراھیم و اسمٰعیل و فی ایدیھما الازلام۔ فقال قاتلھم اللہ لقد علموا ما استقسما بھا قط ثم دخل البیت فکبر فی نواحی البیت۔[4]

جب آپؐ مکہ میں آئے تو خانۂ کعبہ میں اس وقت تک داخل ہونا گوارا نہیں کیا جب تک کہ اس میں بت موجود تھے۔ آپؐ کے حکم سے وہ نکالے گئے تو اُن میں حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے اور ان کے ہاتھوں میں جُوئے کے تیر تھما دیے گئے تھے، آپؐ نے ان کو دیکھ کر کہا، خدا کفار کو ہلاک کرے۔ وُہ خوب جانتے تھے کہ ان دونوں پیغمبروں نے کبھی جوا نہیں کھیلا۔ پھر آپ خانۂ کعبہ میں داخل ہُوئے اور اس کے تمام گوشوں میں تکبیر کا نعرہ بلند فرمایا!

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۷ کتاب الجہاد [2] ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۴ کتاب الجہاد۔ [3] ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۷ کتاب الجہاد [4] بخاری جزو ۵ ص ۱۴۰ (مقالہ الہلال ۱۱۔ نومبر ۱۹۱۴ء سے ماخوذ ہے)

صرف ایک قتل امن و امان کے بعد صرف ایک شخص قتل کیا گیا۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں:

جاء رجل فقال ابن خطل متعلق باستار الکعبۃ فقال اقتلہ[1]

ایک شخص نے آکر آنحضرت صلعم کو خبر کی کہ ابن خطل خانہ کعبہ کے پردوں کو تھام کر کھڑا ہے۔ آپ نے فرمایا اسے قتل کر دو۔

اہل سیر نے چند اشخاص کے نام اور بتائے ہیں۔ ابو داؤد میں دو روایتیں ہیں، جن سے اہل سیر کے بیان کی تائید ہوتی ہے لیکن ان میں سے ایک روایت کے متعلق خود ابو داؤد نے لکھ دیا ہے کہ میرے حسب دلخواہ نہیں[2]

نتائج مجموعی طور پر ان سادہ واقعات سے حسب ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ قریش کو فتح مکہ کی تیاری کی خبر دینے پر آنحضرت صلعم نے حاطبؓ بن بلتعہ کو بالکل معاف کر دیا حالانکہ موجودہ قوانین جنگ کی رُو سے ایسے شخص کو گولی مار دی جاتی ہے۔

۲۔ سعدؓ بن عبادہؓ نے فخریہ یا طنزاً ابو سفیان کو خانۂ کعبہ کی بے حُرمتی کی دھمکی دی تو آنحضرت صلعم نے اس کی تردید فرمائی۔

۳۔ فتح مکہ میں آنحضرت صلعم نے امان عام کا اعلان فرما دیا حالانکہ یہی لوگ اسلام کے اصل دشمن تھے۔

۴۔ مکہ میں صحابہ نے کوئی چیز نہ لُوٹی۔

۵۔ امان کے بعد صرف ایک شخص کو قتل کیا گیا جو واجب القصاص تھا۔ بقیہ اشخاص کے قتل کی روایت مشتبہ ہے۔

دنیا کی قدیم وجدید تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ اسلامی فوج کے ساتھ اگر ان کے داخلے کا موازنہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی پوری تاریخ اس قسم کے فیاضانہ داخلے کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

عہد صحابہ میں بھی آنحضرت صلعم کے فاتحانہ طرز عمل کی تمام خصوصیات قائم رہیں اور مفتوحہ ممالک کے ساتھ نہایت فیاضانہ مراعات کی گئیں[3]

---

[1] بخاری جزو ۵ ص ۱۳۸ [2] ابو داؤد جلد ۲ ص ۹ [3] الہلال ۱۸۔ نومبر ۱۹۱۴ء

غزوۂ حنین

باب ۱۲

غزوۂ حنین

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ (توبہ ۲۵)

—(۱)—

ہوازن و ثقیف اسلام کی کامیابی جہاں قریش مکہ کے پشتینی اقتدار کے لیے نیز تولیت کعبہ کے سلسلے میں خودغرضی کی بنا پر تراشے ہوئے اوضاع و اطوار کے لیے پیام مرگ تھی۔ اس وجہ سے جوش غیظ نے انھیں پاگل بنا رکھا تھا، وہاں بعض دوسرے قبائل کے نزدیک بھی یہ کامیابی ناقابل برداشت تھی جو کثرت تعداد، مہارت فنون جنگ اور قوت و طاقت کی بنا پر ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ انھیں بھی خیال ہو گیا تھا کہ یہ نومولود قوت مرکز عرب یعنی مکہ مکرمہ پر قابض ہو جائے گی تو ان قبائل کی خود رائی ضغطے میں پڑ جائے گی۔ ان میں سے ہوازن و ثقیف بطور خاص قابل ذکر ہیں، جو طائف اور اس کے اطراف میں مقیم تھے۔ چنانچہ جب اسلامی قوت کے تدریجی ارتقا سے قریش پر اک گونہ بیچارگی کی حالت طاری ہو گئی تو ہوازن و ثقیف کے رؤسا نے عرب کا دورہ کر کے مختلف قبیلوں کو مسلمانوں کی مخالفت پر ابھارا۔ اس اثنا میں یکایک مکہ مکرمہ پر اسلام کا قبضہ ہو گیا تو ہوازن و ثقیف معاً جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ انھیں یہ خیال بھی ہو گا کہ مسلمانوں کو شکست دے کر وہ اپنی آزادی ہی کے لیے ایک زبردست خطرے کا انسداد نہ کریں گے، بلکہ قریش کی پوری میراث و املاک پر بھی قابض ہو جائیں گے۔ اس طرح ان کا اقتدار بڑھ جائے گا۔

جنگ کی تیاری ہوازن کے رئیس اعظم مالک بن عوف النصری نے جو تیس سال کا پُرجوش جوان تھا، سب سے پہلے جنگ کا فیصلہ کر کے تمام قبائلی گروہوں اور شاخوں کو شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ بنو نصر اور بنو جشم سب کے سب شریک ہو گئے۔ بنو سعد بن بکر اور بنو ہلال میں سے کچھ لوگ آئے۔ البتہ بنو کعب اور بنو کلاب میں سے کوئی قابل ذکر شخص شامل نہ ہُوا۔ ثقیف کے رئیسوں میں سے قارب بن الاسود بن مسعود نیز ذوالخمار سُبَیع بن الحارث اور اس کا بھائی احمر بن الحارث ساتھ تھے اور تمام معاملات میں ان سے مشورے لیے جاتے تھے۔ ریاست عامہ کا منصب مالک بن عوف ہی کو حاصل تھا۔

بنو جشم کے معروف رئیس اور عرب کے مشہور شہسوار دُرَید بن صِمّہ کو بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔ اگرچہ وُہ کسی کام کا نہیں رہا تھا کیونکہ عمر سو سال سے تجاوز کر چکی تھی اور اس کی بینائی بھی جاتی رہی تھی تاہم اس کی دانائی، صواب اندیشی اور تجربہ کاری سب کے نزدیک مسلّم تھی۔ مالک بن عوف نے یہ حکم بھی دے دیا تھا کہ تمام لوگ پُورا

مال و اسباب اور بال بچے ساتھ لائیں تاکہ ان کی وجہ سے جنگ میں لوگوں کی پامردی کو تقویت پہنچے۔ لیکن اس تدبیر کا نتیجہ الٹا نکلا جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ یہ لوگ وادی اوطاس میں پہنچ گئے۔

دُرید بن صمّہ

دُرید بن صمّہ نے آتے ہی پوچھا کہ ہم کون سے مقام پر ہیں؟ جواب ملا کہ اوطاس میں۔ اس نے کہا کہ یہ مقام جنگ کے لیے موزوں ہے۔ زمین نہ تو اتنی نرم ہے کہ اس میں لڑنے والوں کے پاؤں دھنسیں اور نہ اتنی سخت ہے کہ تلووں کو کاٹے۔ پھر اس نے پوچھا، یہ کیا ہے کہ اونٹ چلاتے ہیں، گدھے شور کر رہے ہیں، بچے رو رہے ہیں اور بکریاں ممیا رہی ہیں؟ جواب ملا کہ مالک کے حکم سے مال و اسباب، بال بچے ساتھ آئے ہیں۔ پوچھا کیوں؟ کہا گیا کہ ان کی محبت لوگوں کو زیادہ جم کر لڑنے پر آمادہ کرے گی اور قدم پیچھے نہ ہٹانے دے گی۔

دُرید بولا جس کے پاؤں اکھڑ جائیں، بھلا وہ یہ سب کچھ دیکھتا ہے؟ کوئی چیز اس کے لیے روک بن سکتی ہے؟ جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔ شکست ہوئی تو مال و عیال مصیبت کا باعث بن جائیں گے۔

پھر دُرید نے بنو کعب و بنو کلاب کے متعلق پوچھا۔ بتایا گیا کہ ان میں سے کوئی نہیں آیا۔ دُرید نے کہا کہ اگر آج عزت و شرف کا دن ہوتا تو کعب و کلاب ہرگز غائب نہ ہوتے۔ میرے نزدیک تو تم سب کو بھی وہی کرنا چاہیے جو کعب و کلاب نے کیا۔

دُرید نے مالک سے کہا کہ ہوازن کو تہلکے میں نہ ڈالو۔ اہل و عیال کو کسی محفوظ مقام پر ٹھہراؤ۔ فارغ البال ہو کر لڑو۔ فتح ہوئی تو سب تم سے آملیں گے، شکست ہوئی تو یہ بچے رہیں گے۔ لیکن مالک نے یہ کہہ کر دُرید کی رائے ٹھکرا دی کہ تُو تو پیر خرف ہے اور تیری عقل بالکل بیکار ہو چکی ہے۔

حالات کی تحقیق

رسول اللہ صلعم کو ہوازن و ثقیف کے عزائم اور جنگی تیاریوں کی خبر ملی تو عبداللہ بن حدرد اسلمی کو مقرر کیا کہ ان قبیلوں کے اندر چلے جائیں۔ ہر معاملے کے متعلق صحیح اور قطعی معلومات حاصل کریں۔ جب تک ایک ایک بات واضح نہ ہو جائے، ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ چنانچہ ابن ابی حدرد اپنا فرض احسن طریق پر پورا کر کے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوری کیفیت عرض کر دی۔

یہ معلومات اس وجہ سے بھی ضروری تھیں کہ اگر جدال و قتال کے روکنے اور مناسب طریق پر صلح و مفاہمت کر لینے کی کوئی صورت ہو تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس وجہ سے بھی ضروری تھیں کہ اگر جنگ ناگزیر ہو تو موقع و محل کی مناسبت سے اس کے لیے انتظامات کیے جائیں۔

تیاری اور روانگی

بہر حال رسول اللہ صلعم حرم پاک میں بیٹھ کر جنگجوؤں کے حملے کا انتظار نہیں فرما سکتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں حدودِ حرم کے اندر خونریزی ہوتی، جو اس مقدس مقام کی عزت و

حرمت کے منافی تھی۔ ویسے بھی حضور صلعم کی عادت شریف یہ تھی کہ حتی الامکان اچانک جنگجوؤں کے سر پہ پہنچ جاتے اور ان کی جمعیت درہم برہم کر ڈالتے۔

آپؐ نے ابوجہل کے سوتیلے بھائی عبداللہ بن ربیعہ سے تیس ہزار درہم مصارف جنگ کے سلسلے میں قرض لیے[1]۔ صفوان بن امیہ سے، جس نے قبول اسلام کے لیے مہلت لے رکھی تھی، ایک سو زرہیں مستعار لیں۔ عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ پر حاکم مقرر فرمایا اور ۹۔ شوال ۸ھ[3] (۲۷۔ جنوری ۶۳۰ء) کو اس سمت روانہ ہوگئے، جہاں ہوازن و ثقیف جمع ہو رہے تھے۔ ۱۰۔ شوال ۸ھ (۳۱۔ جنوری ۶۳۰ء) کو منزل مقصود پر پہنچ گئے[4]۔

حنین کا موقع اور محل

اب سب سے پہلے مقام حنین کا تعین ضروری ہے، جہاں یہ جنگ ہوئی۔ زیادہ تر سیرۃ نگاروں نے صرف اس پر اکتفا کر لیا کہ مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے حالانکہ حجاز کے دونوں شہروں کے درمیان آمد و رفت کے جتنے راستے ہیں، ان میں کسی پر حُنین واقع نہیں بعض نے لکھا ہے کہ دور جاہلیت کا مشہور بازار ذوالمجاز عرفات سے تین میل ہے۔ اس کے دامن میں حنین ہے اور اسے اوطاس بھی کہتے ہیں۔

میری معلومات کے مطابق ڈاکٹر حمید اللہ پہلے محقق ہیں، جنھوں نے حنین کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ انھی کی تحریرات سے معلوم ہوا کہ شیخ ارسلان باسلامہ نے بھی مقام حنین معلوم کرنے کے لیے بڑی تگ و دو کی تھی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور ایک ایسے مقام کا تعین فرما دیا، جسے شوال ۸ھ کی جنگ کا مقام ماننا مشکل ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان عبدالحمید خان مرحوم نے حجاز ریلوے کے لیے جو نقشہ تیار کرایا تھا۔ اس میں اوطاس کا محل طائف کے شمال مشرق میں دکھایا گیا ہے۔ میں نے وہ نقشہ سامنے رکھ کر مکہ اور طائف، نیز طائف اور اوطاس کا درمیانی فاصلہ ناپا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں ایک اور دو کی نسبت ہے۔ یعنی اگر مکہ اور طائف کا فاصلہ ساٹھ میل فرض کیا جائے تو نقشہ حمیدیہ کا اوطاس طائف سے کم از کم ایک سو بیس میل ہونا چاہیے۔ بغرض یا تو اسے وہ اوطاس نہیں مانا جا سکتا، جس کا ذکر جنگ حنین کی روایتوں میں آیا ہے یا اس اوطاس کا مقام و محل نادرست ہے۔

تعین کے قرائن

میرے نزدیک حنین کے تعین کا ایک بدیہی قرینہ یہ ہے کہ معلوم کیا جائے رسول اللہ صلعم جنگ حنین کے بعد کس راستے سے طائف گئے۔ اس قرینے سے کام لے کر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۸۶ (بحوالہ مسند ابن حنبل) [2] ابن ہشام القسم الثانی ص ۴۴۰ [3] "البدایہ والنہایہ" جلد چہارم ص ۳۲۲ [4] "البدایہ والنہایہ" جلد چہارم ص ۳۲۲

نے وہ مقام متعین کر لیا، جسے اب تک زیادہ سے زیادہ صحیح مانا جا سکتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ جنگ کے بعد حنین سے نخلۃ الیمانیہ[1] گئے، پھر قرن اور ملیح ہوتے ہوئے وادی لیّہ کے مقام بحرۃ الرغا (یا بحرہ) میں پہنچے، جہاں ایک روز قیام فرمایا۔ ایک مسجد تعمیر کرائی جس میں نماز پڑھی۔ نیز بنو لیث کے ایک آدمی کو قصاص میں موت کی سزا دلائی، جس نے بنو ہذیل کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ لیّہ میں مالک بن عوف النصری (رئیس اعظم ہوازن) کا قلعہ تھا جسے منہدم کرا دیا۔ وہاں سے آپ اس راستے نخب پہنچے جو الضیقہ کے نام سے مشہور تھا۔ پھر طائف کے قریب نزول فرمایا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اسی بدیہی قرینے کے مطابق مکہ مکرمہ سے قرن تک رسول اللہ صلعم کے سفر کا نقشہ یوں بنایا:۔

نخلۃ الیمانیہ
جعرانہ
مکہ مکرمہ
قرن
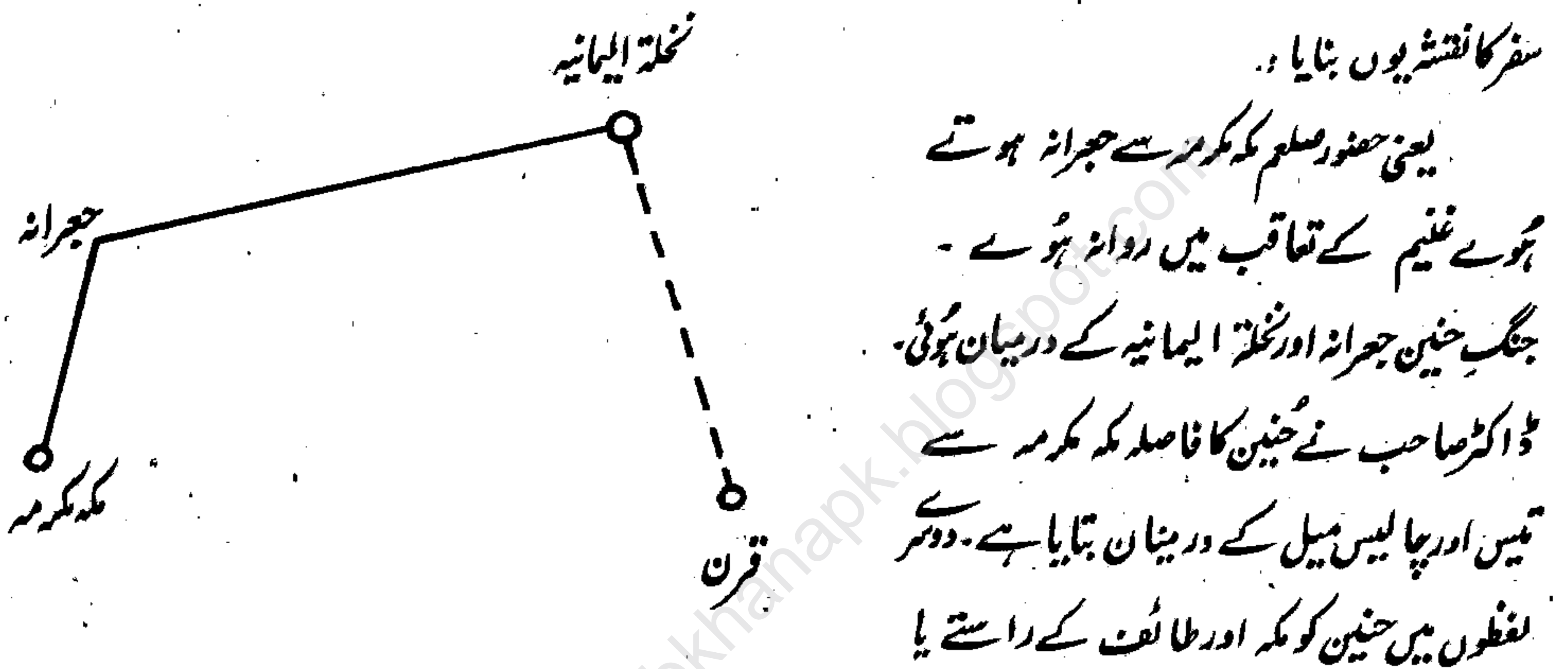
یعنی حضور صلعم مکہ مکرمہ سے جعرانہ ہوتے ہوئے غنیم کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ جنگِ حنین جعرانہ اور نخلۃ الیمانیہ کے درمیان ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے حُنین کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس اور چالیس میل کے درمیان بتایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حنین کو مکہ اور طائف کے راستے یا راستوں پر نہیں بلکہ اسے مکہ سے شمال مشرق اور طائف سے شمال مغرب میں تلاش کرنا چاہیے۔ افسوس کہ ڈاکٹر صاحب خود حُنین تک نہ جا سکے ورنہ زیادہ ثبت اور قطعی شواہد مہیا ہو جاتے۔

ایک قرینہ اور بھی ہے، اگرچہ اس کی حیثیت زیادہ محکم نہ ہو۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ حنین کی جانب چلتے چلتے بعض لشکریوں کو ایک بڑا اور سرسبز درخت نظر آیا۔ انھوں نے کہا: یا رسول اللہ! جس طرح کفار "ذاتِ انواط"[2] کو مانتے ہیں، اسی طرح ہمیں بھی ایک درخت کو ماننے کا موقع دیجیے۔ حضور صلعم نے فرمایا: اللہ اکبر! یہ تم نے ایسی بات کہی، جیسی بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہی تھی کہ اجعل لنا الٰھاً کما لھم آلھۃ (ہمارے لیے بھی ایسا ہی معبود بنا دیجیے، جس طرح کافروں کے معبود ہیں۔ اعراف ۱۳۸) موسیٰؑ نے فرمایا: انکم قوم تجھلون۔ (تم بلاشبہ ایک جاہل گروہ ہو)

---

[1] نخلۃ الیمانیہ اور قرن مشہور مقامات ہیں۔ قرن اہل نجد کے لیے میقات ہے اور یہ وہی مقام ہے جو ایک روایت کے مطابق حضرت اویس کا وطن تھا۔ ملیح، بحرۃ الرغا اور لیّہ اور نخب بھی طائف سے قریب ہی ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ سفرنامہ ارض القرآن کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک کے طائف اور موجودہ شہر طائف میں دو اڑھائی میل کا فاصلہ تھا۔ [2] ذات انواط ایک درخت تھا جس میں دورِ جاہلیت کے عرب اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے، دن بھر وہاں ٹھہرتے اور جانور ذبح کرتے۔

مطلب یہ کہ ممکن ہے اس راستے میں یہ درخت اب تک موجود ہو۔ یہ بھی سراغ کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

جنگ رسول اللہ صلعم کے ساتھ دس ہزار انصار و مہاجرین تھے، جو مدینہ منورہ سے آئے تھے۔ دو ہزار مکہ مکرمہ سے ساتھ ہو گئے۔ بارہ ہزار کا منظم لشکر بڑا بھاری لشکر تھا، جسے کوئی قبائلی اجتماع نظر بہ ظاہر شکست نہیں دے سکتا تھا۔ شاید لشکر کی کثرت ہی دیکھ کر کسی کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے کہ اب ہم قلیل التعداد نہیں کہ کوئی ہم پر غالب آ جائے۔ قرآن مجید بھی اس کا شاہد ہے، اذ اعجبتکم کثرتکم۔ (جب تم کثرت تعداد پر اترا گئے تھے)

جنگ کے متعلق تمام روایات سامنے رکھ کر صحیح کیفیت کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کو علم ہو گیا تھا، اسلامی فوج کس راستے سے آ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے راستے کے ایک نشیب میں ادھر ادھر محفوظ مقامات پر کمین گاہیں بنا کر تیر انداز بٹھا دیے تھے۔ صبح کی تاریکی زائل نہیں ہوئی تھی، جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ مسلمانوں کے مقدمۃ الجیش میں بنو سُلیم اور طلقائے مکہ تھے، جو اس وقت تک اسلام بھی نہیں لائے تھے۔ وہ کمین نشینوں کی زد میں پہنچے تو ایک دم ہر سمت سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ ابن ہشام میں ہے۔

"جب وادی حنین سامنے آئی تو ہم نے تہامہ کی طرف جانے والی وادیوں میں سے ایک نشیبی ڈھلان اور وسیع وادی میں اترنا شروع کر دیا۔ ہم اترے جا رہے تھے، صبح کی تاریکی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ دشمن ہم سے پہلے وادی میں آ گئے تھے۔ انھوں نے ہر تنگ گھاٹی، ہر گوشے اور ہر خفیہ راستے سے ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ ان کا سوچا سمجھا ہوا منصوبہ تھا اور اس کے لیے پوری تیاری کر رکھی تھی[1]"

پہلے بنو سُلیم پلٹے۔ پھر اہل مکہ نے راہ فرار اختیار کی۔ بعد ازاں عام ابتری پھیل گئی۔ نہ کوئی صورت حال کا اندازہ کرنے کی حیثیت میں رہا اور نہ کوئی پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا۔ قرآن مجید نے افتاد کا نقشہ نہایت عمدگی سے کھینچ دیا ہے:

ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئًا وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین۔ (توبہ: ۲۵)

اور جنگ حنین کا دن یاد کرو جب تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے تو دیکھو وہ کثرت تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی ساری وسعت پر بھی تمھارے لیے تنگ ہو گئی۔ بالآخر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

ابتری کے اسباب مولانا شبلی مرحوم نے ابتری کے بہت سے اسباب بیان کیے ہیں مثلاً:

۱۔ مقدمۃ الجیش میں زیادہ تر مکہ کے جدید الاسلام نوجوان تھے اور دو ہزار طلقا تھے جو اس وقت اسلام بھی نہیں

---

[1] ابن ہشام القسم الثانی ص ۴۴۲۔

لائے تھے۔

۲۔ ہوازن تیر اندازی میں عرب کے اندر جواب نہیں رکھتے تھے۔

۳۔ دشمن نے معرکہ گاہ میں پہلے پہنچ کر تمام مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں، کھوؤں اور دروں میں جا بجا جما دیے تھے۔

۴۔ میدان جنگ اس قدر نشیب میں تھا کہ پاؤں جم نہیں سکتے تھے۔

۵۔ مقدمۃ الجیش بے قابو ہو کر تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹا تو پوری فوج کے قدم اکھڑ گئے[1] (مولف)

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۸۸۔

باب ۴۶

غزوۂ حنین

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ (توبہ: ۲۵)

—(۲)—

ثابت قدم اصحاب جو اصحاب رسول اللہ صلعم کے ساتھ ثابت قدم رہے، وُہ اتنے تھوڑے تھے کہ ان کے نام روایتوں میں محفوظ ہو گئے یعنی ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، عباسؓ، فضلؓ بن عباسؓ، قثمؓ بن عباسؓ، اسامہؓ بن زید، ایمنؓ بن عبید (ام ایمن کے بڑے صاحبزادے)، مغیرہؓ بن حارث بن عبدالمطلب، ان کے فرزند جعفرؓ اور ربیعہؓ۔ گویا ابوبکرؓ اور عمرؓ کے سوا تمام ثابت قدم اصحاب رسول اللہ صلعم کے اہل خاندان تھے۔ اسامہؓ اور ایمنؓ بھی انھی میں شامل سمجھے جائیں۔ مغیرہؓ بن حارث نے حضور صلعم کے سفید خچر کی زین کا پچھلا حصہ پکڑ رکھا تھا اور چُپ چاپ ساتھ چل رہے تھے۔ عباسؓ کے ہاتھ میں خچر کی لگام تھی۔

حضرت انسؓ کی والدہ ام سُلیم بھی ثابت قدم اصحاب میں شامل تھیں۔ وہ اپنے شوہر ابوطلحہؓ کے ساتھ آئی تھیں۔ کمر چادر سے کس کر باندھ رکھی تھی اور اونٹ کی نکیل کھینچ کر اس کے نتھنوں میں اپنے ہاتھ کی انگلیاں دے رکھی تھیں تاکہ بے قابو نہ ہونے پائے۔ خنجر پاس تھا کہ کوئی مشرک قریب آئے تو اس کا پیٹ چاک کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ۔ (توبہ: ۲۶)	پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اپنی طرف سے سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اتاریں جو تمھیں نظر نہیں آتی تھیں اور ان لوگوں کو عذاب دیا جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور کافروں کی یہی جزا ہے۔

دشمن کا فرار رسول اللہ صلعم نے عباسؓ سے فرمایا کہ زور سے پکارو: "یا معشر الانصار" "یا معشر اصحاب السمرہ"۔ اے گروہ انصار، اے حدیبیہ میں زیر سایہ درخت بیعت کرنے والو۔ یہ ابن ہشام کی روایت ہے۔ البدایہ والنہایہ میں ہے: "یا اصحاب الشجرہ"۔ یہ آواز جس جس نے سُنی، وہ لبیک لبیک کہتا ہوا ایک دم مڑا۔ جس کا اونٹ نہ مڑ سکا وہ ڈھال اور تلوار لے کر اونٹ سے کُود پڑا اور جانور کو چھوڑ دیا۔ اس طرح آناً فاناً جاں نثاروں کا ایک گروہ حضور صلعم کے پاس جمع ہوگیا۔ انھوں نے اس زور سے حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں

اکھڑ گئے۔ وہ لوگ پراگندہ وار ہر طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور میدان خالی ہو گیا۔ صرف مال و اسباب اور اہل و عیال رہ گئے۔ دُرَید بن صِمَّہ نے سچ کہا تھا کہ جس کے پاؤں اکھڑ جائیں اسے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ بھاگتے وقت کسی کو مال و اسباب اور اہل و عیال کا خیال تک نہ رہا اور وہ سب کچھ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔

فراریوں میں سے کچھ گروہ اوطاس کی طرف چلے گئے۔ بعض نے طائف کا رُخ کیا۔ ان میں مالک بن عوف رئیس اعظم ہوازن بھی تھا۔ بنو غیرہ نخلہ کی طرف نکل گئے۔ رسول اللہ صلعم نے مفروروں کے تعاقب کا انتظام فرمایا۔

ابو عامرؓ اشعری (ابو موسیٰ اشعری کے عم مکرم) اوطاس کی جانب مامور ہوئے۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو مارا۔ آخر سلمہ بن دُرَید کے تیر سے مہلک زخم لگا اور شہادت پائی۔ ابو عامرؓ نے وفات سے پیشتر ابو موسیٰؓ کو اپنی جگہ مقرر کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ رسول اللہ صلعم سے دعا کی درخواست کرنا۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے ابو عامرؓ کے لیے دُعا فرمائی۔

دُرَید بن صِمَّہ بھی مارا گیا۔ رسول اللہ صلعم نخلۃ الیمانیہ، قرن، ملیح، بحرۃ الرغا، لیۃ ہوتے ہوئے طائف پہنچ گئے۔ مال غنیمت حنین سے جعرانہ بھجوا دیا۔

شہدائے حنین جنگ حنین میں مندرجہ ذیل اصحاب شہید ہوئے:

۱۔ ایمن بن عُبَید (اسامہؓ کے ماں جائے بھائی)
۲۔ یزیدؓ بن زمعہ (گھوڑے سے گرے اور قتل ہوئے)
۳۔ سُراقہ بن حارث انصاری
۴۔ ابو عامرؓ اشعری۔

شانِ رحمت اس جنگ میں حضور صلعم ایک عورت کی لاش کے پاس سے گزرے، جہاں لوگ جمع تھے۔ فرمایا: کیا ہے؟ عرض کیا گیا: ایک عورت خالدؓ بن ولید کے ہاتھ سے قتل ہوئی۔ حضور صلعم نے اپنے رفیقوں میں سے کسی کو حکم دیا کہ خالدؓ سے ملو اور کہو: "رسول اللہ نے بچے، عورت یا اجرت پر کام کرنے والے کے قتل سے منع فرمایا ہے۔"[1]

جنگ میں قتل و خونریزی سے مفر نہ تھا، لیکن انھی لوگوں کو جو مسلح ہوں اور مقابلے پر آئیں۔ عورتوں اور بچوں کو یا ان اجیروں کو قتل کرنا کیونکر جائز قرار پا سکتا تھا، جو اپنے فعل کے مختار نہ تھے اور نہ ہتھیار لے کر مقابلہ کرنے کے

---

[1] ابن ہشام القسم الثانی ص ۴۵۸۔

اہل تھے۔ جنگ مطلوب نہ تھی لیکن بعض اوقات حفاظت حق کی بنا پر مجبوری کی حالت میں اسے قبول کرنا پڑتا تھا تاہم اس کی مضرتوں اور بیدردیوں کا دائرہ جس حد تک بھی محدود کر دینا ممکن تھا، اس کے لیے انتہائی کوشش کی گئی۔ مختلف مذاہب کے دینی پیشواؤں مثلاً راہبوں، پادریوں بلکہ ہر اس شخص کو مستثنیٰ کر دیا گیا، جو ہتھیار اٹھا کر مقابلے پر نہ آئے، یعنی اپنے اصل دائرۂ مشغولیت سے باہر نکل کر دائرۂ حربیت میں نہ آ جائے۔

شیما بنت حارث

رسول اللہ صلعم کی رضاعی والدہ حلیمہ .. اس کے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ کی شاخ بنو سعد بن بکر میں سے تھے۔ اسیروں میں شیما[1] بنت حارث بھی پکڑی آئی جو رسول اللہ صلعم کی رضاعی بہن تھی اور اس نے آتے ہی کہا، یا رسول اللہ میں آپ کی رضاعی بہن ہوں اور ثبوت میں پیٹھ کھول کر دکھائی کہ بچپن میں ایک دفعہ آپؐ نے دانت سے کاٹا تھا اور وہ نشان باقی تھا۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں:

فرطِ محبت سے آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے بیٹھنے کے لیے ردائے مبارک بچھائی، محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ جی چاہے تو میرے گھر میں چل کر رہو، گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے۔ انھوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا۔ چنانچہ عزت و احترام سے پہنچا دی گئیں[2]۔

محاصرہ طائف

جنگ حنین کے بعد طائف کا محاصرہ کر لیا گیا، جو بیس روز جاری رہا۔ اسے مزید طوالت دینے کی ضرورت نہ سمجھی گئی اور اس دعا کے ساتھ محاصرہ اٹھا لیا گیا:

اللھم اھد ثقیفا و ات بھم۔ — اے اللہ ثقیف کو ہدایت عطا فرما اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔

یہ دعا منظور ہوئی یعنی ثقیف بھی بارگاہِ رسالت میں پہنچ کر اسلام کی دولت لازوال سے مشرف ہوئے اور اسلامی تاریخ کے اوراق پر جوانمردانِ ثقیف کے کارنامے بھی جابجا درخشاں ہیں۔

شہدائے طائف

محاصرہ طائف کے شہدا کی فہرست یہ ہے:

۱۔ سعید بن سعید بن العاص
۲۔ عُرفُطہ بن خبّاب[3]

---

[1] شیما کا نام ابن ہشام میں "حذافہ" درج ہے، الاصابہ میں "حذامہ" اور طبقات ابن سعد میں "جدامہ"۔ [2] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص۔ ۴۹۰۔ [3] ابن ہشام میں "حباب" ہے۔

۳- عبداللہ بن ابی امیہ (ام المومنین ام سلمہؓ کے بھائی)

۴- عبداللہ بن عامر

۵- سائب بن حارث

۶- عبداللہ بن حارث ۵ؓ کا بھائی

۷- عُلَیحہ بن عبداللہ

۸- ثابت بن الجذع

۹- حارث بن سہل

۱۰- المنذر بن عبداللہ

۱۱- رُقیم بن ثابت

۱۲- بُجَیر بن زہیر

مال غنیمت اور اسیر جنگ حنین کے اسیروں اور مال غنیمت کی مجموعی کیفیت درج ذیل ہے:

عورتیں اور بچے	چھ ہزار
اونٹ	چوبیس ہزار
بھیڑ بکریاں	چالیس ہزار
چاندی	چار ہزار اوقیہ

ہوازن کا وفد رسول اللہ صلعم طائف سے لوٹے تو عمرہ ادا کیا۔ پھر جعرانہ تشریف لائے۔ آپ کو اسیران جنگ کی رہائی کے لیے جس وفد ہوازن کا انتظار تھا وہ آگیا۔ اس کی ایک شاخ سے حضور صلعم کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ تھیں۔ رئیس وفد نے رضاعت ہی کے رشتے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اسیر عورتوں میں آپ کی پھوپھیاں اور خالائیں بھی ہیں۔ اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے کسی خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو اس سے بھی بہت امیدیں ہوتیں۔ آپ سے بہت زیادہ امیدیں ہیں۔

حضور صلعم نے فرمایا کہ خاندان عبدالمطلب کا حصہ تو میں چھوڑ سکتا ہوں لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے موقع پر سب لوگ جمع ہوں تو یہ درخواست پیش کرو۔

نماز ظہر کے بعد درخواست پیش ہوئی تو حضور صلعم نے فرمایا مجھے صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں عام مسلمانوں سے ان کے بدلے سفارش کرتا ہوں۔ یہ سنتے ہی مہاجرین و انصار سب نے اپنے حصے چھوڑ دیے۔ یوں

تمام عورتیں اور بچے رہا ہو گئے۔

تقسیم غنیمت غنیمت کی تقسیم میں رسول اللہ صلعم نے مکہ کے جدید الاسلام لوگوں کے ساتھ تالیف قلب کی خاطر زیادہ رعایت فرمائی چنانچہ ابوسفیان اور اس کی اولاد کو تین سو اونٹ، حکیم بن حزام کو دو سو، ان کے علاوہ آٹھ کو ایک ایک سو، بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ دیے۔ فوج میں سے ہر فرد کو فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں ملیں۔ سواروں کا حصہ زیادہ تھا۔

انصار سے خطاب اہل مکہ پر خاص احسان بعض نوجوان انصار کے لیے موجب اعتراض بن گیا اور بعض کی شکایتیں رسول اللہ صلعم تک پہنچیں تو آپ نے انصار کو ایک خیمے میں جمع کر کے فرمایا:

کیا یہ سچ نہیں کہ تم گمراہ تھے اور خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں ہدایت کی؛ تم منتشر و پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم میں اتفاق پیدا کیا؛ تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں دولت مند بنایا؛

انصار ہر ارشاد پر کہتے جاتے کہ بے شک خدا اور رسول نے ہم پر احسان کیا۔ حضور صلعم نے فرمایا:

تم اس کے جواب میں یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمدؐ، جب سب لوگوں نے تمہیں جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی؛ جب تجھے گھر اور وطن سے نکال دیا تو ہم نے تجھے پناہ دی؛ جب تم محتاج تھے تو ہم نے تیری مدد کی؛ میں کہتا جاؤں گا تم سچ کہتے ہو۔ اے انصار! تم ہمارے شعار ہو دوسرے لوگ دثار ہیں۔ اے خدا انصار پر رحم کر، انصار کی اولاد پر رحم کر، ان کی اولاد کی اولاد پر رحم کر۔

"شعار" کپڑے کی اس تہ کو کہتے ہیں جو جسم سے ملا ہوا ہو۔ "دثار" اوپر کی تہ کو کہتے ہیں۔ آخر میں فرمایا:

اے انصار کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ دوسرے لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمد (صلعم) کو لے کر اپنے گھر جاؤ۔

انصار چیخ اٹھے کہ ہمیں صرف محمد صلعم درکار ہیں۔

رسول اللہؐ کی معیت دراصل انصار میں بعض کو خیال ہو گیا تھا کہ اب رسول اللہ صلعم شاید مدینہ منورہ نہ جائیں اور مکہ مکرمہ ہی میں قیام فرما رہیں۔ اسی تاثر نے ان میں شدید پریشانی اور دل شکستگی پیدا کی اور ان کی زبان پر ایک ایسی بات آئی جسے ان کی فطری روح ایثار سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ تو اپنے پاس سے سب کچھ دے کر خوش ہوتے تھے۔ پھر باہر کا مال دوسروں کو زیادہ ملنے پر کیونکر رنجیدہ یا شاکی ہو سکتے تھے؛ جب عشق و محبت میں ناکامی کی بلائے مہیب گھٹا کی طرح ماحول پر چھائی نظر آتی ہے تو دل و دماغ کی طبعی کارفرمائی میں بھی خلل آ جاتا ہے۔ اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ معاملہ تو اس وجود مقدس و منزکّی سے عشق و محبت کا تھا،

جس کا جمال جہاں آرا قلب و روح کے لیے روز مراد اور ایمان و یقین کے لیے نوید عید سعید تھا۔ رسول اللہ صلعم نے خطبۂ مبارکہ میں انصار کے ساتھ جانے کا ذکر خصوصیت سے اسی لیے فرمایا کہ ان کی تمام پریشان خیالیوں اور پریشان گفتاریوں کا اصل مصدر و منشا حضور صلعم کی معیت سے محرومی کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہ عرض کر دینے میں بھی تامل کی کوئی وجہ نہ تھی کہ جعرانہ میں تقسیم غنیمت کے سلسلے میں جن لوگوں پر بغرض تالیف قلب زیادہ توجہ مبذول ہوئی، انھیں رسول اللہ صلعم کی معیت کے برکات و حسنات کا صحیح اندازہ کیا ہو سکتا تھا جو انصار یا مدینہ منورہ میں جا بسنے والے مہاجرین کو تھا۔

سماع دُرد کشاں صوفیاں چہ می دانند
ز شیوہ ہائے سمندر سپند را چہ خبر؟

چنانچہ حضور صلعم کے صرف اس ارشاد نے کہ آپ انصار کے ساتھ جائیں گے، ان کے دامن قلب سے تمام بے چینیوں، پریشانیوں اور اضطراب افزائیوں کو دھو ڈالا اور وہ کاملاً آسودۂ اطمینان ہو گئے۔ (مولف)

ایلاؔ و تخییر

یہ معاملہ ۹ھ کے اوائل (اپریل ۶۳۰ء) میں غزوۂ تبوک سے پہلے پیش آیا۔ اس سلسلے میں کئی واقعات جمع ہو گئے تھے جیسا کہ مولاناؒ نے اصل مقالے میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے اور یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اصل مقالے میں سے ایک طویل روایت کا عربی متن حذف کر دیا کیونکہ مولاناؒ نے خود اس کا خلاصۂ مطالب الگ بیان فرما دیا ہے۔ اس صورت میں عربی متن کا اندراج ضروری نہ رہا، نیز خوانندگانِ کرام کی سہولتِ مطالعہ کے پیشِ نظر جا بجا ذیلی عنوانوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۱۴ء کے "الہلال" کے چار نمبروں میں شائع ہوا تھا۔

باب ۶۵

ایلاء و تخییر

—(۱)—

انکار حدیث و مصلحین متفرنجین

استفسار (از غلام سرور شاہ) حضرت مولانا۔ السلام علیکم۔ میرے ایک نوجوان دوست (جن کا نام لکھنا ابھی مناسب نہیں سمجھتا اور غالباً ان کے خاندان سے جناب بھی ضرور واقف ہیں) آج کل عیسائی مشنریوں کے دام میں پھنس گئے ہیں اور رفتہ رفتہ انھیں اسلام کی جانب سے بدظن کیا جارہا ہے۔ وہ روز اپنے نئے عیسائی رفیقوں کے یہاں سے کوئی نہ کوئی اعتراض سیکھ کر آتے ہیں اور ہم لوگوں سے جواب طلب کرتے ہیں۔ ایک کتاب اردو کی ٹائپ میں لنڈن کی چھپی ہوئی بھی انھیں دی گئی ہے جسے وہ بطور حرزِ جاں کے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور اس میں بھی اسی طرح کے اعتراضات جمع کیے گئے ہیں۔ الحمدللہ کہ آج تک ان کے ہر اعتراض کا میں نے مسکت جواب دیا اور اس کا جواب وہاں سے وہ کوئی نہ لا سکے۔ البتہ ایک واقعہ انھوں نے ایسا بیان کیا، جس کے متعلق بوجہ عدم علم و واقفیت میں پوری طرح تشفی نہ کر سکا، لیکن چونکہ اس کا حوالہ احادیث کی بنا پر دیا گیا تھا اس لیے میں نے صاف کہہ دیا کہ ہم صرف انھیں اعتراضات کے جواب دہ ہیں جو قرآن کریم کی بنا پر کیے جائیں۔ صرف وہی حقیقی اور ایک ہی مجموعہ ہمارے تمام اعتقادات و عبادات کا ہے۔ حدیثوں کو کوئی یقینی درجہ حاصل نہیں اور اس لیے اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔ یہی زرّیں اصول سرسید احمد خاں مرحوم نے خطبات احمدیہ اور مضامین "تہذیب الاخلاق" میں قائم کیا ہے۔ اس پر ان کے عیسائی دوست نے جواب میں کہلایا کہ قرآن کریم میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

انھوں نے حضرت سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق بیان کیا ہے کہ ایک مصری عورت حضورؐ کے پاس آئی تھی اور اسے بطور لونڈی کے آپ نے رکھ لیا تھا۔ ایک دن آپ اس کے ساتھ خلوت میں تھے کہ یکایک آپ کی بیویوں میں سے ایک بیوی چلی آئیں اور دیکھ کر سخت ملامت کی، اس پر آپ نے معذرت کی اور کہا کہ اس واقعہ کا ذکر دوسری بیویوں سے نہ کرنا مگر انھوں نے ذکر کر دیا اور آپ ایک مہینے تک اپنی تمام بیویوں سے

ناراض ہوکر بالکل الگ رہے اور اس قدر اس کا صدمہ ہوا کہ مہینے بھر تک اپنی کوٹھڑی سے بالکل نہ نکلے۔

وہ کہتا ہے کہ یہ واقعہ معتبر کتب میں موجود ہے اور اسی بنا پر اعتراض کرتا ہے کہ کیا ایسا اخلاق انبیاء کا ہوسکتا ہے؟

میں نے اپنے یہاں کے بعض علمائے سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ ہاں بے شک یہ واقعہ کتب معتبرہ میں آیا ہے۔

پھر جناب .... کو لکھا انھوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اب جناب سے مستدعی ہوں کہ خدارا اپنا تھوڑا سا وقت صرف کرکے مجھے واقعے کی حقیقت سے مطلع فرمائیں، بلکہ "الہلال" میں درج کریں تاکہ تمام مسلمانوں کے لیے ذریعۂ علم ہو اور مخالفوں کے دام تزویر سے بچیں۔ نیز اس کی نسبت بھی تحریر فرمائیں کہ کیا احادیث کے متعلق اس اصول کو آپ تسلیم کرتے ہیں جو میں نے مخالف کے سامنے پیش کیا؟

جواب

اصل بیان کی حقیقت

۱۔ آپ نے جس کتاب کو اپنے قابل رحم دوست کے ہاتھ میں دیکھا ہے، وہ غالباً پادری عمادالدین کی "میزان الحق" وغیرہ ہوگی جو لنڈن میں چھپی تھی۔ "ازالۃ الاوہام"، "استفسار"، "لسان الصدق"، "اظہار الحق" وغیرہ انھی کتابوں کا جواب ہے لیکن جس واقعے کا آپ نے ذکر کیا ہے اسے ان کتابوں سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ جن لفظوں اور جس صورت میں آپ کے دوست نے یہ واقعہ بیان کیا ہے وہ قطعاً بے اصل اور حتماً کذب وافتراء ہے۔ آپ پورے وثوق اور تحدّی کے ساتھ انکار کردیں اور ثبوت طلب کریں۔ جن حضرات علمائے سے آپ نے تحقیق فرمایا اور انھوں نے اس واقعے کی تصدیق کی، ان کی نسبت بجز اس کے کیا کہوں کہ اللہ ان پر رحم کرے۔ ایسے اپنوں کا وجود دشمنوں سے زیادہ مہلک ہے۔ فنعوذ باللہ من شرّ الجہل والجاھلین۔

۳۔ البتہ بیان کردہ صورت واقعہ سے قطع نظر کرلیا جائے تو یہ دراصل واقعہ ایلاؤ تخییر کی بعض روایات کی ایک مسخ شدہ صورت ہے اور جس مصری لونڈی کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے مقصود ماریہ قبطیہ ہیں۔ بلاشبہ کتب سیر و تفاسیر میں بعض روایات ایسی موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ازواج کی خاطر ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا اور حضرت حفصہؓ یا حضرت زینبؓ سے کہا تھا کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ انھوں نے حضرت عائشہؓ سے ذکر کردیا اور اس پر سورہ تحریم کی آیات نازل ہوئیں۔

لیکن اوّل تو آپ کے دوست کے مسیحی معلم کا یہ کہنا کہ یہ واقعہ قرآن کریم میں بھی موجود ہے، بالکل غلط ہے۔ قرآن کریم میں کوئی ایسا واقعہ بیان نہیں کیا گیا بلکہ صرف ایک راز کا ذکر کیا گیا ہے جو آنحضرت صلعم نے بعض ازواج پر ظاہر کیا تھا اور اس کا ذکر دوسروں سے کردیا گیا۔ پھر جو روایتیں اس بارے میں موجود ہیں ان کا کتب معتبرہ حدیث میں کہیں ذکر نہیں۔ صحاح کے تمام ابواب نکاح و طلاق و ایلاؤ تخییر ان سے خالی ہیں اور طبری وغیرہ میں ان کا ہونا کوئی دلیل صحت نہیں، جب تک کہ

اصول مقررۂ حدیث کے مطابق ثابت نہ ہو جائے۔ علاوہ بریں متعدد وجوہ ایسے موجود ہیں، جن سے یہ تمام روایات موضوع اور پایۂ اعتبار سے ساقط ثابت ہوتی ہیں اور محققین فن کی بھی یہی رائے ہے۔ کما سیاتی ان شاء اللہ۔

لیکن آپ نے ساتھ ہی ایک نہایت اہم اور اصولی موضوع بھی چھیڑ دیا ہے یعنی احادیث کے انکار و تسلیم کا سوال بغیر ایک مستقل و مبسوط مضمون کے اس کا تشفی بخش جواب تو ممکن نہیں، البتہ اصل سوال کے جواب سے پہلے سرسری طور پر کچھ اس کی نسبت بھی عرض کر دیتا ہوں۔

معترضین اسلام کی اصولی تقسیم

مخالفین و اعدائے اسلام جس قدر اعتراضات اسلام اور حضرت داعی اسلام صلعم کے متعلق کرتے ہیں خواہ وہ آج پادری عماد الدین، پادری فنڈر، سر ولیم میور، مارگولیتھ وغیرہ نے کیے ہوں یا اب سے صدہا سال پہلے ان معترضین نے، جس کے جوابات ابن حزم "الملل والنحل" میں، غزالی نے "تحفۃ الاریب" میں، ابن تیمیہ نے "الجواب الصحیح" میں اور ابن قیم نے "ارشاد الحیاریٰ" وغیرہ میں دیے ہیں (رحمہم اللہ)، مگر اصولاً ان کی دو ہی قسمیں ہیں:

ا۔ وہ اعتراضات جو محض سوء تفہیم یا دانستہ تلبیس و اعراض عن الحق کا نتیجہ ہیں مثلاً قرآن کریم کے احکام جہاد و طلاق وغیرہ کے متعلق جس قدر اعتراضات کیے جاتے ہیں یا اختلافات بیانات قرآن و کتب مقدسہ کی بنا پر جو کچھ کہا جاتا ہے، ان کی بنیاد ایک صحیح اور واقعی تعلیم پر ہے اور یقیناً وہ احکام قرآن کریم میں موجود ہیں لیکن یا تو ان کی نسبت تعصب و جہل سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں یا دانستہ ان کے رد و بطلان کی کوشش کی گئی ہے یا سرے سے اس اصل کو قابل اعتراض قرار دے دیا ہے جس پر وہ تمام تعلیقات و احکام متفرع ہیں۔ غرض اسلام کو ان باتوں کے لیے الزام دیا ہے جن کے وجود سے تو وہ منکر نہیں لیکن جن وجوہ و دلائل کی بنا پر الزام دیا گیا ہے ان کا منکر و مبطل ہے۔

ب۔ یا پھر وہ اعتراضات ہیں جن کی بنا نہ تو کسی اسلامی تعلیم پر ہے اور نہ اسلام کے کسی مسلّمہ واقعے پر۔ نہ تو خود قرآن کریم میں ان کا وجود ہے اور نہ احادیث صحیحہ و معتبرہ میں۔ ان کا دار و مدار صرف ان بیانات اور روایات پر ہے جو بعض مسلمان مصنفوں نے اپنی کتابوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے درج کر دی ہیں یا عام طور پر مسلمانوں میں بیان کی جاتی ہیں اور افواہ عوام پر چڑھ گئی ہیں مثلاً "قصہ غرانیق"، "واقعہ حضرت زینبؓ" وغیرہ یا مثلاً یہی واقعہ ماریہ قبطیہ جو آپ کے دوست کو ایک نہایت مکروہ و محرف صورت میں دکھلایا گیا ہے۔

ان دو قسموں کے علاوہ بے شمار اعتراضات ایسے بھی ہیں جو افترا و بہتان ہیں، جیسے صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں مشرقی پادریوں نے مسلمانوں کی بت پرستی کے اکاذیب مشہور کر دیے تھے اور جن کو موسیو کاستری نے "اسلام اور بانی اسلام" میں مفصل بیان کیا ہے یا آج بھی ایسی صدہا باتیں اسلام کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں جن کی کوئی ادنیٰ اور ضعیف اصلیت بھی روایت اسلامیہ میں نہیں ملتی۔ یہ تمام اعتراضات یکسر عداوت و تعصب اور جہل و فساد کا

نتیجہ ہیں، جنھیں خود صاحبِ نظر معترضین بھی تسلیم نہیں کرتے اور یہاں مقصود صرف قابل توجہ اعتراضات ہیں، نہ کہ افتراء محض و بہتان صرف۔

سب سے زیادہ خطرناک قسم جن لوگوں نے مخالفین و معترضین کے اسفار و کتب سے واقفیت حاصل کی ہے، وہ تسلیم کریں گے کہ اعتراضات کا سب سے زیادہ حصہ دراصل دوسری ہی قسم پر مشتمل ہے اور پہلی قسم کے اعتراضات گو اصلاً زیادہ اہم ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے اور اعداے اسلام کو اسلام کی تضحیک و تحقیر میں بھی ان سے بہت کم مدد ملتی ہے۔ یہ صدہا کتابیں جو اسلام کی مخالفت میں لکھی گئی ہیں یا لکھی جا رہی ہیں، انھیں اٹھاکر دیکھیے اور ان تمام اعتراضات پر نظر ڈالیے جو ان میں پیش کیے گئے ہیں، ان میں بہت تھوڑا حصہ ان اعتراضات کا ہوگا جو براہِ راست قرآن کریم کی تعلیمات یا احادیث معتبرہ و مسلّمہ کی بنا پر کیے گئے ہیں اور تمام مجلدات یکسر انھی مطاعن و معائب سے لبریز ہوں گی جو عام روایات مفسرین و کتب سیرۃ و مغازی کی بنا پر کیے گئے ہیں اور جن میں ضمناً یہ مقدمہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اسلام و پیروان اسلام کے لیے ہر مسلمان مصنف کا بیان حجت و برہان ہے۔

سب سے بڑا ابلیسی وسیلہ اعدائے اسلام کے پاس یہ ہے کہ حضرت داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ و مقدسہ کو دنیا کے سامنے ایسی مکروہ و معیوب شکل میں پیش کیا جائے جس کے دیکھتے ہی طبائع میں نفرت و کراہت پیدا ہو جائے اور اسلام کے متعلق کسی حسن ظن کے پیدا کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

یہ مقصد پہلی قسم کے اعتراضات سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں جہاد کا حکم ہے، تعدد ازواج کی اجازت ہے۔ طلاق کو جائز بتلایا ہے۔ قوم عاد و ثمود کے تاریخی مقامات کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا خانۂ کعبہ بنانا بیان کیا گیا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کو ملامت کرنے والوں نے "یا اخت ہارون" کہا ہے۔ معترضین ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ احکام جہاد کو ظالمانہ بتلاتے ہیں۔ تعدد ازواج اور طلاق کو اخلاقاً معیوب کہتے ہیں۔ قوم عاد و ثمود کے متعلق تاریخی ثبوت طلب کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی بنائے کعبہ کا ثبوت تورات سے مانگتے ہیں۔ حضرت مریمؑ کا "اخت ہارون" ہونا ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم ان تمام اعتراضات سے اسلام کے محاسن و فضائل پر بالکل پردہ نہیں پڑ جا سکتا اور سننے والے کے لیے یہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اس کے دیگر احکام و تعلیمات کے متعلق حسن ظن قائم کرے یا بعض دیگر شرائع سے مقابلہ کرکے تسلی حاصل کرلے۔ حضرت موسیٰؑ نے تلوار سے کام لیا۔ حضرت داؤد و سلیمان نے صدہا بیویاں رکھیں۔ اگر مخاطب ان الزامات کو صحیح مان بھی لے جب بھی زیادہ سے زیادہ یہی نتیجہ حاصل کر سکتا ہے کہ قرآن کریم اور کتب مقدسہ عتیقہ کو ایک درجہ میں رکھنا چاہیے۔

یورپ و امریکہ کی حالت لیکن برخلاف اس کے دوسری قسم کے اعتراضات و مطاعن اپنی معاندانہ تاثیر و نفوذ میں ان اعتراضات سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں اس زندگی کی تصویر

دکھائی جاتی ہے جو تعلیمات اسلامیہ کا حامل ہے اور جس کی رسالت و نبوت کی صداقت پر قرآن و اسلام کی حقانیت موقوف ہے۔ یہ تصویر نہایت مکروہ ہوتی ہے اور شیطان کفر و ضلالت اعدائے اسلام کے اندر حلول کر کے اس کے خال وخط درست کرتا ہے نعوذ باللہ، انسانی معاصی و رذائل کے تمام اعمال سیئہ اس میں جمع کیے جاتے ہیں اور ایسے ایسے قبائح و شنائع کو کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو انسانی بد اخلاقی کی انتہا ہیں اور درجہ نبوت و رسالت تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے ایک شریف و نیک اعمال شخص کی زندگی بھی ان سے ملوث نہیں ہو سکتی۔ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۔ (مومن، ۶۳)[1]

آج یورپ اور امریکہ میں عام طور پر جو توحش و تنفر اسلام کی طرف سے پھیلا ہوا ہے وہ زیادہ تر اسی تلبیس و شیطنت کا نتیجہ ہے۔ ان مفتریات کو سن کر ایک سادہ ذہن مخاطب اس درجہ اسلام سے متوحش ہو جاتا ہے کہ اس کے کسی حسن و فضیلت کا اسے تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ہمیشہ کے لیے حسن ظن و تلاش حقیقت کا سد باب ہو جاتا ہے۔

پس فی الحقیقت قسم اول کے اعتراضات اس درجہ اسلام کے لیے مضر نہیں، جس قدر دوسری قسم کے ہیں اور آج اعدائے اسلام کے ہاتھ میں سب سے زیادہ خطرناک حربہ یہی مفتریات ہیں۔ کسی مذہب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بزور شمشیر پھیلا، سننے والوں کو اس درجہ متاثر نہیں کر سکتا، جس قدر اس افترا کا پیش کرنا کہ (نعوذ باللہ) اس کا بانی اپنے متبنیٰ کی بیوی کو برہنہ غسل کرتے دیکھ کر فریفتہ ہو گیا اور بالآخر اس سے طلاق دلا کر خود اپنے نکاح میں لے آیا۔ یہ ایک نہایت دقیق نکتہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں اور اس وقت تک بہت کم اس پر توجہ کی گئی ہے۔

ان مطاعن کا سرچشمہ

اس قسم کے تمام مطاعن و معائب میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں، ان کا ایک بڑا حصہ معترضین کے افترائے کفر و ضلالت کا نتیجہ ہوتا ہے، جس کی کوئی اصلیت نہیں، البتہ معاندانہ حذف و اضافہ اور تحریف و تلبیس کو الگ کر دینے کے بعد دیکھا جائے تو اس کی بنیاد میں کوئی بات ایسی ضرور نکل آتی ہے جو یا تو کسی مسلمان مصنف کا بیان ہے یا کوئی روایت اور اثر ہے یا پھر کوئی قصہ ہے جو مسلمانوں کی زبانوں پر چڑھ گیا ہے۔

معترضین عموماً یہ کرتے ہیں کہ اسلامی تصنیفات کے متعلق ایک سطحی اور سرسری واقفیت حاصل کر کے چند کتابیں تفسیر اور سیرۃ یا قصص و فضائل کی اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں اور ان میں جس قدر روایتیں اس قسم کی پاتے ہیں جن کی بنا پر اسلام کی صداقت اور بانی اسلام کی زندگی پر طعن و قدح کیا جا سکتا ہے، انھیں کامل ابلیسانہ ہوشیاری اور پوری مفتریانہ چالاکی کے ساتھ یکجا کر لیتے ہیں۔ پھر اپنے اکاذیب و مفتریات کا ان پر اضافہ کرتے ہیں اور مفید مطلب توجیہ و تعلیل کے ساتھ

---

[1] اور اسی طرح پھرے جاتے ہیں وہ لوگ جو اللہ کی آیات سے منکر ہیں۔

ترتیب دے کے اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ ناواقف ان کے استدلال و استشہاد سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

وہ عموماً کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں اور بعض اوقات ان روایات کو نقل بھی کر دیتے ہیں، جن سے ان کا استدلال ہوتا ہے۔ امریکن مشن نے عربی زبان میں ایک کتاب بلاد مصر و شام کے لیے شائع کی تھی، جو چار ضخیم جلدوں میں ختم ہوئی ہے اور جس کا نام "الہدایہ" ہے، اس میں اوّل سے لے کر آخر تک ہر اعتراض کے ساتھ کوئی نہ کوئی روایت بھی پیش کی ہے غیروں کے علاوہ خود ناواقف مسلمانوں پر بھی ان حوالوں کا بہت اثر پڑتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جب خود اسلامی روایات میں یہ واقعات موجود ہیں تو ان سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے؛

اس قسم کی روایات زیادہ تر تفاسیر اور عام کتب سِیَر و تاریخ میں ہیں یا حضرت شاہ ولی اللہ کی تقسیم مدارج کتب حدیث سے مطابق، تیسرے یا چوتھے درجے کی کتابوں سے لی جاتی ہیں۔

فتنۂ اصلاح و اجتہاد

یہ ایک نہایت اہم اور اصولی بحث ہے کہ اس قسم کے اعتراضات و مطاعن کے لیے صحیح اور حقیقی طریق جواب و رد کا کیا ہے؛

ہمارے زمانے میں ایک نیا گروہ مصلحین و متکلمین کا پیدا ہوا ہے، جس نے اپنی قابل تعریف بیداری و باخبری کے باعث پہلے پہل ان اعتراضات سے واقفیت حاصل کی اور چاہا کہ ان مطاعن کی آلودگی سے اسلام کے دامن کی تنزیہہ و تقدیس ثابت کرے۔ اس کی مستعدی مستحق اعتراف ہے اور اس کی نیت وسعی قابل تحسین، لیکن افسوس ہے کہ جس کام کو وہ کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے مستعدی اور آمادگی تو اس کے پاس ضرور تھی، پر اسباب و وسائل یکسر مفقود تھے۔ اس کا دماغ کارکن اور اس کا فہم طالبِ اجتہاد تھا، لیکن نہ تو اس کے پاس نظرِ علم پیا تھی جو معینِ مقصد ہوتی اور نہ ہی فکر واقف کار تھا جو سامان مہیا کرتا۔ نہ تو اسے علوم اسلامیہ کی خبر تھی، نہ فنِ حدیث و اثر پر نظر تھی۔ نہ اصولِ فن سے اس نے واقفیت حاصل کی اور نہ اسفار و مصنفات محققین و ائمہ قوم پر نظر ڈالی۔ جس طرح اسلام کے حریفوں نے اس پر طعن کرتے ہوئے اپنے جہل پر اعتماد کیا، اسی طرح اسلام کے ان حامیوں نے ان کا جواب دیتے ہوئے صرف اپنے بے خبرانہ اجتہاد ہی کو کافی سمجھا۔ چونکہ انھیں اپنی قوت کی خبر نہ تھی اور صرف اپنی فکر و رائے ہی پر اعتماد تھا، اس لیے وہ حریفوں کی سطوت سے مرعوب ہو گئے اور قابل اعتراض روایات و بیانات کا انبار دیکھ کر اس طرح گھبرا گئے کہ ان میں رد و تحقیق کے لیے کوئی قوت فعّال باقی نہ رہی اور ان کا رشتۂ کار حریفوں کی قوت اور استیلاء سے اثر کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

اس گھبراہٹ میں انھوں نے اپنے تئیں بالکل مجبور پایا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ اپنے کسی جدید خود ساختہ اصول کی بنا پر احادیث و روایات کی صحت ہی سے قطعی انکار کر دیں اور اس طرح ان کے جواب کی ذمہ داری سے بہ آسانی سبک دوش ہو جائیں۔ پس بجائے اس کے کہ وہ ان روایات کی حقیقت و اصلیت کو واضح کرتے، انھوں نے

اس قسم کے مجتہدانہ اصول وضع کرنا شروع کر دیے ، جن کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو معترضین کے فتنے سے بھی بڑھ کر ایک داخلی فتنہ عظیم اسلام میں پیدا ہو جائے ۔ اعاذنا اللہ من شرّھا و من شر الجھل و الفساد ۔

فن حدیث کی تضعیف

مثلاً انھوں نے ان اعتراضات سے بچنے کے لیے جو احادیث کی بنا پر کیے جاتے ہیں ۔ سرے سے فن حدیث ہی کی تضعیف و تحقیر شروع کر دی ، حتیٰ کہ صاف فیصلہ کر دیا کہ حدیثیں اکثر خبر احاد ہیں اور خبر احاد مفید یقین نہیں ۔ اس لیے حدیث فی الحقیقت کوئی شے نہیں ، اس کے جواب کے ہم ذمہ دار نہیں ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

اسی طرح انھوں نے ایک فتنہ سے بچنے کے لیے اپنے وجود کو دوسرا فتنہ بنا دیا اور دشمن نے چونکہ شاگرد پیشہ کے مکان پر قبضہ کر لیا تھا لہٰذا اس کے ہلاک کرنے کے لیے پوری عمارت میں آگ لگا دی ۔ عزیز من ! یہ اسلام کی حمایت نہیں ، بل ھی فتنہ ، و لکن اکثرالناس لا یعلمون ۔

وقت تفصیل کا متحمل نہیں اس لیے میں سرسری اشارات کروں گا ۔ اگر فن و ارباب فن پر ان بے خبروں کی نظر ہوتی تو وہ سمجھتے کہ مخالفین کے حملوں سے بچنے کے لیے اس مہلک اجتہاد کی کوئی ضرورت نہیں ۔ ایک محفوظ و مصئون طریق کا پیشتر سے موجود ہے اور بغیر اس کے کہ کسی جدید مصلح و مجدد کو اپنے عزائے اجتہاد کے اعلان کی ضرورت ہو ، خود محققین فن نے اس بارے میں جو اصول و قواعد وضع کر دیے ہیں انھی کے مطابق چل کر ہم بہتر سے بہتر حق تحقیق و دفاع ادا کر سکتے ہیں ۔

اصول بحث و مسلک صحیح و مستقیم

اصل یہ ہے کہ یہ تمام نتائج جہل و بے خبری کے ہیں اور وہ بے خبری ہمارے مخالفین اور نئے حماۃ و مصلحین ، دونوں کے حصے میں آئی ہے ۔ ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ معترضین کو بتا دیں قرآن کریم کے بعد ہمارے لیے حجت و دلیل کون کون سے مصادر علم و اعتماد ہو سکتے ہیں ؟ نیز یہ کہ کیا کسی روایت کا کسی کتاب میں درج ہونا اس کے لیے کافی ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے حجت ہو سکے ؟ اس بارے میں ائمہ سلف نے کچھ اصول مقرر کیے ہیں یا نہیں ؟

درحقیقت انھی دو سوالوں کا جواب آجکل کے صدہا داخلی و خارجی مباحث و اختلافات کے لیے بمنزلہ اصل و اساس کے ہے اور جس قدر مشکلات ہمیں نظر آتی ہیں اور جس قدر ٹھوکریں نئے مصلحین نے کھائی ہیں ، وہ تمام تر اسی اصولی بحث کے افراط و تفریط کا نتیجہ ہے ۔

ان دو سوالوں کا مختصر جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کے بعد یقیناً اور حتماً احادیث صحیحہ کا درجہ ہے اور بغیر کسی خوف و تامل کے اس کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ حدیث صحیح ایک ایسا مصدر علم ضرور ہے جو ہمارے لیے دلیل اور حجت ہو سکتا ہے اور جس طرح ہم اپنے داخلی اعمال میں احادیث کے معترف و معتقد ہیں ، بالکل اسی طرح خارج کے اعتراضات میں بھی ان کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں ۔

لیکن حدیث ایک مدوّن و منضبط فن ہے، جس کے اصول و قواعد ہیں اور اس کی جمع و ترتیب کا کام صدیوں تک جاری رہا ہے۔ اس لیے صحت و اعتبار کے لحاظ سے مختلف طبقات و مدارج میں منقسم ہو گیا ہے۔ اس کی بنیاد انسانوں کی روایت پر تھی، اس لیے اصولِ شہادت و روایت کی بنا پر ضرور تھا کہ نقد و روایت کے اصول وضع کیے جاتے اور وضع کیے گئے۔ اس پورے کرۂ ارضی کے اندر جس میں انسان نے ہزار ہا برس کے تجارب و محن کے بعد صدہا علوم و فنون تک رسائی حاصل کی ہے اور ہر قوم نے علم کی تفتیش و تدوین میں حصہ لیا ہے۔ بے خوف دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کسی علم و فن کو بھی انسانی دماغ نے اس درجہ منضبط اور سعی انسانی کی انتہائی حد تک مرتب و مہذب نہیں کیا، جیسا کہ علمائے سلف نے فن حدیث کو کیا اور یہ ایک مخصوص شرف و مزیت علمی ہے امت مرحومہ کی، جس میں دنیا کی کوئی قوم شریک و سہیم نہیں۔ والقصۃ بطولہا۔

پس ضرور ہے کہ جس حدیث سے ہمارے سامنے استدلال کیا جائے اس کی صحت، اصول و قواعد مقررۂ فن اور علوم متعلقہ حدیث سے ثابت بھی کر دی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارے لیے کسی طرح بھی دلیل و حجت نہیں ہو سکتی۔

ایک عام غلط فہمی ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ فن حدیث کے طبقات و مدارج اور محدثین کے طریق جمع و اخذ پر لوگوں کی نظر نہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تفسیر و سیر اور مغازی و ملاحم کی کسی کتاب میں سلسلۂ اسناد و کسی روایت کا درج ہونا اس کے لیے کافی ہے کہ اسے تسلیم کر لیا جائے، حالانکہ یہ صریح غلطی ہے اور خود محدثین نے اس غلطی کو کبھی جائز نہیں رکھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں جو تصریحات اس کے متعلق کر دی ہیں، وہ قدما کی تصنیفات سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ انھوں نے بہ اعتبار صحت و شہرت و قبول، کتب احادیث کو چار درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول درجے میں وہ موطا امام مالک اور صحیحین کو قرار دیتے ہیں اور بقیہ کتب صحاح ستہ کو دوسرے درجے میں رکھتے ہیں۔ اس کے بعد دارمی، ابویعلی، ابن حمید، طیالسی کے مسانید اور عبدالرزاق ابن ابی شیبہ وغیرہ کے مجموعے ہیں، انھیں تیسرے درجے میں قرار دیا ہے، یہاں تک کہ موضوع حدیثیں بھی شامل ہیں۔ شاہ صاحب نے سنن ابن ماجہ کو بھی اسی درجے میں رکھا ہے مگر اس کے خلاف رائیں زیادہ ملیں گی۔

چوتھے درجے میں کتب حدیث کا تمام بقیہ حصہ داخل ہے۔ علی الخصوص تصانیف حاکم، ابن عدی، ابن مردویہ، خطیب، تفسیر ابن جریر طبری، فردوس دیلمی، ابونعیم صاحب حلیہ، ابن عساکر وغیرہ۔ عام کتب تفاسیر و دلائل و خصائص و قصص کا سرچشمہ یہی کتابیں ہیں۔

ان بزرگوں نے اپنا مقصد کتب صحاح کے جامعین سے بالکل مختلف قرار دیا تھا۔ اس مقصد کی بے خبری ہی سے تمام مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ انھوں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جس قدر حدیثیں وہ پیش کرتے ہیں، سب کی سب قابل اعتماد ہیں۔ ان کا مقصد صرف احادیث کو کسی خاص سلسلے سے جمع کر دینا تھا اور اس کے نقد و بحث کو انھوں نے

دوسروں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

محققین فن کا مسلک

چنانچہ اس کا سب سے بڑا واضح ثبوت یہ ہے کہ محققین فن حدیث نے ہمیشہ اپنی تصنیفات میں ان کی جمع کردہ حدیثوں کو اسی وقت قبول کیا، جب وہ اصول مقررۂ حدیث کے مطابق جانچ لی گئیں اور ہمیشہ ان پر اپنے اپنے اصول کے ماتحت رد و قدح اور نقد و جرح کرتے رہے۔ سب سے بڑا ذخیرۂ حدیث اس قسم کا امام ابن جریر طبری کی تفسیر ہے جنھوں نے قرآن کریم کی ہر آیت کے نیچے روایات کے جمع کرنے کا التزام کیا ہے اور ماریہ قبطیہ کے متعلق جو روایات آپ کے دوست نے نسخ و اضافہ کے بعد پیش کی ہیں وہ بھی امام موصوف ہی نے سورۂ تحریم کی تفسیر میں درج کی ہیں یا پھر طبرانی کے معاجم ہیں اور حاکم کی مستدرک، ابن حمید و دارمی کی مسانید اور ابونعیم و دیلمی کی تصنیفات ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ ذہبی جیسے مسلّم محدثین اپنی تصنیفات میں جا بجا ان کی مرویات پر جرح و نقد کرتے ہیں اور کسی روایت کو بحث و نظر کے بعد قبول اور کسی کو مردود قرار دیتے ہیں۔ صرف فتح الباری اور عینی ہی اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ اس رد و قبول کا کیا حال ہے؟

ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ

امام ابن تیمیہؒ سے بڑھ کر فن حدیث کا اور کون حامی و غوّاص ہوگا، جنھوں نے اس راہ میں بے شمار متاعب و شدائد بھی فقہائے متقشفین کے ہاتھوں برداشت کیے مگر جن خوش نصیبوں کو امام موصوف کی تصنیفات کے مطالعہ کرنے کی توفیق ملی ہے، وہ اندازہ کرسکیں گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ "منہاج السنۃ" وغیرہ میں صحاح کی متعدد احادیث کو انھوں نے صاف صاف رد کر دیا ہے۔

یہ ہمارے پاس علامہ ابن قیم کی "زاد المعاد" اور "اعلام الموقعین" وغیرہ مصنفات شہیرہ موجود ہیں۔ ایک نہیں متعدد مقامات پر موصوف ان کتابوں کی بیان کردہ احادیث کو بلاتکلف رد کر دیتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کتب صحاح کی مرویات پر بھی روایت و درایت کے مقررہ اصول کے بموجب نظر انتقاد ڈالتے ہیں اور کسی سے استدلال کرتے ہیں اور کسی کو اعتماد کے لیے غیر مفید بتلاتے ہیں پھر فقہائے حنفیہ کا طرز عمل تو اس بارے میں ایک صاف شہادت ہے جو احادیث صحیحین تک کو بلاتکلف اپنے قیاس و درایت کے مقابلے میں تسلیم نہیں کرتے۔

نقد و نظر کا اصول

پس یہ ایک صریح اور مسلّم بات ہے کہ احادیث کے تسلیم کرنے کے لیے طریق نقد و نظر سے کام لینا ضروری اور ناگزیر ہے اور اس بارے میں ہمیشہ اکابر فن کا یکساں طرز عمل رہا ہے۔ اس امر کے لیے کسی شہادت کے پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے اس لیے زور دیا تاکہ مخالفین اسلام یہ نہ سمجھیں کہ ان کے اعتراضات سے بچنے کے لیے یہ کوئی نیا اصول قرار دیا جا رہا ہے یہ اصول ہمیشہ سے موجود ہے اور جس طرح ہم اب سے آٹھ سو برس پہلے صرف انھی احادیث کو تسلیم کرتے تھے جو قواعد مقررۂ فن سے ثابت ہو جائیں، اسی طرح آج بھی صرف انھی روایتوں کو تسلیم کریں گے جو خود ان روایات کے جمع کرنے والوں کے مقررہ اصول کے مطابق ثابت

کر دی جائیں۔

یہ بالکل ایک کھلی ہوئی بات ہے، علی الخصوص کتب تفسیر و سیرۃ و مغازی اور بالخصوص انبیاے سابقین و اسرائیلیات کے متعلق ابتدا سے ائمہ فن نے یہی رائے دی ہے اور حضرت امام احمد کے زمانے سے جبکہ انھوں نے "ثلاثۃ کتب لیس لہا اصل: المغازی والملاحم والتفسیر" کہا تھا۔ حفاظ حدیث کے آخری عہد تک جب ابن حجر، ابن تیمیہ، ابن قیم اور حافظ ذہبی رحمہم اللہ نے کتابیں تصنیف کیں، تمام محققین فن کا طرز عمل اسی کا موید رہا ہے۔

خلاصۂ مطالب

پس ضرور ہے کہ اس امر کو اچھی طرح معترضین اسلام پر واضح کر دیا جائے اور اس کے اصول و قواعد ان کے سامنے پیش کر دیے جائیں۔ اس کے بعد ان سے بحث کی جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو باوجود اس واقفیت کے جو مجھے معترضین کے ذخیرۂ کثیرہ مطاعن و معائب سے ہے اور باوجود ان مشکلات کا کامل اندازہ کرنے کے جو ہمارے نئے مصلحین و مجتہدین اور متکلمین قرن جاری کو رد مطاعن اور دفع اعتراضات و شکوک میں پیش آئی ہیں، میں پوری طمانیت قلب اور وثوق کامل کے ساتھ کہتا ہوں کہ احادیث معتبرہ کی بنا پر کوئی دقت ہمیں اس راہ میں پیش نہیں آئے گی اور نئے اجتہادات و تجدیدات کا طوفان مہلک و بادم اٹھانے کی بالکل ضرورت نہ ہوگی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آکر باوجود اتحاد مقصد و علم ضرورۃ مجھے نئے مصلحین متفرنجین سے علحدہ ہو جانا پڑتا ہے اور باوجود ان کے کاموں سے غیر جاہلانہ و غیر متعسفانہ واقفیت کے میرے دل میں ان کے لیے کوئی حسن اعتقاد و اعتماد پیدا نہیں ہوتا۔ بلاشبہ ضرورتیں شدید اور نظر و تحقیق کے داعیات ناگزیر ہیں۔ یقیناً ہمارا مقابلہ سخت اور بہت سے عوارض و جذبات میں بالکل نئے قسم کا ہے اور یہ بھی بالکل سچ ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے حریف کے وجود سے خبردار ہوئے اور میدان کارزار میں نکلے، ان کی مستعدی و ہوشیاری اور سعی و محنت کا پوری طرح اعتراف کرنا چاہیے، لیکن ان میں سے کوئی بات بھی اس کے لیے مستلزم نہیں کہ ناواقفیت کو مجتہد العصر اور لاعلمی و بے خبری کو صاحب الامر تسلیم کر لیا جائے اور بلا ضرورت دشمنوں کے مقابلے میں ایسا اسلحہ اٹھایا جائے جس کا پہلا وار خود اپنی ہی گردن پر پڑے۔

صحیح راہ عمل

جب ہم اصول و قواعد فن کے مطابق چل کر بعینہٖ وہی مقصد حاصل کر سکتے ہیں جو ان لوگوں کے پیش نظر ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ محض اپنے فہم و قیاس شخصی کا نام "درایت و احتجاج عقلی" رکھ کر ان علوم مسلّمۂ اسلامیہ کی تضعیف و تحقیر بل انکار و انہدام کے درپے ہو جائیں، جو خزائن امۃ کا راس المال، اشرف ترین مصادر علوم دینیہ، سرچشمۂ معارف و حقایق اسلامیہ، تاریخ صدر اول و سیرۃ حضرت ختم المرسلین ہے اور جس کے لیے خود صحابہ و تابعین، ائمہ مہتدین اور تمام سلف صالح، بل اجماع جمیع امۃ مرحومہ، من بدایۃ عہدہا الی زماننا ہٰذا، قولاً و فعلاً ہمارے سامنے موجود ہے۔ درحقیقت ایسا کرنا اصول متفقہ امت اور مصادر شریعت و علوم شرعیہ میں ایک سخت اختلال و انتشار پیدا کرنا ہے، جس کا نتیجہ مہلک اور جس کے عواقب فساد آلود ہیں۔

باب ۶۶

ایلاءؔ و تخییر

(۲)

اصل مبحث

یہاں تک تو صرف اس ٹکڑے کا جواب تھا جو جناب نے احادیث کے اعتماد و عدم اعتماد کی نسبت فرمایا تھا اور جو ضمناً اصول ردّ و دفاع منکرین اسلام کے متعلق ایک نہایت اہم اور وقت کی بحث تھی۔ اب آپ کے اصل سوال کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

ایلاء کی تشریح

آپ کے نوجوان دوست کے مسیحی معلم نے جس واقعے کو اپنی معاندانہ و ابلیسانہ تحریف و اضافہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ در اصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک کے اس واقعے سے تعلق رکھتا ہے جو کتب تفسیر و سیرۃ میں "واقعہ ایلاء و تخییر" کے نام سے مشہور ہے۔

"ایلاء" اصطلاح فقہ و حدیث میں شوہر اور بیوی کی اس علیحدگی کو کہتے ہیں جو بغیر طلاق کے عمل میں آئے اور جس کی صورت یہ ہے کہ شوہر غصّے کی حالت میں کوئی قسم کھا بیٹھے کہ میں اپنی بیوی کے پاس نہ جاؤں گا۔ اس کا ماخذ قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ ہے:

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ: ۲۲۶)

جو لوگ اپنی بیوں کے پاس جانے کی قسم کھا بیٹھیں، ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر اس عرصے میں رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا ارادہ کرلیں تو بھی اللہ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

نقطۂ اختلاف

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ایلاء کریں یعنی اپنی بیوی سے علیحدگی کی قسم کھا بیٹھیں، انھیں چار مہینے کے اندر ملاپ کرلینا چاہیے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ایلاء ساقط ہوجائے گا، البتہ قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر شوہر نے چار ماہ کے اندر رجوع نہ کیا تو محض ایلاء کی مدت کے اختتام سے طلاق پڑجائے گی یا نہیں؛ احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس صورت میں بھی طلاق نہیں پڑتی اور عورت مرد سے نہیں چھوٹتی۔ اگر مرد عورت کو بالکل معلق چھوڑ دینا چاہے گا تو اسے قید رکھا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ عورت کی طرف رجوع کرے یا طلاق دے کر فیصلہ کرے۔ مگر فقہائے حنفیہ کے نزدیک محض انقضائے مدت ہی عورت کے حق میں طلاق بائنہ ہے۔

رسول اللہ صلعم کا ایلاء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ایک مرتبہ ایلاء کی صورت پیش آئی۔ آپ نے عہد فرمایا تھا کہ ایک ماہ تک ازواج مطہرات سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔ واقعۂ ایلاء سے یہی واقعہ مقصود ہے اور یہی شان نزول ہے آیات سورۃ تحریم کا۔

یہ واقعہ بہ تفصیل صحاح ستہ میں موجود ہے اور رواۃ و اسانید سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کی مختلف حیثیتیں تھیں اور مختلف قسم کے احکام ان سے نکلتے تھے، اس لیے حضرت امام بخاری (رضی اللہ عنہ) نے اپنی عادت کے مطابق مختلف ابواب میں اسے درج کیا ہے اور مختلف احکام نکالے ہیں۔ ابواب نکاح و طلاق اور ایلاء میں تو اصلی حیثیت سے آیا ہے مگر کتاب التفسیر میں بہ ضمن سورۂ تحریم (آیا ہے)، کیونکہ اس کا شان نزول یہی واقعہ ہے۔

میں نے ان تمام ابواب کی احادیث پیش نظر رکھ لی ہیں نیز صحیح مسلم، بقیہ کتب صحاح، تفسیر امام طبری، ابن کثیر اور در منثور بھی سامنے ہیں۔ صحیحین کی شروح میں سے فتح الباری، عینی اور نووی شرح مسلم بھی پیش نظر ہیں۔ ان سب سے جو مشترک اور صحیح واقعہ ثابت ہوتا ہے پہلے اسے بیان کرتا ہوں، اس کے بعد آپ کے پیش کردہ واقعہ کی نسبت مع بعض اہم متعلقہ مباحث کے عرض کروں گا۔

رسول اللہ صلعم کی حیاۃ طیبہ

اگر کسی مدعی انسان کی زندگی کے حالات و واقعات اس کی صداقت و تقدیس کے لیے معیار ہو سکتے ہیں تو اس آسمان کے نیچے فی الحقیقت ایک ہی انسانی زندگی ہے جس کے سوانح و حالات میں سے ہر شے اس کی صداقت و ربانیت کے لیے معجزۂ قاہرہ و برہان قاطعہ ہے یعنی: محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

جس وجود اقدس کے ظہور نے دنیا کی بڑی بڑی شہنشاہیوں کو نابود کر دیا۔ جس کی ہیبت الٰہی اور سطوت ربانی کے آگے تاجداران عالم کے تخت الٹ گئے، جس کے غلاموں کے سامنے کسریٰ کا خزانہ آنے والا اور قیصر کا خراج پٹنے والا تھا، جو اپنی حیات طیبہ ہی کے اندر عرب و یمن کی شہنشاہی کو اپنے قدموں پر دیکھتا تھا اور فی الحقیقت جس کے لیے دنیا کے تمام خزانے اور طاقتیں وقف اور جس کی مرضی کے لیے رب السمٰوٰت والارض کی تمام پیدا کردہ قوتیں سر بہ سجود تھیں، بایں ہمہ اس نے خود اپنے لیے جو دنیوی زندگی اختیار کی تھی، اس کا حال یہ تھا کہ تمام عمر کبھی دونوں وقت شکم سیر ہو کر غذا تناول نہ فرمائی اور دو دو دن تک آپ کے حجرۂ فقر میں غذا کی طیاری کے نشانات یکسر معدوم و مفقود رہے، صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

اس بارے میں تصریحات سیرت و احادیث اس درجہ مشہور ہیں کہ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ مہمان آجاتے تھے اور آپ کا مطبخ کئی کئی وقتوں سے بالکل سرد ہوتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: مجھے یاد نہیں کہ کوئی دن آنحضرت صلعم پر ایسا گذرا ہو کہ صبح و شام، دونوں وقت سیر ہو کر غذا میسر آئی ہو۔

اسی روح الٰہی اور پیکر صفات ربانی کی غذا اس خاکدان ارضی پر نہ تھی، جس کی اسے آرزو اور جستجو ہوتی۔ اس کا سفرۂ لذائذ و نعائم وہاں بچھا تھا جہاں کے لیے جسم کی تشنگی آب زلال اور معدہ کی بھوک غذائے حیات ہے کہ،

ابیت عند ربی یطعمنی ویسقینی۔ (رواہ البخاری)   میں اپنے پروردگار کے ہاں شب باش ہوتا ہوں، جو مجھے کھلاتا ہے اور سیراب کرتا ہے۔

ابتدائی فتوحات اسلامیہ کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا تھا اور مال غنیمت اس کثرت اور افراط سے آتا تھا کہ اس کا صرف ایک حصہ پاکر عام مسلمان خوشحال و صاحب مال بن جاتے تھے مگر خود اس سلطان کونینؐ اور محبوب رب المشرقین کو ایک فقیر الحال زندگی کی بھی ضروریات و مایحتاج حاصل نہ تھیں۔

ازواج مطہرات

ان حالات کو صحابہؓ کرام دیکھتے تھے اور جوش محبت و جاں نثاری سے بے قرار ہو جاتے تھے۔ سب سے زیادہ اس کا اثر آپؐ کی ازواج مطہرات پر پڑتا تھا، جنھوں نے گو دنیوی جاہ وجلال پر اس محبوب رب العلمین کے حجرۂ فقر وفاقہ کو ترجیح دی تھی، تاہم وہ انسان تھیں انسانی خواہشیں اور ضرورتیں رکھتی تھیں، عیش و آرام کے ساز و سامان نہ سہی، لیکن ایک فقیر سے فقیر زندگی کے لیے بھی کچھ نہ کچھ سامان حیات و منزل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا خیال تو انھیں ضرور ہونا تھا۔ ان میں سے اکثر بی بیاں ایسی تھیں جو امارت و ریاست کے گھروں میں پرورش پا چکی تھیں اور ان کے ماں باپ امراء و رؤسائے وقت میں محسوب تھے۔ حضرت صفیہؓ خیبر کے امیر اعظم کی صاحبزادی تھیں، جو ایک طرح کا شاہی اقتدار رکھتا تھا۔ حضرت ام حبیبہؓ ابو سفیان کی صاحبزادی تھیں جو اپنے عہد میں (عملاً) جمہوریت حجاز کا پریسیڈنٹ تھا اور قریش کی پوری ریاست رکھتا تھا۔ اسی طرح حضرت جویریہؓ ایک بڑے قبیلے کے رئیس وقت کی بیٹی تھیں، جس کا نام غالباً (اس وقت ٹھیک یاد نہیں اور جو رئیس) بنو المصطلق تھا[1] حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ بھی ایسے گھروں میں پرورش پائی ہوئی تھیں، جنھوں نے گو اپنے مال و متاع کو راہ محبت الٰہی میں لٹا دیا ہو مگر صاحب مال وجاہ اور دارائے شوکت و احتشام ضرور تھے یعنی حضرت ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما۔

توسیع نفقہ کا مطالبہ

یہ تمام خواتین محترمہ آنحضرت صلعم کے گھر میں آئیں اور قدیمی شان و شکوہ دنیوی کو عظمت و سطوت روحانی کے آگے بھول گئیں۔ تاہم وہ بشر تھیں اور ضرورتیں رکھتی تھیں ہر بیوی کو دوسری بیوی کے مقابلے میں اقتضائے طبیعت نسائیہ سے اپنی حالت کی بہتری و رفعت کا بھی خیال ہوتا تھا۔ عام مسلمانوں اور صحابہ کو مال و متاع غنیمت سے آسودہ حال دیکھتی تھیں اور مال غنیمت میں اپنے لیے کچھ نہ پاتی تھیں۔ ان تمام حالات کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ انھیں اپنی تنگ دستی اور غربت و فقر کا احساس ہوتا اور جو شہنشاہ تمام دنیا کو

---

[1] اس کا نام حارث بن ضرار تھا اور وہ بنو المصطلق کا رئیس تھا۔

سب کچھ دے رہا تھا اس سے کچھ نہ کچھ اپنے لیے بھی مانگتیں۔ علی الخصوص جب کہ اس کی محبت و عشق کا ان میں سے ہر ایک کو ناز تھا اور جو کچھ اپنے لیے مانگنے والی تھیں وہ بھی در اصل اسی کے لیے طلب کرتا تھا۔

چنانچہ ازواج مطہرات کی طرف سے آپ پر توسیع نفقہ کے لیے تقاضے شروع ہوئے اور ایک مرتبہ تمام بی بیوں نے مل کر زور ڈالا کہ ہماری حالت اس فقر و غربت میں کیسے بسر ہو سکتی ہے؟ آپؐ کو سب کا خیال ہے مگر اپنے گھر کا خیال نہیں ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کا بھی کچھ سامان کیجیے۔

یہ مطالبہ اگرچہ تمام بی بیوں کی طرف سے تھا مگر دو بی بیوں نے خاص طور پر ایکا کر کے زور ڈالا تھا کہ ہماری معروضات پوری کی جائیں۔ چنانچہ انھیں کی نسبت سورۂ تحریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ۔ (تحریم: ۴)

اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے کیونکہ تمھارے دل مائل ہو چکے ہیں اور اگر رسول اللہ کے مقابلے میں ایکا کرو گے تو جان لو کہ خدا ان کا مددگار ہے جبریل اور نیک مسلمان بھی انھی کے ساتھ ہیں اور سب کے بعد ملائکہ الٰہی بھی انھی کے مددگار ہیں۔

اس آیت میں تثنیہ کا صیغہ "ان تتوبا" اور "قلوبکما" میں آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایکا کرنے والی دو بیویاں تھیں، لیکن نام کی تصریح نہیں۔ اس بارے میں اختلافات حدیث کا ذکر آگے آئے گا لیکن ارجح خبر یہی ہے کہ وہ دو بی بیاں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ تھیں جیسا کہ خود حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا۔

غرض ازواج مطہرات کا یہ مطالبہ غیر معمولی طور پر سخت ہوا اور آنحضرت صلعم کے سکون خاطر اور حیات فقر و استغنا پر بہت بار گزرا۔ ان کی زندگی روحانی استغراق اور اصلاح عالم و انسانیت کے مہمات مقاصد سے اس طرح لبریز تھی کہ اس میں فکر مال و اسباب دنیوی کو گنجایش نہیں مل سکتی تھی۔

تحرم ما احل اللہ کی شان نزول

اس اثنا میں ایک اور رنجیدہ واقعہ بھی پیش آیا جو گو بالکل علحدہ اور مستقل واقعہ ہے مگر اس کے امتزاج و خلط نے واقعۂ ایلاء میں پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں یعنی سورۂ تحریم کی ان ابتدائی آیات کا شان نزول:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۔ (تحریم: ۱، ۲)

اے پیغمبر! تم اپنی بیویوں کی خوشی کے لیے اس چیز کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کر دی ہے؟ اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔ بے شک اللہ نے تمھارے لیے یہ فرض کر دیا ہے کہ اپنی قسموں کو کھول دو۔ وہ تمھارا دوست ہے

اور سب باتوں کو جاننے والا اور ان کی حکمتوں پر نظر رکھنے والا ہے۔

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی بات اپنے اوپر حرام کر لی تھی جو اللہ کی طرف سے حلال تھی اور اس کے لیے کوئی قسم بھی کھائی تھی۔ نیز یہ کہ صرف ازواج کی خوشی کے لیے ایسا کیا تھا۔

اصل واقعہ

وہ کیا بات تھی؛ کس بات کے لیے قسم کھائی تھی؛ ازواج کی خوشی کو اس سے کیا تعلق تھا؛ ان سوالات کے جوابات احادیث سے ملتے ہیں اور اسی کے متعلق وہ بعض روایات کتب تفسیر وسیر میں درج ہوگئی ہیں جنھیں ایک مسخ و بدنما شکل میں اعدائے اسلام نے بیان کیا ہے اور جس کی نسبت آپ نے دریافت فرمایا ہے۔

تفصیلی بحث ان روایات مختلفہ پر آگے آئے گی۔ یہاں صرف اصلی اور محقق واقعے کو بیان کر دیتا ہوں۔ بخاری و مسلم کے ابواب نکاح و طلاق و تفسیر میں یہ واقعہ بالکل صاف اور غیر پیچیدہ موجود ہے۔

ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کا قاعدہ تھا، عصر کے بعد ازواج مطہرات کے ہاں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک بار آپؐ کئی دن تک حضرت زینبؓ کے ہاں معمول سے زیادہ بیٹھے۔ حضرت عائشہؓ نے اس کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ آپ کو شہد اور شیرینی بہت پسند ہے۔ حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آگیا ہے۔ وہ آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہیں اس کے تناول فرمانے میں معمول سے زیادہ دیر ہوجاتی ہے۔

رشک اور غیرت محبت جنس اناث کا وہ فطری جذبہ ہے جس کے آگے کسی جذبے کی نہیں چلتی۔ حضرت عائشہؓ کو یہ معلوم کر کے بہ اقتضائے ضعف بشریت رشک ہوا۔ وہ سمجھ گئیں کہ حضرت زینبؓ نے یہ تدبیر آنحضرت صلعم کو زیادہ عرصے تک ٹھہرانے کی نکالی ہے۔ پس کوئی نہ کوئی تدبیر اس کے توڑ کی بھی کرنی چاہیے۔

سب کا اتحاد

انھوں نے ایک تدبیر سوچی اور حضرت حفصہؓ بھی اس میں شریک ہوگئیں۔ قرار پایا کہ آنحضرت صلعم جب وہاں سے اٹھ کر ہمارے یہاں آئیں تو کہنا چاہیے کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے۔ مغافیر ایک قسم کا درخت ہوتا ہے جس کے پھولوں سے عرب کی مکھیاں رس چوس کر شہد جمع کرتی ہیں۔ اس کا پھل لوگ کھاتے بھی ہیں مگر اس کی بو اچھی نہیں ہوتی۔

اس کے بعد اس تدبیر کی اور بی بیوں کو بھی خبر دے دی گئی اور وہ بھی اس میں شریک ہوگئیں۔

چنانچہ آنحضرت صلعم حسب معمول جب حضرت حفصہؓ کے ہاں تشریف لائے تو انھوں نے کہا، کیا آپ نے مغافیر کھایا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، نہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ آپ کے منہ سے تو مغافیر کی بو آرہی ہے اور بی بیوں نے بھی مغافیر کی بو کا آنا ظاہر کیا۔ یہ دیکھ کر آپ نے قسم کھائی کہ آیندہ شہد نہ کھاؤں گا۔ شہد ایک حلال غذا تھی اور اس کے نہ کھانے کی قسم کھانا ایک حلال شے کو اپنے اوپر حرام کر لینا تھا۔ پس سورۂ تحریم کی آیت نازل ہوئی کہ "لم تحریم ما احل اللہ لک؟"

آپ اس شے کو کیوں اپنے اوپر حرام کرتے ہیں، جو خدا نے آپ کے لیے حلال کر دی ہے!

حضرت عائشہ کی روایت یہ واقعہ خود حضرت عائشہؓ کی روایت سے امام بخاری نے کتاب الطلاق اور کتاب التفسیر (سورۂ تحریم) میں درج کیا ہے:

قالت (عائشہؓ): کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یشرب عسلا عند زینب ابنۃ جحش و یمکث عندھا فواطأت انا و حفصۃ عن ایتنا دخل علیھا فلتقل اکلت مغافیر؟ انی اجد ریح مغافیر۔ قال لا و لکنی کنت اشرب عسلاً عند زینب ابنۃ جحش فلن اعود لہ وقد حلفت و لاتخبری بذالک احدا[1]

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زینبؓ بنت جحش کے یہاں شہد نوش فرماتے اور دیر تک ٹھہرتے۔ اس پر میں نے اور حفصہؓ نے یہ قرارداد کی کہ جب آنحضرتؐ ہم میں سے کسی کے یہاں اٹھکر آئیں تو کہیں کہ کیا آپ نے مغافیر کھایا ہے؟ اس کی بُو آپ کے منہ سے آرہی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آنحضرت صلعم نے یہ سن کر فرمایا کہ مغافیر تو میں نے نہیں کھایا، البتہ زینب کے ہاں شہد کھایا ہے۔ اب میں قسم کھاتا ہوں کہ آیندہ کبھی نہ کھاؤں گا، مگر تم اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔

زیادہ مفصل روایت لیکن بخاری کے باب الطلاق میں" ہشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشہؓ " کی روایت سے ایک دوسری حدیث بھی موجود ہے جو اس سے زیادہ مفصل اور بعض جزئیات میں مختلف ہے مثلاً حضرت زینبؓ کی جگہ شہد کا کھانا خود حضرت حفصہؓ کے ہاں بیان کیا ہے اور حضرت سودہؓ کی نسبت کہا ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے مغافیر کی بُو کی نسبت کہا تھا۔ روایت بالا میں صرف حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کا ذکر ہے لیکن اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اور بی بیوں کو بھی اس کی خبر دے دی گئی تھی اور آنحضرت صلعم اس دن جس کے ہاں تشریف لے گئے اس نے یہی بات کہی کہ مغافیر کی بُو آتی ہے۔ ایسا ہونا ورایۃً بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اکثر بی بیوں نے مل کر فرداً فرداً کہا ہوگا، جبھی تو آپ نے قسم کھالی۔ ورنہ صرف ایک بی بی کے کہنے سے قسم کھا لینا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے بعض ضروری جزئیات اس روایت سے بھی لے لی ہیں اور سب کا مشترک ماحصل بیان کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس اختلاف پر نہایت عمدہ بحث کی ہے اور وجوہ تطبیق بیان کر دیے ہیں۔ خوف طوالت سے ہم نقل نہیں کر سکتے (دیکھو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۳۲۹ مطبوعہ مصر)

واقعہ واذا اسر النبی اس اثنا میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض ازواج سے

---

[1] بعض روایتوں میں لفظی اختلافات ہیں لیکن ان سے معنی پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

کوئی راز کی بات فرمائی اور تاکید کر دی کہ اس کا ذکر اور کسی سے نہ کرنا، لیکن ان سے ضبط نہ ہو سکا اور ایک دوسری بیوی سے ذکر کر دیا۔ اسی کے متعلق سورۂ تحریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ (تحریم، ۳)

اور جب پیغمبر نے اپنی بعض بیویوں سے ایک راز کی بات کہی اور اس نے فاش کر دی اور خدا نے پیغمبر کو اس کی خبر دے دی تو انھوں نے اس میں سے کچھ حصہ بیان کیا اور کچھ چھوڑ دیا۔ یہ سن کر اس بیوی نے پوچھا کہ آپ کو کس نے اس کی خبر دی؟ فرمایا کہ اس خدا نے جس کے علم اور خبرۃ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔

بخاری و مسلم کی تمام روایات کے جمع کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ "بعض ازواجہ" سے یہاں مقصود حضرت حفصہؓ ہیں۔ انھیں نے حضرت عائشہؓ سے راز کہہ دیا تھا۔ اس میں بعض جزئی اختلاف بھی ہیں جن پر حافظ ابن حجر نے مفصل بحث کی ہے، لیکن محقق و ارجح یہی ہے کہ حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ ہی سے اس کا تعلق ہے۔ جن حضرات کو یہ بحث تفصیل سے دیکھنا ہو وہ فتح الباری (جلد ۹ شرح کتاب الطلاق، صفحہ ۲۹۹) کو ملاحظہ فرمائیں۔ ہم اختصار کے لیے مجبور ہیں۔ البتہ اس واقعے کے بعض اہم متعلقات و مباحث آگے آئیں گے۔

سی روزہ علحدگی غرض توسیع نفقہ کے لیے تمام ازواج نے متفق ہو کر اصرار کرنا شروع کیا۔ آنحضرت (صلعم) کے استغراق روحانی پر یہ دنیا طلبی اس قدر شاق گزری کہ آپ نے عہد کر لیا: ایک ماہ تک تمام بیویوں سے تعلق نہ رکھوں گا۔

جب کچھ زمانہ اس علحدگی پر گزر گیا تو صحابہ کرامؓ کو سخت تشویش ہوئی۔ ان میں سے اکثر کو خیال ہوا کہ عجب نہیں آپ نے تمام ازواج کو طلاق دے دی ہو مگر ہیبت نبوت و سطوت رسالت اجازت نہیں دیتی تھی کہ اس بارے میں آپ سے سوال کیا جائے، حتیٰ کہ خواص صحابہ و مقربین بارگاہ رسالت بھی دم بخود اور خاموش تھے۔

سوء اتفاق یہ کہ اسی زمانے میں آپ گھوڑے سے گر پڑے اور ساق مبارک پر زخم آ گیا۔ اس کی تکلیف چلنے پھرنے سے مانع تھی، اس لیے کئی روز تک آپ بالاخانے سے اتر کر مسجد میں بھی تشریف نہ لا سکے۔ صحابہ دریافت حال کو آئے تو وہیں بیٹھ کر نماز پڑھائی۔

جب ایک مہینے کے قریب مدت اسی حالت میں گزر گئی تو صحابہ کی تشویش اور زیادہ بڑھ گئی اور ان حالات کو دیکھ کر اکثر کو یقین ہو گیا کہ آپ نے طلاق دے دی ہے اور اب ازواج مطہرات سے نہیں ملیں گے۔

حدیث عمر فاروقؓ یہ حالت کیونکر ختم ہوئی؟ کس کی جرأت محبت و نیاز نے اس تشویش کا خاتمہ کیا؟ اور کیونکر آیت

تخییر نازل ہوئی؟ ان تمام سوالوں کا مفصل جواب اس مشرح و مطول روایت میں ہے جو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں منقول ہے۔ یہ روایت صحیح بخاری میں مختلف طریقوں سے مروی ہے اور مختلف ابواب میں اس سے استخراج نتائج و معارف کیا گیا ہے۔ امام مسلم نے بھی چار مختلف طریقوں سے کتاب الطلاق میں درج کی ہے۔ بالاتفاق اس کے راوی اوّل حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ ہیں اور ان سے عبید بن حنین، سماک ابی زمیل اور عبید اللہ بن ابی ثور وغیرہ نے روایت کی ہے، ان روایات میں ایک متفق علیہ روایت عبیدؒ بن حنین کی ہے جو حضرت عباسؓ کے غلام تھے۔

اس واقعے کو امام بخاری نے کتاب العلم میں عبید اللہ بن ابی ثور کی روایت سے بھی درج کیا ہے۔ وہ جزئیات بیان میں زیادہ مشرح و مفصل ہے۔ علی الخصوص حضرت عمرؓ اور آنحضرت صلعم کا مکالمہ زیادہ تفصیل سے اس میں بیان کیا گیا ہے۔ امام مسلم کی روایات میں بھی بعض زیادہ تفصیلات ہیں۔ ہم بہ خوف طوالت کتاب العلم والی روایت کو نہیں نقل کر سکتے مگر ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر ان کا مشترک اور مربوط و مرتب خلاصہ باحتیاط درج کرتے ہیں۔ بہ نسبت ایک ہی روایت کے ترجمہ کر دینے کے یہ زیادہ مفید ہوگا۔ علاوہ اصل واقعے کے اس روایت سے آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ، فقر و استغنا، عورتوں کے حقوق، اسلام کی حمایت، زنان عرب کی حالت میں انقلاب، صحابہ کا عشق رسول۔ حضرت عمرؓ کے مدارج علیہ اور راہ محبت رسولؐ میں بے خودانہ سرشاری اور اسی طرح کے بے شمار امور و مسائل پر جو ضمنی روشنی پڑتی ہے، اس کے لحاظ سے بھی اس کا مفصل و جامع خلاصہ درج کرنا بہت ضروری تھا۔

مفصل اور جامع خلاصہ مطالب

حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں سال بھر تک ارادہ کرتا رہا کہ حضرت عمرؓ سے قرآن کریم کی ایک آیت کی نسبت پوچھوں، لیکن ان کی ہیبت و رعب سے میری ہمت پست ہو جاتی تھی اور پوچھنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت عمرؓ حج کے لیے نکلے اور میں بھی ان کے ہمراہ روانہ ہوا۔ جب حج سے فارغ ہو کر ہم لوگ واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک اچھا موقع گفتگو کا ہاتھ آ گیا اور میں نے اس مہلت کو غنیمت سمجھ کر اپنے قدیمی ارادے کو پورا کرنا چاہا۔ میں نے عرض کیا کہ امیرالمومنین! آنحضرت (صلعم) کی وہ کون دو بی بیاں تھیں جنھوں نے اپنے مطالبات کے لیے ایکا کر کے آنحضرت (صلعم) پر زور ڈالا تھا اور جس کا ذکر خدا تعالیٰ نے "وان تظاھرا علیہ" میں کیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "عائشہؓ اور حفصہؓ"۔ اس پر میں نے کہا کہ واللہ، میں ایک سال سے ارادہ کر رہا تھا کہ اس بارے میں آپ سے پوچھوں، مگر آپ کے رعب سے میری زبان نہیں کھلتی تھی۔

حضرت عمرؓ کا بیان

حضرت عمرؓ نے کہا "اس کا کچھ خیال نہ کرو جو بات مجھے معلوم ہے، میں بیان کرنے کے لیے موجود ہوں۔"

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اس واقعے پر ایک مفصل و مشرح تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ "ایام جاہلیت میں ہم لوگوں کا

عورتوں کے ساتھ یہ سلوک تھا کہ کسی طرح کے حقوق انھیں حاصل نہ تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ عورتیں کوئی چیز نہیں، لیکن جب اسلام آیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق کے متعلق آیات نازل کیں اور ان کا حق ہم پر قرار پایا، تو ہماری عورتوں کی حالت بالکل بدل گئی اور اپنا حق مانگنے میں وہ نہایت جری ہو گئیں۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ کسی بات پر حسب عادت قدیم میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا اور باہم تکرار سی ہو گئی۔ اس نے الٹ کر ویسا ہی جواب دیا اور سختی سے بات کی۔ میں نے کہا تمھیں کیا ہو گیا ہے، میری بات کا اس طرح جواب دیتی ہو؟ وہ بولی کہ سبحان اللہ! تم کیا ہو کہ تمھیں جواب نہ دوں؟ تمھاری بیٹی حفصہؓ تو خود رسول اللہ صلعم کو برابر کا جواب دیتی ہے۔ حتیٰ کہ دن دن بھر ان سے روٹھی رہتی ہے۔

حضرت حفصہؓ سے گفتگو

یہ سن کر میں نے اپنے دل میں کہا، یہ تو عجیب بات ہوئی۔ فوراً اٹھ کر حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی اور آنحضرت صلعم کی زوجہ مطہرہ) کے پاس پہنچا اور پوچھا کہ بیٹی! کیا یہ سچ ہے کہ تم آنحضرت صلعم سے سوال جواب کرتی ہو اور دن دن بھر روٹھی رہتی ہو؟ اور کیا اور بی بیاں بھی ایسا ہی کرتی ہیں؟ حفصہؓ نے کہا کہ ہاں بے شک ہم ایسا کرتے ہیں۔ مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے کہا، تجھے اللہ کی سزا اور اس کے رسولؐ کے غضب سے ڈرنا چاہیے۔ رسول اللہؐ کی ناراضی عین خدا کی ناراضی ہے۔ یہ کیا ہے جو تم اس طرح انھیں ناراض کرتی ہو؟ تمھیں حضرت عائشہؓ کی کوئی نظیر دیکھ کر بھول نہ جانا چاہیے جس سے آنحضرت صلعم بہت محبّت فرماتے ہیں۔ واللہ اگر انھیں میرا خیال نہ ہوتا تو وہ تمھیں طلاق دے چکے ہوتے۔ جو کچھ مانگنا ہو مجھ سے مانگ۔ آنحضرتؐ کو کیوں تکلیف دیتی ہے؟

حضرت ام سلمہؓ کا جواب

اس کے بعد میں ام سلمہؓ (آنحضرتؐ کی دوسری زوجہ مطہرہ) کے ہاں آیا کیونکہ قرابت کی وجہ سے مجھے زیادہ موقع دریافت حال اور ملاقات کا حاصل تھا۔ میں نے ان سے بھی وہ تمام باتیں کہیں، جو اپنی بیٹی سے کہی تھیں لیکن انھوں نے سنتے ہی جواب دیا کہ اے ابن خطاب! تمھاری حالت تو بڑی عجیب ہے۔ تم ہر معاملے میں دخیل ہو گئے اور اب یہ نوبت آ گئی کہ رسول اللہ صلعم اور ان کی بی بیوں کے معاملے میں بھی دخل دینے لگے ہو۔ انھوں نے یہ بات اس زور سے کہی کہ مجھ سے کوئی جواب نہ دیا گیا اور میں خاموش اٹھ کر چلا آیا۔

ایک انصاری کی اطلاع

اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ میرے ہمسایے میں ایک انصاری رہتا تھا۔ ہم اور وہ، دونوں باری باری ایک دن درمیان دے کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو اپنی حاضریوں کے حالات سنا دیا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ مدینہ میں دشمنوں کے حملوں کی ہر وقت توقع کی جاتی تھی اور خود مجھے ملوک غسان میں سے ایک بادشاہ کی طرف کھٹکا تھا کہ وہ حملہ کرنے والا ہے۔

ایک دن رات کو میرے انصاری ہمسایے نے بالکل ناوقت دروازے پر دستک دی اور پکارا کہ دروازہ کھولو! دروازہ کھولو! میں گھبرایا ہوا گیا اور پوچھا خیر ہے، کیا غسانی مدینہ پر چڑھ آئے؟ اس نے کہا کہ نہیں، مگر اس سے بھی بڑھ کر

حادثہ ہوا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی۔

بارگاہ نبوی میں حاضری

میں نے کہا کہ یہ سب کچھ حفصہؓ و عائشہؓ ہی کی ان باتوں سے ہوا ہوگا جو وہ آنحضرتؐ کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ میں نے کپڑے پہنے اور سیدھا مدینہ پہنچا۔ آنحضرت صلعم نماز صبح کے بعد بالاخانے پر تشریف لے گئے۔ مسجد میں لوگ بیٹھے تھے اور غمگین تھے۔ مجھ سے صبر نہ ہوا۔ بالاخانے کے نیچے آیا اور آنحضرت کے حبشی غلام سے کہا کہ میری اطلاع دو، مگر باریابی کی اجازت نہ آئی۔ کچھ وقفے کے بعد دوبارہ آیا اور غلام سے کہا کہ میری حاضری کے لیے اجازت طلب کرو۔ جب کچھ جواب نہ آیا تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ بے اختیارانہ پکار اٹھا کہ شاید رسول اللہ خیال فرماتے ہیں کہ میں اپنی بیٹی حفصہؓ کی سفارش کرنے آیا ہوں خدا کی قسم! میں تو صرف رسول اللہ کی رضا کا بندہ ہوں اگر وہ حکم دیں تو خود اپنے ہاتھ سے حفصہؓ کی گردن اڑا دوں۔

قیصر و کسریٰ اور حضور انور صلعم

غرض اس بار اذن مل گیا اور میں بالاخانے کے اوپر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سرور کائنات ایک کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور آپ کے جسم اقدس پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں۔ گھر کے ساز و سامان کا یہ حال ہے کہ ایک طرف مٹھی بھر جو کے دانے پڑے ہیں۔ ایک کونے میں کسی جانور کی کھال رکھی ہے۔ دوسری کھال ایک طرف لٹک رہی ہے۔

یہ حالت دیکھ کر میرا دل بے قابو ہو گیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عمرؓ! تم روتے کیوں ہو؟ عرض کی کہ رونے کی اس سے زیادہ بات کیا ہوگی؟ آج قیصر و کسریٰ عیش و راحت کے مزے لوٹ رہے ہیں، حالانکہ خدا کی بندگی سے غافل ہیں مگر آپ سرور دوجہاں ہو کر اس حالت میں ہیں کہ گھر میں ایک چیز بھی آرام کی میسر نہیں اور کھری چارپائی کے نشان جسم مبارک پر نمایاں ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں ٹھیک ہے، لیکن کیا تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہمیں آخرت نصیب ہو؟

ازواج کے متعلق گزارش

میں نے پوچھا کہ کیا حضورؐ نے ازواج کو طلاق دے دی؟ فرمایا، "نہیں"۔ یہ سنتے ہی میں اس قدر خوش ہوا کہ میری زبان سے اللہ اکبر کا نعرہ نکل گیا۔ پھر میں نے آپ کی تفریح خاطر کے لیے عرض کیا کہ ہم قریش کے لوگ عورتوں پر غالب تھے، لیکن یہاں آکر دیکھا کہ رنگ دوسرا ہے۔ اس پر آپ متبسم ہوئے، پھر میں نے اپنی وہ سرگزشت عرض کی جو حفصہؓ اور ام سلمہؓ کے ساتھ پیش آئی تھی۔ اس پر آپ دوبارہ متبسم ہوئے۔ آخر میں نے عرض کی کہ مسجد میں لوگ مغموم بیٹھے ہیں۔ اجازت ملے تو انھیں بھی جا کر خبر دے دوں کہ طلاق کا خیال غلط ہے۔

اس کے بعد آپ حضرت عائشہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ انھوں نے عرض کیا کہ آپ نے ایک مہینے تک ایلاء کرنے کا عہد کیا تھا۔ ابھی اس میں ایک دن باقی ہے۔ آپ نے کہا کہ انتیس دن کا بھی مہینا ہوتا ہے ۔۔۔۔

بعض نتائج و بصائر

اس حدیث طویل کے نقل کرنے سے مقصود اصل واقعہ ایلاء و تخییر کے متعلق معلومات صحیحہ کا حصول تھا لیکن ضمناً بعض امور و مسائل پر اس سے روشنی پڑتی ہے، نہایت مختصر لفظوں میں ان کی طرف اشارہ کروں گا۔

شارحین بخاری نے اس حدیث سے بے شمار باتیں پیدا کی ہیں۔ خود امام بخاری نے تحصیل علم، تحقیق و سوال، احکام نکاح، احکام طلاق، نصیحت والدین وغیرہ متعدد مسائل میں اسی ایک روایت سے حسب عادت تبویب کی ہے:

۱۔ اسلام سے قبل عورتوں کی کیا حالت تھی اور اسلام نے کس طرح اس میں انقلاب پیدا کر دیا؟ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم اسلام سے پہلے عورتوں کا کوئی حق اپنے اوپر نہیں سمجھتے تھے۔ اسلام نے جب ان کے حقوق گنوائے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑا۔

۲۔ حضرت ابن عباسؓ کے اس شوق تحقیق و تلاش علو اسناد کو دیکھیے کہ صرف ایک آیت کے متعلق تحقیق کرنے کے لیے کامل سال بھر تک کوشش کرتے رہے۔ اس سے فن تفسیر کے متعلق بھی ان کی جدوجہد کا حال معلوم ہوتا تھا جب ایک آیت کی شان نزول کے لیے یہ حال تھا تو پورے قرآن کریم کے معارف کو کس سعی و جہد سے حاصل کیا ہوگا!

۳۔ اللہ اکبر! یہ کیا چیز تھی کہ خلفائے راشدین رہتے تو تھے اس مساوات اور فقر و زہد کے ساتھ کہ کوئی تمیز اعلیٰ و ادنیٰ کی نہ تھی مگر پھر بھی ہیبت و صولت ربانی کا یہ حال تھا کہ عمر فاروقؓ کے آگے خود صحابہؓ کی زبانیں نہیں کھلتی تھیں۔ ولنعم ما قیل:

ہیبت حق است، ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

سرور کائنات کی حیات مقدسہ

۴۔ حضرت سرور کائنات کی اس حیات مقدسہ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، جو ایک طرف تو دو جہاں کی پادشاہت اپنے سامنے دیکھتی تھی، دوسری طرف چارپائی پر بچھانے کے لیے ایک کمبل بھی پاس نہ تھا:

مقام اس برزخ کبریٰ میں تھا صرف مشدد کا

۵۔ صحابہؓ کی محبت اور جاں نثاری کہ شمع رسالت پر پروانہ صفت نثار تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اپنے ہاتھ سے اپنی بیٹی کا سر قلم کر دوں گا۔ ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہیے کہ کیا حال ہے؟

۶۔ حضرت عمرؓ کی جلالت مرتبت اس سے واضح ہوتی ہے، نیز وہ تقرب جو دربار رسالت میں انھیں حاصل تھا۔ حضرت ام سلمہؓ نے جھنجھلا کر کہا کہ تم سب باتوں میں دخیل ہو گئے۔ اب آنحضرتؐ کے گھر کے معاملے میں بھی دخل دینے لگے ہو؟ جب آپ نے یہ واقعہ بیان کیا تو آنحضرتؐ متبسم ہوئے۔

۷۔ اس سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ باپ کا اپنی بیٹی کے مکان میں بلا اجازتِ شوہر جانا درست ہے۔ حضرت عمرؓ حضرت حفصہؓ کے ہاں بلا اذن آنحضرت صلعم کے تشریف لے گئے۔

مدینہ منورہ کی حالت ایک بڑا اہم نکتہ یہ حل ہوتا ہے کہ اس وقت مدینہ کس طرح دشمنوں کے نرغے میں تھا اور ہر وقت حملوں کا خوف تھا۔ حتیٰ کہ جب انصاری ہمسایہ نے کہا کہ دروازہ کھولو تو حضرت عمرؓ بول اٹھے کہ کیا دشمن مدینے پر چڑھ آئے ہیں؟ پھر جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے قیام مدینہ کے زمانے میں خود حملے کیے، ان کا یہ کہنا کس قدر غلط اور خلاف واقعہ ہے۔

۸۔ آنحضرت صلعم کی منزلی زندگی کی شفقت و نرمی، تحمل و درگزر، رفق و لینت اور بیویوں کے ساتھ صبر و برداشت کا سلوک۔ اس سے جہاں اس خلق عظیم کی زندگی سامنے آتی ہے، وہاں ان کا اسوۂ حسنہ ہم سے مطالبہ بھی کرتا ہے کہ اپنی بیویوں سے محبت و نرمی کریں اور ہمیشہ شفقت و سلوک اور درگزر و رفق سے پیش آئیں کہ یہ آبگینہ بہت ہی نازک ہے۔

باب ۴

ایلاء و تخییر

—(۳)—

کشفِ حقیقت

آیتِ تخییر غرض اس کے بعد سورۂ احزاب کی آیت تخییر نازل ہوئی؛

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ـ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (احزاب : ۲۷-۲۸)

اے پیغمبر! اپنی بیوں کو کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو صاف صاف کہہ دو۔ میں تمھیں اچھے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ، اس کے رسول اور آخرت کی طالب ہو تو پھر اسی کی ہو رہو۔ اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والی عورتوں کے لیے بہت ہی بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

دو راستے ازواج مطہرات کے متعلق یہ آخری اور الٰہی فیصلہ تھا چونکہ توسیع نفقہ اور طلب اسباب آرام و راحت کے لیے انھوں نے آنحضرت صلعم پر زور ڈالا تھا اور اس مطالبے میں تمام بیویاں متفق ہو گئی تھیں، حتّٰی کہ آنحضرت صلعم نے ایلاء کر کے ایک ماہ کے لیے ان سے کنارہ کشی کر لی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ایک مرتبہ ہمیشہ کے لیے اس کا فیصلہ ہو جائے اور دونوں راستے ان کے آگے پیش کر دیے جائیں۔ یا تو اللہ اور اس کے رسول صلعم کی راہ میں آرام و راحت دنیوی کو بالکل خیر باد کہیں یا دنیا کے نعائم و لذائذ کے لیے اللہ کے رسول کی رفاقت ترک کر دیں۔

چنانچہ اس آیت میں فرمایا کہ دنیا اور آخرت، دونوں تمھارے سامنے ہیں۔ اگر دنیا کی طلب ہے تو صاف صاف کہہ دو۔ تمھیں رخصت کے عمدہ جوڑے پہنا کر اپنے گھر سے بہ عزت و احترام رخصت کر دوں، لیکن اگر خدا اور اس کے رسولؐ کی معیت چاہتی ہو تو ان زخارف دنیوی کی خواہشوں کو یک قلم جواب دے دو، کیونکہ ایسا کرنے والوں کے لیے خدا کے ہاں بڑا ہی اجر اور ثواب ہے۔

مصالح و حکمِ تخییر

اس حکم کے نزول میں فی الحقیقت بہت سی عظیم الشان مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ یہ ازواجِ مطہرات کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔ دنیا کو دکھلانا تھا کہ جن لوگوں کو خدا کے رسول صلعم نے اپنی زندگی میں شریک کیا ہے، ان کے تزکیۂ باطنی اور خدا پرستی کا کیا حال ہے؟ اگر اس طرح کے واقعات پیش نہ آتے تو ازواجِ مطہرات کا تزکیۂ نفس اور ان کے دلوں کی محبتِ الٰہی کیونکر دنیا کے سامنے واضح ہوتی؟

چونکہ توسیعِ نفقہ کی خواہش میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا، اس لیے آنحضرت صلعم سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے ہاں تشریف لائے اور اس آیت کے حکم سے مطلع کیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اس معاملے میں جلدی نہ کرو۔ بہتر ہوگا کہ اپنے والدین سے بھی مشورہ کرلو۔ حضرت عائشہؓ بے اختیار بول اٹھیں کہ بھلا اس میں مشورہ کرنے کی کیا بات ہے؟ جب خدا نے دو راہیں میرے سامنے واضح کر دی ہیں تو اس کا جواب ہر حال میں صرف ایک ہی ہے۔ دنیا اور دنیا کی نعمتیں آپ کی رفاقت کے سامنے کیا شے ہیں؟ میں سب کچھ چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی معیت اختیار کرتی ہوں۔ اس کے بعد اور تمام بیویوں سے آپؐ نے پوچھا اور سب نے یہی جواب دیا۔

خود حضرت عائشہؓ کی روایت سے صحیحین میں مروی ہے، مسلم عن مسروق عن عائشہ، قالت: خیّرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخترنا اللہ و رسولہ فلم یعد ذلک علینا شیئاً۔ (بخاری کتاب الطلاق، باب من خیر نسائہ)

حضرت عائشہؓ کا مفصّل بیان

صحاح کی دوسری روایتوں میں حضرت عائشہؓ کا بیان زیادہ تفصیل سے منقول ہے، ہم نے واقعہ بیان کرتے ہوئے انھیں بھی پیشِ نظر رکھ لیا ہے۔

مثلاً امام مسلم و نسائی نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے جو روایت اس بارے میں نقل کی ہے اس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

فبدأ بی رسول اللہ (صلعم) فقال انی ذاکر لک امراً فلا علیک ان لا تعجل حتی تستامری ابویک قالت وقد علم ان ابوی لا یامرانی بفراقہ۔ ثم قال ان اللہ قال "یا ایہا النبی قل لازواجک الخ" فقلت لہ ففی ای ھذا استامر ابوی؟ فانی ارید اللہ و رسولہ والدار الآخرۃ۔

(صحیح نسائی کتاب النکاح صفحہ ۱۵۰۔ مطبوعہ دہلی)

پس آنحضرت نے مجھ سے گفتگو کی اور فرمایا کہ میں تجھ سے ایک امر اہم کا ذکر کرتا ہوں لیکن کوئی مضائقہ نہیں اگر اس کا جواب دینے میں جلدی نہ کریں اور اپنے والدین سے بھی رائے پوچھ لیں آنحضرت صلعم کو علم تھا کہ میرے والدین کبھی ان سے علٰحدگی کی رائے نہ دیں گے۔ بہرحال اس کے بعد آیتِ تخییر آپ نے پڑھی اور دنیا و آخرت کی دونوں راہیں پیش کر دیں۔ میں نے عرض کیا، کیا یہی بات تھی جس کے لیے حضور فرماتے تھے کہ اپنے والدین سے بھی پوچھ لو؟ بھلا اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے اس کا جواب تو صرف یہی ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول کا ساتھ دیتی ہوں اور دنیا کی جگہ آخرت کو لیتی ہوں۔

بصیرت کا ایک نکتہ یہ حکم اگرچہ صرف ازواج مطہرات کے متعلق تھا مگر دراصل اس میں اس راہ کے لیے ایک عام بصیرت بھی پوشیدہ ہے۔ اس واقعے کے ضمن میں خدا تعالیٰ نے ظاہر کیا ہے کہ دو چیزیں ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتیں جو دل خدا اور اس کے رسول صلعم کی محبت اور مرضات کے طالب ہوں، انھیں چاہیے کہ پہلی ہی نظر میں دنیا اور اہل دنیا کی طرف سے دست بردار ہو جائیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک طرف تو خدا کی محبت کا بھی دعویٰ ہو، دوسری طرف زخارف دنیوی کے پیچھے بھی سرگرداں رہیں۔ و للہ در ما قال،

سرمد گلہ اختصار مے باید کرد
یک کار ازیں دو کار مے باید کرد
یا تن بہ رضائے دوست مے باید کرد
یا قطع نظر ز یار مے باید کرد

حق و صداقت کی محبت ہی میں خدا اور اس کے رسول صلعم کی محبت پوشیدہ ہے۔ اس راہ میں جتنی کشمکشیں پیدا ہوتی ہیں اور جس قدر ٹھوکریں لگتی ہیں، وہ صرف اسی بات کا نتیجہ ہیں کہ راہروؤں نے دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنے کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا اور بغیر اس کے کہ ایک کے ہو رہنے کا فیصلہ کر کے قدم اٹھائیں، ویسے ہی جوش میں آ کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

ماریہ قبطیہ اور روایات موضوعہ یہاں تک تو ہم نے ایلاء و تخییر کا اصل واقعہ بیان کر دیا جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اب ہم ان روایات کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جن کی آمیزش سے اس صاف واقعے کو مکدر و مشتبہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جس کی ایک محرف و مسخ شدہ صورت آپ کے مسیحی معلم نے پیش کی ہے۔

ان تمام روایات سے صحاح ستہ خالی ہیں۔ البتہ ابن سعد، ابن مردویہ، واقدی، ابن جریر طبری، طبرانی، بزاز، ہیثم بن حلیب وغیرہ نے درج کیا ہے اور ان سے عام مفسرین و ارباب سیرت نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے۔

ان روایات کا تعلق واقعہ تحریم سے ہے۔ اگر انھیں تسلیم بھی کر لیا جائے، جب بھی واقعۂ ایلاء پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ "لم تحرم ما احل اللہ" کا شان نزول یہ واقعہ نہ تھا کہ آنحضرت صلعم نے شہد کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، بلکہ ماریہ قبطیہ سے اس کا تعلق ہے اور آپ نے ازواج کی خاطر اسے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

ہم ان روایات کے لیے امام طبری کی تفسیر کو سامنے رکھ لینا کافی سمجھتے ہیں کیونکہ انھوں نے سورۂ تحریم کی تفسیر میں حسب عادت تمام روایتوں کو جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

اختلف أهل العلم فی الحلال الذی کان الله احله لرسوله فحرمه علی نفسه ابتغاء مرضاة ازواجه ، فقال بعضهم ، کان ذٰلک ماریة مملوکة القبطیه حرمها علی نفسه بیمین انہٗ لا یقربھا طلبا بذالك رضا حفصه زوجته۔
(تفسیر طبری جلد ۲۸ صفحہ ۱۰۰)

اہل علم نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کون سی بات ہے جو خدا نے اپنے رسول کے لیے حلال کی تھی اور انھوں نے اپنی بیویوں کی خوشی کے لیے اپنے اوپر حرام کرلی ؛ ان میں سے بعض کا یہ بیان ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ لونڈی تھی اسے آپ نے اپنے لیے حرام کر لیا تھا۔ ایک قسم کھاکر کہ کبھی اس کے پاس نہ جاؤں گا اور ایسا حفصہؓ بنت عمرؓ کی خوشی کے لیے کیا تھا۔ جو آپ کی زوجہ مطہرہ تھیں۔

لیکن امام موصوف نے جن "بعض اہل علم" کی یہ رائے نقل کی ہے، اکثر ائمہ حدیث مثل امام بخاری و مسلم بل جمیع مصنفین کتب صحاح کے مقابلے میں ان کی کیا وقعت ہوسکتی ہے، جنھوں نے سرے سے اس واقعہ کو نقل ہی نہیں کیا؛

طبری کا بیان

بہرحال اس کے بعد امام موصوف نے وہ تمام روایتیں جمع کر دی ہیں جو اس بارے میں ان تک پہنچی ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت (صلعم) کی لونڈی تھیں۔ ایک دن حضرت حفصہؓ آئیں تو انھوں نے دیکھا کہ انھی کے مکان میں آنحضرت (صلعم) ماریہ کے ساتھ خلوت میں ہیں۔ آپ اس پر آزردہ خاطر ہوئیں اور کہا کہ میرے ہی مکان میں اور میری باری کے دن آپ نے ایسا کیا! آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ آیندہ کے لیے قسم کھاتا ہوں کہ ماریہ سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا، لیکن اس قسم کھانے کا ذکر کسی دوسری بیوی سے نہ کرنا۔ حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ تمام ازواج مطہرات میں باہم رازدار اور دوست تھیں۔ ان سے صبر نہ ہو سکا۔ انھوں نے حضرت عائشہؓ سے کہہ دیا۔ اس پر یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں کہ "لم تحرم ما احل الله لك" اور "واذ اسرالنبی الی بعض ازواجه" پس جو چیز آپ نے اپنے اوپر حرام کرلی تھی، وہ یہی ماریہ قبطیہ تھی، جسے خدا نے آپ کے لیے حلال کیا تھا اور جو راز بعض ازواج نے ظاہر کردیا تھا وہ بھی آپ کا قسم کھانا تھا۔ بعض روایتوں میں اتنا اور زیادہ ہے کہ علاوہ قسم کے کھانے آپ نے حضرت حفصہؓ سے یہ بھی کہا تھا کہ میرے بعد حضرت ابوبکرؓ اور تمہارے والد میرے جانشین ہوں گے۔

امام طبری نے اس واقعے کے متعلق متعدد روایتیں درج کی ہیں۔ یہی روایتیں ہیں جو محمد ابن سعد، ہیثم، ابن مردویہ اور طبرانی نے عشرۃ النساء اور مسند وغیرہ میں درج کی ہیں۔ ان میں باہم سخت اختلاف ہے اور ایک ہی واقعہ کو مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے لیکن جب سرے سے ان کی اسناد ہی قابل قبول نہیں تو اضطراب و اختلاف متون پر کیا بحث کی جائے؛

تحقیق و نقد روایات

لیکن ہم پورے وثوق اور زور کے ساتھ ان روایات کی صحت سے قطعاً انکار کرتے ہیں اور اس کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں کہ انھیں یک قلم ناقابل قبول و اعتبار قرار دیا جائے۔

بالاختصار وجوہ حسب ذیل ہیں:

سب سے پہلے اس بیان کو پیش نظر رکھیے جو اس مضمون کے پہلے نمبر میں احادیث و کتب حدیث کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ محققین و ائمۂ فن نے طبقات و مراتب محدثین کے متعلق کافی تصریحات کر دی ہیں اور اس بارے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تقسیم قدماء محققین کی آراء کی بہترین ترجمان ہے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے کہ کتب حدیث چار درجوں میں منقسم ہیں۔ پہلا درجہ صحیحین کا ہے دوسرا بقیہ کتب صحاح کا، تیسرا تصانیف دارمی، عبدالرزاق، بیہقی، طبرانی وغیرہ کا۔ چوتھا ابن مردویہ، ابن جریر طبری، ابونعیم، ابن عساکر، ابن عدی وغیرہ کا۔ تیسرے اور چوتھے درجوں کی کتابوں میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا ہے اور ہر طرح کا رطب و یابس ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

صحت، شہرت اور قبول

یہ محققانہ تقسیم باعتبار صحت، شہرت اور قبول کے کی گئی ہے۔ "صحت" کے معنی یہ ہیں کہ اس کتاب کے مصنف نے صحیح حدیثوں کے جمع کرنے کا اس میں التزام کیا ہو اور اگر کوئی حدیث اس درجہ کی نہ ہو تو اس کے نقص کی بھی تصریح کر دی ہو۔ "شہرت" سے مقصود یہ ہے کہ ہر زمانے میں ارباب فن نے اسے درس و تدریس میں رکھا ہو اور اس کے تمام مطالب کی شرح و تفسیر اور چھان بین ہو گئی ہو۔ "قبول" سے مراد یہ ہے کہ علمائے فن نے اس کتاب کو معتبر اور مستند تسلیم کیا ہو اور کسی نے اس سے انکار نہ کیا ہو۔

غور و فکر کی ضرورت

اب غور کرو کہ قصہ ماریہ قبطیہ کی جتنی روایتیں ہیں، وہ نہ تو پہلے درجے کی کتابوں میں ہیں، نہ دوسرے درجے کی، بلکہ تمام تر تیسرے اور چوتھے درجے کی کتابوں میں روایت کی گئی ہیں پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اول درجے کی صحیح کتب حدیث یعنی کتب صحاح علی الخصوص صحیحین کی روایات ان کے صریح مخالف بھی ہیں اور جو سبب نزول آیت تحریم کا ان سب میں بیان کیا گیا ہے، اس سے ان روایات کے بیان کردہ قصے کو کوئی تعلق نہیں۔

یہ تمام روایتیں طبرانی، ابن سعد، ابن جریر، طبری وغیرہ کی ہیں۔ ان مصنفوں کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ ان کا مقصود صرف روایات جمع کر دینا اور ہر طرح کے ذخیرۂ احادیث و آثار کو ضائع ہونے سے محفوظ کر دینا تھا۔ نہ تو انھوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ان کی تمام مرویات صحیح ہیں اور نہ محققین نے انھیں یہ درجہ دیا۔ پس طبرانی اور طبری وغیرہ کی روایات صرف اسی وقت قبول کی جا سکتی ہیں، جب کہ ان کی صحت کی تصدیق دیگر وسائل سے بھی ہو جائے یا حسب اصول مقررۂ حدیث ان کی صحت پایۂ ثبوت تک پہنچا دی جائے۔ علی الخصوص جب کتب معتبرہ حدیث مثل بخاری و مسلم ان کے مخالف ہوں اور تمام صحاح ستہ خاموش۔

صحیحین کا بیان

ان روایتوں میں "لم تحرم ما احل اللہ لک" اور "و اذ اسر النبی الی بعض ازواجک" کا شان نزول بیان کیا گیا ہے، لیکن امام بخاری و مسلم انھیں آیات کا شان نزول دوسرا واقعہ بیان کرتے ہیں یعنی جس حلال شے کو آپ نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اس کی نسبت خود حضرت عائشہؓ کا قول متعدد

روایات واسناد صحیحہ سے موجود ہے کہ وہ شہد تھا نہ کہ ماریہ قبطیہ۔ امام بخاری نے پانچ چھ بابوں میں اس واقعے کو لیا ہے، لیکن کہیں بھی ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا واقعہ نظر نہیں آتا۔ پھر ہم اس بارے میں امام بخاری ومسلم اور مصنفین صحاح کی روایت کو تسلیم کریں یا واقدی، ابن سعد، طبرانی اور طبری کی؟

معیار اصول فن

قطع نظر اس کے اصول فن کے لحاظ سے بھی یہ روایات پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ طبرانی، ابن مردویہ اور ابن جریر وغیرہ نے مختلف طریقوں سے انھیں روایت کیا ہے لیکن ان میں سے کسی روایت کی بھی اسناد صحیح نہیں۔ آگے چل کر محققین فن کی تصریحات اس بارے میں درج ہوں گی۔

البتہ صرف ایک مبہم و مجمل روایت ہے جس سے ان روایات کی تقویت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کے دو مختلف طریقوں کی بعض محدثین نے توثیق کرنی چاہی ہے اور یہی روایت ہے جو قصہ ماریہ قبطیہ میں نسبتاً بہترین اسناد سے سمجھی جاتی ہے۔ ہم صرف اسی پر نظر ڈالیں گے اور اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جب بہترین اور اقوی روایت کا یہ حال ہے تو ان روایتوں اور ان کے اسناد کا کیا حال ہوگا، جنھیں خود ان کے حامیوں نے بھی پیش کرنے کے قابل نہ سمجھا؟

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

روایت مسروق ورقاشی

حافظ ابن حجر عسقلانی نے کتاب التفسیر کی شرح میں ان تمام روایتوں پر بحث کی ہے اور جتنے مختلف اسناد سے مروی ہیں، سب کو پیش نظر رکھا ہے،

واختلف فی المراد بتحریمہ ففی حدیث عائشۃ ثانی حدیثی الباب ان ذلک بسبب شربہ (صلعم) العسل عند زینب بنت جحش ..... ووقع عند سعید بن منصور بہ اسناد صحیح الی مسروق قال، حلف رسول اللہ لحفصہ لا یقرب امۃ وقال ھی علی حرام۔

(جلد ۸ صفحہ ۵۰۳ مطبوعہ مصر)[1]

جس شے کو آنحضرت نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اس کے تعین میں اختلاف ہے۔ عائشہؓ کی حدیث میں جو اس باب کی دوسری حدیث ہے یہ ہے کہ اس کا سبب آنحضرت کا شہد تناول فرمانا تھا جو زینب بنت جحش کے یہاں آپ نے کھایا تھا۔ لیکن سعید بن منصور نے سند صحیح سے جو مسروق تک پہنچی ہے، روایت کیا ہے کہ اس کا سبب وہ قسم تھی جو آنحضرتؐ نے حفصہؓ کے لیے کھائی تھی کہ اپنی لونڈی کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے۔

حافظ موصوف نے ان تمام روایات میں سے صرف ایک روایت ہی کی توثیق کی ہے اور سند صحیح سے قرار دیا ہے باقی روایتیں جو طبرانی، ابن مردویہ اور مسند ہیثم وغیرہ سے مروی ہیں اور عموماً قرطبی اور واحدی وغیرہ نے اپنی اپنی تفسیروں میں درج کر دی ہیں۔ ان کو صرف اس خیال سے نقل کیا ہے کہ جب مسروق والی حدیث معتبر قرار دے لی گئی تو ان روایتوں سے

---

[1] ۱۳۲۵ھ کے مصری ایڈیشن میں یہ عبارت جلد ۸ کے صفحہ ۶۳۴ پر ہے۔

اس کی تقویت کا کام لیا جا سکتا ہے گو فی نفسہ ان میں سے کسی کی سند بھی قابل اعتنا نہ ہو، چنانچہ آخر میں لکھتے ہیں:

وھذا طرق کلھا یقوی بعضھا بعضا فیحتمل ان تکون الایۃ نزلت فی السببین معاً۔ (جلد ۸ صفحہ ۵۰۳)[1]

اور تمام مختلف طرق باہم ایک دوسرے کو قوت پہنچاتے ہیں پس یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے سورۂ تحریم کی پہلی آیت دونوں واقعوں کے متعلق ایک ساتھ نازل ہوئی ہو

اس قول میں حافظ موصوف نے دونوں واقعات میں باہم تطبیق کی کوشش کی ہے۔ اس کی نسبت ہم آگے چل کر لکھیں گے۔ یہاں صرف اس قدر دکھلانا مقصود ہے کہ تمام روایات ماریہ قبطیہ میں صرف مسروق والی روایت ہی سے حافظ موصوف متاثر ہیں اور دیگر اسناد و طرق کو اس لیے پیش کرتے ہیں کہ روایت مسروق کی ان سے تقویت مزید ہو جاتی ہے پس اس بارے میں عروۃ الوثقیٰ صرف مسروق ہی کی روایت ہوئی۔

حافظ ابن کثیر کا بیان

اس روایت کے ایک دوسرے طریق کی حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں توثیق کی ہے اگرچہ وہ خود بھی اس واقعے کا شان نزول سورۂ تحریم ہونا تسلیم نہیں کرتے جیسا کہ آگے نقل کیا جائے گا۔

چنانچہ حافظ موصوف نے سورۂ تحریم کی تفسیر میں حسب عادت وہ تمام روایات نقل کر دی ہیں جو امام طبری وغیرہ نے اس بارے میں درج کی ہیں لیکن چونکہ ان کی اسناد کا حال ان پر واضح تھا اس لیے کسی طریق و سند کی بھی توثیق نہیں کی۔

البتہ جو روایت ہیثم بن جلیب نے اپنی مسند میں درج کی ہے، اسے نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے:

قال الھیثم فی مسندہ ثنا ابو قلابہ عبدالملک بن محمد الرقاشی ثنا مسلم بن ابراھیم (الخ) عن عمر قال قال النبی صلعم لحفصہ لا تخبری احدا وان ام ابراھیم علیّ حرام فقالت اتحرم ما احل اللہ لک؟ قال فو اللہ لا اقربھا ...... ھذا اسناد صحیح۔ و لم یخرجہ احد من اصحاب الکتب الستۃ واختارہ الحافظ الضیاء المقدسی۔

(فتح البیان جلد: ۱۰ ص: ۱۸)

ہیثم نے اپنی مسند میں حضرت عمرؓ سے بواسطہ ابن رقاشی وغیرہ روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے حفصہؓ سے کہا کہ کسی کو اس بات کی خبر نہ دینا۔ ابراہیم کی ماں (ماریہ قبطیہ) مجھ پر حرام ہے۔ حفصہؓ نے کہا: کیا آپ اس چیز کو حرام کرتے ہیں جس کو آپ کے لیے خدا نے حلال کیا ہے؟ فرمایا کہ قسم خدا کی! میں کبھی اس کے پاس نہ جاؤں گا۔ اس روایت کی اسناد صحیح ہے لیکن صحاح ستہ کے جامعین میں سے کسی نے بھی اسے روایت نہیں کیا البتہ حافظ ضیاء مقدسی نے اپنی مستخرج میں اسے لیا ہے۔

---

[1] ۱۳۲۵ھ کے ایڈیشن کی جلد ۸ کا صفحہ ۴۶۳ ملاحظہ فرمایئے۔

دراصل یہ روایت بھی وہی مسروق والی روایت ہے مگر دوسرے طریق سے مروی ہے، پس ان تمام روایتوں میں جن میں ماریہ قبطیہ کا حضرت حفصہؓ کے مکان میں آنحضرت صلعم کے ساتھ ہونا، ان کا عتاب کرنا اور آزردہ ہونا، پھر آنحضرت صلعم کا قسم کھانا وغیرہ بیان کیا گیا ہے، صرف یہی ایک روایت ہے جس کے ایک طریق کی حافظ ابن حجر نے اور دوسرے طریق کی حافظ ابن کثیر نے توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ اسناد صحیح سے مروی ہے لہذا ان کے علاوہ اور جس قدر طریق ہیں، ان کا ذکر کرنا فضول ہوگا کیونکہ ان کی صحت کے متعلق کوئی تصدیق ہمارے سامنے نہیں۔

روایت مسروق و رقاشی کی حقیقت

اب آئیے، اس روایت پر نظر ڈالیں کہ اصول فن کے لحاظ سے یہ کہاں تک قابل اعتبار و تسلیم ہے؟ اور اس کا اثر اصل واقعے پر کہاں تک پڑ سکتا ہے؟

سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس روایت میں نہ تو ماریہ قبطیہ کا ذکر ہے اور نہ واقعے کے وہ تمام اہم حصے منقول ہیں جو امام طبری وغیرہ نے اپنی روایات میں درج کیے ہیں۔ صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ آنحضرت (صلعم) نے حضرت حفصہؓ سے فرمایا میں اپنی لونڈی کے پاس نہ جاؤں گا۔ اس کے لیے قسم کھاتا ہوں۔ پس اگر یہ روایت تسلیم بھی کر لی جائے جب بھی ان تفصیلات کی تصدیق کے لیے قیاس محض کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

ثانیاً اس روایت کا پہلا سلسلہ مسروق تک منتہی ہوتا ہے۔ مسروق صحابی نہ تھے تابعی تھے (یعنی انھوں نے آنحضرت کو دیکھا نہیں تھا) لیکن وہ کچھ نہیں بتلاتے کہ انھوں نے یہ واقعہ کس صحابی سے سنا؛ اور جس سے سنا وہ کس حیثیت سے بیان کرتا ہے؛ صرف ان کا بیان ہے جو بعد کے راویوں نے روایت کر دیا ہے۔ اس کو اصطلاح حدیث میں "منقطع" کہتے ہیں۔ یعنی اس کا سلسلہ آنحضرت صلعم تک نہیں پہنچتا۔ ایک ایسی منقطع روایت کو بخاری و مسلم اور کتب صحاح کی متصل اور کثیر الطرق روایات صحیحہ کے مقابلے میں کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ دونوں میں تطبیق محتمل ہے، کسی طرح صحیح نہیں۔ آگے چل کر ہم اسے واضح کریں گے۔

رہا اس روایت کا دوسرا طریقہ جس کی توثیق حافظ ابن کثیر نے کی ہے تو وہ بھی اپنے اندر کوئی ایسی قوت نہیں رکھتا جو اسے اس حالت میں قائم کر سکے جب امام بخاری و مسلم کی صحیح روایتیں سورۂ تحریم کا شان نزول دوسرا واقعہ بیان کر رہی ہیں اور تمام کتب صحاح اس کی موید ہیں۔

رقاشی کی حیثیت

اس کے اسناد میں سب سے پہلے جو راوی ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ ابو قلابہ عبد الملک بن محمد الرقاشی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متعدد ثقات نے ان کی توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ نیز ابن جریر وغیرہ ان کے حفظ کا اعتراف کرتے ہیں۔ باایں ہمہ دارقطنی جیسے شخص کی رائے ان کی اسناد کے متعلق یہ تھی۔

كثير الخطاء في الاسانيد و المتون كان يحدث من حفظه فكثرت الاوهام في روايته۔

وہ روایت کی سندوں میں اور حدیث کے اصل الفاظ میں کثرت سے غلطیاں کر جاتے ہیں۔ ان کا قاعدہ تھا کہ محض اپنے حفظ کی بنا پر حدیث بیان کرتے تھے، اس لیے ان کی روایت میں بہت اوہام پیدا ہو گئے۔

پھر اسی "تہذیب" میں دارقطنی کا دوسرا قول نقل کیا ہے کہ "لا یحتج بما ینفرد بہ" آخر میں خود حافظ ابن حجر لکھتے ہیں،

"بلغني عن شيخنا ابي القاسم انه قال، عندي عن ابي قلابه عشرة اجزاء ما منها حديث مسلم إنما في اسناد و اما في المتن كان يحدث من حفظه فكثرت الاوهام فيه" فتامل۔

چنانچہ اسی بنا پر بعض محدثین نے اس حدیث سے انکار کر دیا ہے، جو ابو قلابہ رقاشی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ "ان النبي صلعم صلى حتى تورمت قدماه" جیسا کہ حافظ موصوف نے تہذیب میں تصریح کی ہے۔

پس ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابو قلابہ کی اسناد میں کثرت خطاء اوہام روایت و اغلاط متون کی ارباب جرح و تعدیل نے صاف صاف شکایت کی ہے اور ظاہر ہے کہ راوی کی شخصی ثقاہت اور موصوف بالخیر و الصلاح ہونا (کما قال الخطیب) کچھ مفید نہیں ہو سکتا، جب اس کے حفظ و اتقان اور صحت اسناد و متون کے متعلق مخالف تصریحات موجود ہوں، علی الخصوص ایسے موقع پر کہ صرف اسناد کی قوت ہی مطلوب ہے اور دیگر اسناد معتبرہ و متصلہ اس کے مخالف ہیں۔

قصہ ماریہ اور محققین فن

حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی روایت بھی صحیح موجود نہیں جو شان نزول حضرت عائشہؓ نے بیان کر دیا ہے اور جسے بالاتفاق آئمہ حدیث و اساطین فن نے درج اسفار معتبرہ و صحیحہ کیا ہے، وہی اصلی اور صحیح واقعہ ہے اور صرف وہی قابل قبول ہے۔

چنانچہ خود حافظ ابن کثیر باوجود رقاشی کی روایت کی توثیق کرنے کے، آگے چل کر اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے،

و الصحيح ان ذلك كان في تحريمه العسل كما قال البخاري عند هذه الاية۔
(ابن کثیر جلد ۱۰ صفحہ ۱۹)

اور صحیح یہ ہے کہ سورۂ تحریم کی پہلی آیت اس بارے میں نازل ہوئی کہ آنحضرت نے شہد کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، جیسا کہ امام بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔

صرف حافظ موصوف ہی پر موقوف نہیں دیگر ارباب نظر و تحقیق نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ ماریہ قبطیہ کے اس واقعہ کے متعلق کوئی صحیح روایت ثابت نہیں۔ علامہ عینی شرح بخاری میں ان تمام روایات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں،

والصحیح فی سبب نزول الآیة انه فی قصة العسل لا فی قصه ماریة المروی فی غیر الصحیحہ۔ (عینی جلد: ۹ ص: ۵۲۸)

اور اس آیت کے شان نزول کی نسبت صحیح روایت یہی ہے کہ وہ شہد کے متعلق ہے۔ ماریہ قبطیہ کے قصے کے متعلق نہیں، جو کتاب صحاح کے علاوہ دیگر کتب مروی ہے۔

یہی رائے قاضی عیاض کی بھی ہے بلکہ جو الفاظ علامہ عینی نے لکھے ہیں، در اصل قاضی موصوف ہی کے ہیں۔ امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں ان کی رائے انہی الفاظ میں نقل کی ہے۔ خود امام موصوف کی بھی رائے یہی ہے:

ولم تات قصة ماریه من طریق صحیح۔

اور ماریہ قبطیہ کا قصہ کسی صحیح طریق سے مروی نہیں۔

(نووی جلد: ۱ مطبوعہ مولانا احمد علی مرحوم صفحہ: ۴۷۹)

ایسی صریح اور صاف تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ماریہ قبطیہ کا قصہ صحیح ہے؟ اور کیوں کر جائز ہو سکتا ہے کہ اس کی بنا پر معترضین اسلام اپنی معاندانہ تلبیس اور ابلیسانہ فریب کاری کے ساتھ اس واقعے کو ہمارے سامنے بطور حجت اور دلیل کے پیش کریں۔ (مولاناؒ)

غزوۂ تبوک

باب ۶۸

تمہید

(۱)

(از مؤلف)

غزوے کی اہمیت غزوۂ تبوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری غزوہ تھا۔ مختلف وجوہ سے اسے خاص اہمیت حاصل ہے،

۱۔ وقت کی دو بڑی شاہنشاہیاں تھیں، یعنی رومی اور ساسانی۔ انھیں زمانۂ رسالت میں وہی حیثیت حاصل تھی جو آجکل امریکہ اور روس کو حاصل ہے۔ ان میں سے ایک شاہنشاہی کے ساتھ براہِ راست ٹکر کا یہ پہلا موقع تھا۔

۲۔ اس کے لیے تیس ہزار مجاہدین تیار ہوئے۔ ان کے ساتھ اونٹوں کے علاوہ، جن کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی، حسب روایت طبقات ابن سعد دس ہزار گھوڑے تھے۔ سرزمین عرب سے مجاہدین کی اتنی بڑی تعداد اس سامان کے ساتھ پہلے کبھی فراہم نہیں ہوئی تھی۔

۳۔ تمام مجاہدین رضاکار تھے۔ ان میں سے تنخواہ دار ایک بھی نہ تھا۔ ضروری سامان اور زاد و توشہ کے علاوہ سواریاں بھی رضاکارانہ پیشکشوں کی بنا پر مہیا ہوئی تھیں۔

۴۔ ان رضاکاروں کے درجات عالیہ بھی پیش نظر رہنے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ کے ان حق گزار اور سعادت شعار بندوں نے جان و مال اور دنیا کی ہر شے اللہ کی راہ میں بے دریغ قربان کرنے کی توفیق پائی تھی۔

۵۔ منزل مقصود بہت دُور تھی۔ راستہ سخت دشوار گزار اور موسم حد درجہ ناخوشگوار تھا، لیکن اہل حق کو رسول اللہ صلعم کی دعوت پر لبیک کہنے میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہ ہوا۔

۶۔ اسلامی نظام کے برکات وحسنات کا یہ کتنا ایمان افروز اور حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا پاک رسول صلعم صرف سوا آٹھ سال پیشتر بحالت بیچارگی مکہ مکرمہ سے نکل کر مدینہ منورہ پہنچا تھا اور اس مختصر سی مدت میں غازیان صداقت کیش کی اتنی بڑی قوت پیدا ہو گئی، جو سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے سرحد پر اس قیصر سے ٹکرانے کے لیے تیار تھی جو تھوڑا عرصہ پیشتر ساسانی شاہنشاہی پر کاری ضرب لگا چکا تھا۔

کیا معنوی تربیت کے ذریعے مردم گری کے اس محیر العقول معجزے سے کسی کو بھی بہ سلامت عقل و ہوش انکار یا اختلاف کی جرأت ہو سکتی ہے؟

تبوک کا محل وقوع تبوک، حجاز کے منتہائے شمال میں اس شاہراہ پر واقع ہے جو شام کی طرف سے مدینہ منورہ یا

کہ مکہ مرآنے والے تجارتی قافلوں کا عام راستہ تھی۔ پھر ظہورِ اسلام کے بعد حج و زیارت کی غرض سے جو قافلے آتے جاتے رہتے ان کا عام راستہ بھی یہی تھا۔ موجودہ صدی کے اوائل میں سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے حجاز ریلوے تعمیر کرائی تھی تو اس کا ایک اہم سٹیشن تبوک بھی تھا۔

خود مولانا آزاد مرحوم نے مدینہ منورہ سے تبوک کا فاصلہ چھ سو دس کلومیٹر بتایا ہے۔ یہ فاصلہ سرسری حساب کے مطابق کم و بیش تین سو اکاسی میل ہوتا ہے۔ "سفرنامہ ارض القرآن" میں مدینہ منورہ سے العلا کا فاصلہ پانسو بیس میل[1] اور العلا سے الحجر یا مدائن صالح کا فاصلہ تیس میل درج ہے۔ یہ بھی لکھا ہے:

> مدینہ منورہ سے مدائن صالح تک جس راستے سے ہم گزرے، یہ قریب قریب وہی راستہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے گئے تھے۔[2]

گویا ساڑھے پانسو میل کے اس فاصلے میں مدائن صالح سے تبوک کا فاصلہ بھی شامل کر لیا جائے تو پوری مسافت ساڑھے چھ سو میل یا اس سے بھی زاید ہوگی۔

پرانے اندازِ بیان کے مطابق مدینہ منورہ اور تبوک کی درمیانی مسافت چودہ مرحلوں کی بتائی گئی ہے لیکن ساڑھے چھ سو میل کے چودہ مرحلے فرض کرنا تو بظاہر بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے "سفرنامہ ارض القرآن" کا حساب صحیح نہ ہو یا ممکن ہے موٹر کے میٹر کا حساب ملحوظ رکھا گیا ہو، جسے خدا جانے کہاں کہاں چکر لگانے پڑے ہوں۔ سب سے آخر میں ممکن ہے کلومیٹروں کو سہواً میل سمجھ لیا گیا ہو۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مدینہ اور معان کا درمیانی فاصلہ آٹھ سو کلومیٹر بتایا گیا ہے یعنی پانسو میل۔ تبوک معان سے خاصے فاصلے پر جنوب میں ہے۔[3]

عزمِ تبوک کا سبب

عزمِ تبوک کا اصل سبب یہ تھا کہ شمالی جانب سے متواتر خبریں آ رہی تھیں، قیصرِ روم عرب پر حملے کی تیاریاں سرگرمی سے کر رہا ہے، کیونکہ وہ جنگ مُوتہ کا بدلہ لینا چاہتا ہے، جس میں صرف تین ہزار مسلم مجاہدین نے قیصر اور قبائلیوں کے کئی گنا زیادہ لشکر کو میدان سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔[4] اس وقت سے قیصر اور اس کی ماتحت سرحدی ریاستوں نے جن میں غسانی پیش پیش تھے، عزم کر رکھا تھا کہ اسلامی قوت کو اوائل بلوغ ہی میں کچل ڈالیں۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں:

> شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے۔ انھوں نے خبر دی کہ رومیوں نے شام میں لشکرِ گراں جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہ تقسیم کر دی ہے۔ اس فوج میں لخم اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور مقدمۃ الجیش بلقا تک آگیا ہے۔ "مواہب لدنیہ" میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے

---

[1] سفرنامہ ارض القرآن ص ۲۱۸ [2] ایضاً ص ۲۲۱ [3] ایضاً ص ۲۲۴ [4] جیسا کہ موتہ کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے تھا موجودہ سلطنت اردن کا ایک ضلع ہے جو دریائے اردن کے مشرق میں بحیرہ لوط کے جنوبی گوشے تک آتا ہے۔

> مگر عرب کے عیسائیوں نے ہرقل[1] کو لکھ بھیجا تھا کہ محمد (صلعم) نے انتقال کیا اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں، اس بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوج روانہ کی[2]

غسانیوں کو اسلامی قوت اور اسلامی برکات کی صلاحیت توسیع و نفوذ کا بہتر اندازہ ہوگا کیونکہ وہ سرحد پر رہتے تھے نیز وہ عربوں کے امیال و عواطف سے پوری طرح آگاہ ہوں گے۔ اگر انھوں نے قیصر کو برانگیختہ کرنے کے لیے جھوٹی خبریں بھی وضع کرلیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

اس زمانے کے مدینہ منورہ میں قیصر اور غسانیوں کے عزم یورش کی افواہ عام تھی۔ اس کی تصدیق واقعہ ایلاء کے ایک جزئیے سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے ہمسایے میں ایک انصاری رہتے تھے۔ وہ ایک رات گھبرائے ہوئے آئے اور حضرت عمرؓ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا تو کہا، غضب ہوگیا۔ حضرت عمرؓ یہ سنتے ہی بولے، کیا غسانیوں نے چڑھائی کردی؟ حالانکہ انصاری کے ذہن میں ایلاء سے پیدا ہونے والی ایک افواہ تھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی، لیکن حضرت عمرؓ کی توجہ غسانیوں کی یورش ہی کی جانب منعطف ہوئی کیونکہ اسی کا عام چرچا تھا۔

تیاری کا فرمان

جب مختلف ذرائع سے قیصر کے عزم یورش کی تصدیق ہوتی گئی اور بظاہر شک و شبہ کا کوئی امکان نہ رہا تو رسول اللہ صلعم نے فیصلہ فرمالیا کہ جنگ ناگزیر ہے تو یہ حجاز کی شمالی سرحد پر ہونی چاہیے۔ اس میں کئی مصلحتیں تھیں،

۱۔ ابتدائی مراحل ہی میں جنگ کو حملہ آور کے ملک میں پہنچایا جاسکتا تھا اور اپنے ملک کو قتل و غارت کا تختۂ مشق بننے سے محفوظ رکھا جاسکتا تھا۔

۲۔ سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کرکے دفاع کے لیے مستعدی کے ساتھ سرحد پر پہنچ جانا بجائے خود دشمن کے جوش اقدام کو افسردہ کرسکتا تھا۔

۳۔ دشمن کسی ملک میں آتا ہے تو آبادی کے مختلف عناصر کو گوناگوں ترغیبات سے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ حجاز کے شمالی حصوں کے قبائلی عناصر یا تو نئے نئے دائرہ اسلام میں آئے تھے اور ابھی دین حق ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہوا تھا یا وہ اسلام کی طرف مائل ہو رہے تھے لیکن دشمن کا اقدام ان مسلمانوں کو آزمائش میں ڈال سکتا تھا، جنھیں اسلام قبول کیے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اور مائلین کے لیے رکاوٹ کا باعث بن سکتا تھا۔

۴۔ دشمن کسی ملک میں آجاتا ہے تو آبادیوں کے امن اور جان و مال کے لیے خطرہ پیدا ہوجاتا ہے اور بہرحال

---

[1] قیصر روم کا نام [2] سیرۃ النبی (جلد اول ص: ۵۱۱)

بہت یا تھوڑے نقصان کا ہدف ضرور بننا پڑتا ہے۔ سرحد پر پہنچ جانے سے اپنے ہاں کے تمام افراد کے لیے خاصے اطمینان کی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کے برعکس دشمن کی رعایا کے لیے تشویشات میں یقیناً اضافہ ہو جاتا۔

چنانچہ رسول اللہ صلعم نے تبوک کے لیے تیاری کا فرمان صادر کر دیا اور تمام طبقوں خصوصاً اغنیاء کو فوج کے لیے سواریوں اور دوسرے مصارف کے انتظام کی طرف توجہ دلائی گئی۔

احوال و ظروف کی ناسازگاری

سوء اتفاق سے اس وقت گرد و پیش کے حالات خاصے ناخوشگوار تھے۔ موسم شدید گرمی کا تھا۔ سفر بہت طویل اور راستہ دشوار گزار تھا۔ خشک سالی کے باعث قحط کی سی حالت نمودار تھی۔ پھل پکنے والے تھے اور ایسے حالات میں لوگ سفر کو پسندیدہ نہیں سمجھتے، لیکن معاملہ ملی دفاع کا تھا جس پر محض ایک فصل کے پھلوں ہی نہیں بلکہ تمام افراد ملت کے امن اور جان و مال کی مستقل حفاظت کا انحصار تھا۔

مخلص اصحاب نے انفاق میں بڑی فراخ حوصلگی سے حصہ لیا۔ مثلاً :

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پورا مال رسول اللہ صلعم کی بارگاہ اقدس میں پیش کر دیا یہاں تک کہ کرتے کے بٹن بھی توڑ کر پیشکش میں شامل کر دیے۔ جب شمع رسالت کے اس پروانے سے پوچھا گیا کہ اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا؟ تو عرض کیا، اللہ اور اس کے رسول کی محبت۔

۲۔ حضرت عمرؓ نے پورے مال کے دو حصے کیے اور ایک حصہ قومی سرمایے میں دے دیا۔

۳۔ حضرت عثمانؓ نے تین سو اونٹ ساز و سامان کے ساتھ حاضر کیے اور ایک ہزار دینار نقد دیے[۱]۔

۴۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے چالیس ہزار درم پیش کیے۔

۵۔ خواتین نے زیورات ہدیہ کر دیے[۲]۔

۶۔ حضرت ابوعقیلؓ انصاری نے رات بھر پانی نکال نکال کر ایک کھیت سیراب کیا اور مزدوری میں چار سیر کھجوریں پائیں۔ دو سیر اہل و عیال کو دے دیں اور دو سیر بارگاہ رسالتؐ میں حاضر کر دیں۔ حضور صلعم نے حکم دیا کہ یہ کھجوریں پورے مال پر بکھیر دی جائیں۔

پیچھے رہ جانے والے لوگ

جو لوگ سفر تبوک میں حضور صلعم کے ساتھ نہ گئے اور پیچھے رہ جانے کی وجہ سے مخلفین کہلائے، انھیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱۔ منافقین، جو بے بنیاد عذر پیش کر کر کے گھروں میں بیٹھ رہے۔ بظاہر انھیں سر و سامان کے اعتبار سے مسلمانوں کی

---

[۱] "رحمۃ للعالمین" میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے نو سو اونٹ، ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کیے اور "مجہز جیش العسرۃ" (یعنی زمانہ عسرت کے لشکر کے لیے سر و سامان بہم پہنچانے والا) کا لقب پایا (جلد اول ص: ۱۷۷)۔ [۲] اصح السیر ص: ۳۱۸

کم مائیگی اور قیصر کے وسیع وسائل حرب کی بنا پر یقین ہو گا کہ مسلمان اس لڑائی میں تباہ ہو جائیں گے اور قیصر کی قوت کا یہی ثبوت کم نہ تھا کہ وہ کچھ ہی عرصہ پیشتر ساسانی شاہنشاہی پر خوفناک ضرب لگا چکا تھا۔

۲۔ وہ مخلص اور جاں نثار مساکین جن کے پاس نہ سواری کا انتظام تھا اور نہ وہ توشہ و زادِ راہ کی استطاعت رکھتے تھے۔ وہ اپنی بیچارگی اور بے مائیگی پر بے اختیار روتے تھے۔ اس وجہ سے "البکاؤن" کہلائے یعنی "بہت رونے والے"۔ ان میں بعض کے جانہ سکنے کا سبب بے استطاعتی اور بے مقدوری کے سوا کچھ نہ تھا۔

۳۔ بعض مخلصین سے بھی سہل انگاری ہوئی یعنی وہ آج جاتے ہیں، کل جاتے ہیں، کے منصوبے بناتے رہے یہاں تک کہ وقت نکل گیا۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

آدمیوں کی کثرت، سواریوں کی قلت اور ضروری سازوسامان کی کمی کے باعث تبوک جانے والے لشکر کو "جیش العسرت" بھی کہتے ہیں چونکہ اس غزوے کی وجہ سے منافقین کا پردہ بری طرح فاش ہو گیا تھا اور ان کی بہت فضیحت ہوئی تھی اس لیے یہ "غزوۂ فاضحۃ" بھی کہلاتا ہے اور اسی وجہ سے بعض صحابہ سورۂ توبہ کو "سورۂ فاضحۃ" بھی کہتے تھے۔

اخلاص کے ایمان افروز نمونے

سفر بہت طویل تھا۔ راستے میں کوئی شخص پیچھے رہ جاتا اور حضور صلعم یہ کیفیت سنتے تو فرماتے کہ اسے چھوڑ دو، اگر اس میں کوئی بھلائی ہے تو وہ ضرور تم سے آملے گا۔ اگر اس کی حالت کچھ اور ہے تو سمجھ لو خدا نے تمہیں اس سے بچا لیا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا اونٹ راستے میں سست ہو گیا اور وہ پیچھے رہ گئے۔ اونٹ بیٹھ گیا اور وہ رک گئے۔ اونٹ کی قوت و رفتار کی بحالی سے مایوسی ہو گئی تو سامان خود اٹھا لیا اور لشکر کے نقش ہائے قدم پر پیدل چلنے لگے۔ حضور صلعم ایک منزل پر قیام فرما ہوئے تو کسی نے دیکھا کہ کوئی شخص پیدل چلا آرہا ہے۔ حضور صلعم سے عرض کیا گیا تو فرمایا: "ابوذرؓ ہوں گے"۔ چنانچہ وہی نکلے۔

حضرت ابوخیثمہؓ کا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ رسول اللہ صلعم روانہ ہو چکے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ تیز اور گرمی سخت تھی۔ حضرت ابوخیثمہؓ کی دونوں بیویوں نے پانی چھڑک کر اپنے مکان ٹھنڈے کیے۔ کھانا تیار کر لیا۔ پینے کے لیے ٹھنڈا پانی لا رکھا۔ ابوخیثمہؓ آئے تو دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ بیویوں کے اہتمام پر نظر ڈالی۔ پھر بولے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیز دھوپ اور گرم ہوا میں ہوں اور ابوخیثمہؓ بیویوں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھائے؟ یہ انصاف نہیں۔ خدا کی قسم میں کسی بھی مکان میں ہرگز داخل نہ ہوں گا جب تک رسول اللہ صلعم سے مل نہ جاؤں۔

چنانچہ سواری کے لیے اونٹ منگایا اور اسی وقت روانہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلعم تبوک پہنچ چکے تھے۔ کسی نے اطلاع دی کہ دُور کوئی سوار چلا آرہا ہے۔ حضور صلعم نے فرمایا: ابوخیثمہؓ ہوں گے۔ پاس آئے تو وہی نکلے۔ گویا پیچھے رہ جانے کے نتیجے میں تنہا سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے لشکرِ اسلام سے جا ملے۔

ان سراپا اخلاص بزرگوں کے لیے صرف اتنا جان لینا کافی تھا کہ حضور صلعم کا حکم بہر حال پورا ہونا چاہیے۔ چونکہ ایمان کی پختگی میں شبہ نہ تھا اس لیے امداد و تقاضا کی ضرورت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جذبۂ خاص کی رہنمائی میں جو کچھ ہونا چاہیے تھا، اس پر کاربند ہو گئے۔ (مولف)

باب ۶۹

تمہید

(۲)

حضرت علیؓ کا واقعہ رسول اللہ صلعم نے روانگی کے وقت محمد بن مسلمہ انصاری کو عامل مدینہ مقرر فرمایا۔ حضرت علیؓ کو اہل بیت کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ رسول اللہ صلعم جرف میں تھے، جو مدینہ منورہ سے تین میل شمال میں ہے۔ اس اثنا میں بعض منافقوں نے یہ افواہ پھیلا دی، حضرت علیؓ کو اس لیے چھوڑ دیا کہ حضور صلعم کو ان سے اک گونہ سرگرانی تھی۔ حضرت علیؓ کے گوش مبارک تک یہ اطلاع پہنچی تو ہتھیار اٹھائے اور جرف میں رسول اللہ کے پاس پہنچ گئے اور عرض کیا: آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمھیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔

حقیقت یہی ہے کہ سفر بہت طویل تھا اور کچھ معلوم نہ تھا کہ سرحد پر پہنچ کر کیا صورت پیش آئے گی اور کب تک وہاں ٹھہرنا پڑے گا، لہٰذا اہل بیت کے لیے کسی قریبی عزیز کو مقرر کر دینا عین قرین مصلحت تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ جرف سے لوٹ آئے۔

دیارِ ثمود تبوک جاتے وقت راستے کا صرف ایک واقعہ قابل ذکر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الحجر (مدائن صالح) یعنی دیار ثمود میں پہنچتے ہی حکم دے دیا کہ نہ یہاں کا پانی پیا جائے، نہ اس پانی سے وضو کیا جائے، نہ اس سے آٹا گوندھا جائے۔ اگر کسی نے گوندھ لیا ہو تو وہ اونٹ کو کھلا دے۔ صرف ایک کنواں مستثنیٰ رکھا گیا اور وہ صالح علیہ السلام کے وقت کا کنواں تھا، جس سے آپ کی اونٹنی پانی پیتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ "بئر ناقہ" مشہور ہوا۔ خود حضور صلعم اس مقام سے گزرے تو روئے مبارک پر پردہ ڈال لیا اور سواری کو تیز چلایا تاکہ جلد گزر جائیں۔

حضور صلعم کا طریقہ یہی تھا کہ جن مقامات میں مجرم قومیں غضب ایزدی کا نشانہ بن چکی تھیں وہاں سے جلد از جلد گزر جاتے تھے۔ عرفات کے راستے میں وادی محسر آتی ہے یہاں اصحاب فیل مبتلائے عذاب ہوئے تھے۔ اس وادی سے بھی عرفات جاتے آتے جلد گزر جانے ہی کا دستور قائم ہوا۔

تبوک میں قیام تبوک پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کم و بیش بیس روز قیام فرما رہے۔ اس اثنا میں نہ قیصر اور غسانیوں کی کسی فوج کا سراغ ملا۔ نہ حملے کی تیاری کے متعلق کچھ معلوم ہو سکا۔ ان حالات میں جنگ کا کون سا امکان تھا؟ ممکن ہے غلط افواہوں کا فتنہ سرحد کے نصرانی قبیلوں اور غسانیوں نے برپا کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے

کر دفاع کے لیے مسلمانوں کی بے مثال مستعدی دیکھ کر دشمنوں کا عزم یورش مضمحل ہو گیا ہو۔ موتہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا، جس میں تین ہزار سے کم افواج نے تیس تینتیس گنا لشکر کو ہراساں کر دیا تھا۔ اب تو تیس ہزار جانباز آمادہ پیکار تھے اور ان کی قیادت خود رسول اللہ صلعم بہ نفس نفیس فرما رہے تھے۔

لڑائی تو نہ ہوئی لیکن غسانیوں کی شرارتیں بعد میں بھی جاری رہیں چنانچہ جب کعبؓ بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں کے پیچھے رہ جانے اور شامل لشکر نہ ہونے کے متعلق باز پرس جاری تھی تو رئیس غسان کا خط کعبؓ کے نام آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ محمد (صلعم) نے تمہاری قدر نہ کی اس لیے میرے پاس چلے آؤ۔ کعبؓ نے اس خط کو ایک اور آزمایش سمجھ کر پھاڑ ڈالا تھا یا جلا دیا تھا۔

اہل اَیلہ کے لیے امان نامہ

زمانہ قیام میں ایلہ[1] کا مسیحی حاکم یحنہ بن روبہ خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور جزیہ دینے کا اقرار کر کے اس نے امان نامہ حاصل کر لیا جس کا مضمون یہ تھا:

یہ اللہ کی طرف سے اور محمد النبیؐ کی طرف سے جو اللہ کے رسول ہیں، یحنہ بن روبہ اور اہل ایلہ کے لیے امان نامہ ہے۔ سمندر میں ان کی کشتیوں اور جہازوں، نیز خشکی کے راستوں میں ان کے قافلوں اور مسافروں کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول کا ذمہ ہے۔ اس ذمہ داری میں اہل شام، اہل یمن یا سمندر میں کشتی بازی کرنے والے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ان کے پاس رہتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شخص معاہدے کے خلاف کسی نئی بات کا مرتکب ہوگا تو اس کا مال اس کی جان بچانے میں حائل نہ ہوگا۔ وہ اس کے لیے حلال ہوگا جو اسے لے لے۔ یہ جائز نہ ہوگا کہ جو پانی ان کے ہاں جاتا ہے اسے بند کیا جائے یا خشکی اور تری میں جس راستے وہ جانا چاہیں، انہیں روکا جائے۔

اہل جربا اور اہل اذرح

اسی طرح اہل جربا اور اہل اذرح[2] نے بھی امان نامے حاصل کر لیے۔ ان کے لیے شرطیں یہ تھیں:

۱۔ ماہ رجب میں ایک سو دینار ادا کرتے رہیں۔

۲۔ اگر مسلمانوں میں سے کوئی فرد کسی جرم پر تعزیر کے خوف سے ان کے ہاں پہنچ جائے تو اسے مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔

---

[1] ایلہ وہ مقام ہے جسے آجکل ایلات کہتے ہیں اور وہاں اسرائیل نے بندرگاہ بنالی ہے یہ عقبہ کے پاس ہے۔ [2] جربا اور اذرح قریب قریب ہیں اور دونوں معان کے نزدیک ہیں۔ اذرح وہی مقام ہے جہاں جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان ثالثی کی مجلس منعقد ہوئی تھی۔

دومتہ الجندل

تبوک ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ بن ولید کو چار سو بیس سواروں کے ہمراہ دومتہ الجندل[1] بھیجا، جو کم و بیش پانچ مرحلے پر تھا۔ مدینہ منورہ سے اس کی مسافت پندرہ رات کی بیان کی گئی ہے۔ اُکیدر بن عبدالملک وہاں کا حاکم تھا جو بنی کندہ میں سے تھا۔ وہ مذہباً نصرانی تھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ حضرت خالدؓ دومہ پہنچے تو چاندنی رات تھی اور اُکیدر شکار کھیل رہا تھا۔ حضرت خالدؓ نے حملہ کر دیا۔ اُکیدر قید ہو گیا۔ اس کے بھائی نے جنگ کی اور مارا گیا۔ آخر اُکیدر سے معاملہ طے کر لیا گیا۔ اس نے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہیں اور چار سو نیزے دینے منظور کیے۔ پھر حضرت خالدؓ اُکیدر اور اس کے ایک اور بھائی کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلعم کے پاس مدینہ منورہ پہنچے۔ جزیہ ادا کرنے کی شرط پر اُکیدر کو نہ محض رہا کر دیا گیا بلکہ دومہ کے علاوہ تیما[2] کی حکومت بھی اسی کے سپرد کر دی گئی۔ اسی طرح ایلہ کے علاوہ تبوک کا انتظام یحنہ بن روبہ کو سونپ دیا گیا۔

واقعی صورت حال

دومہ، ایلہ، جربا اور اذرح کے امان ناموں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان علاقوں میں قیصر یا غسانیوں کا کچھ اثر نہیں رہا تھا۔ فلپ حتّی نے لکھا ہے:

> بیزنطینیوں نے سرحدی قلعوں سے تغافل برتا تھا...... بحیرۂ لوط کے ارد گرد یا مدینہ وغزہ کی شاہراہ پر جو شامی عربی قبیلے رہتے تھے، قیصر نے ان کے وظیفے بند کر دیے تھے جو پہلے انھیں باقاعدہ ملتے تھے[3]

یہاں وجوہ پر بحث غیر ضروری ہے۔ وظیفے کی بندش یا سرحدی قلعوں سے تغافل کا ذمہ دار قیصر تھا۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ قیصر اور غسانیوں کا اثر اس علاقے میں ختم ہو چکا تھا اور ان سے خوف و ہراس بھی کسی کو نہ تھا۔ اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ ایلہ، جربا اور اذرح والوں نے خود بخود حاضر ہو کر رسول اللہ صلعم سے امان نامے حاصل کیے۔ ان امان ناموں کی وجہ سے شمالی حجاز کے تحفظ کے لیے ایک نیا دفاعی خط قائم ہو گیا۔

---

[1] دومتہ الجندل وادی سرحان کے جنوبی سرے پر واقع تھا۔ آجکل اس مقام کو جوف کہتے ہیں جو شمالی نجد کا مشہور مقام ہے۔ "دومہ" یا "دوما" دراصل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک فرزند کا نام تھا۔ اس کی اولاد جس مقام پر آباد ہوئی وہ مقام ابتدا میں دومہ کہلایا۔ اس کا ذکر بائبل میں بھی مختلف مقامات پر آیا ہے مثلاً پیدائش باب ۲۵۔ آیت ۱۴، یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۱ وغیرہ نیز ارض القرآن مرتبہ سید سلیمان مرحوم (جلد دوم ص ۶۱) اور بائبل ڈکشنری مرتبہ ایسٹن (Easton) ص ۲۰۵۔

[2] تیما بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک فرزند کا نام تھا۔ یہ مقام غالباً اس نے یا اس کی اولاد نے آباد کیا تھا۔ تیما تبوک سے ایک سو ستر میل جنوب مشرق میں خیبر و تبوک کی شاہراہ پر واقع ہے۔ خیبر تیما سے اڑھائی سو میل بتایا جاتا ہے۔ بائبل میں اس مقام کا ذکر بھی کئی جگہ آیا ہے۔

[3] تاریخ عرب (انگریزی)، ص ۱۴۳ بحوالہ تھیوفینز (Theophanes)۔

روانگی اور واپسی کی تاریخیں تمام روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلعم رجب ۹ھ[1] میں تبوک گئے تھے۔ تاریخ کسی نے نہیں لکھی، دن جمعرات کا بتایا گیا ہے۔ مدینہ منورہ رمضان ۹ھ[2] میں واپس تشریف لائے۔ واپسی کی تاریخ بھی کہیں نظر سے نہیں گزری۔ بیس دن یا ایک دو دن کم یا زیادہ آپ تبوک میں قیام فرما رہے۔ اٹھائیس یا کسی قدر زیادہ دن جانے آنے میں صرف ہوئے ہوں گے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ جب آپ ذی آوان پہنچے، جو مدینہ منورہ سے قریب ہے تو مسجد ضرار کے انہدام و احراق کے لیے آدمی بھیج دیے۔

تبوک کی کیفیت سفرنامہ ارض القرآن سے معلوم ہوا کہ جس مقام پر لشکر اسلام ٹھہرا تھا وہاں اس جگہ پہلے لکڑی کی ایک مسجد بنی ہوئی تھی جہاں رسول اللہ صلعم دوران قیام میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۰ء) میں ایک ترک فوجی افسر نے اپنے خرچ سے وہاں پتھر کی ایک مسجد بنوا دی تھی۔ تبوک کا پانی خیبر اور مدینہ منورہ دونوں سے زیادہ ہے۔ ہر طرف باغ لگائے جا رہے ہیں۔ یوں حضور صلعم کی وہ پیشگوئی پوری ہو رہی ہے جو زمانۂ قیام تبوک میں فرمائی تھی کہ تم اس علاقے کو باغات سے بھرا ہوا پاؤ گے۔ شہر کی آبادی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ ہر طرف پختہ اور جدید طرز کی عمارتیں بن رہی ہیں۔ پہلے تبوک کی آبادی دو تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اب پچیس تیس ہزار بلکہ ایک روایت کے مطابق پچاس ساٹھ ہزار ہے[3]۔

ایک گزارش سفرنامہ ارض القرآن میں ہے:

> مغائر شعیب وہی جگہ ہے جس کا قدیم نام مدین تھا اور جہاں حضرت شعیبؑ کی قوم آباد تھی۔ اگرچہ حضرت شعیبؑ کی بعثت اس علاقے کے علاوہ علاقہ تبوک کے لیے بھی تھی۔ بہت سے مفسرین نے تبوک ہی کو ایکہ کا علاقہ قرار دیا ہے، جس کے رہنے والوں کا قرآن حکیم میں اصحاب الایکہ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے[4]۔

بظاہر یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ "اصحاب الایکہ" کا ذکر قرآن مجید میں چار مقامات پر آیا ہے۔ یعنی سورۂ حجر، سورۂ شعراء، سورۂ ص اور سورۂ ق میں۔ اگر تبوک واقعی وہ مقام ہوتا جہاں اصحاب الایکہ آباد تھے تو رسول اللہ صلعم کبھی

---

[1] ہجرت کے نویں سال ماہ رجب ۱۸؍ اکتوبر ۶۳۰ء سے شروع ہوا اور ۱۲ نومبر ۶۳۰ء کو ختم ہوگیا۔ [2] ہجرت کے نویں سال رمضان شریف کا آغاز ۱۲ دسمبر ۶۳۰ء کو ہوا۔ [3] سفرنامہ ارض القرآن (ص ۲۳۸-۲۳۹)

[4] سفرنامہ ارض القرآن ص ۲۴۱ سفرنامہ میں ہے کہ مغائر شعیب تبوک سے ایک سو پینتالیس میل ہے۔

اس جگہ قیام نہ فرماتے، کیونکہ آپ کو ان مقامات میں قیام قطعاً پسند نہ تھا جو باری تعالیٰ کے غضب کا ہدف بنے۔
ممکن ہے تبوک کے اردگرد کسی اور مقام پر "اصحاب الایکہ" کی آبادی ہو، لیکن تبوک کو اس علاقے میں شامل نہ کرنا چاہیے۔
بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ ایکہ مدین سے قریب تھا۔ غالباً یہی صحیح ہے۔

(یہاں مولف کی تحریر ختم ہوگئی۔ آگے تبوک کے متعلق جو کچھ ہے، وہ مولاناؒ کی تحریر پر مشتمل ہے)۔ (مولف)

باب

غزوۂ تبوک

—(۱)—

قیصر کے حملے کی خبریں

"تبوک" مدینہ اور دمشق کے درمیان ایک مقام کا نام ہے جس کا فاصلہ آجکل مدینہ سے چھ سو دس کلومیٹر حساب کیا گیا ہے۔

۹ھ میں پیغمبر اسلام کو خبر ملی کہ قیصر روم نے یعنی قسطنطنیہ کی مشرقی رومی حکومت نے مدینہ پر حملہ کا حکم دے دیا ہے اور عرب کے عیسائی قبائل بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے لیے پہلا موقع تھا کہ عرب سے باہر کی ایک سب سے بڑی طاقت و شہنشاہی آمادۂ پیکار ہوئی تھی اس لیے ضروری تھا کہ بروقت مدافعت کا پورا سامان کیا جاتا چنانچہ پیغمبر اسلام نے تیاری اور کوچ کا اعلان کر دیا۔

لیکن اگر ایک طرف ضرورت ناگزیر تھی تو دوسری طرف وقت کی ساری باتیں ناموافق ہو رہی تھیں۔ مسلمان چند ماہ پہلے جنگ حنین وطائف کی لڑائی میں چور ہو چکے تھے اور اس سے پہلے فتح مکہ کا معاملہ پیش آچکا تھا پھر اچانک مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور چونکہ مالی وسائل محدود تھے اور باہمی اشتراک و معاونت کی زندگی تھی اس لیے تنگی و عسرت سب پر چھائی ہوئی تھی۔ پھر موسم بڑی ہی گرمی کا تھا اور فصل کاٹنے کا وقت سر پر آگیا تھا نیز سفر ملک کے اندر نہ تھا اس سے باہر مرحلوں کا تھا۔ ان سب باتوں نے مل جل کر مسلمانوں کے لیے بڑی ہی مشکلیں پیدا کر دیں اور قدرتی طور پر ان کے قدم رک رک کر اٹھنے لگے۔ حالت بلاشبہ مجبوری کی تھی، لیکن حب وفاع ملت کی گھڑی آجائے تو اس طرح کی کوئی مجبوری، مجبوری تسلیم نہیں کی جا سکتی اور ادائے فرض کی راہ بہرحال آسانیوں اور راحتوں کی راہ نہیں۔ اس میں مشکلیں اور مصیبتیں جھیلنی ہی پڑیں گی البتہ مصیبتیں عارضی ہوں گی اور نتائج کی کامرانیاں دوامی۔ آیات[۱] میں مسلمانوں کو اسی حقیقت کی تلقین کی گئی ہے

مومنین صادقین کی شان ایثار

مومنین صادقین نے اس دعوت کا کیا جواب دیا اور ساری باتوں کے ناموافق ہونے پر بھی کس جوش و سرگرمی کے ساتھ اٹھے، اس کا جواب تاریخ سے

---

[۱] سورۂ توبہ کی آیت ۴۱ سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے یعنی ساز و سامان کے بوجھ سے ہلکے ہو یا بوجھل، اللہ کی راہ میں جہاد کرو یہی تمہارے لیے بہتر ہے اور بعد کی آیات میں اسی سے متعلق مختلف پہلو پیش کیے گئے ہیں۔

مل سکتا ہے۔ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ تیس ہزار مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کے ساتھ کوچ کیا تھا اور انفاق مال کی فداکاریوں کا یہ حال تھا کہ اگر ایک طرف حضرت عثمانؓ نے نو سو اونٹ پیش کر دیے تھے تو دوسری طرف ابو عقیلؓ انصاری نے رات بھر ایک کھیت میں آبپاشی کر کے دو سیر چھوہارے مزدوری میں حاصل کیے تھے اور وہ لاکر اللہ کے رسول کے قدموں میں رکھ دیے تھے۔

اسی فوجی تیاری کا یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا تھا، حتیٰ کہ کرتے کی گھنڈیاں بھی توڑ کر شامل کر دی تھیں۔ جب اللہ کے رسول نے پوچھا تھا ما ابقیت لاھلك، بیوی بچوں کے لیے کیا چھوڑ آئے! تو اس پیکر صدق و وفا نے جواب دیا تھا: اللہ و رسولہ (اللہ اور اس کا رسول)

چونکہ اس فوج کی تیاری بڑی ہی تنگی و افلاس کی حالت میں ہوئی تھی اس لیے یہ "جیش عسرت" کے نام سے مشہور ہوئی۔

فریضۂ دفاع

آیت ۹۱ (التوبہ[1]) میں بتلا دیا کہ اگر دفاع کے لیے نفیر عام ہو تو کن کن لوگوں کو معذور تصور کیا جا سکتا ہے فرمایا ناتواں آدمی یعنی جو لوگ جسمانی طور پر مجبور رہوں مثلاً بہت بوڑھے، اندھے، اپاہج، دوسرے بیمار، تیسرے ایسے لوگ جو سفر کی لازمی ضروریات کے انتظام کی مقدرت نہ رکھتے ہوں۔

اس عہد میں نہ تو سرکاری فوج وجود میں آئی تھی، نہ رضاکاروں کی کوئی الگ قسم تھی نہ سپاہیوں کے مصارف کے لیے حکومت کا کوئی خزانہ تھا۔ سبھی رضاکار تھے اور سب کے لیے ضروری تھا کہ اپنا خرچ خود ہی اٹھائیں بلکہ بن پڑے تو دوسروں کے لیے بھی خرچ کریں۔ پس فرمایا جو لوگ فی الحقیقت مقدور نہیں رکھتے، کوئی وجہ نہیں کہ ان پر الزام آئے۔ خصوصاً وہ لوگ جن کے ایمان و اخلاص کا یہ حال تھا کہ جب ان کے لیے سواری کا انتظام نہ ہو سکا اور تیرے (رسول اللہ صلعم) ادب و احترام نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ زیادہ اصرار کریں تو خاموش اٹھ کر لوٹ گئے لیکن آنکھیں جو درد دل کی غماز ہیں، خاموش نہ رہ سکیں۔ حسرت و غم کے آنسو بے اختیار بہنے لگے!

زچشم آستیں بردار و اشکم را تماشا کن

البکائین

قرآن کی معجزانہ بلاغت دیکھو۔ پہلے بے مقدوروں کا ذکر ہو چکا تھا لیکن خصوصیت کے ساتھ پھر ان کا ذکر کیا اور ان کی محبت ایمانی کی تصویر کھینچ دی تاکہ نفاق کے مقابلے میں ایمان کا بھی ایک مرقع سامنے آ جائے یعنی

---

[1] یہ آیت مع ترجمہ ذیل میں درج ہے:

لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَی الْمَرْضٰی وَ لَا عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

ناتواں اور بیماروں پر اور ایسے لوگوں پر جنھیں خرچ کے لیے کچھ میسر نہیں۔ کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی خیرخواہی میں کوشاں رہیں۔ نیک عمل لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔ اللہ بڑا بخشنے والا اور رحیم ہے۔

یا تو وہ ہیں کہ قدرت رکھنے پر بھی حیلے بہانے نکالتے ہیں، یا یہ ہیں کہ مقدرت نہ رکھنے پر بھی دل کی لگن چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپک رہی ہے۔

غزوۂ تبوک میں سواریوں کی بڑی قلت تھی۔ اٹھارہ آدمیوں کے حصے میں ایک اونٹ آیا تھا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی ایک جماعت نے جو زادراہ کی مقدرت نہیں رکھتی تھی، پیغمبر اسلام صلعم سے عرض کیا، ہمارے لیے سواری کا بندوبست کر دیجیے۔ آپ نے کہا، کہاں سے کروں؛ کوئی سامان نہیں پاتا۔ اس پر وہ روتے ہوئے چلے گئے اور ان کے درد و غم کا یہ حال تھا کہ "البکائین" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ یعنی بہت رونے والے (ابن جریر)۔

سبحان اللہ! ان چند آنسوؤں کی قدر و قیمت جو ایمان کی تپش سے بہے تھے کہ ہمیشہ کے لیے ان کا ذکر کتاب اللہ نے محفوظ کر دیا۔ آج بھی کہ تیرہ صدیاں گزر چکی ہیں، ممکن نہیں، ایک مومن یہ آیت پڑھے اور ان آنسوؤں کی یاد میں خود اس کی آنکھیں بھی اشک بار نہ ہو جائیں[1]۔

اداے فرض کے تقاضے

آیت ۹۳ (التوبہ) میں فرمایا[2]، اداے فرض کے وقت عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہنا ایک ایسی نامرادی کی بات ہے جسے خوددار آدمی گوارا نہیں کر سکتا لیکن انھوں نے یہ بھی گوارا کر لیا کیونکہ جہل و بے حسی کی انتہائی حالت ان پر طاری ہو گئی تھی۔ اس حالت کو جو انتہا درجہ غفلت و انکار کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، قرآن مُہر لگا دینے سے تعبیر کرتا ہے۔

قرآن کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانین و اسباب سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں، انھیں براہ راست خدا کی طرف نسبت دیتا ہے۔ مثلاً اس کا قانون یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھ بوجھ سے کام لینے کی جگہ اپنے بڑے بوڑھوں کی تقلید کرنے لگتے ہیں اور اسی پر اڑے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی عقلیں ماری جاتی ہیں اور سمجھ بالکل الٹی ہو جاتی ہے کتنی ہی صاف بات کہی جائے ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کتنی ہی ان کی بھلائی چاہو وہ اور زیادہ مخالفت کریں گے۔ قرآن اس

---

[1] ان اصحاب میں سات کے نام "جوامع السیرت" میں درج ہوئے ہیں:

۱۔ سالم بن عُمیر ۲۔ عُلبہ بن زید ۳۔ ابولیلیٰ عبدالرحمٰن بن کعب ۴۔ عمرو بن الحمام ۵۔ عبداللہ بن المغفل ۶۔ ہرمیؓ بن عبداللہ۔ ۷۔ عرباض بن ساریۃ الفزاری۔ بعض نے عبداللہ بن المغفل کی جگہ عبداللہ بن عمرو المزنی کا ذکر کیا ہے۔ (جوامع السیرت ص ۲۵۰)

[2] اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

الزام تو دراصل ان پر ہے، جو تجھ سے اجازت مانگتے ہیں حالانکہ مالدار ہیں۔ انھوں نے پسند کیا کہ گھروں میں رہ جانیوالی عورتوں کے ساتھ رہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی۔ پس جانتے بوجھتے نہیں۔

حالت کو یوں تعبیر کرے گا کہ خدا نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی یعنی یہ صورت حال خدا کے مقرر کیے اور ٹھہرائے ہوئے قانون کا قدرتی نتیجہ ہے[1]۔

جماعتی زندگی کے لیے ایک بڑا مہلکہ

اس سے معلوم ہوا کہ جماعتی زندگی کے لیے مذبذب اور کچے دل کے آدمیوں کی موجودگی ایک بڑا مہلکہ ہے۔ خصوصاً جب قوم موت و حیات کی جدوجہد میں مشغول ہو..... حتی الامکان ایسے افراد کی موجودگی برداشت نہیں کرنی چاہیے اور ایسا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی علیحدگی سے جو عارضی شور و شغب ہو گا وہ جماعتی مصالح کے لیے مضر ہو گا..... جب انسان میں سچائی باقی نہیں رہتی تو نیکی و پرہیزگاری کے خیال کو خود نیکی و پرہیزگاری کے خلاف استعمال کرنے لگتا ہے اور اس سے حیلے بہانے کا کام نکالتا ہے اور یہ نفاق کا سب سے زیادہ پرفریب حربہ ہے..... آیت (۴۹) میں فرمایا؛ بعض منافق کہتے ہیں اس سفر میں نکلنا فتنوں میں پڑنا ہے[2]..... ان کا مقصود کیا تھا؛ اسے اس لیے بیان نہیں کیا کہ صریحی قرائن واضح کر رہے ہیں اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔ وہ یقیناً ہر طرح کے متوقع اور وہمی خطرات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہوں گے اور اسے فتنے سے تعبیر کرتے ہوں مثلاً؛

۱- اس موسم میں ہزاروں آدمیوں کو اس قدر دور سفر پر لے جانا جان بوجھ کر انھیں ہلاک کرنا ہے اور یہ نیکی کا کام نہیں۔

۲- پھر جہاں جانا ہے، وہ دوسروں کا ملک ہے، نہیں معلوم کن کن برائیوں میں پڑنا پڑے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے تبوک کا ارادہ کیا تو منافقوں کے ایک سردار جد بن قیس نے کہا؛ میں عورتوں کے معاملے میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہیں بنو اصفر (یعنی رومی) عورتیں دیکھ کر مفتون نہ ہو جاؤں۔ پس مجھے رہ جانے کی اجازت دے دیجیے اور اس فتنے میں نہ ڈالیے۔

منافقوں کا بیان

اب آیت ۴۲ (التوبہ) سے سلسلۂ بیان منافقوں کی طرف متوجہ ہوا ہے جن کے لیے غزوۂ تبوک کا معاملہ ایک آخری اور فیصلہ کن آزمائش ثابت ہوا تھا۔ اس نے تظاہر و نمائش کے تمام پردے چاک کر دیے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اس سورت کو (سورۂ توبہ کو) "الفاضحہ" کے نام سے بھی پکارتے تھے کیونکہ اس نے منافقوں کے بھید کھول کر ان کی فضیحت کر دی۔

منافقوں کی نسبت سورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۹[3] میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ انھیں مومنوں سے ممتاز کر کے آشکار

---

[1] دیکھیے آیت ۹۳ کا آخری حصہ۔

[2] وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ۔ (توبہ ۴۹) — اور ان منافقوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے مجھے فتنے میں نہ ڈالیے..... الخ

[3] مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ — ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ ایمان والوں کو اسی حالت میں چھوڑ رکھے

(باقی اگلے صفحہ پر)

کر دے گا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ایسے مرحلے پیش آتے رہے، جن میں نفاق کے چہروں کو بے نقاب ہونا پڑا۔
اس سلسلے کا آخری مرحلہ غزوۂ تبوک تھا۔

پڑھ چکے ہو کہ اس موقع پر ناموافق حالات سے عام مسلمانوں کی سرگرمیاں بھی ابتدا میں کچھ دھیمی رہی تھیں، لیکن منافقوں کی حالت بالکل دوسری تھی۔ یہ حکم ان کے لیے پیام موت سے بھی زیادہ سخت ہوا۔ لگے حیلے بہانے کرنے۔ ہر شخص ایک نیا بہانہ گھڑ کر لاتا اور کہتا، ویسے تو مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ فلاں کام ناگزیر ہو گیا ہے، فلاں بات ناقابل حل ہو رہی ہے، فلاں الجھاؤ سلجھایا نہیں جا سکتا۔ اب جیسا آپ کا حکم ہو۔ مقصود یہ تھا کہ جھوٹی سچی مجبوریاں سنائیں گے تو پیغمبر اسلام کا اخلاق ایسا نہیں کہ کسی کو مجبور کر کے لے جانا چاہیں۔ ان کی رحمت و رافت ہمیشہ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتی ہے وہ کہیں گے کہ مجبور ہو تو نہ چلو۔

چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ پیغمبر اسلام ان کے حیلے بہانے سنتے اور یہ دیکھ کر کہ بخوشی چلنے کے لیے تیار نہیں، کہہ دیتے اچھا تمہیں رخصت ہے۔

ان میں سے بعض نے بات بنانے کے لیے یہ بھی کہا کہ مال حاضر ہے، لے لیجیے، مگر نکلنا دشوار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں انھی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرمایا، اگر کوئی ایسی بات ہوتی کہ فوراً فائدہ دکھائی دیتا اور سفر بھی دور کا نہ ہوتا تو ان کے نفاق کو چھپنے کی آڑ مل جاتی جیسے بار بار مل چکی ہے۔ یہ فوراً تیرے پیچھے قدم اٹھا دیتے۔ ظاہر میں حکم کی تعمیل کرتے۔ دل میں دنیا کی طمع اور مکر و غدر کی چالیں ہوتیں۔ چنانچہ احد وغیرہ میں ایسا ہی کیا تھا مگر انھیں مشکل یہ آ پڑی کہ معاملہ نکل آیا عرب سے باہر دور دراز کا اور سفر کی مشقتیں ہُوئیں بڑی ہی سخت۔ نہ تو دنیا کے نفع قریب کی توقع، نہ قرب مقام کی سہولت کا سہارا۔ پس بے بس ہو کر رہ گئے اور دکھاوے کے لیے ساتھ نہ نکل سکے۔ اللہ کی طرف سے یہی فیصلہ کن آزمایش تھی جس نے سارا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا اور جب کبھی راہ حق میں کوئی سخت آزمایش آ جاتی ہے تو منافقوں کے چہرے اسی طرح بے نقاب ہو جایا کرتے ہیں۔

آیت ۴۳ (التوبہ [۱]) کے اسلوب بیان پر غور کرو، کیسے دلکش اور پُر محبت انداز میں پیغمبر اسلام کو تنبیہ کی ہے کہ رحمت و درگزر کی ایک حد ہونی چاہیے۔ اب یہ اس کے مستحق نہیں کہ رسی اتنی ڈھیلی چھوڑ دی جائے۔

(بقیہ حاشیہ ص۵۱۵)

حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ۔ (آل عمران ۳: ۱۷۹)
وہ ضرور ایسا کرے گا کہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔

[۱] عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْکٰذِبِیْنَ۔
اے پیغمبر اللہ تجھے معاف کرے تو نے ایسا کیوں کیا کہ انھیں رخصت دے دی۔ اس وقت تک رخصت نہ دی ہوتی کہ تجھ پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں اور تو معلوم کر لیتا کہ کون جھوٹے ہیں۔

منافقوں کی خوش خیالیاں

فرمایا: جب یہ لوگ ایک طرف تو جھوٹے عذر سناتے تھے، دوسری طرف یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ جو آپ کا حکم ہو تو بہتر تھا کہ تم انھیں پوری آزمایش میں ڈال دیتے، یعنی کہتے میرا حکم تو یہی ہے کہ چلنا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ کھل جاتا، کون یہ کہنے میں سچے تھے، کون ایسا کہہ دینے پر بھی نہ نکلنے والے تھے۔

آیت ۴۴ (التوبہ) میں فرمایا: جن کے دلوں میں ایمان کی لگن ہے بھلا وہ ایک ایسے کام میں کیوں حکم ماننے لگے؛ اور کیوں اس کے انتظار میں بیٹھنے لگے؟ ان کے لیے تو صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ادائے فرض کا وقت آگیا اور جسے ایمان عزیز ہے وہ ادائے فرض کے لیے مستعد ہو جائے۔ حکم تو وہی مانگیں گے، جن کے دلوں میں سچا ایمان نہیں اور جو شک کے روگی ہو رہے ہیں تاکہ کوئی نہ کوئی راہ نکل بھاگنے کی مل جائے۔

چونکہ مقابلہ بیزنطینی شہنشاہی سے تھا جو مشرق میں رومۃ الکبریٰ کی عظمت کی جانشین تھی اور ابھی حال میں ایران کو شکست دے چکی تھی۔ اس لیے منافقوں کو یقین تھا، مسلمانوں کے خاتمے کے دن آگئے۔ عبداللہ بن ابی سلول نے جو منافقوں کا سرغنہ تھا، لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ پیغمبر اسلام اس سفر سے لوٹنے والے نہیں۔

آیت ۴۷ (التوبہ) میں فرمایا: یہ سمجھے، پیچھے رہ کر مصیبت سے بچے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا نہ نکلنا ہی تمھارے لیے بہتر ہوا کیونکہ نکلتے تو فتنوں کے گھوڑے دوڑاتے اور کچے دل کے آدمیوں کو بہکاتے رہتے۔ اس سے پہلی آیت میں فرمایا: "مگر اللہ کے حضور ان کا اٹھنا ناپسند ہوا" یعنی اللہ کے علم میں تھا کہ اب کے نہیں نکلیں گے اور اللہ نے تمھارے لیے اسی میں بہتری دیکھی کہ نہ نکلیں۔

حبِ ایمانی اور حبِ غیر ایمانی

سورۂ توبہ کی آیت (۲۴)[۱] مہمات مواعظ میں سے ہے اور اس باب میں قطعی ہے کہ اگر حبِ ایمانی اور حبِ غیر ایمانی میں مقابلہ ہو جائے تو مومن وُہ ہے جس کی

۱؎ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔

اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھاری برادری، تمھارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمھاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو، تمھارے رہنے کے مکانات جو تمھیں اس قدر پسند ہیں، یہ ساری چیزیں تمھیں اللہ سے، اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وُہ تمھارے سامنے لے آئے اور اللہ منافقوں پر کامیابی وسعادت کی راہ نہیں کھولتا۔

حبِ ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت اور علاقہ بھی غالب نہ آ سکے۔ یہاں آٹھ چیزوں کا ذکر کیا۔ غور کرو گے تو ایک متمدن زندگی کے تمام علائق ان میں آ گئے نیز جس ترتیب سے ذکر کیا ہے علائق کی گہرائیوں کی قدرتی ترتیب یہی ہے۔

فرمایا انسان کی مدنی زندگی کی الفتوں کے بڑے رشتے یہی ہیں اور اپنی جگہ سب مطلوب و ضروری ہیں لیکن اگر حبِ ایمانی میں اور ان میں مقابلہ ہو جائے تو مومن وہ ہے جس پر ان تمام الفتوں میں سے کسی الفت کا بھی جادو چل نہ سکے اور کوئی علاقہ بھی اسے اتباعِ حق سے روک نہ سکے۔

غور کرو قرآن فطرتِ انسانی کی کمزوریوں کا کس طرح کھوج لگاتا ہے۔ فرمایا، تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا ڈر تمہیں لگا رہتا ہے، یعنی عزائم و مقاصد کی راہ میں جب کبھی قدم اٹھایا جائے گا تو ناگزیر ہے کہ صورتِ حال میں انقلاب ہو اور جب انقلاب ہوگا خواہ جنگ کی صورت میں ہو خواہ کسی دوسری صورت میں تو عارضی طور پر کاروبار ضرور بگڑے گا مال و جائداد کے لیے خطرے ضرور پیدا ہوں گے اور یہی بات مال و دولت کے پرستاروں پر شاق گزرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں، ہمارا کاروبار خراب ہو جائے گا اور نہیں جانتے کہ اگر راہِ حق میں استقامت دکھائیں تو جو کچھ خراب ہوگا تھوڑا ہوگا۔ پھر جو کچھ بنے گا وہ بہت زیادہ ہوگا۔ و ان اللہ عندہ اجرٌ عظیم۔

حبِ ایمانی کی اس آزمائش میں صحابہ کرام جس طرح پورے اترے، اس کی شہادت تاریخ نے محفوظ کر لی ہے اور محتاجِ بیان نہیں۔ بلا شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے کسی انسان کے ساتھ اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح سے ایسا عشق نہیں کیا ہوگا، جیسا صحابہ نے اللہ کے رسول سے راہِ حق میں کیا۔ انھوں نے اس محبت کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا جو انسان کر سکتا ہے پھر اسی راہ سے وہ سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پا سکتی ہے۔

تابش

غزوۂ تبوک

—(۲)—

پیچھے رہ جانے والے تین صحابی

جنگ تبوک کے سلسلے میں جہاں منافقین کے لیے کڑے امتحان کا موقع پیش آگیا تھا وہاں تین نہایت مخلص اور جلیل القدر صحابی بھی صرف وقتی سستی اور کاہلی کی بنا پر شرکت سے محروم رہ گئے اور انھیں بھی آزمایش کی ایک سخت منزل سے گزرنا پڑا۔ یہ کعبؓ بن مالک، ہلالؓ بن امیہ اور مرارہؓ بن ربیع تھے۔ ان تینوں کے جو حالات مولاناؒ نے بیان فرمائے ان میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں کیونکہ واقعات کا کوئی قابل توجہ پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

آیت ۱۱۸ (التوبہ[1]) میں ان لوگوں کو قبولیت توبہ کی بشارت دی ہے جن سے غزوہ تبوک کی طیاریوں میں کوتاہی ہوئی تھی اور جن کی نسبت آیت ۱۰۲ (التوبہ) میں فرمایا تھا کہ انھیں رحمت الٰہی کا امیدوار رہنا چاہیے چونکہ قبولیت کا مقتضا یہ تھا کہ ان کے دلوں کے زخم دھوئے جائیں اور رحمت و اکرام کے مرہموں سے تسکین پائیں اس لیے پیرایہ بیان ایسا اختیار کیا گیا کہ ان کے سارے دکھوں کا مداوا ہوگیا۔ انھوں نے اس لغزش کی وجہ سے اپنی اصل جگہ

---

[1] وہ آیت جس میں تین صحابیوں کی معافی کا ذکر ہے۔ یہ تبوک میں صرف تساہل کے باعث شریک نہ ہو سکے۔ رسول اللہ صلعم واپس تشریف لائے تو اپنی کوتاہی کا صاف اعتراف کرلیا تھا۔ تفصیل اصل مضمون سے واضح ہوجائے گی۔ آیت کا متن مع ترجمہ ذیل میں درج ہے:

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

اور اس طرح ان تین شخصوں پر بھی خدا کی رحمت لوٹ آئی جو معلق حالت میں چھوڑ دیے گئے تھے زمین اپنی ساری وسعت پر ان کے لیے تنگ ہوگئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آگئے تھے اور وہ جان گئے تھے کہ اللہ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی مگر اسی کے دامن میں پس اللہ اپنی رحمت سے ان پر لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحمت والا ہے۔

گئی تھی، یعنی جن مقبولوں کے ساتھ ان کا شمار تھا، ان کی صف سے باہر ہو گئے تھے۔ پس قبولیت توبہ کا مژدہ سنایا گیا تو اس طرح کہ پہلے خود پیغمبر اسلامؐ کا نام آیا پھر مہاجرین و انصار کا پھر انھی کے ضمن میں ان لوگوں کا بھی ذکر کر دیا گیا اور رحمت الٰہی کی توجہ یکساں طور پر سب کے لیے کی گئی تاکہ اب کوئی اس حلقہ سے باہر نہ رہے۔ جن سے قصور ہوا تھا، وہ بھی محسوس کرنے لگیں کہ رحمت و قبولیت کی ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں:

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست

کہ سلطانِ جہاں با ماست امروز

توبہ کے معنی رجوع ہونے اور لوٹنے کے ہیں۔ اللہ کا اپنی رحمت کے ساتھ لوٹنا، کاملوں کے لیے یہ ہے کہ مزید رحمت و اکرام ہو، قصور مندوں کے لیے یہ کہ قبولیت و مغفرت ہو۔

قبول توبہ کی بشارت

اس کے بعد فرمایا، ان تین آدمیوں کی بھی توبہ قبول ہو گئی جن کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا یعنی جن کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا اور پیغمبر اسلام نے فرمایا تھا، حکم الٰہی کا انتظار کرو (چنانچہ آیت ۱۰۶ التوبہ) میں انھی کی نسبت گزر چکا ہے کہ حکم الٰہی کے انتظار میں رہیں۔

یہ تین شخص کعبؓ بن مالک، ہلالؓ بن امیہ اور مرارہؓ بن ربیع تھے۔ کعبؓ بن مالک ان تہتر سابقین انصار میں سے ہیں جنھوں نے عقبہ ثانیہ میں بیعت کی تھی اور ہلالؓ بن امیہ اور مرارہؓ بن ربیع دونوں بدری تھے یعنی ان جاں نثاروں میں سے جنھوں نے جنگِ بدر میں شرکت کی تھی۔

ان تینوں سے بھی غزوۂ تبوک میں کوتاہی ہوئی اور شریک نہ ہوئے لیکن جب آنحضرتؐ واپس تشریف لائے اور ساتھ نہ دینے والے اپنے اپنے عذر پیش کر کے معافی مانگنے لگے تو انھوں نے کوئی خاص عذر پیش نہیں کیا اور صاف صاف تسلیم کر لیا کہ ہماری سستی اور کاہلی تھی کہ اس سعادت سے محروم رہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: حکم الٰہی کا انتظار کرو۔ پھر تمام مسلمانوں کو حتیٰ کہ ان کی بیویوں کو بھی حکم ہوا کہ ان سے ملنے جلنے کے تمام تعلقات منقطع کر لو۔ چنانچہ اچانک انھوں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ مدینہ اور اطراف مدینہ کی پوری آبادی نے ان کی طرف سے رُخ پھیر لیا تھا۔ ان کے عزیز و قریب تک ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے تھے۔ آخر جب پورے پچاس دن اس حالت میں گزر گئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں قبولیت توبہ کی بشارت ملی۔

کعبؓ بن مالک کا بیان

ان تین صحابیوں میں سے حضرت کعبؓ بن مالک نے خود اپنی سرگزشت تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے تمام جنگوں میں رسول اللہ کے ساتھ شرکت کی اور اس موقع پر بھی نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن ایک کے بعد ایک دن نکلتے گئے اور میں اسی خیال میں رہا کہ اپنے معاملات نپٹا لوں تو نکلوں۔

یہاں تک کہ آج کل ہوتے ہوتے پورا وقت نکل گیا صاحت تنے میں خبر اڑی کہ آنحضرت صلعم واپس آرہے ہیں۔ تب میری آنکھیں کھلیں، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آپ حسب معمول پہلے مسجد میں تشریف لائے اور جو لوگ کوچ میں شریک نہیں ہوئے تھے، وہ آ آ کر معذرتیں کرنے لگے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی سچائی کا یقین دلانے لگے۔ یہ کچھ اوپر اسّی آدمی تھے۔ انھوں نے جو کچھ ظاہر کیا آنحضرت صلعم نے قبول کر لیا اور ان کے دلوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ جب میری طرف متوجہ ہوئے تو مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کوئی جھوٹی معذرت بنا کر کہہ دیتا۔ جو کچھ سچی بات تھی، صاف صاف عرض کر دی آپؐ نے سن کر فرمایا: اچھا جاؤ اور انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا اور بھی کسی کو ایسا حکم ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں مرارہؓ بن ربیع اور ہلالؓ بن امیہ کو۔

گفتگو کی ممانعت

اس کے بعد جب آنحضرتؐ کا حکم ہوا کہ ہم تینوں سے کوئی بات چیت نہ کرے تو سب نے منہ پھیر لیا۔ اچانک دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ گویا کل تک جس دنیا میں تھا اب وہ دنیا ہی نہیں رہی تھی۔ میرے دونوں شریک اپنا گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہے تھے لیکن میں سخت جان تھا۔ اس حالت میں بھی روز گھر سے نکلتا، مسجد میں حاضری دیتا۔ جماعت میں شریک ہوتا پھر ایک گوشہ میں سب سے الگ بیٹھ جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نماز کے بعد قریب جا کر سلام عرض کرتا پھر اپنے جی میں کہتا، دیکھوں سلام کے جواب میں آپ کے لبوں کو حرکت ہوتی ہے یا نہیں؟ آپ گوشۂ چشم سے کبھی کبھی دیکھ لیتے لیکن جب میری نگاہِ حسرت اٹھتی تو رُخ پھر جاتا:

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
وہ جو وقتِ ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں ہے

چچیرے بھائی کا جواب

ایک دن شہر سے باہر نکلا تو ابو قتادہؓ کے باغ تک پہنچ گیا۔ یہ میرا چچیرا بھائی تھا اور میں تمام عزیزوں میں اسے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ میں نے سلام کیا، مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے کہا: ابو قتادہ! کیا تم نہیں جانتے کہ میں مسلمان ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں؟ اس پر بھی اس نے میری طرف رُخ نہ کیا لیکن جب میں نے یہی بات بار بار دہرائی تو صرف اتنا کہا: اللہ و رسولہ اعلم۔ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ تب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

ایک اور آزمایش

وہاں سے واپس ہوا تو راستے میں شام کا ایک نبطی مل گیا۔ وہ لوگوں سے کہہ رہا تھا: کوئی ہے جو کعبؓ بن مالک تک پہنچا دے؟ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا تو اس نے بادشاہ غسان کا ایک خط نکال کر میرے حوالے کیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے، تمھارے آقا نے تم پر سختی کی ہے تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم تمھاری قدر و منزلت کریں گے۔ خط پڑھ کر میں نے کہا: یہ ایک نئی مصیبت

آئی، گویا پچھلی بلائیں کافی نہ تھیں۔

بیویوں سے علیحدگی

جب اس حالت پر چالیس راتیں گزر چکیں تو آنحضرت صلعم کی جانب سے ایک آدمی آیا اور کہا، حکم ہوا ہے تم اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ۔ میں نے کہا، طلاق دے دوں؟ کہا؛ نہیں، صرف علیحدگی کا حکم ہے۔ ہلالؓ اور مرارہؓ کو بھی ایسا ہی حکم ہوا ہے۔ اس پر میں نے اپنی بیوی کو میکے بھجوا دیا۔

جب دس دن اور گزر گئے تو پچاسویں رات پر صبح آئی۔ میں اپنے مکان کی چھت پر نماز پڑھ کر بیٹھا تھا اور ٹھیک ٹھیک وہی حالت تھی جس کی تصویر اللہ کے کلام نے کھینچ دی ہے۔ زندگی سے تنگ آگیا تھا اور خدا کی زمین اپنی ساری پہنائیوں پر میرے لیے تنگ ہو گئی تھی۔

جوق در جوق مبارک باد

اچانک کیا سُنتا ہوں، کوئی آدمی کوہ سلع پر سے پکار رہا ہے "کعبؓ بن مالک! بشارت ہو تمہاری توبہ قبول ہو گئی"!

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شب قدر کہ ایں "تازہ براتم دادند

اب لوگ جوق جوق مجھے مبارک باد دینے کے لیے دوڑے۔ ایک آدمی گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا لیکن بشارت کی آواز اس سے بھی زیادہ تیز ثابت ہوئی تھی۔ میں مسجد میں حاضر ہوا تو آنحضرت صلعم لوگوں کے حلقہ میں بیٹھے تھے۔ آنحضرتؐ کا قاعدہ تھا کہ جب خوش ہوتے چہرہ مبارک چمکنے لگتا، جیسے چاند کا ٹکڑا ہو۔ ہم لوگوں کو یہ بات معلوم تھی؛ اس لیے ہمیشہ آپؐ کے چہرے پر نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیکھا اس وقت بھی چہرہ مبارک چمک رہا تھا۔ فرمایا؛ کعبؓ تجھے آج اس دن کے ورود کی بشارت دیتا ہوں جو تیری زندگی کا سب سے بہتر دن ہے۔ میں نے عرض کیا، یہ بات آپ کی جانب سے ہوئی یا اللہ کی وحی سے۔ فرمایا: "اللہ کی وحی سے۔" (صحیحین)

چند روشن حقیقتیں

امام احمد بن منبل کی نسبت منقول ہے کہ قرآن کی کوئی آیت انھیں اس قدر نہیں رلاتی تھی جس قدر یہ آیت اور کعبؓ بن مالک کی روایت۔ اس سے معلوم ہوا کہ؛

۱۔ خدمت حق میں تساہل ایک مومن کے لیے سخت جرم ہے کہ ایسے مخلص اور مقبول صحابی بھی اس درجہ سرزنش کے مستحق ہوئے اور تمام مسلمانوں کو ان سے قطع علایق کا حکم دیا گیا۔

۲۔ مسلمانوں کی اطاعت و امتثال کا کیا حال تھا کہ جونہی انقطاع علایق کا حکم ہوا، تمام شہر نے بہ یک دفعہ رُخ پھیر لیا۔ چوری چھپے بھی کسی نے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی حتیٰ کہ ان کے محبوب سے محبوب عزیزوں کو بھی یہ خیال نہ گزرا کہ ایک لمحہ کے لیے اس پر عمل نہ کریں یا کم از کم تعمیل میں نرمی و تساہل سے کام لیں۔ ابو قتادہؓ

کا حال خود حضرت کعبؓ کی زبان سے سُن چکے ہو۔ جب انھوں نے کہا تم تو اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ سچا مسلمان ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں۔ پھر مجھ سے رخ کیوں پھیر لیا ہے؟ تو ابو قتادہؓ نے صرف یہی کہا کہ اللہ و رسولہ اعلم۔ ان تین لفظوں میں اس عہد کے مسلمانوں کی ذہنیت کی پوری تصویر اتر آئی ہے۔ یعنی مجھے معلوم تو سب کچھ ہے۔ جانتا ہوں کہ تم پکے مسلمان ہو لیکن اپنے جاننے کو کیا کروں؟ جاننا تو اللہ اور اس کے رسول (صلعم) کا ہے اور اس کا حکم یہی ہے کہ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں۔

۳۔ پھر اس اطاعت کے لیے نہ تو کوئی مادی قوت کام میں لائی گئی تھی، نہ عمال حکومت کا ڈر تھا، نہ قانون و عدالت کا۔ صرف ایک شخص کے لبوں نے حرکت کی تھی اور اتنی بات سب کو معلوم ہو گئی تھی کہ اس کی مرضی یہی ہے، بس اتنی بات کا معلوم ہو جانا اس کے لیے کافی تھا کہ سب کے دل مجسم اطاعت و امتثال بن جائیں۔

۴۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ مسلمانوں کی باہمی اخوت و محبت کا کیا حال تھا۔ اس سختی کے ساتھ حکم کی تعمیل تو سب نے کی، لیکن ساتھ ہی ان کی مصیبت کے غم سے کوئی دل خالی بھی نہ تھا۔ سب کے دلوں کو لگی تھی کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے۔ جونہی قبولیت کا اعلان ہوا ایک پر ایک دوڑنے لگا کہ ان سختی کشانِ عشق کو سب سے پہلے میری زبانی مژدۂ قبولیت ملے۔ کوہِ سلع پر سے جس نے پکار کر سب سے پہلے بشارت سنائی تھی، حضرت کعبؓ نے گو اس کا نام نہیں لیا، لیکن وہ حضرت ابوبکرؓ تھے۔

قبول معذرت

آیت ۱۰۲ سے لے کر ۱۰۶ (التوبہ) تک ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اگرچہ اس موقع پر کوتاہی کی تھی، لیکن اس کا سبب نفاق نہ تھا۔ سستی اور کاہلی تھی۔ پیغمبر اسلام صلعم جب سفر سے واپس آئے تو ان میں سے ہر شخص سچائی کے ساتھ اپنی غفلت پر منفعل ہوا اور کوئی نہ تھا جس کا دل حسرت و ندامت کے زخموں سے چور نہ ہو رہا ہو۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی کیونکہ اس کی بخشش و رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو سکتا۔ شرط صرف یہ ہے کہ خود ہم اپنے دلوں کا دروازہ اپنے ہاتھوں سے بند نہ کر لیں؛

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی، ورنہ صدا

درِ قبول تو اس آرزو میں باز رہا!

فرمایا؛ انھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور ان کا اعتراف دل کا اعتراف ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ان کی توبہ قبول نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں اصل کار گناہوں کا سچا اعتراف ہے اور جو سر اعتراف ذنوب میں جھک گیا پھر اس کے لیے محرومی نہیں ہو سکتی؛

کہ مستحقِ کرامت گناہ گارانند

اس سے پہلے حکم گزر چکا ہے کہ منافقوں کی خیرات قبول نہ کرو اور ان کی بخشش کے لیے دعا کرو۔ یہاں فرمایا، ح۔

لوگوں نے اپنی خطاؤں کا اقرار کر لیا اور تائب ہو گئے، وہ جو کچھ راہ حق میں نکالیں، اسے قبول کر لو اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔ تمہاری دعا ان کے دلوں کے لیے جو حسرت و ندامت سے زخمی ہو رہے ہیں، راحت و سکون کا مرہم ثابت ہوگی۔

نیز فرمایا، تم اس ذریعے سے انھیں مطہر اور مزکّی کر دو گے یعنی خیرات و زکوٰۃ کا نکالنا اور اس کا قبول ہونا ایک ایسا معاملہ ہے جو نفس کی پاکی و تربیت کا باعث ہوتا ہے۔ (مولاناؒ)

باب ۲۷

خطبۂ تبوک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبے ارشاد فرمائے، ان میں سے ایک نہایت اہم خطبہ مبارکہ وہ ہے جو ایک نماز کے بعد تبوک میں ارشاد فرمایا۔ دیکھیے چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں لیکن ہر فقرہ نیکی، ہدایت اور حکمت کا ایک دریا ہے جو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ میں نے یہ خطبہ حافظ ابن قیمؒ کی کتاب "زاد المعاد" (جلد دوم صفحہ ۷) سے لیا ہے اور ہر فقرے کو اس لیے الگ الگ کر رکھا ہے کہ اس پر خوب غور و خوض کیا جا سکے۔ نیز علم نبوت کے ان گوہر پاروں کو یاد کر لینے میں سہولت رہے۔ ہر فقرے کا ترجمہ بالمقابل درج کر دیا ہے۔ قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری نے بھی یہ خطبہ "رحمۃ للعالمین" کی جلد اول میں شامل کر لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی زیبا حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

۱۔ فان اصدق الحدیث کتاب اللہ۔ — صدق و راستی میں سب سے بڑھا ہوا مجموعۂ کلام اللہ کی کتاب ہے۔

۲۔ و اوثق العری کلمۃ التقوی۔ — بھروسے کی چیز کلمہ تقویٰ ہے۔

۳۔ وخیر الملل ملۃ ابراھیم۔ — تمام ملتوں سے بہتر ملت ابراہیم علیہ السلام کی ہے (ملت ابراہیم حنیفا)

۴۔ و خیر السنن سنۃ محمدؐ۔ — تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے۔

۵۔ و اشرف الحدیث ذکر اللہ۔ — تمام باتوں پر اللہ تعالیٰ کے ذکر کو شرف و برتری حاصل ہے۔

۶۔ واحسن القصص ھذا القرآن۔ — تمام بیانات سے پاکیزہ ترین اور خوب ترین بیان قرآن مجید ہے۔

۷۔ وخیر الامور عوازمھا۔ — بہترین کام عزیمت کے کام ہیں۔

۸۔ و شر الامور محدثاتھا۔ — بدترین امور محدثات و بدعات ہیں۔

۹۔ واحسن الھدی ھدی الانبیاء۔ — بہترین ہدایت انبیا کی ہدایت ہے۔

۱۰۔ واشرف الموت قتل الشھدا۔ — بہترین موت راہ حق کے شہیدوں کی موت ہے۔

۱۱۔ و اعمی العمی، الضلالۃ بعد الھدی۔ — سب سے بڑھ کر بے بصارتی اور کوری، وہ گمراہی ہے جو

انسان ہدایت پالینے کے بعد اختیار کرے۔

۱۲۔ وخیر الاعمال ما نفع۔
بہترین اعمال وہ ہیں جن سے انسان کو دینی، اخلاقی اور روحانی نفع حاصل ہو۔

۱۳۔ وخیر الھدی ما اتبع۔
بہترین ہدایت وہ ہے جس کی پیروی کی جاسکے۔

۱۴۔ وشر العمی، عمی القلب۔
بدترین اندھا پن دل کا اندھا پن ہے۔

۱۵۔ وید العلیا خیرٌ من ید السفلیٰ۔
بلند ہاتھ پست ہاتھ سے بہتر ہے۔

۱۶۔ وما قل وکفیٰ خیرٌ مما کثر والھیٰ۔
تھوڑا مال جو جائز ضرورتوں کے لیے کفایت کرسکے اس کثیر مال سے بہتر ہے جو انسان کو غفلت میں ڈال دے۔

۱۷۔ وشر المعذرۃ حین یحضر الموت۔
بدترین عذر خواہی اور توبہ وہ ہے جو جانکنی کے وقت کی جائے۔

۱۸۔ وشر الندامۃ یوم القیامۃ۔
بدترین ندامت و شرمساری وہ ہے جو قیامت کے دن ہوگی۔

۱۹۔ ومن الناس من لا یاتی الجمعۃ الا دبراً۔
بعض لوگ جمعہ کے لیے آتے ہیں مگر ان کے دل پیچھے لگے ہوتے ہیں۔

۲۰۔ ومن لا یذکر الا ھجرا۔
بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو کبھی کبھی یاد کرتے ہیں۔

۲۱۔ ومن اعظم الخطایا اللسان الکذب۔
گناہوں میں سے عظیم تر جھوٹی زبان ہے۔

۲۲۔ وخیر الغنیٰ غنی النفس۔
بہترین تونگری دل کی تونگری ہے[1]

۲۳۔ وخیر الزاد التقویٰ۔
انسان کے لیے بہترین توشہ تقویٰ ہے۔

۲۴۔ وراس الحکم مخافۃ اللہ عزوجل۔
دانائیوں کا تاج خدائے عزوجل کا خوف ہے۔

۲۵۔ وخیر ما وقر فی القلوب الیقین۔
دل نشینی کے لیے بہترین شے یقین ہے۔

۲۶۔ والارتیاب من الکفر۔
شک و ریب کفر کی ایک شاخ ہے۔

۲۷۔ والنیاحہ ... عمل الجاھلیۃ۔
مردے پر نوحہ کرنا یعنی بین کر کے رونا جاہلیت کا کام ہے۔

۲۸۔ والغلول من حر جھنم۔
خیانت دوزخ کی آگ ہے۔

---

[1] تونگری بہ دل است نہ بہ مال (سعدی)

۲۹- والسکر کیٌ من النار۔ — نشہ آگ کا داغ ہے۔

۳۰- والشعر من ابلیس۔ — شعر گوئی شیطانی کام ہے۔

۳۱- والخمر جماع الاثم۔ — شراب گناہوں کا مجموعہ ہے۔

۳۲- وشر الماکل مال الیتیم۔ — یتیم کا مال کھانا بدترین روزی ہے۔

۳۳- والسعید من وعظ بغیرہ۔ — سعادت مند وہ ہے جو دوسرے سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔

۳۴- والشقی من شقی فی بطن امہ۔ — اصل بدبخت وہ ہے جو ماں کے پیٹ ہی میں بدبخت ہو۔

۳۵- وملاک العمل خواتمہ۔ — انسان کا سرمایہ عمل اس کا بہترین انجام ہے۔

۳۶- وشر الرویا رویاء الکذب۔ — بدترین خواب جھوٹا خواب ہے۔

۳۷- وکل ما ھو آت قریب۔ — جو بات ہونے والی ہے، اس کا وقت قریب ہے۔

۳۸- وسباب المومن فسوق و قتالہ کفر۔ — مومن کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔

۳۹- واکل لحمہ من معصیۃ اللہ۔ — مومن کا گوشت کھانا یعنی اس کی غیبت کرنا خدا کے گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔

۴۰- وحرمۃ مالہ کحرمۃ دمہ۔ — مومن کا مال بھی اسی طرح دوسرے کے لیے حرام ہے جس طرح خون حرام ہے۔

۴۱- ومن یتالی علی اللہ یکذبہ۔ — جو خدا سے استغنا کرتا ہے خدا اسے جھٹلاتا ہے۔

۴۲- ومن یغفر یغفر لہ۔ — جو کسی کے عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے اس کے عیبوں پر پردہ ڈالا جائے گا۔

۴۳- ومن یعف یعف اللہ عنہ۔ — جو دوسروں کے ساتھ عفو و درگزر سے پیش آتا ہے خدا اس کے ساتھ عفو و درگزر کا برتاؤ کرے گا۔

۴۴- ومن یکظم الغیظ یاجرہ اللہ۔ — جو غصہ پی جائے گا، خدا اسے اجر سے نوازے گا۔

۴۵- ومن یصبر علی الرزیۃ یعوضہ اللہ۔ — جو نقصان پر صبر کرتا ہے خدا اسے اچھا بدلہ دے گا۔

۴۶- ومن یتبع السمعۃ یسمع اللہ۔ — جو چغلی پھیلاتا ہے خدا اس کی رسوائی عام کر دیتا ہے۔

۴۷۔ و من یصبر یضعف اللّٰہ لہ۔
جو صبر کرتا ہے، خدا اسے بڑھاتا ہے۔

۴۸۔ و من یعص اللّٰہ یعذبہ اللّٰہ۔
جو خدا کی نافرمانی کرتا ہے خدا اسے عذاب دے گا۔

آخر میں تین مرتبہ کلمہ استغفار فرمایا۔ (مولف)

باب ۵۳

مسجد ضرار

مسجد ضرار | مسجد ضرار کا ذکر سورۂ توبہ کی مندرجہ ذیل آیات میں آیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔

(۱۰۷ - ۱۱۰)

اور (منافقوں میں سے) وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے ایک مسجد اس غرض کی بنا پر کھڑی کی کہ دعوت حق کو نقصان پہنچائیں۔ خدا کی عبادت کے بجائے کفر کے طور طریقوں پر کاربند ہوں مومنوں میں پھوٹ ڈالیں اور ان لوگوں کے لیے ایک پناہ گاہ پیدا کریں جو پہلے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف لڑ چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ بھلائی کے سوا کچھ نہ تھا لیکن اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ اس مسجد میں ہرگز او اسے نماز کے لیے کھڑے نہ ہونا۔ جس مسجد کی بنیاد پہلے دن سے تقوے پر رکھی گئی ہے۔ وہی اس امر کی حقدار ہے کہ اس میں نماز کے لیے قیام کیا جائے۔ اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جنھیں پاک وصاف رہنا (ظاہراً اور باطناً) پسند ہے اور اللہ بھی پاک وصاف رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ کیا وہ انسان بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسے کنارے پر رکھی جس کی مٹی کو پانی کے دھارے نے نیچے سے کاٹ کاٹ کر بہا دیا ہو اور وہ مع مکین کے سیدھی آتش دوزخ میں جا گری۔ ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ جو عمارت انھوں نے بنائی ہے وہ ہمیشہ شک وریب اور بے یقینی کی جولان گاہ رہے گی۔ یہ کانٹا نہیں نکلنے کا بجز اس کے کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکیم ودانا ہے۔

بظاہر "مسجد" بہ باطن "دارحرب"

یہ عمارت مسجد قبا سے جانب مشرق تھوڑے فاصلے پر بنائی گئی تھی اور یہ اس زمانے کا واقعہ ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیصر روم کے مقابلے کے لیے سفر تبوک کی تیاریوں میں مصروف تھے، کیونکہ اس کی طرف سے حملے کی خبریں پے در پے آ رہی تھیں اور رسول اللہ صلعم کا فیصلہ مبارک یہ تھا کہ قیصر سے لڑائی ہونی ہے تو خود اسی کے علاقے میں ہونی چاہیے۔ دین حق کے دشمنوں اور ان سے ساز باز رکھنے والے منافقوں کو یقین ہو گا کہ قیصر کے مقابلے میں مسلمانوں کا شیرازہ درہم برہم ہو جائیگا۔ لہذا پہلے ہی ایسا مرکز بنا لینا چاہیے جہاں مخالف قوت کے نظم وجمعیت کا کام انجام پاتا رہے اور تبوک سے حسب مراد اطلاع ملتے ہی مدینہ منورہ میں اسلام کے بچے کھچے آثار ملیا میٹ کر دیے جائیں۔ غالباً انھیں حالات کے پیش نظر حافظ ابن کثیرؒ نے اس عمارت کو بظاہر "مسجد" اور بہ باطن "دارحرب" قرار دیا۔

بہرحال عمارت بن چکی تو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یہ مسجد بیماروں اور ضعیفوں کی ضرورت کے لیے بنائی گئی ہے جو ذرا فاصلے پر واقع مسجد میں نماز کے لیے نہیں پہنچ سکتے اور اس میں نماز پڑھ لیا کریں گے۔ تیز بارش اور جاڑے کی راتوں میں دوسرے لوگ بھی فریضہ نماز ادا کر سکیں گے۔ آپ تشریف لے چلیں اور تبرکاً ایک نماز وہاں پڑھا دیں۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ بالفعل تو سفر درپیش ہے واپسی پر ان شاء اللہ نماز پڑھا دوں گا۔

مکروہ عزائم پر ریا و منافقت کا پردہ اس خوش اسلوبی سے تانا گیا کہ کسی کو اول نظر میں اصل معاملے کی تحقیق و تفتیش کا خیال ہی نہ آیا۔ یہاں تک کہ خود قبا والے بھی جو پہلو بہ پہلو رہتے تھے کوئی بات زبان پر نہ لائے۔

مندرجہ بالا آیات میں سے جو سفر تبوک سے واپسی پر نازل ہوئیں دو ٹکڑے بطور خاص توجہ کے مستحق ہیں:

۱۔ لیحلفن ان اردنا الا الحسنیٰ۔	قسمیں کھا کھا کر جتلائیں گے کہ ہمارے ارادے میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں۔
۲۔ ارصادا لمن حارب اللہ و رسولہ من قبل۔	اس فرد کے لیے نیز اس کے گروہ کے لیے پناہ گاہ مہیا کرنا جو پہلے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کر چکا ہے۔

آخری اشارہ غالباً ابو عامر راہب نصرانی کی طرف ہے۔

ابو عامر راہب

یہ شخص قبیلہ خزرج میں سے تھا اور ظہور اسلام سے پیشتر ہی نصرانیت قبول کر کے راہب بن گیا تھا۔ عموماً سمجھا جاتا تھا کہ وہ اہل کتاب کے علماء میں سے ہے حالانکہ جس شخص کا علم اسے حقیقت حال تک نہ پہنچا سکے، اس میں صحیح بصیرت پیدا نہ کر سکے، اس کے باطن کی اصلاح کا کام انجام نہ دے سکے، اسے "علم" کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ دراصل ابو عامر کا نام نہاد علم اور نمائشی زہد و تقشف دونوں نفس پروری اور خود پرستی کے ہتھکنڈے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے وقار و عظمت کے مقابلے میں کسی کا بھی چراغ روشن نہ رہے۔

رسول اللہ صلعم ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو جس طرح عبداللہ بن ابی کی ریاست کا دیا گل ہو گیا۔ اسی طرح ابو عامر راہب کے زہد اور علم کتاب کی قدر و منزلت بھی ہیچ رہ گئی۔ ابتدا میں اسے خیال ہو گا کہ قریش کے جن اکابر نے حضور صلعم اور آپ کے صحابہ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے، وہ آپ کو مدینہ منورہ میں کب جمنے کا موقع دیں گے۔ جنگ بدر نے ابو عامر کی اس امید کو موج سراب بنا دیا۔ پھر وہ احد و خندق کی جنگوں کے لیے قریش اور دوسرے عرب قبیلوں کو ابھارتا رہا۔ ان میں بھی ناکام ہوا تو قیصر کے پاس پہنچ گیا جو اس کا ہم مذہب تھا کہ اسے مسلمانوں کے مقابلے پر لائے۔ مدینہ منورہ کے منافقوں سے بھی اس کا ربط ضبط قایم تھا اور مسجد ضرار کی تعمیر ان سب کے مشترکہ منصوبے کا ایک کرشمہ تھی۔

بانیانِ مسجد ضرار مسجد ضرار کے بانیوں کی تعداد بارہ بتائی گئی ہے جیسا کہ مولاناؒ کے بیان سے واضح ہو گا۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ خِذام بن خالد (بنی عبید بن زید میں سے جو بنی عمرو بن عوف کی ایک شاخ ہے)

۲۔ مُعَتِّب بن قُشیر (بنی ضُبَیعہ بن زید)

۳۔ ابو حبیبہ بن الازعر (بنی ضُبَیعہ بن زید)

۴۔ عبّاد بن حُنَیف (بنی عمرو بن عوف)

۵۔ جاریہ بن عامر

۶۔ مجمّع بن جاریہ

۷۔ زید بن جاریہ بن عامر

۸۔ نَبتَل بن الحارث (بنی ضُبَیعہ)

۹۔ بجاد بن عثمان (")

۱۰۔ بحزج (")

۱۱۔ ودیعہ بن ثابت (بنی امیہ بن زید)

۱۲۔ ثعلبہ بن حاطب۔

عام فہرست یہی ہے لیکن ابن حزم نے ثعلبہ بن حاطب کے متعلق تصریحاً لکھا ہے کہ ان کا نام اس فہرست میں شامل کرنا مناسب نہیں۔ وہ بدری ہیں[۱] مولانا عبدالرؤف مرحوم دانا پوری نے اس کی تصدیق کی لیکن وہ لکھتے ہیں کہ یہ ثعلبہ بدری نہیں بلکہ دوسرا شخص ہے۔ اصل شخص اور والد کے نام کی یکسانی کے باعث اشتباہ ہوا۔ ثعلبہؓ بن حاطب بدری جنگِ اُحد میں شہید ہو گئے تھے[۲] لیکن مجھے شہدائے احد کی کسی بھی فہرست میں ثعلبہؓ کا نام نہیں ملا اور

۱؎ جوامع السیرت ص ۲۵۴ ۲؎ اصح السیر (ص ۳۳۵)

ابن حزم اس حقیقت سے ناواقف نہیں رہ سکتا تھا جس نے خود احد کے شہدا کی فہرست اپنی کتاب میں دی ہے۔

اس فہرست کا پہلا شخص (خذام بن خالد) وہ ہے جس نے اپنے گھر سے زمین کا ایک ٹکڑا الگ کر کے مسجد کے لیے دیا گویا مسجد ضرار اس کے گھر سے متصل تھی۔ جاریہ بن عامر کے دو بیٹے اصل کام میں شریک تھے مگر بعد میں انھوں نے عذر پیش کیا کہ وہ عمر میں چھوٹے تھے اور انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کس غرض سے ہو رہا ہے۔ باپ جو کچھ کرتا رہا ہم بھی بحالت نادانی میں اس کے ساتھ شامل رہے۔ یہ عذر تسلیم کر لیا گیا۔ مجمع بن جاریہ مسجد ضرار کا امام تھا کیونکہ قرآن اچھا پڑھتا تھا مگر اس کا یہ قصور معاف ہو گیا۔ زید بن جاریہ کو رسول صلعم نے خیبر کے مال میں سے حصّہ دیا تھا اور اس نے جنگ صفین میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔

مسجد ضرار کا انہدام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر تبوک سے واپس تشریف لائے تو مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔ آپ ذی اوان میں پہنچے جو مدینہ منورہ سے تھوڑے فاصلے پر ہے تو مالک بن الدخشم اور معن بن عدی یا اس کے بھائی عاصم بن عدی کو بھیجا کہ مسجد ضرار کو منہدم کر دیں اور جلا دیں۔ مالک بن الدخشم اپنے گھر میں داخل ہوئے۔ کھجور کی ایک شاخ لے کر آگ سلگائی پھر مسجد ضرار میں پہنچے۔ اسے آگ لگائی اور عمارت ڈھا دی۔

راقم الحروف نے مسجد ضرار کے کھنڈر دسمبر ۱۹۲۵ء میں مسجد قبا کے مشرق میں تھوڑے فاصلے پر دیکھے تھے۔[1]

آیت ۱۰۷[2] میں جس مسجد کا ذکر کیا گیا ہے اور جو تاریخ اسلام میں مسجد ضرار کے نام سے یاد کی جاتی ہے اس کا مختصر حال یہ ہے:

پیغمبر اسلام جب مدینہ آئے تو پہلے قبا نام مقام میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ کے حکم سے ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی جو عہد اسلام کی پہلی مسجد ہے۔ بعض منافقوں نے جن کی تعداد بعض روایات سے بارہ ثابت ہوتی ہے، اسی مسجد کے پاس ایک نئی مسجد تعمیر کی اور جب پیغمبر اسلام غزوۂ تبوک کے لیے نکل رہے تھے تو آپ کی خدمت میں آ کر عرض کیا، ایک دن وہاں آ کر نماز پڑھوا دیجیے۔ آپ نے فرمایا؛ ابھی تو سفر درپیش ہے واپسی پر دیکھا جائے گا۔ پھر جب آپ تبوک سے واپس ہوئے اور مدینہ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ نے بانیان مسجد کے منافقانہ مقاصد سے آپ کو مطلع کر دیا۔ آپ نے فوراً حکم دیا کہ یہ مسجد گرا دی جائے چنانچہ قبل اس کے کہ مدینہ پہنچیں مسجد منہدم کر دی گئی۔

---

[1] یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ مولف کی طرف سے تھا اور اسے مولانا کے بیان کی تمہید سمجھ لیجیے۔ آگے مولانا کا بیان ہے۔ [2] یہ آیت آغاز باب میں مع ترجمہ نقل کی جا چکی ہے۔

مسلمانوں کا نقصان

اس آیت میں مسجد بنانے کے چار مقاصد بیان کیے ہیں:

۱۔ "ضرارًا" یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ قبا کے مخلص مومنوں کو نقصان پہنچائیں کیونکہ مسجد قبا کی وجہ سے انھیں ایک خاص عزت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ حسد و عناد سے چاہتے ہیں ان کی یہ خصوصیت باقی نہ رہے۔

تشریح کفر

۲۔ "وکفرًا" کفر کے مقاصد پورے ہوں یعنی اپنی الگ مسجد ہو جائے گی تو مسجد قبا میں جانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور اس طرح نماز ترک کرنے کا موقع مل جائے گا کیونکہ لوگ سمجھیں گے انھوں نے اپنی مسجد میں نماز پڑھ لی۔ یہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں گے اس سے معلوم ہوا کہ ترک نماز کی حالت ایک ایسی حالت ہے جسے قرآن کفر کی حالت سے تعبیر کرتا ہے۔ نیز معلوم ہوا کہ نیک کاموں کا نیک ہونا مقصدو نیت پر موقوف ہے ورنہ مسجد بنانے جیسا نیک کام بھی کفر کے لیے ہو جا سکتا ہے۔

تفرقہ بازی

۳۔ "وتفریقًا بین المومنین" مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے۔ کیونکہ قبا کی تمام آبادی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتی تھی۔ اب بالکل اس کے پاس دوسری مسجد بنے گی تو جماعت بٹ جائے گی۔ کچھ لوگ پچھلی مسجد میں جائیں گے کچھ نئی میں اور جب ایک جماعت نہ رہی تو مسلمانوں کے باہمی اجتماع و تعارف کا وہ مقصد بھی فوت ہو گیا جو قیام جماعت کے ایک اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسجد اگر موجود ہو تو بلا ضرورت دوسری مسجد اس کے قریب تعمیر کرنا جائز نہیں، کیونکہ ایسا کرنا تفریقًا بین المومنین ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام ائمہ اسلام نے اتفاق کیا، ہر شہر میں جمعہ کی جماعت ایک ہی جگہ ہونی چاہیے اور اگر آبادی اتنی زیادہ ہو جائے کہ ایک جگہ کافی نہ ہو تو پھر بقدر ضرورت ایک سے زیادہ مسجدوں میں جمعہ قائم کیا جائے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ بلا ضرورت بہت سی مسجدیں تعمیر کر دی جائیں اور ہر مسجد میں جمعہ شروع کر دیا جائے۔

صریح حکم قرآن سے اعراض

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے یہ صریح حکم قرآنی پس پشت ڈال دیا اور محض ریاکاری اور نام و نمود کے لیے یا کسی سابق مسجد اور اس کے مہتموں کو نقصان پہنچانے کے لیے بہ کثرت مسجدیں ہر شہر و قریہ میں تعمیر کر دیں اور روز بروز تعمیر کرتے جاتے ہیں۔ اگر ان کی تعمیر کے حالات و مقاصد کا تفحص کیا جائے تو بڑی تعداد ٹھیک ٹھیک مسجد ضرار کی سی مسجدیں ثابت ہوں گی، مگر کوئی نہیں جو اس افساد سے لوگوں کو روکے بلکہ خود علما و مشائخ اپنے شخصی انتفاع و ترفع کے لیے اس مفسدانہ فعل کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور اپنے معتقدوں کو تعمیر مسجد کے لیے بے محل ثواب سنا سنا کر مزید ترغیبیں دیتے ہیں چنانچہ مسلمانوں کی تفریق و انتشار کا ایک بڑا باعث مسجدوں کا وجود بھی ہو گیا ہے۔ ایک ہی محلے میں چار چار پانچ پانچ جگہ جماعتیں ہوتی ہیں۔ ایک ہی رقبہ میں بلا ضرورت ایک سے زیادہ جگہ جمعہ پڑھا جاتا ہے پھر صرف اتنے ہی پر

قدم انسا دنہیں رکھا بلکہ عیدین کی جماعتیں بھی مسجدوں میں ہونے لگی ہیں، حالانکہ ایسا کرنا صریح سنت مستمرہ کے خلاف ہے اور اجتماع عیدین کا مقصد عظیم ضائع کر دینا ہے۔

دشمنوں کے کمیں گاہ

"وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ من قبل" اللہ اور اس کے رسول سے جس نے جنگ کی اس کے لیے ایک کمیں گاہ پیدا کر دی جائے یا اس کے انتظار و توقع میں پہلے سے ایک جگہ بنا دی جائے یعنی دشمنان اسلام کے لیے جن سے یہ لوگ ساز باز رکھتے ہیں ٹکنے کی جگہ پیدا ہو جائے۔

ابو عامر راہب

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں قبیلہ خزرج کا ایک آدمی ابو عامر راہب تھا جو ظہور اسلام سے پہلے عیسائی ہو گیا تھا، جب پیغمبر اسلام مدینہ تشریف لائے تو کلمۂ اسلام کا عروج اس پر شاق گزرا اور اسلام کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہو گیا، پہلے قریش مکہ کا ساتھ دیا۔ پھر شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس پہنچا اور اسے مسلمانوں پر حملے کی ترغیب دی۔ تبا کے بعض منافقین میں اور اس میں قدیم سے رسم و راہ تھی۔ یہ انھیں اسلام کے خلاف اکساتا رہتا اور رومیوں کے حملے کا یقین دلاتا۔ یہاں " لمن حارب اللہ ورسولہ" میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

باب ۳

حقیقتِ نفاق

جنگ تبوک اور مسجد ضرار کے سلسلے میں منافقین کا ذکر بار بار آیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ حقیقت نفاق کے متعلق مولانا نے سورہ توبہ کے حواشی میں جو مختصر سی تحریر شامل کر دی تھی، اسے بھی یہاں درج کر دیا جائے۔ (مولف)

تشریح نفاق قرآن نے "کفر" کی طرح "نفاق" کا بھی جا بجا ذکر کیا ہے اور منافقوں کے اعمال و خصائل کی سب سے زیادہ تفصیل اسی سورت میں ملتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ ٹھیک طور پر سمجھ لیا جائے نفاق کی حقیقت کیا ہے اور منافقوں کی جماعت کس طرح کی جماعت تھی؟

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں، فکر و عمل کا کوئی گوشہ ہو، تین طرح کے آدمی ہوتے ہیں:

مستعد اور صالح طبیعتیں: یہ ہر اچھی بات کو پہچان لیتی اور قبول کر لیتی ہیں۔ پھر سرگرم عمل ہو جاتی ہیں۔

مفسد طبیعتیں، انھیں ہر اچھی بات سے انکار ہوتا ہے۔ کوئی سیدھی بات ان کے اندر اترتی نہیں۔

درمیانی گروہ: یہ ہر بات کو سن لینے اور مان لینے کے لیے طیار ہو جاتا ہے، لیکن فی الحقیقت اس کے اندر طیاری نہیں ہوتی۔ وہ قدم اٹھا دیتا ہے مگر چلتا نہیں اور چلتا ہے تو پہلے ہی قدم میں لڑکھڑا جاتا ہے۔ اس میں پہلے گروہ کی مستعدی نہیں ہوتی کہ جو بات مان لی، اسے ٹھیک ٹھیک مان لے اور عمل کرے۔ اس میں دوسرے گروہ کی بے باکی اور جرأت بھی نہیں ہوتی کہ یکسو ہو کر صاف صاف انکار کر دے۔ پس گروہ سمجھتا ہے کہ ایک راہ اختیار کر لی ہے، لیکن فی الحقیقت دونوں راہوں میں سے کسی میں بھی نہیں ہوتا۔ جہاں تک اقرار کا تعلق ہے، قبول کرنے والوں میں ہوتا ہے، جہاں تک اذعان و عمل کا تعلق ہے منکروں کی سی حالت میں: مذبذبین بین ذالک، لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء[۲]۔ (سورۂ نسا: ۱۴۳)

جزم و یقین اور عزم و عمل پہلے گروہ کا خاصہ ہے۔ انکار و جحود دوسرے کا، شک و تذبذب اور بے عملی و تعطل

---

[۱] مراد ہے سورۂ توبہ کیونکہ یہ نوٹ سورۂ توبہ ہی کے آخر میں لکھا ہے۔ [۲] کفر و ایمان کے درمیان متردد کھڑے ہیں کہ ادھر رہیں یا ادھر۔ نہ ان کی طرف ہیں اور نہ ان کی طرف۔

تیسرے کا۔

بعینہٖ یہی حال ایمان وعمل کے دائرے کا بھی ہے۔ یہاں بھی طبیعت انسانی کی یہ تینوں حالتیں ظہور میں آتی ہیں۔ مستعد طبیعتیں قبول کرلیتی اور چل کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ مومن ہیں۔ مفسد انکار کرتے اور مخالفت میں سرگرم ہوجاتے ہیں۔ یہ کافر ہیں۔ کچھ لوگ قبول کرلیتے ہیں لیکن فی الحقیقت قبولیت کی رُوح ان کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ منافق ہیں۔

ہمیشہ ظہور میں آنے والی گمراہی

قرآن نے کفر کی طرح نفاق کے اعمال وخصائص بھی پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیے کیونکہ کفر کی طرح نفاق بھی محض عہد نزول ہی کی پیداوار نہ تھا۔ ہمیشہ ظہور میں آنے والی گمراہی تھی اور انسان کی گمراہیاں کسی خاص عہد ونسل کی نہیں بلکہ نوع انسانی کی گمراہیاں ہوتی ہیں۔

ایک عام غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں منافقوں کا گروہ کافروں کا کوئی خاص سازشی گروہ تھا جو جاسوسوں کی طرح بھیس بدل کر مسلمانوں میں رہنے لگا تھا۔ باہر نکلتا تو مسلمان بن جاتا۔ اکیلے میں ہوتا تو اپنے اصلی بھیس میں لوٹ آتا، حالانکہ ایسا سمجھنا قرآن واحادیث کی صاف صاف تصریحات کو جھٹلانا ہے۔ ان لوگوں نے اسلام بطور اپنے دین و اعتقاد کے اسی طرح اختیار کرلیا تھا، جس طرح دوسرے مسلمانوں نے۔ چنانچہ اسی سورت کی آیت (۷۴) میں ہے کہ وکفروا بعد اسلامھم اسلام لاکر پھر کفر کی باتیں کیں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کی بیویاں انھیں مسلمان سمجھتی تھیں۔ ان کے بچے انھیں مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کے گھر کا ہر فرد یقین کرتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ وہ نماز پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے۔ اسلام کے طور طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے[1]

جہاں تک کسی دین کو بطور ایک دین کے اختیار کرلینے کا تعلق ہے، کوئی بات ایسی نہ تھی جو بظاہر ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہو۔ تاہم قرآن نے فیصلہ کیا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، کیونکہ اسلام کا گھونٹ تو انھوں نے پی لیا تھا لیکن حلق کے نیچے نہیں اترا تھا۔ کسی تعلیم کو اختیار کرلینے کے بعد یقین وعمل کی جو رُوح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم تھے۔ اخلاص اور صداقت کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اللہ کا کلام سنتے، مگر اس لیے نہیں کہ عمل کریں، بلکہ اس لیے کہ محض سنتے رہیں۔ وہ نماز پڑھتے مگر بے دلی کے ساتھ۔ خیرات کرتے مگر مجبور ہوکر۔ ان کے دل میں دین سے زیادہ دنیا کا عشق تھا۔ اسلام کے جو احکام ان کے شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے، ان پر

---

[1] عبداللہ بن ابی منافقوں کا سرغنہ تھا، لیکن اس کا بیٹا منافق نہ تھا، مخلص مومن تھا۔ اسی طرح تمام مومنوں کی اولاد و اعقاد مخلصوں کی جماعت نکلی۔

خوش خوش عمل کرتے، جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگنا چاہتے۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقع ہوتا تو وہ سب سے پہلے مومن تھے۔ جب کبھی قربانیوں کا موقع آجاتا تو سب سے آخری صفوں میں بھی دکھائی نہ دیتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز جاتیں۔ انفاق کا حکم ان کے لیے موت کا پیام ہوتا۔ اسلام کے دشمنوں سے سازگاریاں رکھنے میں انھیں کچھ تامل نہ ہوتا۔ وہ سمجھتے تھے کہ دونوں طرف ملے رہنے ہی میں مصلحت ہے۔ اگر بازی الٹ پڑی اور دشمن فتح مند ہوگئے تو ان کے پاس بھی اپنی جگہ بنی رہے گی۔

نفاق کی مختلف حالتیں

ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں بھی یکساں نہیں ہوتیں اور نہیں تھیں۔ چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقرار نما صورت ہے، اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار قطعی ہی کی طرف بڑھتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں۔ کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ چنانچہ اس عہد کے منافقوں کی حالت نفاق یکساں نہ تھی۔ عبداللہ بن ابیؓ کا نفاق ہر منافق کا نفاق نہ تھا۔ خود قرآن نے اسی سورت کی آیت (۱۰۱) میں اس طرف اشارہ کیا ہے: ومن حولکم من الاعراب منافقون و من اھل المدینۃ مردوا علی النفاق[1] کسی کے نفاق کا رخ زیادہ تر اس طرف تھا کہ ہجرت سے جی چراتے تھے۔ کسی پر انفاق مال شاق تھا۔ کوئی جہاد سے بچنا چاہتا تھا۔ کسی پر نماز کا قیام سخت گزرتا تھا۔ کوئی ایسا بھی تھا کہ احکام الٰہی اور آیات قرآنی کی ہنسی اڑاتا تھا اور اس تاک میں تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی آفت آپڑے تو کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ ہوجائے۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ ان سب نے اسلام بطور اپنے دین و طریقہ کے قبول کر لیا تھا اور مسلمانوں ہی میں سمجھے جاتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ محض ایک سازشی گروہ بھیس بدل کر مسلمانوں میں آملا ہو اور مسلمانوں میں سے نہ ہو۔

اب غور کرو یہاں منافقوں کے اعمال و خصائص کیا کیا بیان کیے ہیں:

۱۔ جب راہ حق میں جان و مال کی قربانی کا وقت آتا تو طرح طرح کے حیلے بہانے نکالتے اور کہتے، ہمیں گھر بیٹھ رہنے کی اجازت مل جائے۔

۲۔ مسلمانوں میں ہمیشہ فتنہ پھیلاتے۔ کمزور اور ناسمجھ آدمیوں کو گمراہ کرتے، ادھر کی بات ادھر لگاتے۔

۳۔ جب کبھی جماعت کے لیے کوئی نازک وقت آجاتا تو اس طرح کی باتیں نکالتے کہ دوسروں کے دل بھی کمزور پڑجاتے اور کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ چنانچہ احد میں انھوں نے ایسا ہی کیا اور اس موقع پر بھی کمی نہیں کی۔

---

[1] ان اعرابیوں میں جو تمھارے آس پاس بستے ہیں کچھ منافق ہیں اور مدینہ کے باشندوں میں بھی ہیں جو نفاق میں مشاق ہوگئے ہیں۔

۴۔ دینداری کے بھیس میں اپنا نفاق چھپاتے اور کہتے۔ اس کام میں ہمارے لیے فتنہ ہے اس لیے شریک نہیں ہو سکتے۔

۵۔ مسلمانوں کی مصیبت ان کے لیے مصیبت نہ ہوتی اور نہ ان کی خوشی ان کے لیے خوشی۔

۶۔ جب کوئی جماعتی معاملہ پیش آجاتا، تو اس کا ساتھ نہ دیتے اور طرح طرح کی فتنہ اندازیاں کرتے۔ پھر اگر کوئی حادثہ پیش آجاتا تو کہتے، ہم نے پہلے ہی یہ بات معلوم کر لی تھی۔ اسی لیے ساتھ نہیں دیا تھا پھر بجائے اس کے کہ قوم کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھیں، دل میں خوش ہوتے کہ چلو، اچھا ہوا، کامیاب نہ ہوئے۔

۷۔ نماز پڑھیں گے تو اس بے دلی سے کہ معلوم ہوگا، بوجھ آپڑا ہے اور چاہتے ہیں کسی نہ کسی طرح پٹک کر الگ ہو جائیں۔

۸۔ نیکی کی راہ میں خوشدلی سے کبھی خرچ نہ کریں گے۔ کنجوسی ان کی سب سے بڑی علامت ہے۔

۹۔ قسمیں کھا کھا کر یقین دلائیں گے کہ ہمیں مخالف نہ سمجھو، حالانکہ دل میں نفاق بھرا ہوا ہے۔

۱۰۔ چونکہ دلوں میں کھوٹ ہے، اس لیے ڈرے سہمے رہتے ہیں اور بہت سے کام دل کی خواہش سے نہیں، بلکہ محض جماعت کے خوف سے کرتے ہیں۔

۱۱۔ چونکہ راہ حق کی آزمائشیں پیش آتی رہتی ہیں اور دل میں اخلاص و یقین نہیں ہے، اس لیے بسا اوقات متوحش حال سے ایسے مضطرب ہو جاتے ہیں کہ اگر چھپ بیٹھنے کی کوئی جگہ مل جائے تو فوراً رسی تڑا کر بھاگ کھڑے ہوں۔

۱۲۔ غرض کے بندے ہیں۔ ان کی خوشنودی اور ناراضگی کا سارا دارومدار دنیا اور دنیا کا حصول ہے۔ اگر صدقات کی تقسیم میں انھیں بھی کچھ دے دیا جائے تو خوش رہیں گے۔ نہ دیا جائے تو بگڑ بیٹھیں گے۔

۱۳۔ چونکہ ایمان و راستی سے محروم ہیں۔ اس لیے حق و ناحق کی کچھ پروا نہیں۔ جس طرح بھی ملے مال و دولت حاصل کرنی چاہیے۔ صدقات وخیرات کے مستحق نہیں لیکن اس کے حصول کے خواہشمند رہتے ہیں۔

۱۴۔ اگر ان کی ہوائے نفس کے خلاف کوئی فیصلہ ہو ... تو فوراً طعنہ زنی پر اتر آئیں کہ دوسروں کی طرفداری کی جاتی ہے۔

۱۵۔ پیغمبر اسلام مخلص مومنوں کا اخلاص پہچانتے اور انھیں قابل اعتماد سمجھتے تھے۔ یہ بات منافقوں پر شاق گزرتی حتیٰ کہ بعض نے کہا، وہ کان کے کچے ہیں۔ لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔

۱۶۔ جب دیکھتے ہیں، ان کی منافقانہ روش پر عام برہمی پیدا ہو گئی، تو قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یقین دلاتے اور انھیں اپنے سے راضی رکھنا چاہتے۔ قرآن کہتا ہے ان کی حق فراموشی دیکھو انھیں خدا کی تو کچھ پروا نہیں کہ بدعملیاں کیے جاتے ہیں لیکن انسانوں کی اتنی پروا ہے کہ جونہی ان کی نگاہیں بدلی ہوئی نظر آئیں، لگے خوشامد کرنے

اور جھوٹی قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے۔

فی الحقیقت انسانی گمراہی کی بوالعجبیوں میں سے ایک بوالعجبی یہ ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کا مدعی ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے علم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ تاہم ہر طرح کی معصیتیں کیے جائے گا اور ایک لمحے کے لیے بھی اسے خیال نہ ہوگا کہ میں کیا کر رہا ہوں، لیکن جونہی انسانوں کی نظر میں اس کی معصیتیں نمایاں ہوئیں، اس کے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے اور ہزار طرح کے جتن کرے گا کہ کہیں وہ اسے بُرا نہ سمجھنے لگیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فی الحقیقت اسے خدا کی ہستی کا یقین نہیں۔ کیونکہ اگر یقین ہوتا، اسی درجہ کا یقین جس درجہ کا یقین انسانوں کی موجودگی پر رکھتا ہے، تو ممکن نہ تھا کہ اس سے بے پروا ہو جاتا۔ قرآن کہتا ہے، یہی حالت نفاق کی حالت ہے۔

منافقت کی فریب آرائیاں

۱۷۔ دین کے بارے میں ان کی زبانیں چھوٹ ہیں لیکن جب پکڑے جاتے ہیں، تو کہتے ہیں ہم نے بطور تفریح اور مزاح کے ایک بات کہہ دی تھی۔ سچ مچ کو ہمارا یہ مطلب نہ تھا۔ قرآن کہتا ہے، یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوا، تم اللہ کی، اس کی آیتوں کی، اس کے رسول کی ہنسی اڑاتے ہو۔

۱۸۔ جس طرح مومن مرد اور عورتیں راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و معاون ہیں، اسی طرح منافق راہ نفاق میں ایک دوسرے کے رفیق و معاون ہیں۔

۱۹۔ کذب گوئی ان کا شعار ہے۔ صریح ایک بات کہیں گے اور پھر انکار کر دیں گے۔

۲۰۔ بعضوں کا یہ حال ہے کہ عہد کرتے ہیں۔ خدایا، اگر تو ہم پر فضل کرے تو ہم تیری راہ میں خیرات کریں گے اور نیکی کی زندگی بسر کریں گے لیکن جب اللہ فضل کرتا ہے تو پھر بے تامل بخیلی پر اتر آتے ہیں اور کچھ اس کی راہ میں نہیں نکالتے۔ اس کی طرف سے رُخ پھیرے رہتے ہیں۔

۲۱۔ ان کا ایک وصف یہ ہے کہ خود تو کچھ کریں گے نہیں، لیکن کرنے والوں کے خلاف زبان کھولنے میں ہمیشہ بے باک رہیں گے، مثلاً: اگر خوشحال آدمیوں نے بڑی بڑی رقمیں راہ حق میں نکالیں تو کہیں گے، دکھاوے کے لیے یا کسی دنیوی غرض کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اگر کوئی غریب آدمی اپنی محنت مزدوری کی کمائی سے چار پیسے نکال کر رکھ دے گا تو اس کی ہنسی اڑائیں گے کہ واہ اچھی خیرات کی!

۲۲۔ راہ حق میں محنتیں مشقتیں برداشت کرنا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ غزوۂ تبوک کا معاملہ سخت گرمی میں پیش آیا تھا اس لیے لوگوں سے کہتے تھے، اس گرمی میں کہاں جا رہے ہو؟

۲۳۔ ایمان کے ضعف نے انھیں مردانگی کے احساس و غیرت سے بھی محروم کر دیا۔ جب لوگ قوم و ملت کی راہ میں

جان قربان کرنے ہیں تو وہ عورتوں کے ساتھ گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور ذرا بھی نہیں شرماتے۔

۲۴- کچھ لوگ ایسے ہیں جو نفاق کی حالت میں شب و روز رہتے رہتے بڑے مشاق ہو گئے ہیں۔ دُوسرے اتنے مشاق نہیں۔ جو مشاق ہیں، تم انھیں تاڑ نہیں سکتے۔

۲۵- بعض لوگ دینداری کے بھیس میں ایسی راہیں نکالتے کہ مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ہو اور ان کے مقاصد کو نقصان پہنچے مثلاً ایک مسجد بنائی اور پیغمبر اسلام سے عرض کیا، آپ اس میں نماز پڑھا دیں تو ہمارے لیے برکت و سعادت ہو۔ مقصود یہ تھا کہ اپنے اجتماع کے لیے ایک نیا حلقہ پیدا کریں اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ہو۔

۲۶- کوئی سال نہیں گزرتا کہ ان کے لیے تنبیہ و اعتبار کی کوئی نہ کوئی بات ظہور میں نہ آجاتی ہو لیکن غفلت کا یہ حال ہے کہ نہ تو توبہ کرتے ہیں، نہ عبرت پکڑتے ہیں۔

اعمالِ منافقین دوسری سورتوں میں

سورۂ آلِ عمران، نساء، انفال، احزاب، محمدؐ، فتح، حدید، مجادلہ اور حشر میں بھی منافقوں کے اعمال و خصائص بیان کیے گئے ہیں اور ایک پوری سورت "منافقون" انھی کے حالات میں ہے۔ چاہیے کہ اس موقع پر فہرست سے مدد لے کر وہ تمام مقامات بھی دیکھ لیے جائیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۸) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ میں اور اس کی بعد کی آیتوں میں جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس سے مقصود منافقوں کی یہ جماعت نہیں ہے، بلکہ یہود و نصاریٰ ہیں، جو ایمان باللہ کا دعویٰ کرتے تھے۔ مگر حقیقۃً ایمان کی رُوح ان میں باقی نہیں رہی تھی۔ فی الحقیقت یہ حالت بھی نفاق ہی کی حالت ہے جو ایک مدت کے جمود و اعراض کے بعد پیروان مذاہب پر طاری ہو جاتی ہے لیکن مقصود اس سے مدینہ کے منافق نہیں ہیں۔

خصائلِ نفاق کی حدیثیں

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ ان احادیث کا مطلب کیا ہے جن میں نفاق کی خصلتیں بیان کی گئی ہیں اور فرمایا ہے جس میں یہ خصلت ہو تو سمجھ لو، نفاق کی خصلت آ گئی مثلاً اربع، من کن فیہ، کان منافقا خالصًا، و من کانت فیہ خصلۃ منھن، کانت فیہ خصلۃ من النفاق (بخاری) و لو صلّٰی، و صام، و زعم انہ مسلم (مسلم) یعنی چار خصلتیں ہیں۔ جس میں یہ چاروں جمع ہو جائیں وہ پورا منافق ہے اور جس میں کوئی ایک خصلت پائی جائے، تو سمجھ لو، نفاق کی ایک خصلت پیدا ہو گئی۔ مسلم کے لفظ میں یہ بھی ہے" اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اس زعم میں ہے کہ مسلمان ہے" پھر وہ خصلتیں بیان کی ہیں جو سچے مومن میں نہیں ہونی چاہئیں مثلاً امانت میں خیانت، جھوٹ بولنا

وعدہ خلافی، غصے میں آکر بے قابو ہوجانا، تو معلوم ہوا نفاق کوئی ایسی حالت نہ تھی جو صرف آنحضرت صلعم کے زمانہ ہی میں ظہور پذیر ہوئی ہو اور نہ منافقوں کا گروہ کوئی ایسا گروہ تھا، جو محض چھپے کافروں کا ایک سازشی گروہ ہو۔ یہ ایمان و عمل کی کمزوری کی ایک زیادہ سخت حالت ہے اور جس طرح اس زمانے میں تھی، اسی طرح ہر زمانے میں ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔

اگر آج مسلمانوں کی اکثریت اپنے ایمان وعمل کا احتساب کرے، تو اسے معلوم ہو جائے کہ نفاق کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اور کسی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ہی وجود میں اسے دیکھ لے سکتی ہے۔

عقائد و اعمال کی تین حالتیں

یہ جو قرآن نے انسان کے عقائد و اعمال کی تین حالتیں قرار دیں۔ ایمان، کفر، نفاق، تو فی الحقیقت عالم ہستی کے تمام گوشوں میں اصلاً تین ہی حالتیں پائی جاتی ہیں۔ یا تو تکوین کی حالت ہوگی یا انساد کی حالت ہوگی یا پھر دونوں کی درمیانی حالت۔ خود اپنے ہی وجود کو دیکھ لو۔ یا زندگی ہے یا موت ہے یا بیماری۔ بیماری کو نہ تو زندگی کی صحیح حالت کہہ سکتے ہیں نہ موت ہی قرار دے سکتے ہیں۔ دونوں کے بین بین ہے۔ لیکن رُخ اس کا موت ہی کی طرف ہے۔ قلب و رُوح کا بھی یہی حال ہوا۔ ایمان زندگی ہے، موت کفر ہے اور نفاق بیماری۔

یہ مقام مہات معارف قرآنی میں سے ہے لیکن،

گر نویسم شرح آں بے حد شود
مثنوی ہفتاد من کاغذ شود

باب ۵

"رضوا عنہ" کی شرح

"وہ اللہ سے راضی ہوئے"

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۰ میں سابقون الاولون اور ان کے متبعین کی نسبت فرمایا: رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ (اللہ ان سے راضی ہوا وہ اللہ سے)۔ اس مقام کا ایک پہلو قابل غور ہے جس پر لوگوں کی نظر نہیں پڑی یعنی "رضوا عنہ" پر کیوں زور دیا گیا؟ اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ اللہ ان سے خوشنود ہوا کیونکہ ان کے اعمال اللہ کی خوشنودی ہی کے لیے تھے۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ کیوں کہی گئی کہ وہ بھی اللہ سے خوشنود ہوئے۔

اس لیے کہ ان کے ایمان و اخلاص کا اصلی مقام بغیر اس کے نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔

دو حالتیں

انسان جب کبھی کسی مقصد کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو دو طرح کی حالتیں پیش آتی ہیں کچھ لوگ جوانمرد اور باہمت ہوتے ہیں۔ وہ بلا تامل ہر طرح کی مصیبتیں جھیل لیتے ہیں لیکن ان کو جھیلنا جھیل لینا ہی ہوتا ہے یہ بات نہیں ہوتی کہ مصیبتیں ان کے لیے مصیبتیں نہ رہی ہوں، عیش و راحت ہو گئی ہوں، کیونکہ مصیبت پھر مصیبت ہے۔ باہمت آدمی کڑوا گھونٹ بغیر کسی جھجک کے پی لے گا، لیکن اس کی کڑواہٹ کی بدمزگی محسوس ضرور کرے گا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں صرف باہمت ہی نہیں کہنا چاہیے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھنا چاہیے۔ ان میں صرف ہمت و جوانمردی ہی نہیں ہوتی، بلکہ عشق و شیفتگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح جھیلتے ہی نہیں بلکہ عیش و راحت کی طرح ان سے لذت و سرور حاصل کرتے ہیں۔ راہ محبت کی ہر مصیبت ان کے لیے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے۔ اگر اس راہ میں کانٹوں پر لوٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں انھیں ایسی راحت ملے، جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر نہیں مل سکتی۔ حتیٰ کہ اس راہ کی مصیبتیں جس قدر بڑھتی جاتی ہیں اتنی ہی زیادہ ان کے دل کی خوشحالیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ ان کے لیے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ کسی کی راہ میں پیش آرہا ہے اور اس کی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں، عیش و سرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ یہ بات سننے میں تمھیں عجیب معلوم ہوتی ہوگی لیکن فی الحقیقت حالت میں اتنی عجیب نہیں بلکہ انسانی زندگی کے معمولی واردات میں سے ہے۔ عشق و محبت کا مقام تو بہت بلند ہے، بوالہوسی کا عالم بھی

اس واردات سے خالی نہیں ؛

حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نہ ، ناصح[1]
بدستِ آور رگِ جانے ونشتررا تماشا کن

سابقون کی محبت ایمانی سابقون الاولون کی محبت ایمانی کا یہی حال تھا۔ ہر شخص جو ان کی زندگی کے سوانح کا مطالعہ کرے گا بے اختیار تصدیق کرے گا کہ انھوں نے راہِ حق کی مصیبتیں صرف جھیلی ہی نہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور رُوح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں ان میں بسر کر ڈالیں۔ ان میں سے جو لوگ اول دعوت میں ایمان لائے تھے ان پر شب و روز کی جانکاہیوں اور قربانیوں کے پورے تیئس برس گزر گئے لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے بھی یہ بات دکھائی نہیں دیتی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کبھی کھلی ہو۔ انھوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت کے ساتھ کی گویا دنیا جہان کی خوشیاں اور راحتیں ان کے لیے فراہم ہو گئی ہیں اور جان کی قربانیوں کا وقت آیا تو اس طرح خوش خوش گردنیں کٹوادیں گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں بلکہ موت میں تھی۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے اتنی عمریں نہیں پائیں کہ اسلام کی غربت کے ساتھ اسلام کا عروج و اقبال بھی دیکھ لیتے اور عدی بن حاتم کی طرح کہہ سکتے "کنت فی من افتتح کنوز کسریٰ"[2] تاہم جب دنیا سے گئے تو اس عالم میں گئے کہ ان سے زیادہ عیش و خوشحالی میں شاید ہی کسی نے دنیا چھوڑی ہو۔

بدر اور احد کے شہدا بدر اور احد کے شہیدوں کے حالات پڑھو۔ ایمان لانے کے بعد جو کچھ بھی ان کے حصے میں آیا، وہ بجز رات دن کی کاہشوں اور مصیبتوں کے اور کیا تھا؟ اور پھر قبل اس کے کہ اسلام کے فتح و اقبال کی کامرانیوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا، دشمنوں کی تیغ و سنان سے چور میدان جنگ میں دم توڑ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی غور کرو، ان کے دل کی شادمانیوں کا کیا حال تھا؟ اس اطمینان و سکون کے ساتھ عیش و نشاط کے بستروں پر کسی نے جان نہ دی ہوگی، جس طرح انھوں نے میدان جنگ کی ریتلی زمین پر لوٹ لوٹ کر دی۔ جنگ احد میں سعد بن ربیع کو لوگوں نے دیکھا، زخموں میں پڑے سانس توڑ رہے ہیں۔

---

[1] شعر شیخ علی حزیں کا ہے۔ اس میں "ناصح" کی جگہ "زاہد" ہے۔ لیکن مولانا کے تصرف سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ [2] عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا لتفتحن کنوز کسریٰ۔ ایسا ضرور ہونے والا ہے کہ تم کسریٰ کے خزانے فتحمندانہ کھولو گے۔ وکنت فی من افتتح کنوز کسریٰ۔ یہ پیشگوئی میں نے اپنی آنکھوں سے پوری ہوتے دیکھ لی کیونکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے کسریٰ کا خزانہ کھولا تھا (بخاری)

پوچھا کوئی وصیت کرنی ہو تو کر دو کہا اللہ کے رسول کو میرا سلام پہنچا دینا اور قوم سے کہنا، ان کی راہ میں جانیں نثار کرتے رہیں۔ عمارہ بن زیاد زخموں سے چور جانکنی کی حالت میں تھے کہ آنحضرت سرہانے پہنچ گئے۔ فرمایا کوئی آرزو ہو تو کہہ دو۔ عمارہ نے اپنا زخمی جسم گھسیٹ کر اور زیادہ قریب کر دیا اور اپنا سر آپ کے قدموں پر رکھ دیا، کہ اگر کوئی آرزو ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہے:

منم و ہمیں تمنا کہ بوقت جاں سپردن
برخ تو دیدہ باشم، تو درون دیدہ باشی

عورتوں کا حال عورتوں تک کا یہ حال تھا کہ بیک وقت انھیں ان کے شوہر، بھائی اور باپ کے شہید ہونے کی خبر پہنچائی جاتی تھی اور وہ کہتی تھیں، یہ تو ہوا مگر بتلاؤ، اللہ کے رسول کا کیا حال ہے؟ پھر جب آپ کا جمال جہاں آرا نظر آتا تو بے اختیار خوش ہو کر پکار اٹھتیں: کل مصیبۃ بعدک جلل[1]! تو اگر سلامت ہے، تو پھر دنیا کی ساری مصیبتیں ہمارے لیے شہد و شکر کا گھونٹ ہوگئیں:

من و دل گر فنا شدیم، چہ باک
غرض اندر میان سلامتِ اوست

جنگ صفین کا مال غنیمت تاریخ اسلام میں جنگ حنین پہلی جنگ ہے جس میں بہ کثرت مال غنیمت ہاتھ آیا۔ چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی کا ذکر روایات میں ملتا ہے یہ وقت تھا کہ سابقون الاولون کو مال و دولت سے حصۂ وافر ملتا، لیکن آنحضرتؐ نے ان باشندگان مکہ کو ترجیح دی، جو فتح مکہ کے بعد نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور انصار مدینہ کے حصے میں کچھ نہ آیا کیونکہ آپ کے پیش نظر نومسلموں کی تالیف قلب تھی۔ یہ حالت دیکھ کر بعض نوجوانوں کو خیال ہوا، اہل مکہ سے لڑے تو ہم لیکن آج مال غنیمت کا حصہ مل انھیں رہا ہے۔ بات آنحضرتؐ تک پہنچی تو آپؐ نے انصار کو جمع کیا اور فرمایا: الا ترضون ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وتذھبون بالنبی الی رحالکم "کیا تمھاری خوشنودی کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ لوگ یہاں سے مال غنیمت کے حصے لے کر جائیں اور تم اللہ کے نبیؐ کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ؟ انصار بے اختیار پکار اٹھے: رضینا، یارسول اللہ رضینا! ہم خوشنود ہیں یارسول اللہ ہم خوشنود ہیں۔ (صحیحین)

---

[1] تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں:

ہیں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم (شبلی)

اور پھر غور کرو، جو لوگ "والذین اتبعوھم باحسان[1]" میں داخل ہوئے، انھیں بھی کس درجہ اس مقام سے وافر حصہ ملا تھا؛ دنیا میں شاید ہی کسی عورت کے دل میں اپنے عزیزوں کے لیے ایسی محبت پیدا ہوئی ہوگی، جیسی جاہلیت کی مشہور شاعرہ خنساء کے دل میں تھی۔ اس نے جو مرثیے اپنے بھائی صخر کے غم میں کہے ہیں تمام دنیا کی شاعری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے؛

یذکرنی طلوع الشمس صخرا
واذکرہ بکل غروب شمس[2]

لیکن ایمان لانے کے بعد اسی خنساء کی نفسیاتی حالت ایسی منقلب ہوگئی کہ جنگ قادسیہ میں اپنے تمام بیٹے ایک ایک کر کے کٹوا دیے اور جب آخری بیٹا بھی شہید ہو چکا تو پکار اٹھی؛ الحمد للہ الذی اکرمنی بشہادتہم[3]

پس و رضوا عنہ میں اشارہ اسی طرف ہے کہ اللہ اور اس کے کلمۂ حق کی راہ میں جو کچھ بھی پیش آیا انھوں نے اسے جھیلا ہی نہیں، بلکہ کمال محبت ایمانی کی وجہ سے اس میں خوش حال و خوشنود رہے اور یہی مقام ہے جو ان کے درجے کو تمام مدارج ایمان و عمل میں ممتاز کر دیتا ہے۔

---

[1] اور وہ جنھوں نے راستبازی سے ان کی (سابقون الاولون کی) پیروی کی۔ [2] ہر صبح سورج کا نکلنا صخر کی یاد تازہ کر دیتا ہے اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں آئی کہ صخر کی یاد میرے سامنے نہ آگئی ہو۔ [3] حمد و ثنا خدا کے لیے ہے جس نے مجھے ان بیٹوں کی شہادت سے عزت بخشی۔

پیغامِ حق کے معجز نما نتائج

"ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجاً"

(اور تم نے لوگوں کو گروہ در گروہ دینِ حق میں داخل ہوتے دیکھ لیا۔)

باب ۲۶

پیغام حق کے معجز نما نتائج

(۱)

دائرہ اسلام کی توسیع رسول اللہ صلعم کا اصل وظیفہ تبلیغ اسلام ہی تھا۔ جن دعوت ناموں اور سفارتوں کا ذکر اوپر آچکا ہے ان کے علاوہ بھی اس وظیفے کی تکمیل کے لیے یا تو مختلف قبیلوں اور گروہوں کے افراد نے بطور خود اپنے آپ کو تبلیغ کے لیے وقف کر دیا یا خود حضور صلعم نے مختلف علاقوں، گروہوں اور قوموں کے لیے داعی مقرر فرمائے۔ اس طرح کم از کم عرب میں اسلام جلد سے جلد پھیل گیا۔ اس کا سرسری اندازہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ بدر میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ مہاجرین و انصار میں سے جاں نثاروں کی تعداد تین سو سے کسی قدر زیادہ تھی۔ احد میں یہ تعداد سات سو پر پہنچی۔ خندق میں تین ہزار، حدیبیہ کے موقع پر صرف عمرہ ادا کرنا منظور تھا، صحابہ کرام کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ پندرہ سو تھی۔ عمرۃ القضا کے وقت دو ہزار۔ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار اور تبوک میں تیس ہزار۔ یہ دائرہ اسلام کی توسیع کے ثمرات برکات و حسنات تھے۔

قریش کی وجہ سے رکاوٹ حقیقت یہ ہے کہ عام عربوں کے لیے قبول اسلام میں سب سے بڑی رکاوٹ قریش مکہ کی شدید مخالفت کے باعث پیدا ہوئی۔ صحیح بخاری کی روایت ہے،

کانت العربُ تَلَوّمُ باسلامهمُ الفتح فیقولون اترکوه وقومه۔ فانّهٗ ان ظهر علیهم فهو نبیٌّ صادقٌ۔ فلمّا کانت وقعة اهل الفتح بادرَ کل قومٍ باسلامهم۔[1]

عرب اسلام لانے میں فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلعم اور ان کی قوم کو باہم فیصلہ کر لینے دو۔ اگر رسول اللہ صلعم قوم پر غالب آ گئے تو بلاشبہ واضح ہو جائے گا کہ وہ سچے نبی ہیں۔ چنانچہ جب فتح مکہ کا واقعہ پیش آ گیا تو عرب کی ہر قوم نے اسلام قبول کر لینے میں جلدی کی۔

عام عربوں میں قریش کو انتہائی اثر و رسوخ حاصل تھا۔ تولیت کعبہ نے ان میں خاص نوع کا تقدس پیدا کر دیا تھا۔ عرب پشتوں سے ان کی مذہبی قیادت کے معتقد چلے آتے تھے اور عام امور میں بھی انھی کو منصب قیادت کا حامل

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الفتح۔

سمجھتے تھے۔ فتح مکہ نے یہ سب سے بڑی رکاوٹ درہم برہم کر ڈالی اور جس سیاہ پردے نے اسلام کی آسمانی روشنی کو عام نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا وہ تار تار ہو گیا۔

پھر جنگوں اور یورشوں کے باعث بہت سے لوگوں کے دل و دماغ جوشِ انتقام کے باعث ماؤف ہو گئے تھے۔ ان کی عقلوں اور بصیرتوں پر تعصبات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ معاہدۂ حدیبیہ کے بعد فضا عداوت کے گرد و غبار سے پاک ہو گئی۔ باہم میل جول شروع ہوا تو کوئی صاحب دانش و ہوش ایسا نہ تھا کہ اسلام کے متعلق بات چیت سنتا اور لے بے تکلف قبول نہ کر لیتا۔ گویا معاہدۂ حدیبیہ رسول اللہ صلعم کے اصل مشن کے لیے بھی ایک بہت بڑا اور ساز گار موڑ تھا جس کے بعد اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔

داعیوں کا انتظام

فتح مکہ تک مختلف قبیلوں اور گروہوں کی طرف سے گوناگوں خطرے تھے۔ رجیع اور بئر معونہ کے دردناک حادثے پیش آ چکے تھے اور کسی بھی قبیلے یا گروہ یا آبادی کے متعلق نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب بطور خود یا قریش کی انگیخت پر داعیانِ اسلام سے وہی سلوک نہ کرے گا، جو رجیع اور بئر معونہ میں بیدردوں نے روا رکھا تھا۔ لیکن فتح مکہ کے بعد ایسی حالت بالعموم باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے جہاں جہاں مناسب سمجھا، داعی مقرر فرما دیے۔ ان کی حفاظت کے لیے حسبِ ضرورت فوجی دستے بھی بھیج دیے جاتے تھے جن کا مقصد یہ نہ تھا کہ کسی قبیلے یا گروہ سے جنگ کریں، صرف یہ تھا کہ داعیانِ اسلام کی حفاظت کا فرض انجام دیں۔ مثلاً جب حضرت علیؓ کو قبیلۂ مذحج میں تبلیغ اسلام کے لیے نامزد فرمایا اور حضرت نے اس قبیلے کی ایک جماعت کو دعوتِ اسلام دی تو وہ لوگ بے تامل سنگ باری و خدنگ افگنی پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے اپنے رفیقوں کی صف بندی کر کے مقابلے کا انتظام کیا تو مذحج کی جمعیت بھاگ کھڑی ہوئی، مگر مفروریں کا تعاقب نہ کیا گیا، کیونکہ مقصود صرف ذاتی حفاظت تھی نہ کہ جنگ۔ اسی طرح عمروؓ ابن العاص کو تبلیغ کے لیے قبیلہ بلی میں بھیجا گیا، جہاں ان کی ننھیال تھی قبیلہ جذام کے تالاب پر پہنچ کر عمرو ابن العاص کو حملے کا خطرہ پیدا ہوا۔ یہ اطلاع دربار نبوت میں پہنچی تو ابو عبیدہؓ بن الجراح کو فوج دے کر بھیج دیا گیا[1]۔ بلی، جذام وغیرہ قبیلے عرب و شام کے درمیان رہتے تھے لیکن ایسے واقعات شاذ ہی پیش آئے۔ زیادہ تر جماعتوں اور گروہوں نے بہ طیبِ خاطر اسلام قبول کر لیا۔

داعیوں کی ایک فہرست

سیرۃ النبیؐ میں داعیانِ اسلام کی ایک فہرست درج ہے، جو یمن کے مختلف علاقوں نیز حضر موت، بحرین وغیرہ میں بھیجے گئے۔

۱۔ مہاجرؓ بن ابی امیہ (برادر ام المومنین ام سلمہؓ) صنعا (یمن)

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد دوم ص ۲۳۔

داعی	مقام
۲۔ زیادؓ بن لبید	حضرموت
۳۔ خالدؓ بن سعید	صنعا (یمن)
۴۔ عدیؓ بن حاتم	قبیلہ طے (یمن)
۵۔ ابوموسیٰؓ اشعری	زبید و عدن (یمن)
۶۔ معاذؓ بن جبل	جَند (یمن)
۷۔ جریرؓ بن عبداللہ البجلی	ذو الکلاع حمیری (یمن)
۸۔ علیؓ ابن ابی طالب	قبیلہ ہمدان و جذیمہ و مذحج۔
۹۔ مغیرہؓ بن شعبہ	نجران
۱۰۔ خالدؓ بن ولید	اطراف مدینہ
۱۱۔ علاءؓ بن حضرمی	بحرین
۱۲۔ عمروؓ بن العاص	عمان [1]

رسول اللہ صلعم کے نامزد فرمائے ہوئے داعیوں کی یہ فہرست صرف اس حقیقت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت منظم طریق پر بالاہتمام جاری رہی۔ یہ فہرست بہت مختصر ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسے کتنے داعی جابجا بھیجے گئے ہوں گے۔

ابوذرؓ غفاری

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے راہ حق پا لیتا تھا، وہ خود ایک مستقل داعی بن جاتا تھا۔ نیز بعض رؤسائے قبائل نے اپنی زندگیاں تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دی تھیں۔

ابوذرؓ غفاری ابتدائی دور ہی میں اسلام کی نعمت عظمیٰ سے شرف اندوز ہو گئے تھے اور اظہار اسلام کے جوش میں انھوں نے قریش مکہ کے ہاتھوں مار بھی کھائی تھی۔ وہ اپنے قبیلے میں پہنچے تو تبلیغ شروع کر دی اور جلد ہی نصف کے قریب قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔ باقی لوگوں نے کہا کہ ہم اس وقت اسلام قبول کریں گے، جب رسول اللہؐ مدینے تشریف لے آئیں گے۔ چنانچہ ہجرت کے بعد باقی لوگ بھی حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ گویا قبیلۂ غفار کو برکات اسلام سے بہرہ مند کرنے کا شرف حضرت ابوذر ہی کو حاصل ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

قبیلۂ اسلم، غفار کے قریب تھا۔ وہ بھی مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح قبیلہ جہنیہ بھی ابتدائی دور ہی میں دائرہ اسلام کے اندر آ گیا۔ قبیلۂ اشجع نے کفر کی حالت میں مصالحت کی، پھر اسلام قبول کر لیا۔ (مولف)

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد دوم (ص ۲۲-۲۴)

طفیلؓ بن عمرو دوسی

بالکل یہی کیفیت طفیلؓ بن عمرو دوسی کی ہے۔ وہ نبوت کے دسویں سال مکہ مکرمہ آئے۔ چونکہ ایک قوم کے رئیس ہونے کے علاوہ دانش مند اور شاعر بھی تھے، اس لیے اہلِ مکہ نے آبادی سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ طفیلؓ کا اپنا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم کا ذکر کرتے ہوئے استقبالیوں نے مجھے بطور خاص تاکید کی کہ اس کے قریب نہ جانا۔ یہ بھائی کو بھائی سے جدا کر دیتا ہے اور ہمارے کاموں میں اس نے ابتری ڈال دی ہے۔ مبادا تمھارا اور تمھاری قوم کا بھی یہی حال ہو۔

طفیلؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس نصیحت پر پورے اہتمام سے عمل کیا۔ یہاں تک کہ حرم پاک میں جاتا تو اپنے کانوں میں روئی رکھ لیتا تاکہ رسول اللہ صلعم کی آواز تک نہ سن سکوں۔ ایک روز صبح ہی صبح حرم میں گیا تو رسول اللہ صلعم نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی آواز میرے کانوں میں پہنچی تو دل پر عجیب اثر ہوا۔ جو کچھ میں نے سنا وہ نہایت عجیب کلام تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ اچھے بُرے کی تمیز رکھتا ہوں۔ آخر کیوں آپ کی بات نہ سنوں؟ چنانچہ ٹھہرا رہا جب رسول اللہ صلعم حرم پاک سے واپس ہونے تو میں بھی پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ پھر لوگوں کے بہکانے کا پورا واقعہ حضور صلعم کو سنایا اور عرض کیا کہ مجھے اپنی بات سنا دیجیے۔ رسول اللہ صلعم نے قرآن سنایا، طفیلؓ اسی وقت مسلمان ہو گئے۔

رخصت ہوتے وقت طفیلؓ نے اپنی قوم کے لیے دعاے ہدایت کی درخواست کی۔ واپس گھر پہنچے تو ان کے اپنے اقربا تو مسلمان ہو گئے لیکن قوم میں پیغامِ حق کی اشاعت دلخواہ طریق پر کامیاب نہ ہوئی۔ وہ پھر حضور صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رنجیدہ تھے اس لیے بددعا کی درخواست کی۔ حضور صلعم نے فرمایا: "اللھم اھد دوسا" اے خدا قوم دوس کو راہِ ہدایت دکھا دے۔

ساتھ ہی طفیل سے فرمایا: لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ۔ ان سے نرمی اور محبت کا برتاؤ کرو۔

چنانچہ اس مرتبہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

باب ۲

پیغام حق کے معجز نما نتائج

(۲)

قرآن مجید کا اثر بعض اوقات قرآن مجید کی کوئی آیت سن کر کسی کے دل پر ایسا اثر ہو جاتا تھا کہ وہ بے تامل اسلام قبول کر لیتا تھا۔ طفیل بن عمرو دوسی نے قرآن ہی کی چند آیات سن کر اپنے آپ کو ملامت کی تھی کہ بے وجہ بہکانے والوں کی بات مان کر کانوں میں روئی ٹھونسے رہا۔ پھر خود اسلام قبول کر لیا جو پورے قبیلۂ دوس کے اسلام کا باعث بنا۔

جبیرؓ بن مطعم اسیرانِ بدر کا فدیہ ادا کر کے انھیں رہا کرانے کے لیے آئے تھے۔ ایک روز رسول اللہ صلعم نے سورۂ طور کی یہ آیتیں پڑھیں:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝ (طور: ۳۵-۳۶)

کیا یہ (بغیر کسی کے پیدا کرنے کے) آپ سے آپ پیدا ہو گئے؟ یا یہ لوگ خود اپنے آپ کو پیدا کرنے والے ہیں یا انھوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا؟ بلکہ حقیقت یہ ہے ان کے دل یقین سے خالی ہیں۔

جبیرؓ کے کان میں ان آیتوں کی بھنک پڑی تو ان کا بیان ہے کہ میرا دل پرواز کر گیا[۱]۔ چنانچہ وہ اسی وجہ سے مسلمان ہو گئے۔ اسی لیے رسول اللہ صلعم قیدیوں یا باہر سے آنے والے غیر مسلم مہمانوں کے متعلق فرمایا کرتے تھے، انھیں ایسی جگہ ٹھہراؤ جہاں سے قرآن خوانی کی آواز ان تک پہنچتی رہے۔

ضماد بن ثعلبہ ضماد بن ثعلبہ قبیلۂ ازد کا رئیس اور زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ صلعم کا دوست تھا۔ وہ مکہ آیا تو رسول اکرم صلعم کے مخالفوں سے سنا کہ آپ کو (معاذ اللہ) جنون ہو گیا ہے۔ وہ جھاڑ پھونک بھی کرتا تھا۔ اس غرض سے بارگاہِ رسالت میں پہنچا کہ اپنے جھاڑ پھونک کے کمالات کا مظاہرہ کرے۔ کہا بھی کہ لائیے میں آپ کا علاج کروں۔ آپؐ نے فرمایا:

الحمد لله نحمده و نستعينه من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له، اشهد ان لا اله

تمام ستائشیں اللہ کے لیے ہیں، ہم اسی کی ستائش کرتے ہیں اسی سے مدد مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا غلط راہ پر نہیں ڈال سکتا۔ جسے اللہ راستے سے

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد دوم (ص ۱۶-۱۷)

الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہ۔

پھر اسے کوئی ہدایت کرنے والا بیدھے راستے پر نہیں لگا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یگانہ و یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

ضماد پر ان کلمات کا ایسا اثر ہوا کہ عرض کیا پھر پڑھیے۔ حضور صلعم نے ان کا اعادہ کیا۔ ضماد بولا، ایک مرتبہ اور جب تیسرے مرتبہ بھی سن چکا تو کہا: میں نے کاہنوں کی باتیں، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصیدے سُنے ہیں لیکن ایسے کلام سے آج تک سامعہ لذت گیر نہیں ہوا۔ پھر خود بھی بیعت کی اور جس قبیلے کا رئیس تھا اس کی طرف سے بھی بیعت کر لی[۱]

غرض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایک ہی فرد کا قبول اسلام بہت بڑی جماعت کے لیے ہدایت کی دستاویز بن گیا۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں گویا دل اور دماغ کی جگہ لوہے اور پتھر کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے، جن پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ لیکن نہ پہلی مثالیں فریضۂ تبلیغ و اشاعت کی طرف سے تساہل کا باعث بنیں اور نہ آخری مثالوں نے ہمت میں افسردگی پیدا کی۔ ہر دور اور ہر حالت میں "بلغ ما انزل الیک" کا حق ایسے انداز میں ادا کیا گیا کہ ہم اسے احسن سے احسن انسانی سعی و جہد کی آخری حد قرار دے سکتے ہیں۔

سازگار اسباب و عوامل

کچھ شبہ نہیں کہ چند اور اسباب بھی تبلیغ و اشاعت کی کامیابی میں معاون و سازگار رہے، مثلاً:

۱۔ انتہائی جوش و خروش کے باوصف ہر مرحلے میں قریش مکہ کی ناکامی سے ان کے دبدبے اور وقار پر سخت ضرب لگتی رہی۔ ان کا ہر نیا اقدام بے چارگی اور اضطرار کا مظاہرہ بنتا گیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی قوت دفاع، شان ایثار اور جذبۂ فداکاری اُحد جیسی ضرب کھا کر بھی برابر بڑھتا اور ترقی کرتا گیا۔

۲۔ معاہدۂ حدیبیہ کے بعد سب کو فی الجملہ یقین ہو چکا تھا کہ قریش ایسا کارتوس ہیں جو چل چکا ہے، ایسی توپ ہیں جس کا گولہ بارود ختم ہو چکا ہے، ایسا طوفان ہیں جس کا زور ٹوٹ چکا ہے، اس لیے ان کے (قریش کے) رعب و ہیبت سے دل خالی ہو چکے تھے۔ آفتاب کی حدت نئے برفستان میں نرمی اور گداز کا عمل شروع کر دیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد برف پگھل کر پانی بن چکی تھی۔ لہٰذا نزدیک و دور کے لوگ گروہ در گروہ اور جوق در جوق آ آ کر اسلام قبول کرنے لگے یا بہ طیب خاطر اسلام کی پناہ کے خواہاں ہو گئے۔

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد دوم (ص: ۱۴۰)

۴۔ مولانا سید سلیمان مرحوم فرماتے ہیں:

مکہ میں روم و فارس کی جنگ کے متعلق جو پیشین گوئی آنحضرت صلعم نے فرمائی تھی، وہ ٹھیک فتح بدر کے موقع پر پوری اتری اور قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق سات برس کے بعد رومیوں نے فارس پر کلی فتح پائی۔ اس عظیم الشان معجزے کا یہ نتیجہ ہُوا کہ ایک خلق کثیر نے اسلام کی صداقت کا اقرار کیا۔[1]

محیر العقول معجزہ اس تبلیغ کے درخشاں نتائج کی کچھ جھلکیاں آپ کو اس باب میں نظر آئیں گی، جس میں مختلف قبیلوں اور گروہوں کے وفود حضور صلعم کی بارگاہ میں پہنچے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ قدیم مذہبی صحائف یا تاریخ کے اوراق پر داعیان حق کی جو سرگزشتیں محفوظ ہیں، ان میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ کسی داعی کی حیات میں اس کا لایا ہوا پیغام اس پیمانے پر اشاعت پذیر ہُوا ہو جو رسول اللہ صلعم کے پیغام حق کو میسر آیا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی ملک کی آبادی اپنے انفرادی یا اجتماعی نظم و ضبط کے اعتبار سے اس درجہ پست، ابتر اور بدحال نہ تھی، جس درجہ ظہور اسلام کے وقت عرب قوم بدحال تھی۔ لیکن آغاز ہجرت سے رسول اللہ صلعم کی وفات تک اس قوم کی حالت میں جو غیر معمولی انقلاب رُونما ہوا، اس کی نظیر سے تاریخ کے صفحات بالکل خالی ہیں۔ کیا دنیا اس محیر العقول معجزے سے انکار کی جرأت کرسکتی ہے؟

کرۂ ارض کی بہترین قوم سورۂ انفال میں ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ۔ (آیت: ۲۴)

مسلمانو اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو، جب وہ پکارتا ہے کہ تمہیں روحانی موت سے نکال کر) زندہ کر دے۔

مولانا آزاد مرحوم و مغفور فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی دعوت انسانیت اعلیٰ کے انبعاث و قیام کی دعوت تھی:

غور کرو اس دعوت نے وقت کی تمام مُردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر مُردوں کو جلانا اور کیا ہوگا کہ عرب کے ساربانوں میں ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، عائشہؓ، خالدؓ، ابن وقاصؓ، ابن العاصؓ (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر عالم پیدا ہو گئے اور

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد دوم۔ ص ۱۷۰ سید صاحب مرحوم و مغفور نے اس سلسلے میں ترمذی تفسیر سورۂ روم کا حوالہ دیا ہے۔

پچاس برس کے اندر عرب کے وحشی کرۂ ارض کی سب سے بڑی قوم تھے۔[1]

آج کی حالت آپ آجکل کے عام حالات پر غور فرمائیں۔ ایک ذہین بچہ پندرہ سولہ سال میں تعلیم مکمل کر کے مقابلے کا امتحان دیتا ہے۔ وہ اعلیٰ نمبروں میں پاس ہو جائے تو اسے اکیڈیمی میں تعلیم و تربیت دی جاتی ہے پھر اسے کسی کے ساتھ کام سیکھنے کی غرض سے لگایا جاتا ہے۔ یہ ساری منزلیں طے ہو جائیں تو کسی ضلع میں ضمنی کام پر مقرر کیا جاتا ہے۔ انگریزی دور میں چھوٹے چھوٹے ضلعوں کا کام بھی خاصی تربیت و تجربہ حاصل کر لینے کے بعد سونپا جاتا تھا اور پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ہر شخص انتظامی امور کی ذمہ داریوں سے اطمینان بخش طریق پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا اور آج حالت اس سے بہتر معلوم نہیں ہوتی۔

ابتدائی دور کے مسلمان ابتدائی دور کے مسلمانوں کی سرگزشت پر ایک نظر ڈالیے۔ وہ زیادہ تر ساربانی یا کسی قدر سادہ سی زراعت و تجارت کرتے ہوئے قرآن مجید سے آشنا ہوئے۔ قرآن مجید کے علاوہ رسول اللہ صلعم کے ارشادات سے مستفید ہوتے رہے۔ پھر انھیں اچانک ایشیائی رومی سلطنت اور ساسانی سلطنت سے بیک وقت مقابلہ آپڑا اور ان دونوں سلطنتوں کو اس دور میں وہی حیثیت حاصل تھی جو آج کی دنیا میں روس و امریکہ کو حاصل ہے۔ میدان جنگ ہو یا دائرۂ نظم و نسق، ایوان عدالت ہو یا فریضہ خدمت خلق، کیا کوئی شخص انکار کر سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے واجبات و فرائض اس انداز میں پورے کیے کہ نہ ان کے زمانے سے آج تک ایسی کوئی مثال ملتی ہے اور نہ ان سے پیشتر کا کوئی دور ان کا نقشہ و نمونہ پیش کر سکتا ہے، حالانکہ انھوں نے قرآن مجید کے سوا کچھ نہیں پڑھا تھا اور سنت رسول پاک کے سوا ان کے سامنے عملی روشنی کوئی نہ تھی۔ انھوں نے کسی عسکری یا انتظامی اکیڈیمی میں تعلیم و تربیت نہیں پائی تھی، لیکن وقت کی متمدن ترین سلطنتوں کے نہایت زرخیز علاقوں کے نظم و ضبط کی ذمہ داری ان پر آپڑی تو اسے ایسے طریق پر پورا کیا کہ دیکھنے والوں کو وہ ایک معجز نما کارنامہ معلوم ہوتا تھا۔

خیر و شر میں امتیاز سورۂ انفال کی انتیسویں آیت میں ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا۔

مسلمانو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو (اور اس کی نافرمانی سے بچو) تو وہ تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کی ایک قوت پیدا کر دے۔

مولانا آزاد مرحوم کیا خوب فرماتے ہیں:

---

[1] ترجمان القرآن جلد دوم ص ۵۹۔

عرب کے صحرانشین جن کی ساری زندگیاں اونٹ چرانے میں بسر ہوئی تھیں، یکایک ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں کی نسلتوں کے مالک بن گئے لیکن خیر و رشد میں انبیاء کی ایک ایسی قوت ان کے قبضے میں آگئی تھی کہ جو کچھ کرتے تھے، جس طرح کرتے تھے، وہ حق و عدالت اور خیر و سعادت کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔[1]

فلپ حتی کا اعتراف حقیقت

فلپ حتی اپنی تاریخ عرب میں لکھتا ہے:

اگر کوئی فرد ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں ایسی پیشین گوئی کی جسارت کرتا کہ دس سال کے اندر اندر عرب کی سراسر غیر متمدن اور غیر متعارف سرزمین سے ایک نادیدہ قوت کا ظہور ہونے والا ہے جو وقت کی دونوں عالمی طاقتوں سے ٹکرا جائے گی، ایک یعنی ساسانیوں کی پوری میراث سنبھال لے گی اور دوسری یعنی بیزنطینیوں کے بہترین صوبوں پر قبضہ جمالے گی تو لاریب اسے پاگل قرار دیا جاتا، لیکن یہی صورت حال پیش آئی۔ پیغمبر اسلام (صلعم) کی وفات کے بعد عرب کی بنجر اور بے آب سرزمین، جادو کی چھڑی سے ایسے سورماؤں کی پرورش گاہ بن گئی، جن کی مثال کمیت و کیفیت دونوں کے اعتبار سے کسی دوسری جگہ ملنی بہت مشکل ہے۔ عراق، ایران، شام اور مصر میں خالدؓ بن ولید اور عمروؓ ابن العاص کی مہمیں تاریخ رزم و پیکار کی ان مہموں میں سے ہیں جنھیں نہایت درخشاں انداز میں پایۂ تکمیل پر پہنچایا گیا اور ان کا مقابلہ نپولین، ہینی بال یا سکندر کی مہموں سے کیا جائے تو ترجیح کی مستحق قرار پائیں گی۔[2]

یہ ایک مسیحی کے الفاظ ہیں، جو اصلاً شامی ہے، لیکن عرصہ دراز سے امریکہ میں متوطن ہے۔ عربی مصادر کے تحقیقی مطالعے کے بعد اس نے جو رائے قائم کی، وہ بے کم و کاست پیش کر دی۔ نپولین، ہینی بال اور سکندر قدیم و جدید دنیا کے بہترین جرنیل مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے خاصی دیر تک تعلیم و تربیت پا کر اپنی فطری صلاحیتوں کو جلا دی تھی لیکن خالدؓ اور عمروؓ ابن العاص کی تعلیم و تربیت کا دائرہ کتاب و سنت کے سوا کیا تھا؟ یہی سرچشمہ فیضان حق ان کی ذہنی و بدنی صلاحیتوں ہی کو نہیں بلکہ معنوی یعنی اخلاقی اور روحانی صلاحیتوں کو بھی سراپا نور بنا گیا۔ (مولف)

---

[1] "ترجمان القرآن" (جلد دوم ص ۶۱) [2] تاریخ عرب (انگریزی صفحہ ۱۴۲)

باب ۷

وفود کا ورود

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجًا ۝

—(۱)—

سال وفود

رسول اللہ صلعم کی بارگاہ اقدس میں قبول اسلام کی غرض سے یا قبول اسلام کے بعد افراد اور گروہوں کی آمد بہت پہلے شروع ہوگئی تھی۔ مثلاً قبیلہ مُزینہ کے چار سو افراد رجب ۵ھ (نومبر و دسمبر ۶۲۶ء) میں آئے تھے[۱] لیکن ہجرت کے نویں برس کثرت سے وفود آئے کہ سیرۃ طیبہ میں اس سال کا نام ہی "سال وفود" پڑ گیا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، فتح مکہ کے بعد عرب کی تمام بڑی یا چھوٹی قوتوں یا قبیلوں اور گروہوں پر آشکارا ہو چکا تھا کہ اب ان کے وطن کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان سب کے لیے اب صرف دو راستے رہ گئے تھے،

۱۔ قبول اسلام اور اس کے تمام اوامر و نواہی کی پابندی۔

۲۔ مرکزی اسلامی قوت سے مصالحت اور اس کی حفاظت پر انحصار۔

چنانچہ تمام گروہوں کے نمایندے یا تو اسلام قبول کر کے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوگئے یا مدینہ منورہ پہنچ کر اسلام قبول کر لیا یا ادائے جزیہ کی شرط کے ساتھ اپنے آپ کو اسلامی قوت کی حفاظت میں دے دیا۔

تعداد وفود

ان وفود کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے۔ طبقات ابن سعد میں ستر سے زیادہ وفود کا ذکر الگ الگ ہوا ہے۔ سیرۃ شامی میں یہ تعداد ایک سو چار تک پہنچا دی گئی ہے، اگرچہ محققین کے نزدیک اس سلسلے میں کہیں کہیں ضعیف روایتوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے[۲]۔ ملک کی وسعت، قبیلوں اور ان کی ضمنی و ذیلی شاخوں کی کثرت کے پیش نظر ایک سو چار کی تعداد بھی بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ جن قبیلوں یا ان کی ذیلی شاخوں کے وفود کا ذکر روایتوں میں آ چکا ہے، ان کے علاوہ جتنے قبیلے یا گروہ ہوں گے، وہ سب قلب عرب کی مرکزی قوت سے بے نیاز سی سابقہ روش پر قایم رہے ہوں گے یا عالم انسانیت کے اس حیرت انگیز انقلاب کا اثر ان پر بالکل نہیں پڑا ہوگا، جس کی عملی شہادتیں ستر یا ایک سو چار وفود دے رہے ہیں۔ ظن غالب یہی ہے کہ باقی قبیلوں اور گروہوں کے قبول اسلام کا یا تو کسی وجہ سے ذکر نہ آیا یا ان کی طرف داعی بھیجے گئے اور قبول اسلام کے بعد وہ قبیلے اور گروہ چپ چاپ ان اہم اسلامی مہمات میں شریک ہوگئے، جو رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد وسیع پیمانے پر شروع ہوگئی تھیں۔

---

[۱] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۲۹۱ [۲] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۳۴

بہرحال اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ عرب کی آبادی کا بہت بڑا حصّہ دائرہ اسلام میں آچکا تھا۔ اگر اتفاقیہ کچھ لوگ باقی بھی رہ گئے ہوں تو "اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب" (مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو) کے ماتحت خارج کر دیے ہوں گے۔ اس طرح یہود و نصاریٰ بھی خارج کر دیے گئے۔ اول اس لیے کہ جزیرۃ العرب میں صرف ایک دین رکھنا منظور تھا، دوم اس لیے کہ ان لوگوں نے شرارتیں اور فتنہ انگیزیاں شروع کر دی تھیں۔ اس مسئلے کی شرعی حیثیت اور دلائل و مصالح پر مولانا آزاد مرحوم و مغفور نے "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" میں مفصّل بحث فرمائی ہے۔[1]

دائرہ بیان ظاہر ہے کہ ان تمام وفود کے مفصل حالات نہ ملتے ہیں اور نہ بالتفصیل یہاں بیان کیے جا سکتے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ نے چونتیس وفود کے حالات لکھے ہیں۔[2] "سیرۃ النبیؐ" میں سلسلہ بیان صرف سترہ اور اٹھارہ وفود تک محدود رہا۔ ان میں سے بعض کا صرف نام آیا۔[3] "رحمۃ للعالمین" میں چھبیس وفود کا ذکر آیا ہے[4] اور "اصح السیر" میں انتیس یا تیس کا۔[5]

یہ امر بھی محتاج تصریح نہیں کہ خاص توجہ صرف انھی وفود کے ذکر پر کی جا سکتی ہے، جن سے سیرۃ طیبہ یا اسلام کے کسی اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہو یا مختلف قبیلوں اور گروہوں کے احوال و عادات سامنے آتے ہوں تاکہ اندازہ ہو سکے، ظہور اسلام سے پیشتر عرب کے مختلف گروہ اور قبیلے فکر و نظر اور فہم و بصیرت کے اعتبار سے کس سطح پر تھے اور کس قسم کے اوہام داہیہ میں ان کی زندگیاں گزر رہی تھیں۔ پھر رسول اللہ صلعم کی تعلیم و تزکیہ کے بعد نہایت قلیل عرصے میں وہ انسانی فضائل و مکارم کی کن بلندیوں پر پہنچ گئے، یہاں تک کہ بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے، نہ ان سے پیشتر کوئی قوم بہ حیثیت قوم ان بلندیوں تک پہنچ سکی اور نہ ان کے بعد گزشتہ چودہ سو سال میں کسی قوم کو ان کے قریب پہنچنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ واضح رہے کہ ہمارا موضوع گفتگو وہ بے شمار اسلامی سلطنتیں نہیں، جن کے عجائبات جاہ و جلال کا ذکر آج بھی نگاہوں کے لیے سراسر خیرگی اور دلوں کے لیے سراپا حیرت کا سرمایہ ہے۔ اگرچہ ان میں بھی اسلامیات کے بے شمار اوصاف و خصائص درخشاں نظر آئیں گے، یہاں ذکر صرف اس قوم کا ہے، جو نبوت کے آفتاب کو نین تاب سے بقدر استعداد نورانی کرنیں لے کر دنیا کے ظلمت کدے میں اجالا کر دینے کے لیے سیل نور کی طرح بحر و بر پر چھا گئی تھی۔

وفد مُزَینہ جس وفد کا ذکر سب سے پہلے آیا ہے وہ قبیلہ مُزَینہ ("م" کی پیش اور "ز" کی زبر) کا تھا۔ یہ قبیلہ

---

[1] ملاحظہ "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" باب "جزیرۃ العرب و بلاد اسلامیہ" [2] زاد المعاد جلد دوم [3] جلد اول حصہ دوم (ص ۴۴-۵۳) [4] جلد اول (ص ۲۱۲-۲۵۰) [5] اصح السیر (ص ۴۰۵-۴۵۵)

مُضَر (بن نزار ، بن معدّ بن عدنان) کی ایک شاخ تھا اور مُضَر پر اس کا سلسلہ نسب قریش سے مل جاتا ہے مدینہ منورہ اور وادی القریٰ کے درمیان اس کی آبادیاں تھیں[1] نعمان بن مُقرِّن اسی قبیلے میں سے تھے، جو فتح مکہ کے وقت اپنے قبیلے کے علمدار تھے[2] بعد میں انھوں نے اصفہان فتح کیا۔ یہ وفد چار سو افراد پر مشتمل تھا اور رجب ۵ھ[3] میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ پہلے خزاعی بن عبد نُہم دس آدمیوں کے ساتھ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، ان میں نعمان بن مُقرِّن بھی تھے۔ پھر پورا قبیلہ مسلمان ہوا۔ جب اس قبیلے والوں کو معلوم ہُوا کہ ہجرت ضروری ہے تو وہ چار سو کا وفد لے کر آئے۔ حضور صلعم نے فرمایا:

انتم مهاجرون حيث ما كنتم فارجعوا الى اموالكم[4] — تم لوگ جہاں رہو، مہاجر ہو۔ لہذا اپنے مال و متاع کی طرف لوٹ جاؤ۔

یہ واپس ہوئے تو رسول اللہ صلعم کے ارشاد کے مطابق حضرت عمرؓ نے انھیں زاد راہ کے لیے کھجوریں دیں۔

بنو سعد بن بکر

یہ لوگ قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ تھے۔ انھوں نے رجب ۵ھ میں یعنی جس سال مُزَینہ کا وفد آیا، اپنی طرف سے ضمامؓ بن ثعلبہ کو نمایندہ بنا کر رسول اللہ صلعم کی بارگاہ میں بھیج دیا تھا۔ بخاری میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ہم لوگ مسجد میں رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر تھے، ایک شخص ناقہ پر سوار آیا۔ اسے مسجد کے صحن میں بٹھا کر باندھ دیا۔ پھر لوگوں سے پُوچھا، تم میں سے محمد (صلعم) کون ہیں؟ رسول اللہ صلعم تکیہ لگائے تشریف فرما تھے، ہم نے آپؐ کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس شخص نے رسول اللہ صلعم سے کہا، اے عبدالمطلب کے فرزند میں آپؐ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، اور ذرا سختی سے پوچھوں گا۔ اس پر ناراض نہ ہونا۔ ارشاد ہُوا جو چاہو پوچھو:

سائل: میں آپؐ کے پروردگار اور آپ سے پہلے لوگوں کے پروردگار کی قسم کھا کر پُوچھتا ہُوں کہ کیا آپؐ کو اللہ نے پوری کائنات کے لیے بھیجا ہے؟

حضور صلعم: اللہ گواہ ہے، ہاں۔

سائل: میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ دن رات میں پانچ وقت نماز پڑھیں؟

حضور صلعم: اللہ گواہ ہے، ہاں۔

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے معجم القبائل العرب مرتبہ عمر رضا کحالہ (ص ۱۰۸۳-۱۰۸۴) [2] طبقات کا بیان ہے کہ فتح مکہ میں مُزَینہ کا علم خزاعی بن عبد نُہم کے سپرد ہوا تھا (جلد اول ص ۲۹۲) [3] تقویم کے مطابق رجب ۵ھ ۲۶ نومبر ۶۲۶ء سے شروع ہوا تھا۔ [4] طبقات (جلد اول ص ۲۹۱)

سائل : میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ سال بھر میں اس مہینے (رمضان) کے روزے رکھیں؟

حضور صلعم : اللہ گواہ ہے، ہاں۔

سائل : میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے مالداروں اور دولت مندوں سے صدقہ (زکوٰۃ) لیں اور ہمارے محتاجوں میں بانٹ دیں؟

حضور صلعم : اللہ گواہ ہے، ہاں۔

یہ سن کر سائل نے کہا : آپ جو کچھ لائے ہیں، میں اس پر ایمان لایا۔ میں اپنی قوم کی طرف سے ایلچی کی حیثیت میں آیا ہوں۔ میرا نام ضمامؓ بن ثعلبہ ہے اور میں بنو سعد بن بکر میں سے ہوں[1]

یہ روایت بخاری کے مختلف ابواب میں آئی ہے۔ ضمامؓ بن ثعلبہ نے مزید کہا جو کچھ آپ نے مجھے بتایا ہے، میں اس میں نہ ایک ذرّہ زیادہ کروں گا اور نہ کم۔ وہ جاچکا تو رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا : اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی۔

ضمامؓ نے قوم میں پہنچتے ہی بتوں کی مذمت کی، انھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور شام ہونے سے پہلے پہلے بنو سعد بن بکر کے تمام مرد و زن اسلام لے آئے، مسجدیں تعمیر کیں اور نمازوں کے لیے اذانیں کہنے لگے۔

بعض اصحاب نے اسے ۹ھ کا واقعہ قرار دیا ہے، لیکن طبقات ابن سعد میں ہے کہ ضمامؓ بن ثعلبہ رجب ۵ھ میں مدینہ منورہ پہنچے تھے۔ سوال و جواب میں حج کا ذکر نہیں آیا، یقیناً اس لیے کہ حج بہت بعد میں فرض ہوا۔ نیز عرب حج وعمرہ سے بخوبی متعارف تھے، اگرچہ قریش نے ان دونوں کی صورت بگاڑ رکھی تھی۔ حج فرض ہونے کے بعد اسے بھی از سرِ نو صحیح بنیادوں پر قایم کردیا گیا۔

عبدالقیس

عبدالقیس بحرین کا بہت بڑا عدنانی قبیلہ تھا۔ سیرۃ النبیؐ کا بیان ہے : یہاں اسلام کا اثر بہت پہلے پہنچ چکا تھا۔ سب سے پہلے اس قبیلے کے تیرہ آدمی ۵ھ میں یا اس سے آگے پیچھے کے زمانے میں خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے[2]

طبقات ابن سعد سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اہل بحرین کو تحریر فرمایا تھا کہ ان میں سے بیس آدمی بطور وفد آئیں۔ ان کے رئیس عبداللہ بن عوف الاشجؓ[3] تھے اور وفد میں اشجؓ کے بھانجے منقذ بن حیّان نیز جارود بن العلا بھی تھے جو مذہباً نصرانی تھے۔

---

[1] بخاری، کتاب العلم۔ [2] جلد اول حصہ دوم ص : ۵۰۰ [3] عبداللہ بن عوف کو اشجؓ رسول اللہ صلعم نے قرار دیا کیوں کہ ان کے چہرے پر کچھ نشانات تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ مُنقِذ بن حیّان دورِ جاہلیت میں ھجر (بحرین) سے تجارتی مال یثرب لایا کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد وہ مال لائے اور ایک جگہ بیٹھے ہُوئے تھے۔ پاس سے رسول اللہ صلعم کا گزر ہُوا۔ حضور صلعم نے پوچھا، کون ہو؟ عرض کیا، مُنقِذ بن حیّان۔ ساتھ ہی قبیلے کا ذکر کیا۔ پھر آپؐ نے شرفاے قوم میں سے ایک ایک کا نام لے کر خیریت پوچھی۔ حضور صلعم تجارتی سفروں میں بحرین کے شرفا سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ بعد ازاں مُنقِذ کو اسلام کی دعوت دی، وہ مسلمان ہو گئے اور قرآن مجید کی چند سورتیں بھی سیکھ لیں۔ حضور صلعم نے روانگی کے وقت ایک خط بھی مُنقِذ کے حوالے فرمایا، جو عبدالقیس کے نام تھا۔ منقذ واپس گئے تو نماز باقاعدہ پڑھتے تھے مگر اپنا اسلام مخفی رکھا۔ ان کی اہلیہ نے جو اشجّ کی صاحبزادی تھیں، وضو اور نماز کا ذکر والد سے کیا۔ چنانچہ اشجّ نے مُنقِذ سے ملاقات کی اور ان کے دل میں بھی اسلام سے محبت ہو گئی۔

بہرحال عبدالقیس کا وفد فتح مکہ کے سال (۸ھ[1]) رسول اللہ صلعم کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا: یارسول اللہ ہمارے اور آپؐ کے درمیان کفارِ مُضَر حایل ہیں اور ہم حرمت والے مہینے کے سوا حاضر نہیں ہو سکتے، لہٰذا ہم لوگوں کو واضح اور مفصل احکام فرما دیجیے، جن پر ہم خود بھی عمل کریں اور قوم کو بھی انھی احکام کی پابندی کے لیے کہیں۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ تمھیں چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے اور چار سے منع کیا جاتا ہے۔

اوامر و نواہی احکام یہ ہے کہ:

۱۔ خداے یگانہ و یکتا پر ایمان لاؤ۔ یعنی شہادت دو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔

۲۔ نماز پڑھو۔

۳۔ روزے رکھو۔

۴۔ زکوٰۃ اور مالِ غنیمت میں سے خمس دو۔

ممانعت کی باتیں یہ ہیں:

۱۔ دُبّا یعنی کدّو یا تونبے۔

۲۔ حَنتم یعنی لاکھی برتن۔

۳۔ نقیر یعنی لکڑی کے برتن۔

۴۔ مُزَفّت یعنی روغنی برتن۔

---

[1] اغلب ہے وہ ۸ھ کے ذی قعدہ یا ذی حجہ میں چلے ہوں اور محرم ۹ھ میں واپس ہوئے ہوں۔

عبدالقیس کے ہاں شراب بنانے کے لیے چاروں قسم کے برتن استعمال ہوتے تھے۔ حضور صلعم نے ان کی قطعی ممانعت کر دی۔ گویا شراب نوشی سے روکنے کے سلسلے میں ان برتنوں کے استعمال سے بھی روک دیا، جو شراب بنانے کے لیے کام میں لائے جاتے تھے۔

عبداللہ بن عوف یا اشج

رسول اللہ صلعم نے پوچھا: تم لوگوں میں سے اشج کون ہے؟ عبداللہ نے عرض کیا، میں۔ فرمایا، آدمی کو دو سب سے چھوٹی چیزوں کی حاجت ہوتی ہے: اول زبان، دوم دل۔ پھر فرمایا کہ اے عبداللہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہیں: اول حلم، دوم وقار۔ عرض کیا: یہ خصلتیں مجھ میں پیدا ہو گئیں یا میری جبلت میں تھیں؟ فرمایا: تمھاری جبلت میں تھیں۔

رسول اللہ صلعم کی نظر مبارک ہر فرد کی ایک ایک حرکت پر رہتی تھی اور اس سے اندازۂ طبیعت، و کردار فرما لیتے تھے۔ وفد عبدالقیس میں بیس آدمی تھے۔ سب سواریوں سے اترتے ہی خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے لیکن عبداللہ بن اشج نے بڑے اطمینان سے ناقہ کو باندھا۔ ہاتھ منہ دھویا، کپڑے درست کیے۔ پھر حضور صلعم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ بعد ازاں بیعت کے وقت حضور صلعم نے پوچھا کہ اپنے علاوہ قوم کی طرف سے بھی بیعت کرتے ہو؟ تو سب نے اثبات میں جواب دیا مگر اشج نے عرض کیا کہ ہم اپنا ذمہ لے سکتے ہیں۔ قوم کو دعوت دی جائے گی، وہ لوگ نہ مانیں گے تو ہم ان سے لڑیں گے۔ لیکن ان کی طرف سے وعدہ کیوں کر کر سکتے ہیں؟ حضور صلعم نے فرمایا: یہ درست ہے۔ اس سے اندازہ فرما لیا کہ اشج کی فطرت میں حلم اور وقار ہے۔

انعامات

جارود بن العلا نے مسیحیت چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالقیس میں جارود کے ہم مذہب اور لوگ بھی تھے۔ اسی لیے قاضی سلیمان مرحوم نے لکھا ہے کہ اور عیسائی بھی مسلمان ہو گئے[1]

ان لوگوں کو رملہ بنت الحارث کے مکان میں ٹھہرایا گیا تھا اور یہ دس روز مقیم رہے۔ رخصت کے وقت سب کو انعامات دیے گئے۔ عبداللہ الاشج کو سب سے زیادہ انعام ملا۔ یعنی ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی۔ بارہ اوقیہ چاندی نصف سیر کے قریب ہوتی ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی کر دینا چاہیے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد عرب کے بعض حصوں میں ارتداد کی آندھی چلی تو کئی قبیلوں کے قدم متزلزل ہو گئے، مگر قبیلہ عبدالقیس اسلام پر برابر قائم و استوار رہا۔ (مولف)

---

[1] رحمۃ للعلمین ص ۲۰۲

باب ۷۹

وفود کا ورود

یدخلون فی دین اللہ افواجاً

—(۲)—

دوس طفیل بن عمرو اور قبیلہ دوس کا ذکر پیشتر آچکا ہے۔ طفیلؓ ہی کی وجہ سے یہ قبیلہ نور اسلام سے منور ہُوا۔ ۷ھ میں طفیلؓ اپنی قوم میں سے قریباً اسّی قبیلوں کو لے کر مدینہ منورہ پہنچ گئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ حضرت ابو ہریرہ بھی انھی کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے۔ گویا ان سب کی آرزو تھی کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ رسول اللہ صلعم کی بابرکت صحبت میں بسر ہو اور حضور صلعم نیز باری تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے زیادہ سے زیادہ کاموں کے سرانجام کی سعادت پائیں۔ طفیلؓ نے جنگ یمامہ میں شہادت پائی، جس میں مسیلمہ کذاب مارا گیا تھا اور طفیلؓ کا فرزند ارجمند عمروؓ بن طفیل جنگ یرموک میں شہادت سے سرفراز ہوا۔

ثقیف یاد ہوگا کہ رسول اللہ صلعم نے طائف کا محاصرہ چھوڑا تھا تو دعا کی تھی:

اللھم اھد ثقیفا وأت بھم۔ اے اللہ! ثقیف کو ہدایت کی راہ دکھا اور انھیں میرے پاس بھیج۔

اس دعا کے قبول ہونے کی سرگزشت ملاحظہ فرمائیے۔

عروہؓ بن مسعود ثقفی قبیلہ ثقیف کے ایک بڑے رئیس تھے۔ انھی کے ذریعے سے معاہدۂ حدیبیہ طے ہوا تھا اور وہی تھے جنھوں نے اپنے فرزند ارجمند ابو جندلؓ کی واپسی کے سلسلے میں معاہدہ ختم کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ جب رسول اللہ صلعم طائف کا محاصرہ چھوڑ کر جعرانہ سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے تو عروہؓ بن مسعود نے حاضر خدمت ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ ساتھ ہی اپنی قوم میں تبلیغ اسلام کی اجازت طلب کی۔ رسول اللہ صلعم کو ثقیف کے غرور اور جاہلانہ ہٹ کا پُورا اندازہ تھا۔ فرمایا: کہیں وہ لوگ تمھیں قتل نہ کر دیں۔ عروہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ مجھ سے میری قوم کو ایسی محبت ہے جیسی والدین کو اکلوتے بیٹوں سے ہوتی ہے۔ چنانچہ عروہؓ نے جاتے ہی ہم قوموں کو اسلام کی دعوت دی اور اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ ان لوگوں نے اپنے محبوب سردار کو بُرا بھلا کہا۔ ایک روز عروہؓ نے بالاخانے پر اذان دی۔ ثقیف جوشِ مخالفت میں باہر نکل آئے۔ بنو مالک میں سے اوس بن مالک نے تیر مارا جو عروہؓ کے ہفت اندام میں لگا۔ اس زخم سے خون جاری ہو گیا تو بند نہ ہُوا۔ کچھ لوگ بنو مالک سے انتقام لینے کے لیے نکل پڑے، مگر عروہؓ نے کہا کہ میں نے

خون کرنے والے کو خون معاف کر دیا تاکہ تمہارے درمیان صلح ہو جائے۔ خدا نے میرا اکرام کیا کہ شہادت سے سرفرازی بخشی۔ وصیت کر دی کہ مجھے ان مسلمانوں کے پہلو میں دفن کیا جائے، جو محاصرہ طائف میں شہید ہوئے تھے۔

رئیس احمس کا اقدام سید سلیمان مرحوم و مغفور فرماتے ہیں کہ صخر بن عیلہ رئیس احمس نے جب یہ سنا کہ رسول اللہ صلعم نے طائف کا محاصرہ کر رکھا ہے تو وہ کچھ سواروں کے ساتھ طائف روانہ ہو گیا۔ اس کے پہنچنے سے پیشتر رسول اللہ صلعم محاصرہ چھوڑ کر جا چکے تھے:

صخر نے عہد کیا کہ جب تک اہل طائف آنحضرت صلعم کی اطاعت قبول نہ کریں گے، میں قلعے کا محاصرہ نہ چھوڑوں گا۔ آخر اہل طائف نے اطاعت قبول کر لی۔ صخر نے خدمت نبوی میں اطلاع کی تو آپ نے مسجد میں تمام لوگوں کو جمع کیا اور احمس کے لیے دس بار دعا فرمائی[1]

چند روز بعد اہل طائف نے باہم مشورہ کیا کہ عرب کے سب قبیلے اسلام قبول کر چکے ہیں۔ ہم تنہا مخالفت کرتے رہے تو اس سے نتیجہ کیا نکلے گا؛ آخر فیصلہ ہوا کہ چند سفیر رسول اللہ صلعم کی خدمت میں بھیجے جائیں۔ یہ عروہؓ بن مسعود کے خلوص کی کرشمہ فرمائی تھی کہ ثقیف کے لیے دربار رسالت میں حاضری کا خدا ساز انتظام ہو گیا۔ اس خلوص پر عروہؓ نے اپنے خون شہادت سے مہر ثبت کر دی تھی۔

وفد بہرحال یہ وفد عبد یالیل کی سرکردگی میں مدینہ منورہ روانہ ہوا۔ ثقیف کا یہ وہی رئیس تھا کہ جب رسول اللہ صلعم دعوت حق کے لیے طائف پہنچے تھے تو اس نے نہایت نازیبا جواب دیا تھا۔ بعض کے نزدیک وفد میں ستر آدمی تھے۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ کل انیس افراد تھے۔

صحابہ کرامؓ کا طریقہ یہ تھا کہ سرکاری اونٹ باری باری چرایا کرتے تھے، جس روز وفد ثقیف مدینہ منورہ پہنچا۔ مغیرہؓ بن شعبہ کے اونٹ چرانے کی باری تھی اور وہ شہر سے باہر اسی راستے پر تھے جو جنوبی جانب سے مدینہ منورہ کی طرف آتا تھا۔ دور سے اپنے ہم قوموں کو آتے دیکھ کر اتنے خوش ہوئے کہ دوڑ پڑے تاکہ رسول اللہ صلعم تک یہ خوش خبری پہنچائیں۔ راستے میں حضرت ابوبکرؓ مل گئے آپ خبر سن کر مغیرہؓ کو قسم دلائی کہ یہ خوش خبری مجھے پہنچانے دو۔

مغیرہؓ نے اپنے ہم قوموں کو دربار رسالت میں حاضری کے ضروری آداب سکھائے۔ رسول اللہ صلعم کے ارشاد کے مطابق ان کے لیے مسجد کے صحن میں خیمے نصب کرائے گئے تاکہ وہ نماز اور خطبوں میں قرآن مجید سن سکیں۔ خالدؓ بن سعید بن العاص کو ان کی مہمانداری سونپی گئی۔

چنانچہ یہ نماز اور خطبوں میں قرآن بھی سنتے رہے۔ مسلمانوں کے طریق عبادت سے بھی ان پر گہرا اثر پڑتا رہا۔

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۴۳ ۔ (حسب روایت ابوداؤد باب اقطاع الارضین)

رسول اللہ صلعم بہ نفس نفیس بھی ان سے گفتگو فرماتے۔ آخر یہ لوگ اسلام لانے پر آمادہ ہو گئے۔

شرطیں تاہم انھوں نے شرطیں پیش کیں:

۱۔ ہمارے اکثر لوگ کاروبار تجارت کے سلسلے میں گھر بار سے دور رہتے ہیں، انھیں زنا کی اجازت ہو۔

۲۔ ہماری قوم کا تمام کاروبار سود پر چلتا ہے لہذا سود خواری ہمارے لیے ممنوع نہ ہو۔

۳۔ ہمارے ہاں انگور بکثرت پیدا ہوتا ہے اور شراب ہماری خاص جنس تجارت ہے، لہذا شراب سے بھی نہ روکا جائے۔

رسول اللہ صلعم نے تینوں شرطیں رد کر دیں اور تینوں کے خلاف قرآن مجید کی امتناعی آیات تلاوت فرما دیں۔ آخر میں وفد نے کہا کہ ہماری ربہ (دیوی) یعنی لات کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے؛ حضور صلعم نے فرمایا اسے توڑ دیا جائے گا۔ وہ بولے: اگر ہماری دیوی کو معلوم ہو جائے کہ آپ کا یہ ارادہ ہے تو وہ ہمیں تباہ کر ڈالے گی۔

حضرت عمرؓ سے یہ سن کر ضبط نہ ہو سکا، بولے: کیا تم اتنا نہیں سمجھتے کہ لات ایک پتھر ہے؛ وفد میں سے یہ بات کہنے والا کھسیانا ہو کر بولا: عمرؓ! ہم تم سے بات کرنے نہیں آئے۔

دیکھیے، جب اوہام انسانوں کے دل و دماغ پر غلبہ پا لیتے ہیں تو فہم سلیم اور ذہن مستقیم مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی روشن حقیقت اپنی قوم پر واضح کرنے کے لیے تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کیا تھا۔ صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا تھا۔ جب حضرت سے پوچھا گیا کہ کیا یہ حرکت تمہاری ہے تو فرمایا کہ بڑے بت سے پوچھو، کیا کہتا ہے؛ یہ سنتے ہی پجاریوں کی گردنیں شرم و ندامت سے جھک گئیں اور بولے "تو اچھی طرح جانتا ہے، یہ بت بات نہیں کرتے۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۝ أُفٍّ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (سورۃ انبیاء: ۶۶، ۶۷)	پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جو نہ تمھیں کوئی نفع پہنچائیں، نہ نقصان۔ تمھاری حالت کس درجہ ناقابل برداشت ہے اور ان کی بھی جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل کورے ہو گئے ہو؟

وفد ثقیف کے لوگ مسلمان تو ہو گئے تھے، لیکن اسلام ابھی ان کے دلوں میں نہیں اترا تھا، لہذا بولے کہ ہم تو اپنے معبود کو توڑ نہیں سکتے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: ہم اپنے آدمی بھیج کر تڑوا دیں گے۔ چنانچہ مغیرہؓ بن شعبہ اور ابوسفیانؓ اس کام کے لیے مامور ہو گئے۔

نماز، زکوٰۃ اور جہاد وفد ثقیف نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے بھی معافی کی درخواست کی۔ نماز کے سلسلے میں تو

معافی مل ہی نہیں سکتی تھی کہ رات دن میں پانچ مرتبہ باجماعت نماز پڑھی جاتی تھی۔ زکوٰۃ ایک سال کے بعد ادا کرنے کی نوبت آسکتی تھی۔ جہاد عموماً فرض کفایہ ہے۔ اس کے فرض عین ہونے کے مواقع خاص ہیں جو روز روز پیش نہیں آتے۔ رسول اللہ صلعم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ مضائقہ نہیں جب یہ لوگ ایمان لے آئیں گے تو زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ حضور صلعم کا یہ ارشاد بھی حرف بہ حرف سچا ثابت ہوا کیونکہ ایمان لانے کے بعد ثقیف زکوٰۃ بھی دینے لگے جہاد میں بھی نمایاں حصہ لیا جس کی شہادتیں تاریخ کے صفحات دے رہے ہیں۔ مثلاً سرزمین پاک و ہند میں اسلام کے ورود کا دروازہ جس نوجوان سالار کے بابرکت ہاتھوں سے کھلا، وہ ثقیف ہی کا ایک مایۂ ناز فرد تھا یعنی محمد بن قاسم اور آج پاک و ہند میں کم و بیش سولہ سترہ کروڑ کلمہ گویان توحید موجود ہیں، حالانکہ یہاں کسی بھی دور میں حکومت کی طرف سے تبلیغ کا منظم سلسلہ جاری نہ ہو سکا۔

ارکان وفد میں سے عثمانؓ بن ابو العاص بہ لحاظ عمر سب سے چھوٹے تھے۔ وہ ابتدا ہی سے اسلام کی طرف مائل تھے۔ لہٰذا اپنے رفیقوں سے الگ ہو کر قرآن مجید اور احکام شریعت سیکھتے رہے۔ رسول اللہ صلعم نے انھی کو امام مقرر فرمایا۔

حسن تدبیر

وفد ثقیف واپس ہوا تو تمام ارکان نے مشورہ کر کے طے کر لیا کہ ان کی قوم کے لوگ جاہل، اکھڑ اور شعلہ مزاج ہیں۔ اگر انھیں جاتے ہی قبول اسلام کی خبر پہنچا دی گئی تو ممکن ہے وہ بھڑک اٹھیں اور صورت حال بگڑ جائے۔ عروہؓ ان کا محبوب سردار تھا، مگر اسے مار دینے میں بھی تامل نہ ہوا۔ اس لیے مناسب یہ سمجھا گیا کہ جاتے ہی اسلام کی خبر نہ سنائی جائے بلکہ قوم کو رفتہ رفتہ اسلام پر لایا جائے۔

چنانچہ طائف پہنچ کر ارکان وفد نے قوم کے لوگوں کو بتایا کہ ہمیں تو ایسے شخص سے سابقہ پڑا جو انہونی باتوں کا حکم دیتا ہے۔ مثلاً، بتوں کو توڑ دو، سودی روپیہ چھوڑ دو، شراب اور زنا کو حرام سمجھو۔ لوگ بولے کہ ان باتوں کو ہم کیونکر مان سکتے ہیں؟ وفد نے کہا کہ پھر تو جنگ کے سوا چارہ نہیں ہتھیاروں اور قلعوں کی درستی کا انتظام کرو۔ تیسرے روز لوگ خود ہی بولے کہ ہم محمدؐ سے کیونکر لڑ سکتے ہیں۔ سارا عرب تو ان کا مطیع و فرمانبردار ہے۔ یہ سن کر وفد کے ارکان بولے کہ دوسری صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو کہا جاتا ہے اسے قبول کر لو۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ہم نے محمد صلعم کو تقویٰ، وفا، رحم اور صدق میں سب سے بڑھ کر پایا اور اس سفر سے ہمیں بڑی برکت حاصل ہوئی۔ چنانچہ پوری قوم حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئی۔

لات کا انہدام

اسی اثنا میں لات کو توڑنے والے بھی آ پہنچے۔ مردوں کے مقابلے میں ثقیف کی عورتیں زیادہ ضعیف العقیدہ اور اوہام پرست تھیں۔ وہ لات کے ٹوٹنے پر مردوں کو طعنے دینے لگیں کہ لڑنے کے بجائے دیوی کو چپ چاپ دشمن کے حوالے کر دیا۔ شاید اس لیے بھی زیادہ غصے میں آئیں کہ لات سے انھیں

دیوی ہونے کے باعث زیادہ محبت تھی۔

ثقیف کی عورتوں ہی نہیں مردوں میں سے بھی اکثر کو یقین تھا کہ لات کو توڑنے والے خود تباہ ہو جائیں گے۔ مغیرہؓ نے تیر سے لات کو نشانہ بنایا تو اتفاق کی بات ہے کہ وہ گر پڑے۔ سب کو یقین ہو گیا کہ لات نے مغیرہؓ پر وار کر دیا۔ لیکن مغیرہؓ اٹھے اور نہ محض بت کو بلکہ اس کی پوری عمارت کو توڑ کر رکھ دیا۔ بعض نے کہا کہ معبد کی بنیاد ان توڑنے والوں کو ختم کر دے گی۔ مغیرہؓ نے یہ سنا تو معبد کی بنیاد بھی کھود ڈالی۔

اس مندر میں چڑھاووں سے جو مال جمع تھا اس میں سے عروہؓ بن مسعود اور ان کے بھائی اسود کے قرض ادا کر دیے گئے۔ باقی مال مستحقوں میں تقسیم ہو گیا۔

قبیلہ طے

طے کے دو رئیس تھے۔ ایک زیدؓ الخیر دوسرے عدی بن حاتم۔ زیدالخیر پہلے شہسواری کی وجہ سے "زیدالخیل" مشہور تھے۔ رسول اللہ صلعم نے انھیں "زیدالخیر" کا لقب دیا اور یہ بھی فرمایا:

مجھ سے عرب کے کسی شخص کا تذکرہ نہیں کیا گیا، جسے میں نے بیان کردہ اوصاف سے کم نہ پایا۔ سوائے زیدالخیرؓ کے کہ ان میں جتنی خوبیاں بیان کی گئی تھیں، اس سے زیادہ ہی پائیں۔

اس وفد میں کل پندرہ آدمی تھے۔ اس کے رئیس زیدؓ الخیر ہی تھے۔ ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہ صلعم نے رخصت کے وقت ہر ایک کو پانچ پانچ اوقیے اور زیدؓ الخیر کو ساڑھے بارہ اوقیے چاندی دی۔ انھیں ایک جاگیر بھی عطا کی، جس کے متعلق فرمان تحریر فرما دیا۔ زیدؓ واپس ہوئے تو فردہ پہنچ کر وفات پائی۔

عدی بن حاتم

عدی بن حاتم کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے مسیحیت قبول کر لی تھی۔ جب رسول اللہ صلعم نے حضرت علیؓ کو دو سو سواروں کے ساتھ طے کے بت فُلس کے انہدام کے لیے بھیجا تو عدی بھاگ کر شام پہنچ گیا۔ اس کی بہن یعنی حاتم کی بیٹی گرفتار ہو کر مدینہ منورہ آئی اور اسے مسجد نبوی کے دروازے کے پاس ایک سایبان میں رکھا گیا۔ وہ خوبصورت اور شیریں کلام تھی۔ رسول اللہ صلعم پاس سے گزرے تو دختر حاتم نے عرض کیا:

هلك الوالد وغاب الوافد فامنن علىّ من الله عليك۔

والد وفات پا گئے۔ چھڑانے والا غائب ہو گیا۔ آپ مجھ پر احسان فرمائیں، اللہ آپ پر احسان فرمائے گا۔

حضور صلعم نے پوچھا: تمھارا چھڑانے والا کون ہے؟ عرض کیا: عدی بن حاتم۔ فرمایا: وہی جو اللہ اور رسولؐ سے بھاگ رہا ہے؟

پھر آپؐ نے فرمایا: میں نے تجھے رہا کیا، مگر جانے کے لیے جلدی نہ کر، جب تیری قوم کا کوئی قابل اعتبار آدمی آ جائے جو تجھے وطن پہنچا دے تو چلی جانا اور پہنچ کر مجھے اطلاع بھیج دینا۔

دختر حاتم کہتی ہے کہ میرا ارادہ بھائی کے پاس شام جانے کا تھا۔ جب قبیلہ قضاعہ کی ایک جماعت آئی تو میں نے

اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ رسول اللہ صلعم کو اطلاع دے دی۔ چنانچہ آپ نے مجھے کپڑے پہنائے، سواری کا انتظام کر دیا۔ خرچ بھی دیا اور میں بھائی کے پاس شام پہنچ گئی۔

عدی حضور رسالت میں

جاتے ہی کہا: قطع رحم کرنے والے ظالم، تو اپنے بال بچوں کو سوار کرا کے لے آیا اور باپ کی قابل حفاظت چیز کو چھوڑ آیا! عدی نے اعتراف کر لیا کہ میں نے واقعی وہی کیا جو تو کہہ رہی ہے۔

پھر عدی نے رسول اللہ صلعم کے متعلق پوچھا، بہن نے کہا کہ میری رائے یہ ہے تم ابھی جا کر ان سے ملو۔ اگر وہ نبی ہیں تو جو ان کی طرف سبقت کرے گا، اسے فضیلت حاصل ہوگی۔ اگر وہ بادشاہ ہیں تو تمہیں ان کی بابرکت عزت کے ساتھ کبھی ذلت نہ اٹھانی پڑے گی۔ تم جو کچھ ہو، وہی رہو گے۔

عدی نے یہ رائے قبول کر لی۔ چنانچہ وہ مدینہ پہنچا اور رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ پوچھا: کون ہو؟ عرض کیا: عدی بن حاتم۔ عدی کا بیان ہے: آپ فوراً اٹھے اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے چلے۔ راستے میں ایک بڑھیا مل گئی اور دیر تک اپنی ضرورتوں کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ آپ ٹھہرے رہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ بادشاہ نہیں۔

گھر پہنچ کر آپ نے چمڑے کا ایک گدا میری طرف بڑھا دیا جس میں پتیاں بھری ہوئی تھیں اور فرمایا: اس پر بیٹھو۔ خود زمین پر بیٹھ گئے۔ عدی نے ہرچند عرض کیا کہ آپ گدے پر تشریف رکھیں۔ فرمایا: نہیں، تم ہی بیٹھو گے۔

پھر آپؐ نے پوچھا، عدی! کیا تو رکوسی[1] نہیں؟

عرض کیا، بالکل بجا فرمایا۔

پھر ارشاد ہوا: کیا تو اپنی قوم سے چوتھ نہیں لیتا؟

عرض کیا، لیتا ہوں۔

فرمایا، یہ تمہارے دین کے رُو سے تو جائز نہیں۔

عدی کہتا ہے مجھے یقین ہو گیا کہ آپ واقعی نبی ہیں۔

آخر میں آپؐ نے آیندہ کے متعلق چند باتیں کہیں۔ مثلاً،

۱۔ وہ وقت دُور نہیں کہ مسلمانوں میں دولت کی اتنی فراوانی ہوگی، گویا یہ بھی بہی پھرے گی اور اسے لینے والا ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔

---

[1] رکوسی ایک فرقہ تھا، جس کا مذہب مسیحیت اور صابیت کے بین بین تھا۔

۲۔ وہ وقت دُور نہیں کہ ایک بڑھیا قادسیہ سے اپنی ناقہ پر سوار ہو کر بیت اللہ کی زیارت کے لیے نکلے گی اور اسے کسی کا خوف نہ ہوگا۔

۳۔ وہ وقت دُور نہیں جب تم سن لوگے کہ مسلمانوں نے بابل کے سفید قصر فتح کر لیے۔

غرض عدی نے اسلام قبول کر لیا اور یہ ارشادات عدیؓ کی زندگی ہی میں پورے ہوگئے۔

بنو حنیفہ بنو حنیفہ میں اسلام کی اشاعت ثمامہؓ بن اثال رئیس بنو حنیفہ (یمامہ) کے ذریعے سے ہوئی۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلعم کا ایک جیش بنو حنیفہ میں سے ایک شخص کو گرفتار کر لایا، لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے۔ رسول اللہ صلعم اس کے پاس پہنچے تو آپ نے فرمایا، یہ تو ثمامہ بن اثال ہیں، پھر کھانا ثمامہ کے پاس بھیجا۔ ایک دُودھ والی اونٹنی ان کے لیے مقرر فرما دی۔ حضور صلعم ثمامہ کے پاس پہنچتے تو اسلام کی دعوت دیتے۔ ثمامہ جواب دیتے۔ اس معاملے کو چھوڑیئے۔ اگر آپ فدیہ چاہتے ہیں تو جتنا چاہیں مانگ لیں۔ تیسرے روز رسول اللہ صلعم نے کہا، ثمامہ کو چھوڑ دو۔ چنانچہ وہ رہا ہو کر بقیع کی سمت گئے۔ وہاں نہا دھو کر آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ پھر مکہ کرمہ جا کر عمرہ ادا کیا اور قریش سے کہا کہ آیندہ رسول اللہ صلعم کی اجازت کے بغیر غلہ مکہ نہیں پہنچے گا۔ اہل مکہ کا انحصار زیادہ تر یمامہ ہی کے غلے پر تھا چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلعم سے التجا کی اور حضور صلعم کے حکم سے غلہ آنے لگا۔

بنو حنیفہ میں اسلام کی اشاعت ثمامہؓ ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

وفد بنو حنیفہ کا وفد ۹ھ (۶۳۰ء) میں آیا اور اس میں انیس آدمی تھے جنھیں رملہ بنت الحارث کے مکان میں ٹھہرایا گیا اور اکثر وفد اسی مکان میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ طبقات کا بیان ہے کہ ان کی مہمانداری میں کبھی گوشت روٹی، کبھی دُودھ روٹی، کبھی گھی روٹی اور کبھی کھجوریں پیش کی جاتی تھیں۔

مسیلمہ بن الحبیب (الکذاب) بھی اس وفد میں شامل تھا لیکن اہل وفد اسے کجاووں اور اونٹوں کی نگرانی کے لیے چھوڑ جاتے تھے۔ رخصت کے وقت رسول اللہ صلعم نے سب کو پانچ پانچ اوقیے چاندی دی۔ اہل وفد نے عرض کیا کہ ہمارا ایک ساتھی کجاووں اور اونٹوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ حضور صلعم نے اس کے لیے بھی پانچ اوقیے چاندی دی اور فرمایا: کجاووں اور اونٹوں کی حفاظت کے باعث اس کا درجہ تم لوگوں سے کم نہیں ہوا۔

یہی مسیلمہ ہے جس نے حضور صلعم کی وفات کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا۔ لیکن ثمامہؓ بن اثال اسلام پر بدستور قائم و استوار رہے۔ مسیلمہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں مارا گیا۔

رسول اللہ صلعم نے اپنے وضو سے بچے ہوئے پانی کا ایک مشکیزہ بھر کر وفد کے حوالے کیا اور فرمایا کہ تمھارے ہاں جو گرجا ہے اسے توڑ کر جگہ کو اس پانی سے دھو ڈالنا اور وہاں مسجد تعمیر کر لینا۔ (مولف)

باب ۵

وفود کا ورود

یدخلون فی دین اللّٰہ افواجاً

—(۳)—

ازد ازد کے وفد میں سات آدمی تھے۔ رسول اللہ صلعم ان کی طرز و روش اور گفتگو سے بہت خوش ہوئے۔ فرمایا: تم لوگ کون ہو؟ عرض کیا: مومن۔ فرمایا: ہر قول کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ تمھارے قول یعنی ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ عرض کیا: پانچ باتیں وہ ہیں، جن کے اعتقاد کا آپ کے بھیجے ہوئے مبلغوں نے حکم دیا۔ اسی طرح پانچ باتوں پر عمل کے لیے کہا۔ پانچ باتیں وہ ہیں جن کی پابندی ہم پہلے سے کر رہے تھے:

۱۔ ایمان و اعتقاد کی باتیں: اللہ پر ایمان، اللہ کے فرشتوں پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان، اللہ کے رسولوں پر ایمان، مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان۔

۲۔ عمل کی باتیں: کلمۂ توحید کہنا، پانچ وقت نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا، بیت اللہ کا حج کرنا جسے زاد و راہ کی استطاعت ہو۔

۳۔ جن پر پہلے سے کاربند تھے: آسودگی پر اللہ کا شکر، مصیبت پر صبر، قضائے الٰہی پر راضی رہنا، امتحان پیش آجائے تو راست بازی پر استواری، اعدا کو برا بھلا نہ کہنا۔

حضور صلعم نے فرمایا: پانچ باتیں میں بتا دیتا ہوں تاکہ تم لوگوں کے لیے بیس خصلتیں پوری ہو جائیں:

ا۔ جن چیزوں کو کھانا نہ ہو، انھیں جمع نہ کرو۔

ب۔ وہ مکان نہ بناؤ جس میں رہنا نہ ہو۔

ج۔ ایسی باتوں میں مقابلہ نہ کرو جنھیں کل چھوڑ دینا ہو۔

د۔ خدا سے تقویٰ اختیار کرو، جس کی طرف لوٹ جانا ہے اور جس کے حضور پیش ہونا ہے۔

ہ۔ ان چیزوں سے رغبت رکھو جو آخرت میں تمھارے کام آئیں، جہاں تمھیں ہمیشہ رہنا ہے۔

تُجیب تجیب بنو کندہ کی شاخ تھے اور وسط حضرموت میں رہتے تھے۔ ان کا وفد بھی سنہ ۹ ھ میں آیا، جو "سال وفود" کہلاتا ہے۔ اس میں تیرہ آدمی تھے اور یہ اپنے صدقات بھی ساتھ لائے تھے۔ رسول اللہ نے فرمایا: یہ مال واپس لے جاؤ اور اپنے فقراء و مساکین میں تقسیم کر دو۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ فقراء و مساکین میں تقسیم کے بعد جو کچھ بچ رہا ہم وہی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ جواب سنا تو کہا: یا رسول اللہ

عرب کی کسی قوم کا وفد ایسا نہیں آیا، جیسا تجیب کا وفد ہے۔ ارشاد ہوا: ہدایت خدا کے اختیار میں ہے۔ جس کے لیے خلا بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اس کے دل میں ایمان کے لیے انشراح پیدا کر دیتا ہے۔

پھر ان لوگوں نے دین کے متعلق کچھ سوالات کیے۔ رسول اللہ صلعم نے جوابات لکھوا کر انھیں دے دیے۔ رخصت کے وقت انھیں بھی معمول کے مطابق زاد راہ کے لیے رقم دی اور پوچھا کوئی باقی تو نہیں رہا؟ انھوں نے عرض کیا، ایک نوجوان ہے جو عمر میں ہم سب سے چھوٹا ہے، اسے سواریوں اور اسباب کی نگرانی کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔

حضور صلعم نے اسے بھی بلوایا۔ وہ آیا تو عرض کیا، یا رسول اللہ آپ نے میرے ساتھیوں کی ضرورتیں پوری کر دیں، میری ضرورت بھی پوری کر دیجیے۔ پوچھا، تیری ضرورت کیا ہے؟ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں۔ خدا سے عرض کریں کہ مجھ پر رحم کرے اور میرے دل کو غنی کر دے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: "اللھم اغفر لہ وارحمہ واجعل غناہ فی قلبہ"۔

حجۃ الوداع میں اس قوم کے کچھ لوگ ملے اور حضور صلعم نے ان سے اس نوجوان کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یا رسول اللہ ایسا قانع شخص نہ دیکھا اور نہ سنا۔ اگر کوئی اس کے سامنے دنیا تقسیم کرے تو وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔

بنو تمیم

اس قبیلے کے وفد میں رؤسا شریک تھے۔ شلاً اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن، عطارد بن حاجب، زبرقان بن بدر اور کل ارکان کی تعداد ستر یا اسی یا نوّے بتائی گئی ہے۔ یہ لوگ مدینہ منورہ پہنچے تو بلالؓ ظہر کی اذان کہہ چکے تھے اور رسول اللہ صلعم کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ارکان وفد نے خاموشی سے انتظار کرنے کے بجائے پکارا: "اے محمد باہر آؤ"۔

انھی لوگوں کی روش کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (حجرات، ۴)	جو لوگ آپ کو (رسول اللہ صلعم کو) حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔

رسول اللہ صلعم تشریف لائے۔ نماز کے بعد وفد تمیم نے کہا کہ ہم اس غرض سے آئے ہیں، آپ سے مفاخرہ کریں۔ سب سے پہلے ان کے خطیب عطارد بن حاجب نے ایک پرزور تقریر میں اپنی قوم کے فضائل کا اظہار کیا۔ یہ مشہور خطیب تھا اور نوشیرواں کے دربار میں حسنِ تقریر کی بنا پر کمخواب کا خلعت حاصل کر چکا تھا۔ رسول اللہ صلعم کے ارشاد پر ثابتؓ بن قیس نے جوابی تقریر کی۔ پھر تمیم کے شاعر زبرقان بن بدر نے قصیدہ پڑھا۔ حضور صلعم نے حسانؓ کو جواب کے لیے ارشاد فرمایا۔ اقرع بن حابس حکَم تھا۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ رسول اللہ صلعم کے خطیب اور شاعر ہمارے خطیب اور شاعر سے افضل ہیں اور پورے وفد نے اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح بنو تمیم حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

بنو سُلیم بنو سُلیم نجد میں رہتے تھے اور ان کی بعض شاخوں کے وطن خیبر کے قریب تک پہنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے بت کی مجاورت اور دیکھ بھال کے لیے ایک شخص غاوی بن عبد العزیٰ کو مقرر کر رکھا تھا۔ غاوی نے ایک روز دیکھا کہ دو لومڑیاں بت پر پیشاب کر رہی ہیں، جیسے کتوں کا خاصا ہے کہ چلتے چلتے ٹانگ اٹھا کر جا بجا پیشاب کر دیتے ہیں، یہ منظر دیکھتے ہی غاوی نے کہا،

اربٌ یبول الثعلبان برأسہ

لقد ذلّ من بالت علیہ الثعالب

(یعنی کیا وہ رب ہو سکتا ہے جس کے سر پر لومڑیاں پیشاب کریں؟ بے شک وہ ذلیل ہوا جس کے سر پر لومڑیاں پیشاب کریں)

یہ کہتے ہی بت کو پاش پاش کیا اور رسول اللہ صلعم کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ غالباً اصل واقعہ بھی سنایا۔ آپ نے نام پوچھا۔ جب اس نے بتایا: غاوی بن عبد العزیٰ تو فرمایا، نہیں تم "راشد بن عبد ربہ" ہو۔ فتح مکہ کے بعد آپ نے راشد کو ایک قطعہ زمین عطا فرمایا جس میں ایک چشمے کا نام عین الرسول تھا۔

رسول اللہ صلعم وہ نام بدل دیتے تھے، جن کے معنی اچھے نہ ہوتے۔ مثلاً جُہَینہ میں سے ایک قبیلے کا وفد آیا تو آپ نے پوچھا: تم لوگ کون ہو؟ عرض کیا: "بنی غیّان" (غیان بمعنی سرکشی) فرمایا، نہیں تم "راشدان" (بمعنی ہدایت پانے والے) ہو۔ ان لوگوں کی وادی کا نام "غوی" تھا یعنی گمراہی۔ آپ نے اس کا نام "رشد" رکھ دیا۔

بنو سلیم کی ہدایت کا وسیلہ قیسؓ بن نُسَیبہ بنے۔ انھوں نے رسول اللہ صلعم کے ارشادات سنے۔ خود اسلام لائے اور قوم سے جا کر کہا کہ میں نے رومیوں اور فارسیوں کا کلام، عرب کے اشعار، کاہنوں کی پیش گوئیاں اور قبیلہ حِمیَر کے مقرر کی تقریریں سنی ہے مگر رسول اللہ صلعم کے ارشادات ان میں سے کسی کے مشابہ نہیں۔ میری پیروی کرو اور حضور صلعم سے اپنا حصہ لے لو۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر بنو سلیم میں سے ایک ہزار آدمی قُدَیدؓ[1] میں آپ سے آ ملے اور اسلام قبول کیا اور کہا ہمیں مقدمۃ الجیش میں رکھیے اور ہمارا جھنڈا سُرخ ہو۔

نجران نجران کے سلسلے میں میرے نزدیک قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری کی رائے مستحق ترجیح ہے یعنی یہ کہ نجران کے وفد دو مرتبہ مدینہ منورہ پہنچے۔ تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جس طرح دوسرے علاقوں کے باشندوں کو دعوت نامے بھیجے اسی طرح ایک دعوت نامہ نجرانیوں کو بھی ارسال فرمایا۔ نجرانی اسقف خاص ضرورت کی بنا پر تین شخصوں سے مشورہ لیتا تھا جو عیسائی نہ تھے، لیکن بہت دانش مند اور مخلص مانے جاتے تھے۔

---

[1] قُدَید مکہ اور مدینہ منورہ کے راستے میں مشہور مقام ہے مکہ مکرمہ سے قریب ہے۔

اول ہمدان کا شُرحبیل بن وداعہ، دوم حمیر کا عبداللہ بن شُرحبیل، سوم بنو حارث بن کعب کا جبار بن قیس۔ ان تینوں نے باری باری خط پڑھا مگر کوئی رائے نہ دے سکے۔ اسقف نے پوری مسیحی آبادی کو بلایا اور خط سُنا کر مشورہ پُوچھا۔ غور و فکر کے بعد رائے یہ قرار پائی کہ شُرحبیل بن وداعہ، عبداللہ بن شُرحبیل اور جبار بن قیس کو مختار و مجاز بنا کر مدینہ منورہ بھیجا جائے۔ وہ جو فیصلہ مناسب سمجھیں، کر آئیں۔

یہ لوگ مدینہ منورہ پہنچے۔ رسول اللہ صلعم سے باتیں کیں۔ حضور صلعم نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید کی آیات سنائیں۔ انھوں نے جزیہ منظور کر لیا۔ معاہدے کی دفعات یہ تھیں:

۱۔ اہل نجران کو رسول اللہ صلعم کی حفاظت حاصل ہوگی۔

۲۔ ان کی جانوں، مذہب، زمین، جایداد کی حالت اور حقوق میں کوئی تغیر نہیں کیا جائے گا اور یہ دفعہ حاضر و غائب، رؤسا و عوام سب پر حاوی تھی۔

۳۔ نہ ان سے بیگار لی جائے گی، نہ عُشر، نہ ان کے علاقے سے فوج گزرے گی۔

اسقف کا وفد

پہلا وفد رسول اللہ صلعم کا فرمان لے کر نجران لوٹا تو اسقف کا چچیرا بھائی ابو علقمہ بشر بن معاویہ یہ سن کر کہ رسول اللہ نبی موعود ہیں، راستے ہی سے پلٹ کر مدینہ منورہ پہنچا اور رسول اللہ صلعم کے دست مبارک پر اسلام کی بیعت کر کے وہیں رہ پڑا۔ کسی ایک جنگ میں شہادت پائی۔

پھر اسقف اور نجران کے بڑے بڑے حاکم، ساٹھ آدمیوں کا وفد لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ ان میں سے چوبیس مشہور سردار تھے۔ رسول اللہ صلعم نے انھیں مسیحی طریقے پر مسجد مقدس نبوی ہی میں عبادت کر لینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ ان سے مختلف اوقات میں بات چیت بھی ہوئی۔ سورۂ آل عمران کی متعدد آیات کا نزول اسی دور کا ہے۔ قاضی سلیمان مرحوم و مغفور نے لکھا ہے کہ پہلے وفد کو مباہلے کی دعوت بھی دی گئی تھی۔ مجھ ناچیز کا احساس یہ ہے کہ ان لوگوں کو مباہلے کی دعوت نہیں دی ہوگی، کیونکہ وہ تو عیسائی بھی نہ تھے، اگرچہ عیسائیوں کے معتمد علیہ مشیر تھے۔ اسقف اور اس کے اہل وفد ہی سے مباہلے کے لیے کہا گیا ہوگا، لیکن وہ مباہلے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جزیہ قبول کر چکے تھے۔ اب انھوں نے گرجاؤں اور پادریوں کے متعلق ایک نیا فرمان حاصل کیا جس کے اہم مطالب یہ ہیں:

۱۔ اسقف اعلیٰ نیز دوسرے اسقفوں، کاہنوں، راہبوں وغیرہ کو خدا اور رسول صلعم کی حفاظت حاصل ہوگی۔

۲۔ گرجا کے چھوٹے بڑے عہدیداروں میں سے کسی کو بدلا نہ جائے گا اور کسی کے حقوق یا اختیارات میں مداخلت نہ کی جائے گی نہ ان کی موجودہ حالت میں تغیر ہوگا۔

۳- شرط یہ ہے کہ وہ رعایا کے خیر خواہ اور خیر اندیش رہیں۔ نہ خود ظلم کریں اور نہ کسی ظلم کرنے والے کا ساتھ دیں۔

سیرۃ النبیؐ میں ہے کہ نجران میں ؛

عیسائیوں کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا جس کو وہ کعبہ کہتے تھے اور حرم کعبہ کا جواب سمجھتے تھے۔ اس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے...... جو شخص اس کی حدود میں آ جاتا تھا، مامون ہو جاتا تھا۔ اس "کعبے" کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی۔[1]

بنو اسد یہ بہت بڑا عدنانی قبیلہ تھا جس کی کئی شاخیں تھیں اور "معجم القبائل العرب" کے بیان کے مطابق یہ نجد اور قبیلہ طے کے ہمسایے میں رہتے تھے۔ یمن سے نکل کر یہ لوگ اجا و سلمیٰ پر چھا گئے۔ اسلام کے بعد حجاز میں بکھر گئے۔ اس قبیلے کے دس آدمی وفد میں آئے تھے جس میں حضرمی بن عامر، ضرار بن الازور، وابصہ بن معبد اور طلحہ بن خویلد بھی تھے۔ یہ وفد ۹ھ کے اوائل میں آیا تھا۔

حضرمی نے حضور صلعم سے عرض کیا کہ ہم لوگ سخت تاریک راتوں اور شدید خشک سالی میں آئے ہیں، حالانکہ آپ نے ہمارے پاس کوئی لشکر نہیں بھیجا تھا۔ سورۂ حجرات کی یہ آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی تھی؛

یَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (۱۷)	(اے پیغمبر) لوگ آپ پر احسان جتاتے ہیں کہ اسلام لے آئے ہیں کہہ دو: مجھ پر اسلام لانے کا احسان نہ دھرو۔ بلکہ تم پر خدا کا احسان ہے کہ اس نے ایمان کی راہ دکھائی۔ اگر یہ لوگ دعوائے اسلام میں سچے ہیں۔

قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری نے شیخ سعدیؔ کا شعر خوب برمحل لکھا ہے؛

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمے کنی
منت شناس ازو کہ بہ خدمت بہ داشتت

وفد خولان یہ لوگ قحطانیوں کی ایک شاخ تھے، جن کا جد اعلیٰ خولان بن عمرو تھا۔ ان کا وفد جو دس افراد پر مشتمل تھا، شعبان ۱۰ھ[2] میں آیا۔ یہ مسلمان ہو کر آئے تھے اور اپنی قوم کی طرف سے بھی نمایندگی کا اختیار لائے تھے۔ ان کے بت کا نام "عم انس" تھا جس کے لیے بے دریغ قربانیاں کرتے تھے۔ وفد کے ارکان نے خود بتایا کہ ایک مرتبہ خشک سالی تھی اسے دور کرنے کے لیے ہم نے مال جمع کیا اور ایک سو بیل خرید ے۔ ان سب کو

---

[1] جلد اول حصہ دوم ص ۷۴ [2] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۲۹۱ [3] شعبان ۱۰ھ کی ابتدا ۲۔ نومبر ۶۳۱ء سے ہوئی۔

ایک ہی دن میں "عم انس" کے لیے قربان کر دیا اور گوشت بت کے پاس ہی درندوں کے لیے چھوڑ آئے۔

یہ بھی بتایا کہ ہماری قوم اپنے جانوروں اور زراعت میں سے ایک حصہ اللہ کے لیے اور ایک حصہ "عم انس" کے لیے مقرر کرتی۔ اگر ہوا کی ناسازگاری کے باعث "عم انس" والا حصہ خراب ہو جاتا تو اللہ والا حصہ "عم انس" کے لیے نامزد کر دیا جاتا لیکن "عم انس" کا حصہ کبھی اللہ کے لیے نامزد نہ ہوا۔

گویا قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں انھی لوگوں یا ایسے ہی دوسرے گروہوں کا ذکر ہے:

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔

(الانعام، ۱۳۶)

جو کچھ خدا نے کھیتی اور مویشی میں سے پیدا کیا ہے اس میں سے ایک حصہ اپنے زعم باطل کے مطابق خدا کے لیے ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے لیے ہے اور ایک حصہ بتوں کے لیے ٹھہرا کر کہتے ہیں یہ ان کے لیے ہے جنھیں ہم نے خدا کا شریک ٹھہرایا ہے بس جو کچھ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو خدا کو پہنچتا نہیں، لیکن جو کچھ خدا کے لیے ہے وہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیا ہی بُرا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلعم نے انھیں فرائض دین سکھائے۔ خصوصیت سے ان باتوں کی نصیحت فرمائی:

۱۔ ایفائے عہد

۲۔ ادائے امانت

۳۔ ہمسایوں سے اچھا سلوک

۴۔ کسی پر بھی ظلم نہ کرنا کیونکہ ظلم قیامت کے دن ظالم کے لیے تاریکی کا باعث ہوگا۔

حضور صلعم نے دستور شریف کے مطابق اس وفد کے ارکان کو بھی زاد راہ دیا۔

وفد محارب

قبیلہ محارب قیس بن عیلان کی ایک شاخ تھا۔ ان کا وفد سنہ ۱۰ھ میں آیا جس میں دس افراد شریک تھے۔ بلالؓ ان کی مہمانداری پر مامور ہوئے۔ ایک روز یہ لوگ ظہر سے عصر تک رسول اللہ صلعم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ آپ وفد میں سے ایک آدمی کو غور سے دیکھتے رہے۔ پھر فرمایا: میں نے تمھیں کہیں دیکھا ہے۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ بجا ارشاد ہوا۔ میں نے عکاظ کے میلے میں آپ سے بہت بُرے انداز میں گفتگو کی تھی اور آپ کے کلام کو بُری طرح رد کیا تھا۔ اس وقت جو لوگ میرے ساتھ تھے وہ سب مر گئے۔ مجھے خدا نے باقی رکھا اور میں نے آپ کی تصدیق کا شرف حاصل کیا۔ ساتھ ہی التجا کی، یا رسول اللہ، خدا سے دعا کیجیے کہ میری مغفرت کرے اور جو برتاؤ میں نے

آپ نے کیا تھا اسے معاف کردے۔ فرمایا: اسلام ان تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے، جو حالت کفر میں ہوں۔

متفرق وفود دوسرے وفود میں سے بعض کی کیفیت درج ذیل ہے:

۱۔ وفد صدا: یہ قحطانی قبیلہ تھا اس میں سے زیاد بن حارث مسلمان ہوا۔ وہی پندرہ آدمیوں کا وفد لے کر آیا۔ پھر پورا قبیلہ حلقۂ اسلام میں آ گیا۔ اس قبیلے کے کنوئیں کے لیے رسول اللہ صلعم نے سات کنکریاں دی تھیں کہ ایک ایک کر کے اللہ اللہ پڑھتے ہوئے کنوئیں میں ڈال دینا۔ پھر اس میں اتنا پانی ہو گیا کہ اس کی گہرائی کا پتا ہی نہ لگا۔

۲۔ اشعریین: یہ یمن کا معزز قبیلہ تھا۔ ۷ھ میں ترپن اشعری ہجرت کے قصد سے جہاز پر سوار ہوئے۔ سوء اتفاق سے ہوائے جہاز کو حبشہ پہنچا دیا۔ وہاں سے یہ لوگ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کے ساتھ مدینہ پہنچے۔ ابو موسیٰؓ اشعری انھی کے ساتھ آئے تھے۔

۳۔ زبید سے عمرو بن معدیکرب دس آدمیوں کے ہمراہ آئے، فتنہ ارتداد میں یہ لوگ بھی ڈگمگا گئے اور ازسرِ نو اسلام لائے۔

۴۔ ان کے علاوہ ہمدان، کندہ، حضرموت، بجیلہ، مہرہ، حمیر، جعفی، باہلہ، غسان، ثعلبہ، مرہ، فزارہ، کلاب، کنانہ، عامر بن صعصعہ اور مذحج کی مختلف شاخوں، اشجع، بکر و تغلب، شیبان، مراد، صدف، سعد ھذیم، بلی، بہرا، عذرہ، سلامان، کلب، جرم، سعد العشیرہ، عنس، نخع، غامد، خثعم، جذام وغیرہ کی طرف سے وفد آئے۔

تکمیل کار غرض رسول اللہ صلعم کو اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے مبعوث فرمایا تھا وہ بوجہ احسن پورا ہو گیا۔ جزیرۃ العرب پر صدیوں سے بت پرستی، بے دینی، بے تنظیمی اور وحشت و جاہلیت کی خوفناک تاریکی چھائی ہوئی تھی، انسانیت کی شاید ہی کوئی نفرت خیز و کراہت انگیز بیماری ہو، جو زیادہ سے زیادہ بُری شکل میں اس سرزمین کے اندر موجود نہ تھی۔ رسول اللہ صلعم کی تعلیم و تزکیہ کی بدولت صرف تئیس سال کی قلیل سی مدت میں وہ خطہ دین حق کا جلوہ زار بن گیا اور ایک ایسی قوم تیار ہو گئی، جو اس دین کی نورانی قندیلیں لے کر وطن سے نکلی تو شرق و غرب میں جہاں جہاں پہنچی اسے سراپا نور بناتی گئی۔ وقت کی دنیا نے بیس سال کے اندر اندر زبان حال سے اعتراف کر لیا کہ اس سے بہتر قوم چاند اور سورج کی آنکھوں نے نہیں دیکھی۔ وہ اپنی ہر ادا میں نرالی تھی اور اس کا نصب العین کیا تھا؛ انسانوں کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلا کر صرف خدائے واحد کی عبودیت پر استوار کرنا، ہر مصنوعی اور جبلی امتیاز کو مٹا کر حسن انسانیت کے لیے صرف تقویٰ اور عمل صالح کو معیار بنا دینا۔ کالے گورے، شرقی غربی اور عربی عجمی کو ایک برادری میں منسلک کر دینا، کیونکہ سب آدم کی اولاد تھے۔ سب ایک گھرانے کے افراد تھے۔ دلوں اور دماغوں کو

وساوس و اوہام کی جن آہنی زنجیروں نے جکڑ رکھا تھا، وہ گویا جادو کی چھڑی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور عرب کے ساربانوں نے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھ دی، جو اس دنیا کی بہترین تہذیب تھی اور اس میں کائنات انسانیت کے ہر مسئلے کا حل موجود تھا۔ علامہ اقبالؒ نے پیروان رسول اکرم صلعم کی والہیت حق کا نقشہ کتنے دل پذیر انداز میں کھینچا ہے:

محفلِ کون و مکان میں سحر و شام پھرے   مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
کوہ میں، دشت میں، لے کر ترا پیغام پھرے   اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

(مولف)

باب ۳

اسلامی فوجوں کا سیلِ فتح

اصلاحاتِ جنگ

—(۱)—

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۔
(نمل: ۳۴)

جب بادشاہ بستی میں گھستے ہیں تو اسے خراب کر ڈالتے ہیں اور وہاں کے سرداروں کو بے عزتی کی پستی میں گرا دیتے ہیں اور یہی ان کا شیوہ ہے۔

فوجی یورشیں فوجوں کا سیلاب جب میدان جنگ کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے اندر سے غیظ وغضب، جوش و غرور اور بغض و انتقام کی لہریں اٹھتی ہیں۔ قدیم جنگی داستانوں بلکہ ملکی تاریخ میں جنگ کے جن نمایاں واقعات کی گم شدگی کی شکایت کی جاتی ہے انھیں زیادہ تر انھی طوفان خیز موجوں نے اپنی آغوش میں چھپا لیا ہے۔ سمندر میں جب طوفان خیز لہروں کا تلاطم برپا ہوتا ہے تو اس کے دردانگیز نتائج کا حال ان لوگوں کو معلوم نہیں ہو سکتا جو شام کے وقت ساحل کے کنارے اس لیے جمع ہو جاتے ہیں کہ سطح کے ہر جدید تغیر سے ایک نیا لطف اٹھائیں۔ ان کی حقیقت سے صرف وہی خانہ ویران واقف ہو سکتے ہیں جن کے گھر کی دیواروں سے یہ سیلاب ٹکرا کر گزرتا ہے۔

ایران و بابل کے بوسیدہ کھنڈر یونانی فوج کے جنون خیز و وحشت انگیز ہجوم اور سودا زدہ تگ و دو کی داستان" سکندر نامہ کے اوراق کی سطح پر اگرچہ ذوق نظر کے لیے مقناطیسی اثر رکھتی ہے، لیکن اس کا فسانۂ عبرت صرف ایران کے کھنڈر ہی سنا سکتے ہیں۔ نظامیؔ نے یہ فسانہ سنا تھا اور انھوں نے (ایرانی کھنڈروں) اسے دیکھا بھی ہے۔

دنیا میں اب بھی معرکہ کارزار گرم ہوتے ہیں۔ فوجیں جوش و غرور میں بادل کی طرح امنڈ آتی ہیں، بجلی کی طرح کڑکتی ہیں، سیلاب کی طرح آگے بڑھتی ہیں۔ بیسویں صدی کے مناظر جنگ میں اگرچہ قدیم زمانے کے خوفناک چہرے، روئیں تن انسانوں کے ہاتھ پاؤں اور ہفت خواں سیاحت کے عجیب و غریب مراحل نظر نہیں آتے۔ تاہم "مہذب" انسانوں کا یہ سیلاب بھی جب کسی شہر سے ٹکراتا ہے تو ایران و بابل کے بوسیدہ کھنڈر دوبارہ ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور خانہ بدوش انسانوں سے کہیں زیادہ وہ تمدن مظلوم چیخ اٹھتا ہے۔

عربوں کا سیلِ فتح لیکن دنیا کی ہر ابتدا اور انتہا کے درمیان ایک کڑی اور بھی ہوتی ہے جس کا تناسب ان

دونوں سلسلوں کے بیچ ہی میں رکھنے سے نمایاں ہو سکتا ہے۔ گزشتہ قوموں کے کارناموں کی داستانیں بیت المقدس، بابل اور ایران کی چار دیواریاں سنا چکیں۔ جدید دور کے فنون حربیہ و مناقب عسکریہ کا نظارہ لیژ[1] اور نامور[2] کے قلعوں کی برجیوں پر سے لیا جا سکتا ہے۔ لیکن تاریخ کی زبان کسی زمانے میں بند نہیں رہی۔ دور قدیم و دور جدید کے وسط میں ایک زمانہ اور بھی گزرا جس میں ایک گمنام قوم صحرائے عرب سے اٹھی، سیلاب کی طرح بڑھی۔ موجوں کی طرح کرۂ ارض پر پھیل گئی۔ دنیا نے اس سیلاب کی رَو میں بھی ظلم و درندگی کی انھی لہروں کو دیکھنا چاہا، جو ہمیشہ طوفان میں اٹھتی رہی ہیں لیکن ذوق نظارہ ناکام ہو کر گوشۂ چشم میں چھپ گیا۔ دنیا نے دیکھا کہ وہ مختلف مادی طاقتوں سے ٹکرائی۔ اس نے قلعوں سے ٹکر لی، عظیم الشان پہاڑوں کو ٹھوکر لگائی۔ تاہم نہ تو کسی کی جھونپڑی کو اجاڑا، نہ کسی عظیم الشان محل کو برباد کیا۔ نہ تمدن کی یادگاریں مٹائیں اور نہ تہذیب کے آثار قدیمہ منہدم کیے۔ وہ فاتحانہ جوش میں سیلاب کی طرح بڑھی۔ لیکن جب ممالک مفتوحہ میں داخل ہو گئی تو گرداب کی طرح سمٹ گئی۔ دنیا نے یہ عجیب و غریب متضاد منظر دیکھا اور دم بخود رہ گئی۔ صرف ایک ابن خلدون کی زبان میں حرکت نطق باقی رہی۔ وہ اس کے فلسفیانہ عوامل و اسباب پوچھنا چاہتی ہے لیکن روحانیت کے دریا میں عقل و فلسفہ دونوں کو لے کر کہا جاتے ہیں۔ یہاں یہ سوال بالکل بیکار ہے۔ تاہم اگر ہم بانیٔ فلسفۂ تاریخ[3] کی خواہش پوری کر سکتے ہیں تو ہمیں اس کے پورا کرنے میں دریغ نہ کرنا چاہیے۔

بہترین انسانی مقاصد

دنیا میں جب کوئی فوج فاتحانہ جوش میں میدان کا رُخ کرتی ہے تو اس کے دل کو مختلف طریقوں سے گرمایا جاتا ہے۔ طبل و قرنا کی ہنگامہ خیز صدائیں اس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ سپہ سالاروں کی فصاحت اور رجز خوانی کی آتش بیانی اسے گرم جوشی کے ساتھ رخصت کرتی ہے۔ علم و پرچم لہرا لہرا کر انسانی آتش غضب کو بھڑکاتے ہیں۔ وطن پرستی کی مقدس قسمیں دی جاتی ہیں۔ قوم پرستی کا حلف اٹھوایا جاتا ہے اور قدیم کارنامہ ہائے شجاعت ایک ایک کر کے یاد دلائے جاتے ہیں۔ انھیں چیزوں کا پیدا کیا ہوا جوش میدان جنگ میں سنگدلی، بے رحمی، قساوت اور وحشت و درندگی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جب کسی شہر سے ٹکراتا ہے تو اسے چور چور کر دیتا ہے۔

لیکن اسلامی فوج کی حالت پوری دنیا کے فوجی نظاموں سے مختلف تھی۔ نہ تو طبل و دہل نے اس کا دل بڑھایا اور

---

[1] Leige بلجیم کا شہر، برسلز کے جنوب مشرق میں جرمنی کی سرحد سے صرف دس میل ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں جرمنوں نے بلجیم کی غیر جانبداری سے بے پروا ہو کر اس پر حملہ کر دیا تھا کیونکہ بلجیم میں سے ہو کر فرانس پر حملہ سہل تھا۔ لیژ پر ۵۔ اگست ۱۹۱۴ء کو حملہ ہوا تھا اور دس روز میں اس شہر کے آخری قلعے سر ہو گئے تھے۔ یہ مقالہ پہلی جنگ عظیم ہی کے زمانے میں لکھا گیا تھا۔

[2] Namur بلجیم کا شہر برسلز سے پینتیس میل جنوب مشرق میں جس پر لیژ کے بعد جرمنوں کا حملہ ہوا اور ٹھیک دس روز میں اس پر بھی قبضہ ہو گیا۔ [3] یعنی ابن خلدون، جو واقعی فلسفۂ تاریخ کا بانی ہے۔

نہ اس کے سامنے آتش بازیوں کی آگ بھڑکائی گئی نہ سرخ و سبز جھنڈیوں کے نیچے اس کی نمایش کی گئی۔ نہ اس کے سامنے وطن پرستی کے ترانے گائے گئے۔ نہ اس کے دل میں قومیت کی یاد تازہ کرائی گئی اور نہ عرب کی قدیم شجاعت کی داستانوں سے اس کا خون گرمایا گیا۔ وہ خدا کی راہ میں، حق و صداقت کے عشق میں، خدا کا نام لے کر اٹھی۔ قوموں اور فوجوں کے بے شمار ملکی و نسلی مقصدوں کی جگہ صرف ایک روحانی مقصد اپنے سامنے رکھا،

لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا۔ — تاکہ اللہ کا کلمہ حق سر بلند ہو۔

وہ صرف ایک اخلاقی دستور العمل لے کر میدان جنگ کی طرف بڑھی،

اغزوا باسم اللّٰہ فی سبیل اللّٰہ اغزوا ولا تغلوا و لا تغدروا و لا تمثلوا و لا تقتلوا ولیدا۔ (صحیح مسلم) — خدا کی راہ میں خدا ہی کا نام لے کر لڑنا، خیانت نہ کرنا، بدعہدی نہ کرنا، دشمن کے ہاتھ پاؤں، ناک، کان نہ کاٹنا، بچوں کو قتل نہ کرنا۔

یسّروا ولا تعسّروا وسکّنوا و لا تنفروا۔ (صحیح مسلم) — آسانی پیدا کرنا، دشواری پیدا نہ کرنا، لوگوں کو اطمینان دلانا، مفتوحوں کو وحشت زدہ اور غیر مطمئن نہ کر دینا۔

رسول اللہ صلعم کے ارشادات

استودع اللّٰہ دینکم و امانتکم وخواتیم اعمالکم۔ (ابوداؤد، کتاب الجہاد) — میں تمہارے دین کو، تمہاری امانت کو، تمہارے نتائج و اعمال کو خدا کے سپرد کر کے تمہیں میدان جنگ میں جانے کے لیے رخصت کرتا ہوں۔

انطلقوا باسم اللّٰہ و باللّٰہ وعلی ملۃ رسول اللّٰہ! لا تقتلوا شیخا فانیا، و لا طفلا و لا صغیرا و لا امرأۃ و لا تغلوا وضموا غنائمکم و اصلحوا و احسنوا ان اللّٰہ یحب المحسنین۔ (ابوداؤد، کتاب الجہاد) — خدا کا نام لے کر خدا کے لیے اور رسول اللہ صلعم کے مذہب کے پابند ہو کر میدان جنگ میں جاؤ۔ بوڑھوں کو، بچوں اور لڑکوں کو اور عورتوں کو ہرگز قتل نہ کرنا۔ خیانت نہ کرنا، مال غنیمت کو متفقہ طور پر جمع کرنا، اصلاح اور احسان کرنا، خدا احسان کرنے والوں ہی کو دوست رکھتا ہے۔

امیر العسکر کی اطاعت کا مقصد

یہ احکام اگرچہ خود اپنے اندر روحانی طاقت رکھتے ہیں، لیکن امیر العسکر کے احکام کی پابندی اس طاقت میں اور بھی اضافہ کر دیتی تھی، اس لیے اس کی اطاعت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر حکم دیا۔ اس اطاعت کا مقصد جاہ و اقتدار کا قائم رکھنا نہ تھا،

بلکہ محض اس شر و فساد کا مٹانا تھا جو فوجوں کے ذریعے سے عموماً خدا کی زمین میں پھیلتا رہا۔

و من غزا فخراً او ریاءً و سمعة و عصی الامام و افسد فی الارض فانه لم یرجع بالکفاف۔

جو شخص فخر پرستی اور نام و نمود کے لیے لڑا اور امام کی نافرمانی کی اور خدا کی زمین میں فساد پھیلایا، تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ وہ جہاد کے ثواب سے خالی ہاتھ واپس آیا۔

(ابو داؤد، کتاب الجہاد)

اطاعت صرف نیکی میں ہے چنانچہ جب کسی امیر العسکر نے صرف اظہار اقتدار کے لیے مجاہدین کو کوئی حکم دیا تو فوج کے اکثر حصے نے اس کی مخالفت کی اور جب آنحضرت صلعم کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے اسے حق بجانب فرمایا۔

ایک مرتبہ ایک امیر فوج نے آگ روشن کی اور فوج کو اس میں جانے کا حکم دیا۔ فوج کے ایک حصے نے اس میں جانا چاہا لیکن دوسرے فریق نے انکار کیا اور کہا کہ "ہم تو آگ ہی سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں"۔ آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو فرمایا:

"اگر وہ لوگ ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کے اندر قدم رکھتے تو ہمیشہ آگ (جہنم) ہی کے اندر رہتے۔ اطاعت گناہ کے کاموں میں نہیں کی جاتی، اطاعت کا تعلق صرف نیک کاموں سے ہے" (ابو داؤد کتاب الجہاد........) لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔

عرب کا ماحول یہ اخلاقی احکام اور اخلاقی اطاعت اگرچہ قدم قدم پر مجاہدین کے لیے زنجیر پا بن گئی تھی، لیکن جس قوم نے وحشت کدۂ عرب میں نشو و نما پائی ہو، جس نے صحرائے عرب ہی میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے ہوں، جو بادیہ نشین بدوؤں سے سرگرم کارزار رہی ہو، جو بے سر و سامان اور فاقہ مست ہو کر گھر سے نکلی ہو، جو ہر طرف سے بغض و انتقام کے جذبات مشتعلہ سے گھری ہوئی ہو، وہ دفعتاً اس قدر مہذب، سیر چشم اور صلح جو نہیں ہو سکتی کہ اس کے اخلاقی دامن پر ایک دھبا بھی نظر نہ آئے۔" اس لیے اس سے قدرتی طور پر بعض جزوی فروگذاشتیں ہوئیں، لیکن کبھی ان فروگذاشتوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی، بلکہ ان سے روکا گیا، ان غلطیوں کی داد نہیں دی گئی، بلکہ ان پر ملامت کی گئی اور عہد نبوت و خلافت راشدہ ان سے بالکل پاک ہے۔

اسوۂ مبارکہ اور احکام چنانچہ ایک غزوے میں کسی عورت کی لاش ملی تو آنحضرت صلعم نے عموماً عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت کر دی (ابو داؤد)۔ ایک سفر جہاد میں جب صحابہؓ بھوک کی شدت سے بیتاب ہو گئے تو ادھر ادھر سے کچھ بکریاں لوٹ لائے اور ذبح کر کے ان کا گوشت دیگچیوں میں چڑھا دیا۔ آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو کمان کے ذریعے سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا:

ان النھبۃ لیست باحل من المیتۃ۔ لوٹ کا مال مُردار چیزوں سے کچھ بہتر نہیں۔

(ابوداؤد)

فوج کے لیے خاص طور پر حکم تھا کہ اگر راستے میں دُودھ دینے والے مویشی مل جائیں تو ان کے دُودھ دوہنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ سخت مجبوری کی حالت میں بھی مالک موجود ہو تو اجازت لے لینی چاہیے، ورنہ تین بار بآوازِ بلند پکار لینا چاہیے۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد)۔

باب ۱۸

اسلامی فوجوں کا سیل فتح

اصلاحات جنگ

(۲)

قلت فوج کی ایک مصلحت ان احکام اور اس روک ٹوک کے علاوہ مجاہدین اسلام کی خوش اخلاقی کا ایک اور بھی سبب تھا۔ فتح ممالک کے لیے جو فوجیں روانہ کی جاتی ہیں، عموماً ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ ٹڈی دل کی طرح چاروں طرف اسی وسعت کے ساتھ پھیلتی جاتی ہیں کہ ان کی جزئی نگرانی رکھنا بالکل ناممکن ہوجاتا ہے، لیکن اسلامی فوجوں کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ کے لیے ان کا ظہور ہوا تھا۔ اس لیے ان کا روحانی پلہ جس قدر بھاری تھا اسی قدر ان کی مادیت کا وزن ہلکا بھی تھا۔ آنحضرت صلعم نے غزوۂ بدر میں مجاہدین کی اسی قلت تعداد کو دیکھ کر خدا کی غیرت و رحمت کو ان پر حسرت الفاظ میں جوش دلایا تھا:

اللھم انک ان تشاء لا تعبد فی الارض۔ (مسلم جلد ۲ ص ۷۵)

خداوندا! کیا تیری یہی مرضی ہے کہ زمین پر اب تیری عبادت کرنے والے چند اشخاص بھی باقی نہ رہیں؟

غزوۂ بدر میں مجاہدین کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی۔ اسلامی فوجوں کا سب سے بڑا اجتماع فتح مکہ میں ہوا تھا[1] لیکن وہ بھی دس ہزار سے متجاوز نہ تھا (مسلم)۔ پس قلت تعداد کی وجہ سے ایک محدود فوج کی اخلاقی نگرانی نہایت آسانی کے ساتھ ہوسکتی تھی۔

لوٹ کی ممانعت تاہم فوجوں کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ وہ میدان جنگ میں جس قدر منظم اور مرتب طور پر دوش بدوش کھڑی ہوکر لڑتی ہے، اسی قدر منزل پر پہنچ کر غیر منظم طریقے سے منتشر ہوجاتی ہے۔ یہ وقت عموماً کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کا ہوتا ہے۔ فوجیں اکثر اسی حالت میں ظلم و تعدی، نہب سلب اور لوٹ مار کرتی ہیں۔ ایک غزوہ میں مجاہدین کا گروہ ہر طرف پھیل گیا اور لوٹنا چاہا۔ آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا تو

---

[1] مطلب یہ ہے کہ پہلا سب سے بڑا فوجی اجتماع وہ تھا جو کہ مکہ کی فتح کے وقت ہوا تھا۔ عرب کی سرزمین نے اتنا بڑا منظم فوجی اجتماع پہلے نہیں دیکھا تھا۔ بعد میں تبوک کے لیے تیس ہزار مجاہدین تیار ہوئے تھے لیکن اسلامی فوجیں دوسروں کے مقابلے میں عموماً کم تعداد ہی رہیں۔ قادسیہ اور نہاوند ہی نہیں، ہسپانیہ اور ہندوستان کی فتح میں بھی یہی کیفیت تھی۔

من ضيق منزلا او قطع طريقا فلا جهاد له۔ (بخاری جزء ۲ ص ۱۴۶)

جس شخص نے منزل کو گھیر لیا، دوسروں کے لیے جگہ چھوڑی اور رہزنی کی تو اس کا جہاد جہاد نہیں۔

اِدھر اُدھر پھیلنے کی ممانعت

پھر بالکل اس کی ممانعت فرمادی:

ان تفرقكم فى هذه الشعاب و الاودية انما ذالكم الشيطان۔

ان گھاٹیوں اور ٹیلوں میں جو تم پھیل جاتے ہو تو یہ شیطان کا کاکام ہے۔

نظام وترتیب کا نقشہ

اس کے بعد فوج کے نظام و ترتیب نے جو ترقی کی، اس کو اسی روایت کے اندر نہایت جامع الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

فلم ينزل بعد ذلك منزلا الا انضم بعضهم الى بعض حتى يقال لو بسط عليهم ثوب لعمهم۔ (ابوداؤد)

اس کے بعد جب آپ نے پڑاؤ ڈالا تو مسلمان باہم اس قدر ملے جلے یکجا نظر آتے تھے کہ اگر ان کے اوپر ایک چادر تان دی جاتی تو سب اس کے نیچے آجاتے!

دنیا نے آج نظام و ترتیب و قوائد میں اس قدر ترقی کی ہے کہ انتظامات اس کے آگے وحشیانہ تفرقہ و انتشار معلوم ہوتے ہیں، لیکن کیا آج بھی کوئی منظم سے منظم اور مہذب سے مہذب فوج ایسی پیش کی جا سکتی ہے جو فتح و مراد کی حالت میں اس قدر باقاعدہ طور پر یکجا رہی ہو؟ پھر اس درجہ اپنے افسر کی مطیع ہو کہ ایک سپاہی بھی قیام گاہ سے حرکت نہ کرے؛

نظام اسلام اور اخلاقی رُوح

لیکن اس زجر و توبیخ کے ساتھ ایک دوسری طاقت بھی تھی جو مجاہدین اسلام کو جادۂ اعتدال و صراط مستقیم سے آگے بڑھنے نہیں دیتی تھی۔

اسلام جابرانہ قوانین اور اقتدارانہ احکام کا مجموعہ نہیں۔ اس کا نظام تعلیم تمام تر اخلاقی روح سے لبریز ہے۔ جن احکام کو ہم اسلام کا سادہ قانون کہتے ہیں، وہ بھی اخلاقی رنگ کی آمیزش سے خالی نہیں۔ اس لیے آنحضرت صلعم مجاہدین اسلام کو صرف اخلاقی طاقت ہی سے ان احکام کا پابند کرنا چاہتے تھے، چنانچہ سفر جہاد میں جب کبھی اخلاقی نصائح کا جزئی سے جزئی موقع پیش آجاتا تھا تو آپؐ اس کے ذریعے مجاہدین کو رفق و ملاطفت اور نرمی و رحم دلی کی تعلیم دیتے تھے۔

عملی مثالیں

ایک سفر جہاد میں صحابہ کسی چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے۔ چڑیا نے دیکھا تو فرط محبت میں بے اختیارانہ بچوں کے سر پر منڈلانے لگی۔ آنحضرت صلعم کی نگاہ پڑ گئی تو فرمایا: "اس چڑیا کا دل کس نے دکھایا ہے؟ اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔" پھر دوسری طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ میدان کے اندر چیونٹیوں کے گھر میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔ آپؐ نے پوچھا کہ ان چیونٹیوں کے گھر کو کس نے جلایا ہے؟ صحابہؓ نے کہا: کسی خاص آدمی نے ایسا

نہیں کیا، ہم سب نے اس کو برباد کر دیا ہے۔ فرمایا کہ "آگ کا عذاب صرف خدا ہی دے سکتا ہے"۔[1]

آنحضرت صلعم کا ذاتی طرزِ عمل اس سے بھی زیادہ موثر تھا۔ یہودیوں نے آپؐ کو زہر دیا لیکن آپؐ نے انتقام نہیں لیا۔ ایک کافر نے آپؐ پر بحالت خواب میں حملہ کرنا چاہا۔ آپ بیدار ہو گئے اور اس کا حملہ ناکام رہا، تاہم اسے کوئی سزا نہیں دی۔[2]

ہادی کے لیے راہ عمل

یہاں تک کہ اگر حالت اضطرار میں بھی آپؐ کی زبان سے کوئی انتقامانہ فقرہ نکل گیا تو خدا نے آپؐ کو اس پر تنبیہ کی۔ غزوۂ احد میں جب آپؐ کے چہرۂ مبارک پر پتھر لگا اور دندان مبارک شہید ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

كيف يفلح قوم شجوا نبيهم؟ — وہ قوم کیونکر نجات پا سکتی ہے جس نے اپنے پیغمبر ہی کو زخمی کر دیا؟

اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ[3] — تمھیں اس قسم کی بددعا کرنے کا اختیار نہیں، یہ کام صرف خدا کا ہے، وہ چاہے گا تو ان کی توبہ قبول کرے گا ورنہ انھیں عذاب دے گا، کیونکہ وہ ظالم ہیں۔

فروگزاشتوں پر سخت تنبیہ

اس احتساب و مراقبہ کی بنا پر جن غزوات میں آنحضرت صلعم شریک ہوتے تھے ان میں مجاہدین اسلام جادۂ اخلاق و انسانیت سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے تھے، لیکن جن غزوات میں فوج کا سررشتۂ نظام صرف امیر العسکر کے ہاتھ میں ہوتا تھا، وہ بھی آپ کی اخلاقی نگرانی سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ آپؐ نے قبیلہ خثعم کی طرف فوج کا ایک دستہ روانہ کیا۔ معرکہ کارزار گرم ہوا تو چند آدمی جان بچانے کے لیے یا اس لیے کہ وہ حقیقۃً مسلمان تھے، سجدے میں گر پڑے۔ تمام فوجیں انھی لوگوں کی طرف جھک پڑیں اور ان جھکے ہوئے سروں کو آسانی کے ساتھ تہ تیغ کر دیا۔ آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا تو آپ نے نصف

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ، کتاب الجہاد۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ چیونٹیوں کے گھر کو کسی نے دانستہ نہیں جلایا تھا بلکہ ایک جگہ کھانا پکانے کے لیے چولھے بنا لیے۔ اتفاق سے وہاں چیونٹیوں کا گھر نکل آیا۔ آنحضرت صلعم کے ارشاد کے ساتھ ہی چولھے وہاں سے ہٹا لیے گئے۔

[2] بخاری جزو ۵ ص ۱۱۵ کتاب الجہاد۔ [3] آل عمران ۱۲۸۔ اس آیت کے فوائد میں مولانا نے لکھا ہے ضمناً اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ ظلم و کفر کرنے والوں کی بدعملیاں کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو جائیں لیکن ہادی و مصلح کو ان کی ہدایت سے مایوس نہ ہونا چاہیے اور نہ رحم و بخشش کی طلب کے سوا کوئی جذبہ اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ (ترجمان جلد اول ص ۳۲۸)

دیت ولائی۔ ایک بار آپؐ نے قبائل حرقات کی طرف ایک سریہ بھیجا۔ فوج نے حملہ کر کے ایک آدمی کو گھیر لیا۔ ....
.... وہ کلمۂ توحید پڑھنے لگا۔ لیکن مجاہدین کی تلوار نے اس کا فیصلہ کر دیا۔ آپؐ کو خبر ہوئی تو فرمایا: "قیامت میں اس خون کا ذمہ دار کون ہوگا؟" اسامہؓ ابن زیدؓ نے کہا، "وہ حقیقۃً مسلمان نہیں ہوا تھا۔ جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھ دیا تھا۔" آپؐ نے برہم ہو کر فرمایا: "کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟"[۱]

امرائے فوج کا طرز عمل

امراء فوج بھی بالکل انھی اصول اخلاق کے پابند تھے، اس لیے وہ فوج کے معمولی وحشیانہ افعال کو بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ فوج کا ایک دستہ عبدالرحمٰن بن سمرہ کی امارت میں مصروف جہاد تھا۔ مال غنیمت میں ایک ہاتھی آیا تو ہر شخص نے اپنے قبضے میں کرنا چاہا۔ انھوں نے یہ حال دیکھا تو ایک عام تقریر کی اور فرمایا: آنحضرت صلعم نے اس قسم کی غارت گری سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ سب نے مال غنیمت کو جمع کر کے مشترکہ طور پر تقسیم کیا۔[۲]

ہیئت اجتماعیہ کا اصل اصول

صحابہؓ میں بعض بزرگ ایسے موجود تھے جو خود امراء کی اخلاقی غلطیوں پر نکتہ چینی کرتے تھے اور اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کا اصل اصول یہی امر بالمعروف ہے۔ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید نے چار کافروں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر قتل کرادیا۔ حضرت ابو ایوبؓ انصاری کو خبر ہوئی تو انھوں نے کہا: "آنحضرت صلعم نے اس قسم کے وحشیانہ قتل سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن خالد نے اس کے بدلے چار غلام آزاد کیے۔[۳]

دیانت وفضیلت اخلاق

اس اخلاقی احتساب و مراقبہ نے مسلمانوں کو جس قدر خوش اخلاق، متدین اور فیاض طبع بنا دیا تھا اس کی تصدیق متعدد واقعات سے ہوتی ہے۔ حضرت مقدادؓ ایک بار قضائے حاجت کے لیے باہر گئے تو دیکھا کہ ایک چوہا بل سے اشرفیاں (دینار) نکال نکال کر باہر رکھتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس نے اٹھارہ دینار نکالے۔ حضرت مقدادؓ انھیں اٹھا لائے اور آنحضرت صلعم کے قدموں پر ڈال دیا۔ آپؐ نے یہ فرما کر ان کے حوالے کر دیں: خدا تمھارے اس مال میں برکت دے۔[۴]

ایک مرتبہ حضرت سوید بن   ، حضرت زید بن صوحان اور حضرت سلیمان بن ربیعہ ایک ساتھ جہاد کی غرض سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک کوڑا پڑا ہوا پایا۔ سوید نے اٹھا لیا۔ دونوں ساتھیوں نے ٹوکا، لیکن انھوں نے کہا: میں اس کے مالک تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ ناکامیابی ہوگی تو اس سے خود فائدہ اٹھاؤں گا۔

---

[۱] ابوداؤد جلد ۱ ص ۳۵۴ کتاب الجہاد [۲] ابوداؤد جلد ۱ ص ۳۵۴ کتاب الجہاد۔ [۳] ابوداؤد جلد ۳ ص ۱۲ کتاب الجہاد۔ [۴] ابوداؤد جلد ۳ ص ۱۰ کتاب الجہاد۔ [۵] ابوداؤد جلد ۲ ص ۳۔

جہاد سے پلٹ کر انھوں نے حج کا سفر کیا۔ حج سے فارغ ہو کر مدینہ آئے اور حضرت ابی ابن کعب سے کوڑے کا واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا، "میں نے آنحضرت صلعم کے زمانے میں ایک بار سو دینار پائے تھے۔ آنحضرت صلعم کی خدمت میں آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کے مالک کو تلاش کرو۔ میں نے تین چار سال تک ڈھونڈا مگر اس کا پتہ نہ چلا۔ پھر میں نے آپؐ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے کہا کہ تھیلی سمیت گن کر رکھ دو، وہ آئے تو دے دینا ورنہ تمھارے کام آئے گا"[1]

قدیم تمدن کے کارنامے

تمھارے سامنے تمدن قدیم اور تمدن جدید، دونوں کے مناظر موجود ہیں۔ روم و ایران سے بڑھ کر تمدن قدیم کا اور کون عہد ہوگا؟ شام و ایران اور کارتھیج میں تم دیکھ چکے ہو کر روم کا تمدن کس ساز و سامان کے ساتھ داخل ہوا؟ سکندر نے ایران کا چپہ چپہ جلا دیا، ایرانیوں نے بابل میں داخل ہو کر خون کے سیلاب، لاشوں کے ڈھیر اور منہدم عمارتوں کے کھنڈر اپنی یادگار چھوڑے اور ٹیٹس کی فاتح فوج جب یروشلم میں داخل ہوئی تو وہ انسانوں کا داخلہ نہ تھا بلکہ جنگل کے درندوں اور اژدہوں کا غول تھا، جس نے صرف چیرا اور پھاڑا اور زندگی اور آبادی کے لیے ایک گوشہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ فجاسوا خلال الدیار، وکان وعدًا مفعولًا (پس وہ تمھاری آبادیوں کے اندر پھیل گئے اور اللہ کا وعدہ تو اس لیے تھا کہ پورا ہو کر رہے)

جدید تمدن کے بڑے گھرانے

یہ تمدن قدیم کے سب سے زیادہ ممتاز فرزند تھے، لیکن آج یورپ کے جدید تمدن کا بھی سب سے بڑا گھرانا ہمارے سامنے ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اصلیت کیا ہے؟ مگر خود یورپ ہمیں یقین دلانا چاہتا ہے کہ بلجیم کے فاتح جب اس کی آبادیوں میں سے گزرے تو لوائین[2] کا دارالعلم تباہ ہو گیا۔ ریمز[3] کے معبد مقدس کی دیواریں گرا دی گئیں۔ برسلز اور انٹورپ[4] کی آبادی خوف و دہشت سے تھرا گئی اور وحشت و بربریت کا جو افسانہ ایران کے کھنڈر، بیت المقدس کی دیواریں، کارتھیج کے تودے اور بابل کی برباد شدہ رونق سناتی تھی، وہ آج کئی ہزار برس کے بعد بجنسہٖ اسی طرح بلجیم کے اندر سنی جا سکتی ہے[5]

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۹۵ کتاب اللقطہ۔ [2] Louvain بلجیم کا ایک شہر۔ یہاں کی یونیورسٹی کی بنیاد ۱۴۲۳ء میں رکھی گئی تھی اور اس کا کتب خانہ بڑا ہی قیمتی تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنوں کے حملے میں جلا دیا گیا۔ سب کتابیں ضائع ہو گئیں۔ امریکہ کی امداد سے پھر ایک کتب خانہ فراہم ہوا، اگرچہ جلے ہوئے کتب خانے کے بعض نوادر کی نقلیں کہیں سے نہ ملیں۔ دوسری عالمی جنگ میں یہ شہر پھر تباہ ہوا اور کتب خانے کو بھی نقصان پہنچا۔ [3] Reims فرانس کا مشہور شہر جس کا گرجا ۱۴۲۵ء میں مکمل ہوا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جرمنوں کی گولہ باری سے اسے نقصان پہنچا۔ [4] برسلز بلجیم کا دارالحکومت اور انٹورپ ایک اہم بندرگاہ ہے۔ [5] یہ اشارہ ۱۹۱۴ء کی جنگ اور جرمنوں کے حملے کے نتائج کی طرف ہے۔

حقیقت ثابتہ و محکمہ

چنانچہ جنگ کی یہی وہ حقیقت ثابتہ و محکمہ ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے ملکۂ سبا کی زبانی اشارہ فرمایا:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ۔

بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی آبادی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہاں کے اہل عزت کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں اور یہی ان کا شیوہ ہے۔

مسلمانوں کا نمونہ

لیکن جب تم تمام قدیم اقوام کا مفتوحہ ممالک میں داخلہ دیکھ چکے ہو اور جب بیسویں صدی کے عصر تمدن و سلام کی سب سے بڑی قوم[1] کی نسبت بھی جو کچھ تمہیں سنایا گیا ہے وہ تمہارے سامنے ہے تو آؤ دیکھیں، اس قوم کا کیا حال ہے، جس سے آج دنیا کے مفتوحہ و محکومہ ممالک آباد ہیں، لیکن کبھی دنیا کے بحر و بر کے بڑے بڑے حصوں پر سے اس کے فاتحانہ سیلاب گزرا کرتے تھے۔

---

[1] یعنی جرمن

حج

باب ۸۳

یوم الحج کی تقریب میں

بیماری کا علاج

دنیا کی بیماریاں ہمیشہ یکساں رہی ہیں اس لیے ان کا علاج بھی اصولاً ایک ہی ہونا چاہیے۔ وہ جب کبھی عریاں ہوئی ہے، تو اس کی تلاش اس جستجو سے کبھی بھی مختلف نہ تھی، جو جستجو آج ہمیں درپیش ہے۔ ایک ہی چیز تھی، جس کی ہمیشہ تلاش رہی۔ ہم بھی آج اس کو ڈھونڈیں گے۔

حضرت نوحؑ

اب سے ہزاروں برس پہلے اسی زمین پر خدا کے ایک مخلص بندے نے اسے (یعنی خدا کو) درد اور تڑپ کی آواز میں پکارا تھا اور کہا تھا کہ،

رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ۝ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۔ (سورہ نوح : ۵-۹)

خدایا! میں نے اپنی قوم کو رات دن حق و ہدایت کی دعوت دی، لیکن افسوس کہ میری دعوت کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہ نکلا کہ وہ مجھ سے اور بھاگنے لگی۔ میں نے جب کبھی ان کو پکارا تاکہ وہ تیری طرف رجوع ہوں تو انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کہ کہیں میری آواز نہ سُن لیں اور اپنے اوپر سے کپڑے اوڑھ لیے کہ کہیں میرے چہرے پر نظر نہ پڑ جائے اور ضد اور شیخی میں آ کر اکڑ بیٹھے! اس پر بھی میں باز نہ آیا، پھر انھیں پکار پکار کر تیرا پیغام پہنچایا اور اس کے بعد بھی ظاہر و پوشیدہ، ہر طرح سمجھایا۔

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا ۔ (نوح : ۲۱)

خدایا! بایں ہمہ سعی دعوت و اصلاح ان سرکشوں نے میرا کہا نہ مانا اور انھی معبودان باطل کی غلامی کرتے رہے، جنھوں نے ان کے مال اور ان کی اولاد کو فائدہ کی جگہ اُلٹا نقصان ہی پہنچایا۔

تو وہ بھی اپنی قوم کو اسی کی تلاش کا پتا دے رہا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ

جب کالڈیا کے بت خانے میں ایک برگزیدہ نوجوان نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ادا کیا[1]، جب اس نے اپنے ہاتھ میں چھُری لی اور اپنے فرزند عزیز کو محبت الٰہی کی بے خودی میں دشمنوں کی

---

[1] مراد ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام

طرح زمین پر وے پٹکا۔ جب اس نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے خاندان کو دین الٰہی کی پیروی کی وصیت کی اور کہا:

يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ۔ (بقرہ، ۱۳۲)

دیکھو اللہ نے تمھارے اس دین اسلام کو تمھارے لیے پسند فرمایا ہے، پس ہمیشہ اسی پر قائم رہنا اور دنیا سے نہ جانا، مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔

تو اس نے بھی اسی کو ڈھونڈا اور پایا تھا۔

حضرت یوسفؑ

جب تخت گاہ فراعنہ کے ایک قیدخانے میں کنعان کے قیدی نے دین الٰہی کا وعظ کہا اور جب اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ:

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔ (یوسف: ۳۹-۴۰)

اے یاران محبس! بہت سے مالک اور آقا بنا لینا اچھا ہے یا ایک ہی خدائے قہار کے آگے جھکنا؟ تم جو اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کی پرستش کر رہے ہو، تو یہ اس کے سوا کیا ہے کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے پیش روؤں نے گھڑ لیے ہیں؟ حالانکہ خدا نے تو اس کیلیے کوئی سند بھیجی نہیں۔ اے گمراہو! یقین کرو کہ پوری کائنات میں حکومت تو صرف اللہ کے لیے ہے! اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کے آگے جھکو! یہی اسلام کا سیدھا راستہ ہے لیکن افسوس کہ اکثر لوگ نہیں سمجھتے؟

تو اس کی نظر بھی اسی کی طرف تھی اور اسی کی تلاش تھی، جس کا وہ سراغ دے رہا تھا۔

حضرت موسیٰؑ

وہ "شاطی وادی ایمن" اور "بقعۂ مبارکہ" کا مقدس چرواہا، جب کوہ سینا کے کنارے "إِنِّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ"[1] کی ندائے محبت سے مخاطب ہوا تھا اور جب ایک ظالم و جابر حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے اس نے یکہ و تنہا فرمانروائے عہد کے سامنے حریفانہ کھڑے ہو کر پیشگوئی کی تھی کہ:

رَبِّي أَعْلَمُ بِمَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِندِهِ وَمَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ۔ (القصص: ۳۷)

یعنی اے لوگو! مجھ کو جھٹلانے میں جلدی نہ کرو! خدا خوب جانتا ہے کہ کون شخص اس کی طرف سے سچائی لے کر آیا ہے اور آخرکار کس کے ہاتھ نتیجہ کی کامیابی آنے والی ہے؟

---

[1] میں ہوں اللہ، جہانوں کا پروردگار (القصص: ۳۱)

یقین کرو کہ خدا کبھی ان لوگوں کو فلاح نہیں دیتا جو ظالم ہیں۔

تو وہ بھی اسی تلاش کا اعلان کر رہا تھا اور یہی تلاش تھی جس نے اسے منزل مقصود تک پہنچایا تھا۔

حضرت علیسیٰ ع وہ "ناصرہ" کا نوجوان اسرائیلی، جو پچھلی کتابوں کی پیشین گوئی کے مطابق آیا تھا تاکہ عہد اسرائیلی کے خاتمے اور دور اسماعیلی کے آغاز کا اعلان کرے اور جب اس نے چلنے سے پیشتر ایک باغ کے گوشے میں اپنے نادان اور ناسمجھ ساتھیوں سے کہا تھا کہ،

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ "اَحْمَدُ"۔ (الصف : ۶)

"میں اللہ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجا ہوا آیا ہوں۔ میں کوئی نئی شریعت نہیں لایا، بلکہ میرا کام صرف یہ ہے کہ کتاب تورات کی، جو مجھ سے پہلے آچکی ہے، تصدیق کرتا ہوں اور ایک آنے والے رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام "احمد" ہوگا!"

تو وہ بھی اسی وادی جستجو کا ایک کامیاب قدم شوق تھا اور یہی گوہر مقصود تھا، جس کے لیے اس نے اپنے بے عقل ساتھیوں کے جیب و دامن کو بے قرار دیکھنا چاہا تھا۔

رسول اکرم صلعم پھر وہ ظہور انسانیت کبریٰ، وہ مجسمۂ نعمت الٰہیۂ عظمیٰ، وہ معلم کتاب و حکمت، وہ مزکی نفوس انسانیت، وہ "ہادی الی صراط مستقیم" وہ مخاطب "انک لعلی خلق عظیم" وہ تاجدار کشورستان یزداں پرستی، وہ فتح یاب اقلیم قلوب انسانی، وہ علم آموز درسگاہ "ادبنی ربی فاحسن تادیبی"، وہ خلوت نشین شبستان "ابیت عند ربی ھو یطعمنی و یسقینی"، یعنی وہ وجود اعظم واقدس، جس کے لیے دشت حجاز میں ابراہیم خلیل ؑ نے اپنے خدا کو پکارا: ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم، یتلوا علیھم ایاتك و یعلمھم الکتاب والحکمة و یزکیھم[1] جس کے نور مبین کی تجلی فاران کی چوٹیوں پر موسیٰ ؑ نے دیکھی، جس کے عشق میں داؤد ؑ نے نغمہ سرائی کی، جس کے جمال الٰہی کی تقدیس میں سلیمان ؑ اپنے تخت جلال پر جھک گیا، جس کی طرف یوحنا ؑ نے پوچھنے والوں سے بے قرارانہ اشارہ کیا اور جس کے لیے ناصرہ کے اسرائیلی نبی نے اپنا جانا ہی بہتر سمجھا تاکہ وہ اپنے باپ سے جو آسمان پر ہے سفارش کرے اور اس کو "جو آنے والا ہے" جلد بھیج دے۔ (یوحنا : ۱۶ ، ۸)

غرض کہ جب وہ "آنے والا" آیا اور خدا کی زمین آخری مرتبہ سنواری گئی تا اس کی ابدی حکومت و جلال کا

---

[1] اے خدا ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو انہی میں سے ہو، وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) ان کے دلوں کو پاک کر دے۔ (بقرہ : ۱۲۸)

تخت نیچے۔ پھر اس کے فرمان آخری کا اعلان ہوا:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (آل عمران: ۸۵)

اب سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ کسی دوسری تعلیم کو تلاش کرے گا تو یقین کرو کہ اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی اور اس کے تمام کاموں کا آخری نتیجہ نامرادی ہی ہوگا!!

تو وہ بھی اسی کی جستجو میں نکلا تھا، جس کی جستجو میں سب نکلے اور قبل اس کے کہ وہ اس کے لیے بے قرار ہو، خود اس نے بیقرار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ (الضحیٰ: ۷)

اور اے پیغمبر! ہم نے تم کو دیکھا کہ ہماری تلاش میں سرگرداں ہو پس ہم نے (خود ہی) تم کو اپنی راہ دکھلادی۔

دنیا کی حالت

دنیا کی خوشی مرجھا گئی تھی۔ اس کا جمال صداقت پژمردہ اور اس کا چہرۂ ہدایت زخمی ہو گیا تھا۔ وہ پیمان و مواثیق، جو اولاد آدم نے مقدس رسولوں کے سامنے، ان کے پاک پیغاموں کو سن کر خدا سے باندھے تھے۔ ایک ایک کر کے عصیان و تمرد سے توڑ دیے گئے تھے اور خدا کی رحمت و رافت زمین کے بسنے والوں سے روٹھ گئی تھی۔ اس کا وہ جمال ازلی و ابدی، جس سے پردے اٹھا دیے گئے تھے تا اس کے ڈھونڈنے والوں کو محرومی نہ ہو، اب پھر مستور و محجوب ہو گیا تھا اور اس میں اور اس کے بندوں میں کوئی رشتہ باقی نہ تھا۔

ہاں، کوئی نہ تھا، جو اس کو ڈھونڈے، کوئی قدم نہ تھا، جو اس کی طرف دوڑے، کوئی آنکھ نہ تھی جو اس کے لیے اشکبار ہو۔ کوئی دل نہ تھا جو اس کی یاد میں مضطرب ہو۔ کوئی روح نہ تھی جو اسے پیار کرے۔ اس کی دنیا اس سے بے خبر تھی۔ اس کے بندے اس سے غافل تھے۔ انسان کا ضمیر مر چکا تھا۔ فطرت کا حسن حقیقی عصیان عالم کی تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ طغیان و سرکشی کے سیلاب تھے، جو خشکی و تری، دونوں میں امنڈ آئے تھے اور جن کے اندر خدا کے رسولوں کی بنائی ہوئی عمارتیں بہ رہی تھیں:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ۔ (روم: ۴۱)

خشکی اور تری، دونوں میں انسان کے عصیان و سرکشی سے فتنہ و فساد پھیل گیا۔

مقصود و مطلوب

جب یہ حالت تھی تو دنیا بگڑ کر پھر سنوری، انسانیت مر کر پھر زندہ ہوئی اور خدا نے اپنے چہرے کو پھر بے نقاب کر دیا۔ وہ جو شام کے مرغزاروں اور یروشلم کے ہیکل کے ستونوں سے روٹھ گیا تھا، اب پھر آ گیا، تا کہ دشت حجاز کے ریگستانوں کو پیار کرے اور اپنے راز و نیاز محبت کے لیے ایک نئی قوم کو چن لے۔ دنیا

جو صدیوں سے اس کو بھلا چکی تھی، پھر اس کی تلاش میں نکلی اور انسان نے اپنے مقصود و مطلوب کو کھو کر دوبارہ پا لیا:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (المائدہ: ۱۵-۱۶)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور ہدایت اور ایک کتاب مبین آئی، اس کے ذریعے سے سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے، اسے جو اس کی رضا چاہتا ہے اور اس کو ہر طرح کی گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا اور صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔

غرض دنیا کی حیات ہدایت و سعادت کی تاریخ یکسر تلاش و جستجو ہے۔ اس نے اپنے ہر دور میں کھویا، پھر ہر دور میں اس کی تلاش کے لیے نکلی۔ وہ جب کبھی گری تو اسی کو کھو کر گری اور جب کبھی اٹھی تو اسی کی تلاش کا ولولہ لے کر اٹھی۔ اس کے ہادیوں نے جب کبھی اس کو جگایا تو اسی کے لیے جگایا اور جب کبھی اس کا ہاتھ پکڑا تو اسی جستجو میں نکلنے کے لیے پکڑا۔ اس کی یہ تلاش ہمیشہ کامیاب ہوئی اور اس نے جب کبھی پکارا، اسے جواب ملا۔ پانی کے ملنے میں کبھی دیر نہ ہوئی البتہ تشنگی کا ثبوت ہمیشہ مانگا گیا:

جمال حال شود ترجمان استحقاق
دلیل آب جگر تفتگی و تشنہ لبی است

(نظیری)

جماعت لیکن یہ انقلاب عظیم جو ہیئت انسانیت میں ہوا، جس نے دنیا کو یکسر بدل دیا اور جس عزیز گم گشتہ کو وہ بھول بیٹھی تھی، اس کی تلاش و جستجو میں گم ہو کر، پھر نمودار ہوئی، کس چیز کا نتیجہ تھا؟

یقیناً وہ ایک صدائے الٰہی تھی لیکن کن کے اندر سے اٹھی؟ کچھ شک نہیں کہ وہ جمال ربانی کی ایک بے نقاب بخشش نظارہ تھی، لیکن اس جلوہ ریزی کا آفتاب، کن کے سیاسے وجوہ پر چمکا؟

ان کے، جن کی نسبت کہا گیا کہ "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود"[۱] اصل یہ ہے کہ وہ ایک جماعت تھی اور تاریخ اصلاح عالم میں یاد رکھنا چاہیے کہ ہر دعوتِ انقلاب و اصلاح نے سب سے پہلے جماعت ہی پیدا کی ہے۔ دعوت الٰہی اگر کوئی بیج ہے تو اس کے درخت کی پہلی شاخ جماعت ہی ہے۔ دنیا میں جب کبھی کوئی اصلاحی تغیر ہوا ہے تو محض تعلیمات سے نہیں ہوا ہے، بلکہ اس جماعت کے اعمال سے ہوا ہے جو ان تعلیمات کی حامل و محافظ تھی۔ وہ صدائیں جو محض زبانوں سے اٹھتی ہیں، ہوا کی منجمد سطح میں تموج پیدا کر سکتی ہیں مگر دلوں کے سمندر میں لہریں پیدا نہیں کر سکتیں۔ کان ان کو

---

[۱] کثرت سے سجود کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر نشان بن گئے ہیں۔ (سورۂ فتح: ۲۹)

سنتے ہیں، پر دل ان کے آگے مسجود نہیں ہوتے۔

یہی سبب ہے کہ دنیا میں جب کبھی مصلحین حق کا ظہور ہوا، خواہ وہ ظہور انبیاء و رسل کرام کا تھا جو بمنزلہ اصل ہیں یا ان کے متبعین و مجددین کا جو بمنزلہ فرع و ظل کے ہیں، مگر ہمیشہ ان کا پہلا کام یہی رہا کہ انھوں نے اپنی تعلیم و دعوت کا نمونہ ایک جماعت کی صورت میں پیش کیا۔ پھر یہ بنیاد جتنی محکم بن سکی، اتنا ہی استحکام بعد کی تعمیرات کو بھی حاصل ہوا۔

انبیائے کرام کی مثالیں

حضرت ابراہیمؑ کی نسبت قرآن کریم نے تصریح کی ہے کہ:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ (الممتحنہ: ۴)

بے شک تمھارے واسطے اتباع و پیروی کے لیے ایک بہترین نمونہ اور نصب العین ہے، حضرت ابراہیمؑ کی زندگی میں۔ نیز "ان کے ساتھیوں" کی زندگی میں۔

فرمایا: "والذین معه" اور وہ لوگ جو ان کے ساتھی ہیں۔ یہی "معیت" ہے جو اعمال اصلاح نبوت کی حامل و محافظ ہوتی ہے اور اس امانت اصلاح و دعوت کو دنیا میں پھیلانے کے لیے سنبھال لیتی ہے، جو انبیائے کرام لے کر دنیا میں آتے ہیں۔

حضرت نوحؑ جب کشتی میں سوار ہوئے تو ستر آدمی ان کے ساتھ تھے۔ حضرت موسیٰؑ کا ساتھ ابتدا میں خود بنی اسرائیل میں سے بھی ایک تعداد قلیل نے دیا۔ حضرت مسیحؑ نے اپنی تمام حیات دعوت میں بارہ آدمی پیدا کیے، لیکن فی الحقیقت یہی جماعتیں تھیں، جنھوں نے لاکھوں کروڑوں دلوں کو مسخر کیا اور زمین کے بڑے بڑے حصّوں کو اپنی اصلاح و دعوت کے آگے سربسجود پایا۔

کیونکہ وہ دعوت و اصلاح کی جماعتیں تھیں، جو ان تعلیمات کا اپنے اعمال و افعال کے اندر نمونہ رکھتی تھیں اور زبان کی پکار ضائع جاسکتی ہے، پر اعمال کی صدا کبھی جواب لیے بغیر نہیں رہتی!

دنیا کے اندھیرے میں اجالا

پس اصلاح عالم کا یہ آخری ظہور جس نے دین الٰہی کو اس کے قدیمی نام "اسلام" کے ساتھ پیش کیا، یہ بھی دنیا میں اسی لیے آیا تا ایک جماعت پیدا کرے اور اس نے "جماعت" پیدا کی۔ یہی جماعت تھی جس کو خدا نے اپنے کاموں کے لیے چن لیا اور اس کے دلوں کو اپنے جمال و صفات الٰہیہ کا مسکن بنایا۔ عشق الٰہی کی وہ آتش مقدس، جس کے لیے نوحؑ نے لکڑیاں چنیں، جسے ابراہیم خلیلؑ نے اپنے دامن قربانی سے ہوا دی، جس کی چنگاریاں وادی ایمن کی تاریکی میں چمکیں، جس کے شعلوں کے لیے مسیحؑ کی قربانی کے خون نے تیل کا کام دیا اور جو بالآخر جبل بوقبیس کے غاروں میں "سراجاً منیراً" بن کر بھڑکی، اس کے شعلوں سے اس جماعت الٰہی نے اپنے دلوں کی انگیٹھیوں کو روشن کر لیا تھا اور یہ انگیٹھیاں گو تعداد میں قلیل اور دنیا کی تاریکی وسیع و عالمگیر تھی، لیکن انھی سے دعوت و اصلاح کے وہ لاتعد و لاتحصیٰ چراغ روشن ہوئے، جن میں سے ایک ایک چراغ

زمین کے بڑے بڑے رقبوں اور انسانوں کی بڑی بڑی آبادیوں میں آفتاب جہانتاب بن کر ظلمت ربائے عالم ہوا۔

یہی وہ خدا کی روشنی تھی، جو اس کی جماعت میں سے ہو کر چمکی اور جس کو خدا نے " نور اللّٰہ " کے لقب سے یاد کیا:

"یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون"[1]

آسمان کی بادشاہت

میرا مقصود تاریخ دعوت اسلامیہ کی اس اولین جماعت سے ہے جس نے حضرت ابراہیم خلیل کے ساتھیوں کی طرح، محمد رسول اللہ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کا ساتھ دیا اور اتباع اعمال نبوت کے ذریعے سے خود اپنے اندر خصائص و برکات نبوت پیدا کر لیے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا٘ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ (سورہ فتح: ۲۹)

محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں دشمنانِ حق کے مقابلے میں نہایت سخت، مگر آپس میں نہایت رحم دل ہیں، انھیں تم ہمیشہ اللہ کے آگے عالم رکوع و سجود میں دیکھو گے کہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر کثرتِ سجود کی وجہ سے نشان بن گئے ہیں۔

یہی جماعت تھی، جس کے الٰہی کاروبار کو حضرت مسیح نے " آسمان کی بادشاہت " سے تعبیر کیا کیونکہ فی الحقیقت وہ دنیا کو قوائے شیطانیہ کے تسلط سے نکالنے والی تھی اور اسی کے اعمال حقہ کے ذریعے سے دنیا میں خدا کا تخت عدل و صلاح بچھنے والا تھا۔ وہ ایک بیج تھا جو بوتے وقت گو حقیر اور بہت چھوٹا تھا، پر بارآور ہونے کے بعد ایک درخت وسیع و تناور بننے والا تھا۔ اسی لیے مسیح نے اسے اس تمثیل میں بیان کیا کہ:

" آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانے کی مانند ہے، جسے کسی آدمی نے لے کے اپنے کھیت میں بویا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا ہے پر جب اُگتا ہے، تب سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہوتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کی ڈالیوں پر بسیرا لیتے ہیں۔" (متی باب ۱۳ آیت ۳۲)

چنانچہ پچھلی آیت میں اس تمثیل کی طرف قرآن کریم نے بھی اشارہ کیا:

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚ (فتح: ۲۹)

ان کی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے۔ (الخ)

یعنی یہی جماعت ہے جسے تورات اور انجیل میں ایک کھیتی سے تمثیل دی ہے۔

---

[1] یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ یہ روشنی پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے۔ (سورۃ صف: ۹)

اصلها ثابت وفرعها فی السماء

دیکھو! آسمان کی پادشاہت کا یہ بیج جو بو دیا گیا، فی الحقیقت کیسا حقیر تھا! ایک جماعت قلیل وحقیر، جسے نہ ساز و سامان دنیوی حاصل تھا اور نہ کسی طرح کی دنیوی ریاست وعزت۔ نہ اس کے پاس آلاتِ جنگ تھے نہ کوئی مسلح فوج۔ چند فقرا وصعالیک تھے جنھوں نے دعوت الٰہی کا ساتھ دیا۔ اللہ کی پکار کو سن کر اس کی تلاش میں نکلے اور آسمان کے لیے زمین والوں سے اپنا رشتہ قطع کر دیا۔ ان کے پاس پُرہیبت جسم نہ تھے اور نہ خونخوار اسلحہ، مگر ان کے سینوں میں صداقت شعار دل اور ان کی آنکھوں میں سچائی کے آنسو تھے، انھوں نے تعلیم الٰہی کو اپنا دستور العمل بنایا۔ انھوں نے ہر اس لفظ کو جو خدا کے مقدس پیغامبر کی زبان سے نکلا، اپنے اعمال وافعال کے اندر محفوظ کر لیا۔ ان کی زبانیں خاموش تھیں مگر ان کے اعمال گویا تھے۔ انھوں نے اس "اسوۂ حسنہ" کی زندگی کو اپنا نصب العین بنایا تھا، جو گو انسان تھا مگر اپنے ہر فعل کے اندر ایک خدا نما جلوۂ الٰہی رکھتا تھا وہ نہ صرف تعلیم بلکہ ایک عملی نمونے کر دنیا میں بڑھے اور آسمان کی پادشاہت کا وہ مقدس تخم، جس کی منادی شام کے مرغزاروں میں ہوئی تھی۔ حجاز کے ریگستانوں میں نشوونما پانے لگا۔ تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ ایک سرسبز وتناور درخت نے اپنی ڈالیوں سے کرۂ ارضی کو چھپا لیا۔ ہوا کے پرندوں نے اس کی شاخوں میں نشیمن بنائے اور زمین کی مخلوقات نے اس کے سایے میں پناہ لی، اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ (سورۂ ابراہیم ۱۴: ۲۴-۲۵) وہ درخت کہ جڑ اس کی زمین کے اندر مضبوط اور بلند ٹہنیاں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ قوت الٰہی کی نشوونمائی سے وہ ہر وقت کامیابی کا پھل لاتا رہتا ہے اور یہ ایک مثال ہے جو اللہ بیان کرتا ہے تاکہ لوگ سوچیں اور غور کریں۔

تلاشِ مکان یا تلاشِ مکین

یاد رکھو، وہ خدا جو مکان و زمان سے منزہ ہے، جب دنیا میں آتا ہے تو اپنے بسنے کے لیے گھر چاہتا ہے۔ زمین کی شاندار آبادیاں، پہاڑوں کی سربفلک چوٹیاں، سمندروں کی ناپیدا کنار موجیں، صحراؤں کے وسیع میدان، یہ سب اس کے لیے بے کار ہیں۔ پادشاہوں کے تخت ہیبت وجلال، لعل وجواہر سے لبریز خزانے، بڑے بڑے گنبدوں اور ستونوں کے عظیم الہیئت ایوان ومحل، اس کا گھر نہیں بن سکتے۔ تم اس کے لیے ایک گھر پیدا کرو جو اس کے جمال قدس کا نشیمن اور اس کے حسن ازل کا کاشانہ بن سکے۔ تم جو اس کی جستجو میں نکلنا چاہتے ہو بہتر ہے کہ پہلے اپنی جستجو میں نکلو۔ تم کہ اس کے نہ ملنے کے شاکی ہو، چاہیے کہ پہلے اپنی گم گشتگی پر ماتم کرو! اس کے حریم محبت کا دروازہ ہمیشہ سے بے حجاب ہے۔ اس کے کاشانۂ وصال کے باب عشق نواز پر کوئی پاسبان نہیں۔ وہ تو ہر آن و ہر لحظہ تلاش کرنے والوں کا منتظر ہے، لیکن ساری محرومی اس میں ہے کہ تمھارے پاس کوئی مکان ہی نہیں، جو اس کے قدوم محبت کا مسکن بن سکے۔

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالاے کس کوتاہ نیست

(حافظؒ)

اس کے بسنے کے لیے چاندی اور سونے کا محل اور صندل و آبنوس کا تخت مطلوب نہیں، جس میں لعل و الماس کے ٹکڑے جڑے ہوں۔ وہ ان دلوں کا طالب ہے، جن میں اس کے درد محبت کے زخموں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ اس کے لیے فقیروں اور خاک نشینوں کی ایک ایسی جماعت چاہیے، جن کے دلوں کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اس کے رہنے کے لیے ایوان و محل ہیں اور یہی اجڑی ہوئی بستیاں ہیں، جن کو اس نے اپنی آبادی کے لیے چن لیا ہے وہ کہ آبادیوں کی رونق، صحراؤں کی فضا، پہاڑوں کی بلندی، ملکوت السمٰوات کی بوقلمونی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی، دلوں کی اُجڑی ہوئی بستیوں اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں کو اپنا کاشانۂ وصال بناتا ہے اور اس گھر کے سوا اور کوئی جگہ اسے پسند نہیں، لا وسعنی ارضی و لا سمائی ولکن تیسعنی قلب عبدی المومن و ایضًا قال: انا عند المنکسرۃ قلوبھم۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔

(احزاب: ۷۲)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس بارگراں کے متحمل نہ ہو سکے، لیکن انسان آگے بڑھا اور اس نے بلا تامل اٹھا لیا۔ کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے او پر سخت ظلم کرنے والا اور سرگشتۂ نادانی ہے۔

وقال مولی الجامی، قدس اللہ سرہ السامی:

غیر انساں کس نہ کردہ قبول
زانکہ انساں ظلوم بود و جہول!
ظلم او آنکہ ہستی خود را
ساخت فانی بقاے سرمد را
جہل او آنکہ ہر چہ جز حق بود
صورت آں ز لوح دل بہ زدود
نیک ظلمے کہ عین معدلت است
نغز جہلے کہ مغز معرفت ست

فلو لم یکن للانسان قوۃ ھٰذہ الظلومیۃ والجھولیۃ، لما حمل تلک الامانۃ العظیمۃ الالٰھیۃ۔

دلوں کو بدلو

پس اس قدوس وقدیم کا دنیا میں کوئی گھر ہو سکتا ہے، تو وہ صرف ان انسانوں کے دلوں ہی کا آشیانۂ محبت ہے، جنھوں نے اس گھر کو اس کے بسنے کے لیے پہلے ہی سے سنوار رکھا ہے اور اس کی آرائش وتزیین سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ دنیا کے گھروں کی طرح اس گھر کی آرائش کے لیے نہ تو حریر و اطلس کے پردوں کی ضرورت ہے نہ دیبا و قاقم کے فرش وقالین کی۔ اس کی آرائش کے لیے صرف ایک ہی چیز مطلوب ہے یعنی زخم محبت کی خوننابہ فشانی، جس کی چھاپوں سے اس کی دیواریں ہمیشہ گلزار رہیں:

بجز محبت ہر چہ بردم، سود در محشر نداشت
دین و دانش عرضہ کردم، کس بہ چیزے بر نداشت

(نظیری)

(شبلی) را در خواب دیدند و پرسیدند، کیف وجدت سوق الآخرۃ؟ بازار آخرت را چہ طور یافتی؟ گفت: بازاری است کہ رونق نہ دارد و دریں بازار مگر جگرہاے سوختہ و دلہاے شکستہ، آہ ہاے سوزان وچشم ہاے خوں فشاں! سوختہ را مرہم نہند، شکستہ را باز بندند، وچشم ہاے خونچکاں را از سرمۂ نظارہ مجلّٰی ومنوّر سازند۔

دل شکستہ دراں کوے می کنند درست
چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست!

(نظیری)

پس اگر تم اس کے طالب ہو تو ایک جماعت پیدا کرو تا اس کے جلال وقدوسیت کا وہ آشیانہ بنے۔ اگر تمھارے پاس گھر نہیں تو بسنے والے کی تلاش میں کیوں سرگرداں ہو؟ مکین سے پہلے چاہیے کہ مکان کی فکر کر لو۔

انقلاب آسان نہیں

دنیا کے اندر تبدیلی پیدا کرنا آسان نہیں۔ تم کسی گھر کی ایک دیوار یا کھڑکی بدلنی چاہتے ہو تو اس کے لیے کیا کیا سر و سامان کرنے پڑتے ہیں؟ پھر جو لوگ سطح ارضی کے بڑے بڑے رقبوں اور انسانوں کی عظیم الشان آبادیوں کے اعمال ومعتقدات کو بدل دینا چاہتے ہیں انھیں سوچنا چاہیے کہ ان کا مقصد کس درجہ مشکل اور کٹھن ہے۔

دنیا میں مادی انقلابات ہمیشہ سلطنتوں کے تغیرات اور خونریز جنگوں کے ظہور سے ہوتے رہتے ہیں، لیکن غور کرو کہ ان میں کا ہر چھوٹے سے چھوٹا انقلاب بھی کیسی گراں قدر وقیمت رکھتا ہے؟ قرنوں کے قرن فکر وتدابیر میں گزر جاتے ہیں۔ خزانوں کے خزانے لٹا دیے جاتے ہیں۔ کروڑوں گنیوں کے قرض لیے جاتے ہیں۔ پھر فوجوں کے

سمندر طوفان میں آتے ہیں۔قیمتی سے قیمتی آلات و اسلحہ کروڑوں کی تعداد میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بے شمار انسانوں کی قربانیاں تڑپتی اور خون کی ندیاں بہتی ہیں۔عورتیں بیوہ، بچے یتیم، والدین زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔یہ سب کچھ ہو رہتا ہے، جب کہیں جا کر ایک چھوٹا سا ملکی انقلاب تکمیل کو پہنچتا ہے۔

پھر وہ بھی یقینی نہیں کہ ہزارہا کوششیں رائیگاں اور صدیوں کی امیدیں پامال بھی ہو جاتی ہیں۔جب دنیا کے ان مادی انقلابات کا یہ حال ہے جو صرف انسانی حکومت کے تخت اور انسانی نسلوں کی آبادیوں کو متغیر کرنا چاہتے ہیں، تو پھر اس روحانی اور قلبی انقلاب کو سوچو، جو زمین کی سطح اور انسان کے جسموں کو نہیں بلکہ رُوحوں اور دلوں کی اقلیموں کو پلٹ دینا چاہتے ہیں اور کروڑوں انسانوں کے اعمال و خصائل کے اندر تبدیلی کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ان انقلابات کے لیے کیا محض انسانی قوت و تدبیر اور محض اخلاق و مذہب کے چند رسمی اصولوں کو پکار دینا ہی کافی ہو سکتا ہے؟

تم ایک مرتبہ خود اپنے ہی نفس کو آزما دیکھو، جس پر تمہارے ارادے کو پوری قدرت ہے۔کیا ایک چھوٹے سے چھوٹی تبدیلی بھی اپنے نفس و اعمال کے اندر بآسانی پیدا کر سکتے ہو؟

پھر جب تم ایک نفس کی تبدیلی پر، جو خود تمہارے اختیار میں ہے، قادر نہیں، تو ان کروڑوں دلوں کو کیوں کر بدل دے سکتے ہو، جن پر تمہاری نہیں، بلکہ صدیوں کے پرورش یافتہ و محکم اعتقادات و اعمال کی حکومت قاہرہ اور نفس کا تسلط جابرہ قائم ہے۔

ارواح و قلوب کی کایا پلٹ

اصل یہ ہے کہ انسان جسم کو پارہ پارہ کر دے سکتا ہے پر دلوں کو نہیں بدل سکتا۔ زمین کی خشکی و تری کا نقشہ، ممکن ہے وہ بدل دے لیکن قلب و روح کا ایک گوشہ بھی اس کے پھیرے سے نہیں پھر سکتا۔وہ تعلیم دے سکتا ہے اور" اصلاح"! "اصلاح"! پکار بھی سکتا ہے، لیکن نہ تو فتح مندی کا بیج اس کے دامن میں ہے اور نہ بار آور کرنے والی نشوونما اس کے قبضے میں ہے۔ یہ صرف اسی قدیر و حکیم کے دست قدرت کا کام ہے، جو مقلب القلوب اور محول الاحوال ہے اور جو ہمیشہ اپنے کاروبار قدرت کی نیرنگیاں دکھلاتا اور اپنی عجائب فرمائی پر حیرانی و تحیر کی بخشش کرتا ہے۔

پس اگر تم کہ انسان ہو، انسانوں کو بدلنا اور ارواح و قلوب کے عوالم روحانیہ کو منقلب کر دینا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ جب تک تم انسان ہو، ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ انسانوں کو اس کی قدرت نہیں دی گئی۔ البتہ اگر تم اپنے اندر قوت الٰہی پیدا کر لو، اگر اپنی جماعت کے اندر اس کارفرمائے حقیقی کا ایک گھر بنا لو۔تمہاری صداؤں کی جگہ تمہارے اندر سے اس کی آواز نکلنے لگے۔تمہاری آنکھوں کے حلقوں سے تمہاری نظروں کی جگہ اس کی نگاہیں کام کرنے لگیں۔تمہارے اعمال و افعال یکسر اس قادر و مقتدر کے کاروبار ہوں گے جس کا دامن عزت و کبریائی اس سے بہت اقدس و منزہ ہے کہ آلودۂ ناکامی و ملوثِ حسرت و افسوس ہو۔

اللہ کا ہاتھ درکار ہے

پھر جب وہ کہ سب کا مالک ہے، تم میں ہوگا، تو تمہیں بھی اس کے ملک کی ہر شے پر قدرت ہو جائے گی کیونکہ تمہاری قدرت درحقیقت اسی کی قدرت ہوگی۔ تمہاری صدائے دعوت ایک سیلابِ انقلاب ہوگی، جسے دنیا کی کوئی طاقت نہ روک سکے گی۔ تمہاری زبانوں سے جو کچھ نکلے گا، وہ دلوں اور روحوں پر نقش ہو جائے گا۔ پھر نہ زمین کا پانی اسے دھو سکے گا اور نہ آسمان کی بارش اسے محو کر سکے گی۔ تمہاری تعلیم بیج اور پھل دونوں اپنے ساتھ لائے گی اور تم گو چپ رہو گے لیکن تمہاری خاموشی کی ایک ایک صدائے عمل پر کروڑوں ہستیاں اپنے دلوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر پیش کش کریں گی۔ تمہاری آنکھوں سے شعلۂ الٰہی کے جب شرارے نکلیں گے تو دنیا میں کس کی آنکھ ہوگی، جو اس سے دوچار ہو سکے؟ تمہاری زبانوں سے جب لسانِ الٰہی کی صدائے دعوت اٹھے گی، تو خدا کی آواز کو سن کر اس کی کون مخلوق ہے جو لبیک نہ کہے گی؟

تم جس طرف سر اٹھاؤ گے، دلوں کو سربسجود اور روحوں کو معترفِ عجز و نیاز پاؤ گے اور خدا کا قاہر و مقتدر ہاتھ تم میں سے ظاہر ہو کر ملکوں اور قوموں کو منقلب کر دے گا!

تم ایک عالم کو بدلنا چاہتے ہو۔ تمہارے سامنے صدیوں کی ایک محکم عمارت ہے تم چاہتے ہو کہ اسے یکسر ڈھا دو اور اس کی جگہ ایک نیا محل تعمیر کرو، لیکن اس کے لیے تمہارے دست و بازو کی قوت تو کافی نہیں۔ جب تک تمہارے ہاتھ کے اندر سے اللہ کا ہاتھ نمایاں نہ ہوگا اس ردّ و قبول اور ہدم و بنا سے عہدہ برآ نہ ہو سکو گے۔

تشریح مزید

حکیم و جاہل اور فرزانہ و ہشیار میں مرئیات و مشاہدات کا فرق نہیں بلکہ صرف چشمِ نظارہ اور دلِ فکر فرما کا فرق ہے۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے، یہ کیا بوالعجبی ہے کہ پاک تعلیمات کا اثر اور مقدس صداؤں کی تاثیر ہم میں سے مفقود ہو گئی ہے؟ یہ کیوں ہے کہ بہتر سے بہتر ارادے ہمارے ذہنوں میں، اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات ہماری فکروں میں اور پاک سے پاک تعلیمات ہماری زبانوں پر ہیں، مگر نہ تو ارادوں میں قبولیت ہے، نہ خیالات میں فعالیت اور نہ تعلیمات میں اثر؟ جس دنیا کے بڑے بڑے وسیع ٹکڑوں کو صرف ایک زبان کی دعوت نے مضطر و سیماب وار کر دیا تھا، آج اسی دنیا میں بڑی بڑی جماعتوں کی صدہا صدائیں ایک نفسِ واحد کی جامد و ساکن فضا میں حرکت پیدا نہیں کر سکتیں۔ یہی اسلام کی صدائے دعوت اور یہی اس کی کتابِ ہدایت کی صدائے اصلاح اس وقت بھی تھی، جب کہ اس کے ایک ایک داعی نے ایک ایک اقلیم کو مسخر اثر کر لیا تھا اور یہی اب بھی ہے کہ خود اپنے دلوں ہی میں تپش محسوس نہیں ہوتی، دوسروں کی انگیٹھیاں اس سے خاک روشن ہوں گی۔

ایک ہی علت سے دو مختلف نتیجے پیدا نہیں ہو سکتے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا کا سرِ انقلاب و تغیر ہمیشہ صدائے عمل کے آگے جھکا ہے، نہ کہ صدائے قول کے سامنے۔

حقیقی شے ہر تعلیم کے لیے "نمونہ" ہے اور جب تک مصلح اپنے اندر اپنی اصلاح کا نمونہ نہیں رہے گا، اس کی تعلیم دلوں کی قبولیت اور روحوں کی اطاعت سے محروم رہے گی۔ آگ جب جلتی ہے تو سب سے پہلے جلانے والے کو گرم کرتی ہے۔ اگر تمہارے پاس آگ موجود ہے تو سب سے پہلے اپنے آپ کو سوز و تپش میں دکھلاؤ۔ پھر دوسروں کو گرمی و حرارت کی دعوت دینا۔ اگر خود تمہارے اندر آگ موجود ہے تو اس مجمر سوزاں کو جہاں کہیں بھی رکھو گے، خود بخود ہر طرف گرمی پھیل جائے گی، کیونکہ گرمی آگ کے شعلوں سے نکلتی ہے، برف کی سل سے پیدا نہیں ہو سکتی۔

اسلام نے ایک جماعت صحابۂ کرام کی پیدا کر دی تھی، جو اس تعلیم کا ایک صحیح ترین عملی نمونہ اپنے اندر رکھتی تھی اور ان میں کا ہر فرد اس اسوۂ حسنہ کی قوت سے ایک ایک اقلیم کی تسخیر اپنے قبضۂ اقتدار میں رکھتا تھا۔ ان کے اعمال کے اندر تعلیمات الٰہیہ کی مقدس انگیٹھی شعلہ فروز تھی، اس لیے وہ جہاں جاتے تھے، ایک آتشکدۂ اثر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔[1]

---

[1] یہ خیال نہ فرمایا جائے کہ یہ مقالہ حج سے بظاہر بے تعلق سا ہے۔ حقیقۃً مولاناؒ نے حج کی تمہید کے طور پر یہ مقالہ مرتب فرمایا تھا۔ وہ بہ یک وقت کئی کام انجام دیتے تھے۔ اسلامی تنظیم بھی ہر لحظہ ان کے پیش نظر تھی چنانچہ وہ حج کو حقیقۃً اسلام کی بین الملی تنظیم کا ایک اہم محرک سمجھتے تھے۔ اس مقالے سے مقصود یہ تھا کہ دکھائیں اسلامی زندگی دراصل جماعتی زندگی ہے۔ اس مقالے کو غالباً ایک اور مقالے کے ذریعے سے حج کے ساتھ ملا دینے کے خواہاں تھے جو لکھا نہ جا سکا۔ دراصل یہ مباحث حج ہی کی تمہید ہے اور بجائے خود بھی اس کی اہمیت کسی توضیح کی محتاج نہیں۔ (مولف)

باب ۸۴

تاریخ فرضیتِ حج

اگرچہ اہل عرب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجموعۂ تعلیم ہدایت کو بالکل بھلا دیا تھا لیکن انھوں نے خانہ کعبہ کے کنگرے پر چڑھ کر تمام دنیا کو جو دعوت عام دی تھی اس کی صدائے بازگشت اب تک عرب کے در و دیوار سے آ رہی تھی،

وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ (سورۂ حج آیات: ۲۶-۲۷)

اور جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے ایک معبد قرار دیا اور حکم دیا کہ ہماری قدوسیت و جبروت میں اور کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانا اور اس گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنیوالوں کے لیے ہمیشہ پاک و مقدس رکھنا! نیز ہم نے حکم دیا کہ دنیا میں حج کی پکار بلند کر دو لوگ تمہاری طرف دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے ان میں پیادہ پا بھی ہوں گے اور وہ بھی جنھوں نے مختلف قسم کی سواریوں پر دور دراز مقامات سے قطع مسافت کی ہوگی۔

بدعات و محدثات جاہلیت

لیکن سچ کے ساتھ جھوٹ مل جاتا ہے تو وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ اہل عرب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سنت قدیم کو تو زندہ رکھا تھا، لیکن بدعات و اختراعات کی آمیزش نے اصل حقیقت بالکل گم کر دی تھی۔

۱۔ خدا نے اپنے گھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیام کی اجازت صرف اس شرط پر دی تھی کہ "کسی کو خدا کا شریک نہ بنانا" (ان لا تشرك بی شیئا) لیکن اب خدا کا یہ گھر تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز بن گیا تھا اور ان کا طواف کیا جاتا تھا۔

۲۔ خدا نے حج کا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ دنیوی فوائد کے ساتھ خدا کا ذکر قائم کیا جائے لیکن اب صرف آبا و اجداد کے کارنامہائے فخر و غرور کے ترانے گائے جاتے تھے۔

۳۔ حج کا ایک مقصد تمام انسانوں میں مساوات قائم کرنا تھا۔ اس لیے تمام عرب بلکہ پوری دنیا کو اس کی دعوت عام دی گئی اور سب کو وضع و لباس میں متحد کر دیا گیا[1] لیکن قریش کے غرور فضیلت نے اپنے لیے بعض خاص امتیازات

[1] یہ اشارہ احرام کی طرف ہے کہ حج کے موقع پر تمام افراد ایک ہی وضع کا لباس اختیار کرتے ہیں یعنی دو چادریں ایک باندھنے کے لیے اور دوسری اوڑھنے کیلئے برہنگی کا ہٹانا

قائم کر لیے تھے جو اصول مساوات کے بالکل منافی تھے مثلاً تمام عرب عرفات کے میدان میں قیام کرتے تھے لیکن قریش مزدلفہ سے باہر نہیں نکلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متولیان حرم، حرم کے باہر نہیں جا سکتے، جس طرح آج کل کے امرائے فسق و والیان ریاست عام مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں آکر بیٹھنے اور دوش بدوش کھڑے ہونے میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

۴۔ قریش کے سوا عرب کے تمام مرد و زن برہنہ طواف کرتے تھے۔ ستر عورت کے ساتھ صرف وہی لوگ طواف کر سکتے تھے جنھیں قریش کی طرف سے کپڑا ملتا تھا اور قریش نے اسے بھی اظہار سیادت کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا۔

۵۔ عمرہ گویا حج کا ایک مقدمہ یا جزو تھا لیکن اہل عرب ایام حج میں عمرہ کو سخت گناہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ جب حاجیوں کی سواریوں کی پشت کے زخم اچھے ہو جائیں اور صفر کا مہینا گزر جائے، تب عمرہ جائز ہو سکتا ہے۔

۶۔ حج کے تمام اجزا و ارکان میں یہودیانہ رہبانیت کا عالمگیر مرض ساری ہو گیا تھا۔ اپنے گھر سے پا پیادہ حج کرنے کی منت ماننا، جب تک حج ادا نہ ہو جائے خاموش رہنا، قربانی کے اونٹوں پر کسی حالت میں سوار نہ ہونا، ناک میں نکیل ڈال کر جانوروں کی طرح خانۂ کعبہ کا طواف کرنا، زمانۂ حج میں گھر کے اندر دروازے کی راہ سے نہ گھسنا، بلکہ پچھواڑے کی طرف سے دیوار پھاند کے آنا، در و دیوار پر قربانی کے جانوروں کے خون کا چھاپا لگانا، عرب کا عام شعار ہو گیا تھا۔

ظہور اسلام و تزکیۂ حج

اسلام درحقیقت دین ابراہیمی کی حقیقت کی تکمیل تھا، اس لیے وہ ابتداً ہی سے اس حقیقت گم شدہ کی تجدید و احیا میں مصروف ہو گیا، جس کا قالب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں نے تیار کیا تھا۔ اسلام کا مجموعۂ عقائد و عبادات صرف توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سے مرکب ہے، لیکن ان تمام ارکان میں حج ہی ایک ایسا رکن ہے جس سے اس تمام مجموعہ کی ہیئت ترکیبی مکمل ہوتی ہے اور یہ تمام ارکان اس کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو صرف خانۂ کعبہ ہی کے ساتھ متعلق کر دیا،

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ (النمل: ۹)

مجھے صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے خدا کی عبادت کروں، جس نے اسے حرمت و عزت والا بنایا۔ سب کچھ اسی خدا کا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس کے فرمانبرداروں میں سے رہوں۔

حج اور اسلام

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ہر موقع پر حج کے ساتھ اسلام کا ذکر بطور لازم و ملزوم کے کیا:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ

اور ہر امت کے لیے ہم نے عبادات کا ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا تھا کہ خدا نے انھیں جو چار پائے بخشے ہیں ان کی

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْاؕ وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ۔ (سورۂ حج، ۳۴)

قربانی کے وقت خدا کا نام لیں۔ پس تم سب کا خدا ایک ہی ہے، اسی کے تم سب فرمانبردار بن جاؤ اور خدا کے خاکسار بندوں کو حج کے ذریعے سے دین حق کی بشارت دو۔

ظالموں کی محرومی

اسلام خدا کا ایک فطری معاہدہ تھا، جسے انسان کی ظالمانہ عہد شکنی نے بالکل چاک چاک کر دیا تھا اس لیے خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ناخلف اولاد کو روزِ اوّل ہی اس کے ثمرات سے محروم کر دیا:

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًاؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔ (سورۂ بقرہ، ۱۲۴)

جب خدا نے چند احکام کے ذریعے سے ابراہیم کو آزمایا اور وہ خدا کے امتحان میں پورا اترا تو خدا نے کہا کہ اب میں تمہیں دنیا کی امامت اور خلافت عطا کرتا ہوں۔ اس پر ابراہیم نے عرض کیا، اور میری اولاد کو بھی؟ ارشاد ہوا کہ ہاں، مگر اس قول و قرار میں ظالم لوگ داخل نہیں ہو سکتے۔

امت مسلمہ

خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن "کلمات" کے ذریعے سے آزمایا اور جن کی بنا پر انھیں دنیا کی امامت عطا ہوئی، وہ اسلام کے اجزائے اولین یعنی توحید الٰہی، قربانی نفس و جذبات، صلوٰۃ الٰہی کا قیام اور معرفت دین فطری کے امتحانات ہیں۔ اگرچہ ان کی اولاد میں سے چند ناخلف لوگوں نے ان ارکان کو چھوڑ کر اپنے اوپر ظلم کیا اور اس موروثی عہدے سے محروم ہو گئے "قال لا ینال عهدی الظالمین" لیکن حضرت ابراهیم علیہ السّلام کی ذات کے اندر ایک دوسری امت بھی چھپی ہوئی تھی جس کے لیے خود انھوں نے خدا سے دعا کی تھی:

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا۔ (سورۃ النحل، ۱۲۰)

ابراہیم بظاہر تو ایک فرد واحد تھے مگر ان کی فعالیت روحانیہ و الٰہیہ کے اندر ایک پوری قوم قانت و مسلم پوشیدہ تھی۔

اجزائے حج

اب اس "امت مسلمہ" کے ظہور کا وقت آ گیا اور وہ رسول مزکّی و موعود غار حرا کے "تاریک گوشوں سے نکل کر منظر عام پر نمودار ہوا تاکہ اس اندھیرے میں خود اس نے جو روشنی دیکھی تھی، وہ پوری دنیا کو بھی دکھا دے:

یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (سورۂ بقرہ، ۲۵۷)

وہ پیغمبران کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ۔ (سورۂ مائدہ، ۱۵)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور ہدایت اور ایک کھلی کھلی ہدایتیں دینے والی کتاب آئی۔

توحید و نماز وہ منظر عام پر آیا تو سب سے پہلے اپنے باپ کے موروثی گھر کو ظالموں کے ہاتھ سے واپس لینا چاہا لیکن اس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی طرح بتدریج چند روحانی مراحل سے گزرنا ضرور تھا۔ چنانچہ اس نے ان مرحلوں سے بتدریج گزرنا شروع کیا۔ اس نے غارِ حرا سے نکلنے کے ساتھ ہی توحید کا غلغلہ بلند کیا کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو عہد لیا تھا اس کی پہلی شرط یہی تھی، "ان لا تشرك بی شیئاً" پھر اس نے صفِ نماز قائم کی کہ یہ گھر صرف خدا ہی کے آگے سر جھکانے والوں کے لیے بنایا گیا تھا: "وطهر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود"۔ اس نے روزے کی تعلیم دی کہ وہ شرائطِ حج کا جامع و مکمل تھا:

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ۔ (سورۂ بقرہ: ۱۹۷)

جس شخص نے ان مہینوں میں حج کا عزم کر لیا تو اسے ہر قسم کی نفس پرستی، بدکاری اور جھگڑے تکرار سے اجتناب کرنا لازم ہے۔

روزہ روزے کی حقیقت یہی ہے کہ وہ انسان کو غیبت، بہتان، فسق و فجور، مخاصمت و منازعت اور نفس پرستی سے روکتا ہے جیسا کہ احکامِ صیام میں فرمایا:

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ۔ (سورۂ بقرہ ۱۸۷)

پھر رات تک روزہ پورا کرو اور روزے کی حالت میں عورتوں کے نزدیک نہ جاؤ اور اگر مساجد میں اعتکاف کرو تو شب کو بھی ان سے الگ رہو۔

زکوٰۃ اس نے زکوٰۃ بھی فرض کر دی کہ وہ بھی حج کا ایک اہم مقصد تھی:

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ (سورۂ حج: ۲۸)

قربانی کا گوشت خود کھاؤ اور فقیروں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔

فتح مکہ اسی طرح جب اس "امت مسلمہ" کا روحانی خاکہ تیار ہو گیا تو اس نے اپنی طرح اسے بھی منظر عام پر نمایاں کرنا چاہا۔ اس غرض سے اس نے عمرہ کی تیاری کی اور چودہ پندرہ سو کی جمعیت کے ساتھ روانہ ہوا کہ پہلی بار اپنے آبائی گھر کو حسرت آلود نگاہوں سے دیکھ کر چلے آئیں، لیکن یہ کاروانِ ہدایت راستے ہی میں بمقام حدیبیہ روک دیا گیا۔ دوسرے سال حسب شرائطِ صلح زیارت کعبہ کی اجازت ملی تو آپ مکہ میں قیام کر کے چلے آئے۔ اب اس مصالحت نے راستے کے تمام نشیب و فراز ہموار کر دیے تھے۔ صرف خانہ کعبہ میں پتھروں کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا اسے بھی فتح مکہ نے ہموار کر دیا:

دخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم مکۃ یوم الفتح وحول البیت ستون وثلثمائۃ نصب فجعل

آنحضرت صلعم فتح مکہ کے دن جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو اس کے گرد تین سو ساٹھ بت نظر آئے۔ آپ ان کو ایک

يطعنها بعود فى يده و يقول جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔ (صحیحین)

لکڑی کے ذریعے سے ٹھکراتے جاتے تھے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے "جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل کان زهوقا" یعنی حق اپنے مرکز پر آگیا اور باطل نے اس کے سامنے ٹھوکر کھائی۔ باطل پامال ہونے ہی کے قابل تھا۔

فرضیت حج

اب میدان بالکل صاف تھا۔ راستے میں ایک کنکری بھی سنگِ راہ نہیں ہو سکتی تھی۔ باپ نے گھر کو جس حال میں چھوڑا تھا، بیٹے نے اسی حالت میں اس پر قبضہ کر لیا۔ تمام عرب نے فتح مکہ کو اسلام و کفر کا معیارِ صداقت قرار دے لیا تھا۔ جب مکہ فتح ہوا تو لوگ جوق جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اب وقت آگیا تھا کہ دنیا کو اس جدید النشئۃ "امت مسلمہ" کے قالب روحانی کا منظر عام طور پر دکھا دیا جاتا، اس لیے دوبارہ اسی دعوت عامہ کا اعادہ کیا گیا جس کے ذریعے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام عالم میں ایک غلغلۂ عام ڈال دیا تھا، مگر اس قوت کا فعل میں آنا ظہور نبی امی پر موقوف تھا،

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۚ (آل عمران: ۹۷)

جو لوگ مالی اور جسمانی حالت کے لحاظ سے حج کی استطاعت رکھتے ہیں، ان پر حج فرض کر دیا گیا۔

تکمیل حج

اس صدا پر تمام عرب نے لبیک کہی اور آپ کے گرد ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔ عرب نے ارکانِ حج میں بدعات و اختراعات کا جو زنگ لگا رکھا تھا، وہ ایک ایک کر کے چھڑا دیا گیا۔ آباء و اجداد کے کارناموں کے بجائے خدا کی توحید کا غلغلہ بلند کیا گیا،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۚ (البقرہ: ۲۰۰)

زمانہ حج میں خدا کو اسی جوش و خروش سے یاد کرو جس طرح اپنے آباء و اجداد کے کارناموں کا اعادہ کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ۔

امتیازات قریش کا خاتمہ

قریش کے تمام امتیازات مٹا دیے گئے اور تمام عرب کے ساتھ ان کو میدان عرفہ کے ایک گوشہ میں کھڑا کر دیا گیا،

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (البقرہ: ۱۹۹)

اور جس جگہ سے تمام لوگ روانہ ہوں تم بھی وہیں سے روانہ ہوا کرو اور فخر و غرور کی جگہ خدا سے مغفرت مانگو، کیونکہ خدا بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

برہنہ طواف بند

بدترین رسم برہنہ طواف کرنے کی تھی اور مردوں سے زیادہ حیا سوز نظارہ برہنہ عورتوں کے طواف کا ہوتا تھا، لیکن ایک سال پہلے ہی سے اس کی عام ممانعت کرا دی گئی:

ان ابا هريرة اخبره ان ابا بكر صديق رضى الله عنه بعثه فى الحجة التى امره رسول الله (صلعم) قبل حجة الوداع يوم النحر فى رهط يوذن فى الناس، الا لا يحج بعد العام مشرك و لا يطوف بالبيت عريان۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع سے پہلے آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حج کا امیر بنایا اور انھوں نے مجھے ایک گروہ کے ساتھ روانہ کیا تاکہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک یا کوئی برہنہ شخص حج یا طواف نہ کر سکے گا۔

(بخاری جزء ۲، ص: ۱۵۳)

مختلف بدعات محو زمانہ حج میں عمرہ کرنے والوں کو فاسق و فاجر کہا جاتا تھا لیکن آنحضرت صلعم نے حجۃ الوداع میں عمرہ ہی کا احرام باندھا اور صحابہ کو بھی عمرہ کرنے کا حکم دیا۔ پا پیادہ اور خاموش حج کرنے کی ممانعت کی گئی۔ قربانی کے جانوروں پر سوار ہونے کا حکم دیا گیا۔ ناک میں رسّی ڈال کر طواف کرنے سے روکا گیا۔ گھر میں دروازے سے داخل ہونے کا حکم ہوا:

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(بقرہ: ۱۸۹)

یہ کوئی نیکی کا کام نہیں کہ گھروں میں پچھواڑے سے آؤ، نیکی تو صرف اس کی ہے جس نے پرہیزگاری اختیار کی۔ پس گھروں میں دروازے ہی کی راہ سے آؤ اور خدا سے ڈرو۔ یقین ہے کہ تم کامیاب ہوگے۔

قربانی کی حقیقت قربانی کی حقیقت واضح کی گئی اور بتایا گیا کہ وہ صرف ایثار نفس و فدویت جان و روح کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ اس کا گوشت یا خون خدا تک نہیں پہنچتا کہ اس کے چھاپے سے دیواروں کو رنگین کیا جائے۔ خدا تو صرف خالص نیتوں اور پاک و صاف دلوں کو دیکھتا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ

(الحج: ۳۷)

خدا تک قربانی کے جانوروں کا گوشت و خون نہیں پہنچتا بلکہ اس تک صرف تمھاری پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

غرض چھلکے اتر گئے تو خالص مغز ہی مغز باقی رہ گیا۔ اب وادی مکہ میں خلوص کے دو قدیم و جدید منظر نمایاں ہو گئے ایک طرف آب زمزم کی شفاف سطح لہریں لے رہی تھی، دوسری طرف ایک جدید النشاۃ قوم کا دریائے وحدت موجیں مار رہا تھا۔

اعلان عام اور حجۃ الوداع لیکن دنیا اب تک اس اجتماع عظیم کی حقیقت سے بے خبر تھی۔ اسلام کی ۲۳ سالہ زندگی کا مدّ و جزر تمام عرب دیکھ چکا تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسلام کی تاریخی زندگی کن نتائج پر مشتمل تھی اور مسلمانوں کی جدوجہد، فدویت، ایثار نفس و روح کا مقصد اعظم کیا تھا؟ اب اس کی

توضیح کا وقت آگیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کا سنگ بنیاد یہ دُعا پڑھ کر رکھا تھا:

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (بقرہ: ۱۲۶)

جب ابراہیم نے کہا خداوندا اس شہر کو امن کا شہر بنا اور اس کے باشندے خدا اور روزِ قیامت پر ایمان لائیں تو ان کو ہر قسم کے ثمرات و نعائم عطا فرما۔

حضرت ابراہیمؑ اور رسول اللہ صلعم

جس وقت انھوں نے یہ دعا کی تھی، تمام دنیا فتنہ و فساد کا گہوارہ بن رہی تھی۔ دنیا کا امن و امان اٹھ گیا تھا۔ اطمینان و سکون کی نیند آنکھوں سے اُڑ گئی تھی۔ دنیا کی عزت و آبرو معرض خطر میں تھی۔ جان و مال کا تحفظ ناممکن ہو گیا تھا۔ کمزور اور ضعیف لوگوں کے حقوق پامال کر دیے گئے تھے۔ عدالت کا گھر ویران تھا، حریتِ انسان مفقود تھی اور نیکی کی مظلومیت انتہائی حد پر پہنچ چکی تھی۔ کرۂ ارض کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ظلم و کفر کی تاریکی سے ظلمت کدہ نہ ہو۔ اس لیے انھوں نے آباد دنیا کے ناپاک حصوں سے کنارہ کش ہو کر ایک "وادی غیر ذی زرع" میں سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک دار امن بنایا اور تمام دنیا کو صلح و سلام کی دعوت عام دی۔ اب ان کی صالح اولاد سے یہ دارالامن بھی چھین لیا گیا تھا۔ لہٰذا اس کی واپسی کے لیے پورے دس سال تک اس کے فرزند نے بھی باپ کی طرح میدان میں ڈیرہ ڈالا[۱] فتح مکہ نے جب اس کا مامن و ملجا واپس دلایا تو وہ اس میں داخل ہوا کہ باپ کی طرح تمام دنیا کو "گم شدہ حق کی واپسی" کی بشارت دے۔ چنانچہ وہ اونٹ پر سوار ہو کر نکلا اور تمام دنیا کو مژدۂ امن و عدالت سنایا۔

خطبہ حجۃ الوداع

ان دماءکم و اموالکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم هٰذا فی شهرکم هٰذا فی بلدکم هذا۔ الا ان کل شی من امر الجاهلیة تحت قدمی موضوع و دماء الجاهلية موضوعة و اول دم اضعه دماءنا دم ابن ربیعة و ربا الجاهلیة موضوعة و اول ربا اضع ربانا ربا

جس طرح تم آج کے دن کی (حج کے دن کی) اس مہینے کی (حج کے مہینے کی) اس شہرِ مقدس (مکہ مکرمہ) کی حرمت کرتے ہو، اسی طرح تمھارا خون اور تمھارا مال بھی تم پر حرام ہے۔ اچھی طرح سن لو کہ جاہلیت کی تمام بُری رسموں کو آج میں اپنے دونوں قدموں سے کچل ڈالتا ہوں۔ بالخصوص زمانہ جاہلیت کے انتقام اور خوں بہا لینے کی رسم تو بالکل مٹا دی جاتی ہے، میں سب سے

---

[۱] یہ اشارہ بظاہر اس طرف ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کعبۂ مکرمہ کی تطہیر کے لیے مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ میں جا بسے تھے۔

عباس ابن عبدالمطلب ، اللهم اشهد ثلاث مرات۔ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۲۶ کتاب الحج)

پہلے اپنے بھائی ابن ربیعہؓ کے خون کے انتقام سے دست بردار ہوتا ہوں۔ جاہلیت کی سُود خوری کا طریقہ بھی مٹا دیا جاتا ہے اور سب سے پہلے میں خود اپنے چچا عباس ابن عبدالمطلب کا سود چھوڑتا ہوں۔ خدایا تو گواہ رہیو۔ خدایا تو گواہ رہیو، خدایا تو گواہ رہیو کہ میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا۔

تکمیلِ دین اب حق پھر پھرا کے اپنے اصلی مرکز پر آ گیا اور باپ نے دنیا کی ہدایت و ارشاد کے لیے جس نقطے سے پہلا قدم اٹھایا تھا، بیٹے کے روحانی سفر کی وہ آخری منزل ہوئی اور اسی نقطے پر پہنچ کر اسلام کی تکمیل ہو گئی۔ اس لیے وہ کہ اس نے تمام دنیا کو مژدۂ امن سنایا تھا، آسمانی فرشتے نے بھی اس کو کامیابی مقصد کی سب سے آخری بشارت دے دی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (مائدہ: ۳)

آج کے دن میں نے تمہارے دین کو بالکل مکمل کر دیا اور تم پر اپنے تمام احسانات پُورے کر دیے اور تمہارے لیے پسند کر لیا کہ تمہارا دین "الاسلام" ہو۔

(سورۂ حج کے حواشی میں فرمایا)

افادۂ مزید بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت ۲۶ سے ۲۷ (الحج) تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ سب ان احکام کی حکایت ہے جو حضرت ابراہیم کو دیے گئے تھے، لیکن عام طور پر مفسّروں نے آخری حصّہ کو براہِ راست خطاب قرار دیا ہے۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ تمام تفصیلات اسی بات کی شرح ہیں کہ جعلنٰه للناس سواءً العاکف فیه والباد (یعنی یہ عبادت گاہ صرف باشندگانِ مکّہ ہی کے لیے نہیں بنائی گئی بلکہ بلا امتیاز سب کے لیے ہے، خواہ مکہ کے رہنے والے ہوں یا دوسری جگہوں کے) چنانچہ اسی لیے حج اور قربانی کا حکم دیا گیا۔ لوگ دُور دُور سے یہاں آنے لگے اور قربانی کے جانور لانے لگے۔ خصوصًا قربانی کے اونٹ جو صحرا و جبال طے کر کے حرم مکّہ میں پہنچائے جاتے اور لوگ انھیں معبد کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی تصوّر کرتے۔ اب اگر قریش مکّہ کا یہ اختیار تسلیم کر لیا جائے کہ جسے چاہیں آنے دیں، جسے چاہیں روک دیں تو پھر نہ کعبہ کعبہ رہا، نہ حج حج۔

ضمناً یہ بات بھی واضح کر دی کہ قربانی کی حقیقت کیا ہے؟ آیت ۲۸ اور ۳۶ (الحج) میں فرمایا تھا کہ اس کا

---

[1] ابن ربیعہ بن الحارث، دورِ رضاعت میں بنی سعد کے ہاں تھے، وہاں ھذیل نے انھیں قتل کر دیا تھا۔

گوشت خود بھی کھاؤ اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ، یعنی مقصود اس سے جانوروں کا خون بہانا نہیں جیسا کہ لوگ سمجھتے تھے، یہ ہے کہ لوگوں کے لیے غذا کا سامان ہو۔ پھر آیت ۳۷ (الحج) میں صاف صاف کہہ دیا کہ اصل عبادت تمہارے دلوں کا تقویٰ ہے نہ کہ قربانی کا گوشت اور خون۔

بت پرست اقوام میں قربانی کی رسم اس طرح چلتی تھی کہ انھوں نے خیال کیا، انسانوں کی طرح دیوتاؤں کو بھی چڑھاووں کی ضرورت ہے اور جانوروں کا خون بہانا ان کا غضب و قہر ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے، نہ تو خدا تک گوشت کا چڑھاوا پہنچ سکتا ہے نہ وہ خون بہانے کا شائق ہے۔ اصل شے جو اس کے حضور مقبول ہو سکتی ہے، دل کی نیکی اور طہارت ہے۔

باب ۵۹

مقاصدِ حج

عبادات و اعمال کا مقصد

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کی ایک ما بہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تمام عبادات و اعمال کا ایک مقصد متعین کیا اور اس مقصد کو نہایت صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ نماز کے متعلق تصریح کی،

ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر۔ — نماز ہر قسم کی بد اخلاقیوں سے انسان کو روکتی ہے۔

روزے کے متعلق فرمایا؛

لعلکم تتقون۔ — روزے کے ذریعے سے تم لوگ پرہیزگار بن جاؤ گے۔

زکوٰۃ کی نسبت بیان کیا؛

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا۔ — ان کے مال و دولت میں سے ایک حصہ بطور صدقہ کے لے لو کیونکہ تم اس کے ذریعے سے ان کو بخل اور حرص و طمع کی بد اخلاقیوں سے پاک و صاف کر سکو گے۔

احادیث نے اس سے زیادہ تصریح کر دی؛

الصدقہ اوساخ المسلمین توخذ من اغنیائھم و ترد الی فقرائھم۔ — صدقہ مسلمانوں کے دل کا میل ہے، ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے محتاجوں کو دے دیا جاتا ہے۔

اسی طرح خداوند تعالیٰ نے حج کے فوائد و منافع بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیے؛

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومٰتٍ۔ (حج: ۲۸) — حج کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے فوائد حاصل کریں اور اس کے ساتھ ہی چند مخصوص دنوں میں خدا کو یاد بھی کر لیا کریں۔

حج اور تجارت بین الملی

اس آیت میں قرآن حکیم نے جن فوائد کو حج کا مقصد قرار دیا ہے، ان سے اجتماعی و اقتصادی فوائد مراد ہیں اور یہ حج کا ایک ایسا اہم مقصد ہے کہ ابتدا میں جب صحابہ کرام نے دینی مقاصد کے منافی سمجھ کر اسے بالکل چھوڑ دینا چاہا تو اللہ نے ایک خاص آیت نازل فرمائی؛

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ (بقرہ: ۱۹۸)

اس میں تمہارے لیے گناہ کی کوئی بات نہیں کہ (اعمال حج کے ساتھ) تم اپنے پروردگار کے فضل کی تلاش میں بھی رہو (یعنی کاروبار تجارت کا مشغلہ بھی رکھو)

قرآن حکیم کا عام طرز خطاب یہ ہے کہ وہ جزئیات سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا۔ اس کی توجہ ہمیشہ اہم باتوں کی طرف مبذول رہتی ہے۔ اس بنا پر خداوند تعالیٰ نے جس قسم کی تجارت کو حج کا مقصد قرار دیا اور اس کی ترغیب و حوصلہ افزائی کی، وہ عرب کی اقتصادی و تمدنی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ عرب اگرچہ ایک بادیہ نشین اور غیر متمدن قوم تھی تاہم معاش کی ضرورتوں نے اسے تمدن کی ایک عظیم الشان شاخ یعنی تجارت کی طرف ابتداً ہی سے متوجہ کر دیا تھا۔ قریش کا قافلہ عموماً شام وغیرہ کے اطراف میں مال لے کر جایا کرتا تھا اور ان لوگوں نے وہاں کے رہنے والوں سے مستقل طور پر تجارتی تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ خود مکہ کے متصل عکاظ، ذوالمجاز وغیرہ متعدد بازار قائم تھے اور وہ حج کے زمانے میں اچھی خاصی تجارتی منڈی بن جاتے تھے۔ پس اہل عرب کو نفس تجارت کی طرف متوجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن اسلام جو عظیم الشان و عالمگیر مدنیت پیدا کرنا چاہتا تھا، اس کی گرم بازاری کے لیے عکاظ، ذوالمجنہ اور ذوالمجاز کی وسعت کافی نہ تھی۔ وہ دنیا کی تمام متمدن قوموں کی طرح تجارت بین الاقوام کا مستقل سلسلہ قائم کرنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ عنقریب آفتاب اسلام حجاز کی پہاڑیوں سے بلند ہو کر تمام بحر و بر پر چمکنے والا ہے۔

پس اس آیت کریمہ میں جن اقتصادی و تجارتی فوائد کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ایک وسیع بین الملی تجارت کا قیام ہے' ورنہ اہل عرب جس قسم کی تجارت کرتے تھے وہ تو ہر حالت میں قائم رکھی جا سکتی تھی۔ البتہ تجارت بین الاقوام کا سلسلہ بالکل قیام امن و بسط عدل و اجتماع عام پر موقوف تھا، اس لیے جب کامل امن و ایمان قائم ہو گیا اور حج نے راستے کے تمام نشیب و فراز ہموار کر دیے تو اس وقت خدا نے مسلمانوں کو تمدن کی اس منفعت عظیمہ کی ترغیب عام دی۔

مقاصد اعلیٰ و حقیقیہ

لیکن اس تصریح و توضیح کے علاوہ قرآن حکیم کا ایک طرز خطاب اور بھی ہے جو صرف خواص کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ قرآن حکیم کا عام انداز بیان یہ ہے کہ وہ جن مطالب کو عام طور پر ذہن نشین کرنا چاہتا ہے یا کم از کم وہ ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتے ہیں، ان کو تو نہایت کھلے الفاظ میں ادا کر دیتا ہے، لیکن جن مطالب دقیقہ کے مخاطب صرف خواص ہوتے ہیں اور وہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتے، ان کو صرف اشارات و کنایات میں ادا کرتا ہے۔

مقاصد حج میں تجارت ایک ایسی چیز تھی، جس کا تعلق ہر شخص کے ساتھ تھا اور اس کے فوائد و منافع عام طور پر سمجھ میں آ سکتے تھے، اس لیے خدا نے اس کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا' لیکن حج کا ایک اہم مقصد اور بھی تھا' جسے اگرچہ صراحتہً بیان نہیں کیا گیا لیکن قدم قدم پر اس کی طرف اس کثرت سے اشارے کیے کہ اگر ان تمام آیتوں کو

جمع کردیا جائے تو کئی صفحے صرف انھی سے لبریز ہوجائیں۔

حقائق و معارف الٰہیہ کے اظہار میں قرآن حکیم نے عموماً اسی قسم کا طرز خطاب اختیار کیا ہے، جس سے باوجود ابہام کے حقیقت کا چہرہ بالکل بے نقاب ہوجاتا ہے؛ وما یعقلھا الا العالمون! سفرِ درحقیقت انسانی ترقیوں کے تمام مراحل کا مجموعہ ہے، اس کے ذریعے سے انسان تجارت بھی کرسکتا ہے، علمی تحقیقات بھی کرسکتا ہے۔ جغرافیہ اور سیاحت علمیہ کے فوائد بھی حاصل کرسکتا ہے۔ مختلف قوموں کے تمدن و تہذیب سے آشنا بھی ہوسکتا ہے۔ ان میں باہم ارتباط و علائق پیدا ہوسکتے ہیں۔ اشاعت مذہب و تبلیغ حق و معروف کا فرض بھی انجام دے سکتا ہے۔ سب سے آخر میں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام عالم کی اصلاح و ہدایت و انسداد مظالم و فتن و قلع و قمع کفار و مفسدین و اعلان جہاد فی سبیل الحق والعدالۃ کے لیے بھی وہ ایک بین الملی مرکز و مجمع عموم اہل ارض کا حکم رکھتا ہے۔

اُمتِ مسلمہ

لیکن ان تمام چیزوں سے مقدم اور ان تمام ترقیوں کا سنگِ بنیاد ایک خاص امت مسلمہ اور حزب اللہ کا پیدا کرنا اور اس کا استحکام و نشو و نما تھا۔

حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے حج کا مقصد اوّلین اسی کو قرار دیا تھا:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ (بقرہ: ۱۲۸)

خدایا! ہم کو اپنا فرمانبردار بنا، ہماری اولاد میں سے اپنی ایک امت مسلمہ پیدا کر اور ہمیں عبادت کے سچے طور طریقے بتلادے اور اگر ہم سے اس فرمانبرداری میں کوئی لغزش ہو تو اس کو معاف فرما۔ تو بڑا مہربان اور معاف کرنیوالا ہے۔

لیکن جس قالب میں قومیت کا ڈھانچا تیار ہوتا ہے اس میں دو قوتیں نہایت شدت اور وسعت کے ساتھ عمل کرتی ہیں، آب و ہوا اور مذہب۔

آب و ہوا اور مذہب

آب و ہوا اور جغرافیائی حدود طبیعیہ اگرچہ قومیت کے تمام اجزا کو نہایت وسعت کے ساتھ احاطہ کرلیتے ہیں، لیکن ان کے حلقۂ اثر میں کوئی دوسری قوم نہیں داخل ہوسکتی۔ یورپ اور ہندوستان کی قدیم قومیت نے صرف ایک محدود حصۂ دنیا میں نشو و نما پائی ہے اور آب و ہوا کے اثر نے ان کو دنیا کی تمام قوموں سے بالکل الگ تھلگ کردیا ہے لیکن مذہب کا حلقۂ اثر نہایت وسیع ہوتا ہے۔ وہ ایک محدود قطعۂ زمین میں اپنا عمل نہیں کرتا، بلکہ دنیا کے ہر حصے کو اپنی آغوش میں جگہ دیتا ہے۔ کرۂ آب و ہوا کا طوفان خیز تصادم اپنے ساحل پر کسی غیر قوم کو آنے نہیں دیتا، مگر مذہب کا ابرِ کرم اپنے سایے میں تمام دنیا کو لے لیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس عظیم الشان قوم کا خاکہ تیار کررہے تھے، اس کا مایۂ خمیر صرف مذہب تھا اور اس کی رُوحانی ترکیب، عنصر آب و ہوا کی آمیزش سے بالکل بے نیاز تھی۔ جماعت قائم ہوکر اگرچہ ایک محسوس مادّی شکل میں نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت اس کا نظام

ترکیبی بالکل روحانی طریقے پر مرتب ہوتا ہے، جسے صرف جذبات و خیالات، بلکہ عام معنوں میں صرف قوا سے دماغیہ کا اتحاد و اشتراک ترتیب دیتا ہے۔

رابطۂ اتحاد کا سررشتہ اس بنا پر اس قوم کے پیدا ہونے سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مذہبی رابطۂ اتحاد کا سررشتہ مستحکم کیا،

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَـكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ (بقرہ ۱۳۱، ۱۳۲)

جب ابراہیم سے اس کے خدا نے کہا کہ صرف ہماری ہی فرمانبرداری کرو، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں پروردگار عالم کی فرمانبرداری قبول کرتا ہوں۔ پھر اسی طریقۂ اسلامی کی انھوں نے اور یعقوب نے اپنی نسل کو وصیت کی اور کہا کہ خدا نے تمہارے لیے ایک نہایت برگزیدہ دین منتخب کر دیا ہے۔ تم اس پر عمر بھر قائم رہنا اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔

نشأۃ اولیٰ لیکن جماعت عموماً اپنے مجموعۂ عقاید کو مجسم طور پر دنیا کی فضائے بسیط میں دیکھنا چاہتی ہے اور اس کے ذریعے سے اپنی قومیت کا قدیم عہد مودت تازہ کرتی ہے، اس لیے انھوں نے اس جدید النشأۃ قومیت کے ظہور و تکمیل کے لیے ایک نہایت مقدس اور وسیع آشیانہ تیار کیا،

اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ (بقرہ: ۱۲۷)

جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خانۂ کعبہ کی بنیاد ڈال رہے تھے تو یہ دعا ان کی زبانوں پر تھی، خدایا ہماری اس خدمت کو قبول کرلے۔ تو دعاؤں کا سننے والا اور نیتوں کا جاننے والا ہے!

یہ صرف اینٹ پتھر کا گھر نہ تھا بلکہ ایک روحانی جماعت کے قالب کا آب و گل تھا، اس لیے جب وہ تیار ہوگیا تو انھوں نے اس جماعت کے پیدا ہونے کی دعا کی؛ ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لك۔
اب یہ قوم پیدا ہوگئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آخری وصیت کے ذریعے سے اس روحانی سررشتۂ حیات کو اس کے حوالے کر دیا،

وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَـكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ (بقرہ: ۱۳۲)

اور ابراہیم اور یعقوب دونوں نے اس روحانی طریقۂ نشو ونما کی اپنے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ خدا نے تمہارے لیے ایک برگزیدہ دین منتخب فرما دیا ہے۔ تم اسی پر قائم رہنا۔

اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ

اور پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے چہرے پر

مِنْ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (بقرہ: ۱۳۲)

موت آکھڑی ہوئی اور اس آخری وقت میں انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: میرے بعد کس کی پوجا کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تیرے مقدس باپ ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کے خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور ہم اسی کے فرمانبردار بندے ہیں۔

آثارِ قائمہ و ثابتہ

اگرچہ یہ جماعت دنیا میں موجود نہ تھی اور اس کے آثارِ صالحہ کو زمانے نے بے اثر کر دیا تھا،

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ۔ (بقرہ: ۱۴۱)

وہ قوم گزر گئی، اس نے جو کام کیے اس کے نتائج اس کیلیے تھے اور تم جو کچھ کرو گے اس کے نتائج تمھارے لیے ہوں گے۔

لیکن اس کی تربیت اور نشو و نما کا عہدِ قدیم اب تک دست بُردِ زمانہ سے بچا ہوا تھا اور اپنی آغوش میں مقدس یادگاروں کا ایک وسیع ذخیرہ رکھتا تھا۔ اس کے اندر اب تک آبِ زمزم لہریں لے رہا تھا، صفا و مروہ کی چوٹیوں کی گردنیں اب تک بلند تھیں، مذبحِ اسمٰعیل اب تک مذہب کے گرم خون سے رنگین تھا، حجرِ اسود اب تک بوسہ گاہِ خلق تھا، مشاعرِ ابراہیم اب تک قائم تھے۔ عرفات کے حدود میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ غرض اس کے اندر خدا کے سوا سب کچھ تھا اور صرف اسی کے جمالِ جہاں آرا کی کمی تھی۔

ابراہیمی دُعا کا آخری نتیجہ

اس لیے اس کی تجدید و نفخِ رُوح کے لیے ایک مدت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا سب سے آخری نتیجہ ظاہر ہُوا۔ انھوں نے کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھتے ہوئے دعا کی تھی،

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (بقرہ: ۱۲۹)

خدایا ان کے درمیان انھی لوگوں میں سے ایک پیغمبر بھیج کہ وہ ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کر دے۔ بلاشبہ تو بڑا صاحبِ اختیار اور صاحبِ حکمت ہے۔

چنانچہ اس کا ظہور وجودِ مقدس حضرت رحمۃ للعلمین وختم المرسلین علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی صورت میں ہوا، جو ٹھیک ٹھیک اس دعا کا پیکر و مثل تھا،

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (جمعہ: ۲)

وہ خدا جس نے ایک غیر متمدن قوم میں سے اپنا ایک رسول پیدا کیا جو اللہ کی آیات سُناتا ہے۔ اس کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

رسول اللہ صلعم کا ظہور

پس انھوں نے جو قوم پیدا کر دی تھی، اس کے اندر سے ایک پیغمبر اٹھا۔ اس نے اس گھر میں سب سے پہلے خدا کو ڈھونڈنا شروع کیا، لیکن وہ اینٹ پتھر کے ڈھیر میں بالکل چھپ گیا تھا۔ فتح مکہ نے اس انبار کو ہٹا دیا تو خدا کے نور سے قندیل حرم پھر روشن ہو گئی۔ وہ قوم جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی، اس پیغمبر کے فیض صحبت سے بالکل مزکٰی و تربیت یافتہ ہو گئی تھی۔ اب ایک مرکز پر جمع کر کے اس کے مذہبی جذبات کو صرف جلا دینا باقی تھا چنانچہ اسے خانہ کعبہ کے اندر لا کر کھڑا کر دیا گیا اور اس کی مقدس قدیم مذہبی یادگاروں کی تجدید و احیاء سے اس کے مذہبی جذبات کو پختہ و مستحکم بنا دیا۔ کبھی ان سے کہا،

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ (بقرہ: ۱۵۸)

صفا و مروہ خدا کی قائم کی ہوئی یادگاریں ہیں۔ پس جو لوگ حج یا عمرہ کرتے ہیں ان پر ان دونوں کے درمیان طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

کبھی ان کو مشعر حرام کی یاد دلائی گئی،

فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ (بقرہ: ۱۹۸)

جب عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے نزدیک خدا کی یاد کرو۔

خانہ کعبہ خود دنیا کی سب سے قدیم یادگار تھی، لیکن اس کی ایک ایک یادگار کو نمایاں تر کیا گیا،

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ (آل عمران: ۹۷)

اس میں بہت سی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں منجملہ ان کے ایک نشانی حضرت ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔

لیکن جو لوگ خدا کی راہ میں ثابت قدم رہے، ان کے نقش پا سجدہ گاہ خلق ہونے کے مستحق تھے۔ اس لیے حکم دیا گیا،

وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ (البقرۃ: ۱۲۵)

اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو اپنا مصلیٰ بناؤ۔

روحانی یادگاریں

مادی یادگاروں کی زیارت صرف سیر و تفریح کے لیے کی جاتی ہے، لیکن روحانی یادگاروں سے صرف دل کی آنکھیں ہی بصیرت حاصل کر سکتی ہیں۔ اس لیے ان کے ادب و احترام کو اتقاء و تبصرہ کی دلیل قرار دیا گیا،

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ ۔ (حج: ۳۲)

اور جو لوگ خدا کی قائم کی ہوئی یادگاروں کی تعظیم کرتے ہیں تو یہ تعظیم ان کے دلوں کی پرہیزگاری پر دلالت کرتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مقدس یادگاروں کے روحانی اثر و نفوذ کو دلوں میں جذب کرا دینا چاہتے تھے۔ اس لیے خاص طور پر لوگوں کو ان کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے،

هٰذِہٖ مشاعرابیکم ابراهیم۔

خوب غور سے دیکھو اور بصیرت حاصل کرو کیونکہ تمہارے باپ ابراہیم کی یادگاریں ہیں۔

اتمام نعمت جب اسلام نے اس جدید النشاۃ قوم کے وجود کی تکمیل کر دی اور خانہ کعبہ کی ان مقدس یادگاروں کی رُوحانیت نے اس کی قومیت کا شیرازہ مستحکم کر دیا تو پھر ملت ابراہیمی کی فراموش کردہ روش دکھا دی گئی:

فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (آل عمران: ۹۵)

پس ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو جو صرف ایک خدا کے ہو رہے تھے اور یقیناً ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔

اب تمام عرب نے ایک خط مستقیم کو اپنا مرکز بنا لیا اور قدیم خطوط حرف غلط کی طرح مٹا دیے گئے جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس کے بعد خدا نے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا سب سے بڑا احسان پُورا ہو گیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (مائدہ: ۳)

آج میں نے تمہارے اس دین کو کامل کر دیا جس نے تم کو ایک قومیت کے رشتے میں منسلک کر دیا ہے اور اپنے تمام احسانات تم پر پُورے کر دیے اور تمہارے لیے صرف ایک دین اسلام ہی کو منتخب کیا۔

باب ۸۶

عید اور تکمیلِ شریعت

اَلیَومَ اَکملتُ لکُمْ دِینَکُم وَ اَتممتُ علیکُم نعمَتِی وَرَضِیتُ لکُمُ الاسلامَ دِینًا

تمہید آگ کا شرارہ کوہ آتش فشاں کے دامن میں چھپا رہتا ہے لیکن جب پھوٹتا ہے تو تمام دنیا کو محیط ہو جاتا ہے۔ نمو کی قوت ذراتِ خاک میں مخفی رہتی ہے لیکن جب فصل بہار آتی ہے تو اس میں اس قدر اُبال آجاتا ہے کہ اس پر زمین کی فضائے بسیط تنگ ہو جاتی ہے۔ پانی کا سیال مادہ بادل کے ایک ٹکڑے میں سمٹا ہوا پڑا رہتا ہے لیکن جب برستا ہے تو پھیل کر خشکی و تری کو باہم ملا دیتا ہے۔ برق کی رو دنیا کے ہر ذرے میں موجود ہے، لیکن جب اس میں تموج رُونما ہوتا ہے تو کارخانۂ قدرت کے ایک ایک پُرزے میں دفعتہً حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ موج دریا ہی میں پنہاں ہے لیکن جب اٹھتی ہے اور اٹھ کر بلند ہوتی ہے تو دریا میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔

اسلام اسلام بھی اسی قسم کا ایک شرارہ، اسی طرح کی ایک طاقت نمو، اسی فیاضی کے ساتھ بہنے والا ایک چشمۂ آبِ حیات، اسی قوت کے ساتھ حرکت پیدا کرنے والی بجلی کی ایک رو اور اسی سرعت کے ساتھ پھیلنے والی ایک موجِ ہدایت تھی، جس نے اڑ کر خرمنِ جہل و ضلالت میں آگ لگا دی۔ جس نے پھول پھل کر شورزار دنیا کو تختۂ گل و یاسمن بنا دیا۔ جس نے برس کر پوری دنیا کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ جس نے چل کر دنیا کے سکون کو حرکت سے بدل دیا اور جس نے اٹھ کر کفر و فسادِ فی الارض کے بحرِ ظلمت خیز میں ایک عظیم الشان تلاطم برپا کر دیا۔

غیر محدود وسعت کے تقاضے یہ شرارہ، یہ نمو، یہ برق، یہ موج غارِ حرا میں دبی ہوئی تھی۔ ایک مبارک رات میں اس کا ظہور ہوا، لیکن اس کے لیے ایک فضائے غیر متناہی، ایک وسعتِ غیر محدود، ایک کرۂ غیر معمورہ درکار تھا۔ انھوں نے پھیلنا چاہا لیکن کفرزارِ مکّہ کی زمین گھبرا کر پکار اٹھی:

آہستہ خرام، بلکہ مخرام

اب اسلام دنیا کے دوسرے حصوں کی طرف بڑھا کیونکہ سکڑنا اس کی فطرت کے خلاف تھا اور فطرت کی خلاف ورزی عتابِ الٰہی کا مقدمہ ہے۔

اِنَّ الَّذِینَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ ؕ قَالُوْا کُنَّا	جو لوگ (دشمنوں کے ساتھ رہ کر) اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہے ہیں ان کی رُوح قبض کرنے کے بعد فرشتے ان سے پوچھیں گے، تم کس حال میں تھے

مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۙ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

(النساء، ۹۷-۱۰۰)

(یعنی دین کے اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا) وہ جواب میں کہیں گے ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں دبے ہوئے اور بے بس تھے (یعنی بے بسی کی وجہ سے اپنے اعتقاد و عمل کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکے) اس پر فرشتے کہیں گے (اگر تم اپنے ملک میں بے بس تھے تو) کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟ غرض یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہوا اور جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا تو کیا ہی بُری جگہ ہے مگر ہاں جو مرد اور عورتیں اور بچے ایسے مجبور اور بے بس ہوں کہ کوئی چارۂ کار نہ رکھتے ہوں اور ہجرت کی کوئی راہ نہ پاتے ہوں تو امید ہے اللہ ان کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے انھیں معاف کر دے اور وہ معاف کر دینے والا اور بخشش دینے والا ہے اور (دیکھو) جو کوئی اللہ کی راہ میں (اپنا گھر بار چھوڑ کر) ہجرت کرے گا تو اسے خدا کی زمین میں بہت سی اقامت گاہیں ملیں گی اور (ہر طرح کی) کشایش پائے گا اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلے پھر (راہ ہی میں) موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے حضور ثابت ہو گیا (اور وہ اپنی نیت کے مطابق کوشش کا اجر ضرور پائے گا) اور اللہ تو (ہر حال میں) بخشنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے۔[1]

جو شخص خدا کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں وسعت اور فلاح و نجات پائے گا اور جو شخص اپنے گھر سے نکل کر خدا اور خدا کے رسول کی طرف ہجرت کرے اور راستے ہی میں اسے موت آجائے تو یقین کرو کہ اس کا بدلہ خدا پر واجب ہو چکا اور خدا بڑا غفور اور رحیم ہے۔

مزید پھیلاؤ

اسلام دنیا میں پھیلا اور حبش و مدینہ کی آبادیوں نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ بدر و حنین نے اس کے لیے اپنا دامن خالی کر دیا۔ بنو قریظہ و بنو نضیر کے سرسبز باغوں نے اس کے لیے اپنی جگہ سنواری۔ خیبر کے نخلستانوں نے اس کو اپنے سایے میں بٹھایا۔ بایں ہمہ وہ ابھی پھیلنے کے لیے اور گنجایش ڈھونڈتا تھا اور بڑھنے کے لیے اور وسعت چاہتا تھا۔

قصرِ شریعت کی آخری اینٹ

قصرِ شریعت کی آخری اینٹ نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا جس کی وجہ سے دینِ الٰہی

[1] ان آیات کا ترجمہ مکمل نہ تھا، ہم نے "ترجمان القرآن" جلد اول سے پورا ترجمہ نقل کر دیا اور جو ترجمہ "الہلال" میں کیا گیا تھا اسے حذف کر دیا۔

کی عظیم الشان عمارت تمام دنیا کو بدنما نظر آتی تھی:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انّ مَثَلی و مَثَل الانبیاء من قبلی کَمَثَلِ رَجُلٍ بنیٰ بیتًا فاحسنه و اجمله الاموضعَ لَبِنَةٍ من زاویةٍ فَجَعَلَ النّاس یَطُوفُوْنَ بہٖ و یَعْجَبُوْنَ لَهٗ و یقولونَ هلاّ وُضِعت هٰذه اللَّبِنَةُ قال فانا اللَّبِنَةُ وَ اَنَا خَاتِمُ النَّبِیّن۔

(بخاری کتاب المناقب باب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری اور پچھلے نبیوں کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جس نے ایک نہایت خوشنما مکان بنایا لیکن اس کے کسی کونے میں صرف ایک اینٹ کی کسر رہ گئی پھر لوگوں نے گھوم پھر کر دیکھا اور بہت خوش ہوئے تاہم ان کو یہ کہنا پڑا کہ آخر یہ اینٹ کیوں نہ لگائی گئی؟ تو یقین کرو کہ وہ آخری اینٹ میں ہوں اور اسی لیے میں خاتم الانبیا ہوں۔

شریعت اسلامیہ نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا لیکن تمام دنیا کو دکھا دینا ابھی باقی تھا۔ خدا نے حجۃ الوداع میں اس عمارت کو اپنی مکمل صورت کے اندر دکھا دیا اور تمام دنیا نے خانہ کعبہ کا طواف کر کے دیکھ لیا کہ اب ایک اینٹ کی جگہ بھی خالی نہ رہی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (مائدہ: ۴)

آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنے احسانات پورے کر دیے اور تمہارے لیے دین اسلام کو منتخب کیا۔

داخلی و خارجی اجزا

قرآن حکیم کے بطون و ارواح کی طرح وہ ظروف و مواقع بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے، جن میں اس کی مقدس سورتوں اور آیتوں کا نزول ہوا ہے۔ دیوار کے لیے اینٹ اور گارا لیے ضروری اجزا ہیں، مگر ان سے اس سفیدی کی دل آویزی میں کچھ فرق نہیں آسکتا جو اگرچہ دیوار کی سطح پر ہے۔ لیکن مکان کے اور اجزا اُسے گزرنے والوں کو کہیں زیادہ اپنی طرف مائل کر رہی ہے۔

دینِ الٰہی بھی ایک عمارت ہے جس کی تعمیر ازل سے شروع ہوئی اور ختم نبوت کی آخری اینٹ نے اسے مکمل کر دیا۔ اس لیے وہ بھی اور عمارتوں کی طرح داخلی و خارجی اجزا سے مرکب ہے۔ پہلی قسم کے اجزا سے اس کی تقویم و ترکیب ہوتی ہے اور دوسری قسم کے اجزا نے اس کے آب و رنگ اور اس کی زینت و رونق کو نمایاں کیا ہے۔

تحویل کعبہ کی آرزو

اسلام نے کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ اس کے اجزا پورے نہیں کیے جاتے۔ اس لیے ہمیشہ ان کے اظہار کا دعویٰ کیا۔ مکہ میں صرف دو رکعت نماز فرض کی گئی تھی اور آنحضرت صلعم اور صحابہ بالکل اسی پر قانع تھے، البتہ آرزو اس کی تھی کہ آزادی کے ساتھ اس مختصر عبادت کے ادا کرنے کا موقع ملے۔ آنحضرت صلعم نے نزول فرائض کا کبھی انتظار نہیں کیا لیکن تبدیل قبلہ کے لیے نہایت اضطراب کے ساتھ

وحیِ آسمانی کی راہ دیکھتے رہے۔

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ۔ ہم دیکھ رہے ہیں (اے پیغمبر) کہ حکمِ الٰہی کے شوقِ طلب میں تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ اٹھ جاتا ہے۔ (البقرہ: ۱۴۴)

کیونکہ قبلہ ہی دینِ اسلام کی قوت و نفوذ کا مرکزِ اوّلین و مظہرِ آخرین تھا۔ اس لیے متمم و مکمل دعوتِ ابراہیمی اس کا بیقراری کے ساتھ انتظار کرتے تھے (صلی اللہ علیہ وسلم)

ظہورِ کامل

اصل حقیقت کے لحاظ سے اسلام تمام مذاہبِ عالم کا آب و رنگ تھا۔ مذاہب کے تمام اجزائے بسیط پہلے ہی سے موجود تھے۔ اسلام نے صرف ان کو جلا دے کر نمایاں کر دیا تھا۔ آئینے کا خاکہ پہلے ہی سے تیار تھا۔ اسلام اس کا جوہر بن گیا۔ وہ چہرۂ کائنات کا غازہ تھا جس نے حسنِ حقیقت کو اور دلفریب بنا دیا۔ وہ آب و رنگ تھا، صیقل تھا، جلا تھا، غازہ تھا، ان میں سے ہر چیز نمایاں ہونے والی ہے، اس لیے وہ نمایاں ہونا چاہتا تھا۔

اسلام کا قلبِ حقیقت مکہ ہی میں متشکل ہو چکا تھا۔ مدینہ میں آکر اس کے اجزا بھی مکمل ہو گئے لیکن وہ ایک حسنِ بے پردہ تھا جو دنیا کے سامنے بے نقاب ہونا چاہتا تھا۔ حجۃ الوداع نے اس کے چہرے سے یہ نقاب بھی اُلٹ دی اور تمام دنیا کو اس کا روشن چہرہ نظر آگیا۔

چنانچہ عرفات کے میدان میں اسلام کی حقیقت کے اسی ظہورِ کامل کا اعلان کیا گیا: الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

اسلام کا مقصد

لیکن وہ دنیا کے سامنے صرف ظاہر ہونا اور چہرہ دکھا کر گزر جانا نہیں چاہتا تھا اگر وہ اتنے ہی پر راضی ہوتا تو کب کا راضی ہو گیا ہوتا۔ آنحضرت (صلعم) نے ایامِ مظلومی ہی میں تمام قبائل کے سامنے اسلام کو پیش کر دیا تھا اور تمام جزیرۂ عرب اس سے روشناس ہو چکا تھا مگر وہ غلبۂ کاملہ، تسلّطِ عام اور ظہورِ تام چاہتا تھا یعنی وہ ایک عظیم الشان خلافتِ الٰہی کی بنیاد ڈالنا چاہتا تھا جو میزانِ عدل کو قائم رکھے۔ شعائرِ الٰہیہ کی حفاظت کرے، دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام سنائے، مساواتِ عامہ کی تعلیم دے، پرانے حقد و حسد کو مٹا کر نئے سرے سے الفت و محبت کی بنیاد ڈالے۔ اسلام کے تازہ خون کا قصاص لے، جاہلیت کے دم خشک کو اپنے تلووں سے مسل دے۔ دنیا کو معاملات و مناقضات کا صحیح اصول بتائے۔ وہ حکومت چاہتا تھا جو انسان کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق اور معاملات پر محیط ہو جائے۔ اس عمارت کی بنیاد اگرچہ مکہ ہی میں پڑ چکی تھی لیکن اس کا افتتاح حجۃ الوداع میں ہوا۔ اس لیے تکمیلِ دین کا اعلان بھی اسی زمانے میں کیا گیا۔

خدا کا دین پہلے ہی سے کامل تھا لیکن اب تک وہ مسلمانوں کے نفوذ و قوت کے شایانِ شان نہ تھا۔ آج خدا نے اسے مسلمانوں کے شایانِ شان بنا کر اس پر اپنی پسندیدگی اور رضائے تام کی مہر لگا دی: وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

صالح قوم اور حکومت

دنیا کا کوئی داعی مذہب، دنیا کی کوئی صالح قوم، دنیا کا کوئی اولوالعزم پیغمبر، اپنے مقاصد میں سلطنت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا چنانچہ دنیا میں جب کوئی صالح قوم پیدا ہوئی ہے، اس نے نیکی پھیلانے اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی الٰہی خدمت انجام دینے کی ذمہ داری اٹھائی ہے تو خدا نے اسے ہمیشہ صاحب تاج و تخت بنایا ہے اور جب تک اس کے سر پر حکومت کا تاج نہیں رکھا گیا، اس کا دین خدا کی آخری مرضی کے مطابق نہیں ہوا چنانچہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (نور: ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح اختیار کیا تو خدا نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ ان کو زمین کی خلافت بخشے گا جیسا کہ اس نے گزشتہ لوگوں کو ان کے عمل صالح کی وجہ سے بخشی۔ نیز خدا نے ان کے لیے جو دین پسند فرمایا ہے اسے مستحکم کر دے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا تاکہ اس کی عبادت کریں، کسی چیز کو اس کا شریک نہ بنائیں اور جو لوگ اس کے بعد کافر ہو سے سو وہ یقیناً ملزم و ملزم ہیں۔

تکمیل کی تفصیل

اللہ تعالیٰ کی اسی سنت جاریہ کے مطابق مکہ میں ایک قوم ایمان لائی اور اس نے عمل صالح اختیار کیا اس لیے خدا نے اسے زمین کا خلیفہ بنایا۔ خدا نے اس کے لیے جس دین کو منتخب فرمایا تھا، اب تک وہ اس کے وعدے کے مطابق مستحکم نہیں ہوا تھا۔ فتح مکہ نے اسے مستحکم کر دیا۔ مدینہ میں رہ کر آنحضرت صلعم نے تمام عرب کی مشرکانہ قوت توڑ دی تھی۔ صرف اہل مکہ اپنی اصلی حالت پر قائم تھے۔ اگر اسلام کو کچھ خوف تھا تو اسی مرکزی طاقت کا تھا۔ فتح مکہ نے اس طاقت کو بھی پامال کر دیا۔ اب خوف مبدل بہ امن و امان ہو گیا۔ اس امن و امان کا مقصد جیسا کہ خود خدا نے بیان فرما دیا، یہ تھا کہ خدا کی پرستش کی جائے، تمام انسانی پرستشوں اور معبودانہ اقتداروں کا خاتمہ کر دیا جائے اور خدا کے بندے صرف خدا ہی کے لیے ہو جائیں۔ فتح مکہ میں تین سو ساٹھ بت "جاء الحق و زهق الباطل" کی غلغلہ انگیز صداؤں کے ساتھ توڑ دیئے گئے اور توحید الٰہی کے لیے میدان صاف ہو گیا حجۃ الوداع میں پہلے ہی سے منادی کرا دی گئی تھی کہ کوئی مشرک خانہ کعبہ کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ دین الٰہی کی یہی تکمیل تھی، یہی غلبۂ عام تھا، یہی ظہور تام تھا، یہی حقیقی امن و امان تھا جو اس عہد سے شروع ہو گیا اور اسی کا خدا نے وعدہ فرمایا تھا،

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ (توبہ: ۳۳) خدا اسلام کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کر دے گا۔

جب یہ وعدہ پورا ہوا تو امت کو یہ بشارت عظمیٰ سنائی گئی، الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

عید کا جشن عام

یہ آیت کریمہ وعظیمہ جمعہ کے دن خاص عرفات کے میدان میں نازل ہوئی اور ایک ایسا عطیہ الٰہی سمجھی گئی کہ ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بہ حسرت کہا، اگر ایسی آیت ہمارے مذہب میں نازل ہوتی تو ہم اس کے نزول کی یادگار میں عید مناتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، ہم کو اس یادگار کے قائم کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ آیت اسی دن نازل ہوئی جب کہ خدا کے مخلص بندے عرفات کے میدان میں اس کے سامنے کھڑے تھے۔ پس ہمیشہ کے لیے یہ دن ہمارے واسطے عید کا جشن عام ہو گیا اور خدا کی یہی مرضی تھی۔

عید کی حقیقت

اسی بشارت عظمیٰ نے عید کی حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا۔ وہ محض سیر و تفریح، عیش و نشاط، لہو و لعب کا ذریعہ نہیں۔ وہ تکمیل شریعت کا ایک مرکز ہے، وہ سطوت خلافت الٰہی کا ایک مظہر ہے۔ وہ توحید و وحدانیت کا منبع ہے، وہ خالص نیتوں اور پاک دلوں کی نمائش گاہ ہے۔

اس کے ذریعے سے ہر قوم کے مذہبی جذبات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی حالت میں قائم ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ مذہب اپنی پوری قوت کے ساتھ زندہ ہے۔ اگر وہ مٹ گئی ہے یا بدعات و مزخرفات نے اس کے اصلی مقاصد کو چھپا دیا ہے، تو یقین کر لینا چاہیے کہ اس میں مذہب کا چراغ بجھ رہا ہے۔

لہو و غلبہ کا تماشا

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جس دن سے قوت کی نشو و نما کا آغاز ہوا اسی دن سے عید کو اس کے اظہار کا ذریعہ بنایا گیا۔ مدینہ میں صرف عید الفطر کے ذریعے سے دنیا کو اسلام کی وسعت اثر کا ایک منظر دکھایا جا سکتا تھا لیکن وہ صرف اتنے ہی پر قانع نہ تھا، وہ تمام دنیا کے لیے ایک چشمۂ رحمت تھا جو ابلنا چاہتا تھا۔ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

وہ عرفات کے میدان میں ابلا اور اپنی پھیلنے والی موجوں کی چادر میں اس نے پوری دنیا کو چھپا لیا، اس لیے دنیا نے اسلام کے جاہ و جلال، ظہور و غلبہ اور نفوذ و وسعت کا تماشا دیکھ لیا۔

عید کے مظاہر

پس عید اگر شعائر اسلام کو قائم رکھتی ہے، مذہبی روح کو زندہ کرتی ہے، مذہب کے کارنامۂ اعمال کو دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے، عہد محبت و میثاق الٰہی کی تجدید کرتی ہے، تمام امت کو ایک نظام میں مربوط کر دیتی ہے، مختلف ممالک کے مسلمانوں کے درمیان سفارت کا کام دیتی ہے تو بلاشبہ وہ عید ہے، حج ہے، ملوات ہے، ورنہ وہ صرف کھجور کی ایک گٹھلی ہے جس کو ایک سنت کے احیا کے لیے ہم کھا کر پھینک دیتے ہیں۔

آفتاب نبوت کا غروب

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ اسلام کی اس سب سے عظیم الشان عید کے ساتھ اس کی دعوت اولیٰ کی زندگی کا دور ختم ہو گیا اور خود یہ آیت جس نے مذہب کی تکمیل کا اعلان کیا تھا اُس کا مقدمہ و تمہید تھی چنانچہ اس کے نزول پر اگرچہ اکثر صحابہ کو نہایت مسرت حاصل ہوئی، لیکن جو لوگ اس حقیقت کو جانتے تھے کہ داعی حق کی زندگی کا سب سے آخری مقصد دین کی تکمیل اور اس کا عرض عام و ظہور تام تھا، ان کی

آنکھیں تکمیل کے بعد کے نتیجے کو دیکھ کر اشکبار ہو گئیں۔ یہ مقصد حقیقی حجۃ الوداع میں حاصل ہو گیا تھا اس کے ایک ہی سال[1] بعد آفتاب نبوت رحمت الٰہی کی آغوش میں غروب ہو گیا۔ اللھمّ صلّ و سلّم علیٰ سیّدنا محمّد و علیٰ آل سیدنا محمد کما صلیت و سلّمت علیٰ سیّدنا ابراھیم و علیٰ آل سیّدنا ابراھیم انّکَ حمید مجید[2]

---

[1] ایک ہی سال بعد غالباً اس لیے کہا کہ حجۃ الوداع سنہ ۱۰ھ میں ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ربیع الاول سنہ ۱۱ھ میں ہوئی ورنہ حقیقۃً سانحۂ وفات حجۃ الوداع کے بعد چند روز کم تین مہینے میں پیش آیا۔ [2] یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ اسلام کی پہلی عید یعنی عید الفطر نزول قرآن کی عید ہے، کیونکہ قرآن مجید کا نزول رمضان ہی میں شروع ہوا تھا اور دوسری عید یعنی عید الاضحیٰ اکمال دین اور اتمام نعمت کی عید ہے۔ دونوں کا تعلق قرآن اور صرف قرآن سے ہے۔ ایک کا آغاز سے دوسری کا تمام سے۔ غرض دنیا و عقبیٰ کی تمام برکتیں، سعادتیں، ہدایتیں اور کامرانیاں اوّلاً اور آخراً صرف قرآن مجید کے مطابق پُر خلوص عمل پر موقوف ہے۔ اس لیے دونوں عیدوں میں ہر مسلمان کی دلی توجہ بطور خاص صرف قرآن ہی پر جمی رہنی چاہیے۔ دونوں عیدیں قرآن مجید ہی کے دو جشن ہیں۔

وفات

باب ۹

رسول اللہؐ کی وفات

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُم مَّيِّتُونَ۔

—(۱)—

قرب وفات کے آثار رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری کا مقصد تبلیغ اسلام، تزکیۂ نفوس اور تکمیل دین و شریعت تھا۔ یہ مقصد پورا ہو چکا تو اس دنیا سے رحلت کی منزل قریب آجانے کے آثار شروع ہو گئے۔ اس سلسلے میں زیادہ واضح نشان سورۂ نصر کا نزول تھا، جیسا کہ اس سورت کے الفاظ ہی سے ظاہر ہے:

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔	جب اللہ کی مدد اور فتح پہنچ گئی اور تو نے لوگوں کو گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لیا تو اب اپنے پروردگار کی تسبیح حمد کے ساتھ کر اور اس سے گناہ بخشوا۔ بے شک وہ معاف کر دینے والا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے "اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ" کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا:

اجلُ رسول الله صلى الله عليه وسلم اَعْلَمَهٗ اِيَّاهُ[1]	یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہے، جس کا علم اللہ نے آپ کو دیا۔

عبادات اور تسبیح و تہلیل میں پہلے بھی کمی نہ تھی، اب ان میں اور اضافہ ہو گیا۔ ہر سال رمضان میں دس روز اعتکاف آپؐ کا معمول تھا،

فلما كان العام الذى قُبِضَ فيه اعتكف عشرين يومًا[2]	جس سال وفات ہوئی آپ نے بیس روز اعتکاف میں گزارے۔

اسی طرح آپ ہر سال رمضان میں قرآن مجید ایک مرتبہ جبریل علیہ السلام کی زبان سے سنتے تھے، حیات طیبہ کے آخری رمضان میں دو مرتبہ سنا۔

---

[1] کتاب المناقب، باب علامات نبوت فی الاسلام [2] بخاری: کتاب الاعتکاف، باب الاعتکاف فی العشر الاوسط فی رمضان

حجۃ الوداع اور غدیر خم کے خطبے حجۃ الوداع میں جو خطبے ارشاد فرمائے، ان میں بعض ایسے الفاظ ملتے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انداز رخصت و وداع کا تھا، اگرچہ موقع پر مخاطبین کو یہ احساس واضح طور پر نہ ہُوا ہو۔ مثلاً فرمایا:

۱۔ شاید اس حج کے بعد میرے لیے حج کی نوبت نہ آئے۔

۲۔ تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟

حاضرین نے عرض کیا، آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچایا اور فرضِ رسالت ادا کیا۔ اس پر ارشاد ہوا:

" اے خدا گواہ رہیو۔"

خطبہ غدیر خم میں فرمایا:

ایھاالناس انما انا بشر یوشک ان یاتینی رسول ربی فاجیب ......

لوگو! میں بھی بشر ہوں شاید میرے پاس میرے پروردگار کا قاصد آجائے (یعنی ملک الموت) اور اسے قبول کرنا پڑے۔

ان ارشادات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم بقا کے سفر کی ساعت قریب آگئی تھی۔

شہدائے اُحد شہدائے اُحد پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔ وہ مسلمانوں کے لیے نہایت خوفناک مصائب کا دور تھا۔ رحلت سے کچھ دن پہلے ماہ صفر میں آپ اُحد تشریف لے گئے اور شہدائے احد پر اسی طرح نماز پڑھی، جس طرح میت پر پڑھی جاتی ہے۔ ان سے اس طرح رخصت ہُوئے، جس طرح مرنے والا اپنے زندہ عزیزوں سے رخصت ہوتا ہے۔ آخر میں فرمایا: انا بکم للاحقون۔ (اور ہم لوگ تم سے ملنے والے ہیں)

یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں تاکہ اللہ کی بارگاہ میں تمہارے متعلق شہادت دوں۔ خدا کی قسم میں اس وقت حوض کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں۔ مجھے یہ خوف قطعاً نہیں کہ میرے بعد شرک کرو گے لیکن مجھے خوف ہے کہ تم دنیا میں تنافس شروع کر دو گے۔

یعنی دنیا میں مبتلا ہو جاؤ گے اور باہم رزم و پیکار کرنے لگو گے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ہلاک ہو جاؤ، جس طرح تم سے پیشتر دوسری قومیں ہلاک ہوگئیں۔

اہل بقیع کے لیے دُعا رسول اللہ صلعم کے آزاد کیے ہُوئے غلام ابومُوَیہبہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ

وسط شب میں فرمایا: اے ابومُویہبہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اہل بقیع[1] کے لیے استغفار کروں۔ میرے ساتھ چلو۔ آپ روانہ ہوئے اور میں بھی ساتھ ہو گیا۔ آپؐ نے دیر تک اہل بقیع کے لیے دُعا کی۔ پھر فرمایا:

اے ابومُویہبہ میرے سامنے دنیا بھر کے خزانے، بقائے دوام اور آخر میں جنت پیش کی گئی دوسری طرف پروردگار کی ملاقات اور جنت رکھی گئی۔ اختیار دے دیا گیا کہ دونوں میں سے جو چاہوں لے لوں۔ ابومُویہبہ نے کہا، میرے ماں باپ حضورؐ پر فدا ہوں۔ آپ دنیا بھر کے خزانے اور بقائے دوام کے ساتھ جنت لے لیں۔ فرمایا: اے ابُومُویہبہ میں نے لقائے الٰہی اور جنت کو اختیار کر لیا[2]۔

خطبۂ مبارکہ پھر ایک خطبہ ارشاد فرمایا جسے حالتِ صحت میں آپ کا آخری خطبہ سمجھا جاتا ہے۔ فرمایا:

مسلمانو! مرحبا۔ اللہ تمھیں اپنی رحمت کے سایے میں رکھے۔ تمھاری شکستہ دلی دور فرمائے، تمھارا معاون و دستگیر ہو، تمھیں رزق اور برکت دے۔ تمھاری مدد کرے، عزت و رفعت سے سرفراز رکھے۔ امن و عافیت سے شاد کام فرمائے۔ میں تمھیں تقویٰ (خوف خدا اور پرہیزگاری) کی وصیت کرتا ہوں۔ اللہ ہی کو تمھارا وارث بناتا ہوں۔ اسی سے ڈراتا ہوں کیونکہ میں "نذیر مبین" ہوں۔ دیکھنا اللہ کی بستیوں اور اس کے بندوں میں تکبر اور برتری اختیار نہ کرنا۔ اللہ نے مجھے اور تمھیں حکم دیا ہے،

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ۚ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔ (القصص، ۸۳)

یہ آخرت کا گھر ہے۔ یہ ہم ان لوگوں کو دیتے ہیں جو زمین میں تکبر و برتری اور فساد کا ارادہ نہیں کرتے اور آخرت کی کامرانی صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

پھر فرمایا:

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ[3] (الزمر، ۶۰)

کیا متکبروں اور مغروروں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں۔

آخر میں ارشاد ہوا:

تم سب پر سلام اور ان سب پر سلام جو اسلام کے ذریعے سے میری بیعت میں داخل ہوں گے۔

آغاز علالت سے ایک روز پیشتر حضور صلعم نے اسامہؓ بن زید کو سالار بنا کر رومیوں کے خلاف فوج بھیجنے کا انتظام فرمایا۔ یہ جنگ موتہ میں زیدؓ اور دوسرے شہدا کے انتقام کی مہم تھی۔

---

[1] بقیع مدینہ منورہ کا مشہور قبرستان ہے جو شہر کے مشرقی جانب فصیل کے نزدیک ہے۔ [2] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۰۴

[3] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۵۶۔

آغازِ علالت علالت کا آغاز ۱۸۔ یا ۱۹۔ صفر کو بروز چہارشنبہ ہوا[1] بعض روایتوں کے مطابق حضور صلعم دوشنبہ کو بیمار ہوئے اور بعض میں پنجشنبہ یعنی جمعرات مذکور ہے۔ اسی طرح مدتِ علالت میں بھی اختلاف کی روایتیں ملتی ہیں۔ اس اختلاف کا سبب بظاہر یہ ہے کہ نفس ناسازگاری مزاج کا علم صرف انہی لوگوں کو ہوگا جو زیادہ قریب رہتے تھے۔ اکثر کو علم ہی نہ ہوگا۔ جب مرض نے ذرا شدت اختیار کی تو سب کو معلوم ہوگیا کہ حضور صلعم بیمار ہیں۔ روایات میں ہر فرد نے اپنے علم کے آغاز سے تاریخ اور دن کا تعین کر لیا۔ اس وجہ سے اختلاف کو تعجب انگیز نہ سمجھنا چاہیے۔ روایات سب کی سب جمع ہوگئیں۔ ابتدائی راویوں کی یہ انتہائی دیانت و راستبازی ہے کہ انھوں نے وہی کہا جو ان کے علم میں آیا۔ تاہم پورا ذخیرۂ روایات سامنے رکھ کر صحیح واقعات کے اندازے میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مرض اس روز شروع ہوا، جب ازواج مطہرات میں سے حضرت میمونہؓ کے ہاں قیام کی باری تھی مرض تدریجاً بڑھتا گیا، ضعف و نقاہت میں اضافہ ہوتا گیا مگر آپ ادائے نماز کے لیے مسجد میں جاتے اور امامت فرماتے رہے نیز ازواج مطہراتؓ کے ہاں باری باری قیام کے معمول میں فرق نہ آیا۔ یہاں تک کہ دوشنبہ یعنی ۲۴۔ یا ۲۵۔ صفر تک ضعف اتنا بڑھ گیا اور بیماری نے ایسا غلبہ پا لیا کہ سہارے کے بغیر چند قدم بھی چلنا ممکن نہ رہا۔

ازواج مطہراتؓ سے اجازت مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں،

> مرض میں شدت ہوئی تو ازواج مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہؓ کے گھر قیام فرمائیں۔ خلق عظیم کی بنا پر اجازت بھی صاف اور علانیہ طلب نہیں کی بلکہ پوچھا، کل کس کے گھر رہوں گا؟ دوسرا دن (دوشنبہ) حضرت عائشہؓ کے ہاں قیام فرمانے کا تھا۔ ازواج مطہراتؓ نے مرضیٔ اقدس سمجھ کر عرض کی کہ آپ جہاں چاہیں قیام فرمائیں[2]

مزید لکھتے ہیں،

> ابن سعد نے بروایت صحیح نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کی طرف سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے اجازت طلب کی[3]

---

[1] بعض حضرات نے آغازِ علالت کی تاریخ ۲۹۔ صفر تحریر کی ہے۔ ان کے نزدیک رسول اللہ کی وفات ۱۲۔ ربیع الاول کو ہوئی۔ اس مسئلے پر بحث آگے آرہی ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ بعض متفق علیہ حقائق کی بنا پر حساب کیا جائے تو تاریخ وفات یکم ربیع الاول ثابت ہوتی ہے جیسا کہ مولانا شبلی مرحوم نے ثابت کیا ہے۔ مدت علالت تیرہ روز فرض کی جائے (جس کی تائید میں زیادہ تر روایتیں ہیں) تو آغاز علالت ۱۸۔ یا ۱۹۔ ہی کو ماننا چاہیے۔ [2] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۱۶۷ [3] سیرۃ النبیؐ حاشیہ ص ۱۶۷۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ درست ہے لیکن یہ بات بھی تو تصور میں نہیں آسکتی کہ ازواج مطہراتؓ کو معاذ اللہ حضور م کی حالت اور تکلیف کا زیادہ سے زیادہ احساس نہ تھا یا ان مقدس ہستیوں میں سے ایک ایک حضور صلعم کی مرضی مبارک کی تکمیل یا حضور صلعم کی تکلیف میں تخفیف کے لیے وہ سب کچھ کرنے پر تیار نہ تھی، جو امکان میں تھا۔ حالات ایسے تھے کہ بظاہر وہ سب بھی محض ایک اشارے کی منتظر تھیں۔

پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ قدرت کی طرف سے ایسے اسباب فراہم ہوتے گئے، جو حضور صلعم کو آخری وقت میں روے زمین کے اس مقدس ترین مقام پر پہنچانے کے موجب بنے، جو روز ازل سے جسد اطہر کی آخری آرامگاہ بننے کے لیے منتخب ہو چکا تھا۔ تمام انبیاے کرام علیہم السلام کی آرامگاہوں میں سے یہی ایک مقدس مقام ہے جس کی نشان دہی بہ یقین و وثوق تعین کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ اس ایک کے سوا ایسے تمام مقامات کا معاملہ صرف ظن و تخمین پر مبنی ہے۔

غرض آپ دوشنبہ کو (۲۴ ماہ صفر) اس حالت میں حضرت عائشہؓ کے گھر پہنچے کہ ایک طرف سے حضرت عباسؓ اور دوسری طرف سے حضرت علیؓ نے سہارا دے رکھا تھا۔ جسم اطہر کا زیادہ بوجھ بظاہر سہارا دینے والوں پر تھا۔ پاے مبارک کھنچتے آرہے تھے۔

کیفیتِ مرض

اس وقت بخار بہت تیز تھا۔ حضرت عمرؓ، ابو سعیدؓ خدری، عبداللہؓ بن مسعود اور دوسرے اصحاب کا بیان ہے کہ کسی کا ہاتھ جسم اطہر پر ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ آپ نے موٹی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے اوپر سے بھی حرارت محسوس ہوتی تھی۔ عبداللہؓ بن مسعود نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! آپؐ کو شدید بخار ہے۔ فرمایا: ہاں مجھے اتنا بخار ہوتا ہے جتنا تمھارے دو آدمیوں کو۔ عرض کیا: یا رسول اللہؐ! آپ کا اجر بھی دوگونہ ہوگا۔ فرمایا:

> اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ روے زمین پر کوئی مسلمان نہیں، جسے مرض یا کسی اور وجہ سے تکلیف پہنچے اور اللہ اس کے گناہ اسی طرح کم نہ کرتا ہو جس طرح (خزاں میں) درختوں کے پتے گرتے اور کم ہوتے ہیں۔[1]

اس حالت کے باوصف آپ نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے رہے۔ چہارشنبہ کو جو آخری نماز آپ نے مسجد میں پڑھائی، وہ مغرب کی تھی۔ اس میں سورۂ "والمرسلات" تلاوت کی۔ قاضی سلیمان مرحوم فرماتے ہیں، اس سورت کی آخری آیت قرآن پاک کی جلالت آشکارا کرتی ہے یعنی:

---

[1] طبقات جلد دوم ص ۲۰۸۔

فبای حدیث بعدہٗ یومنون - قرآن پاک کے بعد اور کس کلام پر ایمان لائیں گے؟
(والمرسلات ، ۵)

رفیق اعلیٰ کی طلب حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم بیمار ہوجاتے تو مختلف دعائیں پڑھتے - ایک دعا یہ تھی جسے پڑھ کر ہاتھ جسم پر پھیر لیتے:

اذھب الباس رب الناس بیدک الشفاء اے انسانوں کے پروردگار تکلیف دُور کردے - شفاء
لا شافی الا انت ، اشف شفاءً لا یغادر صرف تیرے ہاتھ ہے ، تیرے سوا کوئی شفا دینے والا
سقما - نہیں ، ایسی شفا عطا کر کہ کوئی تکلیف باقی نہ رہے -

شدت مرض کے پیش نظر حضرت عائشہ صدیقہؓ یہی دعا پڑھ کر حضور صلعم کے دستہائے مبارک جسم اطہر پر پھیرنے لگیں آپؐ نے ہاتھ چھڑا لیے اور دعا کی : اللھم الاعلیٰ جنت الخلد (خدا اے برتر ! جنت الخلد عطا کرے) ان کے الفاظ میں خفیف سا اختلاف ہے اور حضور صلعم نے جو کچھ فرمایا وہ بھی مختلف روایات میں مختلف ہے لیکن اس سے اصل مقصود میں کوئی فرق نہیں پڑتا جو اوپر کے کلمہ مختصر میں آگیا - مختلف روایتیں ہیں کہ آپ نے فرمایا :

۱- اسئل اللہ الرفیق الاعلیٰ و الاسعد (میں اللہ سے اعلیٰ اور اسعد رفیق کا طلب گار ہوں)

۲- الحقنی بالرفیق ، الحقنی بالرفیق (مجھے رفیق سے ملادے ، مجھے رفیق سے ملادے)

۳- اللھم اغفرلی وارحمنی و الحقنی فی الرفیق الاعلیٰ (اے خدا میری مغفرت فرما ، مجھ پر رحم کر اور مجھے رفیق اعلیٰ سے ملادے) -

ان کلمات سے آشکارا ہے کہ حضور صلعم کے قلب مصفیٰ میں اب رفیق اعلیٰ کی طلب کو تمام امور پر غلبہ و تفوق حاصل ہوچکا تھا -

حضرت ابوبکرؓ کی امامت چہارشنبہ کو عشاء کا وقت ہوا تو دریافت فرمایا ، نماز ہوچکی ؟ عرض کیا گیا کہ سب کو مسجد میں حضورؐ کا انتظار ہے - مولانا شبلی مرحوم لکھتے ہیں :

لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا - پھر اٹھنا چاہا کہ غش آگیا - افاقہ ہوا تو پھر پوچھا ، نماز ہوگئی ؟ وہی پہلا جواب دیا - آپ نے پھر غسل فرمایا اور جب اٹھنا چاہا تو غش آگیا - افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا - لوگوں نے وہی جواب دیا - تیسری دفعہ جسم پر پانی ڈالا - جب اٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غشی طاری ہوگئی - جب افاقہ ہوا تو ارشاد ہوا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں [1] -

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۱۷۳ - جس لگن کا ذکر کیا گیا ہے وہ پتھر کا تھا اور ام المومنین حضرت حفصہؓ اس کی مالکہ تھیں -

حضرت عائشہؓ نے معذرت کی کہ ابوبکرؓ بہت رقیق القلب ہیں۔ ان سے آپ کی جگہ کھڑا نہ ہُوا جائے گا۔ آپ نے پھر بھی یہی حکم دیا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔

یہ بات بالکل صحیح تھی، حضرت ابوبکرؓ واقعی رقیق القلب تھے۔ پھر رسول اللہ صلعم کی ذات گرامی کے ساتھ ابوبکرؓ کی محبت و شیفتگی کی بظاہر کوئی حدونہایت نہ تھی۔ حضرت عائشہؓ ہی نہیں، سب کو یقین تھا کہ ابوبکرؓ کے لیے رسول اللہؐ کی جگہ کھڑا ہونا ناقابلِ برداشت رنج و حزن کا باعث بن جائے گا لیکن حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے معذرت کا ایک پہلو اور بھی تھا، جس کا ذکر حضرت عائشہؓ نے خود بعد میں کیا۔ فرمایا: ابوبکرؓ کی امامت کے معاملے میں رسول اللہ صلعم سے تکرار کی، زیادہ وجہ یہ تھی کہ:

> میرے دل میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ آپ کے بعد لوگ اس شخص سے محبت کریں گے، جو آپ کی جگہ کھڑا ہوگا۔ لوگ اسے منحوس سمجھیں گے۔[1]

جو شخص حضرت ابوبکرؓ کے لیے نماز پڑھانے کا حکم لے کر مسجد میں پہنچا۔ اسے موصوف نظر نہ آئے تو حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ نماز پڑھا دیں۔ حضرت عمرؓ اس بنا پر تیار ہو گئے کہ خود حضور صلعم کا ارشاد ہوگا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے خود حضرت عمرؓ سے کہہ دیا تھا کہ آپ نماز پڑھائیں۔ ان کی آواز بلند تھی۔ رسول اللہؐ نے تکبیر کی آواز سن لی تو فرمایا "نہیں نہیں، ابن ابی قحافہ نماز پڑھائیں۔"

آغاز امامت صدیقؓ

تھوڑا سا اختلاف اس معاملے میں بھی ہے کہ ابوبکرؓ کی امامت کا آغاز چہار شنبہ کا دن گزر جانے کی نمازِ عشا سے ہوا یا پنج شنبہ کا دن گزر جانے کی نماز عشا سے؛ یعنی آپ نے حضور صلعم کی حیات طیبہ میں سترہ نمازیں پڑھائیں یا اکیس؛ اس مسئلے کے متعلق مولانا حکیم عبدالرؤف مرحوم دانا پوری اپنی کتاب "اصح السیر" میں فرماتے ہیں:

> حضورؐ نے سوموار (دوشنبہ) کو فجر کی نماز کے وقت پردہ اٹھا کر دیکھا (یعنی وفات کے روز) حضرت انسؓ کی روایت میں تصریح ہے کہ اس روز تین دن کے بعد حضورؐ کے چہرہ انور پر صحابہؓ کی نظر پڑی تھی کیونکہ جمعرات کی ظہر کی نماز میں حضورؐ شریک ہُوئے تھے۔ جمعہ، سنیچر (ہفتہ) اور اتوار کو حضورؐ باہر نہیں آئے۔
>
> علامہ زرقانی نے دمیاطی سے نقل کیا ہے کہ حضرت صدیقؓ نے سترہ وقت امامت کی، مگر یہ صحیح نہیں۔ صحاح کی روایتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ عشا کے وقت حضورؐ نے حضرت صدیقؓ کو امام بنایا۔ اس کے بعد ظہر کی نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے۔ اس لیے یہ عشا لامحالہ اس سے پہلے یعنی بدھ کا دن گزرنے کے بعد والی عشا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس وقت سے سوموار کی صبح تک (جمعرات کی ظہر کو چھوڑ کر) اکیس وقت کی نمازیں ہوتی ہیں جن کی حضورؐ کی حیات میں صدیقؓ نے امامت کی[1]

سیرۃ النبیؐ کا بیان سیرۃ النبیؐ کا بیان بھی اسی کا مصدق ہے، اگرچہ اس میں ایک مقام پر کہا گیا ہے کہ حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم نے تین روز نماز نہیں پڑھائی اور حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی قائمقامی کی،

اس قائمقامی کا آغاز شب جمعہ کی نماز عشا سے ہے.... اور اختتام دوشنبہ کی نماز صبح پر ہوا۔[2] تاہم مولانا مرحوم کی تحریر سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت صدیقؓ کی قائمقامی کا آغاز کم از کم شب پنج شنبہ کی نماز عشا سے ہو چکا تھا۔ مثلاً:

۱۔ انھوں نے مرض الموت کے خطبے کا دن جمعرات مقرر کیا ہے (بعد نماز ظہر) فرماتے ہیں، روایتوں میں بالتصریح مذکور نہیں کہ خطبہ کس روز کی ظہر کا واقعہ ہے لیکن صحیح مسلم "باب النہی عن بناء المساجد علی القبور" میں حضرت جندب کی روایت ہے کہ ابوبکرؓ کی شان میں جو الفاظ آپ نے فرمائے، وہ وفات سے پانچ روز پیشتر فرمائے تھے' لہٰذا مرض الموت کا خطبہ وفات سے پانچ روز پیشتر جمعرات کا واقعہ ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی "فتح الباری" میں یہی فیصلہ کیا ہے[3]

۲۔ اسی دن (جمعرات) ظہر کی نماز کے وقت آپ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی آپ نے حکم دیا پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی جائیں۔ غسل فرما چکے تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر مسجد میں لائے۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکر نماز پڑھا رہے تھے۔[4]

جب حضرت ابوبکرؓ جمعرات کی نماز ظہر پڑھا رہے تھے، ان کی قائمقامی کم از کم چہارشنبہ کا دن گزر جانے پر نماز عشا سے ہو چکی تھی۔

تبادل صورت یہ ہو گی کہ مان لیا جائے، جمعرات کو ظہر ہی نہیں، عصر و مغرب کی نمازیں بھی حضور صلعم نے بہ نفس نفیس پڑھائیں۔ اس بنا پر بعد کا اقتباس محل نظر ٹھہرتا ہے نیز خطبۂ مرض الموت کا دن متعین کرنے میں جو زحمت اٹھائی گئی وہ بے سود رہ جاتی ہے۔ قاضی سلیمان مرحوم کی طرح یہ بھی مانا جا سکتا ہے کہ حضور صلعم رحلت سے دو یا ایک یوم قبل بھی مسجد میں تشریف فرما ہوئے[5] اور یہ حضرت ابوبکرؓ کی قائمقامی کا زمانہ تھا۔ اس طرح بعض دوسری حدیثوں اور روایتوں پر زد پڑتی ہے۔ (مولف)

---

[1] اصح السیر ص ۵۴۳۔ [2] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۳، احاشیہ۔ [3] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۵، احاشیہ۔
[4] ایضاً ص ۱۰۵ [5] رحمۃ للعلمین ص ۳۲۰۔

باب ۸۸

رسول اللہؐ کی وفات

انک میتٌ و انھم میتون۔

—(۲)—

مسجد میں تشریف فرمائی

پنجشنبہ کو ظہر کے وقت بیماری سے ذرا افاقہ محسوس ہوا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی جائیں[1]۔ اصح السیر میں ہے:

مجھ پر سات مشک پانی بہاؤ، جس کا رباط ڈھیلا نہ ہو یعنی مشک بھرپور ہو اور اس میں سے پانی نہ گرا ہو[2]

"رحمۃ للعلمین" کا بیان ہے کہ آپ نے پتھر کی لگن میں بیٹھ کر سات کنوؤں کی سات مشکوں کا پانی سر پر ڈلوایا[3]

پھر حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے سہارے مسجد میں تشریف فرما ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے آہٹ پا کر وہ پیچھے ہٹے۔ آپؐ نے اشارے سے روکا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی، یعنی آپ کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر اور لوگ نماز ادا کرتے جاتے تھے[4]

اس نماز کے بعد آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جو عموماً آپ کا آخری خطبہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ پھر مسجد میں تشریف فرما نہ ہو سکے۔ اسے خطبہ مرض الموت بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ اس مرض میں دیا گیا تھا جس میں آپ راہگرائے عالم بقا ہوئے۔ یہ خطبہ بہت سے مضامین و مطالب پر مشتمل تھا، جن میں سے بعض الگ الگ بیان کیے جاتے ہیں، تاہم خیال یہی ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی کے خطبے میں بیان فرمائے گئے تھے۔

اختیار آخرت

ابوسعید الخدریؓ کی روایت کے مطابق خطبے کا آغاز ان الفاظ سے ہوا:

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیا کی نعمتیں لے لے یا خدا کے پاس جو کچھ ہے، اسے قبول کرلے۔ اس بندے نے وہی قبول کیا، جو خدا کے پاس ہے۔ (یعنی عالم آخرت)

یہ سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے نکلا "ہمارے ماں باپ آپ پر قربان"۔ پھر بے اختیار آنسو

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۵، [2] اصح السیر، ص ۵۱۳ [3] ص ۳۱۸ [4] سیرۃ النبی ص ۱۷۵۔

جاری ہوگئے۔ ابوسعید کہتے ہیں، میں نے دل میں کہا، رونے کا کون سا مقام ہے؛ رسول اللہ صلعم تو ایک بندے کا واقعہ بیان فرما رہے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوگیا کہ ابوبکرؓ کو ہم سب سے زیادہ علم تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ رسول اللہ صلعم ہی وہ بندے ہیں جنھوں نے دنیا کی نعمتیں چھوڑ کر وہ اختیار کر لیا جو اللہ کے پاس ہے گویا آپ ہمیں چھوڑ جانے والے ہیں۔

رفاقت اور مال کا احسان

رسول اللہ صلعم نے ابوبکرؓ کو رونے سے منع فرماتے ہوئے کہا: ابوبکرؓ اپنے آپ پر رحم کر۔ پھر مجمع سے مخاطب ہوئے:

> میں تمام لوگوں میں سب سے بڑھ کر ابوبکرؓ کے مال اور رفاقت کا ممنون ہوں۔ اگر امت میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا۔ لیکن اسلامی اخوت و محبت کا رشتہ کافی ہے۔ دیکھو مسجد کے رُخ کوئی دروازہ نہ چھوڑا جائے سوائے ابوبکرؓ کے دروازے کے۔

بعض روایتوں میں "باب" (دروازہ) کی جگہ "خوخہ" کا لفظ آیا ہے یعنی دریچہ یا کھڑکی۔ دروازہ ہو یا دریچہ تاہم حضرت ابوبکرؓ کے دروازے یا دریچے کے سوا سب کے لیے بندش کا حکم ہوگیا۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت عباسؓ نے کہا، یا رسول اللہ! کیا بات ہے کہ آپ نے کچھ لوگوں کے دروازے بند کرا دیے اور کچھ لوگوں کے کھلے رہنے دیے۔ فرمایا: نہ میں نے اپنے حکم سے کھولے اور نہ اپنے حکم سے بند کیے۔ گویا جو کچھ ہُوا خدا کے حکم سے ہُوا۔

یہ دروازے یا دریچے بظاہر اس غرض سے رکھے گئے تھے کہ نماز کے لیے آنے اور بعد ادائے نماز واپس جانے میں سہولت رہے چونکہ مکان مسجد سے پیوستہ تھے۔ اس لیے وہ لوگ دروازے یا دریچے سے مسجد میں داخل ہو جاتے تھے۔ اسی طرح لوٹ جاتے تھے۔ یہ ضروری نہ تھا کہ گھر سے نکل کر چکر لگائیں اور مسجد میں داخلے کے دروازے سے اندر پہنچیں پھر اسی دروازے سے باہر جائیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے مکان کا مسئلہ

بعض اصحاب نے کہا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا کوئی مکان مسجد کے پاس نہ تھا بلکہ ان کا مکان سنخ میں تھا جو عوالی کی جانب مدینہ منورہ سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ مگر یہ ان کا سسرالی مکان تھا۔ ان کا دوسرا مکان مسجد سے بالکل ملا ہوا تھا، جس کا دروازہ یا دریچہ مسجد میں کھلتا تھا۔ یہ مسجد النبیؐ کی مغربی جانب تھا۔ اسے حضرت ابوبکرؓ نے وفود پر خرچ کرنے کے لیے چار ہزار درہم میں فروخت کر دیا تھا۔ جب حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مسجد کی توسیع ہوئی تو غالباً یہ مکان مسجد میں شامل ہوگیا۔ سلطان عبدالعزیز آل سعود فرمانروائے دولت عربیہ سعودیہ کی توسیع مسجد سے پیشتر سلطان عبدالمجید خاں عثمانی (۱۸۳۹ء۔ ۱۸۶۱ء) نے مسجد کی توسیع و تعمیر کا کام نہایت اعلیٰ پیمانے پر کرایا تھا۔ اس وقت خاص اس مقام پر جہاں حضرت ابوبکرؓ کے مکان کا

دروازہ یا دریچہ تھا، رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد نہایت خوشخط لکھوا کر لگوا دیا گیا تھا تاکہ اثر ماثور کے ساتھ محفوظ رہے۔ توسیع سعودیہ میں مسجد کے لیے تین دروازے نئے کھولے گئے جن میں سے باب الصدیق عین اس مقام پر ہے، جہاں حضرت ابوبکرؓ کا مکان یا اس کا دروازہ یا دریچہ تھا۔

قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت

ازواج مطہرات میں سے حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت سودہؓ ہجرت اولیٰ میں حبش گئی تھیں وہاں انھوں نے "ماریہ" نام گرجا دیکھا تھا جو غالباً حضرت مریمؑ کے نام پر تھا۔ ایک مرتبہ اس گرجے کی خوب صورتی، تصاویر اور نقش و نگار کا ذکر رسول اللہ صلعم کے سامنے آیا تو حضور صلعم نے فرمایا، ان لوگوں میں کوئی مرد صالح ہوتا ہے تو اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے ہیں اور تصویروں کا انتظام کر لیتے ہیں؛

اولٰئك شرار الخلق عند الله۔[1] یہ لوگ خدا کے نزدیک بدترین خلائق ہیں۔

خطبہ پنج شنبہ میں فرمایا؛

جو لوگ تم سے پہلے تھے، وہ انبیاء وصالحین کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، خبردار! تم قبروں کو عبادت گاہ نہ بنانا۔ میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں۔

مرض الموت میں یہ کلمہ غالباً کئی مرتبہ دہرایا۔ مثلاً

۱۔ خدا یہود کو غارت کرے کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔[2]

۲۔ خدا یہود و نصاریٰ کو غارت کرے کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ عرب میں دو نوں دین باقی نہ رہنے پائیں۔[3]

۳۔ اے اللہ میری قبر کو پرستش گاہ نہ بنانا۔ وہ قوم اللہ کے سخت غضب کا نشانہ بنی، جس نے اپنے انبیاء کی قبروں کو پرستش گاہ بنا لیا۔[4]

اسامہؓ بن زیدؓ کی سالاری

رسول اللہ صلعم نے علالت سے ایک روز پیشتر اسامہؓ بن زیدؓ کو ایک لشکر کا سالار بنا کر بلقا کی طرف جانے کا حکم دے دیا تھا تاکہ جنگ موتہ کے شہداء کا بدلہ لیں، جن میں اسامہؓ کے والد زیدؓ بن حارثہ بھی شامل تھے۔ بعض منافقین نے یہ کہنا شروع کیا کہ دیکھو، جس لشکر میں اکابر اور بزرگ شامل ہیں، اس کا سالار ایک نوجوان کو بنایا گیا ہے۔ حضور صلعم نے خطبے میں ارشاد فرمایا؛

---

[1] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۳۹ تا ۲۴۰۔ صحیح بخاری میں "عند اللہ" کے بعد "یوم القیامۃ" بھی ہے یعنی قیامت کے دن ایسے لوگ اللہ کے نزدیک بدترین خلائق ہوں گے۔ [2] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۴۴۔ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۲۴۰۔ ۲۴۱۔

لوگو! اسامہؓ کے لشکر کو روانہ کر دو۔ اگر اب تم نے اسامہؓ کی امارت میں کلام کیا ہے تو اس کے والد کی امارت میں بھی کلام کر چکے ہو، حالانکہ اسامہؓ بھی امارت کے لائق ہے جس طرح اس کے والد امارت کے لائق تھے[1]

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق ساتھ ہی فرمایا:

اور وہ (زیدؓ بن حارثہ) ان لوگوں میں سے تھے، جو مجھے سب سے زیادہ محبوب تھے اور اسامہؓ بھی ان لوگوں میں سے ہے جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں[2]

رسول اللہ صلعم کی محبت کا معیار تقویٰ اور عمل صالح کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟ زیدؓ کی عظمت اور رفعت منزلت کا اندازہ ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں، جس نے رسول اللہ صلعم کی خدمت و محبت پر باپ، چچا اور اہل خاندان کی محبت و رفاقت بے دریغ قربان کر دی اور رسول اللہ صلعم کے مقرر فرمائے ہوئے معیار ایمان کا عملی ثبوت بہم پہنچا دیا کہ کوئی شخص اس وقت تک سچا مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میری ذات اس کے نزدیک باپ بیٹے اور تمام لوگوں پر محبوبیت میں فائق و برتر نہ ہو جائے۔ یہ پہلو بھی برابر سامنے رہنا چاہیے کہ حضور صلعم نے انسانی مساوات کے عملی نمونے کس انتہائی حد پر پہنچا دیے تھے۔ پھر زیدؓ کی صلاحیت امارت کی اس سے روشن تر دستاویز کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کم و بیش سات مزید مختلف جیوش کے امیر بنائے گئے۔ ہر مرتبہ حق امارت بہترین طریق پر انجام دیا۔ حتیٰ کہ غزوۂ موتہ میں جان دے دینے میں بھی سب پر سبقت کی کیونکہ وہ امیر لشکر تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اسامہؓ کا لشکر مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر جُرف پہنچ گیا جو شہر سے تین چار میل پر ہے۔ رسول اللہ صلعم کی بیماری کا اشتداد توقف کا باعث ہُوا۔ حضور صلعم کی وفات کے بعد صدیق اکبرؓ نے خلافت کا منصب سنبھالتے ہی لشکر روانہ کر دیا۔ جب ان سے کہا گیا کہ فوج کی زیادہ ضرورت یہاں ہے تو بے توقف جواب دیا: "ابن ابی قحافہ کا یہ منصب نہیں کہ رسول اللہ صلعم کے مقرر فرمائے ہُوئے لشکر کو روکے۔"

موقع اور محل کی مناسبت سے انداز کلام کا پہلو سامنے رہے کہ ابوبکرؓ یا صدیقؓ یا خلیفۃ الرسول کہتے ہیں اک گونہ فخامت کا رنگ تھا، حالانکہ ان میں سے ہر اسم و علم اپنی جگہ بالکل درست ہوتا۔ عجز و انکسار کا پہلو ابھارنے کے لیے "ابن ابی قحافہ" کہنا پسند فرمایا۔

انصار کے لیے وصیتیں

رسول اللہ صلعم کی بیماری بڑھ گئی تو انصار بہت پریشان تھے۔ ابوبکرؓ اور عباسؓ ایک روز انصار کی ایک مجلس میں گئے تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ سبب پُوچھا تو بتایا گیا کہ رسول اللہ صلعم کی صحبتیں یاد آتی ہیں تو بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ یہ ذکر رسول اللہ صلعم تک

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۴۹ ج ۲ [2] صحیح بخاری، کتاب المناقب۔ مناقب زیدؓ بن حارثہ

بھی پہنچ گیا۔ پھر فضل بن عباسؓ اور علیؓ ابن ابی طالب نے بھی یہی کیفیت سنائی۔ حضور صلعم نے خطبے میں ارشاد فرمایا:

میں انصار کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں۔ انھوں نے تم سے پہلے مدینہ کو اپنا وطن بنایا اور ایمان اپنے اوپر لازم کر لیا۔ کیا انھوں نے اپنے پھلوں میں تمھیں شریک نہ کیا؟ کیا انھوں نے تمھارے لیے مکانوں میں وسعت پیدا نہ کی؟ کیا انھوں نے احتیاج کے باوصف اپنی ذات پر تمھیں ترجیح نہ دی؟[1]

طبقات ابن سعد میں انصار کے متعلق متعدد روایتیں ہیں۔ مثلاً:

۱۔ میں نے انصار کے ہاں پناہ لی۔ ان کے کریم کا اکرام ملحوظ رکھو اور ان کے بُرے سے درگزر کرو۔[2]

۲۔ انصار میرا ترکہ اور جایداد ہیں۔ لوگ کم بھی ہوتے ہیں، زیادہ بھی۔ ان کے محسن کو قبول کرو اور بُرے کے تعلق میں درگزر سے کام لو۔

۳۔ لوگو! اور آدمی بڑھتے جائیں گے۔ انصار کم ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ کھانے میں نمک کی طرح رہ جائیں گے۔ لہٰذا جو لوگ معاملات کے والی ہوں، وہ ان کے محسن کو قبول کریں اور بُرے کو معاف کر دیں۔[3]

۴۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، مجھے تم سب سے محبت ہے۔ انصار کے ذمے جو کچھ واجب تھا انھوں نے پورا کر دیا۔ تمھارے ذمے جو کچھ تھا وہ باقی رہا۔ ان کے محسن کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور بُرے سے درگزر کرو۔[4]

۵۔ خود انصار سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے گروہ انصار، میرے بعد تم تکلیف سے دوچار ہو گے۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس صورت میں ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا: میں حکم دیتا ہوں کہ صبر سے کام لینا، یہاں تک کہ تم اللہ اور اس کے رسول سے آملو۔[5]

دوام کسی کے لیے نہیں

"اصح السیر" میں ہے کہ فرمایا:

لوگو! مجھے خبر ملی ہے کہ تم میری موت سے ڈرتے ہو۔ جتنے انبیاء مبعوث ہوئے، کیا ان میں سے کوئی ہمیشہ رہا؟ میں خدا سے ملنے والا ہوں، تم بھی خدا سے ملنے والے ہو۔

پھر فرمایا:

میں وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین اولین کے ساتھ بھلائی کرنا اور میں وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین

---

[1] اصح السیر ص ۵۲۰ [2] طبقات جلد دوم ص ۲۵۱ [3] ایضاً ایضاً [4] ایضاً ص ۲۵۲ [5] ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۵۳۔

آپس میں اچھا برتاؤ رکھیں۔

بعد ازاں سورۂ عصر کی تلاوت کی اور ارشاد ہوا:

سارے کام خدا کے حکم پر چلتے ہیں، جس کام میں تاخیر ہو، اس کے لیے عجلت نہ کرو۔ کسی کی عجلت سے خدا جلدی نہیں کرتا۔[1]

بدلے کا اذن عام غالباً اسی خطبہ مبارکہ کا ایک ٹکڑا طبقات میں یوں منقول ہے:

تم میں سے بعض کے حقوق مجھ سے وابستہ تھے۔ میں بھی بشر ہوں۔ جس شخص کی آبرو کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچا ہو تو یہ میری آبرو ہے اسے بدلہ لے لینا چاہیے۔ جس شخص کے جسم کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو یہ میرا جسم موجود ہے اسے بدلہ لے لینا چاہیے۔ جس شخص کے مال میں مجھ سے نقصان ہوا ہو تو یہ میرا مال ہے وہ لے لے۔ جان لو تم میں میرے ساتھ سب سے زیادہ محبت کرنے والا شخص وہ ہوگا کہ ان حقوق میں سے اس کا کوئی حق ہو تو وہ لے لے یا مجھے بری کر دے تاکہ میں اپنے رب سے ملوں تو تمام حقوق سے پاک اور بری الذمہ ہو کر ملوں۔ کوئی شخص ہرگز یہ نہ سمجھے کہ بدلہ لینے میں مجھے رسول اللہ (صلعم) کی عداوت یا بغض کا خوف تھا۔ یہ دونوں باتیں (عداوت اور بغض) میری طبیعت ہی میں نہیں۔ جس شخص کا نفس کسی بری بات میں اس پر غالب آگیا ہو تو اسے بھی مجھ سے مدد لینی چاہیے تاکہ میں اس کے لیے دعا کروں۔[2]

آپ فرما چکے تو ایک شخص اٹھا اور بولا: یا رسول اللہ آپ کے پاس ایک سائل آیا تھا۔ آپ نے مجھے حکم دیا اور میں نے اسے تین درم دے دیے۔ فرمایا: درست ہے، فضل (بن عباس) اسے وہ درم دے دو۔

کسی دل میں یہ خیال پیدا نہ ہونا چاہیے کہ اس شخص نے تین درم کی بے حقیقت سی رقم ایسے موقع پر طلب کی۔ ہرگز نہیں۔ رسول اللہ کی صحبت، تعلیم و تربیت اور تزکیے کی برکت سے صحابۂ کرام کی فطرتیں ایسی ہو گئی تھیں کہ وہ حضور صلعم کی ہر بات کو عالم انسانیت کی تعلیم و تربیت او تزکیے کا جاندار وسیلہ بنا دینے کے خواہاں رہتے تھے اور کوئی بھی اپنے دل میں کسی بات کو چھپائے رکھنے کا روادار نہیں تھا، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی حقیر ہو۔ جن قدوسیوں نے اپنا سب کچھ رسول اللہ صلعم پر بے دریغ قربان کر دیا۔ ان کی حب رسول کا اندازہ ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں؟ ان کی عمریں قربانیوں میں گزریں، ہم شاید اس انداز کی زندگی چند لمحوں کے لیے بھی بسر کرنے کے اہل ثابت نہ ہو سکیں۔ حضور صلعم کی زبان مبارک پر جاری ہونے والے ایک ایک لفظ کو لباس عمل پہنانے کے ذمہ دار صحابۂ کرام ہی تھے، جن میں سے ایک فرد

---

[1] اصح السیر ص ۵۲۶ - ۵۲۷۔ [2] طبقات جلد دوم ص ۲۵۵۔

جلیل و عظیم وہ بھی تھا جس نے تین درہم یاد دلائے۔

پھر یہ پہلو بھی نظرانداز نہ ہونا چاہیے کہ وہ حیات طیبہ کس قدر پاک اور کس درجہ مقدس و مزکّٰی تھی۔ تریسٹھ سال زندگی کے اور تیئیس سال نبوت کے گزار کر وفات سے پانچ روز پیشتر حقوق کے بدلے کا اعلان کیا جاتا ہے تو صرف تین درہم کی رقم کے سوا اس کے ذمے کچھ نہیں نکلتا۔ وہ رقم بھی ایک سائل کو دلائی گئی تھی اور اس کا خیال نہ رہنا تعجب انگیز نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ زندہ معجزے ہیں جن سے کسی کو اختلاف یا انکار نہیں ہو سکتا، خواہ وہ غیر ہی کیوں نہ ہو۔

ایک آدمی اٹھا اور عرض کیا، یارسول اللہ میں بہت بخیل، بزدل اور زیادہ سونے والا ہوں۔ آپ اللہ سے دعا کریں کہ میری یہ خصلتیں دُور ہو جائیں۔ آپ نے اس کے لیے دُعا کی۔

ایک خاتون نے اپنے متعلق کچھ عرض کیا۔ فرمایا، عائشہؓ کے مکان میں چلو۔ وہاں آپ نے اپنا عصاے مبارک اس خاتون کے سر پر رکھا۔ وہ دیر تک بکثرت سجدے کرتی رہی۔ فرمایا: سجدے لمبے کرو، کیونکہ بندہ حالت سجدہ میں خدا سے قریب تر ہوتا ہے۔

حرام و حلال کا معاملہ

مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں؛

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع (وضع کرنے والا) اور حاکم براہ راست خداے پاک کو قرار دیتا ہے۔ پیغمبر کا صرف اسی قدر فرض ہے کہ احکام الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعے سے بندوں تک پہنچا دے۔ چونکہ دُوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک و کفر تک منجر ہو چکی تھی اور اس کے نتائج پیش نظر تھے۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حرام کی ہے[1]

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے؛

لوگو! کسی شے کو مجھ پر معلق نہ کرو۔ میں نے اسے حلال یا حرام ٹھہرایا۔ میں تو صرف وہی شے حلال کرتا ہوں جسے اللہ نے حلال کیا اور اسی شے کو حرام کرتا ہوں، جسے اللہ نے حرام کیا[2]

جزا و سزا کی بنیاد

جزا و سزا کی بنیاد انسان کا ذاتی عمل ہے نہ کسی کے ساتھ رشتہ یا تعلق۔ قرآن مجید کا اصول ہے؛

لا تکسب کل نفس الا علیھا — ہر آدمی عمل سے جو کچھ کماتا ہے وہ اسی کے ذمے ہوتا ہے

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۱۷۷ [2] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۵۶۔

ولا تزر وازرۃٌ وِزرَ اُخریٰ۔ — اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

(انعام: ۱۶۴)

آخری ٹکڑا بنی اسرائیل: ۱۵، فاطر: ۱۸ اور زمر: ۷، میں بھی آیا ہے۔ پھر سورۂ نجم میں فرمایا:

الّا تزر وازرۃ وزر اخریٰ وان لیس للانسان اِلّا ما سعیٰ۔ — کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور انسان کے لیے کچھ نہیں، مگر وہی جو اس نے کمایا۔

کسی انسان کا تعلق کتنے ہی مقدس و واجب الاحترام فرد یا خاندان سے کیوں نہ ہو، لیکن وسیلۂ نجات اس کی ذاتی نکوکاری اور پرہیزگاری ہے۔ حضور صلعم نے فرمایا:

اے رسول اللہ کی بیٹی فاطمہؓ، اے رسول اللہ کی پھوپھی صفیہؓ، خدا کے ہاں کے لیے کچھ کر لو۔ میں تم دونوں کو کسی معاملے میں خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔[1]

نیز فرمایا:

اے اولاد عبد مناف، میں تمھیں کسی امر میں خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اے عباسؓ ابن عبدالمطلب، میں تمھیں کسی امر میں خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ دنیا میں مجھ سے جو چاہو مانگ لو۔[2] (تاہم آخرت میں صرف تمھارے نیک عمل ہی کام آئیں گے)

یہ خود اہل خاندان کے لیے بھی عمل صالح کی دعوت تھی اور باقی سب کے لیے بھی اس اعتبار سے ایک پُرتاثیر انتباہ تھا کہ جب رسول اللہ صلعم اپنے اقربا بلکہ صاحبزادی پر صاف صاف واضح فرما رہے ہیں کہ آخرت کا معاملہ ان کے ذاتی اعمال پر موقوف ہے تو ہم لوگوں کے لیے نیک عملی کے سوا راہِ نجات کیا ہے؟

ضروری گزارش یہاں میں نے حضور صلعم کے مختلف ارشادات کو جو مرض موت کے دور کے ہیں، اس خیال سے ایک جگہ جمع کر دیا کہ وہ بظاہر ایک ہی خطبے کے اجزا معلوم ہوتے ہیں۔ خطبہ اس صورت میں اور اس ترتیب کے ساتھ نہیں دیا گیا ہوگا اور نہ اس صورت اور ترتیب میں کسی جگہ نظر آیا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ تمام ارشادات اسی دور کے ہیں، جب حضور صلعم بیمار تھے اور ان میں سے سب کا یا زیادہ تر کا تعلق پنجشنبہ کے خطبے سے ہے۔ بعض اصحاب پنجشنبہ کے بعد بھی حضور صلعم کے مسجد میں تشریف فرما ہونے کے قائل ہیں۔ یہ گزارش اس لیے ضروری تھی کہ کسی صاحب کے لیے غلط فہمی کا کوئی امکان نہ رہے۔

واقعۂ قرطاس اس دور کا ایک واقعہ وہ بھی ہے جو واقعۂ قرطاس کے نام سے مشہور ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ بھی

---

[1] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۵۹۔ [2] ایضاً

پنجشنبہ ہی کو پیش آیا۔ یعنی حضور صلعم کا ارشاد کہ دوات کاغذ لاؤ میں ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔

جو اصحاب اس موقع پر موجود تھے ان میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم کی ظاہری کیفیت دیکھ کر خیال ہوا کہ مرض کی شدت ہے اور اس حالت میں آپ کو تکلیف دینا مناسب نہیں۔ بعض چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلعم کے ارشاد کی تعمیل میں کاغذ پیش کر دیا جائے۔ اس پر مختلف پہلوؤں سے بحثیں ہو چکی ہیں۔ میں انھیں دہرانا نہیں چاہتا۔ صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ اس واقعے سے پانچ روز بعد حضور صلعم کی وفات ہوئی۔ اس دور کی کئی روایتیں بیان کی جاتی ہیں اور ان میں طلب قرطاس کا کوئی ذکر نہیں یعنی اگر واقعی کوئی ضروری بات تھی تو نہ وہ فرمائی گئی اور نہ لکھوائی گئی۔

ابن عباسؓ کی روایت

اس سلسلے میں ایک روایت ابن عباسؓ کی بھی ہے جو صحیح بخاری میں کئی مقامات پر با اختلاف الفاظ آئی ہے۔ طبقات سے اس کے بعض اجزا بیان درج کیے جاتے ہیں:

ابن عباسؓ پنجشنبہ کا ذکر کر کے رونے لگے۔ رونے کا سبب پوچھا گیا تو کہا کہ رسول اللہ صلعم کی بیماری شدت اختیار کر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ دوات کاغذ لاؤ، میں تمھیں ایسا فرمان لکھ دوں کہ کبھی گمراہ نہ ہو۔ لوگوں میں رسول اللہ صلعم کی تکلیف دیکھ کر اختلاف پیدا ہو گیا یعنی دوات کاغذ کا انتظام کیا جائے یا نہ کیا جائے، حالانکہ حضور صلعم کے سامنے اختلاف مناسب نہ تھا۔ آپ سے دوبارہ پوچھا گیا تو فرمایا: مجھے چھوڑ دو، کیونکہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے، جس کی طرف تم بلاتے ہو۔

میں تمھیں تین وصیتیں کرتا ہوں:

۱۔ مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔

۲۔ اہل وفود کی مدارات اسی طرح کرو، جس طرح میں کیا کرتا تھا۔

تیسری وصیت کے متعلق راوی نے کہا، مجھے معلوم نہیں کہ آیا ابن عباسؓ نے بیان کر دی اور مجھے یاد نہ رہی یا خود انھوں نے اس سے سکوت اختیار کیا۔[1]

تیسری وصیت کے متعلق قاضی سلیمان مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ قرآن مجید سے متعلق تھی۔[2] مولانا حکیم عبدالرؤف دانا پوری مرحوم فرماتے ہیں کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، جیش اسامہؓ کے متعلق کوئی حکم تھا اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا: میری قبر کو پرستش گاہ نہ بنانا۔[3]

طبقات کی روایات

طبقات ابن سعد میں کئی روایتیں ہیں مثلاً ایک یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی بیماری کا آغاز اس روز ہوا جب حضرت میمونہؓ کے ہاں مقیم تھے۔ جب حضرت عائشہؓ کے

---

[1] طبقات جلد دوم ص ۲۴۲ [2] رحمۃ للعالمین جلد اول ۳۱۹۔ ۳۲۰ [3] اصح السیر ص ۵۲۵۔

مکان پر پہنچے تو آپ کے سر میں شدید درد تھا۔ اتفاق سے حضرت عائشہؓ بھی دردِ سر میں مبتلا تھیں اور کہہ رہی تھیں: "واراساہ" (ہائے میرا سر) رسول اللہ صلعم نے فرمایا: "بل انا واراساہ" (ہائے میرا سر) کہنے کا مستحق تو میں ہوں میں نے قصد کیا کہ کسی کو بھیج کر تمہارے (حضرت عائشہؓ) والد اور بھائی کو بلا لوں اور اپنا کام پورا کر دوں اور اپنے عہد کو مضبوط بنا دوں تاکہ کوئی طمع کرنے والا اس میں طمع نہ کرے، کہنے والے کچھ کہہ نہ سکیں اور تمنا کرنے والے تمنا نہ کریں۔

پھر فرمایا:

کلاّ یابی اللہ و یدفع المومنون او یدفع اللہ و یابی المومنون و قال بعضھم فی حدیثہ: و یابی اللہ الا ابی بکر۔[1]

اس کی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ اللہ بھی انکار کرے گا اور مومین بھی رد کریں گے یا فرمایا اللہ بھی رد کرے گا اور مومنین بھی انکار کریں گے۔ بعض راویوں نے اپنی روایت میں کہا: اللہ سوائے ابوبکرؓ کے (سب سے) انکار کرے گا۔
(مولف)

---

[1] طبقات جلد دوم ص ۲۲۵-۲۲۶۔

باب ۸۹

رسول اللہؐ کی وفات

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ

—(۳)—

بیماری کی شدت پنج شنبہ کے خطبے کے بعد آپ گھر تشریف لائے تو بیماری کی شدت اور ضعف کے باعث پھر باہر نہ نکل سکے، اگرچہ بعض اصحاب نے اس کے بعد بھی مسجد میں جانے کا ذکر کیا ہے۔ کمزوری بڑھ گئی تھی البتہ آہستہ آہستہ زبان مبارک پر دعوت حق کے مختلف اجزا جاری رہتے تھے مثلاً:

۱۔ یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو انھوں نے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے۔

۲۔ لونڈی غلام کے بارے میں اللہ سے ڈرو، انھیں کپڑا پہناؤ۔ پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ اور ان کے ساتھ نرمی سے بات کرو۔

۳۔ خبردار! تم میں سے کوئی بغیر اس کے نہ مرے کہ اللہ کے ساتھ اس کا گمان نیک ہو۔

وفات سے ایک روز پہلے وفات سے ایک روز پہلے یعنی یک شنبہ کو آپ نے اپنے تمام غلام آزاد کر دیے، جن کی تعداد بعض روایتوں میں چالیس آئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور صلعم نے کبھی کسی غلام کو عملاً غلام نہیں رکھا گیا بہ اعتبار حسن سلوک اسے پہلے ہی دن سے آزاد فرما دیتے تھے۔ شاید بعض کی رسمی آزادی کا اعلان مناسب سمجھا گیا ہو۔ کاشانۂ مبارک میں چھ یا سات دینار کی رقم اتفاقیہ رہ گئی تھی، اسے نکلوا کر تقسیم کرا دیا۔ اپنے تمام اسلحہ مسلمانوں کے لیے ہبہ کر دیے۔ آپ کی ایک فولادی زرہ تیس صاع جَو میں ایک یہودی کے پاس گرو تھی۔ قاضی سلیمان مرحوم نے ایک صاع کا وزن دو سیر ساڑھے تین چھٹانک بتایا ہے۔ اس حساب سے زرہ کی کفالت پر جتنے جَو لیے گئے ان کی مقدار ایک من چھبیس سیر نو چھٹانک ہوئی۔ اتنا تیل گھر میں موجود نہ تھا کہ چراغ روشن کیا جا سکتا۔ چنانچہ حضرت عایشہؓ نے پڑوسن سے تیل ادھار لے کر اس رات دیا جلایا، جو ظلمت زار ارضی میں حیات طیبہ کی آخری رات تھی۔

غشی میں دوا پلانا تیمارداروں میں سے بعض کو شبہ تھا کہ حضور صلعم کو ذات الجنب ہے۔ حضرت اسمار بنت عمیس نے ذات الجنب کا نسخہ جس میں عود ہندی، کُسُم، روغن زیتون وغیرہ پڑتے تھے، حبش سے حاصل کیا تھا، وہی آپ کو پلانا چاہا، آپ نے انکار کیا۔ تیمارداروں نے سمجھا کہ یہ انکار اس کراہت پر مبنی ہے جو مریض کو عموماً دواؤں سے ہوتی ہے۔ اتفاق سے آپ کو غش آگیا، اسی حالت میں منہ کھول کر ذات الجنب کا نسخہ پلا دیا گیا۔ افاقے کے بعد آپ کو دوا کا احساس ہوا تو فرمایا: دوا پلانے کا مشورہ کس نے دیا؟ عرض کیا گیا:

اسماء بنت عمیس نے۔ آپ نے فرمایا: "یہ وہ طب ہے جو ان کے پاس حبش سے آئی ہے۔ تم لوگ سمجھتے ہو گے کہ اللہ نے مجھ پر ذات الجنب کو مسلط کیا ہے۔ اللہ کی مرضی نہیں کہ اسے مجھ پر غالب کرے"۔
ساتھ ہی حکم دے دیا کہ میرے چچا (عباسؓ) کے سوا گھر میں جتنے لوگ ہیں، ان سب کو یہی دوا پلائی جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔

دوشنبہ کی نماز صبح

مرض میں شدت اور تخفیف ہوتی رہتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم دوشنبہ یوم وفات کی نماز صبح کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جس دن وفات ہوئی بظاہر طبیعت کو سکون تھا۔ حجرۂ مبارکہ مسجد سے ملا ہوا تھا۔ آپؐ نے پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ فجر کی نماز میں مشغول تھے۔ دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے۔ لوگوں نے آہٹ پاکر خیال کیا کہ آپؐ باہر آنا چاہتے ہیں (یعنی مسجد میں) فرطِ مسرت سے تمام لوگ بے قابو ہو گئے اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں (حضرت ابوبکرؓ نے جو امام تھے چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں) آپؐ نے اشارے سے روکا اور حجرۂ شریفہ میں داخل ہو کر پردے ڈال دیے (صحیح مسلم میں ہے ضعف اس قدر تھا کہ آپ پردہ بھی اچھی طرح ڈال نہ سکے) یہ سب سے آخری موقع تھا کہ صحابہؓ نے جمال اقدس کی زیارت کی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ چہرہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصحف کا کوئی ورق ہے یعنی سپید ہو گیا تھا۔[1]

اس اقتباس کے بعض الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور صلعم اٹھ کر حجرۂ مبارکہ سے باہر آ گئے تھے۔ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے تاہم صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کو دیکھ کر نکلے۔ ان سے حضور صلعم کی طبیعت کے متعلق پوچھا گیا تو جواب دیا: اصبح بحمد اللہ بارئاً[2] یعنی بحمد اللہ اچھے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھانے کے بعد حضور صلعم کی طبیعت کے متعلق مطمئن ہو کر سنح چلے گئے تھے۔

حضرت عباسؓ نے اس روز یا ایک روز پہلے حضرت علیؓ سے باتیں کرتے ہوئے کہہ دیا تھا:

و انی و اللہ لاری رسول اللہ یتوفی من وجعہ ھذا۔ انی لاعرف وجوہ بنی عبد المطلب عند الموت۔[3]

خدا کی قسم میں سمجھتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بیماری سے عنقریب وفات پا جائیں گے۔ میں تو عبد المطلب کی اولاد کے چہرے دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ موت کا وقت آ گیا ہے۔

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۱۷۹۔ اقتباس میں جو عبارتیں قوسین کے اندر ہیں وہ مولانا سید سلیمان مرحوم کی ہیں۔
[2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب مرض النبی صلعم [3] صحیح بخاری ایضاً ایضاً۔

حضرت فاطمہؓ سے راز کی باتیں

دوشنبہ کا دن جیسے جیسے چڑھتا گیا آپ کی تکلیف میں بھی اضافہ ہوتا گیا بلکہ پے در پے غشی کے دورے پڑنے لگے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ فاطمہؓ آئیں۔ ان کی رفتار رسول اللہ صلعم کی رفتار سے مشابہ تھی۔ آپ نے فرمایا: بیٹی! مرحبا۔ انھیں داہنی یا بائیں طرف بٹھا لیا۔ پھر کان میں چپکے سے کوئی بات کہی اور حضرت فاطمہؓ رونے لگیں۔ پھر کوئی بات چپکے چپکے کان میں کہی اور وہ ہنس پڑیں۔

رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ نے بتایا: پہلے مجھے خبر دی تھی کہ میں خیال کرتا ہوں اس مرض میں میری وفات ہو گی۔ یہ سنتے ہی مجھے بے اختیار رونا آ گیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میرے گھر والوں میں سب سے پہلے تو مجھ سے ملے گی۔ ساتھ ہی بشارت دی کہ مریم بنت عمران کے بعد میں اہل جنت کی عورتوں کی سردار ہوں گی۔ یہ سن کر میں خوشی کے مارے ہنس پڑی[1]۔

ایک روایت ہے کہ حضور صلعم کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہؓ سینہ مبارک سے لپٹ کر رونے لگیں۔ حضور صلعم نے فرمایا: بیٹی! رو نہیں، میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو انا للہ و انا الیہ راجعون (ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں) کہنا، یہی ہر فرد کے لیے ذریعہ تسکین ہے۔ پوچھا آپ کے لیے بھی؟ فرمایا: ہاں، اس میں میری بھی تسکین مضمر ہے۔

سکرات موت

طبیعت زیادہ بگڑی تو حضور صلعم نے پانی سے بھرا ہوا پیالہ پاس رکھوا لیا۔ اس میں ہاتھ ڈالتے اور تر ہاتھ چہرۂ مبارک پر پھیر لیتے۔ زبان مبارک پر آہستہ آہستہ یہ الفاظ جاری تھے:

لا الٰہ الا اللہ ان للموت سکرات۔ — اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور موت تکلیف کے ساتھ ہے۔

ایک اور روایت کے مطابق فرمایا:

اللھم اعنی علی کرب الموت۔ — اے اللہ موت کی تکلیف میں میری مدد فرما[2]۔

پانی سے ہاتھ تر کر کے چہرے پر پھیرنے کے علاوہ کبھی ایک پاؤں پھیلاتے، پھر اسے اٹھا کر کے دوسرا پاؤں پھیلا دیتے۔ اسی طرح کبھی چادر چہرۂ مبارک پر ڈال لیتے پھر اتار دیتے۔ یہ تکلیف میں اشتداد کی علامتیں تھیں۔ حضرت فاطمہؓ یہ دیکھتے ہی حزن سے پکار اٹھیں: "واکرب اباہ (ہائے میرے باپ کی بے چینی)"۔ حضور صلعم نے فرمایا: آج کے بعد تیرا باپ بے چین نہ ہو گا۔

---

[1] طبقات، جلد دوم ص ۲۴۷۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے خود حضرت فاطمہؓ کو بلایا تھا۔
[2] ایضاً جلد دوم ص ۲۵۸۔

مسواک وفات سے کچھ پہلے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ مزاج پرسی کے لیے آئے۔ ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی۔ بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت عائشہؓ فرق مبارک کے لیے سہارا بنی ہوئی تھیں۔ آپ فرماتی ہیں، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہیں مسواک پر جمی ہوئی ہیں، میں نے سمجھ لیا کہ آپ کو مسواک کی خواہش ہے۔ چنانچہ مسواک کا سرا چبایا، کچل کر نرم کیا اور مسواک آپ کو دے دی۔ پھر جس طرح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسواک کرتے دیکھا تھا، اس سے زیادہ اچھی طرح مسواک کی۔ آپ اسے لیے رہے تاآنکہ وہ آپ کے ہاتھ سے گر گئی یا آپ کا ہاتھ گر گیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دنیا کی آخری ساعت اور آخرت کے پہلے دن میں بھی اللہ نے میرا اور آپ کا لعاب دہن جمع کر دیا۔[۱]

آخری وقت سہ پہر کو سینۂ مبارک میں سانس کی گھڑگھڑاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اس اثنا میں لب ہائے مبارک کو جنبش ہوئی تو یہ الفاظ سنے گئے،

الصّلوٰۃ الصّلوٰۃ و ما ملکت ایمانکم۔ — نماز، نماز اور تمہارے لونڈی غلام

پھر انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ فرمایا اور تین مرتبہ کہا،

بل الرفیق الاعلیٰ۔ — بس اب اور کوئی نہیں، صرف اعلیٰ رفیق درکار ہے۔

تیسری مرتبہ یہ الفاظ ادا ہوئے تو ہاتھ لٹک آئے۔ آنکھیں پھٹ کر چھت سے لگ گئیں اور روح پاک عالم قدس میں پہنچ گئی۔[۲]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، اللہ کے انعامات میں سے یہ انعام بھی مجھے عطا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات میری آغوش میں، میرے گھر میں اور میری باری میں ہوئی۔[۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری آغوش میں اٹھائے گئے۔ میں نے اس حالت میں بھی آپ کو نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ آپ کو غسل دیا گیا۔ میں نے تکیہ لے کر آپ کے سر کے نیچے رکھ دیا، چادر اڑھا دی اور عورتوں کے ساتھ کھڑی ہو کر چیخنے، سر اور منہ پیٹنے لگی۔[۴]

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

حَضَرہٗ القبض و رَاسُہٗ علی فخذ عائشۃ غُشِیَ علیہ فلما افاق شَخَصَ بَصَرُہٗ نحوَ سقف البیت ثم قال اللّٰھُمّ

قبض روح کا وقت آیا تو آپ کا فرق مبارک حضرت عائشہؓ کی ران پر تھا۔ اس حالت میں آپ کو غش آگیا۔ جب افاقہ ہوا تو آپ کی نگاہ مبارک کاشانۂ عالیہ کی چھت کی طرف اٹھی اور فرمایا، اے اللہ

---

[۱] بخاری جلد دوم [illegible] [۲] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۱۸۱ [۳] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۶۲ [۴] ایضاً ایضاً

فی الرفیق الاعلیٰ فقلت اذاً لا یجاورنا۔[1] رفیق اعلیٰ میں۔ پس میں نے (حضرت عائشہؓ نے) کہا اب آپ ہمارے پاس نہیں رہنا چاہتے۔

اللھم صل علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آل سیدنا و مولانا محمد و بارک وسلم۔

ربیع الاول ۱۱ھ کی پہلی تاریخ تھی۔ دوشنبہ کا دن اور سہ پہر کا وقت تھا۔ عمر مبارک تریسٹھ سال سے آٹھ یوم کم تھی۔

تاریخ وفات عموماً سمجھا جاتا ہے کہ وفات ۱۲۔ ربیع الاول کو ہوئی اور "تاریخ ولادت بھی ۱۲۔ ربیع الاول ہی مانی جاتی ہے لیکن چھان بین کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں "تاریخیں محل نظر ہیں۔ "تاریخ ولادت پر تو دورِ حاضر میں اتفاق ہو چکا ہے یعنی ۹۔ ربیع الاول عام الفیل۔ یہاں تک کہ قاضی سلیمان مرحوم منصورپوری صاحب "رحمۃ للعلمین" نے اسے درست مانتے ہوئے متوازی عیسوی اور بکرمی تاریخیں بھی دے دی ہیں لیکن تاریخ وفات "قاضی صاحب مرحوم بھی ۱۲۔ ربیع الاول ہی مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی مرحوم نے جو کچھ تحریر فرما دیا ہے، اس میں تاحال کسی اضافے کی گنجایش محسوس نہیں ہوئی اور مرحوم جس نتیجے پر پہنچے، وہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مولانا کا استدلال تلخیصاً درج ذیل ہے:

چند امور پر محدثین اور ارباب سیر کا اجماع ہے:

ا ۔ سال وفات ۱۱ھ تھا۔

ب ۔ مہینا ربیع الاول کا تھا۔

ج ۔ یکم سے ۱۲۔ تک کوئی تاریخ تھی۔

د ۔ دن دوشنبہ کا تھا۔

پھر اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ۹۔ ذی حجہ ۱۰ھ (یوم وقوف عرفات) کو جمعہ تھا[2] اور اس دن سے وفات تک حضور صلعم اکاسی دن جیے۔

نقشۂ حساب اب حساب کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ ذی حجہ، محرم اور صفر تینوں مہینوں کو تیس تیس دن کے فرض کیا جائے۔ یہ صورت عموماً ممکن الوقوع نہیں۔ اگر واقع ہو تو دوشنبہ ۶۔ ربیع الاول کو ہوگا یا ۱۳۔ ربیع الاول کو۔

۲۔ ذی حجہ، محرم اور صفر تینوں مہینوں کو انتیس انتیس دن کے فرض کیا جائے ایسا بھی عموماً واقع نہیں ہوتا۔ اس

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی باب مرض النبی و وفاتہ۔ [2] صحیح بخاری سورۂ مائدہ۔ تفسیر آیہ الیوم اکملت لکم دینکم نیز کتاب الایمان باب زیادۃ الایمان و نقصانہ۔

صورت میں دوشنبہ ۲۔ ربیع الاول کو اور ۹۔ ربیع الاول کو ہوگا۔
باقی ممکن الوقوع صورتوں کا نقشہ یہ ہے:

صورت	دوشنبہ	دوشنبہ	دوشنبہ
ذی حجہ ۳۰۔ محرم و صفر ۲۹	۱	۸	۱۵
ذی حجہ و محرم ۲۹، صفر ۳۰	۱	۸	۱۵
ذی حجہ ۲۹، محرم ۳۰، صفر ۲۹	۱	۸	۱۵
ذی حجہ ۳۰، محرم ۲۹، صفر ۳۰	۷	۱۴	۲۱
ذی حجہ ۳۰، محرم ۳۰، صفر ۲۹	۷	۱۴	۲۱
ذی حجہ ۲۹، محرم و صفر ۳۰	۵	۱۴	۲۱

ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں سے صرف یکم ربیع الاول ہی صحیح اور قابل تسلیم ثابت ہوتی ہے۔ اس کی تصدیق مزید یوں بھی ہو سکتی ہے کہ یوم وقوف عرفات سے مہینوں کے طبعی دور کے مطابق حساب کر لیا جائے۔ ۹۔ ذی حجہ ۱۰ھ کو جمعہ تھا اور یکم ربیع الاول ۱۱ھ کو لازماً دوشنبہ ہوگا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حجۃ الوداع کے یوم وقوف عرفات سے وفات تک اکاسی دن ہوتے ہیں، اس حساب سے بھی دوشنبہ یکم ربیع الاول ہی کو آتا ہے۔

غرض یکم ربیع الاول ۱۱ھ ہی صحیح تاریخ وفات معلوم ہوتی ہے۔ اس کی متوازی عیسوی تاریخ ۲۵ یا ۲۶ مئی ۶۳۲ء نکلتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ صرف یہی صحیح ہے تاہم بظاہر حساب کے مطابق یہ تاریخ اس وقت تک مسلّم رہے گی جب تک قوی تر دلیل سے اس کا نقص واضح نہ ہو جائے۔ (مولف)

باب ۹

تجہیز و تکفین اور تدفین

مشکل اندر مشکل رسول اللہ صلعم کی وفات سے صحابہ کرام، جن میں اقربا سے حضور صلعم بھی شامل تھے اور وقت کی اسلامی دنیا پر جو قیامت گزری ہوگی، اس کا نقشہ الفاظ میں ٹھیک ٹھیک پیش کرنا مشکل ہے۔ ہمارے سامنے روایات کا خاصا بڑا ذخیرہ ہے، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس ناگہانی ضرب نے بعض کو انتہائی پریشان خاطری اور غیر معمولی اضطراب فکر و نظر میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یکایک کیا صورت پیش آگئی اور اس کے متعلق کیا سمجھا چاہیے۔ بعض روایتوں میں بعض اقربا کے "قلبی" تاثرات محفوظ کیے گئے ہیں۔ اشعار کے مجموعے ہیں جو حضور صلعم کی یاد میں کہے گئے، یقین ہے کہ بدرجہ کمال حزن و اندوہ کے ایسے مظاہرے بہت زیادہ وسیع اور دل افگار ہوں گے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اس سانحہ عظیمہ محزنہ پر قریباً چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور وہ دنیا یک قلم بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے جس میں حضور صلعم نے حیات طیبہ کے تریسٹھ سال بسر فرمائے تھے۔ بظاہر وحشت زدہ انبوہ کو جو فی الجملہ انسانیت کے شرف ہی نہیں انسانیت کے عام جوہروں سے بھی محروم تھا۔ مختصر سی مدت میں ایسی حق دوست، حق کیش اور حق شناس قوم بنا دیا تھا، جس کی کوئی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں پیدا کی جا سکی۔ ہم ان مظاہروں سے ایک حد تک آگاہ بھی ہو جائیں تو انھیں صحیح مقام و محل پر رکھنے میں یقیناً دقت پیش آئے گی۔

بدیہی حقیقتیں تاہم بدیہی حقیقتیں ہیں، جن سے دنیا کا کوئی بھی فرد انکار یا اختلاف نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ حس انصاف سے کاملاً محروم نہ ہو:

۱۔ جن شخصیتوں کے احوال و سوانح "تاریخ کے محافظ خانے" میں موجود ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی، جس کے ساتھ انسانوں کی کسی بڑی جماعت نے ولیسی والہانہ محبت کی ہو، جیسی صحابہ کرام نے رسول اللہ صلعم سے کی۔

۲۔ ایسی مثال تو کیا ملے گی، صحابۂ کرام نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جانی اور مالی قربانیوں کا جو درخشاں ہالہ قائم کر دیا تھا اس نوع کی چند جھلکیاں بھی کسی شخصیت کے دامن سے وابستہ نہیں پائی جا سکتیں۔

۳۔ رسول اللہ صلعم کے وجود اقدس میں ہر قسم کی بہترین انسانی محبوبیتیں بدرجہ کمال جمع ہو گئی تھیں۔ اسی وجہ سے یہ وجود کائنات انسانیت میں یگانگی و یکتائی کے درجے کا حامل ٹھہرا۔ سورج، چاند اور تاروں کی آنکھیں خدا جانے کب سے روئے زمین کی طرف نگراں چلی آتی ہیں۔ یہ آنکھیں ایسے یگانہ وجود کے نظارے سے

نہ پہلے ضیاگیر ہوئی تھیں اور نہ بعد میں قیامت تک ایسی کوئی جھلک پا لینے کا امکان ہے۔ اسی طرح کسی وجود کے ساتھ عشق و محبت کا حق بوجہ احسن ادا کرنے والے بھی صحابہ کرام کے سوا کہیں نہ ملیں گے۔

۴۔ دنیوی دولت وحشمت کی خاطر بے شمار لوگوں نے بادشاہوں، سالاروں، سلطنت آراؤں بلکہ قزاقوں تک سے رشتۂ تعلق استوار کیا اور ایسے تذکروں سے تاریخ کے صفحات اب تک خونچکاں چلے آتے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق میرزا غالب کا یہ قول بے اختیار ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے:

وہ کہ زہر چہ ناسزا است ہم بہ سزا نہ کردہ ایم

لیکن صحابہ کرام کے سامنے دنیوی دولت وحشمت نہ تھی بلکہ جو تھوڑی بہت دولت اور جائداد ان کے پاس تھی اس کی بھی قربانی ناگزیر معلوم ہوتی تھی۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ کلمۂ حق سربلند ہو۔ عالم انسانیت دنیا اور عقبیٰ کی فلاح کے راستے پر استوار ہو جائے۔ اس نصب العین کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ بے دریغ قربان کر ڈالا۔ ہر سختی، ہر شدت، ہر مصیبت اور ہر آفت ان کے رہوار عشق کے لیے مہمیز بنتی گئی یہاں تک کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ گئے اور اس عزم مرام کی شہادت زمین و آسمان دے چکے ہیں۔

۵۔ صحابہ کرام نے اس نصب العین کی خاطر رسول اللہ صلعم کی قیادت میں زخموں پر زخم کھائے، مال لٹائے، سر کٹوائے۔ یہ سب کچھ مجبوری اور بے چارگی کی حالت میں قبول نہ کیا بلکہ انتہائی شوق، رضا اور معجز نما خوشدلی کے ساتھ اس خارزار کو تختۂ گل سمجھ کر گزر گئے۔ کیا ان کی محبتِ رسولؐ کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے؟

۶۔ صحابۂ کرام کے سامنے ایمان کا یہ پیمانہ تھا جو ان کے محبوب صلعم نے مقرر فرما دیا تھا:

والذی نفسی بیدہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک میری ذات اس کے نزدیک باپ، بیٹے اور دنیا بھر کے لوگوں سے محبوب تر نہ ہو جائے۔

(بخاری، کتاب الایمان)

صحابۂ کرام میں سے ایک ایک فرد نے اس پیمانے پر پورا اترنے میں اپنی استطاعت کے مطابق کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ ان کے ملیے رسول اللہ صلعم کی وفات نے جو حالت پیدا کر دی ہوگی اس کا تصور بھی ہم لوگ نہیں کر سکتے۔

اس حزن انگیز حادثۂ فاجعہ پر غور و فکر کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ہم لوگوں میں اور صدر اول کے مسلمانوں میں چودہ سو سال کا بعد زمانی حائل ہے۔ ہم اسلامیت حقہ کے اکثر حقیقی جوہر ایک ایک کر کے کھو چکے ہیں۔ اگر ہم اپنے ادعائے اسلامیت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور اس ادعا کے مطابق عمل کی متاع دوسرے پلڑے میں ڈال دیں تو کیا

دونوں پلڑوں میں توازن پیدا ہوجانے کی کوئی امید رکھی جا سکتی ہے ؛ حقایق کی دنیا میں دعووں کی کیا حیثیت ہے ؟ اصل شے عمل ہے اور اس کا جو حال ہے وہ محتاج بیان و تصریح نہیں۔ تاہم اس گئی گزری حالت میں بھی رسول اللہؐ کا اسم گرامی گوش زد ہو تو تڑپ اٹھتے ہیں۔ ہم میں سے ہر عالم و عامی اور اعلیٰ و ادنیٰ کا ساز وجود درود و سلام کے ترانوں سے لبریز ہوجاتا ہے اور ہم میں سے ہر فرد اپنا سب کچھ اس نام کی آبرو کے لیے قربان کر دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

غور کیجیے کہ جب رنج افزا بے عملی کے باوجود اس پاک ذات سے ہماری محبت و شیفتگی کا یہ عالم ہے تو ان مقدس ہستیوں کی کیا کیفیت ہوگی، جنھیں اس سراپا رحمت وجود اقدس کے ظل عاطفت میں لیل و نہار کے بیش بہا اوقات گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی ؟ ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ حضور صلعم کی وفات سے ان پر کیا گزری ہوگی ؟

بعض روایتوں میں حضرت عمرؓ کی کیفیت خصوصیت سے بیان کی گئی ہے، مثلاً :

۱۔ حضرت عایشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ اور مغیرہؓ بن شعبہ نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ دونوں نے آپ کے چہرۂ مبارک سے چادر ہٹائی۔ حضرت عمرؓ بے اختیار بولے:

و اغشیا! ما اشدّ غشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1] ہائے غشی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غشی کس قدر سخت ہے۔

۲۔ واپسی میں دروازے پر پہنچے تو مغیرہؓ نے کہا، عمرؓ، خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، تم جھوٹے ہو رسول اللہ صلعم نے وفات نہیں پائی، تم ایسے شخص ہو جنھیں فتنہ شکار کر لیتا ہے[2]

۳۔ عکرمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ آپ کی رُوح کو معراج ہوئی ہے، جیسے حضرت موسیٰؑ کی رُوح کو معراج ہوئی تھی، حضرت عمرؓ بھی یہی کہتے تھے[3]

۴۔ انسؓ بن مالک کہتے ہیں جب رسول اللہ صلعم کی وفات ہوئی تو لوگ رونے لگے، حضرت عمرؓ خطیب بن کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں کسی کو یہ کہتے نہ سنوں گا کہ رسول اللہ صلعم وفات پا گئے، انھیں بلایا گیا ہے، جس طرح حضرت موسیٰؑ کو بلایا گیا تھا اور وہ اپنی قوم سے چالیس راتیں غائب رہے تھے[4]

---

[1] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۶۷ [2] ایضاً ایضاً [3] ایضاً ص ۲۶۶ [4] ایضاً ایضاً

یہ طبقات ابن سعد کی روایتیں ہیں۔ ان پر تعجب نہ ہونا چاہیے محبت کی فراوانی بعض اوقات مختلف اصحاب کے لیے امتحان و آزمائش کا باعث بن جاتی ہے۔ جو آنکھیں محبوب صلعم کے جمال اقدس کی عادی ہو چکی تھیں۔ جو کان محبوب صلعم کے لب جاں بخش سے حقیقی زندگی کے پیغامات سنتے رہے تھے[1] ان کے لیے یکایک محبوب سے مفارقت کی منزل پیش آ گئی تو ان کے لیے ہوش و حواس بحال رکھنا مشکل ہو گیا۔ ان کی رہنمائی کے لیے حضرت صدیق رضؓ کو اللہ تعالیٰ نے چن رکھا تھا اگرچہ وہ سب سے زیادہ رقیق القلب تھے۔ رسول اللہ صلعم کے ساتھ محبت میں بھی ان کا درجہ سب پر فایق تھا۔ بایں ہمہ یہ بھی جانتے تھے کہ جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلعم کو دنیا میں بھیجا تھا، اسے محفوظ و مصون رکھنا اور آگے بڑھانا ہر مصلحت پر مقدم ہے۔ حضرت صدیق رضؓ ہی کی رہنمائی نے سب کے لیے روشنی مہیا کی اور کاروان حق از سر نو وہ منزلیں طے کرنے لگا، جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے رسول پاک کی خوشنودی کے عین مطابق تھیں۔

حضرت فاطمہ رضؓ کا حزن

تمام اقربا و صحابہ کی حالت ناقابل بیان تھی لیکن حضرت فاطمہ رضؓ کے حزن و اندوہ کا معاملہ سب سے الگ تھا۔ آپ کی زبان مبارک پر یہ دلدوز کلمات جاری تھے:

آہ! پیارے باپ نے پروردگار کی دعوت قبول کر لی۔

آہ! پیارے باپ نے جنت الفردوس کو ٹھکانا بنا لیا۔

آہ! پیارے باپ! ہم جبریلؑ کو آپ کی وفات کی خبر سناتے ہیں[2]۔

آہ! پیارے باپ! اپنے پروردگار سے کس قدر قریب ہو گئے۔

جب رسول اللہ صلعم کو دفن کیا جا چکا تو حضرت فاطمہ رضؓ نے انس رضؓ بن مالک سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اے انس رضؓ! کیا تم نے بہ طیب خاطر قبول کر لیا کہ رسول اللہ صلعم پر مٹی ڈالو؟[3]

ابو جعفر رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد کسی نے حضرت فاطمہ رضؓ کو ہنستے نہ دیکھا، سوائے اس کے دہن مبارک کا کنارہ کسی قدر کھل گیا ہو[4]

دو شعر بھی حضرت فاطمہ رضؓ سے منسوب ہیں:

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّہَا ۔۔۔ صُبَّتْ عَلَی الایام صرن لیالیا

---

[1] خود قرآن مجید کا ارشاد ہے یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ۔ (ایمان والو! اللہ کی اور رسول کی پکار کا جواب دو۔ جب وہ پکارتا ہے کہ تمھیں (روحانی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کر دے۔ انفال ۲۴)

[2] صحیح بخاری کتاب المغازی، باب مرض النبی صلعم و وفاتہ۔ [3] ایضاً ایضاً [4] ایضاً ایضاً

(مجھ پر ایسی مصیبتیں آپڑی ہیں کہ اگر دنوں پر پڑ جاتیں تو وہ راتیں بن جاتے)

مَا ذا علیٰ من شَمّ تربۃ احمدًا ۔۔۔ انْ لا یَشمّ مُدی الزمان غوالیا

(جو کوئی احمد صلعم کی تربت سونگھ لے اس پر کیا لازم ہے؟ یہ کہ پھر عمر بھر کوئی خوشبو نہ سونگھے)

حضرت عائشہؓ کی زار حالی

حضرت عائشہؓ یا دوسری ازواج مطہرات کے اندوہ وقلق کی کیفیت الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ حضرت ممدوحہ کی زبان مبارک صرف خصائص نبوت کی ترجمانی کے لیے وقف تھی:

آہ! وہ نبی جس نے تمول پر فقیری کو ترجیح دی۔ جس نے تونگری کو ٹھکرایا اور مسکینی قبول کی۔

آہ! وہ دین پرور رسولؐ جو امت عاصی کے غم میں پوری ایک رات بھی آرام سے نہ سویا۔

آہ! وہ صاحب خلق عظیم جو مسلسل نفس سے جنگ آزما رہا۔

آہ! وہ رحمۃ للعلمین جس کا باب فیض فقیروں اور حاجت مندوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ جس کا رحیم دل اور پاک ضمیر دشمنوں کی ایذا رسانی سے کبھی غبار آلود نہ ہوا۔

آہ! وہ نبی جس کے موتی جیسے دانت توڑے گئے، مگر اس نے پھر بھی صبر سے کام لیا۔ جس کی نورانی پیشانی کو زخمی کیا گیا، مگر اس نے دامن عفو ہاتھ سے نہ دیا۔

حضرت ابوبکرؓ کی استقامت

وفات کے حادثۂ فاجعہ نے سب کے ہوش وحواس پر بجلی گرا دی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا ہوگا اور آیندہ کیا ہونا چاہیے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ صبح کی نماز کے بعد حضور صلعم کی طبع مبارک بظاہر بہتر دیکھ کر سُنح چلے گئے تھے۔ وہ وفات کی خبر سن کر آئے تو مسجد اور حجرۂ عائشہ میں قیامت برپا تھی۔ انتہائی رقت قلب کے باوجود اب حضرت ابوبکرؓ استقامت واستواری کی چٹان تھے، کیونکہ اب اس متاع عزیز وکریم کا تحفظ سب سے پہلا کام تھا، جو رسول اللہؐ امت کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

اس باب میں متعدد روایتیں ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ معمول کے مطابق رسول اللہ صلعم کے پاس جانے کے لیے اجازت طلب کی۔ لوگوں نے کہا کہ آج آپ کے پاس جانے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ وہ بولے: تم سچ کہتے ہو۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اندر آتے ہی چہرۂ مبارک سے چادر ہٹائی اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ پھر کہا: واللہ رسول اللہ کی وفات ہو گئی۔ پھر وہ آپ کے سر کی طرف سے ہٹ گئے اور کہا "یا نبی"، منہ جھکایا اور آپ کے چہرے کو بوسہ دیا۔ پھر کہا: "وا خلیل"، منہ جھکایا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر کہا: "وا صفی"، منہ جھکایا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر چادر اڑھا کر باہر چلے گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ چہرہ مبارک کھول کر بوسہ دیا اور روئے۔ ساتھ ہی کہا: میرے ماں باپ آپ پہ فدا ہوں۔ خدا کی قسم آپ پہ اللہ دو موتیں کبھی جمع نہ کرے گا۔ جو موت آپ کے لیے لکھی جا چکی تھی اس کا ذائقہ آپ نے چکھ لیا اب ابد تک موت آپ کا دامن نہ چھو سکے گی۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت صدیقؓ نے یہ بھی کہا: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آپ کی زندگی بھی کتنی پاکیزہ تھی اور موت بھی کتنی پاکیزہ ہے۔

مسجد میں خطبہ مسجد میں پہنچے تو حضرت عمرؓ وہی باتیں کہہ رہے تھے جو اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: عمرؓ! چپ ہو جاؤ۔ پھر منبر پر چڑھے، حمد و ثنا کے بعد سب سے پہلے یہ آیت پڑھی:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (زمر: ۳۰) تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔

پھر فرمایا:

تم میں سے جو شخص محمد صلعم کی عبادت کرتا تھا تو محمد صلعم تو وفات پا گئے اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ (آل عمران: ۱۴۴)

محمدؐ اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں، ان سے پہلے بھی اللہ کے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم راہِ حق سے اُلٹے پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی راہِ حق سے لٹے پاؤں پھر جائے (تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا) خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ جو لوگ شکر گزار ہیں (یعنی نعمتِ حق کی قدر سمجھنے والے ہیں) وہ وقت دور نہیں کہ خدا انھیں ان کا اجر عطا فرمائے۔

اس مختصر سے خطبے نے سب کو رسول اللہ صلعم کی وفات کا یقین دلا دیا۔ جنھیں احساس تھا کہ حضورؐ اس دنیا سے رحلت فرما گئے، مثلاً مغیرہؓ بن شعبہ یا حضرت عباسؓ۔ وہ بھی اسے خطبے کے بعد منزل یقین پر پہنچے۔ بعض نے تو اعتراف کیا کہ جب تک ابوبکرؓ نے یہ آیت نہیں پڑھی تھی، اس وقت تک احساس نہ تھا کہ یہ آیت بھی نازل ہو چکی ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ آیت سنی تو کہا کہ میرے پاؤں ٹوٹ گئے اور کھڑے رہنے کی تاب مجھ میں نہ رہی۔ یقین ہو گیا کہ واقعی رسول اللہ صلعم اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔[1]

---

[1] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۷۰۔

تجہیز و تکفین

ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے خود فرما دیا تھا کہ میرے قریبی عزیز مجھے غسل دیں گے اور وہی قبر میں اتاریں گے۔[1]

ہر انسان کے متعلق یہی آخری مراسم کی بجا آوری طبعاً اقربا ہی کا حق ہے لیکن اس ارشاد گرامی میں ایک خاص مصلحت بھی تھی۔ اگر یہ نہ فرمایا جاتا تو ہر فرد شرکت پر اصرار کر سکتا تھا کیونکہ غسل اور دوسرے مراسم کی برکات و حسنات محتاج تصریح نہیں اور کون ان برکات سے بے نیاز ہو سکتا تھا؟ یاد ہوگا کہ جب رسول اللہ صلعم ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تھے تو ہر قبیلے اور محلے کو اصرار تھا کہ حضور صلعم انھیں شرف قیام سے مشرف فرمائیں لیکن آپ نے فیصلہ فرما لیا تھا کہ اپنے جد امجد کے ننھیال میں ٹھہریں گے اس طرح کسی کے لیے شکایت کی گنجایش نہ رہی اور جد امجد کے ننھیال کے لیے بھی حضور صلعم کا قیام اگرچہ بجائے خود بہت شرف و امتیاز کا باعث تھا تاہم حضور صلعم صرف پرانی رشتہ داری کی بنا پر ان کے ہاں ٹھہرے تھے نہ کہ کسی دوسری خصوصیت کے باعث۔ یہی وجہ ہے کہ جب انصار نے اصرار کیا کہ رسول اللہ صلعم کی خدمت گزاری میں ہمارا بھی حصہ ہے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اس بارے کسی کا کوئی حق نہیں۔

بہرحال سہ شنبہ کے روز آپ کو غسل دیا گیا۔ غسل دینے والے حضرت علیؓ تھے۔ فضلؓ بن عباسؓ اور اسامہؓ بن زید نے پردہ کر رکھا تھا۔ حضرت عباسؓ بھی موجود تھے۔ حضور صلعم کے آزاد کردہ غلام شقران پانی لا رہے تھے۔ امام ابن حزم نے قثم بن عباسؓ کا ذکر بھی کیا ہے۔[2] حضرت علیؓ نے اوسؓ بن خولی انصاری کو بھی اندر بلا لیا تھا، جو بدری تھے۔

غسل کے بعد تین سوتی چادروں میں آپ کو کفنایا گیا، جو سحول[3] کی بنی ہوئی تھیں۔

مقبرہ

صحابہ کے درمیان قبر کے متعلق مشورہ ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا، نبی وہیں دفن ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کی ہو۔ لہٰذا حضرت عائشہؓ کے مکان کے جس حصے میں آپ کی وفات ہوئی تھی، اس جگہ سے بستر ہٹا کر قبر کا انتظام کیا گیا۔ مدینہ منورہ میں اس وقت قبر کھودنے کے ماہر دو تھے۔ ایک ابوعبیدہؓ بن الجراح، دوسرے ابوطلحہؓ انصاری۔ ابوعبیدہ بن الجراح اہل مکہ کے دستور کے مطابق صندوقی قبر کھودتے تھے۔ ابوطلحہؓ اہل مدینہ کے رواج کے مطابق لحدی قبر تیار کرتے تھے۔ دونوں کو پیغام بھیج دیا گیا اور فیصلہ یہ ٹھہرا کہ جو پہلے پہنچ جائے اسی کو قبر کھودنے پر لگا دیا جائے۔ اتفاق سے ابوطلحہؓ پہلے پہنچ گئے۔ انھوں نے لحدی قبر کھودی۔ چونکہ زمین میں کسی قدر نمی محسوس ہوتی تھی، اس لیے آپ کا بستر یا وہ چادر جو آپ اوڑھا کرتے تھے شقرانؓ نے لحد میں بچھا دی۔

---

[1] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۵۷ [2] جوامع السیرۃ ص ۲۶۵ [3] یمن کا ایک مقام جہاں بافت کا کام اچھا ہوتا تھا۔

حجرے کے اندر قبر رکھنے میں ایک مصلحت بھی خدا نے پوری کر دی۔ اگر قبر کھلے میدان میں ہوتی تو عوام کی پرستش عقیدگی خدا جانے کیا کیا رنگ لاتی۔ حجرے کے اندر ایسا کوئی امکان نہ تھا۔ پھر رسول اللہ صلعم کی وفات سے چھیالیس سال پانچ مہینے اور سترہ روز بعد حضرت عائشہؓ کی وفات ہوئی۔ (۱۷ رمضان ۵۸ھ مطابق ۲۴ جولائی ۶۷۸ء) اس پوری مدت میں حضرت عائشہؓ سے اجازت حاصل کیے بغیر کوئی شخص اندر نہیں آ سکتا تھا باہر ہی سے دعا مانگ کر لوگ چلے جاتے تھے۔

جنازہ اور تدفین

جنازہ حجرے سے باہر نہیں کیا جا سکتا تھا اور حجرے میں اتنی جگہ نہ تھی کہ امام کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی جاتی، صرف دس آدمی کھڑے ہو سکتے تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ پہلے مردوں کی جماعتیں باری باری الگ الگ نماز ادا کریں۔ پھر عورتوں کو اور ان کے بعد بچوں کو موقع دیا جائے۔

طبقات ابن سعد میں جنازے کے متعلق ایک ارشاد رسول اللہ صلعم سے منسوب ہے۔ فرمایا: غسل و کفن کے بعد میرا جنازہ قبر کے کنارے رکھ دینا اور تھوڑی دیر کے لیے باہر ہو جانا، کیونکہ سب سے پہلے جبریلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ اور ملک الموت (عزرائیلؑ) ملائکہ کے ساتھ نماز جنازہ ادا کریں گے، پھر ایک ایک ہو کر اندر آنا اور مجھ پر صلوٰۃ و سلام پڑھنا۔ پہلے مجھ پر میرے عزیز مرد نماز پڑھیں، پھر ان کی عورتیں، پھر اور لوگ[1]۔ اس وجہ سے تدفین میں دیر ہوئی۔

قبر میں حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ، اسامہؓ بن زیدؓ اور اوسؓ بن خولی انصاری اترے۔ سہ شنبہ کی شب میں (جسے عرب میں چہار شنبہ کہا جاتا ہے) تدفین سے فراغت ہوئی۔

سب کے بعد الگ ہونے والا

مغیرہؓ بن شعبہ نے آخری وقت میں اپنی انگوٹھی دانستہ قبر کے اندر ڈال دی نیز کہا کہ حضور صلعم کے پلنگ مبارک کی طرف کچھ کسر معلوم ہوتی ہے اسے درست کر دینا ضروری ہے۔ چنانچہ مغیرہؓ ہی سے کہا گیا کہ وہ انگوٹھی بھی نکال لے اور درستی بھی کر دے۔ اس کام سے فارغ ہو کر مغیرہؓ نے کہا کہ اب مٹی ڈالنا شروع کرو۔ جب مٹی مغیرہؓ کی پنڈلیوں کے نصف تک پہنچ گئی تو وہ باہر نکلے۔ بعد میں کہا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارا اور سب لوگوں کے بعد حضور صلعم سے الگ ہوا[2]۔ (مولف)

---

[1] طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۲۵۷ [2] ایضاً ص ۳۰۲ ـ ۳۰۳

اُسوۂ محمدیؐ

باب ۱۹

شمائل و معمولات

حلیۂ مبارک رسول اللہ صلعم میانہ قامت اور موزوں اندام تھے۔ آپ کی بناوٹ بدرجہ غایت خوبصورت تھی۔ رنگ چمکتا ہوا سُرخی مائل سفید، نہ زیادہ سفید، نہ زیادہ گندم گوں، پیشانی چوڑی، ابرو پیوستہ، بینی مبارک مائل بہ درازی تھی۔ چہرۂ اقدس کھڑا کھڑا تھا یعنی زیادہ پُرگوشت نہ تھا۔ ساتھ ہی بہت خوب صورت تھا۔ دہانہ کشادہ، دندانِ مبارک ملے ہُوئے نہ تھے۔ گردن لمبی، سر بڑا، سینہ کشادہ جس پر ناف مبارک تک بالوں کی ہلکی سی تحریر تھی۔ سر کے بال نہ زیادہ گھنگریالے تھے اور نہ زیادہ سیدھے۔ ریش مبارک گھنی تھی۔ آنکھیں سیاہ اور سرمگیں، پلکیں بڑی بڑی، شانے پرگوشت، مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں۔ شانوں اور کلائیوں پر بال تھے۔ ہتھیلیاں پُرگوشت اور چوڑی، کلائیاں لمبی، ایڑیاں نازک اور ہلکی۔ تلوے بیچ سے اتنے خالی تھے کہ ان کے نیچے سے پانی نکل جاتا تھا۔[۱]

جب آپ خوش ہوتے تو چہرۂ مبارک میں ایک خاص چمک دمک رونما ہو جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ چاند کا ٹکڑا ہے اور صحابۂ کرام چہرہ دیکھتے ہی آپ کی خوشی کا اندازہ کر لیتے تھے۔[۲] پسینے میں ایک خاص خوشبو تھی۔ جب پسینہ آتا تو معلوم ہوتا چہرۂ مبارک پر موتی لڑھک رہے ہیں۔ انس رض کہتے ہیں کہ میں نے کسی ریشم اور دیبا کو نہیں چھُوا جو رسول اللہ صلعم کی ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو اور کوئی ایسی خوشبو نہیں سُونگھی جو رسول اللہ صلعم کی خوشبو سے بہتر ہو۔[۳]

رُبیّع بنت معوذ نے عمار بن یاسر کے پوتے سے کہا کہ اگر تو رسول اللہ صلعم کو دیکھ لیتا تو سمجھتا کہ سورج نکل آیا ہے۔ جابر بن سمرہ رض کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ چاندنی رات تھی۔ رسول اللہ صلعم سرخ حلّہ اوڑھے ہُوئے بیٹھے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا، کبھی آپ کو۔ آخر میں نے یہی سمجھا کہ حضور صلعم چاند سے زیادہ خوب صورت ہیں۔

واضح رہے کہ یہ ان مقدس ہستیوں کے بیانات ہیں جو صداقت و راست بازی کے پیکر تھے۔

لباس عام لباس چادر، قمیص اور تہمد تھا۔ پاجامہ کبھی استعمال نہ فرمایا۔ موزے پہننے کی عادت نہ تھی۔ ایک مرتبہ نجاشی شاہ حبش نے سیاہ موزے تحفۃً بھیجے تھے جو بظاہر چرمی تھے۔ انھیں آپ نے استعمال فرمایا۔ عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا اس کے نیچے سر سے ملی ہوئی ٹوپی پہنتے۔ عمامے کا شملہ کبھی دوشِ مبارک پر اور کبھی دونوں شانوں کے درمیان رہتا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی عمدہ لباس بھی زیب بر فرمایا۔ یقیناً اس

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۱۹۲ نیز بخاری کتاب المناقب [۲] بخاری کتاب المناقب [۳] ایضاً ایضاً

وجہ سے کہ ہدیتہً آیا اور پہن لیا تاکہ عمدہ لباس کے جواز میں کوئی شبہ نہ رہے تاہم طبع مبارک دینوی آرائش کے سامانوں سے اجتناب کی طرف مائل تھی ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کا لباس کبھی تہ کرکے نہ رکھا گیا ۔ یعنی ایک ہی جوڑا ہوتا جسے دھو دھو کر پہنتے رہتے ۔ ایک سے زیادہ جوڑے ہوتے تو انھیں تہ کرکے رکھنے کی نوبت آتی ۔

آپ کا ارشاد ہے کہ فرزند آدم کو ان چند چیزوں کے سوا کسی کا حق نہیں ، رہنے کے لیے گھر ، پہننے کے لیے کپڑا اور شکم سیری کے لیے روکھی سوکھی روٹی اور پانی ۔ جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی ، ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے ۔

بایں ہمہ نظافت پسندی کی یہ کیفیت تھی کہ طبع اقدس کو گوارا نہ تھا ، کوئی میلا لباس پہنے ۔ کپڑا اعلیٰ درجے کا ہو یا معمولی درجے کا ، تاہم اسے پاک صاف رکھنا مشکل نہیں تاکہ مجلس میں بیٹھنا کسی کے لیے ناخوشگواری کا باعث نہ ہو ۔

غذا زہد و ایثار کے باعث آپ نے کبھی پُر تکلف اور لذیذ کھانا نہ کھایا ۔ البتہ چند چیزیں آپ کو مرغوب تھیں ۔ مثلاً سرکہ ، شہد ، حلوا اور روغن زیتون ۔ کدو کو بہت پسند فرماتے تھے ۔ گھی اور پنیر میں کھجور ڈال کر ایک کھانا پکایا جاتا تھا جسے حیس کہتے تھے ۔ یہ بھی مرغوب تھا ۔ آپ نے دُنبے ، مُرغ ، بٹیر ، بکری ، بھیڑ ، اونٹ ، گورخر ، خرگوش اور مچھلی کا گوشت تناول فرمایا ۔ دست کا گوشت اس وجہ سے بھی پسند تھا کہ جلد گل جاتا تھا ۔ ٹھنڈا پانی بھی مرغوب تھا ۔ بعض اوقات کشمش ، کھجور یا انگور پانی میں بھگو دیتے اور وہ پانی نوش فرماتے ۔ پتلی ککڑیاں بھی کھائیں ، جو تحفے کے طور پر آپ کے پاس آئی تھیں ۔

کھانا کوئی بھی ہوتا اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہ فرماتے ۔ اگر کوئی شے مرغوب نہ ہوتی تو اسے تناول نہ کرتے ۔ میز پر کھانا ثابت نہیں ۔ اہل عجم میں خوان پر کھانے کا دستور تھا اسے بھی ایک قسم کی میز ہی سمجھنا چاہیے جو زمین سے ذرا اونچی ہوتی تھی ۔ حضور صلعم نے اسے بھی فخر و امتیاز کی علامت سمجھ کر پسند نہ فرمایا ۔ کھانا دست راست کی تین انگلیوں سے نوش فرماتے ۔ گوشت چھری سے کاٹ کر بھی کھانا ثابت ہے[1] ۔ بُودار چیزوں مثلاً پیاز ، لہسن اور مولی سے نفرت تھی ۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جو شخص لہسن پیاز کھائے وہ ہمارے پاس یا ہماری مسجد میں نہ آئے ۔ مولانا شبلی مرحوم نے مسلم ، نسائی اور ابن ماجہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے زمانۂ خلافت میں خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا کہ تم لوگ لہسن اور پیاز کھا کر مسجد میں آجاتے ہو ، حالانکہ میں نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا ، یہ چیزیں کھا کر آنے والے کے متعلق حکم دے دیتے کہ اسے مسجد سے نکال کر بقیع پہنچا دیا جائے[2] ۔

---

[1] صحیح بخاری ، کتاب الاطعمہ ، نیز کتاب الوضو ، سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۰۰ ، باقی بیانات کے لیے بھی زیادہ تر استفادہ سیرۃ النبی ہی سے کیا گیا ۔ [2] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۰۷

پسند و ناپسند سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ حضور صلعم کے ہاں اکثر فاقہ رہتا۔ جامع ترمذی کا بیان ہے،

آپ اور آپ کے اہل و عیال متصل کئی کئی رات بھوکے رہ جاتے تھے، کیونکہ رات کو کھانا میسر نہیں آتا تھا۔[1]

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ پانی اور کھجوروں پر گزارا ہوتا تھا۔ ہمسایے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تو وہ پی لیتے۔[2] کبھی دودھ خالص نوش فرماتے، کبھی اس میں پانی ملا لیتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مدینہ منورہ میں قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہ کھائی۔[3]

گفتگو گفتگو نہایت شیریں اور دل آویز تھی۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے۔ ایک ایک فقرہ الگ ہوتا۔ معمول تھا کہ ایک ایک بات تین تین دفعہ فرماتے۔ جس بات پر زور دینا منظور ہوتا اس کا اعادہ بار بار کرتے۔ حالتِ گفتگو میں اکثر نگاہ آسمان کی طرف رہتی۔ آواز بلند تھی۔ بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے۔ ہاتھ سے اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ اٹھاتے۔ کسی بات پر تعجب کرتے تو ہتھیلی کا رُخ پلٹ دیتے۔ تقریر میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ مسرت کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی ہو جاتیں۔ ہنستے بہت کم تھے۔ ہنسی آتی تو مسکرا دیتے۔ یہی آپ کی ہنسی تھی۔ آپ کبھی اس زور سے نہ ہنستے کہ ڈاڑھ کے دانت نظر آئیں۔[4]

حضور صلعم کا ہر ارشاد ہر حال میں محفوظ ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ ہر ارشاد اجزائے دین میں سے تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ارشادات اس وجہ سے بھی محفوظ کر لینے میں سہولت پیدا ہوئی کہ آپ کا اندازِ گفتار حفظ کے لیے بطور خاص ساز گار تھا۔ حضور صلعم کا مقصود جس طرح یہ تھا کہ سننے والے فائدہ اٹھائیں۔ اسی طرح یہ بھی تھا کہ حاضرین جو کچھ سنیں، غائبین کے لیے، جن میں آنے والی نسلیں بھی شامل تھیں، محفوظ کر لیں۔ کلام میں آورد قطعاً معلوم نہیں ہوتی تھی اور اس کے زور، تاثیر و نفوذ کا یہ عالم تھا کہ جاہل مخالفین حضور صلعم کے کلام کی گیرائی اور جاذبیت کی کوئی اور توجیہ نہ کر سکتے تو کہہ دیتے یہ تو سحر اور جادو ہے۔

حضور صلعم کی حیات طیبہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ حضور صلعم نے حیات طیبہ کے تین حصے کر لیے تھے۔ ایک عبادت الٰہی کے لیے، دوسرا عام خلق کے لیے اور تیسرا اپنی ذات کے لیے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو حصہ عام خلق کے لیے تھا، وہ بھی عین عبادت الٰہی تھا اور جو حصہ ذات کیلئے تھا، وہ غالباً سب سے کم تھا، اسے بھی عبادت الٰہی ہی سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اس سے بھی یہی دکھانا مقصود تھا کہ

---

[1] سیرۃ النبی جلد اوّل حصہ دوم ص ۲۵۰ [2] بخاری کتاب الہبہ [3] بخاری کتاب الرقاق [4] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۱۹۸-۱۹۹

خدا کے نیک بندوں کا طریقِ زندگی کیا ہونا چاہیے اور اسے کیونکر پورا کیا جاتا ہے۔

عادت شریف یہ تھی کہ صبح کی نماز سے فارغ ہو جاتے تو مسجد ہی میں تشریف رکھتے۔ وہیں لوگ پاس آ بیٹھتے۔ اسی مجلس میں مواعظ و نصائح بھی فرماتے۔ لوگوں کے خوابوں کی تعبیر بھی کی جاتی۔ حضور صلعم اپنا کوئی خواب بھی سناتے۔ ہنسی خوشی کی باتیں بھی ہوتیں۔ شعر بھی پڑھے جاتے۔ کچھ دن چڑھ آتا تو چاشت کی چار یا آٹھ رکعتیں پڑھتے۔ پھر خانۂ مبارک میں تشریف لے جاتے۔ وہاں پہنچ کر کوئی کپڑا پھٹا ہوتا تو سی لیتے۔ جوتا ٹوٹ جاتا تو گانٹھ لیتے۔ بکری کو دوہ لیتے۔ خادم کو اس کے کام میں مدد دیتے۔ بازار سے ضروری چیز خود جا کر خرید لاتے۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ اور خرد و بزرگ کو سلام میں پہل فرماتے۔ بڑے چھوٹے اور غلام و آقا میں کوئی فرق نہ تھا۔ کوئی معمولی سا فرد بھی دعوت کرتا تو خوش دلی سے منظور فرما لیتے اور جو کھانا سامنے آتا کھا لیتے۔ خادم کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ آٹا گوندھنے میں اسے مدد دیتے۔ گھر کی صفائی بہ نفیس کر لیتے۔

نمازِ عصر کے بعد تھوڑے وقت کے لیے تمام ازواجِ مطہرات کے ہاں جاتے۔ پھر جس کے ہاں رات ٹھہرنے کی باری ہوتی، وہاں تشریف لے جاتے۔ تمام ازواج وہیں جمع ہو جاتیں۔ عشاء تک یہ صحبت رہتی۔ نمازِ عشاء کے بعد استراحت فرماتے۔ ازواج رخصت ہو جاتیں۔ نمازِ عشاء کے بعد بات چیت پسند نہیں فرماتے تھے۔

خوابِ استراحت

استراحت سے پیشتر معمول تھا کہ قرآن مجید کی کوئی سورت ضرور پڑھتے۔ پھر یہ الفاظ فرماتے،

اللّٰھم باسمك اموت و احییٰ۔ — اے اللہ تیرا نام لے کر مرتا ہوں اور تیرا نام لے کر زندہ ہوتا ہوں۔

گویا خواب کو موت کے مشابہ قرار دیا۔

بیدار ہوتے تو فرماتے،

الحمد لِلّٰہِ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور۔ — حمد و سپاس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں موت کے بعد زندہ کیا (یعنی پہلے سلایا، پھر جگایا) اور موت کے بعد زندہ ہو کر سب کو اسی طرف جانا ہے۔

کبھی معمولی بستر پر سو جاتے، کبھی کھال پر، کبھی چٹائی پر اور کبھی زمین پر آرام فرماتے۔ معمول یہ تھا کہ داہنی کروٹ سوتے اور دایاں ہاتھ رخسار مبارک کے نیچے رکھ لیتے۔ ابتدا میں اتنی نمازیں پڑھیں کہ پائے مبارک پر ورم آ گیا۔ اس وقت تک آپ کے لیے قیام لیل فرض تھا۔ جب یہ قیام محض نفل رہ گیا تو آپ شب میں گیارہ رکعتیں پڑھتے۔ آٹھ منفصل اور ان میں سے صرف آخری میں قعدہ کرتے، پھر ایک اور رکعت پڑھ کر بیٹھتے، آخر میں دو رکعت پڑھ لیتے۔ عمر زیادہ ہو گئی تو ان میں سے دو رکعتیں کم کر دی تھیں۔

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نماز عشا کے بعد گھر آکر چار رکعتیں پڑھتے اور سو جاتے۔ مسواک نیز وضو کے لیے پانی رکھ دیا جاتا۔ شب میں اٹھتے تو مسواک کے بعد وضو کرتے۔ پھر نماز ادا فرماتے[1]

خطبۂ مبارکہ جمعہ کے روز معمول یہ تھا کہ لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تو آپ تشریف لاتے۔ لوگوں کو سلام کرتے۔ منبر پر جاکر حاضرین کی طرف متوجہ ہوتے تو پھر سلام کہتے۔ اذان کے بعد خطبہ شروع کر دیتے جو بہت مختصر اور جامع ہوتا اور اس کی ابتدا ہمیشہ حمد وثنا سے ہوتی۔ فرماتے، نماز کا طول اور خطبے کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے۔ جب تک مسجد میں منبر نہیں بنا تھا، عصا ہاتھ میں رہتا۔ منبر بن گیا تو عصا کی ضرورت نہ رہی۔

میدان جہاد میں خطبہ دیتے تو کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو جاتے۔ خدا جانے یہ خیال کہاں سے پیدا کر لیا گیا کہ حضور صلعم تلوار ہاتھ میں لے کر خطبہ دیا کرتے تھے، حافظ ابن قیمؒ نے بہت صحیح فرمایا کہ یہ جاہلوں کا قول ہے کہ رسول اللہ صلعم تلوار لے کر خطبے کے لیے منبر پر کھڑے ہوتے، چنانچہ بعض مساجد میں تلوار ہاتھ میں لے کر خطبہ دینا معاذ اللہ سنت سمجھا جاتا تھا، حالانکہ بالکل بے اصل ہے۔

سفر آپ کو زیادہ تر حج، عمرہ اور جہاد کے لیے سفروں کی ضرورت پیش آتی رہی۔ جمعرات کو سفر پسند تھا۔ ہمیشہ تڑکے روانہ ہوتے۔ سواری سامنے آتی تو بسم اللہ کہہ کر قدم مبارک رکاب میں رکھتے۔ سوار ہو کر تین مرتبہ تکبیر کہتے۔ پھر یہ آیت پڑھتے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔ (زخرف: ۱۳-۱۴)

پاک ہے وہ ذات جس نے اس مرکب کو ہمارا فرمانبردار بنایا، حالانکہ خود ہم میں اسے مطیع رکھنے کی طاقت نہ تھی اور ہم اپنے خدا کی طرف پلٹنے والے ہیں۔

پھر یہ دعا پڑھتے:

اللھم انا نسئلک فی سفرنا ھذا البر و التقوی و من العمل ما ترضی اللھم ھون علینا و اطوعنا بعدہ اللھم انت الصاحب فی السفر والخلیفہ فی الاھل اللھم انی اعوذبک من وعثاء السفر وکآبۃ المنقلب و سوء المنظر فی الاھل

خداوندا! اس سفر میں ہم تجھ سے نیکی، پرہیزگاری اور ایسے عمل کی درخواست کرتے ہیں جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہو۔ خداوندا! ہمارے اس سفر کو آسان کر اور اس کی مسافت طے کرا دے۔ خداوندا! سفر میں صرف تو رفیق ہے۔ اہل وعیال کے لیے تو قائم مقام ہے۔ خداوندا! میں سفر اور واپسی کے آلام وشدائد اور گھر بار کے مناظر قبیحہ سے تیری

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۲۱۲

والسمال[1] پناہ مانگتا ہوں۔

جس لبستی میں پہنچتے یا جس منزل پر اترتے تو جو دعا فرماتے وہ غزوۂ خیبر کے سلسلے میں لکھی جا چکی ہے۔ واپسی پر پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرتے۔ پھر گھر تشریف لے جاتے۔

جہاد جہاد کے معمولات پہلے بیان ہو چکے ہیں مثلاً پوری فوج کو مخاطب کر کے فرماتے:

خدا کے نام پر خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو اللہ کے نافرمان ہیں لیکن خیانت اور بد عہدی نہ کرو۔ مقتولوں کے ناک کان نہ کاٹے جائیں، جس کا عرب میں دستور تھا نہ بچوں کو قتل کیا جائے۔

فوج رخصت ہوتی تو فرماتے،

میں تمہارے فرض کو، تمہاری امانت کو اور نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ معمول تھا، دشمن پر رات کے وقت حملہ نہ کرتے۔ اگر صبح کے وقت حملے کا اتفاق نہ ہوتا تو دوپہر ڈھلے حملہ کرتے۔ مقام فتح پر انتظامات کے لیے کم از کم تین روز قیام فرماتے۔ فتح کی خبر سنتے ہی سجدۂ شکر ادا کرتے۔

خود شریکِ جنگ ہوتے تو یہ دعا کرتے،

اللھم انت عضدی، و نصیری، بک احول بک اصول و بک اقاتل۔

خداوندا! تو میرا دست و بازو ہے۔ تو میرا مددگار ہے، تیرے سہارے میں مدافعت کرتا ہوں۔ تیرے سہارے حملہ کرتا ہوں تیرے سہارے سے لڑتا ہوں۔

عیادت و تعزیت بیماروں کی عیادت بھی آپ کا معمول تھا۔ ہر بیمار کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے، تسلی دیتے اور دعائے شفا فرماتے۔ کسی کی موت کا وقت قریب آجاتا تو اطلاع ملتے ہی جا کر اس کے پہلے دعائے مغفرت کرتے۔ کسی کے مرنے کی اطلاع پاتے تو جا کر نماز جنازہ میں شریک ہوتے۔ آخر میں تکلیف کے خیال سے آپ کو کسی کی حالت نزع کے وقت اطلاع نہیں دی جاتی تھی۔ حضرت سعدؓ بن معاذ کے بھائی احد میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ زندہ تھیں۔ حضور صلعم ان کے پاس جا کر جگر بند کی تعزیت فرمانا چاہتے تھے لیکن سعدؓ آپ کی تکلیف کے خیال سے خود والدۂ ماجدہ کو آپ کے پاس لے آئے اور آپ نے دل سوزی سے تعزیت فرمائی۔

ملاقات کسی سے ملاقات ہوتی تو معمول مبارک یہ تھا کہ اسے پہلے سلام کر کے مصافحہ فرماتے۔ کوئی شخص کان

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۲۱۷۔

میں بات کہنا چاہتا تو جب تک بات پوری نہ کر لیتا آپ رُخ نہ پھیرتے۔ مصافحت میں جب تک فریق ثانی ہاتھ نہ چھوڑتا اپنا دستِ مبارک نہ کھینچتے۔ مجلس میں بیٹھے ہوتے تو زانوے مبارک ہم نشینوں سے آگے نہ ہوتے۔

دستور یہ تھا کہ جو شخص ملاقات کے لیے آتا وہ پہلے السلام علیکم کہتا، پھر حاضری کی اجازت طلب کرتا۔ جس کسی سے اس دستور کی خلاف ورزی ہوتی تو فرماتے اسے اجازت طلبی کا طریقہ سکھا دو۔

ایک مرتبہ حضرت جابر زیارت کو آئے اور دروازے پر دستک دی۔ پوچھا، کون ہے؟ جابر بولے، "میں"۔ فرمایا: "میں"، "میں"، یہ کیا طریقہ ہے؟ نام بتانا چاہیے[1]

یہ اس لیے فرمایا کہ ہر شخص کی آواز ہر وقت پہچانی نہیں جا سکتی۔ دوسرے کو الجھن میں کیوں ڈالا جائے۔ نام کیوں نہ بتایا جائے؟ خود کسی سے ملاقات کے لیے جاتے تو دروازے کے دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہو کر السلام علیکم فرماتے، پھر اجازت طلب کرتے۔ دائیں بائیں اس لیے ٹھہرتے کہ مبادا سامنے کھڑے ہونے سے بے قصد گھر والوں پر نظر پڑ جائے۔ اگر اندر سے جواب نہ آتا تو واپس ہو جاتے۔ ایک مرتبہ سعدؓ بن عبادہ کے ہاں گئے۔ معمول کے مطابق السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہا۔ سعدؓ نے دانستہ اتنا آہستہ جواب دیا کہ رسول اللہ صلعم کے گوشِ مبارک تک نہ پہنچ سکا۔ سعدؓ کے فرزند نے کہا کہ رسول اللہ صلعم کو اندر تشریف لانے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ سعدؓ نے کہا، چپ رہو حضور صلعم بار بار سلام کہیں گے تو ہمارے لیے باعث برکت ہوگا۔ حضور صلعم تیسری مرتبہ سلام کہہ کر واپس ہوئے تو سعدؓ دوڑے ہوئے خدمتِ اقدس میں پہنچے اور عرض کیا آہستہ آہستہ اس لیے جواب دے رہا تھا کہ آپ بار بار سلام فرمائیں۔[2]
(مولف)

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۲۱ [2] ایضاً ص ۲۲۲۔

باب ۹۲

فضائل اخلاق

انک لعلی خلق عظیم

(۱)

کتاب اللہ کی شہادت

رسول اللہ صلعم عالم انسانیت کے لیے فضائل و مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ جس وجود مبارک کو پوری اولاد آدم کے لیے قیامت تک اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا۔ اس کی حیثیت اس کے سوا ہو بھی کیا سکتی تھی؟ اس کا پہلا شاہد قرآن پاک ہے:

۱۔ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ (سورۂ قلم: ۴)

(اے پیغمبر) تم اعلیٰ اخلاق پر پیدا ہوئے۔

۲۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔ (آل عمران: ۱۵۹)

(اے پیغمبر) خدا کی یہ بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمھارے پاس سے ہٹ جاتے (یعنی ان کے دل تمھاری طرف اس طرح نہ کھنچتے جس طرح اب بے اختیار کھنچ رہے ہیں)

۳۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔ (توبہ: ۱۲۸)

(مسلمانو) تمھارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے، جو تم ہی میں سے ہے۔ تمھارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کا بھوکا ہے۔ مومنوں کے لیے نہایت شفیق و رحیم ہے۔

حضور صلعم کے ارشادات

حضور صلعم کے اپنے ارشادات ملاحظہ ہوں:

۱۔ بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔

میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

۲۔ انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کا معاملہ درجۂ اتمام پر پہنچاؤں۔

رسول اللہ صلعم کی بعثت کی خبر ابوذر رضؓ غفاری تک پہنچی تھی تو انھوں نے اپنے بھائی کو تحقیق احوال کے لیے مکہ مکرمہ بھیج دیا تھا۔ بھائی نے مکہ مکرمہ سے مراجعت پر ابوذرؓ کو ان الفاظ میں اطلاع دی:

ما ایتہٗ یامر بمکارم الاخلاق[1] میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ آپ اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔

یہ بعثت کے بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ اس دور میں بھی جس کسی کی نظر آپ پر پڑی، آپ میں جو نمایاں ترین وصف نظر آیا اسے فضائل اخلاق ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت علیؓ کا بیان امام حسینؓ نے حضرت علیؓ سے حضور صلعم کے اخلاق و عادات کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خندہ جبیں، نرم خو اور مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگدل نہ تھے۔ کوئی بُرا کلمہ کبھی منہ سے نہ نکلا۔ عیب جُو اور تنگ گیر نہ تھے۔ کوئی بات ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے۔ اپنے نفس سے آپ نے تین چیزیں بالکل دُور کر دی تھیں، (ا) بحث و مباحثہ، (ب) ضرورت سے زیادہ بات کرنا (ج) جو بات مطلب کی نہ ہو، اس میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین ہی باتوں سے پرہیز کرتے تھے (ا) کسی کو بُرا نہیں کہتے تھے (ب) کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے (ج) کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وہی باتیں کرتے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا۔ آپ کلام کرتے تو صحابہ اس طرح سر جھکا کر اور خاموش ہو کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جب آپ خاموش ہو جاتے تو پھر (صحابہ) آپس میں بات چیت کرتے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک ختم نہ کر لیتا آپ چپ سُنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے، آپ محض مسکرا دیتے۔ باہر کا کوئی آدمی (یعنی اجنبی) بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ تحمل فرماتے۔ دوسروں کے مُنہ سے اپنی تعریف سُننا پسند نہیں کرتے تھے تاہم اگر کوئی آپ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرما لیتے۔ جب تک بولنے والا چُپ نہیں ہو جاتا تھا، آپ اس کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی آپ کو دفعتہً دیکھ لیتا تو مرعوب ہو جاتا۔ لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا محبت کرنے لگتا[2] اور کہا کرتا کہ میں نے آپ جیسا کوئی بھی اس سے پہلے یا بعد نہیں دیکھا۔

یہ محض عہد نبوت کے تیئیس سال ہی نہیں بلکہ چند سال پیشتر کے عینی مشاہدات کا بھی جامع مرقع ہے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان حضرت عائشہؓ نے ہجرت سے قبل رسول اللہ صلعم کی مکی زندگی کے بعض اہم واقعات بھی دیکھے تھے اور مدنی زندگی میں تو وہ حضور صلعم کی رفیقۂ حیات بن گئی تھیں۔

---

[1] بخاری کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخا۔ [2] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۸۸ - ۲۸۹۔ بحوالہ شمائل ترمذی۔

یہاں تک کہ اس دنیا میں حضور صلعم کی حیات طیبہ کا آخری ہفتہ حضرت ممدوحہ ہی کے حجرے میں گزرا۔ حضرت ممدوحہ نے سہارا دے رکھا تھا، جب رُوح پاک اس دنیا کو چھوڑ کر عالم قدس میں پہنچی۔ حضرت عائشہؓ ہی کے حجرے کو اللہ تعالیٰ نے جسد اطہر کی آخری آرام گاہ بنایا۔ مشاہدے کے جیسے مختلف مواقع حضرت ممدوحہؓ کو میسر آئے، وُہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکتے تھے۔ آپ کے بعض ارشادات ملاحظہ ہوں :

۱۔ جب بھی رسول اللہ صلعم کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ اِن میں سے وُہ لے لیتے جو آسان اور سہل ہوتی، بشرطیکہ اس میں گناہ کا کوئی پہلو نہ ہوتا۔ اگر گناہ ہوتا تو آپ سب سے بڑھ کر اس سے دوری اختیار کرتے[1]

۲۔ رسول اللہ صلعم نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی کو سزا نہ دی اور کبھی بدلہ نہ لیا۔ ہاں اللہ کے حکموں کی حرمت زایل کرنے والوں کو آپ اللہ کے لیے سزا دیتے تھے[2]

۳۔ عادت شریف یہ تھی کہ بُرائی کے بدلے میں بُرائی سے کبھی کام نہ لیا۔ ہمیشہ درگزر کرتے اور معاف فرما دیتے[3]

۴۔ رسول اللہ صلعم اس طرح کبھی نہ ہنسے کہ آپ کا تالو نظر آیا ہو، صرف مسکرا دیا کرتے تھے۔

۵۔ ہر لحظہ دل پر خوف و خشیت الٰہی کا غلبہ رہتا تھا۔ بادل دیکھتے یا آندھی آتی تو چہرۂ مبارک پر تکلیف کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ میں نے (حضرت عائشہؓ نے) کہا: یا رسول اللہؐ! لوگ بادل دیکھتے ہیں تو اس امید پر خوش ہوتے ہیں کہ بارش ہوگی۔ آپ کے چہرے سے تکلیف نمایاں ہوتی ہے۔ فرمایا: عائشہؓ! کون سی بات مجھے بے خوف کر سکتی ہے کہ اس میں عذاب نہ ہوگا؟ ایک قوم کو آندھی سے عذاب دیا گیا۔ ایک قوم نے عذاب دیکھا تو کہا یہ بادل ہے[4]

۶۔ آپ نے نام لے کر کبھی کسی پر لعنت نہ کی۔ نہ کبھی اپنے کسی خادم، کسی لونڈی، کسی غلام، کسی عورت اور کسی جانور کو اپنے ہاتھ سے مارا[5]

۷۔ آپ نے کبھی کسی کی درخواست رد نہ فرمائی، اِلّا یہ کہ وُہ ناجائز تھی۔

۸۔ گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہُوئے آتے۔ باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے[6]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب [2] ایضاً [3] ایضاً [4] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۲۸۷ [5] صحیح بخاری [6] سیرۃ النبیؐ جلد اول حصہ دوم ص ۲۸۷ بحوالہ مسلم و ابو داؤد۔ [6] بخاری کتاب الادب۔

۹۔ ایک بدوی آیا اور بولا: آپ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں ہم تو بوسہ نہیں دیتے۔ فرمایا: اللہ نے تیرے دل سے رحم نکال دیا، اس میں میرا کیا اختیار ہے؟[1]

۱۰۔ اسودؓ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ گھر میں کیا کیا کرتے تھے۔ فرمایا: گھر والوں کی خدمت میں رہتے تھے یعنی ان کے کام کیا کرتے تھے۔ نماز کا وقت آتا تو نماز کے لیے چلے جاتے[2]

۱۱۔ اگر کسی کی کوئی حرکت پسند نہ ہوتی تو اس کا نام لے کر منع نہ فرماتے، اصل فعل کو منع فرما دیتے۔[3]

۱۲۔ رسول اللہ صلعم کے گھر والوں نے ایک دن میں دو نوالے نہیں کھائے، مگر ان میں سے ایک کھجور کا تھا۔[4]

۔ اس کے ساتھ رسول اللہ صلعم کے خادم انسؓ بن مالک کا یہ بیان بھی شامل کر لیجیے کہ میں نے دس سال آپ کی خدمت میں گزارے۔ اس پوری مدت میں آپ میرے متعلق ناپسندیدگی کا کوئی کلمہ زبان پر نہ لائے۔ نہ کبھی یہ فرمایا: فلاں کام کیوں کیا؟ نہ کبھی یہ فرمایا: فلاں کام کیوں نہ کیا؟[5]

نبوت سے پیشتر کی زندگی

حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے بیانات کا تعلق زیادہ تر عہد نبوت سے ہے جس کی کل مدت تیئیس سال تھی۔ اس سے پیشتر آپ چالیس سال کی طویل مدت گزار چکے تھے۔ یہی زندگی ہے جسے قرآن مجید میں ایک مقام پر صداقت نبوت کی ایک قوی دلیل قرار دیا گیا ہے یعنی!

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عمراً مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ؟ (یونس : ۱۶)

یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے (یعنی نبوت) سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں۔

مشرکین عرب کو رسول اللہ صلعم کی صداقت و فضیلت سے انکار نہ تھا، حتیٰ کہ ابوجہل کو بھی اعتراف تھا کہ آپ سچے ہیں، مگر وہ کہتے تھے کہ آپ ایسی باتیں کہتے ہیں جنھیں ہم قبول نہیں کر سکتے۔ مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور فرماتے ہیں کہ آیت کے منقولہ ٹکڑے میں صداقت نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے۔ یعنی فرمایا:

ساری باتیں چھوڑ دو۔ اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں نیا آدمی نہیں، جس کے خصائل و حالات کی تمھیں خبر نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمھاری آنکھوں کے

---

[1] بخاری، کتاب الادب [2] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب اذا دعی الامام الی الصلوٰۃ۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔
[4] بخاری، کتاب الادب۔

سامنے رہی۔ بتلاؤ اس میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور دیانت کے خلاف دیکھی ؛ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا اب ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا پر بہتان باندھنے کیلیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے ؛ کیا اتنی چھوٹی سی بات بھی تم نہیں پا سکتے ؛

تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے۔ جو سانچا اس عرصے میں بن گیا، پھر بقیہ زندگی میں تبدیل نہیں ہو سکتا۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں ہی پر نہیں، فاطر السمٰوٰت والارض پر افترا کرنے لگے ؛ چنانچہ بعد میں فرمایا ؛ دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے کہ جو شخص اللہ پر افترا کرے، اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر و مفتری کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا...... فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔ چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جو مکذب تھے، ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا اُس کا کلمۂ صدق آج تک قایم ہے اور قایم رہے گا۔[1]

دنیا جانتی ہے کہ جس دور میں سچائی اور دیانت و امانت کی روشنی گل ہو چکی تھی، اس دور میں رسول اللہ صلعم نے سیرۃ طیبہ کی پاکیزگی اور طہارت سے الصادق اور الامین کے لقب حاصل کیے۔ جب حرم کعبہ کی تعمیر کے سلسلے میں حجر اسود کو اصل مقام پر نصب کرنے کے متعلق رؤسا قبائل کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی تو فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے، اسے ثالث بنا لیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم سب سے پہلے آئے اور تمام لوگ پکار اٹھے، "امین" آ گئے۔ "امین" آ گئے۔ ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہے۔ یہ حضور صلعم کی سیرت کے متعلق ایسی گواہی تھی، جس کی صداقت و محکمیت سے کسی کے لیے بھی اختلاف بجا نہ ہوگا۔

حضرت خدیجہؓ کی شہادت

محض یہی نہیں۔ ایک نہایت زبردست شہادت حضرت خدیجہؓ کی ہے، جو بعثت تک پندرہ سال رسول اللہ صلعم کی رفاقت میں گزار چکی تھیں۔ اس کے بعد دین حق کے دور غربت کی اذیتیں اور مصیبتیں بھی دس سال تک صابرانہ برداشت کر کے عالم بقا کو سدھاریں۔ یہ شہادت بھی عہد بعثت سے نہیں بلکہ بعثت سے پیشتر ہی کی زندگی سے متعلق ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن جلد دوم ص ۱۵۱ - ۱۵۲۔

سورۂ علق کی آیتیں آپ پر نازل ہو چکیں تو اوّل نزول وحی کی شدت کا آپ پر بے حد اثر تھا اور یہ پہلی وحی تھی معلوم ہے کہ اس کے بعد بھی جب وحی نازل ہوتی تھی تو چہرۂ مبارک پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے تھے۔ دوم جو گراں قدر کام اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذمّے لگا دیا تھا، اس کی بے پناہ مشکلات کا آپ کو پورا اندازہ تھا۔ اس لیے آپ کوہ حرا سے اتر کر گھر تشریف لائے تو قلب مبارک پر لرزہ سا طاری تھا۔ جب طبیعت ذرا سکون پذیر ہوئی تو آپ نے پوری کیفیت غمخوار و غمگسار رفیقۂ حیات کو سنا کر فرمایا، لقد خشیت علیٰ نفسی (مجھے اپنی جان کا خوف ہے) حضرت خدیجہؓ رسول اللہ صلعم کے نہایت پاکیزہ اور سراپا خیر طریقِ حیات سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ انھیں خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ خلق خدا کے ساتھ محبت و شفقت کے ایسے نادر پیکر کو قدرت کامیابی کی منزل پر نہ پہنچائے گی۔ چنانچہ آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا،

> ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم، خدا آپ کو کبھی اندوہگیں نہ کرے گا۔ آپ عزیزوں اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں۔ ناتوانوں، بےکسوں اور غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا، انھیں دیتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ مصائب میں حق کے معاون و مددگار ہیں[1]۔ صادق القول ہیں[2]۔

یہ شہادت ان فضائل و مکارم کے متعلق ہے جو بعثت سے بیشتر وجود گرامی میں موجود تھے اور حضرت خدیجہؓ سے بڑھ کر ان کا اندازہ شناس کون ہو سکتا تھا؟

اہل ایمان کے اوصاف وخصائل

رسول اللہ صلعم کے فضائل اخلاق کا اندازہ کرنے کے لیے ایک معیار یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل ایمان کے جو اوصاف و خصائل قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں، انھیں سامنے رکھ لیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس وجود مبارک کے ذریعے سے قرآن مجید کی تعلیم مخلوق تک پہنچائی۔ وہ بہرحال اس تعلیم کا ایک مقدس پیکر ہوگا۔ اسی وجود مبارک کو دیکھ کر صحابہ اپنے عمل درست کرتے تھے اور اسی وجود مبارک کے زیر سایہ ان کے تزکیے کا سلسلہ جاری تھا۔

قرآن مجید سے وہ تمام آیتیں چن کر جمع کر دینا تو ممکن نہیں، لیکن ان میں سے چند ملاحظہ فرما لیجیے، جن میں مجلسی و اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے اوصاف کا ذکر ہے:

۱۔ مومن وُہ ہیں جو اللہ سے ڈرتے اور باہمی معاملات درست رکھتے ہیں۔ اللہ کا ذکر چھڑے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ اللہ کا کلام سنایا جائے تو ان کے ایمان زیادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، جو کچھ خدا نے انھیں دے رکھا ہے، اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہی حقیقی مومن ہیں (انفال: ۱-۴)۔

---

[1] ی: کیف کان بدا الوحی [2] یہ ٹکڑا اسی حدیث کی اس روایت میں آیا ہے جو بخاری کی کتاب التعبیر میں آئی ہے۔

۲۔ بلاشبہ ایمان والے کامیاب ہوئے (ان کی خصوصیتیں کیا ہیں؟) نمازیں خشوع وخضوع سے ادا کرتے ہیں۔ نکمی اور لغو باتوں سے رُخ پھیرے ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں۔ عفت و عصمت کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں ہوتے ...... امانتوں اور وعدوں کا انھیں پاس رہتا ہے۔ نمازوں کی حفاظت میں بھی کوتاہی نہیں کرتے۔ (مومنون: ۱-۱۰)

۳۔ اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں یعنی عجز و فروتنی سے چلتے ہیں۔ جب جاہل یعنی کم عقل، اکھڑ اور بے ادب لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو لایم بات سنا کر اور صاحب سلامت کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ رات کا وقت (یعنی سونے کا وقت کلب کی تفریحات میں نہیں) اپنے پروردگار کے لیے قیام و سجود میں گزارتے ہیں اور کہتے ہیں؛ اے ہمارے پروردگار، ہم سے دوزخ کا عذاب پھیر دے .... جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ موقع کی مناسبت کے پیش نظر تنگی کرتے ہیں۔ وہ کسی کا بے گناہ خون نہیں بہاتے، جس سے اللہ نے منع کر رکھا ہے اور بدکاری سے بھی دُور رہتے ہیں ..... جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے۔ کسی کی لغویات سے گزر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں۔ (فرقان: ۶۳-۷۲)

۴۔ وہ (اہل ایمان) پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں، بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے دُور رہتے ہیں۔ جب غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں اور خدا نے انھیں جو کچھ دے رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جب ان پر کوئی زیادتی ہو تو بدلا لیتے ہیں، برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے، اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا، جو کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور جو ظلم کو سہہ جائے اور معاف کر دے تو یہ بڑی عالی ہمتی کے کاموں میں سے ہے۔ (شوریٰ: ۳۶-۴۳)

اصل نیکی

اصل نیکی کیا ہے؟

۱۔ اللہ پر ایمان
۲۔ یوم آخرت اور فرشتوں پر ایمان۔
۳۔ خدا کی اتاری ہوئی کتابوں اور خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان۔
۴۔ خدا کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مانگنے والوں کو دینا۔

۵۔ مال خرچ کر کے غلاموں کو آزادی دلانا۔

۶۔ نماز اور زکوٰۃ باقاعدہ ادا کرتے رہنا۔

۷۔ عہد کر لینا تو اسے بہر حال پورا کرنا۔

۸۔ تنگی، مصیبت یا خوف و ہراس میں صابر و ثابت قدم رہنا۔ (بقرہ: ۱۷۷)

نیز فرمایا:

۱۔ خوش حالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں خدا کے لیے خرچ کرنا۔

۲۔ غصّے کو پی جانا اور لوگوں کے قصور معاف کر دینا۔

یہ دعوت حق کی محض چند جھلکیاں ہیں جنھیں عاملوں کی شکل میں بھی پیش کیا گیا اور محض نیکیوں کی شکل میں بھی۔ کیا کسی کے لیے یہ تصور کر لینا مشکل ہے کہ جس داعی حق کو یہ پاک دعوت دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا، وہ خود اپنی مقدس تعلیم کا کتنا افضل و اعلیٰ اور کس درجہ منوّر و مزکّیٰ نمونہ ہوگا؟ اسلام نے جو عبادتیں مقرر کی ہیں، ان کا مقصد و مدعا بھی اس کے سوا کیا ہے کہ لوگوں کے اعمال درست ہوں، ان کے کردار اصلاح پائیں۔ ان کی سیرتیں آئینے کی طرح پاک و صاف ہو جائیں اور ان کے اخلاق زیادہ سے زیادہ سنور جائیں؟ (مولف)

باب ۹۳

فضائل اخلاق

انّک لعلیٰ خلقٍ عظیم

—(۲)—

حسنِ اخلاق کی اہمیت رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

۱۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

۲۔ کامل ایمان اس مومن کا ہے، جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔

۳۔ قیامت کے روز اعمال کی ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری چیز کوئی نہ ہوگی۔

۴۔ انسانوں کو قدرت کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں ان میں سب سے بہتر چیز اچھے اخلاق ہیں۔

۵۔ بندوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

۶۔ آخرت کی زندگی میں میرے لیے سب سے پسندیدہ وہ شخص ہوگا جس کے اخلاق اچھے ہوں اور وہی مجھ سے قریب تر ہوگا[۱]

۷۔ کسی نے سوال کیا یا رسول اللہ مومنوں میں سے افضل کون ہے؛ فرمایا: "احسنھم خلقا" (جو سب سے زیادہ خوش اخلاق ہو)[۲]

۸۔ انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ حاصل کر سکتا ہے، جو مسلسل روزے رکھنے اور راتوں کو مسلسل عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

آخری ارشاد کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ یہ ایک اسلوب بیان ہے، جس میں حسن اخلاق کو اس درجے پر رکھ کر پیش کیا گیا ہے جو نماز اور روزے جیسی نفلی عبادات سے حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص فضائل اخلاق کے ساتھ نفلی عبادت میں بھی سرگرم رہے گا، اس کا درجہ اور بھی بلند ہوگا۔

غرض ان ارشادات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فضائل اخلاق کو دین حق میں کتنا بلند درجہ حاصل ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ اخلاق درست ہوں گے تو افراد و جماعات میں میل جول بڑھے گا۔ ان میں محبت و ہمدردی کو فروغ حاصل ہوگا۔

---

[۱] سیرۃ النبیؐ جلد ششم ص ۲۰۔۲۲ [۲] سیرۃ ابن ہشام، القسم الثانی ص ۳۶۱۔

ایک دوسرے کے نفع و نقصان اور دکھ سکھ کا احساس ترقی کرے گا۔ کش مکش کے اسباب رفتہ رفتہ زائل ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ پورا مجمع انسانیت ایک کنبے کے افراد اور ایک خاندان کے اعضا کی حیثیت میں رہنے سہنے لگے گا۔ ہر قلب میں احترام آدمیت کو صحیح مقام مل جائے گا۔ یہی اسلام کا اصل نصب العین تھا۔ اس کی طرف پیش قدمی جاری تھی کہ اچانک ملوکیتوں اور بادشاہیوں کا دور شروع ہو گیا، جس کی ظلمت و تیرگی میں قافلۂ اسلام کی ہر متاعِ عزیز گم ہو گئی اور اب کسی بھی چیز کا ٹھیک ٹھیک سراغ لگا لینا خاصا مشکل ہو گیا ہے۔ اگر کسی کا سراغ مل بھی جائے تو ہم لوگوں کے ذہنوں میں دورِ ملوکیت کے وقت سے دینِ حق کا جو نقشہ جما ہوا ہے، اس میں کسی بازیافتہ شے کے لیے موزوں جگہ نکالنا بظاہر آسان نہ ہو گا۔

باقی رہی تبلیغ اسلام تو وہ ہر مسلمان کے لیے فرداً فرداً اور ہر اسلامی جماعت کے لیے اجتماعاً اس دنیا میں اوّلین شے ہے۔ نہ محض اس لیے کہ اسلام حق ہے اور حق کو پھیلانا ہر فرد و جماعت کے لیے بہترین سعادت ہے، اس لیے بھی کہ ہم جنسوں کی پرخلوص بہی خواہی ہر مسلمان کے اہم فرائض میں داخل ہے اور تمام ہم جنسوں کو نعمت اسلام کا حامل بنا دینے سے بڑھ کر بہی خواہی کوئی نہیں ہو سکتی، جس پر دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و بہبود موقوف ہے۔ لیکن تبلیغ اسلام کے لیے بھی سازگار فضا صلح و امن ہی سے میسر آ سکتی ہے۔ اگر نفرت و مخالفت کی آگ دلوں میں بھڑک رہی ہو تو کسی کو پیغام حق سنانے کی کیا صورت ہو گی؟ سیرۂ طیبہ سے ظاہر ہے کہ بدر و حنین کی فتوحات بے شائبہ ریب بہت عظیم القدر تھیں تاہم فتح مبین صلح حدیبیہ ہی قرار پائی، جس نے طول و عرضِ عرب میں دلوں کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیے اور "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا روح افروز منظر سب نے دیکھ لیا۔

ایمان کیا ہے؟

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں سے صرف چند حدیثیں یہاں درج کی جاتی ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے ایمان و اسلام حقیقۃً کیا ہیں؟ مثلاً:

۱۔ مسلمان وُہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان کو کوئی گزند نہ پہنچے اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی ہر شے ترک کر دے۔

۲۔ اس وقت تک کوئی شخص حقیقۃً مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اپنے مومن بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے، جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کی حلاوت پالی۔

ﺍ۔ اللہ اور رسولؐ اس کے نزدیک ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں۔

ب۔ ہر فرد کے ساتھ صرف اللہ کے لیے محبت کرے یعنی محبت کے ساتھ کوئی غرض و البتہ نہ ہو۔

ج۔ کفر کی طرف لوٹ جانا اسے اتنا ہی بُرا معلوم ہو، جتنا آگ میں ڈالا جانا۔

۴۔ تین باتیں ہیں، جس نے یہ جمع کرلیں، اس نے ایمان جمع کرلیا۔

ا۔ اپنے نفس کے مقابلے میں بھی انصاف پر قایم و استوار رہنا۔

ب۔ دنیا میں سلامتی اور حق پھیلانا۔

ج۔ تنگ دستی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

۵۔ حضور صلعم سے پوچھا گیا کہ کون سا اسلام بہتر (خیر) ہے۔ فرمایا: کھانا کھلانا اور سب کو سلام کہنا یعنی سلامتی کی دعا دینا، خواہ جان پہچان ہو یا نہ ہو۔

۶۔ خود ابوذرؓ غفاری کی روایت ہے کہ میں نے غلام کو گالی دی۔ رسول اللہ صلعم نے سن لی اور فرمایا: ابوذرؓ ابھی تم میں جاہلیت باقی ہے۔ غلام تمھارے بھائی ہیں۔ اللہ نے انھیں تمھارے ماتحت کردیا ہے۔ جس کا بھائی ماتحت ہو، اسے چاہیے کہ بھائی کو ویسا ہی کھلائے جیسا آپ کھائے، ویسا ہی پہنائے جیسا آپ پہنے اور بھائی سے ایسا کام نہ لے، جو اس سے نہ ہو سکے۔ کوئی سخت کام ہو تو خود اس کی مدد کرے۔

۷۔ جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ وہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو، وہ دل ہے۔

۸۔ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔

۹۔ جب دو مسلمان تلواروں کے ساتھ مقابلے پر آئیں تو قاتل و مقتول دونوں آگ میں ہوں گے۔ عرض کیا گیا کہ قاتل تو ہوا اگر مقتول کا یہ حال کیوں ہوگا؟ فرمایا: وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنا چاہتا تھا (لیکن موقع نہ پا سکا اور خود مارا گیا)

۱۔ جس میں چار باتیں ہوں، وہ خالص منافق ہے،

ا۔ امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

ب۔ بات کہے تو جھوٹ بولے۔

ج۔ عہد کرے تو اسے پورا نہ کرے۔

د۔ جھگڑے تو ناحق کی طرف چلا جائے۔

ان میں سے کوئی بھی بات کسی میں ہو تو نفاق کی علامت ہوگی تا آنکہ وہ اسے ترک کردے۔

۱۔ خدا کے نزدیک پسندیدہ عمل وہ ہے، جس پر مداومت کی جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔

۲۔ "کتاب الادب" میں ہے کہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا:

خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا۔ عرض کیا: کون

یارسول اللہ؟ فرمایا: جس کا پڑوسی اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔

ان ارشادات پر غور فرمایئے اور اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ صلعم نے عالم انسانیت کو کس راستے پر چلنے کی دعوت دی؛ آیا اس کے سوا امن عالم اور بہبودِ انسانیت کا کوئی راستہ ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی سوچیے کہ جس سرچشمۂ فلاح و صلاح کو نیں سے یہ اور ایسی ہزاروں موجیں اٹھیں، اس کے طیب و طاہر ہونے کا درجہ کتنا بلند ہوگا۔

دائرۂ اصلاح و درستی

مولانا سید سلیمان مرحوم و مغفور نے سیرۃ النبیؐ میں ان اخلاقی تعلیمات کی ایک فہرست درج فرمائی ہے، جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے[1]۔ میں نے ان تمام تعلیمات کو شمار کیا تو ایک سو ستائیس نکلیں۔ اسی طرح مرحوم مولانا نے صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد سامنے رکھ کر رسول اللہ صلعم کی اخلاقی تعلیمات کے صرف عنوان درج فرمائے[2] ان کی تعداد ننانوے ہوئی۔

پھر فرمایا کہ "کنزل العمال" ہر قسم کی حدیثوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں رسول اللہ صلعم کی اخلاقی تعلیمات بڑی تقطیع کے ایک سو ستاسی صفحوں میں سمائی ہیں، ہر صفحے میں سینتیس سطریں ہیں۔ مولانا سید سلیمان مرحوم نے یہ حدیثیں گنیں تو تین ہزار نو سو چھ نکلیں[3]۔

تاہم اصل معاملہ تعداد کا نہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ قرآن پاک اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جو کچھ بصورت امر یا بشکل نہی آ گیا ہے، اس میں انسانی زندگی کا کوئی بھی ضروری گوشہ نظر انداز نہیں ہوا۔ خطبۂ حج میں رسول اللہ صلعم نے تین چیزوں کا ذکر بطور خاص فرمایا تھا یعنی جان، مال اور آبرو۔ پھر حج کے دن، حج کے مہینے اور مکہ مکرمہ کی حرمت کی طرح جان، مال اور آبرو کی عزت و حرمت کی تاکید فرمائی تھی۔ غور کیا جائے تو دنیا میں جتنی زیادتیاں، جتنے ظلم اور جتنے گناہ ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق اصلاً انھی تین چیزوں میں سے کسی ایک سے نکلے گا جو ہر انسان کو فطرۃً عزیز ہیں۔ کتاب و سنت کی محولہ بالا تعلیمات میں کوئی ایسی خوبیں ملے گی جو ضروری تھی اور اس کے کرنے یا نہ کرنے کی تاکید نہ آئی ہو۔

اب "سیرۃ النبیؐ" اور "رحمۃ للعالمین" سے حضور صلعم کی چند خصوصیتیں اختصاراً بیان کی جاتی ہیں۔

حسن خلق

رسول اللہ صلعم نہایت نرم مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ چہرۂ مبارک پر اس قسم کی کیفیت چھائی رہتی تھی جس سے دیکھنے والے پر لطف و شفقت کا اثر پڑتا۔ گفتگو وقار و متانت سے فرماتے، ایک ایک جملہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے۔ ہر ایک کو نرمی سے سمجھاتے۔ کبھی کسی کی دل شکنی گوارا نہ فرمائی۔ آپ سوار ہوتے اور راستے میں کوئی صحابی مل جاتا تو اسے سوار کرا دیتے اور خود اتر آتے۔

---

[1] جلد ششم ص ۱۲۱-۱۲۳ [2] ایضاً ص ۱۲۳-۱۲۵ [3] ایضاً ص ۱۲۳-

ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا تو ڈھیلے مار مار کر کھجوریں گراتا۔ لوگ مجھے پکڑ کر خدمت اقدس میں لے گئے۔ آپ نے فرمایا کہ زمین پر ٹپکی ہوئی کھجوریں کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارا کرو، پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔

ایک مرتبہ حالتِ قحط میں ایک صاحب نے باغ سے کھجور کے خوشے توڑ کر کھائے اور کچھ دامن میں رکھ لیے۔ باغ کے مالک نے اسے مارا اور کپڑے اتروا لیے۔ پھر شکایت لے کر حضور صلعم کی بارگاہ میں پہنچا۔ کھجوریں توڑنے والا بھی ساتھ تھا۔ آپ نے مالک باغ سے کہا۔ یہ جاہل تھا، اسے تعلیم دینی چاہیے تھی۔ بھوکا تھا، کھانا کھلانا چاہیے تھا۔ یہ فرما کر کپڑے واپس دلائے اور اسے ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے دیا جو ہمارے حساب سے تین من، تیرہ سیر اور دو چھٹانک ہوتا ہے۔

مجلس نبویؐ میں بیٹھنے کی جگہ نہ رہتی تو نئے آنے والے کے لیے ردائے مبارک بچھا دیتے تھے۔ سلام میں پیش دستی فرماتے۔ راستہ چلتے تو مرد، عورت، بچہ جو سامنے آتا اسے سلام کرتے۔ زبان مبارک پر کبھی کوئی غیر مناسب لفظ نہ آیا۔ انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ جب کسی پر عتاب کرتے تو فرماتے: "مالہٗ ترب جبینہٗ" (اسے کیا ہوا؟ اس کی پیشانی خاک آلود ہو) محاورے میں اس فقرے کا استعمال ہلکے زجر کے رنگ میں ہوتا ہے۔

بچوں پر شفقت

حضور صلعم بچوں پر بہت شفقت فرماتے۔ آپ سفر سے تشریف لاتے اور لوگ استقبال کے لیے نکلتے تو بچے بھی ساتھ ہوتے اور وہ معمول کے مطابق دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے۔ جو پہلے پہنچتے انھیں آپ ساتھ سواری پر بٹھا لیتے۔ راستے میں مل جاتے تو انھیں خود سلام کرتے اور ان سے بھی شفقت کا یہی برتاؤ ہوتا۔

ایک مرتبہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی۔ اس کی دو بچیاں بھی ساتھ تھیں۔ اتفاق سے حضرت عائشہؓ کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا۔ ایک کھجور پڑی تھی وہ اس عورت کو نذر کر دی۔ اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ایک ٹکڑا دونوں بچیوں کو دے دیا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ رسول اللہ صلعم کو سنایا تو فرمایا: جس کے دل میں خدا اولاد کی محبت ڈالے اور وہ اس محبت کا حق ادا کرے تو دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

یہ شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی۔ ایک دفعہ کسی غزوے میں چند بچے بھی بے ارادہ وعلم مارے گئے، آپ کو اطلاع ملی تو بڑا رنج ہوا۔ کسی کی زبان سے نکلا یا رسول اللہ وہ مشرکین کے بچے تھے۔ فرمایا: مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان خدا ہی کی فطرت پہ [۵]

---

۵ بخاری: کتاب الادب

پیدا ہوتی ہے۔

جابرؓ بن سمرہ صحابی اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم کے پیچھے نماز پڑھی پھر آپ کے ساتھ ہو لیا۔ سامنے سے چند اور بچے آ گئے۔ آپ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔

غلاموں پر شفقت

اوپر گزر چکا ہے، ابوذرؓ غفاری سے آپ نے فرمایا تھا: تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں، جو خود کھاؤ، انھیں کھلاؤ۔ جو خود پہنو، انھیں پہناؤ۔ چنانچہ اس کے بعد سے ابوذرؓ نے اپنے غلام کو ہمیشہ کھانے پہننے وغیرہ میں اپنے برابر رکھا۔

غلاموں کے لیے لفظ "غلام" بھی گوارا نہ تھا۔ آپ نے فرمایا: انھیں غلام یا لونڈی کہہ کر نہ پکارا کرو۔ "میرا بچہ"، "میری بچی" کہا کرو۔ آپ کے پاس جو غلام آتا، اسے آزاد کر دیتے۔ لیکن وہ لوگ آزاد ہو کر بھی آپ کی شفقت کی زنجیر میں جکڑے رہتے۔ زیدؓ بن حارثہ کا واقعہ محتاج تفصیل نہیں۔ ان کے والد اور چچا لینے کے لیے آئے اور ہر قیمت ادا کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ آپ پہلے ہی زیدؓ کو آزاد کر چکے تھے۔ جانے نہ جانے کا معاملہ زیدؓ ہی پر چھوڑ دیا۔ انھوں نے جانے سے انکار کر دیا اور آپ کے آستانۂ رحمت کو والدین اور دوسرے خونی اقربا کے ظلِّ عاطفت پر ترجیح دی۔ محبت و شفقت کے اس اعجاز کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے، جس کے سامنے قریب ترین خونی رشتے بھی بے حقیقت رہ گئے؟ زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ سے آپ کو جتنی محبت تھی، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ بعض نہایت اہم معاملات میں اسامہؓ ہی کو آپ کی بارگاہ میں سفارش بنایا جاتا تھا اور فتح مکہ میں داخلے کے وقت اسامہؓ حضور صلعم کے ردیف تھے۔

ایک صحابی اپنے غلام کو مار رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی کہ خدا کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے۔ صحابی نے مڑ کر دیکھا تو خود رسول اللہ صلعم تھے۔ عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اسے لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔ فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تمھیں چھو لیتی۔

سب سے آخری وصایا میں سے ایک وصیت یہ تھی کہ غلاموں اور لونڈیوں کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہنا۔ ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ غلاموں کا قصور کتنی مرتبہ معاف کروں؟ آپ خاموش رہے۔ جب تیسری مرتبہ یہی گزارش کی تو فرمایا: "ہر روز ستر مرتبہ"۔

غریبوں پر شفقت

رسول اللہ صلعم اکثر دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر۔ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا یہ کیوں؟ فرمایا: اس لیے کہ مساکین دولت مندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ پھر فرمایا: عائشہؓ! کسی مسکین کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ۔ کچھ نہ ہو تو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی سہی، ضرور دے دو۔ عائشہؓ! غریبوں سے محبت کرو۔ انھیں اپنے سے نزدیک رکھو، خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا۔

۱؎ سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۳۰۲۔

عبداللہ رضؓ بن عمرو ابن العاصؓ کا بیان ہے کہ میں مسجد میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف فقرائے مہاجرین کا حلقہ تھا۔ رسول اللہ صلعم تشریف لائے تو اس حلقے میں بیٹھ گئے۔ میں بھی وہیں جا بیٹھا۔ فرمایا: فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولت مندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں جائیں گے۔

فرمایا:

جو شخص کسی بیوہ اور مسکین کی خبر گیری کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کی ہے یا اس شخص کی جو دن کو روزے رکھتا ہے اور رات کو عبادت کے لیے کھڑا رہتا ہے[1]۔

عوالی میں ایک بڑھیا بیمار تھی، اس کے جانبر ہونے کی امید نہ تھی۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ جب اس کی وفات ہو تو مجھے ضروری خبر کرنا۔ میں جنازے کی نماز پڑھاؤں گا۔ اتفاق سے بڑھیا کا انتقال کچھ رات گئے ہوا۔ صحابہ نے آپ کو رات کے وقت اٹھانا گوارا نہ کیا اور بڑھیا کو دفن کر دیا۔ صبح کے وقت آپ نے دریافت فرمایا اور پوری کیفیت معلوم ہوئی تو اس خاتون کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔

ایک مرتبہ ایک قبیلہ مسافروار مدینہ منورہ آیا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ کسی کے بدن پر ثابت کپڑا نہ تھا۔ پاؤں ننگے تھے۔ کھالیں بدن پر بندھی ہوئی تھیں اور تلواریں گلوں میں ڈال رکھی تھیں۔ حضور صلعم کی نظر مبارک ان لوگوں کی خستگی پر پڑی تو چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا۔ حالت اضطراب میں اندر تشریف لے گئے۔ پھر باہر آئے اور بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ نماز کے بعد ایک خطبے میں سب کو ان غریبوں کی امداد پر آمادہ کر لیا۔

شفقت و رافت عامہ کے باب میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ عبادات نافلہ چھپ کر ادا فرماتے "تاکہ عام لوگوں کے لیے آپ کی پیروی میں اس قدر عبادت کرنا شاق نہ ہو۔"

مساوات

مساوات کی جیسی عملی مثالیں رسول اللہ صلعم کی سیرۃ طیبہ میں ملتی ہیں، ویسی اور کہاں ملیں گی؟ اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہ کی شادی اپنی پھوپھی بہن سے کر دی تاکہ اونچ نیچ کے فرضی اور خود ساختہ سانچے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ فتح مکہ کے بعد آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اس کے مندرجہ الفاظ پر غور فرمائیں:

اے گروہ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

یہ مساوات کا محض درس و وعظ ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ سب سے بڑی، موثر اور ناقابلِ تردید دلیل بھی تھی۔

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الادب۔

دنیا کے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ آدم ہی سب کے مورث اعلیٰ تھے۔ اگر ایک گھرانے کے تمام ارکان درجے میں یکساں ہوتے ہیں تو پھر آدمؑ کی اولاد میں چھوٹے۔ بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ، آقا غلام کی تفریق کس بناء پر جائز سمجھی جا سکتی ہے؟ خون، رنگ، نسل، دولت وغیرہ کے امتیازات ان لوگوں نے پیدا کیے، جن کے ہاتھ سے حقیقت کا رشتہ نکل چکا تھا اور جو ہوسناکیوں کی بناء پر انسانیت کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہوگئے تھے۔ اللہ کے نزدیک انسانوں میں مراتب کا انحصار حسن عمل پر ہے۔ جس کے پاس عمل کا اندوختہ زیادہ ہوگا، وہ خدا کے نزدیک سب پر فایق ہوگا، اگرچہ کالا اور مفلس ہو۔ وہ لوگ اس سے نیچے رہیں گے جو حسن عمل میں اس کے برابر نہ ہوں گے، خواہ ان کے رنگ کتنے ہی گورے اور ان کی دولت و ثروت کتنی ہی لا تناہی ہو۔

چنانچہ رسول اللہ صلعم کی بارگاہ اقدس میں زیدؓ، اسامہؓ، بلالؓ یا دوسرے مساکین کا درجہ عباسؓ سے کم نہ تھا جو آپ کے چچا تھے۔ جنگ بدر میں وُہ قید ہو کر آئے تو انصار نے اس بناء پر ان کا زر فدیہ معاف کر دینا چاہا کہ عباسؓ کے والد رشتے میں انصار کے بھانجے تھے مگر رسول اللہ صلعم نے فرمایا: ہرگز نہیں، ایک دام بھی معاف نہ کرو۔

آپ مسجد کی تعمیر میں صحابہ کے ساتھ برابر کام کرتے رہے۔ خندق کی کھدائی میں بھی آپ نے برابر حصّہ لیا۔ سفر میں صحابہ کھانا پکانے کا کام مل جل کر کرتے۔ آپ بھی کوئی نہ کوئی کام اپنے ذمے لے لیتے۔ ایک مرتبہ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں لانے کا کام آپ نے سنبھالا۔ فدائیوں نے عرض کیا کہ یہ کام ہم کرلیں گے۔ فرمایا: "میں پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو تم سے ممتاز رکھوں۔ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو ہمراہیوں میں ممتاز بنے۔"

جنگ بدر کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے نکلے تو سواریوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ تین تین کے حصّے میں آیا۔ باری باری ہر فرد سوار تھا۔ حضور صلعم کے بھی دو ساتھی تھے۔ وہ عرض کرتے کہ آپ سوار رہیں۔ ہم پیدل چلیں گے۔ فرمایا: نہ میں چلنے میں تم سے کم طاقت ور ہوں اور نہ ثواب کے لیے میں تم سے کم محتاج ہوں۔

مشہور واقعہ ہے کہ بنی مخزوم میں سے ایک عورت چوری کے جُرم میں گرفتار ہوئی۔ بعض لوگ اسے چھڑانا چاہتے تھے اور اس غرض سے اسامہؓ بن زیدؓ کو سفارشی بنا کر حضور صلعم کی خدمت میں بھیجا۔ آپ نے اسامہ کی درخواست سُنی تو فرمایا: کیا تم حدودِ خداوندی میں سفارش کرتے ہو؟ پھر خطبہ دیا، جس میں ارشاد ہوا، پہلی امتیں صرف اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی جُرم کا مرتکب ہوتا تو اس سے چشم پوشی کی جاتی۔ کوئی معمولی آدمی پکڑا جاتا تو اسے سزا دلاتے۔ خدا کی قسم، اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اسے بھی قطع ید کی سزا ضرور دی جاتی۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے خوب فرمایا:

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں (مولف)

باب ۹۳

فضائل اخلاق

انک لعلی خلق عظیم

—(۳)—

ایثار اخلاق و عادات شریفہ میں ایثار کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے یعنی دوسروں کو اپنی ذات بلکہ اعزہ پر بھی ہر معاملے میں مقدم رکھنا۔ آپ کو حضرت فاطمہؓ سے جس قدر محبت تھی اس کا بیان مشکل ہے۔ جب آپ ملاقات کے لیے تشریف لاتیں تو آپ فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی پر بوسہ دیتے تھے۔ اپنی جگہ بٹھاتے اور عموماً پُوچھتے کوئی خاص کام تو نہیں؟

ایک مرتبہ کسی غزوے میں کچھ کنیزیں آئیں۔ رسول اللہ صلعم انھیں تقسیم فرما رہے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کو بھی ایک خادمہ کی سخت ضرورت تھی کیونکہ عسرت کے باعث کوئی ملازمہ نہ تھی اور گھر کا سارا کام حضرت فاطمہ خود ہی انجام دیتیں۔ چکی پیستیں، پانی کی مشک بھر لاتیں۔ اس وجہ سے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے اور جسم مبارک پر نیل کے نشان نظر آتے تھے۔ سیدۂ عالمؓ حضور صلعم کی خدمت میں پہنچیں۔ حضور صلعم نے معمول کے مطابق پوچھا، کوئی کام ہے؟ سیدہ عالمؓ حیا و خودداری کے باعث کچھ نہ کہہ سکیں۔ حضرت علیؓ نے ان کی ترجمانی کی۔ حضور صلعم نے فرمایا: ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہُوا۔ جب تک ان کا بندوبست نہ ہو لے میں دوسری طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ ایک روایت میں ہے حضرت زبیرؓ کی صاحبزادیاں بھی ایسی ہی درخواست لے کر آئی تھیں۔ حضور صلعم نے فرمایا: بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔

ایک دفعہ آپ کو ایک چادر تحفے میں ملی، آپ کو ضرورت تھی، رکھ لی۔ ایک صاحب حاضرِ خدمت ہُوئے اور کہا، کیا اچھی چادر ہے۔ آپ نے اتار کر ان صاحب کو دے دی۔ وہ لے کر چلے تو لوگوں نے ملامت کی کہ تم جانتے تھے رسول اللہ صلعم کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کو چادر کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا میں نے تو اس لیے لے لی کہ اسی چادر کا کفن بناؤں گا اور یہ میرے لیے باعث برکت ہوگا۔

ایک صحابی کے پاس ولیمے کے لیے کچھ نہ تھا۔ حضور صلعم نے فرمایا: عائشہؓ کے ہاں جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ جا کر لے آئے حالانکہ شام کو حضور صلعم کے ہاں کھانے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اسی طرح ایک غفاری کی مہمانداری کے لیے صرف بکری کا دُودھ تھا جو خود پی کر رات گزارتے تھے۔ دُودھ مہمانوں کو پلا دیا اور خود رات فاقے سے گزاری۔

ایثار کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ اطمینان و راحت کا مقام ہو تو دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ خطرے اور تحمل مشد ائد کا مقام ہو تو انسان خود آگے رہے اور دوسروں کو پیچھے رکھے۔ یہ دونوں پہلو سیرۃ طیبہ میں جابجا نمایاں ہیں۔

سوال اور گداگری سے کراہت

سوال اور گداگری انسانی کردار کے لیے بے حد مضر ہے۔ اس سے احساس خودداری رفتہ رفتہ ماؤف ہو جاتا ہے۔ انسان تن آسان بن جاتا ہے۔ غیرت و حمیت کا آئینہ بے طرح مکدر ہو جاتا ہے۔ محنت و مشقت سے کسب حلال کے بجائے عجز و الحاح سے مانگنے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں میں عزائم امور کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی دالبیت باقی نہیں رہتی۔ جس قوم کے افراد عزائم امور کی لذت سے ناآشنا ہو جائیں، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بامقصد زندگی کی لذت و صورت سے محروم ہو گئی۔ معذور یا واقعی ضرورت مند افراد کا معاملہ الگ ہے لیکن جو لوگ گداگری کو پیشہ بنا لیتے ہیں، وہ پورے معاشرے کے لیے باعث ننگ و عار بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے گداگری کے انسداد پر بھی خاص توجہ فرمائی۔

ایک مرتبہ ایک انصاری نے سوال کیا۔ فرمایا، تمھارے پاس کچھ ہے؟ ایک بچھونے اور پیالے کا ذکر کیا۔ آپ نے دونوں چیزیں منگوائیں اور دو درم میں فروخت کر دیں۔ پھر فرمایا، ایک درم سے گھر میں کھانے کی جنس دے آؤ، دوسری سے رسی وغیرہ خرید کر جنگل میں نکل جاؤ اور لکڑیاں لاکر بیچو۔ پندرہ روز کے بعد وہ انصاری آئے تو ان کے پاس دس درم تھے۔ کچھ کپڑا اور غلہ خریدا اور اسی طرح ایک بے کار آدمی معاشرے کا نہایت فعال رکن بن گیا۔ حضور صلعم نے فرمایا: یہ اچھا ہے یا یہ کہ اپنے چہرے پر گدائی کا داغ لگا کر روز قیامت حاضر ہوتے؟

رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے:

> اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر جائے اور لکڑیوں کا گٹھا پشت پر اٹھا کر لائے اور فروخت کرے اور یوں اللہ اس کی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے، وہ اسے دیں یا نہ دیں۔[1]

حکیم بن حزام کا اپنا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے مانگا۔ آپ نے دے دیا۔ پھر مانگا، پھر دے دیا اور فرمایا،

> حکیم! یہ مال ہرا بھرا اور میٹھا ہے جو اسے سخاوت نفس کے ساتھ لے گا، اسے برکت ہوگی۔ جو نفس کی طمع سے لے گا، اسے برکت نہ ہوگی۔ اس کی کیفیت اس شخص کی سی ہوگی جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔ الید العلیا خیر من الید السفلی۔ (اونچا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے)

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ تعالیٰ وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ۔

حکیمؓ نے پھر عمر بھر کسی سے کچھ نہ مانگا۔[۱]

پھر فرمایا:

مسکین وُہ نہیں جو لوگوں کے پیچھے پھرے۔ کہیں سے ایک لقمہ یا دو لقمے یا ایک کھجور، دو کھجوریں مل جائیں تو دوسرے دروازے پر چلا جائے۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال نہیں کہ ضروریات سے بے نیاز کر دے۔ نہ کوئی اس کا حال جانتا ہے کہ صدقہ دے۔ نہ وہ اٹھ کر لوگوں سے کچھ مانگتا ہے۔[۲]

ایک موقع پر تین چیزوں کو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دیا:

قیل وّ قال و اضاعتہ المال وکثرۃ السوال۔ — فضول باتیں، مال ضائع کرنا اور زیادہ مانگنا۔[۳]

یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اللہ سے دُعا کرے کہ اسے سوال وگداگری کی ذلت سے بچایا جائے تو اللہ بچا دیتا ہے۔ جو خدا سے غنا کا طلب گار ہو، اللہ اسے غنا مرحمت فرماتا ہے جو شخص صبر کرتا ہے اللہ اسے صابر بنا دیتا ہے اور صبر سے بہتر و وسیع تر دولت کوئی نہیں جو کسی کو دی گئی ہو۔

جود و سخا ابن عباسؓ کی روایت ہے:

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس و اجود ما یکون فی رمضان۔[۴] — رسول اللہ صلعم تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور آپ کی سخاوت کا ظہور سب سے بڑھ کر رمضان شریف میں ہوتا تھا۔

حدیث ہے کہ:

ما سُئِلَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن شیٔ قط فقال لا۔[۵] — رسول اللہ صلعم سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی گئی کہ آپ نے جواب میں "لا" یعنی کلمۂ نفی فرمایا ہو۔

ایک مرتبہ کسی نے کچھ مانگا۔ فرمایا: "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، تم میرے ساتھ آؤ۔ حضرت عمرؓ ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا: جب آپ کے پاس کچھ نہیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہے۔ ایک اور صاحب بھی تھے، وہ بولے یا رسول اللہ! آپ دیتے جائیں۔ عرش والا خدا آپ کو محتاج نہ کرے گا۔

یہ سن کر آپ فرطِ بشاشت سے مسکرا دیے۔

---

[۱] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ [۲] ایضاً ایضاً [۳] ایضاً باب من سال الناس تکثرا [۴] ایضاً ایضاً [۵] ایضاً [۶] بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق والسخا [۷] ایضاً ایضاً ایضاً۔

ایک مرتبہ کوئی چار اوقیہ چاندی نذر کر گیا۔ تین اوقیے تو تین ضرورت مندوں کو دے دیے۔ چوتھا لینے والا کوئی نہ آیا۔ رات کے وقت حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ حضور صلعم کو نیند نہیں آتی۔ کبھی اٹھتے ہیں اور نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ذرا لیٹ کر اٹھتے ہیں اور نماز شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا، آپ آرام کیوں نہیں فرماتے؟ حضور صلعم نے چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا مجھے ڈر ہے۔ مبادا یہ میرے پاس ہو اور موت آ جائے۔

ایک مرتبہ ابوذرؓ غفاری حضور صلعم کے ساتھ تھے۔ فرمایا، ابوذرؓ، اگر کوہ احد میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک بھی دینار باقی ہو، بجز اس رقم کے جو ادائے قرض کے لیے رکھ چھوڑوں [۱]

احد بہت بڑا پہاڑ ہے۔ وہ سونے کا بن جائے تو اسے ایک دن میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم تین دن ضرور لگیں گے، ساتھ ہی قرض ادا کرنے کی اہمیت بھی واضح فرما دی اور ارشاد گرامی سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضور صلعم اسی فیاضی اور سخاوت کے باعث مقروض رہتے تھے۔ کوئی چیز حضور صلعم کے پاس آ جاتی تھی تو جب تک تقسیم نہ فرما دیتے مضطرب رہتے۔ ایسے متعدد واقعات کتب حدیث میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

آخر میں حضرت عائشہؓ کا یہ جامع ارشاد پیش نظر رکھ لیجیے:

ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینارًا ولا درھمًا ولا شاۃً ولا بعیرًا ولا اوصٰی بشیءٍ۔

رسول اللہ صلعم نے (دنیا سے رحلت کے وقت) کوئی دینار اور کوئی درہم اور کوئی بکری یا کوئی اونٹ نہ چھوڑا اور نہ کسی شے کے لیے وصیت فرمائی۔

جب باقی ہی کچھ نہ رہا تو وصیت کی کیا صورت تھی؟

سادگی اور بے تکلفی

رسول اللہ صلعم کی پوری حیات طیبہ سادگی اور بے تکلفی میں گزری۔ کسی قسم کے لوازم امارت وغنا اپنے گرد جمع نہ کیے۔ لباس، بستر، کھانا غرض ہر چیز عمر بھر بہت سادہ رہی۔ چٹائی، معمولی فرش یا زمین پر بیٹھنے میں کبھی تکلف محسوس نہ ہوا۔ عدیؓ بن حاتم بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے تو چمڑے کا ایک گدا تھا جس میں کھجور کی پتی بھری ہوئی تھی، وہی عدیؓ کی طرف کھسکا دیا، خود زمین پر بیٹھ گئے۔ عدیؓ نے حضور صلعم کے روبرو گدے پر بیٹھنا خلاف ادب سمجھا۔ چنانچہ دوران گفتگو میں گدا حضور صلعم اور عدی کے درمیان پڑا رہا۔ فرمایا کرتے تھے، گھر میں ایک بستر اپنے لیے، ایک بیوی کے لیے اور ایک مہمان کے لیے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے [۲]

---

[۱] سیرۃ النبی بحوالہ صحیح مسلم [۲] سیرۃ النبی بحوالہ ابی داؤد۔

ازواج مطہراتؓ کے لیے جو مکان بنوائے تھے وہ دس دس بارہ بارہ فٹ کے کچے حجرے تھے، جن میں سے بعض کی دیواریں کچی تھیں اور بعض کے لیے کھجور کی ٹٹیاں کھڑی کر کے اوپر سے لپائی کر دی گئی تھی۔ کھجور کی شاخوں کی چھتیں تھیں۔ اونچائی اتنی کہ آدمی کھڑا ہو کر ہاتھ اوپر اٹھائے تو چھت کو جا لگے۔ عبدالملک اموی کے عہد میں توسیع مسجد نبویؐ کے لیے ان حجروں کو منہدم کرانا ضروری سمجھا گیا تو اہل مدینہ بے اختیار رو رہے تھے۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ یہ حجرے محفوظ رکھے جاتے تاکہ دنیا دیکھتی رسول اللہ صلعم نے روئے زمین پر کس سادگی، بے تکلفی اور زہد و قناعت میں دن گزارے۔

ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ کے ہاں کھانے کے لیے بلایا گیا، دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ دیواروں پر پردے لٹک رہے ہیں۔ باہر ہی سے واپس ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے مراجعت کا سبب پوچھا تو فرمایا: پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ زیب و زینت والے کسی مکان میں داخل ہو۔ اسی قسم کا واقعہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کو بھی پیش آیا۔ آپ کسی غزوے کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے مکان کی چھت کے ساتھ ایک کپڑا باندھ دیا۔ واپس تشریف لائے اور چھت میں بندھا ہوا کپڑا دیکھا تو اسے اتار دیا۔ فرمایا: خدا نے ہمیں اس لیے دولت نہیں دی کہ اینٹوں اور پتھروں کو کپڑے پہنائیں۔

ایک مرتبہ کسی نے کمخواب کی قبا ہدیتہً بھیجی۔ آپ نے ذرا دیر کے لیے پہن لی۔ پھر اتار کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دی۔ وہ روتے ہوئے آئے کہ جو چیز آپ نے ناپسند فرمائی، وہ مجھے عطا کی، فرمایا: پہننے کے لیے نہیں فروخت کر دینے کے لیے بھیجی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے دو ہزار درہم میں فروخت کر دیا۔

صبر و حلم صبر و حلم اور عفو و درگزر کے باب میں صرف اسی امر کا اعادہ کافی ہے کہ آپ نے عمر بھر کسی سے ذاتی بدلا نہ لیا۔ سب کو معاف فرماتے رہے۔

ایک یہودی کے آپ مقروض تھے۔ اگرچہ ادائے قرض کے وعدے میں تین روز باقی تھے، مگر یہودی ہمیشہ سے سرمایہ پرست چلے آ رہے ہیں۔ وہ تین روز پہلے ہی آ کر متقاضی ہوا بلکہ حضور صلعم کے عفو و حلم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہہ گزرا کہ عبدالمطلب کے خاندان کے لوگ بڑے نادہند ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ بھی اس وقت موجود تھے، انھوں نے یہودی کو سختی سے جھڑک دیا۔ رسول اللہ صلعم مسکرائے اور فرمایا: عمرؓ! تمھیں لازم تھا کہ میرے ساتھ اور اس شخص کے ساتھ اور طرح کا برتاؤ کرتے۔ مجھے حسن ادا کے لیے کہتے اور اسے حسن تقاضا سکھاتے۔ پھر یہ فرماتے ہوئے کہ ابھی وعدہ پورا ہونے میں ابھی تین روز باقی ہیں لیکن حضرت عمرؓ سے کہا کہ اس کا قرض ابھی ادا کر دو اور بیس صاع[1]

---

[1] قاضی سلیمان مرحوم فرماتے ہیں کہ صاع ہمارے ہاں کے اوزان کے مطابق دو سیر ساڑھے تین چھٹانک کا ہوتا ہے۔ یہی واقعہ یہودی کے اسلام کا باعث بنا۔ اس نے نبیؐ کے حلم کے مطابق جو کچھ سن رکھا تھا اس کی آزمایش کے لیے یہ حرکت کی تھی۔

سے زیادہ دیا کیونکہ تم نے اسے سختی سے ڈانٹا تھا۔

رؤسائے طائف نے دعوت اسلام کے سلسلے میں حضور صلعم سے جو سلوک کیا تھا، وہ بیان ہو چکا ہے۔ اوباشوں کو برانگیختہ کر کے حضور صلعم پر پتھر برسوائے۔ خود آپ کا ارشاد ہے کہ پہاڑوں کا فرشتہ میرے پاس آیا کہ حکم ہو تو دونوں طرف کے پہاڑ ان پر الٹ دوں۔ فرمایا: نہیں مجھے امید ہے ان کے اخلاف میں سے وہ لوگ اٹھیں گے جو خدا سے واحد کو مانیں گے۔

غزوۂ احد میں دندان مبارک ٹوٹ گئے اور آپ زخمی ہو گئے۔ مگر یہی دعا فرمائی کہ اے خدا میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا، وہ حقیقت حال سے ناآشنا ہیں۔

خطبۂ حج میں آپ نے ایام جاہلیت کے خون اور قرضے ختم کر دیے تو سب سے پہلا اپنے خاندان کا خون اور اپنے خاندان میں سے حضرت عباسؓ کا قرضہ ختم کیا۔

عام خصائل رسول اللہ صلعم نے حسن معاملہ، عدل و انصاف، مہمان نوازی کے معیار قائم کیے۔ آپ شرم و حیا، عزم و استقلال اور شجاعت کا پیکر تھے۔ عائلی زندگی کا بہترین نمونہ حضورؐ نے پیش کیا اور ازواجؓ سے اچھے برتاؤ کے بارے میں بار بار تاکید فرمائی۔ فرمایا: تم میں سے بہتر وہ ہے جو اہل خانہ کے لیے بہتر ہے۔ چرند و پرند سب پر شفقت فرماتے۔ دوسروں کے کام کر دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے اور اس میں ادنیٰ اعلیٰ کی کوئی تمیز نہ تھی۔ کسی کا بھی احسان لینا گوارا نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر جان نثاری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے جن کے لیے فرمایا کہ ان کے مال اور صحبت کا میں سب سے زیادہ ممنون ہوں۔ تاہم ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے جو ناقہ آپ کے لیے پالی تھی، وہ نذر کرنی چاہی تو آپ نے قیمت دے کر خریدی۔ مسجد النبیؐ کی زمین مالک اور ان کے سرپرست ہبہ کر دینے پر اصرار کرتے رہے مگر آپ نے قیمت دے کر لی۔

ادائے عبادات میں بھی سہولت عامہ بطور خاص ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ حضرت معاذؓ بن جبل کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ نماز فجر میں لمبی سورتیں پڑھتے ہیں تو فرمایا: تم میں سے جو نماز پڑھائے مختصر پڑھائے کیونکہ مقتدیوں میں بوڑھے، ضعیف اور کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ زیادہ مدح و ستائش بھی پسند نہ تھی۔ آپ وضو فرماتے تو صحابہ دست مبارک سے گرنے والے پانی کو چلو میں لے کر برکت کے لیے بدن پر مل لیتے۔ پوچھا ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ عرض کیا خدا اور رسولؐ کی محبت میں۔ فرمایا: اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے تو چاہیے کہ جب وہ بات کرے، سچ بولے۔ جب اسے کوئی امانت سونپی جائے تو اس کا حق ادا کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو حق ہمسایگی اچھی طرح نبھائے۔

بعض اہم ارشادات

آپ کے بعض اہم ارشادات یہاں درج کیے جاتے، جن سے اسلام کی تعلیم ۔۔۔ خود حضور صلعم کی عملی زندگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ تم میں سے جب کوئی شخص کسی کو مال اور صورت میں برتر و افضل دیکھے تو چاہیے کہ اس کی طرف بھی دیکھے جو دیکھنے والے سے کمتر اور نیچے ہے[۱]

(دیکھیے افضل و برتر کو دیکھنے سے دل میں حسد پیدا ہوگا جو گوناگوں برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ کمتر شخص کو دیکھنے سے شکر کا جذبہ ابھرے گا جو نیکیوں کا وسیلہ ہے)

۲۔ تو مسلمانوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کی طرح دیکھے گا، جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے پورا جسم بے خوابی اور بخار کے ساتھ پکارتا ہے[۲]

سعدی نے اس حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے:

چو عضوے بدرد آورد روزگار	دگر عضوہا را نہ ماند قرار

۳۔ جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ اسے چاہیے کہ یا تو اچھی بات کہے یا چپ رہے[۳]

۴۔ آپس میں بغض نہ رکھو، حسد نہ کرو، باہم تعلقات نہ توڑو اور اللہ کے بندو، بھائی بھائی ہو جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے[۴]

۵۔ سچائی اور راست بازی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ صدیق ہو جاتا ہے (اسی طرح) جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ برائی آگ میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا کے نزدیک کذاب لکھا جاتا ہے[۵]

۶۔ شہ زور وہ دوسرے کو پچھاڑنا نہیں، شہ زور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے[۶]

(کسی فارسی شاعر نے ہمارے عہد کی حالت کا نقشہ کیا خوب کھینچا:

دستے کہ عنان خویش گیرد	امروز بہ آستین کس نیست)

---

[۱] بخاری، کتاب الرقاق، باب لینظر الی من ہو اسفل منہ [۲] بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس

[۳] بخاری، کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ [۴] بخاری ایضاً باب ما ینھیٰ عن التحاسد [۵] ایضاً باب اینھیٰ عن الکذب۔

[۶] بخاری، ایضاً باب الحذر من الغضب۔

۵۔ کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ کسی قوم کے پیشواؤں اور رہنماؤں نے کتاب اللہ کے مطابق حکومت سے اعراض کر کے خدائی احکام کے خلاف زبردستی اپنے احکام نافذ کرنا شروع کیے ہوں اور اللہ نے اس قوم کے اندر جدال و قتال اور شرارتیں نہ پیدا کی ہوں۔[1]

نورِ حق کے لیے والہیت قرآن مجید میں جابجا اسلام کو نور کہا گیا ہے یعنی حق کی روشنی۔ مثلاً:

۱۔ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ ۔ پیروی کی اس نور کی جو اس کے (رسول اللہ صلعم کے) ساتھ اترا۔

(اعراف: ۱۵۷)

۲۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے اسلام کے لیے سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے۔

(زمر: ۲۲)

۳۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔ اللہ ان کا ساتھی اور مددگار ہے، جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں انھیں تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے۔

(البقرہ: ۲۵۷)

بعض مقامات پر "نور" اس طرح آیا ہے کہ بعض مفسرین کرام کو خیال ہُوا غالباً اس سے مراد خود رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات ہے۔ جیسے سورۂ مائدہ میں ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۔ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ ۔ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس "نور" (رسول اللہ صلعم یا حق کی روشنی) آچکا یعنی وہ روشن کتاب آچکی جس کے ذریعے سے اللہ اپنی رضا و خوشنودی کے پیروں کو سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

(مائدہ: ۱۵-۱۶)

مندرجہ ذیل دعا سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضور صلعم کے قلب منور میں "نورِ حق" کے لیے کس درجہ والہیت اور شیفتگی تھی اور یہ دعا آپ روزانہ پڑھتے تھے:

اللّٰھُمَّ فی قلبی نوراً و فی بصری نوراً و فی سمعی نوراً و عن یمینی نوراً و عن ۔ الٰہی! میرے قلب میں نور ہو اور میری آنکھوں میں نور ہو اور میرے کانوں میں نور ہو۔ اور میرے داہنے نور ہو، میرے [illegible]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام القسم الثانی ص ۱۳۱۔

یساری نورًا و فوقی نورًا و تحتی نورًا و امامی نورًا و خلفی نورًا و اجعل لی نورًا و فی لسانی نورًا و فی دمی نورًا و فی عصبی نورًا و فی شعری نورًا و فی بشری نورًا اللّٰھم اعطنی نورًا اللھم اعظم لی نورًا اللھم اجعلنی نورًا۔

میرے اوپر نور ہو اور میرے پیچھے نور ہو اور میرے آگے نور ہو اور میرے پیچھے نور ہو اور نور کو میرا بنا دے اور میری زبان میں نور ہو اور میرے خون میں نور ہو اور میرے پٹھوں میں نور ہو اور میرے بالوں میں نور ہو اور میرے چہرے پر نور ہو الٰہی مجھے نور عطا فرما۔ الٰہی میرے نور کو بڑھا۔ الٰہی مجھے نور ہی بنا دے۔

سنت رسول پاک صلعم

حضرت علیؓ نے حضور صلعم کی سنت کے متعلق پوچھا۔ فرمایا:

۱۔ المعرفۃ راس مالی — میری اصل پونجی معرفت ہے۔
۲۔ و العقل اصل دینی — عقل سلیم میرے دین کی اصل ہے۔
۳۔ و الحب اساسی — محبت میری بنیاد ہے۔
۴۔ و الشوق مرکبی — شوق میری سواری ہے۔
۵۔ و الذکر انیسی — اللہ کا ذکر میرا انیس و مونس ہے۔
۶۔ و الثقۃ کنزی — اعتماد الٰہی میرا خزانہ ہے۔
۷۔ و الحزن رفیقی — (ہم جنسوں کی فلاح کے لیے) اندوہ قلب میرا رفیق ہے۔
۸۔ و العلم سلاحی — علم میرا ہتھیار ہے۔
۹۔ و الصبر ردائی — صبر میری ردا ہے۔
۱۰۔ و الرضا غنیمتی — رضائے باری تعالیٰ میری غنیمت ہے۔
۱۱۔ و العجز فخری — عاجزی میرا سرمایہ فخر ہے۔
۱۲۔ و الزھد حرفتی — زہد میرا پیشہ ہے۔
۱۳۔ و الیقین قوتی۔ — یقین میری روزی ہے۔
۱۴۔ و الصدق شفیعی — راستبازی اور صداقت میری شفیع یعنی ساتھی ہے۔
۱۵۔ و الطاعۃ حسبی — طاعت حق میری عزت ہے۔
۱۶۔ و الجہاد خلقی — جہاد یعنی راہ حق میں انتہائی سعی و جہد میری جبلی خصلت ہے
۱۷۔ و قرۃ عینی فی الصلوٰۃ۔ — اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

۷۔ راست روی اختیار کرو، باہم محبت بڑھاؤ اور لوگوں کو خدا کی طرف سے بشارت پہنچاؤ۔ تہا عمل تو کسی کو بھی جنت میں نہ لے جائے گا۔[1]

۸۔ جو شہرت کے لیے کام کرے گا، اللہ اسے فضیحت دے گا، جو ریا کے لیے کام کرے گا اللہ اس کی اصل حقیقت لوگوں کو دکھا دے گا۔[2]

۹۔ خبردار! بدگمانی کو اپنی عبادت نہ بنانا۔ بدگمانی تو جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ۔ دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو۔ آپس میں بغض نہ رکھو۔[3]

۱۰۔ اسیروں کو رہائی دلاؤ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ بیماروں کی عیادت کرو۔

۱۱۔ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، انھیں تنگی اور سختی میں نہ ڈالو، خوشخبری اور بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔ مل جل کر رہو۔

۱۲۔ دو نعمتیں ہیں، جن کی قدر اکثر لوگ نہیں جانتے: اول تندرستی دوم فراخ دستی۔

۱۳۔ تم میں سے کوئی موت کی خواہش نہ کرے۔ نیک آدمی تو اس لیے کہ شاید وہ اور نیک کام کرے اور بد اس لیے کہ شاید وہ معافی مانگ لے۔[4]

پانچ مذموم خصلتیں

پانچ خصلتیں ایسی ہیں کہ جب وہ تم پر نازل ہوں تو میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ خصلتیں تم لوگ اختیار کرو:

ا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم میں فواحش کا ظہور اس حد پر پہنچ گیا ہو کہ لوگ علانیہ ان کا ارتکاب کرنے لگیں اور اس قوم میں طاعون اور ان بیماریوں کا ظہور نہ ہوا ہو، جو ان کے باپ دادا میں موجود نہ تھیں۔

ب۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے ناپ اور تول میں کمی شروع کی ہو اور اس قوم کو قحط سالی، گرانی، سخت محنت و مشقت اور حکمرانوں کے ظلم و جور نے گرفت میں نہ لیا ہو۔

ج۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اپنے اموال میں سے زکوٰۃ دینا بند کیا ہو اور اسے آسمان سے بارش سے محروم نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر بہائم نہ ہوں تو بارش بالکل روک دی جائے۔

د۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اللہ اور اس کے رسول کا عہد توڑا ہو اور اس پر اغیار کو دشمن بنا کر مسلط نہ کر دیا گیا ہو اور وہ اس قوم کے اموال کا ایک حصہ نہ چھین لیں۔

---

[1] بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد و المداومۃ علی العمل [2] بخاری، ایضاً باب الریا والسمعۃ۔ [3] رحمۃ للعالمین ص ۳۵۲ بحوالہ بخاری۔ [4] کتاب المرضیٰ باب تمنی المریض الموت۔

کیا تاریخ عالم کی کسی شخصیت کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، جس میں خصائل جمیلہ اور شمائل حسنہ اس پیمانے پر جمع ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے حضور صلعم کی ذات بابرکات میں بہ درجہ کمال جمع کر دیے تھے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی دوسری شخصیت کی ایک ایک خصوصیت، ایک ایک حرکت، ایک ایک عمل اور ایک ایک ارشاد مستند روایات کی بنا پر آج تک اس طرح محفوظ بھی نہیں ہوا، جس طرح رسول اللہ صلعم کے متعلق ایک ایک چیز جمع ہوئی۔ صدق اللہ عز و جل۔

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۔

پس جھاگ تو خشک ہو کر جاتا رہتا ہے (یعنی) وہ کسی کام نہ تھا اور جس میں بندگانِ خدا کے لیے نفع ہو وہ چیز زمین میں باقی رہتی ہے۔

(رعد : ۱۷)

ضمیر اصفہانی کیا خوب کہہ گیا ہے:

نقش بندِ صورت زانساں کہ بایست آفرید
بیش ازیں خوبی بہ ظرفِ حسن گنجایش نداشت

(مولف)

اُسوۂ محمدی کا ایک صفحہ

احتساب احتساب ایک سنہری زنجیر ہے، جس میں تمدن، اخلاق، مذہب اور معاشرت کی تمام جزئیات جکڑی ہوئی ہیں۔ اگر اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے تو دفعتہً نظام عالم کی ایک ایک کڑی درہم برہم ہو جائے۔ اسی غرض سے دنیا نے احتساب کو مختلف صورتوں میں قایم رکھا۔ خاندانوں اور کنبوں نے مختلف رسم و رواج اختیار کیے، جن کی خلاف ورزی موجب ملامت، بلکہ بعض اوقات قوی جُرم خیال کی جاتی ہے۔ سلطنتوں نے قوانین بنائے جو انسان کو ایک خاص نظام کے ماتحت ہر قسم کی مادی، اخلاقی اور مذہبی ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ حکما نے فلسفۂ اخلاق ایجاد کیا، جو اخلاقی قوانین کی پیروی پر جمعیۃ بشری کو مجبور کرتا ہے۔

ہمارا سرمایہ فخر اگر یورپ کو اپنی تہذیب پر فخر ہے کہ وہ انسان کی ہر فروگذاشت پر سختی کے ساتھ گرفت کرتی ہے۔ اگر رومن لا (رومی قانون) کو اپنے اوپر ناز ہے کہ وہ دنیا کے قوائے متضادہ کو اپنے مرکز سے ہٹنے نہیں دیتا، اگر یونان کو اپنے فلسفۂ اخلاق پر گھمنڈ ہے کہ وہ اخلاقی قویٰ کی تربیت کرتا ہے تو ہمیں ان کے بڑے بول سے مرعوب نہیں ہو جانا چاہیے۔ ہم رسم و رواج کے غلام نہیں کہ یورپ کے قوانین معاشرت پر فریفتہ ہو جائیں۔ ہم قانونی سختیاں برداشت کرنے کے خوگر نہیں کہ اپنے ہاتھ کو ہر ہتکڑی کے حوالے کر دیں۔ قیاسات عقلی ہماری غذا سے روحانی نہیں کہ یونانیوں کے طلسم میں پھنس جائیں، بلکہ ہمارے رگ اور پٹھے ایک پاک مذہب کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے گوشت اور خون پر چمڑے کی جگہ مذہب کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ہمارے قلب کو ایک غیر متزلزل مذہبی احساس حرکت دے رہا ہے، پس ہم کو ہر دلفریب رسم و رواج، ہر مرعوب کرنے والے قانون اور ہر متحیر کر دینے والے فلسفے کو چھوڑ کر اپنی باگ صرف اسلام ہی کے ہاتھ میں دینی چاہیے اور اس پر فخر کرنا چاہیے کہ،

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اسوۂ حسنہ مذہب کی قوت احتساب ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع فرض کر کے ہم کو پوری دنیا کی مادی و اخلاقی غلامی سے آزاد کر دیا ہے:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ (احزاب: ۲۱) یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں پیروی و

اتباع کا بہترین نمونہ رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم رسول اللہ کی تقلید کرو کیونکہ ایک شخص کی تقلید کرنے سے دوسرے اشخاص کی تقلید کی نفی نہیں ہوجاتی بلکہ یہ فرمایا، تمہاری تقلید صرف اسی پاک ذات میں محدود ہے کیونکہ تمہیں اعمال صالحہ کا یہ خزانہ دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ اس طرز بیان سے نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع لازم کر دیا گیا، بلکہ ساتھ ہی دوسرے تمام بڑے بڑے انسانوں کے اتباع کی نفی بھی کر دی۔ اس لیے کہ صرف ایک ہی آفتاب ہے جس کی روشنی ظلمت زار دنیا کی ہر اندھیری اور ہر تیرہ و تاریک راہ میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے!

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

(مولانا رومؒ)

آیات و احادیث

اسی آفتاب کی روشنی سے اور سیارے بھی نُور حاصل کرتے ہیں، اس لیے ان کا اتباع بھی ہم پر واجب ہوجاتا ہے:

۱۔ خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔

بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کا دور جو اس کے بعد آئیں گے، پھر وہ لوگ جو اس کے بعد اسوۂ حسنہ کی تقلید کریں گے۔

۲۔ اصحابی کالنجوم۔

میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی اس خصوصیت کا بار بار ذکر کیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔ (اعراف: ۱۵۷)

جو رسول اور نبیٔ امّی کی پیروی کریں گے، جس کی بعثت توراۃ و انجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انھیں نیکی کے کاموں کا حکم دے گا۔ برائیوں سے روکے گا۔ پاک و مفید چیزوں کو ان پر حلال اور ناپاک و مضر چیزوں کو حرام کرے گا۔

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

تم لوگ بہترین امت ہو جسے خدا نے دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نمایاں کیا۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان لاتے ہو۔

لیکن ان آیتوں کی عملی تفسیر ہمیں صرف احادیث کی کتابوں میں ڈھونڈنی چاہیے جن کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے مواقع احتساب کے ایک ایک جزیے کا پتا لگ سکتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہدایت وارشاد کے لیے جو آفتاب اور سیارے پیدا کیے تھے، وہ ہمیشہ ضیا گستر رہتے تھے۔

احتساب کی ترتیب اصلاح نفس سے شروع ہو کر بالترتیب محتسب کے قبیلے اور قوم تک منتہی ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض احتساب اسی ترتیب کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔

اصلاح نفس

آنحضرت صلعم کی ذات پاک جامع فضائل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام زلات کو معاف کر دیا تھا، بااین ہمہ آپ اس کثرت سے نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں پھول کر پھٹ پھٹ جاتے تھے۔ صحابہؓ نے اس ریاضت شاقہ کو دیکھ کر عرض کیا، یا رسول اللہ! خدا نے تو آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، پھر آپ کیوں اس قدر مصروف عبادت رہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

افلا اکون عبداً شکوراً[1] کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ ہونے کی کوشش نہ کروں۔

چنانچہ جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے، جو قلب کو خدا کی طرف سے پھیر دے سکتے تھے یا نفس میں غرور و تکبر پیدا کر سکتے تھے تو آپ نہایت سختی کے ساتھ ان کا انکار فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گھر میں ایک پردہ لٹکا لیا تھا، جس میں تصویریں بنی تھیں۔ آپ کی نظر پڑی تو فرمایا:

اَمِیطِی عَنَّا قِرَامَكِ هذا فانهٗ لا تَزَالُ تَصَاوِيرُهٗ تَعْرِضُ فِي صَلَاتِي[2] ہمارے سامنے سے اپنا یہ پردہ ہٹا لو کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں سامنے آتی رہتی ہیں یعنی خلل انداز ہوتی رہتی ہیں۔

ایک صحابی نے بطور تحفہ کے آپ کو حریر کا ایک جبہ دیا، آپ نے اسے پہن کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد نہایت ناگواری سے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا:

لا ینبغی هذا لِلْمُتَّقِينَ[3] یہ پرہیزگاروں کے قابل نہیں۔

غرور و کبر کا سرچشمہ

غرور و کبر کا سرچشمہ مدح و ستایش ہے۔ امرا و سلاطین کو اسی مرض نے دنیا کی تمام چیزوں سے بالاتر بنا دیا ہے۔ آنحضرت صلعم اگرچہ خیر البشر تھے لیکن اگر کوئی شخص آپ کو انبیائے سابقین پر ترجیح دیتا تھا تو آپ اسے منع فرماتے تھے۔ ایک صحابی اور ایک یہودی میں جھگڑا ہو گیا۔ صحابی نے غصے میں قسم کھائی اور کہا: اس خدا کی قسم جس نے محمد کو تمام دنیا سے افضل بنایا ہے۔" یہودی نے بھی قسم کھائی، اس خدا کی قسم جس نے موسیٰؑ کو تمام دنیا پر ترجیح دی ہے۔" صحابی نے اس پر غصے میں آکر یہودی کے منہ پر طمانچہ مارا۔ اس نے آنحضرت صلعم سے شکایت کی۔ آپ نے

---

[1] بخاری مطبوعہ بولاق ص ۹۹ جزء ۸ (کتاب التہجد باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل [2] بخاری جزء ۱ ص ۸۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی ثوب مصلب) [3] بخاری جزء ۱ ص ۸۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی فروج حریر)

حکم دیا کہ "مجھے موسٰی پر ترجیح نہ دو"۔[1]

احتساب قبیلہ و خاندان

خیرات گھر ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو حکم دیا تھا: وانذر عشیرتک الاقربین (اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے آگے حق پیش کرو اور عذاب الٰہی سے ڈراؤ (الشعراء: ۲۱۴) جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے اپنے پورے قبیلے اور خاندان کو جمع کر کے پیغمبرانہ لہجے میں یہ حکم الٰہی سنایا:

"یا معشر قریش! یا معشر بنی عبد مناف! یا معشر بنی قصی! یا معشر بنی عبد المطلب! اے فاطمہؓ محمدؐ کی بیٹی! تم سب اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ کیونکہ میں تمہیں قیامت کے دن کچھ بھی نفع و نقصان نہ پہنچا سکوں گا! اے فاطمہؓ تجھے مجھ سے صرف جسمانی تعلق ہے اور میں رشتے کی بیل کو صرف دنیا ہی میں سرسبز و شاداب رکھ سکوں گا"۔[2]

یہ ایک عام احتساب تھا، لیکن مخصوص مواقع پر بھی آپ ازواج مطہرات اور اہل و عیال کو نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے رہتے تھے۔ ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ آپ ایک رات اُٹھے اور فرمایا: "سبحان اللہ! آسمان سے فتنہ و فساد کی بارش ہو رہی ہے اور برکات و فضائل کے خزانے کھل گئے ہیں۔ حجروں میں سونے والیوں (ازواج مطہرات) کو جگادو کیونکہ دنیا کی بہت سی کپڑے پہننے والی عورتیں آخرت میں برہنہ نظر آئیں گی"۔[3]

صدقے سے اجتناب میں اہتمام

آپ نے تنزہ نفس اور استغنا کی وجہ سے فقر و فاقہ کے باوجود اپنے اوپر اور اپنے تمام خاندان کے اوپر صدقہ حرام کر دیا تھا۔

امام حسین علیہ السلام نے ایک مرتبہ بچپن میں صدقہ کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی آپ کی نگاہ پڑی تو فوراً ٹوکا "کخ کخ" کیا تمہیں خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا"؟[4] آپ ایک مرتبہ شب کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے پاس آئے اور فرمایا: تم لوگ اٹھ کر تہجد نہیں پڑھتے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا، "یا رسول اللہ! ہماری نیند اور بیداری تو خدا کے اختیار میں ہے، اگر وہ جگائے گا تو جاگیں گے"۔ آنحضرت صلعم خاموش ہو گئے مگر اپنی ران پر افسوس کے ساتھ ہاتھ مارا اور یہ آیت پڑھی:

کان الانسان اکثر شیء جدلا[5] آدمی بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

احتساب قوم

اگرچہ وہ تمام جزئی مواقع، جہاں آنحضرت صلعم نے احتساب کا فرض ادا کیا ہے، احتساب قومی کے تحت میں داخل ہیں، لیکن آپ نے دو موقعوں پر نہایت بلیغ تشبیہ کے ساتھ اپنی اس خصوصیت کا اظہار قوم کے سامنے فرمایا، ایک موقع پر فرمایا:

---

[1] بخاری جزء ۸ ص: ۱۰۸ (کتاب الخصومات: لا تخیروا نی علی موسٰی) [2] ترمذی ص ۵۲۹ کتاب التفسیر [3] بخاری جزء ۲ ص: ۳۰۔

[4] بخاری جزء ۲ ص: ۱۲۸ [5] بخاری جزء اول ص: ۵۰۔

"میری اور میری شریعت کی مثال بعینہٖ اس شخص کی سی ہے، جس نے ایک قوم کے پاس آکر یہ وحشت انگیز خبر سنائی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر تمہاری طرف آتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں ایک "نذیر عریاں" ہوں[1] پس تمہیں ہوشیار ہوجانا چاہیے چنانچہ ایک گروہ نے اس کا کہنا مانا اور وہ رات ہی رات بچ کر نکل گیا، دوسرے گروہ نے اسے جھٹلایا: نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر نے دھاوا مارا اور اس گروہ کا استیعال کر دیا۔"

دوسرے موقعے پر فرمایا:

"میری اور تمام لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ بھڑکائی۔ جب آگ کی روشنی چاروں طرف پھیلی تو پروانے اس پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ اس نے پروانوں کو آگ میں جانے سے روکنا چاہا، لیکن وہ سب اس کے قابو میں نہ آسکے اور آگ میں گھس گئے۔"

"اسی طرح میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر کھینچتا ہوں تاکہ آگ میں داخل ہونے نہ پاؤ، لیکن لوگ اس میں گھسے جاتے ہیں۔"[2]

عقائد کی درستی

آنحضرتؐ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد تصحیح عقاید تھا۔ عقائد میں بدترین چیز شرک فی اللہ تھی اور آنحضرتؐ نے صرف شرک ہی مٹانے کے لیے جہاد کیا، جو احتساب کی آخری منزل ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عقائد ہیں، جو عام دسترس سے باہر ہیں۔ اگر عام لوگوں کو ان میں غور و فکر کرنے کا موقع دیا جائے تو مذہبی عقائد میں بہت سے مفاسد پیدا ہوجائیں اور اسلامی عقائد کی سادگی فنا ہوجائے جو اسلام کا سب سے بڑا زیور ہے۔ اسی غرض سے آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کی یہ خصوصیت قرار دی تھی کہ وہ غیر ضروری چیزوں میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ چنانچہ عہد نبوت میں جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ صحابہ کو زجر و توبیخ کی ہے۔

مسئلہ قضا و قدر

ایک مرتبہ صحابہ مسئلہ قضا و قدر کے متعلق مباحثہ کر رہے تھے جس نے آگے چل کر مسلمانوں کے دو عظیم حریف مقابل فرقے پیدا کر دیے[3] آنحضرت صلعم نے دیکھا تو چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا اور فرمایا:

بھذا امرتم او لھذا خلقتم؟ تضربون القرآن بعضہ ببعض بھذا ھلکت الامم قبلکم[4]	کیا تم لوگوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے یا تم اس لیے پیدا کیے گئے ہو، تم لوگ قرآن کو گڈمڈ کر رہے ہو، گزشتہ قوموں کو اسی قسم کے

---

[1] یعنی ننگا ڈرانے والا۔ عرب میں ہر اہم واقعے کی خبر ننگے ہو کر دیتے تھے [2] بخاری جز ۸ ص ۱۰۱-۱۰۲ [3] یعنی جبری اور قدری
[4] سنن ابن ماجہ ص ۱۰ (باب القدر)

لایعنی مسائل نے برباد کر دیا۔

چاند سورج کا گہن اگرچہ اسلام نے عرب جاہلیت کے تمام توہم آمیز عقائد مٹا دیے تھے، تاہم بعض باتیں رہ گئی تھیں اور کبھی کبھی ان کا ظہور ہو جاتا تھا۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیمؑ نے انتقال کیا تو اتفاق سے اسی دن سورج میں گہن بھی لگ گیا۔ لوگوں کو خیال ہُوا کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی موت کا اثر ہے۔ لیکن آپ نے فوراً اس خیال سے لوگوں کو روکا اور فرمایا، "چاند اور سورج میں کسی کے مرنے اور جینے سے گہن نہیں لگتا[1]"

عبادات عبادات چونکہ روز کی چیزیں تھیں جن میں سہو و غفلت اور بے عنوانی کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اس لیے آنحضرت صلعم کو ان کے متعلق احتساب کی اکثر ضرورت پیش آتی تھی[2]۔ اسلام نے ادائے نماز کے لیے جماعت کو واجب کر دیا تھا، لیکن اکثر لوگ اس میں غفلت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے جماعت میں چند اشخاص کو ڈھونڈا تو نہ پایا، نہایت برہم ہُوئے اور فرمایا،

"جی میں آتا ہے کہ ایک شخص کو امام بنا کر خود ان لوگوں کے پاس چلا جاؤں اور لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر ان کے گھر آگ میں پھونک دوں[3]۔"

نماز میں تخفیف کی تاکید بعض لوگ جب امامت کرتے تھے تو نماز میں طول دیتے تھے، جس سے کاروباری اور ضعیف لوگ گھبرا جاتے تھے۔ ایک شخص نے اسی بنا پر امام کی شکایت کی۔ آپ کو معمول سے زیادہ غصّہ آگیا اور فرمایا،

"تم مذہب سے لوگوں کو متنفر کر رہے ہو۔ امام کو نماز میں تخفیف کرنی چاہیے کیونکہ ان میں مریض، ضعیف، کاروباری ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں[4]۔"

خشوع فی الصلوٰۃ نماز کا اصلی مقصد خشوع و خضوع ہے لیکن جب کسی کے طرزِ عمل سے ان کا ظہور نہیں ہوتا تھا تو آنحضرت صلعم اسے تنبیہ فرماتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے نہایت عجلت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز پڑھ چکا تو آپ نے فرمایا، "نماز کو دہراؤ، تم نے نماز پڑھی ہی نہیں"۔ اس نے تین بار نماز دہرائی اور آپ نے تینوں بار ٹوکا، آخر میں اس نے کہا "اب میں اس سے بہتر نماز نہیں پڑھ سکتا"۔ آپ نے تکبیر، قرأت، رکوع و سجود، قیام اور قعود کے وہ طریقے بتائے

---

[1] حضرت علامہ اقبالؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ یہ ارشاد بھی رسول اللہ صلعم کے نبی برحق ہونے کی ایک بیّن شہادت ہے۔ لوگوں میں خود بخود یہ خیال پیدا ہُوا تھا کسی نے پیدا نہیں کیا تھا لیکن چونکہ غلط تھا اس لیے حضور صلعم نے اس کا رد برسرِ عام کر دیا۔ [2] بخاری جز: ۲ ص: ۳۴۔

[3] صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد: ا ص: ۲۴۳ [4] بخاری جز: ا ص: ۲۶۰۔

جن سے اطمینان، سکون، وقار اور اعتدال کا اظہار ہوتا تھا۔[1]

جزئیات پر نظر

عبادات اور مقدمات عبادات کے متعلق آپ نہایت معمولی اور جزئی باتوں پر بھی گرفت فرماتے تھے۔ ایک بار سفر میں تھے۔ نماز عصر کا وقت آگیا، صحابہ نے پاؤں کا مسح کیا۔ آپ نے دیکھا تو دور سے بہ زور آواز دی:

ویل للاعقاب من النار[2]۔ ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔

ابتدائے اسلام میں نماز کے قیام و ادا کی حالت بالکل ابتدائی تھی اور تمام جزئیات و فروع ابھی واضح نہیں ہوئے تھے اس طرح کا بتدریج ارتقاء مذہب کی ہر تعلیم میں ہوتا ہے۔ موجودہ حالت ایک مدت کے تغیرات کے بعد پیدا ہوئی تھی چنانچہ ابتدا میں اکثر لوگ مسجد کے اندر تھوک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے مسجد میں تھوک کا دھبا دیکھا، خود اٹھے اور دست مبارک سے اسے مٹا دیا۔ پھر فرمایا: "نماز میں ہر شخص خدا سے سرگوشی کرتا ہے" اس لیے کسی شخص کو قبلہ کی طرف تھوکنا نہیں چاہیے، البتہ دائیں بائیں یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوک سکتا ہے۔[3]

یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت مسجد کا فرش پختہ نہ تھا، صحن مسجد اور عام سطح زمین میں سوا حدود عمارت کے اور کوئی امتیاز قایم نہ تھا۔ ریتلی زمین تھی اور وہ ہر طرح کی رطوبت جذب کر لیتی تھی لیکن اب مسجدوں کا داخلی حصہ (ہی نہیں صحن کا فرش بھی) پختہ ہوتا ہے، پس وہاں تھوکنا مسجد کی صفائی اور نمازیوں کے حقوق نشست پر حملہ کرنا ہے۔

بدعت

نظام مذہبی کا سب سے زیادہ خطرناک مرض بدعت ہے۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان اس مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے تاہم جاہلیت کے زمانے کی بہت سی بدعتوں کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی تھی، اس لیے آپ ہمیشہ ان کے مٹانے میں مصروف رہتے تھے۔

پیدل چلنے کا حلف

بدعت کی مختلف قسمیں اور مختلف مظاہر ہیں لیکن اس کی بدترین شکل رہبانیت اور جوگ ہے، جو یہود و نصاریٰ کے مذہب کا جزو بن گئی ہے۔ وَرَهْبَانِيَّةً ابتدعوها۔ (اور رہبانیت انھوں نے خود نکالی۔ الحدید: ۲۸) چونکہ عرب پر یہود و نصاریٰ کا مذہبی اثر غالب تھا اس لیے وہاں بھی اس قسم کی بدعات پیدا ہو گئی تھیں۔

ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے جا رہا ہے۔ آپ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا: "اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ ضعف کی وجہ سے بیٹوں کے سہارے چلتا ہے"۔ آپ نے فرمایا: "اس نے اپنے آپ کو کیوں عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟ خدا اس سے بے نیاز ہے"۔

---

[1] بخاری جز ۱، ص: ۱۴۸ [2] بخاری جز ۱، ص: ۲۷ [3] بخاری جز ۱، ص: ۸۶

ننگے پاؤں چلنے کی منت

عقبہ بن عامر کی بہن نے خانہ کعبہ تک ننگے پاؤں پیدل چلنے کی منت مانی اور عقبہ کو آنحضرت صلعم کے پاس بھیجا کر پوچھ آئیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا "سواری پر بھی جاسکتی ہے۔"[۱]

کھڑے رہنا اور بات نہ کرنا

ایک مرتبہ آپ خطبہ دے رہے تھے اور لوگ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر سن رہے تھے لیکن ایک شخص کھڑا تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا، اس نے نذر مانی ہے کہ ہمیشہ کھڑا رہے گا، سایے میں نہ بیٹھے گا۔ کسی سے بات چیت نہ کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ آنحضرت صلعم نے حکم دیا کہ اسے بیٹھنا چاہیے۔ سایے میں آنا چاہیے، گفتگو کرنی چاہیے اور روزے کو بھی پورا کرنا چاہیے۔[۲]

ناک میں نکیل

اسی طرح آپ کو ایک شخص نظر آیا جسے ایک آدمی ناک میں نکیل ڈال کر خانہ کعبہ کا طواف کرا رہا تھا۔ آپ نے اس کی ناک کی رسی کاٹ دی اور فرمایا "اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔"[۳]

تشدد آمیز مذہبی انہماک

لیکن ان بدعات سے زیادہ ان اصول کا مٹانا ضروری تھا جن کی بنا پر بدعات پیدا ہوتی ہیں۔ بدعات کا سب سے بڑا سرچشمہ، تشدد آمیز مذہبی انہماک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے نظام عبادات کو نہایت سہل و آسان طریقے پر قائم کیا ہے۔ اس لحاظ سے اگرچہ خود اسلام کے سنگ بنیاد پر بدعت کی عمارت قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاہم ابتدا میں صحابہ کا ایک پرجوش و مخلص گروہ نہایت شدت کے ساتھ عبادت میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ جب آنحضرت صلعم نے ایک دن چھوڑ کے روزہ رکھنا شروع کیا تو اکثر صحابہؓ نے بھی اس کی تقلید کی، لیکن آپ کو نظر آیا کہ یہی چیز بدعت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ آپ نے صحابہؓ کو سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اس پر بھی لوگ باز نہ آئے تو معمول کے خلاف متصل روزہ رکھنا شروع کر دیا کہ لوگ خود گھبرا کر باز آجائیں۔[۴] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کثرت صوم و صلوٰۃ سے اسی بنا پر روک دیا تھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو بھی شدت زہد سے منع فرمایا تھا اور آپ (صلعم) نے ان کی تائید کی تھی۔[۵]

رسم و رواج کا انسداد

رسم و رواج کو جب استحکام ہوجاتا ہے تو بدعات کی طرح ان کا چھوڑنا بھی نہایت شاق گزرتا ہے حالانکہ اکثر حالتوں میں وہ بدعات سے کم ضرر رساں ثابت نہیں ہوتیں اور بڑی قیامت یہ ہے کہ بعض اوقات مذہبی حیثیت پیدا کرلیتی ہیں۔

عرب میں بہت سی مضر رسمیں جاری ہوگئی تھیں، جن کی پابندی نہایت ضروری خیال کی جاتی تھی، اس لیے بدعات کے ساتھ ساتھ ان کا بھی انسداد کیا گیا۔

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۰۱، [۲] بخاری جزء ۸ ص ۱۴۳ [۳] بخاری جزء ۸ ص ۱۴۳ [۴] بخاری جزء ۸ ص ۱۴۲، [۵] بخاری جزء ۸ ص ۳۲

میت کا ماتم عرب کے جذبات نہایت رقیق و لطیف تھے۔ اس لیے وہ اعزہ و اقارب کی موت سے نہایت متاثر ہوتے تھے، جس کا اظہار مختلف حیثیتوں سے کیا جاتا تھا۔ عورتیں نہایت شدت کے ساتھ میت پر گریہ و بکا کرتی تھیں۔ منہ نوچنا، سر کے بال منڈوا ڈالنا، گریبان چاک کر دینا، شوہر کی موت پر برسوں تک خاص پابندیوں کے ساتھ گھر سے باہر نکل کر ماتم کرنا عرب کی عورتوں کا عام شعار تھا۔ آنحضرت صلعم نے ان تمام رسوم کو نہایت سختی سے مٹایا، شخصی حالتوں کے علاوہ میت پر قومی حیثیت سے بھی ماتم کیا جاتا تھا، یعنی قبیلے کی بہت سی عورتیں جمع ہو کر میت کے محاسن و فضائل بیان کرتیں اور باہم روتی تھیں۔ اسی رسم کا نام "نیاحہ" ہے۔ آنحضرتؐ کے زمانے تک یہ رسم قائم تھی، لیکن آپ کے سامنے جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے تو اس طرح کی عورتوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی۔

حضرت ابو سلمہؓ کی شہادت حضرت ام سلمہؓ کو جب اپنے شوہر کے انتقال کی خبر ملی تو بہ حسرت بولیں "مسافر مسافرت میں مرا۔ اس پر اس قدر گریہ و بکا کروں گی کہ یادگار رہے گا"۔ چنانچہ اس غرض سے اٹھیں تو عرب کے دستور قدیم کے مطابق ایک عورت نے گریہ و بکا میں ان کا ساتھ دینا چاہا۔ آنحضرت صلعم نے دیکھا تو فرمایا، کیا اس گھر میں شیطان کو داخل کرنا چاہتے ہو، جس سے خدا نے اسے نکال دیا ہے"[۱]۔

حضرت جعفرؓ کی شہادت جب حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی شہادت کی خبر آئی تو ان کی عورتوں نے اسی طریقے سے نوحہ کرنا شروع کیا۔ ایک شخص نے آنحضرتؐ کو خبر کی۔ آپ نے منع کرنے کا حکم دیا، لیکن وہ ناکام واپس آیا۔ آپ نے اسی غرض سے دوسری مرتبہ پھر اسے بھیجا، اس پر بھی کچھ اثر نہ ہوا تو تیسری بار فرمایا، "جا کر ان عورتوں کے منہ میں خاک جھونک دو"[۲]۔

جنازے کے مراسم جنازے کے متعلق بھی اسی قسم کی متعدد رسمیں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اہل عرب جنازے کے ساتھ سواری پر جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اشخاص کو دیکھا کہ وہ ایک جنازے کے ساتھ سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ فرمایا، "کیا تم شرم نہیں آتی کہ فرشتے پیدل ہیں اور تم سواری پر جا رہے ہو"[۳]۔

جنازے کی مشایعت صرف کرتہ پہن کر کرتے تھے۔ اظہار غم کے لیے چادر اتار ڈالتے تھے۔ چادر عرب کا عام لباس تھا آنحضرتؐ نے اسی وضع میں چند اشخاص کو دیکھا تو فرمایا، "کیا جاہلیت کے طریقے پر عمل کر رہے ہو"[۴]۔

عورتوں کی شرکت جنازہ جنازے میں عورتیں بھی عموماً شریک ہوتی تھیں، چنانچہ آپ نے چند عورتوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھا، "کیوں بیٹھی ہو؟" بولیں، "ایک جنازے کا انتظار ہے"۔ فرمایا، "کیا اس کو غسل دو گی؟" ان سبھوں نے کہا، "نہیں"۔ پھر فرمایا، "تو کیا لاش کو کندھا دو گی؟" ان سبھوں نے کہا، "نہیں"۔

۱؎ صحیح مسلم جلد اول ص ۳۴۰ ۲؎ صحیح مسلم جلد ۱ ص ۳۴۵ ۳؎ سنن ابن ماجہ ص ۲۵۰ ۴؎ سنن ابن ماجہ ص ۱۵۱۔

پھر فرمایا: "تو کیا لاش کو قبر میں اتار دو گی؟" بولیں "نہیں"۔ تو آپ نے فرمایا: "پھر واپس جاؤ"[۱]

فخر وغرور کی ممانعت

عرب کی فخر پسند طبیعت ہمیشہ باپ دادا کے کارناموں کا ذکر نہایت بلند آہنگی سے علی رؤس الاشہاد کرتی تھی۔ یہاں تک کہ زمانۂ حج میں بھی یہ داستان پارینہ تازہ کی جاتی تھی۔ اذکروا اللہ کذکرکم اباءکم او اشد ذکرا۔ (تو چاہیے کہ جس طرح پہلے اپنے آباو اجداد کی بڑائیوں کا ذکر کرتے تھے، اب اسی طرح اللہ کا ذکر کیا کرو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ البقرہ: ۱۹۹)۔ اس کو "مناشرت" کہتے تھے۔ فخر وغرور کے اظہار کا یہ طریقہ اکثر بڑی بڑی نزاعیں قائم کر دیتا تھا۔ اسلام نے اس رسم کو بالکل ہی مٹا دیا، لیکن اس کا اثر مختلف صورتوں میں پھیل گیا تھا منجملہ ان کے ایک صورت یہ تھی کہ باپ دادا کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے بھی قسم کھائی آپ نے فرمایا: "خدا باپ دادا کے نام کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، صرف خدا کی قسم کھانی چاہیے، ورنہ خاموشی بہتر ہے"[۲]

اخلاقی اصلاح

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد اصلاح اخلاق و تزکیہ نفس تھا، جسے خود آپ نے ظاہر فرما دیا تھا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ میں اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔

اور یہ مقصد ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہتا تھا۔ اصولی طور پر آپ نے اخلاق کے متعلق جو اصلاحیں کیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، جزئی طور پر جب کسی شخص سے کسی قسم کی بداخلاقی کا ظہور ہوتا تھا تو آپ فوراً اسے تنبیہ فرما دیتے تھے۔ چنانچہ احادیث میں اس کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہیں، جن کے جزئیات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

انسداد گداگری

اسلام نے زکوٰۃ کا ایک مستقل نظام قائم کر دیا تھا کیونکہ خاص خاص لوگ اس کے حقیقی مستحق تھے۔ عام طور پر اسلام گداگری اور مفت خوری کو نہایت ذلیل پیشہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیر مستحق لوگوں کو گداگری سے نہایت سختی کے ساتھ روکتے تھے۔

ایک انصاری کی مثال

ایک مرتبہ ایک انصاری نے آپ سے سوال کیا۔ آپ نے پوچھا: "تمہارے گھر میں کچھ پونجی بھی ہے؟" اس نے کہا: "ایک ٹاٹ ہے جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں۔ ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "جا کر اسے لے آؤ۔" وہ جا کر اٹھا لایا، آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے بغرض فروخت پیش کیا۔ ایک صحابی نے ایک درم پر لینا چاہا، دوسرے صحابی نے قیمت میں اضافہ کر کے دو درم پر لے لیا۔ آپ نے دونوں درم اس انصاری کے حوالے کیے اور فرمایا: ایک درم کا غلہ لے کر گھر میں دے آؤ، دوسرے درم کا ایک بسولا

---

[۱] سنن ابن ماجہ ص: ۳۹۷ [۲] سنن ابن ماجہ ص: ۳۹۷

خرید کر میرے پاس لاؤ" وہ بسولا خرید لایا۔ آپ نے خود دست مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور حکم دیا کہ جنگل میں جا کر لکڑی کاٹو اور بیچو۔ پندرہ دن تک میں تمھاری صورت نہ دیکھوں"۔ وہ لکڑی کاٹ لایا اور اسے فروخت کیا۔ دس درم ہاتھ آئے۔ یہ رقم لے کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: "اس رقم سے کچھ غلّہ اور کچھ کپڑا خرید کر کھاؤ پہنو۔ گداگری سے یہ بہتر ہے۔ وہ تو آدمی کے چہرے کا داغ ہے، صرف اپاہج لوگوں کے لیے جائز ہو سکتی ہے"[1]

رشوت خوری عدل و انصاف کی بربادی اور ظلم کی روح خبیث کا سب سے بڑا سبب رشوت خوری ہے۔ عہد نبوت میں چونکہ آنحضرت صلعم کے فیض محبت سے صحابہ کا معیار اخلاق نہایت بلند ہو گیا تھا۔ اس لیے رشوت خوری کی مثالیں نہیں ملتیں۔ تاہم جب کبھی کسی کے طرز عمل پر رشوت کا شبہ بھی ہوتا تھا تو آنحضرت صلعم اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔ حکام و عمال کو اکثر رشوتیں نذر و ہدیہ کے ذریعے سے دی جاتی ہیں۔ آنحضرت صلعم کے زمانے میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ آپ نے قبیلۂ ازد کے ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ اس نے واپس آ کر آنحضرت صلعم کے سامنے صدقے کا مال پیش کیا اور کہا: "اتنا مسلمانوں کا مال ہے اور اس قدر مجھے ہدیہ ملا ہے"۔ چونکہ اس قسم کا ہدیہ رشوت کا ذریعہ بن سکتا تھا اور اگر علانیہ اس کا انسداد نہ کیا جاتا تو اور لوگ بھی اس طریقے سے فائدہ اٹھاتے، اس لیے آپ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا: اس عامل کو دیکھو جو کہتا ہے کہ یہ مال مسلمانوں کا اور یہ مال میرا ہے۔ ذرا وہ اپنے گھر میں تو بیٹھ کے دیکھے کہ اس کے پاس ہدیہ آتا ہے یا نہیں؟"[2]

خیانت کا انسداد معاملات میں خیانت، چالاکی اور خدع و فریب کا سب سے زیادہ موقع تجارتی کاروبار میں مل سکتا ہے، اس لیے آنحضرت صلعم خاص طور پر اس کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بازار میں سے گزرے اور ایک شخص کے غلّے کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کے دیکھا تو نمی محسوس ہوئی چونکہ بھیگنے سے غلّے کا وزن بڑھ جاتا ہے، اس لیے آپ نے فرمایا: "جو شخص دھوکا دیتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں"[3]

چونکہ عرب میں غلّہ بہت کم آتا تھا اس لیے جب باہر سے سوداگر غلّہ لاتے تھے تو لوگ شہر سے باہر ہی تخمیناً خرید لیتے تھے، لیکن اس سے کئی طرح کے نقصانات پیدا ہوتے تھے۔ اول تمام شہر محروم رہ جاتا تھا، دوسرے یہ ایک غیر معین و غیر معلوم بیع تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا۔ آپ لوگوں کو عموماً اس پر سزا دیتے تھے[4]

حفظ الید و حفظ اللسان اسلام نے ایک عظیم الشان اخلاقی اصول یہ قائم کیا تھا،

المسلم من سلم المسلمون من یدہٖ و من لسانہٖ۔ مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو ایذا نہ پہنچے۔

---

[1] سنن ابن ماجہ ص: ۱۶۹ [2] صحیح مسلم جلد ۲ ص: ۱۱۳ [3] سنن ابن ماجہ ص: ۱۶۳ [4] بخاری جزء ۳ ص: ۶۸۔

اگرچہ اس اصول کی خلاف ورزی کا اثر ہر موقع پر بُرے نتائج پیدا کرتا ہے، تاہم برابر کے درجے کے لوگ انتقام سے گو اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں، کمزور انسانوں کو تو اس کا بھی موقع نہیں مل سکتا۔ چنانچہ اس قسم کے موقعوں پر جب کوئی شخص اس اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا تھا تو آپ فوراً ٹوک دیتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے غلام کو ماں کی گالی دی۔ آپ نے فرمایا: "تم اس کو گالی دیتے ہو؟ تم میں زمانۂ جاہلیت کا اثر ابھی باقی ہے۔ تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں، جنھیں خدا نے تمھارے سپرد کر دیا ہے۔ جو تم کھاؤ، وہی ان کو کھلاؤ، جو تم پہنو، وہی ان کو پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لو۔ اگر لیتے ہو تو ان کی اعانت کرو۔"[۱]

حضرت ابو مسعودؓ انصاری کہتے ہیں: "میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ یکایک پیچھے سے ایک آواز آئی "اے ابو مسعودؓ! ہوشیار! خدا کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے۔" میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو آنحضرت صلعم تھے۔ حضرت ابو مسعودؓ پر اس کا یہ اثر پڑا کہ انھوں نے غلام کو آزاد کر دیا۔[۲]

مدّاحی اور عیش پروری کا انسداد

انسان خوشامد پسند ہے اور مداحی اس دبی ہوئی چنگاری کو اور بھی ابھار دیتی ہے امراء و سلاطین کو اسی نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود مدح سے نفرت تھی۔ اور لوگوں کو بھی اس سے منع فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک آدمی نہایت مبالغہ آمیز طور پر ایک شخص کی مدح کر رہا تھا۔ آپ نے دیکھا تو فرمایا: "تم نے اسے ہلاک کر دیا۔"[۳]

عیش پرستی بظاہر تمدن کا زیور ہے، لیکن درحقیقت اس کے اندرونی نظام کا اصلی گھن یہی چیز ہے۔ آنحضرت صلعم کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ آپ تمام لوگوں کو اسی سادگی کی تعلیم دیتے تھے اور جب کبھی کوئی چیز اس کے خلاف نظر سے گزرتی تو اس سے بیزاری ظاہر فرماتے تھے۔

ضرورت سے زائد عمارت

ایک مرتبہ آپ راستے سے گزرے تو ایک بلند عمارت نظر آئی۔ آپ نے فرمایا کس کا مکان ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام لیا۔ آپ خاموش ہو گئے، لیکن دل میں بات رکھ لی۔ وہ انصاری آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ آپ نے منہ پھیر لیا۔ انھوں نے اپنے دوستوں سے آنحضرت صلعم کی ناراضی کا سبب پوچھا تو لوگوں نے واقعہ بیان کیا۔ وہ فوراً گئے اور اس مکان کو منہدم کر دیا۔ آپ دوسری بار اس طرف سے گزرے تو فرمایا کہ وہ عمارت کیا ہوگئی؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! صاحب خانہ نے آپ کی ناراضی کے خوف سے اس کو گرا دیا۔ آپ نے فرمایا: ہر وہ گھر جو ضرورت سے زاید ہو، صاحب خانہ پر وبال ہے۔[۴]

آرائشی پردے

ایک مرتبہ آپ کسی لڑائی سے واپس آئے، حضرت عائشہؓ نے شوق و محبت کے ساتھ گھر کو ایک

---

[۱] بخاری جلد ۱ ص ۱۱۱ [۲] ابوداؤد ص: ۳۴۸ جلد: ۲ (باب فی حق المملوک) [۳] بخاری جز: ۳ ص: ۱۷۷ [۴] ابوداؤد جلد: ۲ ص ۳۵۶ (کتاب الادب، باب ماجاء فی البنا)

نہایت رنگین پردے سے سجایا۔ آپ تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے سلام کیا، لیکن آپ کے چہرے سے ناراضی کے آثار ظاہر ہوئے اور سلام کا جواب تک نہ دیا۔ پھر خود دست مبارک سے پردے کے دو ٹکڑے کر دینے اور فرمایا کہ خدا نے ہمیں مٹی اور پتھر کے آراستہ کرنے کا حکم نہیں دیا[1] حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں۔

عفت و عصمت اسلام پاکبازی اور عفت کی تعلیم دینے کے لیے آیا تھا:

والذین لفروجھم حٰفظون۔ کامیاب مسلمان وہ ہیں جو عفیف اور پاکباز ہیں۔

اس بنا پر جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے جن سے مسلمانوں کی اس خصوصیت پر حرف آسکتا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اس سے تعرض فرماتے تھے۔

حضرت فضلؓ بن عباسؓ نہایت وجیہ آدمی تھے۔ زمانۂ حج میں آنحضرتؐ نے انھیں اپنے ساتھ سوار کر لیا تھا۔ ایک خوش رو عورت آنحضرت صلعم کی طرف فتویٰ پوچھنے کے لیے بڑھی۔ فضلؓ نے اس کو شوق کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ آنحضرتؐ نے خود دست مبارک سے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر منہ اس کی طرف سے پھیر دیا۔[2]

ستر عورت کی تاکید یورپ کو آج تہذیب و تمدن پر بڑا ناز ہے اگرچہ یورپ کی اخلاقی حالت کے اصلی مناظر نہایت نفرت انگیز ہیں۔ بظاہر ہر انگریز کو ستر عورت کا خیال رہتا ہے اور کسی نے کسی انگریز کو راہ میں برہنہ تن بہت کم دیکھا ہوگا، لیکن اسلام کی تہذیب اس بارے میں صرف نمایشی لباس آرائی ہی کو کافی نہیں سمجھتی۔ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو میدان میں برہنہ نہاتے ہوئے دیکھا، فوراً منبر پر تشریف لائے اور ایک عام خطبہ دیا:

"خدا صاحبِ حیا کو پسند کرتا ہے پس تم میں سے جو کوئی غسل کرے، چاہیے کہ پردہ ڈال لیا کرے۔"

آنحضرت صلعم کو ستر عورت کا اس قدر خیال تھا کہ ایک مرتبہ مسورؓ بن مخرمہ نے ایک بھاری پتھر اٹھایا۔ اس حالت میں ان کا کپڑا گر گیا۔ آپ نے فوراً ٹوکا کہ کپڑا اٹھاؤ۔ برہنہ نہ ہو[3] لیکن یورپ کی ستر پوشی کا یہ حال ہے کہ غسل خانوں، حماموں، بحری ساحلوں اور پیراکی کے حوضوں میں صدہا متمدن انسان برہنہ ہو کر ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں۔

اصلاح شئون النساء اس معاملے میں عورتوں کی حالت مختلف حیثیتوں سے قابل توجہ اور محتاج اصلاح تھی۔ عرب میں مخنثوں کا ایک گروہ موجود تھا، جو علانیہ گھروں میں آتا جاتا تھا۔ ایک بار ایک مخنث نے ازواج مطہراتؓ کے سامنے ایک عورت کے محاسن بالکل ایک مرد کی نظر و ذوق سے بیان کیے۔ آنحضرت صلعم

---

[1] ابوداؤد ص: ۲۱۶ جلد ۲ [2] بخاری جزء ۸ ص: ۵۱ [3] ابوداؤد جلد ۲ ص: ۲۰۱

نے فوراً حکم دیا کہ یہ لوگ گھر میں نہ گھسنے پائیں[1]

عرب کی عورتوں میں جو بداخلاقیاں پھیل گئی تھیں ان میں ایک بداخلاقی یہ بھی تھی کہ بعض عورتیں مردوں کی وضع اختیار کرتی تھیں۔ آنحضرت صلعم نے ان پر عموماً لعنت بھیجی ہے۔ جب کبھی کسی عورت کی وضع کو مردوں سے بلاقصد بھی مشابہت ہوجاتی تو آپ فوراً ٹوک دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہؓ دوپٹہ اوڑھ رہی تھیں۔ آپ نے دیکھا تو فرمایا:

لیۃ لا لیتین - ایک تہ کرکے اوڑھو، دو تہ نہ کرو۔

کیونکہ دو تہ کرنے سے عمامہ کے ساتھ مشابہت پیدا ہوجاتی، جو مردوں کی خاص وضع ہے۔ آپ کو اس پر اس قدر اصرار تھا کہ ایک عورت نے پردے سے آپ کو ایک خط دینا چاہا، اس کے ہاتھوں میں مہندی نہ تھی۔ آپ نے فرمایا، یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا؟" اس نے کہا، "میں عورت ہوں" فرمایا، "اگر تم عورت ہو تو مہندی لگاؤ۔"

غیر محتاط لباس کی ممانعت

اکثر عورتیں نہایت غیر محتاط لباس پہنتی تھیں۔ اس کے متعلق قرآن حکیم میں آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی اس قسم کی بے احتیاطی ملاحظہ فرماتے تھے تو فوراً روک دیتے تھے۔ حضرت اسماءؓ بن ابی بکرؓ آپ کے پاس ایک کپڑا پہن کے آئیں تو آپ نے منہ پھیر لیا، پھر فرمایا: "عورت بلوغ کے بعد صرف منہ اور ہاتھ کھلا رکھ سکتی ہے"[2]

عورتیں عموماً راستوں میں مردوں کے دوش بدوش چلتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ مسجد سے نکلے تو دیکھا کہ مرد و عورت دونوں ساتھ ساتھ راہ میں چل رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا، "تم کو درمیان راہ چلنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ راستے کے کنارے چلنا چاہیے" اس کے بعد سے عورتیں دیواروں سے لگ کر چلنے لگیں۔

اس قسم کے بیسیوں واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں۔

اصلاح ذات البین

اسلام نے مسلمانوں پر سب سے بڑا احسان الٰہی یہ جتایا ہے؛

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۔ خدا نے تم کو باہم دشمنی کے بعد بھائی بھائی بنا دیا۔

(آل عمران: ۱۰۳)

لیکن باہمی اختلاف و تنازع سے یہ رشتۂ اخوت ٹوٹ سکتا تھا۔ اس لیے آنحضرت صلعم کے فرائض احتساب میں سب سے اہم فرض رفع نزاع تھا۔ چنانچہ جب کبھی آپ کو کسی شر و فساد خانگی کی خبر ملتی تو آپ جاتے اور اصلاح فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں باہم کچھ ناچاقی پیدا ہوگئی ہے۔ آپ چند صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور معاملے کے سلجھانے میں اس قدر دیر لگی کہ نماز کا وقت آگیا۔ چنانچہ حضرت بلالؓ کے درخواست کرنے پر حضرت ابوبکرؓ

---

[1] مسلم جلد ۲ ص: ۲۴۴ [2] ابوداؤد جلد ۲ ص: ۲۱۱

نے نماز پڑھائی۔[1]

عبداللہ بن ابی بن سلول ایک بار نہایت گستاخانہ پیش آیا، یہاں تک کہ صحابہ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ لڑنے بھڑنے پر تیار ہو گئے، اس پر عبداللہ بن ابی کے حامی بھی اٹھے اور فریقین باہم دست و گریبان ہو گئے، لیکن آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کو سمجھا بجھا کر الگ کیا اور فرمایا کہ صلح فساد سے بہتر ہے۔"[2]

واقعۂ افک کے متعلق خود مسلمانوں کے دو قبیلوں اوس و خزرج میں سخت نزاع قائم ہو گئی اور دونوں فریق آمادۂ جنگ ہو گئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔

مراعات ادب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑوں کے ادب و تعظیم کا نہایت خیال رہتا تھا۔ معمولی باتوں پر بھی گرفت کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود کے چھوٹے بیٹے نے گفتگو میں مسابقت کرنی چاہی تو آپ نے فوراً ٹوک دیا،

الکبر الکبر[3] یعنی پہلے بڑے کو بولنے دو[4]

---

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۱۸۰ [2] ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۱۱ [3] ابو داؤد جلد ۲ ص ۳۰۶ [4] یہ مضمون مولانا کے قلم سے ہے۔

باب ۹۶

پابندی عہد اور اسلام

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃٌ حسنۃ

اخلاقی احکام

سچ یہ ہے کہ اخلاقی احکام کا تعلق جہاں تک تعلیم محض سے ہے، وہ کوئی ایسی متاع غریب نہیں جس کے پیش کرنے پر اسلام فخر کرے۔ اخلاقی احکام ہمیں ہر جگہ مل سکتے ہیں اور قریباً ہر مذہب نے اپنا مقصد یہی بتلایا ہے کہ انسان کو اخلاق کا وعظ سنائے۔ اگر قرآن حکیم تعلیم دیتا ہے کہ عہد و مواثیق کی پابندی کرو تو قوانین موسوی اور ضابطۂ ناصری بھی یہ نہیں کہتا کہ عہد باندھ کر توڑ ڈالو۔ حتیٰ کہ آریائی نسل کی وہ فلسفیانہ روحانیت بھی جس نے ہندوستان اور ایران میں ظہور کیا، اپنی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ شاخ کے اندر اخلاقی تعلیمات و احکام سے لبریز ہے۔

پس اصلی چیز تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے نتائج اور اس کا عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا، اس نے عملی شکل میں کیسی صورت اختیار کی؟ انسان کی روح اس لیے بیمار نہیں کہ زبانوں نے تعلیم کم کر دی اور کاغذوں پر زیادہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا اصل دکھ زندگی کی عملی مشکلات میں ہے اور صرف وہی تعلیم فتحمند ہو سکتی ہے جو ایک مستحکم عملی نمونہ اپنے ساتھ رکھتی ہو۔

عملی حقیقت کے لحاظ سے اوّلین نمونہ حامل قرآن و اوّلین داعی اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا ہے، لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃٌ حسنۃ[1]۔ یہاں ہم صرف اسی حیثیت سے اسلامی مواثیق وعہود پر نظر ڈالیں گے۔

جنگ و صلح کی متضاد حالتیں

جنگ و صلح کی متضاد حالتوں میں انسان کا نظام اخلاق دفعتہً بدل جاتا ہے۔ ایک شخص بذاتِ خود نہایت رحم دل ہے لیکن میدان جنگ میں جا کر نہایت بے رحم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ذاتی معاملات میں نہایت حلیم الطبع ہے، لیکن کسی فوج میں شامل ہو کر سخت مشتعل اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے۔ ایک شخص امن و صلح کے زمانے میں نہایت صادق العقول اور پابند عہد ہے، لیکن زمانۂ جنگ میں اتنا ہی خداع اور عہد شکن بن جاتا ہے۔ ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک، امن و سکون کے دور میں انسانیت کا بہتر سے بہتر نمونہ ہوتا ہے لیکن جنگی اغراض، طامعانہ اقدامات اور حربی مصالح کے عہد فساد میں آکر چارپایوں سے زیادہ

---

[1] بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی اتباع و پیروی کا بہترین نمونہ ہے۔ (احزاب: ۲)

وحشی اور درندوں سے زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، ثم رددنٰہ اسفل سافلین[1]
اسی بنا پر بعض حکماء کا قول ہے کہ "سیاست اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی"۔

لیکن دنیا میں صرف "اسلام" ہی ایک ایسی زندہ ہستی ہے جو اپنے پہلو میں دل اور دل میں ایک غیر ممکن التغیر اخلاقی طاقت رکھتی ہے اس پر عوارض خارجیہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ظاہر و باطن، شخصیت و جمہوریت، افتراق و اجتماع، جنگ و صلح، اس کے لیے تمام حالتیں یکساں ہیں۔ اس کا معیار اخلاق جس طرح امن و صلح کی حالت میں قائم رہا، اسی استحکام و استواری کے ساتھ جنگ کے سیلاب اور آتش و خون کے طوفان میں بھی قائم و ثابت نظر آیا۔

رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ

پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ و السلام) کی زندگی اعمال انسانیہ کی ہر شاخ پر حاوی تھی۔ اس میں حق و صداقت کے آغاز کی غربت و مظلومی بھی تھی اور اتمام کی فتح مندی و کامرانی کا جاہ و جلال اور سطوت و جبروت بھی تھا۔ انھوں نے امن و صلح کے ایام بھی کاٹے اور امن و صلح کے لیے جنگ کی تلوار باندھنے کا حکم بھی دیا۔ اس لیے عہد و میثاق اور ان کے نتائج و عواقب کے واقعات عہد نبوت کی تاریخ میں بیشمار نظر آتے ہیں اور ان کے اندر اخلاق قرآنی کی عملی صورت دیکھی جا سکتی ہے۔

ظالم دشمنوں سے سلوک

سب سے پہلی چیز اس سلسلے میں وہ اخلاقی سلوک ہے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے غیر قوموں اور حریفانِ جنگ سے کیا۔ ان قوموں نے معاہدوں کو اکثر توڑا ہے اور نہایت شرمناک طریقے سے غداریاں کی ہیں۔

رعل، ذکوان، عُصَیّہ اور بنو لحیان کے قبائل نے آنحضرت صلعم سے کسی دشمن کے مقابلے کے لیے فوجی مدد کی درخواست کی[2] آنحضرت صلعم نے قراء صحابہ میں سے ستر صحابی ساتھ کر دیے لیکن بئر معونہ پر لے جا کر ان لوگوں نے بیوفائی کی اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دیا۔

جب حضرت عاصم کی فوج کو قبیلہ بنو لحیان کے دو سو قدر اندازوں نے گھیر لیا تو ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ نیچے اتر آئیں تو کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس پر ایک جماعت اتر آئی، لیکن بعض صحابہ کو اسی جگہ قتل کر دیا گیا اور بعض کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا[3]

---

[1] بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا، پھر اسے بدسے بدتر حالت میں پھینک دیا۔ (التین: ۴-۵) [2] واقعہ یوں ہے کہ قبیلہ کلاب کے رئیس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ چند لوگ میرے ساتھ کر دیجیے جو میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نجد کی طرف سے مطمئن نہیں۔ رئیس کلاب نے نجد کی طرف سے ذمہ داری اٹھائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی بھیج دیے۔ رئیس کلاب نے بئر معونہ پہنچ کر غداری کی۔ آس پاس کے قبائل مثلاً رعل، عُصَیّہ، ذکوان کے پاس آدمی دوڑائے کہ تیار ہو کر آؤ۔

[3] یہ واقعہ رجیع ہے جس میں عضل اور قارہ کے قبیلوں نے تعلیم اسلام کی غرض سے چند آدمی طلب کیے تھے اور دس آدمی بھیجے گئے تھے جن کا رئیس حضرت عاصمؓ بن ثابت کو مقرر کیا گیا۔ ان قبیلوں نے بھی غداری کی۔

ذاتی وفائے عہد | بہرایں ہمہ غدر و بے وفائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معیار اخلاق شخصی حالتوں میں تھا، وہی میدان جنگ میں بھی قائم رہا۔ شخصی حالت میں آپ کے وفائے عہد کا یہ حال تھا:

عن عبد اللہ بن ابی الحمساء قال بایعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ببیع قبل ان یبعث ، و بقیت لہ بقیۃ فوعدتہ ان اٰتیہ بہا فی مکانہ فنسیت فذکرت بعد ثلاث فجئت ، فاذا ھو فی مکانہ ، فقال یافتی لقد شققت علیّ انا ھھُنا منذ ثلاث انتظرك۔

(ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۲۶ کتاب الادب)

عبداللہ بن حمساء کہتے ہیں کہ آنحضرت ؐ کے ہاتھ ان کے مبعوث ہونے سے پہلے میں نے ایک چیز فروخت کی، جس کا کچھ حصہ آپ کے حوالے نہیں کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ آپ ٹھہریے۔ میں اسی جگہ لے کے آتا ہوں مگر میں گھر جا کر بھول گیا اور تین دن کے بعد اپنا وعدہ یاد آیا۔ پلٹ کے آیا تو دیکھا کہ آپ اسی جگہ ہیں۔ آپ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ تم نے مجھے بڑی تکلیف دی۔ میں تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

مجاہدین کو وصیت | جہاد اسلامی کی وسعت نے آپ کی اخلاقی طاقت کو اور بھی مستحکم و استوار کر دیا۔ آنحضرت صلعم کا معمول تھا کہ جب مجاہدین جہاد کے لیے روانہ ہوتے تو آپ ان کو مخاطب کر کے ایک عام وصیت فرماتے جو متعدد اخلاقی ہدایات کا مجموعہ ہوتی تھی۔ انہی ہدایات میں ایک حکم پابندی عہد کا بھی تھا:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا امّر امیرًا علی جیش او سریۃ اوصاہ خاصۃ بتقوی اللہ عزوجل و من معہ من المسلمین خیرًا، ثم قال اغزوا باسم اللہ فی سبیل اللہ قاتلوا من کفر باللہ اغزوا و لا تغلوا و لا تغدروا و لا تمثلوا و لا تقتلوا ولیدًا۔

(صحیح مسلم جلد ۲ ص ۶۲ کتاب الجہاد)

آنحضرت ؐ جب کسی شخص کو کسی فوج کا سپہ سالار مقرر فرماتے اسے خدا سے ڈرنے اور مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرتے۔ پھر فرماتے کہ خدا کی راہ میں خدا کا نام لے کر لڑو! جن لوگوں نے خدا کا انکار کیا ہے ان سے جہاد کرو لیکن مال غنیمت میں کسی قسم کی خیانت نہ کرنا، عہد کی پابندی کرو، بیوفائی نہ کرو، کسی کے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک نہ کاٹو! بچوں کو قتل نہ کرو۔

مجاہدین عموماً ان احکام پر عمل کرتے تھے اور یہی اخلاقی ہدایت تھی جو ان کو ہر قسم کے بے اعتدالانہ جنگی افعال سے روکتی تھی۔

حضرت خُبَیبؓ کا واقعہ | لیکن ان ہدایات میں پابندی عہد پر مسلمانوں نے جس شدت کے ساتھ عمل کیا، اس کی نظیر دنیا کی اخلاقی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ حضرت خُبَیبؓ اور ابن دثنہ کو قبیلہ بنی لحیان نے امان دے کر پہاڑ سے اتروایا[1]، پھر بدعہدی کی اور انھیں غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ عام طور پر جب نقض عہد میں ایک

[1] یہ واقعہ رجیع کا ایک حصہ ہے۔ رجیع عسفان اور مکہ مکرمہ کے وسط میں ایک مقام ہے۔

فریق کی طرف سے پیش قدمی کی جاتی ہے تو دوسرا فریق ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہوجاتا ہے اور تمام معاہدوں کو توڑ سکتا ہے۔ اس لیے خُبیبؓ اگر اس وقت ان ہدایات کی پابندی نہ کرتے تو وہ معذور سمجھے جا سکتے تھے، لیکن آنحضرتؐ کے احکام جبری احکام نہیں ہوتے تھے بلکہ آپ کا روحانی اثر ان کو مجاہدین کے رگ و پے میں ساری کر دیتا تھا۔ جب خُبیبؓ کو حارث بن عامر نے خرید لیا اور حرم کے باہر قتل کرنا چاہا تو انھوں نے حارث کی لڑکی سے استرا طلب کیا۔

لڑکی نے استرا ان کے ہاتھ میں دینا چاہا تو حضرت خُبیبؓ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اتفاقیہ بچّی کی ماں آ گئی۔ وہ ڈری کہ جو شخص جان سے ہاتھ دھو چکا ہے، اسے کسی کی جان پر حملہ کرنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ حضرت خُبیبؓ گو جان سے ہاتھ دھو چکے تھے اور ہاتھ میں ایک ہتھیار (استرا) بھی تھا لیکن آنحضرت صلعم نے بچّوں کے قتل نہ کرنے کا جو عہد ان سے لے لیا تھا، وہ انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا چنانچہ ماں کی سراسیمگی دیکھ کر انھوں نے کہا؛ کیا تم کو ڈر ہے کہ میں اس بچّی کو قتل کر دوں گا؟ نہیں، تم ایسا نہ سمجھو۔ میں ایک بچّے کا خون اپنی گردن پر نہیں لے سکتا۔[1]

ان اخلاقی احکام سے زیادہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل نے صحابہؓ کو پابندیٔ عہد کی تعلیم دی تھی۔ یہودِ خیبر نے آنحضرت صلعم کو زہر دے دیا، لیکن آپ نے کسی قسم کا انتقام نہ لیا۔ آنحضرتؐ پر یہودیوں نے اپنی دانست میں جادو کیا، لیکن آپ نے معاہدے کی بنا پر انھیں معاف کر دیا۔

حُدَیبیہ کے بعد کا ایک واقعہ

آنحضرت صلعم نے جب کفّارِ مکّہ سے بمقام حُدَیبیہ صلح کر لی تو صلح کے بعد مسلمانوں اور کافروں میں باہم میل جول ہو گیا۔ حضرت سلمہؓ کا بیان ہے:

میں اس حالت اطمینان میں ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ اتفاق سے میرے پاس چار مشرک آ گئے اور آنحضرتؐ کی مذمت کرنے لگے۔ میں آپ کی ہجو نہ سن سکا اور اٹھ کر دوسرے درخت کے سایے میں چلا گیا۔ وہ سب درخت کی شاخ میں ہتھیار لٹکا کر لیٹ گئے۔ اس حالت میں دفعتہً غل ہوا کہ ابن زنیم قتل کر دیا گیا۔ میں نے تلوار میان سے کھینچ لی اور انھی چاروں پر حالتِ خواب میں حملہ کیا۔ پہلے ان کے ہتھیاروں پر اچھی طرح قبضہ کر لیا پھر ان سے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے محمدؐ کو برگزیدہ کیا ہے تم میں سے جو شخص سر اٹھائے گا اس کی گردن اڑا دوں گا۔ پھر ایک طرف سے میں ان چاروں کو اور دوسری طرف سے میرے چچا عامر ایک دوسرے کافر کو جس کا نام مِکرَز تھا، گھسیٹتے ہوئے آنحضرتؐ کے پاس لائے، لیکن آنحضرتؐ نے انھیں بالکل معاف کر دیا اور فرمایا: انھیں چھوڑ دو، برائی کی ابتدا انھی کی طرف سے ہونی چاہیے۔[2]

اگر آنحضرت صلعم انھیں قتل کر دیتے تو درحقیقت اس بدعہدی کے ذمہ دار خود وہی لوگ ہوتے، لیکن آپ نے

---

[1] بخاری جزو ۵ [2] صحیح مسلم جلد ۲

نقضِ عہد کی اس ظاہری شکل کو بھی گوارا نہ کیا، جو ان کے اقدام قتل سے پیدا ہوتی تھی۔

احکامِ شریعت کے تین درجے اسلام نے احکامِ شریعت کے تین درجے قرار دیے ہیں:

الحلال بیّنٌ والحرام بیّنٌ وما بینھما مشتبھات۔ حلال بھی کھلا ہُوا ہے اور حرام بھی، البتہ ان کے درمیان چند مراتب ایسے ہیں جو حلت و حرمت دونوں کا احتمال رکھتے ہیں۔

یہی مشتبہات درحقیقت زہد و تقویٰ کی آزمائش ہیں۔ ایک خدا ترس شخص ایک کھلی ہوئی نیکی پر عمل کر سکتا ہے، ایک فریبی دکھلاوے کے لیے کسی صریح برائی سے اجتناب کر سکتا ہے، لیکن نیتوں کا کھوٹ وہاں نہیں چھپ سکتا جہاں حلال و حرام کے نہایت نازک درمیانی مقامات ہیں۔ تمام حیلِ شرعی انھی کے محور پر گردش کرتے ہیں۔

ذاتی انتقام کبھی نہ لیا آنحضرت صلعم زہر دینے والے اور سحر کرنے والے یہودیوں کو قتل کر سکتے تھے۔ آپ ان کفار سے بھی انتقام لے سکتے تھے جنھوں نے صلح حُدَیبیہ کے بعد ہجو و غیبت بلکہ کشت و خون کی طرف قدم بڑھایا۔ بہ ایں ہمہ آپ نے انھیں معاف کر دیا۔ کیونکہ ان بدعہدیوں پر اشتباہ کے متعدد پردے پڑے ہُوئے تھے۔ ان سے ذاتی انتقام کی بُو آتی تھی اور خلق نبوت کے باب اخلاق میں سب سے زیادہ نمایاں باب یہ ہے کہ:

لم ینتقم لنفسہ۔ (صحیحین) آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلا نہ لیا۔

ایسا کرنے سے اگرچہ حقیقی طور پر نقضِ عہد نہیں ہو سکتا تھا تاہم بظاہر نقضِ عہد کا شبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اسلام اپنے دامن پر اس قسم کا ظاہری دھبا بھی نہیں دیکھ سکتا!

صحابہؓ کا دور آپ کے طرزِ عمل نے صحابہؓ کے لیے بھی پابندیٔ عہد کا ایک بلند تر معیار قائم کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے میں ہمیشہ اسے قائم رکھا۔

عہدِ صحابہؓ میں جب کبھی نقضِ عہد کا ظاہری احتمال بھی پیدا ہوا تو لوگوں نے علانیہ اس کا انکار کیا۔ امیر معاویہؓ نے رومیوں سے ایک مدت کے لیے معاہدۂ صلح کر لیا تھا۔ وہ اگرچہ نقضِ عہد کرنا نہیں چاہتے تھے، تاہم انھوں نے زمانۂ صلح ہی میں رومیوں سے لڑنے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں اور فوج لے کر ان کی طرف بڑھے کہ مدت صلح گزر جانے کے ساتھ ہی جنگ شروع کر دیں گے۔ اسی حالت سفر میں ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچا اور کہا: اللہ اکبر! اللہ اکبر! یہ بدعہدی تمھارے شایانِ شان ہے؟ تم کو وفائے عہد کرنا چاہیے۔ لوگوں نے تعجب سے دیکھا تو معلوم ہوا عمروؓ بن عنبسہ ہیں۔ امیر معاویہؓ کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور ان سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

فرمایا ہے :

من کان بینه و بین قوم عهد فلا یشدّ عقدة ولا یحلها حتی ینقضی امدها او ینبذ الیهم علی سواء۔

اگر کوئی شخص کسی قوم سے معاہدہ کرے تو اس معاہدے کی گرہ نہ باندھے اور نہ کھولے (یعنی اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے اور اسے اپنے حال پر قایم رہنے دے) یہاں تک کہ معاہدۂ صلح کی پوری مدت گزر جائے یا باہمی معاہدہ کے توڑنے کا عام اعلان کر دیا جائے۔

چنانچہ امیر معاویہؓ راستے ہی سے لوٹ آئے (ابوداؤد)

پابندی عہد کا کمال سلطنتوں میں باہم معاہدے ہوتے ہیں اور وہ قائم بھی رکھے جاتے ہیں، لیکن کوئی سلطنت اپنے معمولی مقاصد کی کامیابی کو بھی عہد وفا کی اخلاقی پابندی پر قربان نہیں کر سکی۔ یورپ کا موجودہ اخلاق اس کے لیے کافی شہادت ہے۔ اٹلی نے اپنے عام آشکار عہد کو چند لمحوں کے اندر فراموش کر دیا[1] اور جرمنی پیرس کی طرف بڑھنے کو اس قدر ضروری سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے بلجیم کی ناطرفداری کوئی شے نہیں[2]۔ اسلام کا مقصد پیرس کے قلعوں کی برجیوں سے زیادہ بلند تھا، لیکن اس نے پابندی عہد پر اپنے عظیم الشان مقصد کو بارہا قربان کر دیا ہے۔ اسلام کا مقصد حقیقی اشاعت حق تھا، اسی کے لیے وہ لڑتا تھا، اسی کے لیے صلح کرتا تھا، اسی کے لیے معاہدہ کرتا تھا۔ یہ مقصد کبھی کبھی بغیر کسی قسم کی جدوجہد کے بھی حاصل ہو جاتا تھا اور تلوار کی جگہ صرف داعی اسلام کی روحانی طاقت ہی اس میدان کو فتح کر لیتی تھی، لیکن آنحضرت صلعم نے ایسے اعلیٰ مقصد کو بھی، جو نہایت آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا، معاہدے کی اخلاقی پابندی پر ترجیح نہ دی۔ قریش نے ایک شخص کو آنحضرت صلعم کی خدمت میں قاصد بنا کر بھیجا۔ وہ آپ کی صورت مبارک دیکھتے ہی اسلام کی طرف مائل ہو گیا اور بے اختیار پکار اٹھا کہ "اب اس چوکھٹ کو چھوڑ کر قیامت تک نہ جاؤں گا"، لیکن چونکہ قاصدوں کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جاتا اور ان کے ساتھ ایک خاص معاہدے کی پابندی لازمی ہے اس لیے آپ نے فرمایا، میں عہد شکنی نہیں کر سکتا، تم سر دست تو واپس جاؤ۔ اگر تمہارے دل میں اسلام کی محبت ہے تو پھر واپس آ سکتے ہو۔ وہ پیغام لے کر گیا، پھر پلٹ کر آیا اور اسلام لایا (ابوداؤد)۔

---

[1] مطلب یہ کہ اٹلی کا معاہدہ جرمنی اور آسٹریا سے تھا مگر پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء) میں وہ اپنے حلیفوں کو چھوڑ کر برطانیہ و فرانس سے مل گیا۔ [2] پہلی عالمی جنگ میں فرانس پر حملے کے لیے جرمنی کو بلجیم میں سے گزرنا مناسب معلوم ہوا اور اس نے بلجیم کی غیر جانبداری کی کوئی پروا نہ کی۔ دوسری عالمی جنگ میں بھی جرمنی نے بلجیم، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ کی غیر جانبداری کو خس برابر بھی وقعت نہ دی۔ اتحادیوں کو ایران کے راستے روس سامان بھیجنا مناسب نظر آیا تو ایران کی غیر جانبداری ان کے لیے سد راہ نہ ہوئی۔

صلح حدیبیہ

مشرکین نے صلح حدیبیہ میں جو شرطیں پیش کی تھیں، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ "کفارِ مکہ میں سے جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ بھاگ جائے گا، اسے مسلمان واپس کر دیں گے۔" اس شرط پر باہم سخت اختلاف ہُوا۔ صحابہؓ نے کہا کہ ایک مسلمان کو کیونکر کفار کے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ ابھی اس شرط کا کوئی فیصلہ نہیں ہُوا تھا کہ ابوجندلؓ ابن سہیل بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے مکہ سے پہنچے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے پاؤں پر ڈال دیا۔ ابوجندلؓ کا باپ سہیل تھا اور وہی اسی وقت قریش کی طرف سے معاہدے کے لیے آیا تھا۔ سہیل نے کہا کہ میں اپنے بیٹے کی واپسی پر صلح کروں گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابھی تک معاہدۂ صلح مکمل نہیں ہُوا۔ اس لیے اس کی پابندی ہمارے لیے ضروری نہیں، مگر اس نے کہا کہ اس کے سوا کسی دوسری بات پر صلح ناممکن ہے۔ آپؐ نے مکرر اصرار کیا کہ کم از کم ابوجندلؓ کو تو اس شرط سے مستثنیٰ کر دو، مگر سُہیل نے صاف انکار کر دیا۔ ابوجندلؓ نے تمام مسلمانوں سے نہایت درد انگیز لہجے میں کہا کہ "مسلمانو! میں مسلمان ہو کر آیا ہوں۔ کیا اب پھر مشرکین کی طرف واپس کیا جاؤں گا؟ ان الفاظ نے صحابہ کے مذہبی جذبات میں آگ لگا دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے اختیارانہ اٹھ کر آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ کیا آپ پیغمبرِ خدا اور آپ کے ساتھی برسرِ حق نہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ بے شک حق پر ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر ہم کیوں اس قدر دب رہے ہیں اور ذلت گوارا کر رہے ہیں؟ آپؐ نے جواب دیا کہ اللہ کا حکم ایسا ہی ہے۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سوال وجواب سے تسکین نہ ہوئی اور انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کی گفتگو کی۔ تاہم کچھ نتیجہ نہ نکلا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی تمام شرطیں منظور کر کے صلح نامہ مرتب کر دیا اور دستخط ہو گئے۔

ابوبَصیر کا واقعہ

اس کے بعد جب آنحضرتؐ مدینہ کو روانہ ہوئے تو ساتھ ساتھ ابوبصیرؓ بھی مسلمان ہو کر مکہ سے نکل آئے۔ قریش نے ان کی جستجو میں دو آدمی بھیجے اور شرائطِ صلح یاد دلائیں۔ آنحضرتؐ نے فوراً ابوبصیرؓ کو واپس کر دیا۔ وہ ان کو لے کر چلے تو مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر کھجوریں نکالیں اور کھانے پینے میں مشغول ہوئے۔ ابوبصیرؓ نے اس موقع پر بلطائف الحیل ان کے پھندے سے نکلنا چاہا۔ وہ کھجور کھانے میں مصروف تھے۔ ابوبصیرؓ نے ایک شخص کی تلوار کی طرف دیکھ کر کہا: کتنی اچھی تلوار ہے۔ اس نے داد پا کر تلوار کھینچ لی اور کہا بے شبہ، میں اس کا بارہا تجربہ کر چکا ہوں۔ ابوبصیرؓ نے ہاتھ بڑھا کر دیکھنے کے بہانے لے لی اور سب سے پہلے اسی شخص کی گردن قلم کر دی۔ دوسرا شخص یہ حالت دیکھ کر بھاگا اور دوڑتا ہُوا مدینہ پہنچا۔ آنحضرت (صلعم) نے اس کی پیشانی دیکھی تو فرمایا: اس پر کوئی مصیبت آگئی ہے۔ اس نے کہا: میرا ساتھی تو قتل کر دیا گیا ہے اور میں بھی قتل کے قریب پہنچ گیا تھا۔

---

[1] ان کا نام عتبہ بن اسید تھا۔

ایک جمیعۃ کی فراہمی

اسی حالت میں ابوبصیرؓ بھی پہنچے اور آنحضرتؐ سے عرض کی کہ "آپ نے اپنا عہد پورا کر کے مجھے واپس کر دیا۔ اب خدا نے مجھے نجات دی ہے، آپ اس کے ذمہ دار نہیں۔" آنحضرت (صلعم) نے فرمایا، یہ شخص تو لڑائی کا شعلہ معلوم ہوتا ہے: ابوبصیرؓ نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ دوبارہ مجھے واپس کر دیں گے چنانچہ وہ مدینہ سے بھاگ کر سمندر کے کنارے مقیم ہو گئے۔ ابوجندلؓ کو خبر ہوئی تو وہ بھی ان سے جا ملے، یہاں تک کہ قریش کا جو شخص مسلمان ہوتا تھا وہ بھاگ کر ابوبصیرؓ کے دامن میں پناہ لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ابوبصیرؓ نے ایک اچھی خاصی جمیعۃ قایم کر لی اور قریش کے کاروان تجارت کو جو شام کی طرف جاتا تھا، عام طور پر لوٹنا شروع کر دیا۔ بالآخر قریش نے آنحضرتؐ سے شکایت کی اور آنحضرتؐ نے ابوبصیرؓ وغیرہ کو بلا لیا (بخاری)

جنگ میں بھی عہد کی پابندی

عموماً زمانہ جنگ میں معاہدوں کی پابندی نہیں کی جاتی اور اشخاص کے باہمی معاہدے تو صلح کی حالت میں بھی کوئی جمہوری وقعت نہیں رکھتے، لیکن اسلام کی جمہوریت اور شخصیت دونوں ایک ہی روحانی طاقت کے تابع تھیں۔ اس لیے زمانہ جنگ میں اشخاص کے مجبورانہ معاہدوں کو بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ قایم رکھا جاتا تھا۔ حذیفہ بن یمان کا بیان ہے کہ "میں غزوۂ بدر میں صرف اس لیے نہیں شریک ہو سکا کہ میں اور ابوحسیل ساتھ چلے تو کفار قریش نے ہمیں گرفتار کر لیا اور کہا کہ تم محمدؐ کے پاس جاتے ہو۔ ہم دونوں نے کہا کہ نہیں ہم صرف مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے عدم شرکت جہاد کا معاہدہ لے کر ہمیں چھوڑ دیا۔ ہم آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شریک جہاد ہونا چاہا لیکن آپ نے فرمایا: تم لوگ مدینہ کو واپس جاؤ۔ ہم کفار کے معاہدوں کو پورا کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں صرف خدا سے مدد چاہتے ہیں[1]

فراخ دلی اور فیاضی

ایفائے عہد کے متعلق سب سے بڑی بحث یہ ہے کہ کس کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیے اور کس کے ساتھ قائم رکھنا چاہیے؟ یونان کے مقنن اعظم سولن نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا ہے اور وہی تمام دنیا کے سیاسیات کی روح ہے یعنی "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے، جو اپنے سے کمزور کو تو الجھا لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے مقابلے میں ٹوٹ جاتا ہے"، لیکن اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جس کے اخلاقی معاہدوں نے سولن کے اس تار عنکبوت کو توڑ دیا۔ اسلام ضعیفوں کے ساتھ [illegible] کرتا ہے اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھتا ہے۔ آنحضرتؐ نے کفار قریش سے بمقام حدیبیہ جو صلح کی تھی، وہ بظاہر نہایت عاجزانہ و مجبورانہ صلح معلوم ہوتی ہے۔ خود صحابہؓ نے اس کا احساس کیا تھا اور آپ نے بھی نہایت صراحت کے ساتھ فرما دیا تھا:

لا یسألون خطة یعظمون فیها حرمات الله الا — میرے سامنے وہ جو شرط پیش کریں گے میں اسے قبول کروں گا،

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۸۹۔

اعطیتہم۔ بشرطیکہ اس سے شعائر الٰہی کی توہین نہ ہو[1]

چنانچہ آپؐ نے اپنے گوہر مقصود یعنی ان مسلمانوں کو جو نورِ ایمان سے لبریز ہو کر آتے تھے، واپس کرنے کا عہد کر لیا۔
آنحضرت صلعم نے صلح نامہ پر "بسم اللہ" لکھنا چاہا۔ کفار نے اس سے انکار کیا، لیکن آپ نے باوجود صحابہؓ کے اصرار کے کفار کی خواہش پوری کر دی اور "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی جگہ "باسمك اللھم" لکھا۔ آپؐ نے اپنے نام کے ساتھ "رسول اللہ" لکھنا چاہا۔ کفار نے کہا، اگر ہم آپ کو رسول اللہ مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا، صرف محمد بن عبداللہ لکھیے۔"
معاہدہ پر رسول اللہ کا لفظ لکھا جا چکا تھا لیکن آنحضرت صلعم نے حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ "اسے مٹا دو" ان کے جوش ایمان نے اسے گوارا نہ کیا تو آپ نے خود مٹا دیا۔

اس سے زیادہ کمزوری اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن کیا درحقیقت آپ مجبور تھے؟ کیا قریش کی عظیم الشان طاقت نے آپ کو بالکل بے دست و پا کر دیا تھا؟

صلح و امن

تمام سلطنتیں نقض عہد کے لیے ضعف کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں اور صلح تو ہمیشہ قوی ہی کے ساتھ کی جاتی ہے، لیکن اسلام کی امن پسندی نے ایک نہایت ضعیف گروہ کے مقابلے میں یہ فیاضانہ صلح کی اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قایم رکھا۔ چنانچہ آپ نے خود فرمایا:

انا لم نجئ لقتال احد ولکنا جئنا معتمرین وان قریشاً قد نھکتھم الحرب واخرت بھم فان شاؤا ماددتھم مدة۔

ہم کسی سے لڑنے بھڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں۔ قریش کو متواتر لڑائیوں نے چور چور کر دیا ہے اور ان کی طاقت کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ بنا بریں اگر وہ چاہیں تو ہم ایک مدت کے لیے ان سے صلح کر سکتے ہیں۔

دنیوی سلطنتوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اس بہترین موقع سے کیا کام لیتیں؟ انعقاد صلح کا یا اشتعال جنگ کا؟ دنیا کی قدیم و جدید تاریخ اس کا نہایت آسانی کے ساتھ جواب دے سکتی ہے۔ اگر اس حالت میں کوئی سلطنت صلح بھی کرتی تو اس کا نتیجہ جنگ سے زیادہ درد انگیز ہوتا۔

اہل نجران سے معاہدہ

لیکن یہ جزئی طرز عمل صرف اختلافی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلام کی وسعت ایک مستقل اور جامع ہدایت

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ قریش لڑائیوں کے ذمہ دار تھے جو اسلام کو بہ جبر و قوت مٹانے کے درپے تھے۔ صلح حدیبیہ میں وہ جنگ سے دست بردار ہو رہے تھے۔ یہ اسلام کے لیے فتح مبین تھی۔ لہٰذا اس بنیادی اور اساسی فتح کے سلسلے میں ہر شرط قبول کی جا سکتی تھی۔ البتہ شعائر الٰہی کی حرمت کا لحاظ لازم تھا[2] اس وقت تک یہی طریقہ عرب میں مروج تھا۔

کی محتاج تھی، جو اس اخلاقی طرزِ عمل کے ساتھ اپنے اندر ایک قانونی طاقت بھی رکھتی تھی اور جب پچھلوں کی اخلاقی طاقت آنحضرت صلعم کے اسوۂ حسنہ کو بھلا دیتی تو وہ اپنی جزئی طاقت سے اس کو یاد دلاتی۔ آنحضرت صلعم نے غیر قوموں کے ساتھ جو تحریری معاہدے کیے ہیں وہ بالکل قانونی اور سیاسی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس باب میں اسلام کا قانون کس قدر فیاضانہ تھا۔ آنحضرت صلعم نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

علی اهل نجران الفی حلة النصف فی صفر والنصف فی رجب یؤدونها الی المسلمین و عاریة ثلاثین درعا و ثلاثین بعیرا و ثلاثین من کل صنف من اصناف السلاح یغزون بها و المسلمون ضامنون لها حتی یردوها علیهم ان کان بالیمن کید ذات غدر علی ان لا تهدم لهم بیعة و لا یخرج لهم قس و لا یفتنوا عن دینهم۔ (ابوداؤد جلد ۲ ص ۷۵)

اہل نجران کو دو ہزار حلے باقساط دینا پڑیں گے۔ ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہ رجب میں اور ان کو تیس زرہیں تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور ہر قسم کے ہتھیار بطور عاریت کے بھی دینے ہوں گے۔ اگر یمن میں کوئی جنگ ہوگی تو وہ لوگ ان چیزوں کو واپس کر دیں گے اور اس معاہدہ کی بنا پر نہ تو ان کے گرجے گرائے جائیں گے، نہ ان کے کسی پادری کو جلا وطن کیا جائے گا اور نہ ان کے مذہب سے کوئی تعرض ہوگا۔

اخلاقی نصائح لیکن اسلام کا ہر قانون اپنے اندر اخلاقی رُوح بھی رکھتا ہے۔ آنحضرت نے اخلاقی نصائح سے اس کو اور بھی موثر بنا دیا:

الا من ظلم معاهدا او انتقصه او کلفه فوق طاقة او اخذ منه شیئا بغیر طیب نفس فانا حجیجه یوم القیامة۔

(ابوداؤد جلد ۲ ص ۷۷)

خبردار، اگر کسی نے کسی غیر مذہب رعیت پر ظلم کیا، یا اس کی تنقیص کی یا اس کی کوئی چیز بجبر لے لی۔ اگر ایسا ہوا تو میں اس کی طرف سے قیامت کے دن خدا کے سامنے جھگڑوں گا۔

ایک قبطی کا واقعہ صحابہؓ نے آنحضرت صلعم کے بعد اس فیاضانہ طرزِ عمل کو نہایت بے تعصبی کے ساتھ قائم رکھا چنانچہ ہشام ابن حکیم نے حمص کے عامل کو دیکھا کہ قبطیوں کو دھوپ میں بٹھا کر جزیہ وصول کر رہا ہے۔ انھوں نے اسی وقت آنحضرت صلعم کی یہ اخلاقی نصیحت یاد دلائی:

ان اللہ یعذب الذین یعذبون الناس فی الدنیا۔

خدا قیامت میں ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں انسانوں کو دکھ پہنچاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کی وصیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اسی اخلاقی قانون کی تجدید کی تھی:

واوصیه بذمة اللہ و

میرے بعد جو خلیفہ ہوگا میں اس کو خدا اور خدا کے

ذمة رسوله صلى الله عليه وسلم ان يوفى لهم بعهدهم و ان يقاتل من ورائهم ولا يكلفوا الا طاقتهم۔ (بخاری جزو ۴ ص ۶۹)

رسول کے معاہدے کی حفاظت کے لیے وصیت کرتا ہوں وہ وصیت یہ ہے کہ غیر مذہب رعایا سے جو معاہدہ کیا جائے وہ پورا کیا جائے۔ ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیے لڑائی کی جائے اور ان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا جائے جس کے وہ متحمل ہوں۔

فاتح اور پیغمبر کا فرق

جہاد اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے، اس کے لحاظ سے وہ دنیوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف اس قدر بدیہی ہے کہ ہم کو اس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خط و خال کے اندر نمایاں طور پر نظر آسکتا ہے۔

ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادہ سے میدان جنگ کا رخ کرتا ہے تو طبل و دہل کے غلغلے اور قرناء و بوق کے ترانے خیر مقدم بجا لاتے ہیں۔ سر پہ پرچم لہراتا ہے۔ چتر شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اس کی طرف نگاہ گرم سے دیکھنے نہیں دیتا۔ جاہ و جلال کا یہ دیوتا میدان جنگ میں ایک مجسمہ کی طرح کھڑا کر دیا جاتا ہے اور تمام فوج اسی مرصع بت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے۔ عظمت و جبروت کا یہ منظر دنیا کو دفعۃً مرعوب کر دیتا ہے اور اس رعب و داب کے احساس سے اس دنیوی فتح کا سر بادۂ کبر و نخوت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خاک و خون میں مل کر بھی یہ نشہ نہیں اترتا۔ اگر کوئی اس سر پر غرور کو ٹھکرا دیتا ہے تو اس سے مغرورانہ صدا بلند ہوتی ہے۔

زمیں را منم تاج تارک نشیں
مجنباں مرا تا نجنبد زمیں[1]

پیغمبر کا سفر

لیکن ایک پیغمبر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو اگرچہ مخلصین و مومنین کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہوتی ہے لیکن وہ اپنا رفیق سفر صرف خدا کو بناتا ہے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سافر قال اللهم انت الصاحب فى السفر والخليفة

آنحضرت صلعم جب بغرض جہاد روانہ ہوتے تھے تو یہ دعا کرتے تھے، خدایا! تو ہی ہمارا رفیق سفر ہے، تو ہی ہمارے بال بچوں

---

[1] یہ شعر "سکندر نامہ" کا ہے۔ دارا سوم کیانی اپنے درباریوں کے ہاتھوں مہلک زخم کھا کر گر گیا تھا۔ اس اثنا میں سکندر تعاقب کرتا ہوا پہنچ گیا۔ اس نے دارا کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا مگر دارا بہ دستور دارائی کے نشے میں بدمست ہے۔ کہتا ہے کہ میں زمین کے سر کا تاج ہوں۔ مجھے ہلاؤ گے تو زمین زلزلے کا ہدف بن جائے گی۔ البتہ یہ بتا دینا ضرور ہے کہ اسے تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، یہ سب کچھ مولانا نظامی گنجوی مرحوم کی نکتہ آفرینی اور خیال آرائی کا کرشمہ ہے۔

فی الاھل! اللھم انی اعوذبک من وعثاء السفر وکابۃ المنقلب سوء المنظر فی الاھل والمال اللھم اطو لنا الارض وھون علینا السفر!

میں ہمارا قائم مقام ہے۔ خدایا! سفر کے شدائد اور پلٹ کر اہل وعیال کو بُرے حال میں دیکھنے کی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔ خدایا مسافت سفر کو کم کر دے اور ہمارے لیے آسان بنا دے۔

سواری وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ۔ (الزخرف، ۱۳:)

کیا پاک و برتر ہے وہ خدا جس نے اس سواری کو ہمارا فرمانبردار بنا دیا ورنہ ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔

سفر سے واپسی وہ سفر سے پلٹتا ہے تو راہ میں خدا کی حمد کا ترانہ گاتا ہوا چلتا ہے:

آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون[1]!

ہم لوٹ کر آنے والے ہیں۔ ہم توبہ کرنے والے ہیں۔ ہم خدا کے عبادت گزار بندے ہیں اور ہم اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔

پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتا ہے تو غلغلۂ تکبیر بلند کرتا ہے، نیچے اترتا ہے تو ترنم ریز تسبیح وتہلیل ہوتا ہے۔

فوج کی روانگی فوج کو روانہ کرتا ہے تو اسے نہ غرور و طاقت کی یاد دلاتا ہے، نہ اس کے جوش کو دو آتشہ کرتا ہے، نہ قدیم کارنامہائے شجاعت کا تذکرہ کر کے اس کے دل کو گرماتا ہے، بلکہ اس کے دین کو، اس کی امانت کو، اس کے تمام نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کر کے رخصت کر دیتا ہے:

استودع اللہ دینکم و امانتکم وخواتیم اعمالکم۔

میں تمہارے دین، تمہاری امانت اور تمہارے نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کر کے تمہیں خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے بھیجتا ہوں۔

---

[1] یہ بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم جنگ یا حج یا عمرہ سے لوٹتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر فرماتے:

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیء قدیر، آئبون، تائبون، عابدون، ساجدون، لربنا حامدون صدق اللہ وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ۔

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی اس کا شریک نہیں۔ ملک اسی کا ہے، ستایش اسی کے لیے ہے اور وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ ہم لوٹ کر آنیوالے ہیں، تائب ہیں، عبادت گزار ہیں۔ اپنے پروردگار کی حمد کرتے ہیں اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے ہی تمام احزاب یعنی گروہوں اور لشکروں کو شکست دی۔ (کتاب المغازی، باب غزوۂ احزاب)

منزل پر نزول وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ سلاطین کی طرح اس کے لیے خیمے قائم کیے جاتے ہیں، نہ فرش و بچھایا شاہانہ سے زمین آراستہ ہوتی ہے اور نہ میدان کا نشیب و فراز ہموار کیا جاتا ہے وہ خدا کا نام لے کر فرش خاک پر لیٹ جاتا ہے اور اس نام کی عظمت کے سہارے پر زمین ہی کو اپنی حفاظت کی خدمت سپرد کر دیتا ہے:

یا ارض ربی و ربک اللہ اعوذ باللہ من شرک و شر ما فیک و من شر ما یدب علیک۔

اے زمین! میرا اور تیرا، دونوں کا خدا ایک ہی ہے۔ میں تیرے شر سے، تیری سطح باطنی کے شر سے اور تجھ پر چلنے والوں کے شر سے، پناہ مانگتا ہوں۔

جہاد سے مراجعت وہ سفر جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اسے خدا کا گھر یاد آتا ہے اور مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا کرتا ہے، جب اسے فتح و ظفر کی خبر ملتی ہے تو نہ تو اس کے سامنے شادیانے بجائے جاتے ہیں، نہ جشن شاہانہ کی تیاریاں کی جاتی ہیں، نہ عیش و طرب کے گانے گائے جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے خدا کے آگے سر بسجود ہو جاتا ہے اور سجدۂ شکر بجا لاتا ہے۔ اسے جب مشیت ایزدی سے شکست ہوتی ہے تو وہ فوج کو بالکل جوش و غیرت نہیں دلاتا، بلکہ خدا ہی کی غیرت کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی فوج کو خدا کی فوج یقین کرتا ہے:

کان یقول یوم احد: اللھم انک ان تشاء لا تعبد فی الارض۔

آپ معرکہ احد کے دن کہتے تھے: خدایا کیا تو چاہتا ہے کہ اب زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو؟

میدان جنگ میں خدا سے التجا وہ اپنی فوج کی قلت اور دشمن کے لشکر کی کثرت دیکھتا ہے تو صرف رحمت آسمانی ہی سے مدد طلب کرتا ہے اور کسی دنیوی طاقت کے آگے دست سوال نہیں پھیلاتا:

لما کان یوم بدر نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی المشرکین وھم الف و اصحابہ ثلاثمایہ و تسعہ عشر رجلا، فاستقبل القبلۃ ثم مد یدیہ فجعل یھتف بربہ، اللھم انجزلی ما وعدتنی، اللھم ات ما وعدتنی اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض۔ فما زال یھتف بربہ

بدر کے دن جب آنحضرت نے مشرکین کی طرف دیکھا اور آپ کو نظر آیا کہ ان کی جمعیت ایک ہزار کی ہے اور مسلمان صرف تین سو انیس ہیں تو آپ قبلہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا کو پکارنا شروع کیا: "خدایا تو نے مجھ سے فتح و ظفر کا جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر! خدایا اگر مسلمانوں کا یہ مختصر سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ وہ اسی طرح ہاتھ پھیلا کر متصل پکارتے رہے، یہاں تک کہ

مادا یدیه مستقبل القبلة حتی سقط رداءہ عن منکبیه فاتاہ ابوبکر فاخذ رداءہ فالقاہ علی منکبیه ثم التزمه من ورائه وقال یا نبی اللہ کفاک منا شدتک ربک فانه سنجزلک ما وعدک۔ (مسلم)

جوشِ استغراق میں دوش مبارک سے چادر گر گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ کے اس تضرع و الحاح کو دیکھا تو پاس آئے اور چادر اٹھا کر آپ کے کاندھے پر ڈال دی۔ پھر پیچھے سے آکر آپ سے لپٹ گئے اور کہا "یارسول اللہ آپ اپنی مناجات ختم کیجیے، خدا نے آپ سے جو وعدہ کیا ہے اسے بہت جلد پورا کرے گا"۔

میدان جنگ میں زخم میدان جنگ میں اسے شدید زخم لگتا ہے، تو اس حالت میں صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے:

رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔ (مسلم)

خدایا! میری قوم کو معاف فرما، کیونکہ وہ لوگ حق کو نہیں جانتے۔

لیکن جب کبھی اس کے ہاتھ سے جہاد کا اصل مقصد فوت ہو جاتا تو وہ از فرق تا بقدم غضب و قہر الٰہی کا پیکر جلال و جبروت بن جاتا ہے،

ملاء اللہ قبورھم نارا قد شغلونا عن الصلوٰۃ وسطی

خدا کفار کی قبروں کو آگ سے بھر دے کیونکہ انھوں نے ہماری نماز عصر قضا کرا دی۔

بادشاہ اور پیغمبر کا فرق قصہ مختصر، ایک فاتح میدان جنگ میں "سرپرغرور" مگر ایک پیغمبر "جبین نیاز" ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں "زبان خودستا"، مگر ایک داعی حق "زبان شکرسنج" ہوتا ہے۔

ایک بادشاہ میدان جنگ میں "غیظ و غضب" کا آتش کدہ"، مگر ایک منادِ توحید رحم و کرم کا سرچشمہ" ہوتا ہے۔ ان دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہے۔ بادشاہوں کے سرپرغرور بارہا ٹھکرا دیے گئے، لیکن کسی موید من اللہ کی جبین نیاز خاک مذلت سے آلودہ نہ ہوئی۔ بادشاہوں کی زبان خودستا بارہا ذلت کے ساتھ خاموش کر دی گئی، لیکن کسی داعی الٰہی کا نغمۂ حمد و شکر کبھی بھی چپ نہ ہوا۔ بادشاہوں کے غیظ و غضب کے شعلے بارہا بجھا دیے گئے ہیں مگر کسی پیغمبر کے دریائے کرم کو دنیا کے خس و خاشاک نہ روک سکے: و لقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون وان جندنا لھم الغالبون (الصّٰفّٰت، ۱۷۱-۱۷۳)[1]

مساوات مساوات قانونی کو چھوڑ کر عام طرز مساوات پر غور کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلعم تمام مسلمانوں کے آقا و سردار تھے، تاہم آپ نے عام مسلمانوں سے اپنے لیے کبھی کوئی امتیاز نہ چاہا۔

---

[1] اور ہمارا حکم ہمارے بندوں کے حق میں پہلے سے ہو چکا ہے جو رسول ہیں کہ بیشک انھی کو مدد دی جائے گی۔ بے شک ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

ایک سفر میں کھانا پکانے کے لیے صحابہ نے کام تقسیم کر لیے تو جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت سرور کائنات صلعم نے خود اپنے ذمّے لے لی۔

حضرت انسؓ دس برس خدمت نبوی میں رہے لیکن ان کا بیان ہے کہ اس مدّت میں جتنی خدمت آپ کی میں نے کی اس سے زیادہ آپ نے میری کی۔ مساوات کا یہ عالم تھا کہ "ماقال لی فی شیء لما فعلت" یعنی تحکمانہ کام لینا یا جھڑکی دینا تو بڑی بات ہے، کبھی آپ نے اتنا بھی نہ فرمایا کہ فلاں کام یوں سے یوں کیوں کیا؟

غلام اور آقا

ایک صحابی نے اپنے غلام کو مارا تو آپ نے فرمایا: یہ تمھارے بھائی ہیں، جنھیں خدا نے تمھارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ جو خود کھاؤ، وہ انھیں کھلاؤ، جو خود پہنو، وُہ انھیں پہناؤ۔

اسلام نے نہایت شدت کے ساتھ اس سے روکا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو، خواہ وہ کیسا ہی ادنیٰ درجے کا کیوں نہ سمجھا جاتا ہو، "غلام" اور "باندی" کہے۔ کیونکہ سب خدا ہی کے غلام ہیں۔ اسی لیے غلاموں کو فرمایا: "اپنے مربیوں کو "آقا" نہ کہیں کیونکہ اس سے مساوات اسلامی میں فرق آتا ہے۔

ایک بار ایک صحابی نے آنحضرت صلعم کو ان الفاظ میں خطاب کیا: "اے آقائے من" آپ نے فرمایا: مجھے آقا نہ کہو، آقا تو ایک ہی ہے یعنی خدا۔

ایک یگانہ مثال

قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت چوری میں ماخوذ ہوئی۔ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرنے کے لیے حضرت اسامہؓ کو آمادہ کیا جنھیں آپ بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن جب اس واقعے کے متعلق اسامہؓ نے آپ سے سفارش کی تو آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا:

انما اهلك الذين قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف، تركوه واذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحدود، ايم الله لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعتُ يدها۔

لوگو! تم سے پہلی قومیں اس لیے ہلاک کی گئیں کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے پر جب کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اسے سزا دیتے لیکن خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کے ہاتھ ضرور کاٹے جاتے

(بخاری، الشفاعۃ فی الحدود)

چوری کا ذکر صرف خصوصیت واقعہ کی بنا پر ہے ورنہ اس سے مراد عام جرائم ہیں۔[1]

---

[1] یہ دونوں مقالے مولاناؒ کے ہیں یعنی اسوۂ محمدی کا ایک صفحہ اور پابندی عہد اور اسلام۔

رحمۃ للعلمین

سورہ انبیا کی آیت ۱۰۷ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "رحمۃ للعالمین" کہا گیا ہے۔ مولاناؒ نے اس موضوع پر سورت کے حواشی میں اختصاراً چند سطریں لکھی تھیں جن میں یہ حقیقت واضح فرمائی تھی کہ آنحضرت صلعم کے ظہور کو دنیا کے لیے رحمت قرار دے کر قرآن نے ایک کسوٹی ہمارے حوالے کر دی ہے، جس پر اس ظہور کی ساری صداقتیں پرکو لے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی فرمایا تھا کہ "مقدمہ تفسیر" کے ایک باب کا موضوع یہی مسئلہ ہے، جس میں مذہبی خوش اعتقادی سے الگ رہ کر صرف تاریخ کی بے لاگ اور بے رحم روشنی میں اس حقیقت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

"مقدمہ" ۱۹۱۵ء میں تفسیر البیان" کے ساتھ چھپنا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ مولاناؒ نے خود ۱۰۔ دسمبر ۱۹۱۵ء کے "البلاغ" میں فرمایا تھا کہ "مقدمہ" کے ابتدائی اجزاء "البیان" کی اوّلین اشاعت کے ساتھ شائع ہو جائیں گے پھر اصل تفسیر کے ساتھ چھپتے رہیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ سلسلۂ طباعت جاری تھا کہ اچانک مولاناؒ کو کلکتہ سے اخراج کا حکم دے دیا گیا اور وہ رانچی چلے گئے جہاں پہنچتے ہی نظربند ہو گئے اور اواخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں پابندیوں سے نجات ملی۔ اس اثنا میں ان کے ہاں تلاشیاں شروع ہوئیں پھر جتنے مسودات، یادداشتیں اور مجموعہ اجزا ملے وہ سب حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ موقع پر کوئی ایسا آدمی موجود نہ تھا، جو تمام کاغذات کی مفصل فہرست تیار کرا کے دستخط لے لیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۰ء میں مولاناؒ گھر واپس آئے تو پتا چلا کہ جو ضروری چیزیں چھپ رہی تھیں یا چھپنے کے لیے تیار ہو چکی تھیں، محض وہی نہیں، بلکہ ان کی سالہا سال کی یادداشتیں بھی باقی نہیں رہی تھیں۔ اس اثنا میں مولانا تحریک ترک موالات ولا تعاون کے لیے وقف ہو گئے اور ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور ایک سال قید کی سزا پائی۔ ۱۹۲۳ء میں لارڈ سنہا کی مداخلت سے بچے کھچے کاغذات واپس ملے تو ان میں کچھ ایسے تھے جو کارکنان حکومت کی بے احتیاطی نہیں، بے دردی کے باعث اس طرح بکھر چکے تھے کہ انھیں دوبارہ مرتب کرنا غیر ممکن تھا۔ کچھ ایسے تھے، جو اتفاقیہ آگ لگ جانے کے باعث جل چکے تھے۔ انھیں میں "مقدمہ تفسیر" اور البیان کے مطبوعہ اجزا یا مسودات بھی تھے اور "ترجمان القرآن" بھی۔

اب "مقدمہ" کے مطبوعہ اجزا میں سے ایک کرم خوردہ فرما ملا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "مقدمہ" کے بارھویں باب کا ایک حصہ تھا اور اس کی ابتدائی سطر ہی میں "مقدمہ" کے پانچویں باب کا حوالہ ہے، جس میں قرآن حکیم کے طرز نزول اور ترتیب و انضباط کی بحث تھی۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مقدمہ قرآن کے بارہ باب یقیناً چھپ چکے تھے۔ ممکن ہے اس کے بعد کے اجزا بھی چھپ چکے ہوں یا کمپوز ہو چکے ہوں مگر وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے مطبوعہ بھی اور غیر مطبوعہ بھی۔ ان احوال و وقائع سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس بزرگ ہستی کو آزادی وطن کے لیے جانبازانہ جدوجہد کے سلسلے میں صحت اور کاروبار کے علاوہ دینی و علمی افادات کے کتنے گراں بہا ذخیرے قربان کرنے پڑے۔

بہرحال جو "مقدمہ" مولاناؒ نے ۱۹۱۵ء میں مرتب کر لیا تھا، وہ تلف ہو گیا۔ جو اس کے بعد لکھا اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ مولاناؒ کی تحریرات میں سے کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے کم از کم یہی معلوم ہو سکے کہ خود ان کے پیش نظر اس مسئلے پر غور و فکر کا طریقہ کیا تھا۔ خوش نصیبی سے مولاناؒ کا ایک مفصل مقالہ مل گیا جس میں مسئلے کے صرف ایک پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اسے اصل بحث کی محض تمہید سمجھنا چاہیے۔ تاہم اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ خود مولاناؒ کے نزدیک تاریخ کی "بے لاگ اور بے رحم روشنی" میں "رحمۃ للعٰلمین" کی جانچ پرکھ کیونکر ہونی چاہیے۔

اس مقالے کے آخر میں مولاناؒ نے خود لکھ دیا تھا کہ اب دیکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات سے انسانیت کی سعادت اور ارتقاے فطری کی تکمیل کیونکر ہوئی؟ اس بحث عظیم کا احاطہ و استقصا، تو ممکن نہیں چند سرسری اشارے آیندہ نمبر میں کروں گا۔

اس "آیندہ" نمبر کے چھپنے کی نوبت ہی نہ آئی اور مجھے یقین ہے کہ اس کا مسودہ بھی انھیں کاغذات میں تلف ہو گیا جو حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیے تھے لیکن اب اس پر حسرت و افسوس کے سوا کیا باقی رہ گیا ہے؟

یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

اس مقالے کے ساتھ بعض دوسرے ضروری مباحث بھی میں نے شامل کر دیے ہیں۔ (مرتب)

باب ۹

رحمۃ للعلمین ﷺ

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ

—(۱)—

نوع انسانی کے لیے رحمت یہاں پیغمبرِ اسلام کے ظہور کا ایک ایسا وصف بیان کیا گیا ہے جو قرآن کے بیان کردہ اوصاف میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے[1]۔ یعنی رحمۃ للعلمین! یہ ظہور کسی ایک ملک، کسی ایک قوم، کسی ایک نسل ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہے۔ یہ وصف بیان کرکے قرآن نے ایک کسوٹی ہمارے حوالے کر دی ہے۔ اس پر ہم اس ظہور کی ساری صداقتیں پرکھ لے سکتے ہیں۔ اگر یہ فی الحقیقت تمام نوع انسانی کے لیے رحمت کا ظہور ثابت ہوا ہے تو اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو پھر سچائی نے قرآن کا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارا فرض ہے کہ حقیقت کا اعتراف حقیقت کے لیے کریں۔

یہ جانچ تاریخ کی بے لاگ اور بے رحم جانچ ہونی چاہیے۔ ہر طرح کی مذہبی خوش اعتقادیوں سے منزہ، ہر طرح کی خود پرستانہ طرف داریوں سے پاک، کیونکہ یہاں حقیقت کی عدالت موجود ہے اور وہ صرف حقیقت ہی کی شہادت پر کان دھرتی ہے۔

تاریخ کا فیصلہ جہل و تعصب نے ہمیشہ اعلانِ حقیقت کی راہ روکنی چاہی ہے، لیکن روک نہیں سکی۔ اس کے فیصلے میں بھی تاریخ نے دیر لگائی، لیکن بالآخر تسلیم کرنا پڑا۔ ضروری ہے کہ فیصلہ خود اسی کی زبانی سنا جائے اور ایک معتقد کی طرح نہیں بلکہ ایک مورخ کی طرح عالمِ انسانیت کے ایک ایک گوشے سے شہادت طلب کی جائے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی، جو اس موضوع پر علمی حیثیت سے وقیع سمجھی جاسکے۔ ہم نے "مقدمۂ تفسیر" میں اس کی کوشش کی ہے اور ایک خاص باب کا موضوع بحث یہی مسئلہ ہے۔ یہاں اتنی تفصیل کی گنجایش نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں، اس لیے مجبوراً قلم روک لینا پڑتا ہے۔ (سورۂ انبیا کا حاشیہ)

ابرِ رحمت اور شادابیِ زمین جب زمین پیاسی ہوتی ہے تو ربّ السمٰوٰت والارض پانی برساتا ہے، جب انسان

---

[1] وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ (سورۂ انبیاء ۱۰۶) اور اے پیغمبر ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ پوری کائنات کے لیے رحمت کا ظہور ہو۔

اپنی غذا کے لیے بے قرار ہوتا ہے تو وہ موسم ربیع کو بھیج دیتا ہے، جب خشک سالی کے آثار چھا جاتے ہیں تو آسمان پر رحمت کی بدلیاں پھیل جاتی ہیں؛

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (روم: ۴۸)

وہ خدا ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور ہوائیں بادلوں کو اپنی جگہ سے ابھارتی ہیں اور جس طرح اس کی مرضی نے انتظام کر دیا ہے، بادل فضا میں پھیل جاتے ہیں، پس تم دیکھتے ہو کہ ان کے اندر سے مینہ برسنے لگتا ہے اور تمام زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے پھر جب وہ اپنے بندوں پر جو بارش سے مایوس ہو گئے تھے، پانی برسا دیتا ہے، تو وہ کامیاب و خرم ہو کر خوشیاں منانے لگتے ہیں۔

قدرتی مثالوں کی حکمت

خدا کی تمام مثالیں اور دانائیاں جو وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کھولتا ہے، ہمیشہ عام اور قدرتی مظاہر سے تعلق رکھتی ہیں تاکہ زمین کی ہر مخلوق ان کی تصدیق کر سکے اور ان سے دانائی حاصل کر سکے۔ وہ ایسے تغیرات و حوادث اور غیر فطری و صناعی چیزوں کا ذکر نہیں کرتے جن کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے کسی خاص طرح کی زندگی، خاص طرح کے علم اور خاص طرح کے گرد و پیش کی ضرورت ہو، بلکہ اس کی ہر تعلیم ایسی عام اور خالص فطری حالات سے متعلق ہوتی ہے، جس کو سن کر جنگل کا ایک چرواہا اور متمدن آبادیوں کا فیلسوف دونوں یکساں اثر کے ساتھ خدا کی سچائی کو پا سکتے ہیں۔ پس اگر تم نے فلسفہ و حکمت نہیں پڑھا، اگر تم نے اجرام سماویہ کے دیکھنے کے لیے کسی رصد خانے کی قیمتی دور بین نہیں پائی، اگر تم کو مادہ کے خواص کا تجربہ نہیں، اگر تم کسی دار العلوم کے اندر برسوں تک نہیں رہے، اگر تم صحرائی ہو، اگر تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر گوشہ نشین ہو، اگر پھونس کی ایک چھت اور بانس کی ایک شکستہ دیوار ہی رہنے اور بسنے کے لیے تمہارے حصے میں آئی ہے اور اس طرح تم نہیں جانتے کہ اپنے خدا کو آسمان کے عجیب و غریب ستاروں کے اندر کیوں کر دیکھو اور اس کے حسن و جمال کو عناصر و ذرات خلقت کی آمیزش و آویزش کے اندر کیونکر ڈھونڈو، تاہم تم انسان ہو، تم کو روح دی گئی ہے اور تم زمین پر بستے ہو، تم آسمان کی ہر بدلی کے اندر، بادلوں کے ہر ٹکڑے کے اندر، ہواؤں کے ہر جھونکے کے اندر، باران رحمت کے ہر قطرے کے اندر، اپنے خداوند حیّ و قیوم کو، اس کی حکمت و قدرت کو، اس کی رافت و رحمت کو، اس کے پیار اور محبت کو دیکھ سکتے ہو اور اسے پا سکتے ہو۔ تم میں سے کون ہے جس نے امید و بیم کی نظروں سے کبھی آسمان کو نہیں دیکھا اور اس کی بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج کے اندر اپنی کھوئی ہوئی امید کو نہیں ڈھونڈا؟

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا۔ (روم: ۲۴)

اور قدرت الٰہی کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ جب زمین پیاسی ہوتی ہے اور خشک سالی کے آثار ہر طرف چھا جاتے ہیں تو وہ آسمان پر بارش کی علامتیں پیدا کر دیتا ہے اور

تم امید و بیم ، نظروں سے انھیں دیکھتے ہو۔

موت کے بعد زندگی

پھر وہ کون ہے کہ جب تم اور تمھاری تشنہ و بیقرار زمین پانی کے ایک ایک قطرے کے لیے ترس جاتی ہے، خاک کا ایک ایک ذرہ رطوبت و نمو کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے کرۂ ارضی اپنی بے خودانہ حرکت میں آفتاب کے آتشکدے سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اس کی تمام کائنات نباتات اپنا حسن و جمال فطری کھو دیتی ہے، پرندے اپنے گھونسلوں میں، ٹہنیاں درختوں میں اور انسان گھروں میں پانی کے لیے ماتم کرتا اور ہر دم آسمان کی گرم و خشک فضا کی طرف مایوسی کی نگاہیں اٹھاتا ہے، تو وہ اپنی محبت و ربوبیت کے نقاب میں آتا ہے اور مایوسی کے بعد امید کا، نامرادی کے بعد مراد کا، موت کے بعد زندگی کا پیام زمین کے ایک ایک ذرہ تک پہنچا دیتا ہے۔

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (روم: ۲۴)

اسی کی ربوبیت و رحمت کو دیکھو کہ جب تم امید و بیم کی نظروں سے آسمان کو دیکھتے ہو اور تمام زمین پر مردنی اور ہلاکی چھا جاتی ہے تو وہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور زمین پر موت کے بعد زندگی طاری ہو جاتی ہے۔ یقیناً قدرت الٰہی کی اس نمود میں صاحبان فکر و عقل کے لیے بڑی ہی نشانیاں رکھی گئی ہیں۔

رُوح کی پیاس اور دل کی بھُوک

یہ وہ انتظام الٰہی ہے جو پروردگار عالم نے انسان کے جسم کی غذا کے لیے کیا ہے، پھر کیا اس نے انسان کی روح کے لیے کچھ نہ کیا ہوگا؟ وہ رب الارباب جو زمین کی پکار سن کر اسے پانی دیتا اور جسم کی بے قراری دیکھ کر اسے غذا بخشتا ہے، کیا سرزمین روح و معنی کی تشنگی کے لیے کچھ نہیں رکھتا اور دل کی بھوک کے لیے اس کے خزانوں میں کوئی نعمت نہیں؟

وہ کہ اس کی محبت زمین کی مٹی کو خشک نہیں دیکھ سکتی اور درختوں کی ٹہنیوں کو وہ سبز پتوں اور سرخ پھولوں کی زیبائش سے محروم نہیں رکھتا، کیا روح انسانی کو ہلاکت و بربادی کے لیے چھوڑ دے گا اور عالم انسانیت کا مرجھا جانا اسے خوش آئے گا؟ وہ رب العلمین جو تمھارے جسم کو غذا دے کر موت سے بچاتا ہے کیوں کر ممکن ہے کہ تمھاری روح کو ہدایت دے کر ضلالت سے نہ بچائے؟

جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پُوچھا کہ:

مَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى۔ (طٰہٰ: ۵۰) تمھارا پروردگار کون ہے، اے موسیٰ؟

تو حضرت موسیٰؑ نے نہ صرف اپنے رب العلمین کی نسبت خبر ہی دی، بلکہ اس کی الوہیت کی دلیل قطعی و فطری بھی چند لفظوں میں فرما دی:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ (طٰهٰ: ۵۰)

ہمارا رب وہ ہے جو "رب" ہے اور اس کے لیے اس کی ربوبیت نے کائنات کی ہر چیز کو اس کی خلقی ضروریات بخشیں، پھر اس کے بعد ان کی ہدایت کر دی تاکہ صحیح اور فطری طریقے پر کاربند رہ کر اپنی خلقت کے مقاصد کو حاصل کریں۔

پس اس نے کہ زمین کی مٹی کے اندر قوت نشوونما رکھی، پھر پانی برسا کر اس کی ہدایت کر دی، یعنی اس کے آگے نفوذ و عمل کی راہ کھول دی اور جس کی ربوبیت نے عالم ہستی کے ایک ایک ذرہ کے لیے خلقت اور ہدایت دونوں کا سامان کر دیا، انسان کو بھی جسم اور روح دونوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے لیے بھی خلقت اور ہدایت، دونوں کا سامان رکھتا ہے۔

رحمت باری تعالیٰ کے خزانے

اس کی ربوبیت نے جس طرح جسم کے لیے زمین کے اندر طرح طرح کے خزانے رکھے ہیں، اسی طرح روح کی غذا سے بھی اس کے آسمانوں کی وسعت معمور ہے جس طرح جسم کی غذا اور زمین کی مادی حیات و نمو کے لیے آسمانوں پر بدلیاں پھیلتیں، بجلیاں چمکتیں اور موسلا دھار پانی برستا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اقلیم روح و قلب کی فضا میں بھی تغیرات ہوتے ہیں۔ یہاں اگر زمین کی مٹی پانی کے لیے ترستی ہے، تو وہاں بھی انسانیت کی محرومی ہدایت کے لیے تڑپنے لگتی ہے، یہاں پتے جھڑتے ہیں، ٹہنیاں سوکھنے لگتی ہیں اور پھولوں کے رنگین ورق بکھر جاتے ہیں تو تم کہتے ہو کہ آسمان کو رحم کرنا چاہیے۔ وہاں بھی جب سچائی کا درخت مرجھا جاتا ہے، نیکی کی کھیتیاں سوکھ جاتی ہیں، عدالت کا باغ ویران ہو جاتا ہے اور خدا کے کلم حق و صدق کا شجرہ طیبہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر حصے میں بے برگ و بار نظر آنے لگتا ہے تو اس وقت روح انسانیت چیختی ہے کہ خدا کو رحم کرنا چاہیے۔ یہاں زمین پر موت طاری ہوتی ہے تو خدا کی بارش اسے پھر اٹھا کر بٹھا دیتی ہے،

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (اعراف: ۵۷)

اور وہ پروردگار عالم ہی تو ہے کہ بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو باران رحمت کے آنے کی خوشخبری سنا دیتی ہیں، یہاں تک کہ جب اس کا وقت آجاتا ہے تو وہ وزنی بادلوں کو حرکت دیتی ہیں اور ہم انھیں ایک ایسے شہر کے اوپر لے جا کر پھیلا دیتے ہیں جو ہلاک ہو چکا ہے اور زندگی کے لیے پیاسا ہے۔ پھر پانی برستا ہے اور زمین کی موت کو زندگی سے بدل دیتا ہے، اس کی نمو بخشی سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور مخلوقات اپنی غذا حاصل کر لیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم مردوں کو بھی اٹھاتے ہیں اور یہ جو کچھ کہا گیا ہے سو در اصل ایک مثال ہے کہ تم دانائی اور سمجھ حاصل کرو۔

رحمت الٰہی کی عالمگیر نمود

عالم انسانیت کی فضائے روحانی کا ایک ایسا ہی انقلاب عظیم تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں ظاہر ہوا۔ وہ رحمت الٰہی کی بدلیوں کی ایک عالمگیر نمود تھی جس کے فیضان عام نے تمام کائنات ہستی کو سرسبزی و شادابی کی بشارت سنائی اور زمین کی خشک سالیوں اور محرومیوں کی بدحالی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ وہ خداوند قدوس، جس نے سینا کی چوٹیوں پر کہا تھا کہ میں اپنی قدرت کی بدلیوں کے اندر آتشیں بجلیوں کے ساتھ آؤں گا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ میرے جاہ و جلال الٰہی کی نمود ہوگی، سو بالآخر وہ آگیا اور سعیر و فاران کی چوٹیوں پر اس کے ابرکرم کی بوندیں پڑنے لگیں۔

یہ ہدایت الٰہی کی تکمیل تھی، یہ شریعت ربّانی کے ارتقاء کا مرتبہ آخری تھا، یہ سلسلۂ ترسیل رسل و نزول رحمت کا اختتام تھا۔ یہ سعادت بشری کا آخری پیام تھا۔ یہ وراثت ارضی کی آخری بخشش تھی، یہ امت مسلمہ کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہ حضرت ختم المرسلین و رحمۃ للعلمین محمد بن عبداللہ کی ولادت باسعادت تھی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلم۔

یہی واقعہ ولادت نبوی ہے جو دعوت اسلام کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہی ماہ ربیع الاول ہے، جس میں اس امت مسلمہ کی بنیاد پڑی، جسے تمام عالم کی ہدایت و سعادت کا منصب عطا ہونے والا تھا۔ یہ ریگستان حجاز کی بادشاہت کا پہلا دن تھا۔ یہ عرب کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش نہ تھی۔ یہ محض قوموں کی طاقتوں کا اعلان نہ تھا۔ اس میں صرف نسلوں اور ملکوں کی بزرگی کی دعوت نہ تھی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے اور جیسا کچھ کہ دنیا کی تمام تاریخ کا انتہائی سرمایہ ہے' بلکہ یہ عالم کی ربانی بادشاہت کا یوم میلاد تھا۔ یہ دنیا کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش تھی۔ یہ کرۂ ارضی کی سعادت کا ظہور تھا۔ یہ نوع انسانی کے شرف و احترام کا قیام عام تھا۔ یہ انسانوں کی پادشاہتوں، قوموں کی بڑائیوں اور ملکوں کی فتوحات کا نہیں بلکہ خدا کی ایک ہی اور عالمگیر پادشاہت کے عرش جلال و جبروت کی آخری اور دائمی نمود تھی۔

پس یہی دن سب سے بڑا ہے کیونکہ اسی دن کے اندر دنیا کی سب سے بڑی بڑائی ظاہر ہوئی۔ اس کی یاد نہ تو قوموں سے وابستہ ہے اور نہ نسلوں سے، بلکہ وہ تمام کرۂ ارضی کی ایک عام اور مشترک عظمت ہے جس کو وہ اس وقت تک نہیں بھلا سکتی جب تک اسے سچائی اور نیکی کی ضرورت ہے اور جب تک اس کی زمین اپنی زندگی اور بقا کے لیے عدالت و صداقت کی محتاج ہے۔

دنیا کی بڑائیاں اور ان کے نتیجے

دنیا میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے ہیں۔ یہ انقلابات خاص انسانوں کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان انسانوں کی پیدائش کے ایام کو بھی دنیا عظمت کے ساتھ یاد رکھنا چاہتی ہے اور اس اعتبار سے اس کی یادگاروں کی فہرست بڑی ہی طویل ہے۔ اس میں پادشاہوں کے زرنگار تختوں کی قطاریں ہیں، فاتحوں کی بے پناہ تلواروں کی جھنکار رہے، سپہ سالاروں کے زرہ بکتر کی ہیبت ہے۔ حکیموں کی حکمتوں اور دانائیوں کے دفاتر ہیں، فلاسفہ و علماء کے علوم و صحائف کے خزائن ہیں،

صناعوں کی ایجادیں ہیں، وطن پرستوں کے مواعظ ہیں، قومی پیشواؤں اور ملکی داعیوں کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں کی داستانیں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا اگر اپنی عظمت کے اصلی دن کو یاد رکھنا چاہتی ہے تو ان میں سے کسے یاد رکھے؟ ان میں سے کون ہے جس نے دنیا کو سب سے بڑی چیز دی ہے تاکہ وہ بھی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کی یاد کو پیار کرے۔

اولوالعزم شاہنشاہ

آؤ، ہم سب سے پہلے بڑے بڑے اولوالعزم شہنشاہوں کو دیکھیں جنھوں نے دنیا کے بڑے بڑے رقیبوں کو نوکِ شمشیر پر رکھ لیا اور ایسے عجیب و غریب ایوانوں اور محلوں میں بسے، جن کی دیواریں اور چھتیں چاندی سونے اور لعل و جواہر سے بنائی گئی تھیں۔ انھوں نے بہت زیادہ مال و متاع جمع کیا، ان کے پاس لوہے کے بہت سے آلات خونریزی تھے اور ان کی اطاعت و غلامی میں انسانوں کا سب سے بڑا گلہ تھا۔ پس ان کی پیدائش کے واقعہ کو بھی سب سے زیادہ عظیم الشان اور ناقابل فراموش ہونا چاہیے۔

لیکن اگر دنیا ان کی پیدائش کو یاد رکھے تو بتلاؤ دنیا کے لیے انھوں نے کیا کیا؟ ان کی فتوحات بہت وسیع تھیں اور ان کی وہ دولت جو انھوں نے زمین کی بستیوں کو اجاڑ کر لوٹی تھی، بڑے بڑے وسیع رقبوں کے اندر آتی تھی، لیکن دنیا کو اس سے کیا ملا کہ دنیا کی گردن ان کی یاد کے آگے جھکے؟ اگر وہ بہت بڑے فاتح تھے، تو اس کو یوں کہو کہ انھوں نے سب سے زیادہ زمین کو ویران کیا، سب سے زیادہ اس کی آبادیوں کو اجاڑا، سب سے زیادہ خون کی ندیاں بہائیں اور سب سے زیادہ خدا کے بندوں کے گلے میں اپنی غلامی کی لعنت کا طوق ڈالا۔ پھر کیا دنیا اپنی ویرانیوں، قتل و غارت، نہب و سلب اور اپنی غلامی کی ملعنت کے ناپاک دنوں کو یاد رکھے؟ جن کی ابلیسیت نے یہ لعنت پھیلائی تھی، ان کی پیدائش کی نحوست پر خوشیاں منائے؟

سکندر اور دوسرے فاتح

سکندر دنیائے قدیم کا سب سے بڑا فاتح تھا، جس نے پوری دنیا سے اپنے تخت کی پوجا کرانی چاہی، لیکن دنیا اگر اس کی پیدائش کو یاد رکھے تو یہ دن کن واقعات کی یاد ہوگا؟ یہ دنیا کی ویرانیوں، ہلاکتوں اور غلامی کی لعنتوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہوگا، جو اسے ہاتھ آئے گا۔

دنیا میں جس قدر بادشاہ پیدا ہوئے، اگر تم ان کی زندگی کے تمام کارناموں کا حاصل معلوم کرنا چاہو، تو اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ وہ جتنے بڑے بادشاہ تھے، اتنے ہی زیادہ انسانوں کو غلام بنانے والے تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی فطری قوتوں کے لیے پتھر تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی قدرتی حرکت و نشو کے لیے زنجیر تھے اور اتنے ہی زیادہ خدا کی عطا کردہ جبلت صالحہ اور انسان کے نوعی شرف و احترام کے لیے ان کے اندر بربادیوں اور ہلاکتوں کی نحوست تھی۔ پس جن کا وجود خود دنیا کے لیے ایک زخم تھا، وہ ان کی یاد میں اپنی گم شدہ شفا کیوں کر پا سکتی ہے؟

حکماء فلاسفہ

حکماء کی حکمت، فلاسفہ کا فلسفہ، صناعوں کی ایجادیں، بلاشبہ تاریخ عالم کے اہم مقامات ہیں، لیکن اگر وہ اپنی یاد کے آگے دنیا کو جھکانا چاہتے ہیں، تو انھیں تبلانا چاہیے کہ انھوں نے اپنی حکمت سرائیوں اور عجیب عجیب ایجادوں سے دنیا کے اصلی دکھ اور زمین کی حقیقی مصیبت کے لیے کیا کیا؟ آسمان کی فضا میں ان گنت ستاروں کی قطاریں پھیلی ہوئی ہیں۔ بلاشبہ وُہ شخص بہت بڑا غور کرنے والا دماغ اور بڑی ہی کاوش کرنے والی نظر رکھتا تھا، جس نے ہمیں سب سے پہلے تبلایا کہ یہ بڑے بڑے ستارے ہیں، ان میں ثوابت ہیں اور ان کی حرکتوں کے معین اوقات و ایام ہیں، لیکن دنیا جب ستاروں کی یہ بہت بڑی سچائی نہیں جانتی تھی، تو اس وقت بھی بیمار تھی اور یہ معلوم کرکے بھی بیمار ہی رہی۔ اس کا اصلی دکھ یہ نہ تھا کہ انسان آسمان کے متعلق تھوڑا جانتا ہے، بلکہ ہمیشہ سے وہ اس ایک ہی مرض میں گرفتار رہی ہے کہ انسان خود اپنی نسبت، اپنی فطرت صالحہ کی نسبت، اپنی راہ سعادت کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتا۔

صنعت گر

اس صناع کو اگر تم بڑا سمجھتے ہو، جس نے انسان کے لیے فن تعمیر ایجاد کیا تاکہ وہ پائیدار مکانوں اور خوب صورت چھتوں کے نیچے بیٹھے، تو تمھیں تبلانا چاہیے کہ کیا انسان درختوں کے نیچے بیٹھ کر نیک اور سچا انسان نہ تھا اور بڑے بڑے محلّوں کے اندر بس کر اس نے اپنی گم شدہ حقیقت پالی؟ دنیا کا اصلی مرض انسانیت حقیقی کی گم شدگی ہے۔ سعادت انسانی اور امن ارضی ہی وُہ نعمت ہے جس کی ڈھونڈ میں ابتدا سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ تہ و بالا ہو رہا ہے۔ پھر تبلاؤ کہ اگر یہ بڑے بڑے صنّاع اور موجد ہی انسانیت کی سب سے بڑی بڑائی رکھتے ہیں، تو ان کی ایجادوں نے انسان کو کس قدر امن دیا؟ کس قدر سلامتی بخشی؟ کہاں تک صراط سعادت پر چلایا؟ طلسم حیات انسانی کا کون سا راز افشا کیا؟ خدا اور بندوں کے رشتوں کو کہاں تک جوڑا؟ پھر اگر وُہ یہ نہ کر سکے تو دنیا ان کی ایجادات کو اپنے خزانے میں رکھ سکتی ہے، پر ان کی یاد میں اس کے لیے کوئی خوشی نہیں ہو سکتی کیونکہ انھوں نے اس کے اصلی دکھ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔

دور حاضر

اچھا، دنیائے قدیم کے ذخیرے میں جو کچھ ہے، اسے چھوڑ دو، کلدان و بابل اور یونان و اسکندریہ کے کھنڈر اور مسمار شدہ آثار کے اندر اگر دنیا کے لیے کچھ نہ تھا، تو بہت ممکن ہے کہ آج لنڈن اور برلن و پیرس کی عجیب و غریب آبادیوں اور عقل و فہم کو مبہوت کر دینے والے تمدّن کے اندر دُنیا کو وہ چیز مل جائے، جس کے لیے وہ ابتدائے خلق سے حیران و سرگشتہ رہی ہے۔

موجودہ تمدّن یورپ کی ابتدا جن بڑے بڑے دعووں سے ہوتی ہے، ضرور ہے کہ وُہ سب کے سب اس وقت تمھارے سامنے ہوں، کیونکہ ہماری موجودہ صحبت ان کے اعادے کی متحمل نہیں۔ ہم کو تبلایا گیا تھا کہ موجودہ تمدّن کو دنیا کے قدیم تمدّنوں سے کوئی مشابہت نہیں۔ ان کی مختلف شاخوں میں باہم ربط و علاقہ نہ تھا۔ ان کی بنیادیں

صحت وحقیقت پر نہ تھیں۔ وہ انسانی علم وعمل کی تمام شاخوں کو بیک وقت مکمل نہ کر سکی تھی، انھوں نے معلومات و اعمال میں کوئی صحیح نظم وترتیب پیدا نہیں کی اور انھیں اپنے تمدن کی اشاعت اور پھیلاؤ کے وہ ذرائع حاصل نہ تھے جن کے ذریعہ ہم نے کرۂ ارضی کو علم وتمدن کا ایک گھر بنا دیا ہے۔ پس گزشتہ تمدنوں کی ناکامی سے موجودہ تمدن کی ناکامی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور اسی طرح کے دعوے تھے جن سے موجودہ تمدن کی فضا بھر گئی تھی اور جن کے ذریعے اعلان کیا جاتا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی طاقت موجودہ تمدن کی ہے، حالانکہ سب سے بڑا صرف خدا ہے؛

لقد استکبروا فی انفسھم وعتوا عتوًا کبیرًا۔ بلاشبہ انھوں نے یہ کہہ کر اپنے اندر بڑا گھمنڈ پیدا کیا اور بڑی سخت درجے کی سرکشی کی۔ (فرقان: ۲۱)

اپنے ہاتھوں گھر برباد کرنے والے

سو اب تم دیکھو کہ دنیا اپنے اعتراف کا سر جھکانے کے لیے جب تمدن کے اس سب سے بڑے مغرور بت کی طرف جاتی ہے، تو اسے کیا جواب ملتا ہے۔

آج تمدن کے ابلیسانہ گھمنڈ کا ملعون بت چور چور کر دیا گیا ہے، خدا کا وہ زبردست اور بے پناہ ہاتھ جو قوم ثمود وعاد اور بڑی بڑی آبادیوں اور بڑے بڑے خیموں والوں کو سزا دے چکا تھا۔ اپنے جلال اور ہولناکی کی آتشیں چمک دکھلا رہا ہے۔ تم یورپ کی موجودہ جنگ[1] اور متمدن اقوام کے باہمی قتل وخونریزی پر چارپایوں کی طرح نہیں بلکہ انسانوں کی طرح نظر ڈالو اور دیکھو کہ یہ کیا ہے جو تمہارے سامنے ہو رہا ہے؟ یہ تمدن اور وحشت کی پیکار نہیں، یہ علم اور جہل کی ٹکر نہیں۔ یہ تمدن ہے جو تمدن سے ٹکرا رہا ہے، یہ علم ہے جو علم کو ذبح کر رہا ہے۔ یہ صناعت ہے جو صناعت کو پیس رہی ہے۔ یہ ایجاد کا مغرور شیطان ہے، جو ایجاد ہی کے شیطان لعین کو ڈس رہا ہے اور اس طرح تمدن کا گھمنڈ ہی ہے جو تمدن کے گھمنڈ کو ریزہ ریزہ اور پاش پاش کر رہا ہے؛

یخربون بیوتھم بایدیھم۔ اپنے گھروں کو وہ اپنے ہاتھوں ہی سے اجاڑ رہے ہیں۔ (۲۰ : ۵۹)

---

[1] یہ مقالہ پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴-۱۹۱۸) کے دوران میں لکھا گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹-۱۹۴۵) نے اس کے مطالب کی مزید تصدیق کر دی۔ عاد وثمود، فرعون اور ہزاروں دوسرے سرکش مختلف طریقوں سے فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ یورپ پر موت وہلاکت کی جو ہولناک آفتیں عالمی جنگوں کی شکل میں مسلط ہوئیں وہ بھی تو بہرحال ویسے ہی عذاب تھے جو سابقہ قوموں پر مختلف اوقات وادوار میں نازل ہو چکے تھے۔ کیا اہل یورپ نے اپنے ہاتھوں اپنے گھر برباد نہ کیے؟ ہٹلر، سٹالین، چرچل، دوسرے لوگ ایک دوسرے کو کاملاً مٹا دینے کے لیے ہر ممکن جدوجہد نہ کرتے رہے؟

پس اگر مسکین دنیا ان انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے جو تمدن کے پادشاہ تھے، علم کے فرمانروا تھے اور ایجاد صناعت کے دیوتا تھے، تو تم اس کا ہاتھ پکڑو اور اسے آج یورپ کے ان میدانوں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دو، جہاں تمدن و علم کا تخت عظمت و اجلال آگ اور لہو کی بدلیوں اور دھوئیں اور زہریلی گیسوں کی مسموم فضا کے اندر بچھایا گیا ہے اور مسمار عمارتوں کے کھنڈروں، سرخ سرخ خون کی ندیوں اور انسانوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کے تودوں پر اس کے سنہری ستون عظمت نصب کیے گئے ہیں۔ پھر اس سے کہو کہ وہ اپنی احسان مندی اور شکرگزاری کے لیے ان عظیم الشان انسانوں میں سے کسی کی بڑائی کو چھانٹ لے، جو آج گیہوں اور جو کے لیے روتے ہیں کیونکہ ہوا میں اڑنے کے آلات اور پانی کو مفرد اجزا میں بدل لینے کا علم ان کے لیے کچھ کام نہ آیا۔

کس کی یاد منائیں؟

وہ ان میں سے کس کو اپنی پرستش اور یاد کے لیے چُنے گی؟ کیا وہ اس سب سے بڑے فلسفی کو یاد کرے گی، جو چودھویں صدی عیسوی میں آیا اور اس نے تجربے کی راہ کھولی، جس راہ نے کر انسانوں کو ہلاکت اور خونریزی کے سب سے زیادہ روح پاش آلات تک پہنچا دیا؛ وہ کیمسٹری کے اس دیوتا کو یاد کرے گی جس پر موجودہ تمدن کو سب سے زیادہ ناز ہے اور جس نے ایسی زہریلی گیس، ایسے مہلک بم اور شیل اور ایسے بے پناہ مرکبات بنا دیے جن کے آگے انسانی جماعتیں بالکل بے بس ہو جاتی ہیں اور منٹوں کے اندر بڑی بڑی آبادیاں موت کی لعنت سے بھر جاتی ہیں؛ اچھا، بھاپ کی طاقت کے موجد کو بلاؤ، اس کی بڑائی کیسی عجیب تھی جس نے بھاپ کی غیر معلوم طاقت کو انسان کے تابع کر دیا؛ لیکن آہ! وہ اس دنیا کے لیے کیا کر جو موت کی نہیں، بلکہ زندگی کی بھوکی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ بھاپ کے شیطان ہی کے اندر وہ سب سے بڑی بے پناہ خباثت ہے، جس نے آج جنگ کے میدانوں میں مختلف بھیسوں اور مختلف صورتوں کے اندر موت کی سب سے بڑی پھنکار ماردی ہے اور تمام انسانی علم و دانائی اس کے بچاؤ کے لیے بیکار رہے؟

پھر کیا دنیا تمدن و علم کے ان مغرور ربانیوں کی پیدائش پر خوشیاں منائے جنھوں نے اس کی موت اور ہلاکت کے لیے تو سب کچھ کیا، پر اس کے امن و سلامتی اور سعادت و طمانیت کے لیے کچھ نہ کر سکے؛ ان کے پاس انسان کے اڑنے، سمندروں کے اندر جانے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تموج اور ذرات کو اپنے نامہ و پیام کا سفیر بنانے اور خود بخود بجنے والے باجوں اور بڑی تیزی سے چلنے والی سواریوں کے لیے تو بڑا ذخیرہ ہے، لیکن انسان کو نیک اور راست باز بنانے، خدا کی عدالت و صداقت سے زمین کو معمور کرنے، امن اور راحت کی پادشاہت کے قائم کرنے، ظلم و فساد کے بیج سے زمین کو صاف کرنے، طاقت اور حکم کے جبر سے ضعف اور ناتوانی کو بچانے اور انسانوں کو درندوں اور سانپوں کی طرح نہیں، بلکہ انسانوں کی طرح بسا دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔

باب ۹۵

رحمۃ للعلمین ﷺ

وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعلمین

—(۲)—

قرآن حکیم کا درس حکمت تم نے یورپ کے تمدن کی، کتوں کی طرح لوٹ کر اور بھیڑوں کی طرح چل کر ہمیشہ پرستش کی ہے اور مذہب کی تعلیمات کی ہنسی اڑائی ہے کہ وہ "آخرت آخرت" کہتا ہے، مگر یورپ کی طرح دنیا کے لیے کچھ نہیں تبلاتا، لیکن شاید تم آج قرآن حکیم کی اس آیت کو سمجھ سکو، جس کے متعلق حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اس کی تلاوت آخری زمانے کے فتنہ سے بچائے گی؛

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۔

(کہف: ۱۰۳ - ۱۰۴)

تم کو تبلاؤں کہ سب سے زیادہ ناکام و نامراد کام کرنے والے کون ہیں؟ وہ جن کی تمام قوت سعی صرف دنیا کی زندگی سنوارنے ہی میں کھوئی گئی اور جہل حقیقت نے ان میں یہ گھمنڈ پیدا کر دیا کہ بہت سی خوبیوں کا کام کر رہے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے پروردگار کی آیتوں اور اس کے حضور حاضر ہونے سے انکار کیا، پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور قیامت کے دن انھیں کوئی وزن نصیب نہ ہوگا۔

دوسری جگہ ارباب کفر کے اعمال یہ تبلائے؛

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۔ (روم: ۷)

صرف دنیا کی زندگی کا ایک ظاہری پہلو انھوں نے جان لیا ہے اور وہ آخرت کے علاقوں سے بالکل غافل ہو گئے ہیں۔

آخرت سے مقصود یہ نہیں کہ دنیا اور دنیا کے اعمال ترک کر دیے جائیں، بلکہ اس کی عملی تفسیر یورپ کی موجودہ زندگی کو سمجھو، جس نے اپنے تئیں صرف دنیا ہی کے لیے وقف کر دیا اور اس کے گھمنڈ میں وہ اللہ اور اس کے رشتے کے لیے کوئی وقت اور فکر نہ نکال سکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے وہ چیز تو حاصل کر لی، جس کا نام تمدن رکھا گیا ہے، لیکن وہ شے حاصل نہ کر سکی جو انسان کے لیے امن حقیقی کی راہ اور اسلام و سعادت فکری کی صراط مستقیم ہے۔

خدا کے پاک رسول ؐ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ان انسانوں کا حال ہے، جن کی بڑائیاں صرف جسم و مادہ تک محدود تھیں

لیکن اگر دنیا کے لیے ان کی پیدائش کی یاد میں کوئی تسکین اور راحت نہیں تو وہ ان تمام صفوں سے باہر آجائے گی اور دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے دامن میں پناہ لے گی۔ وہ بانیان مذہب کی عظمتوں کا نظارہ کرے گی۔ وہ خدا کے رسول اور اس کے پاک پیاموں کے پیامبروں کو ڈھونڈے گی۔

ہاں، اگر دنیا ایسا کرے تو یہ فی الحقیقت اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوگا، اس کے دائمی درد اور بے قراریوں کے لیے سکھ اور راحت کی ایک حیات بخش کروٹ ہوگی اور وہ بلاشبہ منزل مقصود کو پالے گی۔ قرآن حکیم نے بھی اس کے دکھ کا یہی علاج بتایا ہے اور جب کہ وہ پادشاہوں، قومی پیشواؤں، کاہنوں اور علم و مذہب کے جھوٹے مدعیوں کے دامنِ غرور میں لپٹی ہوئی تھی تو اسے وصیت کی کہ وہ سچائی کے رسولوں اور خدا کے داعیوں کی راہ اختیار کرے اور انھی کی زندگی کو اپنا نصب العین بنائے:

اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم۔ (سورۂ فاتحہ)	خدایا تو ہمیں صراط مستقیم پر چلا، وہ صراط مستقیم جو تیرے نبیوں، صدیقوں، شہیدوں، صالح بندوں کی راہ ہے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس میدان میں بھی آکر وہ کون سی زندگی ہے، جس کے اعمال و عوت کے اندر دنیا کو پیام امن وسعادت مل سکتا ہے؟

دنیا میں آج جو بڑے بڑے مذاہب موجود ہیں، وہ علم الاقوام کی تقسیم کے مطابق دو قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک سیماطیقی (سامی) سلسلہ ہے، جس کے ماتحت یہودی اور مسیحی قومیں اب تک دنیا میں باقی ہیں۔ دوسرا آرین سلسلہ ہے، جس سے گوتم بدھ اور ہندوستان کے تمام داعیان مذاہب وابستہ ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

پھر دنیا کے لیے اگر سب سے بڑا رسول یہودی مذہب کی تاریخ میں ہے، تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور ان کی پیدائش کو سب سے بڑا واقعہ قرار دے گی، لیکن اگر اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے یہ سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعمال حیات مقدس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مصر کی ایک جابر و ظالم گورنمنٹ کے پنجۂ استبداد سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور اسے غلامی کی ناپاکی سے نکال کر جو انسانیت کے لیے سب سے بڑی ناپاکی ہے، حکومت اور امن و عزت کی طہارت تک پہنچا دیا۔

بلاشبہ انھوں نے اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی نسل کے لیے بڑا ہی مقدس جہاد کیا اور یہ ان کا یادگار عالم اسوۂ حسنہ ہے، جس کی دنیا کو تقدیس کرنی چاہیے، لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے تمام دنیا کے لیے کیا کیا؟ دنیا صرف بنی اسرائیل ہی کا نام نہیں۔ غیر الٰہی عبودیت کی زنجیریں صرف بنی اسرائیل ہی کے پاؤں میں نہیں تھیں، بلکہ کرۂ ارضی کی تمام آبادی کے پاؤں اس کے بوجھ سے زخمی تھے، پس دنیا کے لیے وہی طلوار محبوب ہو سکتی ہے جو صرف

فرعون کی ڈالی ہوئی زنجیریں ہی نہ کاٹے، بلکہ دنیا کے تمام فرعونوں کے تخت اُلٹ دے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلائی، مگر پوری دنیا غلامی سے نکلنے کی آرزومند ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

دُوسرا سب سے بڑا اسرائیلی مذہب مسیحی تحریک کا ہے لیکن مسیحی دعوت کی تعلیم ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ مسیحیت سے منسوب قومیں جو کچھ کہیں گی ہم اسے حضرت مسیحؑ کے نام سے قبول نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیحؑ نے کہا کہ میں صرف تورات کو قائم کرنے آیا ہوں، خود کوئی نئی دعوت نہیں لایا (متی ۵، ۱۷) انھوں نے تصریح کی میرا مشن صرف بنی اسرائیل کی اصلاح تک محدود ہے۔ نیز انھوں نے غیر قوموں میں منادی کرنے سے روکا[1] اور ہمیشہ اپنے کاموں اور اپنی وصیتوں میں اپنی تعلیم کو اسرائیل کے گھرانے تک ہی محدود رکھا۔ پس دراصل انھوں نے جو کچھ بھی خدمت کرنی چاہی وہ محض بنی اسرائیل نامی ایک مسخ شدہ قوم کی تھی، تمام دنیا کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

پھر ان کا ظہور اس وقت ہوا جب کہ روم کی ظالمانہ حکومت نے شام کے مقدس مرغزاروں کو روند ڈالا تھا اور بت پرست قوموں کی جابر و مستبد گورنمنٹیں دنیا کے بڑے حصے کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھیں، لیکن انھوں نے نہ تو اس ظلم و طغیان کے متعلق کچھ کہا اور نہ اس سے کچھ تعرض کیا۔

مسیحی قومیں اور تعلیم مسیحؑ

پہلی صدی مسیحی کے بعد جس قدر مسیحی قومیں دنیا میں آباد ہوئیں، ان کو حضرت مسیحؑ کی تعلیم و دعوت سے کچھ تعلق نہ تھا اور وہ سرتاسر یونان کے ایک تعلیم یافتہ یہودی پولس کے مذہب کی پیرو تھیں۔ پولس نے تمام حواریان مسیحؑ کے مذہب کے خلاف غیر اسرائیلی انسانوں کو بپتسما دینا شروع کیا اور اس طرح روم و یونان کے مختلف جزیروں اور دیہاتوں میں ایک نیا گروہ پیدا کر لیا پس اگر دنیا حضرت مسیحؑ کی طرف جھکنا چاہے گی، تو دنیا کو ان کے کارنامۂ حیات کے لیے بمشکل ایک چوتھائی صدی ہاتھ آئے گی، جس کے اندر ان کے تربیت یافتہ حواریوں کے اعمال نظر آ سکتے ہیں اور یہ چند سال فضائل و محاسن اخلاق کا کیسا ہی عمدہ نمونہ پیش کریں، لیکن ان میں دنیا کے لیے کوئی پیغام نجات نہیں۔

پھر اس سے بھی قطع نظر کرو۔ نتائج کی بحث بعد کو آتی ہے۔ سب سے پہلے دعوت، اعلان، ادعاء اور نفس تعلیم کا سوال ہے۔ دنیا حضرت مسیحؑ کی یاد پر کیوں کر قناعت کر لے جب کہ خود انھوں نے دنیا کے لیے کچھ نہ کیا' بلکہ ہمیشہ اسے ٹھکرایا، مردود کہا اور اس کے ساتھیوں کو، اس کے دوستوں کو اور اس سے رشتہ رکھنے والوں کو خدا کی پادشاہت کی مہربانی[2] سے محروم تبلایا حتیٰ[3] کہ ایک آخری فتویٰ دے دیا" تم خدا اور دنیا، دونوں کی خدمت

---

[1] غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور نہ سامریوں کے کسی شہر میں داخل ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا (متی ۱۰: ۶)

نہیں کر سکتے"۔ (متی ۲۵:۶) اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو"۔ (متی ۱۹:۲۳)

اس سے درگزر کرو اور اس کی بہتر سے بہتر توجیہ جو کر سکتے ہو کر لو۔ نیز پولس کی دعوت ہی کو حضرت مسیح علیہما السلام کی دعوت تسلیم کر لو اور ان تمام قوموں کو جنھوں نے مسیح کے نام پر بپتسمے کا پانی اپنے اوپر چھڑکا، مسیحی دعوت کا پھل مان لو، لیکن پھر بھی مسیحی تحریک کی پوری تاریخ کا کیا حال ہے؟

مسیحیت کی حکمرانی جب تک مسیحیت دنیا پر حکمران رہی، جس وقت تک مسیحی مذہب کا دینی تسلط انسانوں سے اطاعت کراتا رہا اور جب تک کہ مسیحی رہنماؤں کی غلامی سے دنیا نے انحراف نہ کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت تک اس کا وجود دنیا کے لیے، دنیا کے علم و تمدن کے لیے، آبادی و عمرانی کے لیے، اخلاق و پاکیزگی کے لیے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کی فطری حریت اور شرف انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت رہا، جس نے جلایا، ویران کیا، مسمار کیا، قتل کیا، جیل خانے بھرے، زبانوں پر مہریں لگائیں، انسانی دماغوں کو معطل کیا، لیکن انسان اور انسانیت کی راستی و ترقی کے لیے چند لمحوں کا بھی ایک دور پیدا نہ کیا۔ مشہور مورخ گیزو، سیدیو، لامارے اور ڈریپر اس بارے میں ہمارے لیے بہترین راوی ہیں۔

لیکن جس وقت سے کہ مسیحیت کی قوت نے شکست کھائی تمدن کا غیر دینی دور شروع ہوا۔ مذہبی جماعتوں اور مذہبی خلافت (پوپ) کے حلقۂ غلامی سے یورپ آزاد ہو گیا اس وقت سے یورپ کے موجودہ تمدن کی بنیاد پڑی اور مسیحی قوموں نے ترقی شروع کی۔

اگر تم کہتے ہو کہ دنیا کے لیے سب سے بڑی عظمت مسیحی مذہب کے بانی میں تھی، تو خود اس کے بانی ہی نے ہمیں معیار حق و باطل بھی بتلا دیا ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" (مرقس ۱۹:۱۶) پس دنیا اگر مسیحی مذہب کی پیدائش کے اندر اپنی خوشی کو ڈھونڈے تو اس کو انسان کے امن و سلامتی اور فطرت کی آزادی و سعادت کی جگہ قتل و غارت اور ہلاکت و غلامی کی یادگار کا جشن منانا پڑے گا کیونکہ "مسیحیت" کے درخت کا تو یہی پھل ہمارے سامنے ہے۔

پھر کیا دنیا اس کے لیے طیار ہے؟

لے یورپ اور امریکہ مسیحیت کے بہت بڑے مرکز ہیں، کیا ان کی سرگزشت استعمار خواہ اس کی شکل کوئی ہو، ابتدا سے آج تک عالم انسانیت کے لیے خصوصاً کمزور قوموں، ملکوں اور ملتوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت نہیں بنی رہی؛ اور آج بھی ہر مصیبت کا سرچشمہ یہی استعمار نہیں جس کی وجہ سے امن عالم معرض خطر میں ہے؛ پہلے جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) استعمار پرستوں کی ذاتی اغراض کے باعث برباد ہوئی آج انجمن اقوام متحدہ ویسی ہی حالت سے دوچار ہے۔

یہ جو کچھ تھا، مسیحی اقوام کی تاریخ قدیم کی بنا پر تھا لیکن اگر اس پر گزشتہ دو صدیوں کے واقعات و نتائج کا بھی اضافہ کر دیا جائے جو اقوام یورپ کے اعمال تمدن سے وابستہ ہیں تو دنیا کی مایوسی اور زیادہ درد انگیز ہو جائے۔

آریائی نسل کی دعوتیں

اس کے بعد مذاہب عالم میں آرین نسلوں کی دعوتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، لیکن افسوس کہ دنیا کے لیے ان کے پاس بھی کوئی پیام سعادت نہیں۔ عظیم الشان گوتم بدھ کی تعلیم و وصایا کا ماحصل یہ بتلایا جاتا ہے کہ "نجات دنیا کے ساتھ رہ کر حاصل نہیں ہو سکتی"۔ پس دنیا کو جن لوگوں نے ٹھکرا دیا، دنیا ان کے پاس جا کر کیا سکھ حاصل کرے گی؟ پھر اس نے جو کچھ بھی بتلایا اور سکھلایا ہو، لیکن قوموں اور ملکوں کے دائرہ ہی میں اس کی دعوت محدود رہی۔ ہندوستان میں اسے شکست ملی تو جاپان اور چین میں جا کر محدود ہو گئی۔ پس زمین اپنی اس مصیبت کے لیے جو رقبوں اور ملکوں میں محدود نہیں، عظیم الشان بدھ سے کیا حاصل کر سکتی ہے؟

ہندوستان کے مذہبی ذخیرۂ تعلیمات اور ان کی پُر اثر قدامت کی وقعت سے ہم انکار نہیں کر سکتے، تاہم دنیا کے لیے ان کے بانیوں کی عظمت کے اندر کیا خوشی ہو سکتی ہے جب کہ کوہ ہمالیہ کی دیواروں اور بحیرہ عرب کی موجوں سے باہر بھی دنیا ہے، مگر ہندوستان کے مذہبی داعیوں نے صرف ہندوستان کے اندر بسنے والوں ہی کو اپنی ہدایتیں سپرد کیں۔

نجات و تسکین کا واحد پیام

پس دنیا اگر اپنی نجات کے لیے بے چین ہے تو اس کے لیے راحت اور تسکین کا پیام صرف ایک ہی ہے اور صرف ایک ہی کی زندگی میں ہے۔ اس کا دکھ ایک ہی ہے اس لیے اس کی شفا کے نسخے بھی ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اس کا پروردگار ایک ہے جو اپنے ایک ہی آفتاب کو اس کے خشک و تر پر چمکاتا اور ایک ہی طرح کی بدلیوں سے اس کے آباد و ویرانے کو شاداب کرتا ہے۔ اس کی ہدایت و رحمت کا آفتاب بھی ایک ہی ہے اور گو بہت سے ستارے اس کی روشنی سے اکتساب نور کرتے ہوں مگر ان سب کا مرکز و مبدأ نورانیت ایک ہی ہے۔

قرآن حکیم نے آفتاب کو "سراج" کہا،

وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا۔ (نبا: ۱۲)

اور ہم نے آسمان میں سورج کے چراغ کو بڑا ہی روشن بنایا۔

اور اسی طرح اس کے ظہور کو بھی "سراج" کہا، جس کی ہدایت و رحمت کی روشنی کرۂ ارضی کی ظلمتوں کے لیے پیام صبح تھی:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا

اے پیغمبر اسلام! ہم نے تم کو دنیا کے آگے حق کی گواہی دینے والا، سعادت

وَ نَذِيْرًا ۙ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ (احزاب ۵: ۴۵-۴۶)

انسانیت کی خوشخبری پھیلانے والا، اللہ کی طرف اس کے بندوں کو بلانے والا اور دنیا کی تاریکیوں کے لیے ایک چراغ نورانی بنا کر بھیجا۔

کرہ ارض کے لیے آفتاب ہدایت

پس تمام کرہ ارضی کی روشنی کے لیے یہی ایک آفتاب ہدایت ہے، جس کی عالم تسخیر کرنوں کے اندر دنیا اپنی تمام تاریکیوں کے لیے نور بشارت پاسکتی ہے اور اس لیے صرف وہی ایک ہے جس کے طلوع کے پہلے دن کو دنیا کبھی نہیں بھلا سکتی اور اگر اس نے بھلا دیا ہے تو وہ وقت دُور نہیں جب اسے کامل عشق و شیفتگی کے ساتھ صرف اسی کے آگے جھکانا پڑے گا اور اسی کو اپنا کعبہ امید بنانا پڑے گا۔

اس مقدس پیدایش نے دنیا میں ظاہر ہو کر یہ نہیں کہا کہ میں صرف بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے آیا ہوں، بلکہ اس نے کہا کہ تمام عالم انسانیت کو غیر الٰہی قوموں سے نجات دلانا میرا مقصد ظہور ہے۔ اس نے صرف اسرائیل کے گھرانے کی گم شدہ رونق ہی سے عشق نہیں کیا، بلکہ تمام عالم کی اجڑی ہوئی بستی پر غمگینی کی اور ان کی دوبارہ رونق و آبادی کا اعلان کیا۔ اس نے اس خدا کی محبتوں کی طرف دعوت نہیں دی جو صرف سینا کی چوٹیوں یا ہمالہ کی گھاٹیوں میں بستا ہے، بلکہ اس رب العلمین کی طرف بلایا جو پورے نظام ہستی کا پروردگار ہے اور اس لیے تمام کائنات عالم کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ ہم کو دنیا میں سکندر ملتا ہے جس نے تمام عالم کو فتح کرنا چاہا تھا لیکن ہم دنیا کی پوری تاریخ میں خدا کے کسی رسول کو نہیں پاتے جس نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا ہو۔

جہانوں کے لیے رحمت

اس کا صرف ایک ہی اعلان ہے جو آغاز خلقت سے اب تک کیا گیا ہے اور اس لیے اگر دنیا نسلوں، قوموں اور رقبوں کا نام نہیں بلکہ مخلوقات الٰہی کی اس پوری نسل کا نام ہے جو کرۂ ارضی کی پیٹھ پر بستی ہے تو وہ مجبور ہے کہ ہر طرف سے مایوسی کی نظریں ہٹا کر صرف اس ایک ہی اعلان عام کے آگے جھک جائے اور صرف اسی کی پیدایش کے دن کو اپنی عمر کا سب سے بڑا دن یقین کرے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ (فرقان: ۱)

کیا ہی پاک اور برکتوں کا سرچشمہ ہے وہ ذات اس کی جس نے اپنے برگزیدہ بندے پر الفرقان نازل کیا تاکہ وہ قوموں اور ملکوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالموں کی ضلالت کے لیے ڈرانے والا ہو۔

دنیا میں جس قدر داعیان حق و صداقت کے اعلانات موجود ہیں۔ اگر دنیا ان کو بھلا دے گی تو یہ صرف قوموں اور ملکوں کی سعادت کی فراموشی ہوگی کیونکہ اس سے زیادہ انھوں نے کچھ نہ کہا لیکن اگر ربیع الاول کو اس نے بھلا دیا تو یہ تمام کرہ ارضی کی نجات کو بھلا دینا ہوگا کیونکہ ربیع الاول کی رحمت کسی ایک سرزمین کے لیے نہیں بلکہ تمام عالمین کے لیے تھی۔

(یہاں ۔ جو کچھ حوالۂ قلم ہوا، یہ محض ایک تمہید تھی اور اسلام کی رحمت عامہ کا ایک سرسری مطالعہ لیکن اس کے بعد اصلی سوال ہمارے سامنے آتا ہے یعنی اس پیدائش نے دنیا کی حقیقی اور عالمگیر مصیبت کے لیے کیا کیا؟ اور انسانیت کی سعادت و ارتقائے فطری کی کیوں کر تکمیل کی؟ اس مبحث عظیم کا احاطہ و استقصاء تو ممکن نہیں لیکن چند سرسری اشارات آیندہ نمبر میں ملیں گے)۔[1]

---

[1] یہ مفصل مقالہ ۱۴ و ۲۱ جنوری ۱۹۱۶ء کے "البلاغ" میں شائع ہوا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ چھپنے ہی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ مارچ میں مولانا کو بنگال سے اخراج کا حکم ہو گیا اور وہ مجبوراً کلکتہ چھوڑ کر رانچی (صوبہ بہار) چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ اپریل ۱۹۱۶ء سے دسمبر ۱۹۱۹ء تک وہ نظر بند رہے، ان کا فیصلہ یہ تھا کہ "البلاغ" جاری رہے گا جس کے لیے رانچی سے مضامین بھیجے جائیں گے لیکن نظر بندی کے بعد اس فیصلے پر عمل نا ممکن ہو گیا۔ بہر حال اس مقالے سے وہ بنیادی معیار ضرور واضح ہو گیا، جس کی بنا پر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ دنیا کے لیے خدا کی رحمت کون سا وجود ہو سکتا ہے۔

باب ۹۹

ربّ العٰلمین اور رحمۃ للعٰلمین

آفتاب توحید و ہدایت

قرآن حکیم نے توحید الٰہی کے داعی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو "سراج منیر" سے ملقب کیا اور ان کے خصائص کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ (احزاب: ۴۶)

اے پیغمبر! بے شک ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت پہنچانے والا، ضلالت و خبائث سے خوف دلانیوالا، راہِ الٰہی کی طرف داعی اور ایک نورانی مشعل بنا کر بھیجا ہے۔

لیکن ایک دوسرے موقع پر آفتاب کو بھی "سراج" کے لقب سے یاد کیا ہے،

وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۔ (نوح: ۱۶)

اور آسمان میں خدا نے چاند کو بھی بنایا، جو ایک نور ہے اور سورج کو بھی بنایا کہ وہ ایک روشن مشعل ہے۔

اس مماثلت اور اشتراک تشبیہ سے مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت بھی اس آفتاب مادی کی طرح ایک آفتاب روحانی ہے۔ آفتاب جب نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز نزدیک و دور، اعلیٰ و ادنیٰ، سیاہ و سفید، باغ و دشت کی نہیں ہوتی۔ اس کی روشنی بلا تمیز مکان و مقام ہر شے پر چمکتی اور ہر حرارت پذیر وجود کو گرم کرتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال اس آفتاب دعوت الٰہی اور نیّر درخشان سماے رسالت کی عموم فیضان بخشی کا تھا، جو گو سیر سے چلا، مگر فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا جس کی کرنوں میں داہنی جانب شریعت الٰہی کی "نور و کتاب مبین" تھی مگر بائیں جانب قیام عدل و میزان کی شمشیر آبدار چمک رہی تھی، جس کا طلوع کائنات میں ظلمت کی شکست اور روشنی کی دائمی فیروزمندی تھا کیونکہ آسمان ہدایت پر شریعت الٰہی کے گو سیکڑوں ستارے نمودار ہوئے تھے لیکن تاریکی کی آخری شکست کے لیے دنیا کو آفتاب ہی کے طلوع کا انتظار ہوتا ہے:

وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ وَ النَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰۤى ۙ (واللیل، ۱-۳)

رات کی قسم، جبکہ اس کی تاریکی کائنات کی تمام اشیاء کو چھپا دیتی ہے اور روز روشن کی قسم، جبکہ آفتاب کی تجلی تمام کائنات کو روشن کر دیتی ہے اور دراصل اس خالق کی قسم، جس نے تخلیق عالم کے لیے نر اور مادہ کا وسیلہ پیدا کیا۔

عالمگیر اخوت و اتحاد اس آفتاب توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق و انشقاق کی تمام تاریکیوں کو مٹادیا۔ اس کی روشنی کی فیضان بخشی میں اسود و ابیض اور عرب و عجم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ خدا کی ربوبیت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ "رب العلمین" تھا، پس ضرور تھا کہ اس کی راہ کی طرف دعوت دینے والا بھی "رحمۃ للعلمین" ہو۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا، مگر تمام عالموں کے لیے رحمت قرار دے کر۔ (انبیاء: ۱۰۷)

انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی، کہ اس نے رشتہ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی، قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا، لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے، جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں، بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی اور کہا کہ؛

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (حجرات: ۱۳)

اے لوگو ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ، ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں۔ امتیاز و شرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔

صرف ایک رشتہ پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے "ومن ایاتہ اختلاف السنتکم و الوانکم" لیکن اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ ہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دُور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دُوسرے سے جدا کر دیا ہو؛

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ۔ بیشک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں۔ (مومنون: ۵۲)

مقام محمود آیت ۷۹ (بنی اسرائیل[1]) میں مقام محمود سے مراد ایسا درجہ ہے جس کی عام طور پر ستایش کی جائے۔

---

[1] وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ (بنی اسرائیل ۷۹) (اور اے پیغمبر) رات کا کچھ حصہ یعنی پچھلا پہر شب بیداری میں بسر کر، یہ تیرے لیے ایک مزید عمل ہے قریب ہے اللہ تجھے ایسے مقام میں پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو۔

فرمایا، کچھ بعید نہیں کہ تمھارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچا دے جو عالمگیر اور دائمی ستایش کا مقام ہو۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب پیغمبرِ اسلام کی مکّی زندگی کے آخری سال گزر رہے تھے۔ مظلومیت اور بے سروسامانی اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ چکی تھی، حتّٰی کہ مخالفین قتل کی تدبیروں میں سرگرم تھے۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ ان مظلومیتوں سے فتح و کامرانی پیدا ہو سکتی ہے؟ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہ تھی بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوعِ انسانی کے لیے عظمت و ارتفاع کی سب سے آخری بلندی ہے۔ یعنی عسیٰ ان یبعثك ربّك مقاماً محمودا۔ حسن و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی مرکزیت حاصل ہو جائے گی۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستایش ہوگی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی۔ محمود یعنی سرتاسر ممدوح ہستی ہو جائے گی۔

ماشئت قل فیه ، فانت مصدق

فالحب یقضی و المحاسن تشهد !

انسانی عظمت کی انتہا

یہ مقام، انسانی عظمت کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی و ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ جا سکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستایش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔ سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد و ملک کی ستایش اسے نہ دلا سکیں اور نپولین کی ساری جہاں ستانیاں اتنا بھی نہ کر سکیں کہ کورسیکا کے چند غدار باشندوں ہی میں اسے محمود و ممدوح بنا دیتیں، جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ محمودیت اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس میں حسن و کمال ہو، کیونکہ رُوحیں حسن ہی سے عشق کر سکتی ہیں اور زبانیں کمال ہی کی ستایش میں کھل سکتی ہیں، لیکن حسن و کمال کی مملکت، وہ مملکت نہیں جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کر سکیں۔

زبانوں کی ستایش اور روحوں کا احترام

غور کرو، جس وقت سے نوعِ انسانی کی تاریخ معلوم ہے، نوعِ انسانی کے دلوں کا احترام اور زبانوں کی ستایش کن انسانوں کے حصے میں آئی ہیں؟ شہنشاہوں اور فاتحوں کے حصے میں، یا خدا کے ان رسولوں کے حصے میں جنھوں نے جسم و ملک کو نہیں روح و دل کو فتح کیا تھا؟

یہی مقام محمود ہے جس کی خبر یہاں ایک دوسری آیت میں دی گئی ہے اور خبر کے ساتھ امر بھی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا[1]۔ (احزاب، ۵)

---

[1] اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر (علیہ السلام) پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے تم بھی اس پر صلوٰۃ بھیجو اور سلام، اچھا سلام۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا ایک مشہود وُہ معاملہ ہوگا، جو قیامت کے دن پیش آئے گا، جبکہ اللہ کی حمد و ثناء کا علم آپ بلند کریں گے اور بلا شبہ محمودیت کا مقام دنیا و آخرت دونوں کے لیے ہے۔ جو ہستی یہاں محمود خلائق ہے، وہاں بھی محمود و ممدوح ہو گی۔

جامعیت افضلیت رسول اکرمؐ ان آیات کریمہ[1] سے فضیلت و سیادت حضرت ختم المرسلین کا یوں اثبات ہُوا کہ امت مسلمہ کو ساری امتوں سے بہتر فرمایا اور شریعت محمدیہ کو تکمیل ادیان اور اتمام نعمت قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت مستلزم افضلیت مطاع اور نعمت کا اتمام نعم سابقہ سے اعلیٰ و اتم ہونا، حامل و مبلغ نعمت کے اعلیٰ و افضل ہونے پر دال ہے اگر آخری شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لیے ان سب سے افضل ہے، اگر آخری امت ساری پچھلی امتوں کے برکات و نعم سے مالامال اور اس لیے ان سب سے اشمل و اصلح ہے اور اگر اس طرح شریعت آخری کے ظہور و زمان و مکان و قوام و اعمال کی ساری باتیں پچھلی امتوں کی ان ساری باتوں پر فوقیت و فضیلت رکھتی ہیں تو یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ امت آخری کا رسول و مقوّم بھی سارے پچھلے رسولوں کے مراتب و مقامات کا جامع اور اس لیے ان سب سے افضل و ما فوق اور "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہو۔ کتاب و سنت کے نصوص و تصریحات اس بارے میں بے شمار ہیں۔ تلك الرسل فضلنا بعضهم علیٰ بعض کی تفسیر میں اس مطلب کو کمال شرح و بسط اور شاید ایک طرز تازہ و استدلال جدید کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اور حقیقت جامعیت رسالت محمدی و جامعیت شریعت اسلامیہ و جامعیت امت مسلمہ اور جامعیت جمیع ما یتعلق بہا پر ایک خاص اسلوب نظر سے بحث کی گئی ہے[2]۔ باقی رہا لا نفرق بين احد منهم تو وہ معاملہ دوسرا ہے "تفریق بین الرسل" کو مسئلہ تفضیل سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح "لا تفضل علی یونس بن متی وغیر ذالك" تو اس نہی کا مورد و محل بھی دوسرا ہے اور منہی عنہ معاملۂ تفضیل میں وہ تکلم یا رائے ہے منجر بہ تفریق بین الرسل جس نے تمام امم سابقہ کو گمراہ کیا، نہ کہ نفس تفضیل۔ کیونکہ "انا سید ولد آدم و لا فخر" اور "آدم ما دونہ تحت لوائی" کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ پھر قطع نظر قرآن حکیم کے، خود نصوص سنت اس بارے میں بے شمار و معلوم ہیں۔

ربّ زدنی علما آیت ۱۱۴ (طٰہٰ) میں فرمایا: جب تک سلسلہ وحی پُورا نہ ہو جائے، اس بارے میں جلدی نہ کر اور منتظر رہ کہ فیضان غیب کی بخششیں کہاں تک مالامال کرتی ہیں۔ تیری زبان حال کی صدا تو یہ

---

[1] کنتم خیر امة اخرجت للناس اور الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی الخ، فکیف اذا جئنا من کل امة بشهید وجئنا بك علیٰ هٰؤلاء شهیدا۔ [2] مطلب ہے "تفسیر البیان" میں۔

[3] فتعالی الله الملك الحق و لا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضیٰ الیك وحیه وقل رب زدنی علما۔ پس ہر طرح کی بلندی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہی جہاندار حقیقی ہے اور جب تک قرآن کی وحی تجھ پر پوری نہ ہو جائے تو اس میں جلدی نہ کر۔ تیری پکار یہی ہو کہ پروردگار میرا علم اور زیادہ کر۔

ہونی چاہیے کہ ربِّ زدنی علما! یعنی میری تشنگی کی سیرابی کے لیے علم کے یہ سارے دریا اور عرفانِ حقیقت کی یہ ساری بارشیں بھی کافی نہیں۔ اے علم کی لاانتہائی اور حقیقت کی ناپید کناری! اپنی بخششیں اور زیادہ کر۔

اس آیت نے واضح کر دیا کہ پیغمبر اسلام کے مقام علم و عرفان کی وسعت و عظمت کا کیا حال تھا؛ وہ کسی حد پر بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے کوئی زیادتی بھی زیادتی نہ تھی۔ اس کے لیے ہر اضافہ نئے استفاضہ کا اشارہ تھا۔ اس کے لیے ہر عطیہ نئے عطیہ کا تقاضا تھا۔ وہ یکسر طلب تھی۔ پیہم ربِّ زدنی کا سوال تھی۔ یہ معلوم ہے کہ یہاں مطلوب کی وسعت کے لیے کوئی انتہا نہیں ہو سکتی، لیکن یہ کیوں کر معلوم کیا جائے کہ طالب کی طلب کہاں جا کر منتہی ہوئی تھی۔[1]

کائنات انسانیت پر احسان عظیم

حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے کائنات انسانیت پر جو لاتعد و لاتحصی احسان کیے، ان کا استقصاء کون کر سکتا ہے؛ ان میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ ہر قسم کے تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر کی زنجیریں کاٹ ڈالیں اور سب کے لیے استقلال و حریت ذات درائے، شرف و احترام نفس اور مساوات صحیحہ کی بنیادیں استوار کر دیں۔

دنیا استبداد و استعباد کے عذاب الیم میں مبتلا تھی۔ غلامی کی زنجیروں نے اس کا بند بند جکڑ رکھا تھا۔ فرمانروایانِ ملک، امرائے شہر، رؤسائے قبائل اپنے اپنے حلقۂ فرمانروائی میں "ارباباً من دون اللہ" تھے اور ان کے اطاعت گزار اور پیروان کے ہاتھ بالکل مثل معدوم الارادہ آلات عمل کے تھے، جن کی زندگی کا موضوع واحد صرف اپنے مخادر قابض کی تکمیل ہوائے نفس و اتباع مرضات تھا۔

مسیحؑ سے سترہ سو برس پہلے ذات شاہی ہر تقدیس سے متصف، ہر احترام فوق العادہ سے مقدس اور ہر نقص و عیب سے مبرا تھی۔ خدا کا سایا کم از کم مرتبۂ انسانیت سے ایک بالاتر شے ضرور تھی۔

فراعنۂ مصر دیوتا تھے۔ اسی لیے مصر کے ایک فرعون نے مسیحؑ سے سترہ سو برس پہلے اپنے درباریوں سے کہا تھا:

---

[1] اقبال نے بھی اپنے انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "پیام مشرق" کے "پیشکش" میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

زندگی جہد است و استحقاق نیست　　جز بہ علم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر　　ہر کجا ایں خیر را بینی، بگیر
سیدِ کلؐ، صاحبِ ام الکتاب　　پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عین ذات را بے پردہ دید
"ربِّ زدنی" از زبان او چکید

" انا ربکم الاعلیٰ " یعنی موسیٰ کا خدا کون ہے؟ تمہارا بڑا خدا تو میں ہوں۔ کلدانیوں کے ملک میں نمرود بابل کی پرستش کے لیے ہیکل بنتے تھے۔ ہندوستان کے راجا دیوتاؤں کے اوتار بن کر زمین پر اترتے تھے۔ روما کا پوپ "خدا کے فرزند" کا جانشین اور اس کا آستانہ مقدس سجدہ گاہ ملوک و سلاطین تھا۔

روم کے قیصر اور فارس کے کسریٰ گو دیوتا نہ تھے لیکن فطرت بشریت سے منزّہ اور مرتبہ انسانیت سے بالاتر تھے، جن کے سامنے بیٹھنا ممنوع، جن کے نام لینا سوء ادب، جن کے سامنے ابتدائے کلام گناہ اور جن کے سامنے ادنیٰ سا اعتراض بھی موجبِ قتل تھا۔

دنیا اسی تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر میں اسیر تھی کہ بحر احمر کے سواحل پر ریگستانی سرزمین میں ایک "عربی بادشاہ" کا ظہور ہوا، جس نے معجزانہ زور و توانائی سے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ بابائے رومۃ الکبریٰ کے ایوان مقدس کی بنیادیں ہلا دیں۔ تعبد و غلامی کی زنجیریں اس کی شمشیر غیر آہنی کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ استقلال ذات و فکر، حریت خیال و رائے، شرف و احترام نفس، مساوات حقوق، ابطال شاہنشاہی کی روشنی دنیائے قدیم کے قلب سے نکل کر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ شاہان عالم مرتبہ قدوسیت و معصومیت سے گر کر عام سطح انسانی پر آ گئے اور عام انسان سطحِ غلامی و حیوانیت سے بلند ہو کر مصر و بابل کے دیوتاؤں اور روم و ایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے۔ (مولف)

باب ۱

دینِ رحمت اور رسولِ رحمت

(۱)

اولین تحریر

آپ نے "وما ارسلناک الا رحمۃ للعلمین" کے متعلق مولانا ابوالکلام مغفور و مغفور کی وہ تحریر ملاحظہ فرمالی، جو جنوری ۱۹۱۶ء کے "البلاغ" میں چھاپی گئی تھی اور میرے علم کی حد تک اس مسئلے کے باب میں ہمارے عہد کی پہلی تحریر تھی۔ مولاناؒ نے اس کے باقی حصے بھی چھاپنے کا وعدہ فرمایا تھا، مگر انہیں بنگال سے حکماً خارج کر دیا گیا اور وہ رانچی (بہار) چلے گئے جو کلکتہ سے نسبتہً قریب تھا تاکہ باہر رہ کر بھی جس حد تک کام سنبھالے جا سکتے ہیں، جاری رکھے جائیں۔ پھر انہیں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا اور وہ جتنے کام شروع کر چکے تھے وہ سب رک گئے۔ ساتھ ہی کلکتہ اور رانچی میں ان کی تلاشیاں ہوئیں اور وہ تمام کاغذات پولیس لے گئی جو چھپ چکے تھے یا چھپ رہے تھے یا مسودات کی شکل میں پڑے تھے۔ ان میں مولانا کی وہ علمی یادداشتیں بھی تھیں جو مدت العمر کے مطالعے میں مختلف عنوانوں کے متعلق مرتب کر لی گئی تھیں تاکہ جب کوئی کتاب یا رسالہ لکھنا منظور ہو تو صرف متعلقہ یادداشت اٹھا کر سب کچھ دیکھا اور لکھا جا سکے۔

مولاناؒ نے اس دور کے واقعات چند سال بعد قلم بند کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں یک جا نہیں ہو سکتیں۔ پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا کہ دونوں کو جمع کر لوں۔ ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا۔ دوسری طرف برقِ خرمن سوز کو دعوت دیتا رہا، آخر عرفیؔ کی زبان سے اعتراف کرنا پڑا:

زاں شکستم کہ بہ دنبالِ دلِ خویش مدام
در نشیبِ شکنِ زلفِ پریشاں رفتم

یوں اس اہم موضوع کے متعلق نہایت گراں بہا ارشادات کی ایک قیمتی متاع سے ہم محروم کر دیے گئے۔ مقدمہ تفسیر کا مسودہ اور مطبوعہ فرمے سب برباد ہو گئے۔ مولاناؒ نے جو کچھ دوبارہ لکھا، اس کا سراغ نہیں ملتا اور جب تک وہ مل نہ جائے، اس کے متعلق فکر و خیال کے گھوڑے دوڑانے سے کیا ہاتھ آئے گا؟

قاضی سلیمان اور ڈاکٹر حمید اللہ

مولانا ابوالکلام مرحوم کی محولہ بالا تحریر کے بعد قاضی محمد سلیمان مرحوم منصور پوری نے "رحمۃ للعالمین" کی دوسری جلد میں اس موضوع پر قلم اٹھایا،[1] جو

۱۔ رحمۃ للعالمین جلد دوم طبع اول ص ۲۲۹-۲۴۲۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں چھپی۔ قاضی صاحب مرحوم وسعت نظر، دردِ اسلام اور حبِ رسولؐ کے اعتبار سے الٰہی نشانیوں میں سے ایک بہت بڑی نشانی تھے، انھوں نے مستند حقایق کا ایک انبارِ عظیم لگا دیا۔ لیکن ان کا اسلوبِ تحریر مولانا ابوالکلام مرحوم کے اسلوب سے بالکل مختلف تھا۔ اس وجہ سے قاضی صاحب کی تحریر، مولانا مرحوم کی تحریر کا ضمیمہ نہ بن سکی۔ البتہ "رحمۃ للعٰلمین" کے متعلق حقایق کا ایک ذخیرہ ضرور بن گئی۔

ہمارے عہد میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے، جو مدت سے پیرس میں مقیم ہیں، سیرۃ طیبہ کے سلسلے میں بڑا قابلِ قدر کام انجام دیا، جس کی کوئی نظیر سابقہ دوروں میں نہیں ملتی۔ یعنی جن میدانوں میں حضور صلعم کو جنگیں پیش آئی تھیں ان میں سے اکثر خود دیکھے اور مشاہدات پیشِ نظر رکھتے ہوئے جنگوں کی کیفیت لکھی۔ ساتھ ساتھ نقشے چھاپے۔ بعد ازاں ان میدانوں کو دوبارہ دیکھنے کے بعد اپنے مضامین میں مناسب اضافے کیے۔ قاضی سلیمان مرحوم نے عہدِ نبوی کی جنگوں میں نقصانِ جان کی بے حقیقتی پر نظر رکھتے ہوئے تمام جنگوں کے مقتولوں، مجروحوں اور اسیروں کے اعداد جمع کیے اور انھیں "رحمۃ للعٰلمین" جلد دوم میں چھاپا۔

نیا زاویہ نگاہ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس سلسلے میں ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ اپنی کتاب "عہدِ نبویؐ کے میدانہائے جنگ" کی تمہید میں لکھتے ہیں:

> عہدِ نبوی کی جنگیں تاریخِ انسانی میں غیر معمولی طور سے ممتاز ہیں۔ اکثر دوگنی، تگنی اور بعض وقت دس گنی قوت سے مقابلہ ہوا اور قریب قریب ہمیشہ ہی فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے، چند محلوں پر مشتمل شہری مملکت سے جو آغاز ہوا وہ روزانہ دو سو چوہتر سے بھی زیادہ مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال میں جب آنحضرت صلعم کی وفات ہوئی تو دس لاکھ سے بھی زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیرِ اقتدار آچکا تھا۔ اس تقریباً ہندوستان کے برابر وسیع علاقے کی فتح میں، جس میں یقیناً ملینوں آبادی تھی۔ دشمن کے صرف ڈیڑھ سو آدمی قتل ہوئے اور مسلمان فوج کا مشکل سے اس دس سال میں ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوتا رہا۔ انسانی خون کی یہ عزت تاریخِ عالم میں بلا خوفِ تردید بے نظیر ہے[1]

اس طرح احترامِ آدمیت اور حفاظتِ نفوسِ انسانی کے ایک ایسے عملی مرقعے کو آئینہ بنا کر سامنے رکھ دیا، جس کی کوئی مثال تاریخِ عالم کے اوراق پر موجود نہیں اور جو کچھ ہے، وہ اتنا تاریک اور دہشت انگیز ہے کہ جن حوادث و وقائع پر صدیوں کے اوراق پلٹے جا چکے ہیں، ان کا ذکر بھی حزن و اندوہ کا ایک زبردست زلزلہ بن کر دلوں کو تہ و بالا

---

[1] "عہدِ نبویؐ کے میدانِ جنگ"۔ ص ۲۔ یہاں یہ عرض کر دینا چاہیے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کے پیش کردہ اعداد محلِ نظر ہیں، لیکن ان کا نقطۂ نگاہ ہر اعتبار سے درست و محکم ہے۔ اس کے لیے زیادہ تر شواہد قاضی محمد سلیمان مرحوم نے جمع کیے (رحمۃ للعٰلمین جلد دوم ص ۲۲۰۔ ۲۸۱) یہ بحث آگے آ رہی ہے۔

کر دینے کے لیے کافی ہوگا:

حدیثِ شوق میں اپنے متعلق کیا عرض کروں، نہ علم کا کوئی قابلِ ذکر سرمایہ، نہ عمل کی کوئی ایسی متاع کہ دیکھنے والے کی نظروں میں جچے اور معاملہ ایسا جس پر احساسِ ذمہ داری کے ساتھ نظر پڑتے ہی عزمیتیں اور ہمتیں اسی طرح پانی ہو کر بہ جائیں، جس طرح آفتاب کی جلوہ افروزی سے برف پانی بن کر بہ نکلتی ہے تاہم فراوانیِ شوق کا تقاضا یہی تھا کہ جو کچھ خیال میں آتا ہے، اسے ضرور قلبند کر دینا چاہیے اور بظاہر اس میں کوئی بات ایسی بھی نہ تھی جو خارج از آہنگ ہوتی۔ لیکن مولانا ابوالکلام مرحوم، قاضی محمد سلیمان مرحوم اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایسے بالغ نظر اصحاب علم و عمل کے ساتھ رکابداری کی حیثیت میں بھی چلنا بہت بڑی جسارت معلوم ہوتا رہا۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ :

عشق است و سد امید نظیریؔ گناہ نیست

تو ہم بگوی یک سخن از آرزوے خویش

جو کچھ لکھا جائے گا، وہ قابلِ توجہ ہو یا نہ ہو، لیکن یہ حدیثِ شوق کی حقیر سی پونجی ہے، جسے قرآن مجید کے لفظوں میں "بضاعت مزجات" کہتے ہوئے بھی سو مرتبہ تامل ہوتا ہے۔ صرف اس خیال سے پیش کر رہا ہوں کہ جو ارباب ہمت آیندہ ان دشوار گزار اور گام فرسا گھاٹیوں میں قدم رکھیں گے، شاید یہ کسی موقع پر ان کے لیے ایک ناچیز زادِ راہ کا کام دے سکے۔ مقصود حقیقی جذبۂ خدمتِ حق کے سوا کچھ نہیں۔ آرزو صرف یہ ہے کہ حضور صلعم کی "رحمۃ للعٰلمینی" کے محکم و استوار اور زندہ و پایندہ شواہد زیادہ سے زیادہ مقدار میں فراہم ہو جائیں اور وجودِ اقدس صلعم کی شانِ رحمت سے دنیا کو روشناس کرانے کا جذبۂ صادقہ ہمہ گیر عمومیت اختیار کر لے۔ بے شک اس کا سرانجام ہر فرد کے علم و فہم اور ہمت پر منحصر ہے۔ خود قرآن مجید کا ارشاد ہے :

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا — خدا کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

تاہم :

جز حرفِ شوق نیست سراسر بیانِ ما

چوں شمع یک سخن گزرد بر زبانِ ما

دینِ رحمت اسلام دینِ رحمت ہے۔ اس دین کی کوئی بھی شق ایسی نہیں، جو عالمِ انسانیت کے لیے بلا لحاظ نسل و خون، بلا امتیاز رنگ و نسب اور بلا قید مقام و محل یکساں پیامِ رحمت نہ ہو۔ سب سے پہلے اصولی اعتبار سے غور کیجیے۔ دنیا میں ہر نیک و بد کے لیے مہلتِ حیات اور رزقِ معیشت کا انتظام موجود ہے، البتہ اس نظام سے استفادہ ہر فرد کی ہمت، صلاحیت اور رجد وجہد پر موقوف ہے۔ کیونکہ :

زندگی جہد است و استحقاق نیست

قدرت نے گوناگوں نعمتوں کے لامتناہی خزانے جابجا مہیا کر رکھے ہیں۔ اچھے بُرے تمام انسان ان سے فائدہ اٹھانے کے مجاز ہیں۔ جزائے اعمال آخرت پر اٹھا رکھی گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام مرحوم فرماتے ہیں: یہ اسی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ یہاں رحمت کی کارفرمائی ہے:

رحمت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے فیضان و بخشش میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہو اور مہلت حیات پوری طرح سب کو ملے۔ اس نے انسانوں کی انفرادی زندگی کے دو حصے کر دیے۔ ایک حصہ دنیوی زندگی کا ہے اور سراسر مہلت ہے۔ دوسرا حصہ مرنے کے بعد کا ہے اور جزا کا معاملہ اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا (کہف: ۵۸)

تیرا پروردگار بڑا بخشش کرنے والا اور رحمت والا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو ان کے عمل کی کمائی پر پکڑتا تو فوراً عذاب نازل کر دیتا۔ لیکن ان کے لیے ایک میعاد ٹھہرا دی گئی ہے۔ جب وہ نمودار ہوگی تو اس سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ انھیں نہ مل سکے گی۔

مہلت بجائے خود رحمت ہی کی دستاویز ہے تاکہ نیک زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائیں اور برائیوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو اعمال بد سے توبہ کی مہلت حاصل رہے۔ عمل بد کا ارتکاب ہوتے ہی عذاب نازل ہو جاتا تو مہلت کہاں رہتی؟ یاد رکھیے کہ اصلاح و درستی کا طریقہ یہی ہے اور اصل نصب العین اصلاح و درستی ہی ہے نہ کہ عذاب۔ عذاب تو ان کے لیے ہو سکتا ہے جو سمجھانے بجھانے، آگاہ کرنے اور مہلت دینے کے باوجود فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے غلط مسلک پر قایم و استوار رہیں۔

جرموں اور گناہوں کی نوعیت یا کیت و کیفیت کیسی ہی ہو، جب توبہ و انابت کے احساس میں جنبش نمودار ہوتی ہے اور غفلت و بے حسی کا خواب سنگیں ٹوٹتا ہے تو رحمت قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور توبہ کرنے والے کے نامۂ اعمال کی سیاہی اس طرح دھل جاتی ہے۔ گویا اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوا تھا یہ بھی سراسر رحمت ہی کی کارفرمائی کا ثبوت ہے۔

قرآن مجید ہر بندے کو رحمت کی بشارت پہنچا رہا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی بُرے اور مکروہ کیوں نہ ہوں:

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا

اے میرے بندو! (جنھوں نے برائیوں کے ارتکاب سے)

لے ترجمان القرآن جلد اول طبع دوم ص ۹۸۔

مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (زمر : ۵۳) اپنی جانوں پر زیادتی کی۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تمھارے تمام گناہ بخش دے گا۔

اسلام کے ضوابط اسلامی ضوابط کی غرض و غایت یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی ہر قسم کے اختلال سے محفوظ رہے اور معاشرے میں فتنہ و فساد پیدا ہونے نہ پائے، جو اجتماعی زندگی کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتا ہے۔ ویسے ہر مجموعۂ ضوابط کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے دو باتیں بطور خاص پیش نظر رہنی چاہئیں:

۱۔ آیا اجتماعی زندگی کے لیے قوانین بنانے کے سلسلے میں جائز انفرادی انسانی حقوق کا پورا لحاظ رکھا گیا؟ ایسا نہ ہو تو جائز انفرادی حقوق اور اجتماعی قوانین میں تصادم کی نوبت آتی رہے گی اور ان حالات میں کوئی معاشرہ اختلالات سے زیادہ عرصے تک محفوظ نہ رہ سکے گا۔

۲۔ اجتماعی قوانین کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ افراد کے درمیان باہم محبت، رحمت اور رافت کو فروغ حاصل ہو؟ جس سے اجتماعی زندگی کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو جائیں گی۔ افراد اجتماعی نظام کے عقیل، فہیم، عاقبت اندیش اور حق شناس کارکن بنے رہیں گے، ان میں ایک دوسرے کے حقوق کی حدوں کا اندازہ کر لینے کی تمیز زیادہ قوی ہوتی جائے گی اور ایک دوسرے کا زیادہ سے زیادہ لحاظ ان کی فطرت ثانیہ بن جائے گا۔

اسلام ایسے ہی معاشرے پیدا کر دینا چاہتا تھا، اس کے مجموعۂ ضوابط (جن میں اخلاقی تلقینات بھی شامل ہیں) کا اصل مقصد یہی تھا کہ انسانوں میں ذمہ داری کے احساس کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے، جس کے بعد کسی احتسابی نظام کی ضرورت بھی محض برائے نام رہ جائے۔ ابتدائی دور کی مربیانہ سیاست میں اس مقصد کی تکمیل یقیناً بہت قریب نظر آنے لگی تھی۔ لیکن حالات نے یکایک پلٹا کھایا اور مربیانہ سیاست کی جگہ ملوکی نظام نے لے لی۔ پھر جو صورت حال پیش آئی اس کا مرقع صدیوں سے ہر حساس فرد کے لیے دل کا ناسور رہا ہے۔ سب سے بڑھ کر اندوہ و قلق کی بات یہ ہے کہ بیشتر نعرے اسلام کے لگائے جاتے ہیں اور پیش نظر وہی پیمانے ہوتے ہیں، جو دورِ ملوکیت میں فروغ پذیر ہوئے۔

باہم سلوک کی مثالیں مثالیں بے شمار ہیں لیکن میں یہاں صرف دو حدیثیں پیش کروں گا:

۱۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

تری المومنین تراحمھم و ... تو مومنوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کے

تواذهم و تعاطفهم كمثل الجسد اذا اشتكى عضوا تداعى له سائر جسده بالسهر والحمى[1]

اعضا کی طرح دیکھے گا۔ جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے پورا جسم بے خوابی اور بخار کی دعوت بن جاتا ہے۔

آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آیا آپس میں اس رحم، اس محبت اور اس مہربانی کی عملی مثالیں آپ کو کسی طرف نظر آتی ہیں؟ الا ماشاء اللہ، یا ہمارے گرد و پیش ایسا کوئی نظارہ روح و قلب کے لیے سرور شادمانی کی بشارت بن سکتا ہے؟

۲۔ حضور صلعم نے فرمایا:

والله لا يومن، والله لا يومن والله لا يومن قيل ومن يارسول الله؟ قال الذى لا يامن جاره بوائقه[2]

اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا۔ کسی نے عرض کیا، یا رسول اللہ کون؟ فرمایا جس کا ہمسایہ اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔

غور کریں کہ اگر ہر ہمسایہ حضور صلعم کے اس ارشاد پر عمل پیرا ہو جائے۔ ہر لحظہ خیال رکھے کہ اس کی کسی حرکت سے ہمسایے کو تکلیف نہ پہنچے تو پوری آبادیاں نہ محض ہر قسم کے شر سے پاک ہو جائیں بلکہ تمام باشندوں میں ایک دوسرے کے متعلق انتہائی محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو جائیں حالانکہ یہ بظاہر ایک جزوی ارشاد ہے تاہم اس کی عملی صورت پر غور کریں تو اس کی وسعت اور اثر خیز کا اندازہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

یہ اسلام تھا جو دنیا کے لیے رحمت و رافت اور برکات و سعادت کی بشارت لے کر آیا تھا۔ کیا اس سے کسی کے لیے داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی "رحمۃ للعلمین" کا اندازہ کر لینا مشکل ہے؟

اشرف المخلوق کے واجبات

انسان کو اشرف المخلوق قرار دیا جاتا ہے۔ کیا اس لیے کہ اس پر فخر و مباہات کی سرشاری میں واجبات کو نظر انداز کر دیا جائے؟ انسان نیک و بد کی تمیز سے بہرہ مند ہے۔ آگ اور پانی میں فرق کر سکتا ہے۔ پھر کیا اس سے کوئی ایسی حرکت یا کوئی ایسا عمل سرزد ہونا چاہیے، جو انسانیت کے حسن اور شرف کے منافی ہو اور جو اسے "اسفل سافلین" میں پہنچا دے؟ یعنی جس سے ہم جنسوں کے طبعی و فطری حقوق پر زد پڑے، خواہ ان کا تعلق ہم جنسوں کی جانوں سے ہو یا اموال سے یا آبروؤں سے؟ ایسا ہر فعل لازماً اجتماعی امن و راحت کے نظام میں کم یا زیادہ اختلال کا باعث ہوگا۔ یہ بھی ظاہر ہے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم [2] صحیح بخاری، کتاب الادب باب اثم من لا یامن جارہ۔

کہ ایسے اختلال انگیز افعال و حرکات سے احتراز حقیقتہً ہر فرد کے لیے ضروری ہے کیونکہ اگر زید کی کوئی حرکت کسی وقت بکر اور اس کے ساتھیوں کو نقصان پہنچائے گی تو دوسرے موقع پر بکر یا اس کے ساتھیوں کی ایسی ہی حرکت خود زید یا اس کے ساتھیوں کے لیے موجب آزار ہو گی۔

اسلام کی برتری یہ ہے کہ اس کے تمام اوامر و نواہی کی بنیاد و اساس معاشرے میں رحمت و محبت جاری و ساری رکھنے کے لیے ہے وہ چاہتا ہے رحمت و محبت کے فروغ و عمومیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ تمام افراد معاشرہ کے درمیان اخوت، خلوص، ہمدردی اور یکجہتی کے روابط زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوں۔ یہ سب رحمت ہی کی کارفرمائی کے عوامل ہیں۔ (مولف)

باب ۱۶

دین رحمت اور رسولؐ رحمت

—(۲)—

محبوب معبود غرض اسلام نے دینی عقاید و اعمال کا جو تصور قایم کیا ہے، اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت اور محبت ہی پر رکھی ہے۔ قرآن مجید کی مختلف تصریحات کے مطابق خدا اور بندوں کے درمیان بھی رشتہ محبت ہی کا ہے۔ مولانا ابوالکلام مرحوم فرماتے ہیں؛

سچی عبودیت اسی کی عبودیت جس کے لیے معبود صرف معبود ہی نہ ہو، بلکہ محبوب بھی ہو۔

اسی لیے فرمایا؛

۱- وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ (بقرہ: ۱۶۵)

اور جو لوگ ایمان والے ہیں، ان کے دلوں میں تو سب سے بڑھ کر چاہت اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔

۲- قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (آل عمران: ۳۱)

(اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے واقعی محبت رکھتے ہو تو چاہیے کہ میری پیروی کرو۔ (کیونکہ میں تمہیں اللہ سے محبت کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ وہ بڑا ہی غفور و رحیم ہے۔

حبّ رسولؐ خود رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات سے محبت بھی اسی لیے دنیا بھر کے انسانوں پر فائق و برتر ہو گئی کہ ان کے ذریعے سے ہمیں خدا کا راستہ ملا۔ حضور صلعم کا ارشاد ہے؛

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہٖ و ولدہٖ والناس اجمعین[1]

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک حقیقی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کے نزدیک باپ، بیٹے اور پورے عالم انسانیت سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔

رسول اللہ صلعم جو نور ہدایت لے کر آئے، اس کے سوا ہدایت کا کوئی وجود نہیں اور انسان کے لیے سب سے پہلی چیز ہدایت حق ہے، اس کے بعد تمام رشتے آتے ہیں اور خود رشتوں کے واجبات نیز ان کی تکمیل و سرانجام کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حب الرسول صلعم

طریقے بھی یہیں اسی نور ہدایت سے ملے جو رسول اللہ صلعم کے ذریعے سے ہماری زندگی میں مشعل راہ بنا۔

خدا سے محبت کی عملی راہ

یہ بھی بتا دیا کہ خدائے بزرگ و برتر سے محبت کی عملی راہ خدا کے بندوں کی محبت سے ہو کر گزری ہے۔ جو شخص چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے، اسے چاہیے کہ رسول اللہ صلعم کی پیروی اور حضور صلعم کے ارشادات کی روشنی میں خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔ اقبالؒ نے مندرجہ ذیل شعر میں اسلام کے اسی پاکیزہ مقصد کا نقشہ کھینچا ہے:

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

قرآن مجید اور احادیث میں خدا کے بندوں سے پیار کے لیے جو کچھ موجود ہے اس کا خاصا بڑا حصہ جا بجا پیش کیا جا چکا ہے اور اعادہ غیر ضروری ہے۔ اس دنیا میں نگرانی اور دیکھ بھال کے محتاجوں کی کوئی صنف ایسی نہیں، جس کیلیے مختلف صورتوں میں انفاق کے احکام موجود نہ ہوں۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کی اعانت، بیواؤں، مسکینوں اور اسیروں کی امداد، غلاموں کو غلامی سے چھڑانا، مسافروں کی خبرگیری، قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے سہارا دینا۔ غرض کون سی ضرورت ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا؟ واضح رہے کہ اسیروں سے مراد وہ لوگ نہیں جو جرموں کے ارتکاب کے بعد جیل خانوں میں چلے جاتے ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں پکڑے جائیں یا زمانۂ ماضی کی طرح اب کوئی ظالم شخص کسی کو گرفتار کر کے اپنا کام لینے لگے۔

جہاں صحیح اسلامی معاشرہ موجود ہو اور اس کے تمام افراد اپنے واجبات کتاب و سنت کے مطابق پورے کریں، وہاں کوئی ایسا محتاج نظر ہی نہیں آ سکتا، جسے کسی کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھنے یا ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہو۔ ارباب استطاعت کا اسلامی جذبۂ خیر نیز محتاج کی اسلامی خودداری اور عزت نفس، دونوں اپنی جگہ کارفرما ہوں گے۔ پہلے گروہ کے نزدیک انفاق اسی طرح واجب ہے، جس طرح خود اس گروہ کے لیے ذاتی ضروریات پورا کرنا واجب ہے۔ محتاج کسی سے نہیں لیتا کہ اس کا ممنون ہو۔ اللہ نے اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور وہ اپنا حصہ لیتا ہے۔ یہ اسلام تھا جو رسول اللہ صلعم دنیا بھر کے انسانوں کے لیے لائے تھے۔

حضور صلعم کے چند ارشادات

حضور صلعم کے بعض ارشادات بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ فرمایا:

۱۔ خدا کی رحمت انہی بندوں کے لیے ہے جو خدا کے بندوں کے لیے رحمت رکھتے ہیں۔

۲۔ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

۳۔ جو شخص رحم کرے گا، اگرچہ ایک چڑیا ہی کے لیے کیوں نہ ہو، خدا اس پر رحم کرے گا۔

۴۔ مَن لا یَرحَم لا یُرحَم یعنی جو شخص رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

۵۔ ایک اعرابی نے نماز پڑھتے ہوئے دعا کی کہ اے اللہ مجھ پر اور محمد صلعم پر رحم کر اور ہمارے ساتھ اور کسی پر رحم نہ کر۔ جب وہ نماز ادا کر چکا تو حضور صلعم نے فرمایا کہ تو نے بہت وسعت والے کا دروازہ تنگ کر دیا۔

اعرابی نے یہ دُعا بُری نیت سے نہیں کی تھی، اس کے تصورات ہی اس قسم کے تھے۔ حضور صلعم نے سمجھا دیا کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ تمام انسانوں کے لیے بھلائی مانگنے سے بھی اس کی رحمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

صفاتِ الٰہی کا پرتو

انسانیت کی تکمیل یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تشبہ پیدا کیا جائے یعنی اتنا تشبہ جتنا انسان کے بس میں ہو۔ ان صفات کا عکس انسان کے آئینۂ فکر و عمل میں ٹھیک ٹھیک اتارنے کے لیے کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھنا چاہیے۔ مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور فرماتے ہیں کہ قرآن مجید ہم میں خدا کی رحمت کا تصور پیدا کرنا چاہتا ہے تو صرف اس لیے کہ ہم بھی سراپا رحمت بن جائیں۔ اسی طرح قرآن خدا کی ربوبیت، رافت، شفقت اور احسان، نیز دوسری صفات کا نقشہ کھینچتا ہے تاکہ ہم میں بھی بقدر ہمت و استطاعت انہی صفات کا جلوہ نمودار ہو۔

قرآن ہمیں بار بار سناتا ہے کہ خدا کی بخشش و درگزر کی کوئی انتہا نہیں اور اس طرح ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم میں بھی اس کے بندوں کے لیے بخشش و درگزر کا غیر محدود جوش پیدا ہو جانا چاہیے۔ اگر ہم اس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں کے لیے اس کی بخشایشوں کا انتظار کریں[1]

یہ آخری فقرہ اس حدیث پر مبنی ہے کہ مَن لا یَرحَم لا یُرحَم۔

احکام و شرائع اور تلقینات

جس حد تک احکام و شرائع کا تعلق ہے، جزاءُ سیئۃٍ سیئۃٌ مثلہا (برائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی) اپنی جگہ قایم ہے کیونکہ تمام انسان حوصلے اور ہمت میں یکساں نہیں ہوتے اور نہ ہر جرم ایسا ہوتا ہے کہ بخشا جائے تو مرتکب پر یا معاشرے کے حالات پر بہرحال اچھا اثر پڑے گا۔ تاہم کتابِ الٰہی کی تلقینات ہر لحظہ پیشِ نظر رہنی چاہئیں، جو عزیمت کی متقاضی ہیں مثلاً:

۱۔ پھر جس نے درگزر کیا اور معاملے کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے (شوریٰ: ۴۰)

۲۔ اور جو کوئی برائی پر صبر کرے اور بخش دے تو یقیناً یہ اولوالعزمی کی بات ہے (شوریٰ: ۴۳)

۳۔ خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں اللہ کے لیے خرچ کرنے والے، غصے کو پی جانے والے۔

---

[1] ترجمان القرآن جلد اول طبع دوم ص ۱۰۲۔

تم جنسوں کے قصور بخش دینے والے ہو اللہ کی محبت انہی محسنین کے لیے ہے۔ (آل عمران: ۱۳۴)

۴۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی رضا و خوشنودی کے لیے (تلخی و ناخوشگواری) صابرانہ برداشت کرلی۔ نماز قایم رکھی، ہمارے دیے ہُوئے رزق میں سے پوشیدہ اور علانیہ (ہمارے بندوں کے لیے) خرچ کرتے رہے اور برائی کا جواب برائی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیا تو یقین کرو کہ یہی لوگ ہیں، جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے (رعد، ۲۲)

۵۔ اور اگر تم بدلا لو تو چاہیے کہ جتنی اور جیسی برائی تمھارے ساتھ کی گئی، ٹھیک اسی کے مطابق بدلا لو اور اگر تم برداشت کرجاؤ تو صابروں کے لیے برداشت کرلینا ہی بہتر ہے۔ (نحل، ۱۲۶)

اللہ کی بے پایاں رحمت رسول اللہ صلعم ہی کی ذات گرامی ہے جس کے ذریعے سے خدائے قدوس کی بے پایاں اور لا متناہی رحمت کی بشارت بندگانِ خدا کو ملی۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

رحمتی وسعت کل شیٔ۔ میری رحمت کا یہ حال ہے کہ ہر شے پر چھائی ہُوئی ہے۔

(اعراف، ۱۵۶)

صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک موقع پر کچھ قیدی آئے۔ ان میں سے ایک عورت کو بچّہ مل گیا جو اس کا تھا۔ دیکھتے ہی ماتا کی خاص تڑپ کے ساتھ اسے سینے سے لگا کر دُودھ پلانے لگی۔ بچّہ مل جانے کی خوشی اور دُودھ پلانے کی پُرسرور تسکین سے وہ بظاہر اس درجہ سرشار ہوگئی کہ گرد و پیش اور ماحول کا بھی کچھ خیال نہ رہا۔ رسول اللہ صلعم نے یہ کیفیت دیکھ کر فرمایا:

اترون ھٰذہٖ طارحۃً ولدھا فی النار ؟ قلنا: لا وھی تقدران لا تطرحہ۔ فقال: اللہ ارحم بعبادہٖ من ھٰذہٖ بولدھا

تمھارا کیا خیال کہ آیا یہ عورت اپنا بچّہ آگ میں ڈال دینے کے لیے تیار ہوجائے گی؟ ہم نے عرض کیا کہ جب تک اس کی طاقت وقدرت میں ہے کبھی نہ ڈالے گی۔ حضور صلعم نے فرمایا: اللہ اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ رحیم ہے جتنی یہ عورت اپنے بچّے کے لیے ہے۔

انسانوں، حیوانوں، پرندوں، چرندوں، درندوں وغیرہ میں سے کسی گروہ کو لے لیجیے، بچّے کے لیے ماں کی ماتا سے بڑھ کر پُرخلوص محبت کا نظارہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ حضور صلعم نے ماتا کا نظارہ دیکھ کر بندوں کے لیے اللہ کی رحمت کا ذکر فرمادیا اور اس محبت کا نقش لوگوں کے قلوب و ارواح پر جما دینے کی صورت اس کے سوا کیا تھی کہ دنیا کی بہترین محبت سے بطور مثال کام لیا جائے۔ حقیقۃً بندوں سے اللہ کی محبت کا صحیح اندازہ پیش کرنے کی دل نشیں تر صورت کون سی ہے؟

بیاتِ مسائل

اگر آپ بعض امور کے متعلق حضور کے ارشادات کی جزئیات سامنے رکھ لیں تو یقین ہے کہ سراپا حیرت زدہ رہ جائیں گے کیونکہ آج تک کائنات انسانیت کا کوئی بڑے سے بڑا عالم، فلسفی یا کوئی اور شخص ایسا استقصا نہیں کرسکا۔ تاہم وہ بیان کر دی جائیں تو آپ کے قلب و رُوح سے بے اختیار صدا بلند ہوگی، بلاشبہ ان میں سے ہر جزئیہ حق ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ پڑوسیوں کے حقوق کی نشان دہی فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

۱۔ اگر پڑوسی بیمار ہو تو اس کی عیادت اور خبر گیری کی جائے۔

۲۔ اگر وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کا ساتھ دو یعنی تدفین میں ہاتھ بٹاؤ۔

۳۔ اگر وہ ضرورت مند ہو اور تم سے استمداد کرے تو اسے قرض دو۔

۴۔ اگر وہ کوئی برا کام کر بیٹھے تو اس کی پردہ پوشی کرو۔

۵۔ اگر اسے کوئی نعمت یا مال ملے تو مبارک باد دو (جس سے دلی مسرت کا اظہار مقصود ہوتا ہے)

۶۔ اگر اس پر کوئی مصیبت آ پڑے تو اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرو۔

۷۔ اپنے گھر کی عمارت اس طرح بلند نہ کرو کہ پڑوسی کے گھر کی ہوا رک جائے۔

۸۔ جب تمھارے گھر میں کوئی اچھا کھانا پکے تو کوشش کرو کہ تمھاری ہنڈیا کی مہک پڑوسی (اور اس کے بال بچوں تک) نہ پہنچے۔ یہ ان کے لیے باعث ایذا ہوگی یا اپنے اوپر لازم کرلو کہ اس کھانے کا کچھ حصّہ پڑوسی کے گھر بھی بھیجو گے۔

پھر پڑوسیوں کی قسمیں بتائیں یعنی:

۱۔ غیر مسلم جس کے ساتھ رشتہ داری بھی نہیں نچلے درجے کا پڑوسی ہے یعنی اس کے بھی حقوق ہیں، مگر دوسروں سے کم۔

۲۔ مسلم پڑوسی جس کے ساتھ رشتہ داری نہ ہو، اس کا درجہ پہلے کے مقابلے میں بلند تر ہے۔

۳۔ رشتہ دار مسلم پڑوسی یعنی پڑوسی بھی، مسلم بھی اور رشتہ دار بھی۔ یہ سب سے اونچے درجے پر فائز ہے۔

آپ کو ان جزئیات کی کوئی مثال کسی دوسری جگہ مل سکے تو مہربانی فرما کر پیش کر دیجیے اور یہ صرف ایک مسئلے کے متعلق ہے۔ ہر مسئلے میں آپ کو ایسی ہی جزئیات ملیں گی جو سامنے آجائیں تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی واقعی جزئیات ہیں، ورنہ کسی کی نظر ان گہرائیوں پر جا ہی نہیں سکتی۔

بنیادی امر

یہ پاک دین تھا، جس کی دعوت کے لیے رسول اکرم صلعم مبعوث ہوئے۔ اسلام کا خدا رؤف ورحیم، اسلام کا رسولؐ رؤف ورحیم۔ اسلام کے پیروؤں کو زیادہ سے زیادہ رحمت ومحبت، شفقت اور عفو ودرگزر کی تعلیم دی گئی تھی۔ عالم انسانیت کی اصلاح ودرستی کا کار اہم اسی طرح بوجہ احسن پُورا ہوسکتا تھا۔ بلاشبہ بدلے کی گنجایش رکھی گئی، کیونکہ تمام انسان عزم الامور کی ترازو میں پُورے نہیں اُتر سکتے، لیکن ترجیح عزم الامور

ہی کو حاصل ہے اور مقاصد اصلاح و درستی کو جلد سے جلد پایۂ تکمیل پر پہنچانا بھی عزم الامور ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔

اصلاح کے سلسلے میں بنیادی امر یہ ہے کہ جن کی اصلاح مقصود ہو، انھیں سب سے پہلے یہ یقین ہو جائے کہ ان کے ساتھ داعی اصلاح کو دلی ہمدردی ہے۔ یہ یقین داعی کے بلند طرزِ عمل ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے دائرۂ اصلاح پھیلتا جائے گا فتنہ و فساد کا ازالہ ہوتا جائے گا۔ نئے نئے داعی بروئے کار آئیں گے۔ اس طرح رحمت خداوندی سے کیا بعید ہے کہ کروڑوں انسان تھوڑے ہی عرصے میں راہِ حق پر لگ جائیں۔ "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا ایک منظر وہ تھا جس نے رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات کے مبعوث ہونے کی ضرورت پوری کر دی۔ "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا آخری منظر ابھی باقی ہے۔ جب شش جہت سے اعتراف رحمۃ للعالمین کی صدائے حق بلند ہوگی اور کائنات انسانیت کے لبوں پر اللھم صل علیٰ سیدنا و مولانا محمدٍ و آلہٖ وسلّم کا ترانہ ہوگا۔

عظیم ترین محسن انسانیت

آپ نے کبھی سوچا کہ خونی رشتے سے بڑھ کر سچی، پُرخلوص اور مستحکم محبت پیدا کرنے کے موثر ترین وسائل کیا ہیں؛ حضور صلعم کے بعض ارشادات پر ایک سرسری نظر ڈال لیجیے، آپ کو یقین ہو جائے گا کہ انسانیت پر اس بنیادی اور دوامی احسان کے لیے جو طریقے حضور صلعم نے اختیار فرمائے۔ ان سے بہتر اور حصول مقصد کے لیے موثر تر ذریعے کوئی نہیں ہو سکتے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے حضور صلعم نے فرمایا:

بدگمانی سے دور رہو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو۔ عیب جوئی نہ کرو۔ باہم بغض نہ رکھو اور بھائی بھائی ہو جاؤ۔[1]

حضرت انسؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے:

آپس میں بغض نہ رکھو، باہم حسد نہ کرو۔ آپس کے تعلقات نہ توڑو اور خدا کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین روز سے زیادہ قطع تعلق رکھے۔[2]

حضرت جابرؓ کا بیان ہے:

رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے، جب تم میں سے کسی کے ہاں سالن پکے تو اسے چاہیے کہ شوربا زیادہ کر لے۔ پھر اس میں سے کچھ پڑوسی کو بھی بھیج دے۔[3]

حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح باب لا یخطب علیٰ خطبۃ اخیہ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب باب ما ینھیٰ عن التحاسد۔ [3] رواہ الطبرانی فی الاوسط

وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا (یعنی میری جماعت میں سے نہیں) جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر مزے سے سو جائے جب اس کے پہلو میں رہنے والا پڑوسی بھوکا ہو اور پیٹ بھر کر سو جانے والے کو علم ہو کر پڑوسی بھوکا ہے[1]

آج رسول اللہ صلعم پر ایمان لانے کے کتنے مدعی ہیں جو حقیقی ایمان کی اس میزان میں پورے اتر سکتے ہیں؟ جو لوگ محض اتفاقات کی بنا پر کچھ عرصے کے لیے امر و حکم میں شریک ہو جاتے ہیں، وہ اپنے عالی شان ایوانوں میں اس طرح پیٹ بھر کر سوتے ہیں کہ لاکھوں بھوکوں اور محتاجوں کا احساس تک انھیں نہیں رہتا۔ احساس ہو تو تڑپ کر باہر نکل آئیں؛ احساس ذمہ داری ان بزرگوں کو تھا جو راتوں کو جگہ جگہ خفیہ خفیہ دورے کر کے اندازہ کیا کرتے تھے کہ کوئی ستم زدہ ان کے دائرۂ علم سے باہر تو نہیں رہ گیا؛ پھر دیکھیے ارشاد کا مدعا جہاں یہ ہے کہ مختلف انسانی حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں یہ بھی ہے کہ ان میں وہ محبت، وہ رحمت اور وہ شفقت بروے کار آ جائے، جو خونی رشتوں میں بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ اگر انسانیت کا کوئی محسن اس عظمت و شان کا ہے تو اس کا نشان بتایئے۔ یہ منصب ازل سے رحمۃ للعالمین صلعم کے لیے خاص ہو گیا۔ (مولف)

---

[1] رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

باب ۱۰۴

رحمت و شفقت کا ابر گہربار

آدمیت احترام آدمی

—(۱)—

ہدایت کے لیے لا تلنا ہی تڑپ رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک میں مخلوق کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کا جو سمندر موجزن تھا، اس کا ذکر کتاب میں پے در پے آتا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ مثالیں پیش ہوتی رہی ہیں۔ باقی رہی شفقت و رحمت کی مفصل کیفیت۔ تو اگر میں بیان کرنا بھی چاہوں تو الفاظ اور بیان مطالب کی صلاحیت کہاں سے لاؤں؟ وہی ایرانی شاعر کا معاملہ ہے:

کتاب فضل ترا آب بحر کافی نیست
کہ تر کنم سر انگشت و صفحہ بشمارم

ہمارے لیے کلام الٰہی سے بڑھ کر قاطع، فیصلہ کن اور دل پذیر شہادت کوئی نہیں ہو سکتی۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔ (کہف، ۶)

(اے پیغمبر تری حالت تو یہ ہو رہی ہے کہ) اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائیں تو عجب نہیں تو ان کے پیچھے افسوس کے مارے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے۔

کیا خلق خدا کی دنیوی اور اخروی بہبود کے لیے انتہائی محبت و شیفتگی کی کوئی روشن تر شہادت بھی ہو سکتی ہے جس کا دائمی ذکر اس کتاب مقدس میں محفوظ ہو گیا۔ جو ذکرٌ للعلمین ہے؟ یہ غمگینی اور اندوہناکی رُو سے زمین کے تمام انسانوں اور پوری نوع بشر کے لیے تھی، خواہ ان کا تعلق کسی نسل، کسی خطے اور کسی قوم سے تھا۔ مولانا ابوالکلام مرحوم فرماتے ہیں:

انبیائے کرام ہدایت اصلاح کے طالب ہی نہیں، عاشق ہوتے ہیں۔ انسانوں کی گمراہی ان کے دلوں کا ناسور ہوتی ہے اور ہدایت کا جوش ان کے دل کے ایک ایک ریشے کا عشق۔ اس سے بڑھ کر ان کیلیے کوئی غمگینی نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان سچائی سے منہ موڑ لے اور اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی شادمانی نہیں ہو سکتی کہ ایک گمراہ قدم راہ راست پر آجائے۔ قرآن میں اس صورت حال کی شہادتیں جابجا ملتی ہیں۔[۱]

---

[۱] ترجمان القرآن جلد دوم طبع اول ص ۳۷۶۔

طرزِ طلب، حقائق

آپ نے اس صورت حال کے اسباب پر بھی کبھی غور فرمایا؛ یہ خیال کر لینا تو انتہا درجے کی سخافت وکم عقلی کا ثبوت ہوگا کہ داعی حق ایک انسان نما مشین ہوتا ہے جو اوپر سے نازل شدہ ہدایات کو خلق خدا کے سامنے دہراتا رہتا ہے۔ حاشا وکلا۔

۱۔ مشیت ایزدی جن مقدس ہستیوں کو دعوت حق کے لیے چنتی رہی ان کی فطرتیں ہم جنسوں کی اصلاح و فلاح اور سُود و بہبود کے غم میں سراپا سوز و درد ہوتی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی داعی حق روزگار کی حد درجہ حوصلہ فرسا مشکلات کے باوجود اپنے وطیفے کی بجاآوری پر چٹان کی طرح جما کیونکر رہ سکتا تھا؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ صلعم انتہائی ناسازگار حالات میں یہ کیوں فرماتے کہ خدا کی قسم، اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سُورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند لاکر رکھ دیں، تب بھی میں اپنے فریضۂ دعوت سے باز نہ آؤں گا، یہاں تک خدا اس کام کو پُورا کر دے یا خود میں اس پر نثار ہو جاؤں؛

۲۔ قرآن مجید اس حقیقت کی پے در پے گواہی دے رہا ہے کہ ہر داعی حق نے آغاز دعوت کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا، میں اس کام کے لیے کسی سے اجر کا طلبگار نہیں۔ میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے۔ اگر ہر داعی حق کے قلب مقدس میں ہم جنسوں کو راہ راست پر لانے کے لیے انتہائی تڑپ نہ ہوتی تو ہر قسم کی ذاتی اغراض سے کامل برأت کا دعویٰ کیوں بار بار زبان پر لایا جاتا؛

۳۔ پھر ہر داعی حق پر ایک ایک فعل اور ایک ایک حرکت کے نتائج وعواقب برای العین آشکارا ہوتے ہیں۔ انجام بد کا تصور ایک شے ہے۔ انجام بد کی تلخیوں اور ناخوشگواریوں کا مشاہدہ بالکل دوسری شے ہے۔

۴۔ اگر کسی کا قدم گمراہی میں بڑھتا جائے تو عام لوگ سمجھیں گے کہ وہ ازروئے شریعت عذاب کا سزاوار ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بخش دے تو دوسری بات ہے، لیکن داعی حق پر معاملہ جزا اسی طرح عیاں ہوتا ہے جس طرح سلیم البصارت آدمی کو دن کے وقت آفتاب نظر آتا ہے۔ پھر ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کی بنا پر سب کو تعزیر و عقوبت کی حوصلہ فرسائیوں اور شکیب گدازیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے داعی حق جس غمگینی و اندوہناکی اور جس اضطراب و بےتابی کا تختۂ مشق بنتا ہوگا، اس کی شدّت اور وسعت حدود ہمارے محدود اور آلودۂ اغراض ذہنوں میں کیوں کر سما سکتی ہے؟ رسول اللہ نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ میں تمھیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں مگر تم آگ میں گرے پڑتے ہو۔

۵۔ رسول اللہ صلعم تمام مکارم و فضائل نبوت کے جامع تھے، کیونکہ آپ پورے عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اس لیے تمام خصوصیات میں بھی سب سے افضل تھے۔

سورۂ کہف کی محولہ بالا آیت کے دو پہلو ہیں اور دونوں بہ ہر حال ہر اس فرد کے پیشِ نظر ہونے چاہئیں جو رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات سے انتساب کا مدعی ہو:

ا: یہ آیت رسول اللہ صلعم کے جوشِ دعوت و اصلاح اور نوعِ بشر کے لیے بے پایاں شفقت کا صحیح نقشہ پیش کر رہی ہے۔

ب۔ ہر مدعی اسلام کا فرض ہے کہ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ" کی پیروی میں حضور صلعم کی ان خصوصیتوں (جوشِ دعوت و اصلاح اور بے پایاں شفقت و رحمت) کا بھی بہتر سے بہتر عملی پیکر بنے۔

واقعۂ طائف حضور صلعم کے سفرِ طائف کا ذکر کرتے ہوئے عرض کیا جا چکا ہے کہ دعوتِ حق کی جو سرگزشت دنیا کے مذہبی دفتروں اور سفینوں میں محفوظ ہے، اس میں سے کوئی ایسا واقعہ دکھایا نہیں جا سکتا جو طائف میں حضور صلعم کی دعوتِ حق کا مثیل بن سکے۔ دیکھیے؛

۱۔ سفرِ طائف کا مقصد اس کے سوا کیا تھا کہ اہلِ طائف ہدایت کی راہ پر لگ جائیں؟ اس میں انھی لوگوں کی بھلائی اور بہتری تھی، دنیوی بھی اور اخروی بھی۔ حضور صلعم نے صرف فریضۂ تبلیغ ادا کرنے میں ہر زحمت گوارا فرمائی تھی۔

۲۔ طائف کے گمراہ اور حق ناشناس رئیسوں نے حضور صلعم سے جو سلوک روا رکھا وہ ہر زاویۂ نگاہ سے ظلم و تعدی کا ایک نہایت افسوسناک مظاہرہ تھا۔ عرب کے دورِ جاہلیت میں ایسے مظاہروں کی کہیں بھی کمی نہ تھی۔

۳۔ ان رئیسوں کی انگیخت پر اوباشوں نے رسول اللہ صلعم کو سنگ باری کا ہدف بنایا، یہاں تک کہ پیشانی مبارک کا خون بہہ کر پائے مبارک تک پہنچ گیا اور آپ نے ایک باغ میں پناہ لی۔

۴۔ اس دردناک حالت میں بھی آپ کے قدوسی تحمل پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس موقع پر بارگاہ باری تعالیٰ میں جو دعا کی، وہ اپنے محل پر منقول ہے، اس میں سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا جس سے تلخی و ناخوشگواری کی بو سونگھی جا سکے۔ اللہ کی لگن کے سوا حضور صلعم کے قلبِ صافی میں اور کسی چیز کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔

۵۔ پھر یہ بھی فرمایا: میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے کیوں دعا مانگوں؟ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو کیا ہوا، ان کی آیندہ نسلیں ضرور ایک خدا پر ایمان لائیں گی۔

کیا اپنے پیغام کی صداقت پر بے پایاں یقین اور ہم جنسوں کے لیے بے پایاں رحمت کی ایسی کوئی مثال —

مل سکتی ہے؟ کیا ہدایت کی لاتناہی امید کا کوئی ایسا نقشہ آپ کو کسی دوسری جگہ نظر آسکتا ہے؟

تاریخ گواہ ہے کہ آیندہ نسلیں نہیں، خود وہ نسل بھی حضور صلعم کے دست مبارک پر ایمان لائی، جس کے ہاتھ چند سال پیشتر حضور صلعم کو سنگ باری کا نشانہ بنا چکے تھے۔ یقین رکھیے واقعۂ طائف اپنی معنوی بے مثالی ہی کی بنا پر سیرۂ طیبہ کا ایک اہم موڑ بن گیا، جہاں سے ہجرت کے مقدمات شروع ہو گئے اور دین حق کی دعوت اس منزل کے دروازے پر پہنچ گئی، جس میں "یدخلون فی دین اللہ افواجًا" کا نظارہ مہر و ماہ کی آنکھوں کے لیے جشن عید بننے والا تھا۔

عہد نبوی کی جنگیں

ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کی ایک روشن دستاویز عہد نبوی کی جنگیں بھی ہیں، جن کی حقیقی حیثیت اور معنوی خصوصیت پر اب تک بہت کم توجہ فرمائی گئی ہے۔

رسول اللہ صلعم کسی بھی دور میں جنگ کے خواہاں نہ تھے جو دین عالم انسانیت کے لیے صلح و امن، محبت و اخوت اور فلاح و بہبود کا پیغام تھا، اس میں رزم و پیکار کے لیے کون سی گنجایش ہو سکتی تھی؛ لیکن قریش مکہ کے غرور و تکبر اور ظلم و جور نے شریعت و حق پرست انسان کے لیے جینا دوبھر کر دیا حالانکہ ان کی نکوکاری، حق پرستی اور شرافت کسی کے لیے بھی باعث تکلیف نہیں ہو سکتی تھی۔ مجبور ہو کر پہلے ایک جماعت کو حبش جانے کی اجازت دے دی گئی۔ قریش مکہ نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا انتظام ہُوا۔ رسول اللہ صلعم اور صحابۂ کرام پشتوں کے گھر بار چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے لیکن یہ بُعد مکانی بھی قریش کی آتش اشتعال روک نہ سکا بلکہ ان کی پیش دستیوں اور آزار رسانیوں کا سلسلہ تیز تر ہو گیا۔ ان حالات میں حفظ و دفاع اور پیش بندیوں کے سوا چارہ نہ رہا اور حفظ و دفاع اس دنیا میں ہر فرد و جماعت کا اوّلین فطری حق ہے، جس پر امن عالم کا انحصار ہے۔

غزوات و سرایا

رسول اللہ صلعم کو جن مہموں سے سابقہ پڑا انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن مہموں کی قیادت حضور صلعم نے بہ نفس نفیس فرمائی انھیں غزوات کہتے ہیں، جن مہموں کی سرعسکری پر دوسرے اصحاب مامور ہُوئے انھیں سرایا (جمع سریہ) کہا جاتا ہے۔

قاضی محمد سلیمان مرحوم منصورپوری نے "رحمۃ للعالمین" کی دوسری جلد میں بیاسی غزوات و سرایا کا ذکر نام بنام کیا ہے اور ان کی تفصیلات بتائی ہیں[1] بعض کتابوں میں اس سے بہت کم تعداد کا ذکر ہُوا ہے لیکن اصل سوال تعداد کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے۔ ان سب کو عمومًا غزوات یا سرایا ہی قرار دے لیا گیا ہے حالانکہ ان میں سے اکثر ایسی تھیں، جنھیں کسی بھی زاویۂ نگاہ سے جنگیں سمجھنا یا جنگیں قرار دینا صحیح نہ ہوگا مثلاً ابن حزم نے حدیبیہ کو بھی غزوہ قرار

---

[1] "رحمۃ للعالمین" جلد دوم (ص ۲۴۴ - ۲۶۴)

دیا ہے حالانکہ نہ رسول اللہ صلعم جنگ کے ارادے سے نکلے تھے، نہ جنگ کی نوبت آئی۔ آپ صرف عمرہ ادا کرنا چاہتے تھے جس کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے اور حضور صلعم کا یہ سفر ذی قعدہ میں ہوا تھا، جو اشہر الحرم میں سے تھا، یعنی جس میں کشمکش یا روک تھام قریش کے لیے جائز ہی نہ تھی۔ قاضی سلیمان مرحوم نے انھیں مہمیں بھی نہیں کہا بلکہ محض "نقل و حرکت" قرار دیا ہے اور یہ تعبیر ان میں سے اکثر کی حقیقی کیفیت کی صحیح آئینہ دار ہے۔

مہموں کی نوعیت قاضی سلیمان مرحوم کی بیان کردہ بیاسی مہموں میں سے بیشتر کی کیفیت خلاصتہً ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱۔ ان میں سے بعض کو جنگیں قرار دینا واقعتہً غلط ہے مثلاً رجیع اور بئر معونہ کی طرف جو لوگ بھیجے گئے وہ نہ فوجی دستے تھے۔ نہ اس غرض سے بھیجے گئے تھے کہ لڑیں۔ وہ محض مبلغ اور مقری تھے۔ اس وجہ سے بھیجے گئے تھے کہ لوگوں نے قرآن اور اسلام سیکھنے کی غرض سے ان کے ارسال پر اصرار کیا تھا۔ بئر معونہ بھیجے جانے والے لوگوں کے لیے ایک رئیس قبیلہ نے ذاتی ضمانت بھی قبول کر لی تھی۔ یہ کل اسّی افراد تھے ستر بئر معونہ اور دس رجیع بھیجے گئے۔ ان دونوں جماعتوں کو اچانک غداری سے سابقہ پڑا۔ اسّی میں سے صرف ایک محفوظ رہا۔ باقی سب نے شہادت پائی، ان کا نقصان بھی جنگی نقصانات میں محسوب نہیں ہو سکتا۔

۲۔ پھر ان میں سے خاصی مہمیں ایسی تھیں جن میں بہت کم آدمی بھیجے گئے۔ اتنے کم کہ انھیں جنگوں میں شامل کرنا مضحکہ خیز ہوگا۔ مثلاً:

آدمی	مہمیں
ایک ایک	۵
پانچ پانچ	۲
دس دس	۲
بارہ بارہ	۲
پندرہ پندرہ	۳
بیس بیس	۴
پچیس پچیس	۲
تیس تیس	۵
چالیس چالیس	۲

گویا ستائیس مہموں میں اتنے تھوڑے آدمی بھیجے گئے کہ انھیں جنگیں کہا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ دراصل طلایہ گرد دستے تھے، جو اس وجہ سے وقتاً فوقتاً اطراف میں بھیجے گئے کہ دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق معلومات حاصل کریں تاکہ اس کے مفسدانہ منصوبوں سے آگاہ ہو کر مناسب دفاعی تدبیریں عمل میں لائی جا سکیں یا کہیں کوئی فتنہ انگیز فرد قتل و غارت کے عادی قبیلوں کو برانگیختہ کر کے مدینہ منورہ پر چھاپا مارنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ایک جانباز گیا اور اس فتنہ انگیز کو "الفتنۃ اشد من القتل" کے اصول پر ختم کر کے چلا آیا، اور وہاں لوگ امن چین سے بیٹھ گئے۔

۳۔ حدیبیہ کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ وہ جنگ تھی ہی نہیں۔ اس کا مقصد ادائے عمرہ تھا۔ آخر قریش سے دس سال کے لیے صلح ہو گئی نیز قرار پایا کہ مسلمان آئندہ سال آ کر عمرہ ادا کر لیں۔ قریش تین روز کے لیے شہر مکہ سے نکل کر آس پاس کے پہاڑوں میں جا بیٹھیں گے۔

۴۔ بعض مہمیں اس وجہ سے تیار ہوئیں کہ دشمن کے چھاپا مار دستے اچانک حملہ کر کے چند امن پسند شہریوں کو خاک و خون میں تڑپا چکے تھے۔ ان کا تعاقب کیا گیا۔ ایسی مہمیں بھی عرفاً جنگ نہیں سمجھی جا سکتیں۔

۵۔ بعض مہمیں اطراف مدینہ کے قبیلوں کے پاس گئیں اور ان سے معاہدہ ہائے صلح و امن کر لیے۔ ان معاہدوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ دشمن کی فتنہ انگیزی کا دائرہ محدود کر دیا جائے اور قبیلوں کو دشمن کی عیاریوں کا تختۂ مشق نہ بننے دیا جائے۔

۶۔ ایک مثال ایسی بھی ہے کہ کچھ لوگ باہر سے آئے جو بیمار تھے انھیں رحم کھا کر مدینہ کی چراگاہ میں ٹھہرا دیا گیا تاکہ کھلی آب و ہوا میں رہیں اور اونٹنیوں کا دودھ پئیں۔ وہ تندرست ہو گئے لیکن دور جاہلیت کے احسان ناشناسوں کی طرح انھوں نے چراگاہ کے رکھوالے کو شہید کر ڈالا اور اونٹ ہنکا لے گئے۔ تعاقب کر کے انھیں پکڑا گیا اور مناسب سزا دی گئی۔ اسے کون جنگ کہنا پسند کرے گا؟

۷۔ ایک مرتبہ بعض قبائلیوں نے اچانک چراگاہ پر حملہ کر دیا تھا اور کچھ اونٹ ہنکا لے گئے تھے۔ ان کا بھی تعاقب کیا گیا اور اونٹ واپس لے لیے گئے۔ یہ بھی جنگ نہ تھی۔

جانی نقصان

سیرت نگاروں نے ان تمام مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دے لیا اور اس طرح تعداد خاصی بڑھ گئی حالانکہ ان میں سے ایک بھی مہم ایسی نہ تھی جسے جنگ کہا جا سکے۔ بلاشبہ بعض مہمیں ایسی ہیں کہ اطلاع ملی، فلاں مقام پر لوگ اس غرض سے جمع ہو رہے ہیں کہ مدینہ منورہ پر حملہ کر کے اول لوٹ مار کا شوق پورا کریں، دوم قریش مکہ کی نظروں میں اعتبار پائیں، جو ہر اس گروہ کو سر پر بٹھانے کے لیے تیار رہتے تھے جس کے ذریعے مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ ایسے بعض گروہوں کے خلاف اچانک اقدام کر کے انھیں منتشر کر دیا گیا۔ ایسی مہموں میں مسلمانوں کو بھی جانی نقصان پہنچا اور غیر مسلموں کے آدمی بھی قتل ہوئے۔

غرض ہیں نے قاضی سلیمان مرحوم کی درج کی ہوئی فہرست ہیں سے کم و بیش ستر مہیں الگ کر لیں، جنھیں کسی بھی اعتبار سے جنگ نہیں کہا جا سکتا اور ان کے جانی نقصان کے اعداد بھی قاضی صاحب مرحوم ہی کی فہرست کے مطابق جمع کیے تو نتیجہ یہ نکلا:

فریق	نقصانِ جان
مسلمان	۹۶
مخالفین	۱۸۰

بعض مہموں میں مخالفین کے مقتولوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی اور قاضی صاحب مرحوم بھی ان اعداد کا کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ وہ اعداد قیاساً شامل کر لینے چاہئیں تاہم وہ پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوں گے۔ ان اعداد میں بنوقریظہ کے ان افراد کا جانی نقصان شامل نہیں، جنھیں سعدؓ بن معاذ کے فیصلۂ ثالثی کی بنا پر موت کی سزا دی گئی تھی۔ یہ سزا موسوی شریعت کے عین مطابق تھی اور سعدؓ کو بنوقریظہ نے خود ثالث بنایا تھا۔ ان مقتولین میں ایک عورت بھی تھی جسے اس لیے سزائے موت ملی کہ اس نے قلعے کی چھت پر سے ایک مسلمان پر چکی کا پاٹ گرا کر شہید کر دیا تھا، حالانکہ وہ دیوار کے سایے صرف سستانے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔ یہ لوگ میدانِ جنگ کے مقتولین نہ تھے۔ اسی طرح رجیع اور بئر معونہ کے مسلمان شہدا بھی مسلمانوں کے جانی نقصان میں شامل نہیں۔

باقاعدہ جنگیں جن مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دیا جا سکتا ہے، وہ بھی مسلمانوں کو بالکل ناخواستہ پیش آ گئی تھیں اور ان میں بھی پیش دستی مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ مثلاً:

۱۔ غزوۂ بدر یوں پیش آ گیا: رسول اللہ صلعم یہ اطلاع پا کر مدینہ منورہ سے نکلے کہ قریش کا وہ قافلۂ تجارت شام سے لوٹ رہا ہے، جس کا پورا نفع مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری میں صرف ہونے والا تھا، اس قافلے کو روکنا ضروری تھا۔ لیکن سالارِ قافلہ مختلف اطلاعات کی بنا پر پہلے ہی عام راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے نکل گیا جو دس بارہ میل مغربی جانب تھا۔ اسی اثنا میں یہ اطلاع مل گئی تھی کہ قریش ایک ہزار کے قریب سواروں اور پیادوں کے ساتھ بدر پہنچ گئے ہیں، نیز ان کا ارادہ وہاں ٹھہرنے اور جشن منانے کا ہے۔ مسلمانوں کے لیے لڑنا اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ اگر طرح دے جاتے تو اول قریش ان قبیلوں پر دباؤ ڈالتے، جن سے مسلمانوں کے معاہدے ہو چکے تھے اور ان قبیلوں کے لیے دوبارہ مسلمانوں سے معاہدہ کرنے کی کیا صورت رہتی؟ دوم قریش مدینہ منورہ پر چڑھائی کر دیتے تو نتائج مسلمانوں کے لیے بدرجہا زیادہ خطرناک ہوتے، جتنے بدر میں لڑنے سے ہو سکتے تھے۔ لہٰذا بدر کو مشیتِ ایزدی نے حق و باطل کی جنگ کا پہلا میدان بنا دیا۔

۲۔ غزوۂ احد اس لیے پیش آیا کہ قریش مکہ نے بدر کے انتقام میں مدینہ منورہ پر حملہ کیا تھا۔ قریش مکہ کی فوج کم از کم تین ہزار تھی۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات سو تھے۔ تیراندازوں کے ایک گروہ کی غلطی کے باعث مسلمانوں کا سخت نقصان ہُوا تاہم میدان انہی کے ہاتھ رہا۔

۳۔ غزوۂ احزاب بھی قریش مکہ اور یہود خیبر کی مشترکہ سازش کا نتیجہ تھا، جس میں قریش و یہود مختلف قبائل کو گوناگوں لالچ دے کر ساتھ لے آئے اور کم از کم دس ہزار افراد نے مدینہ منورہ پر ہجوم کیا اور دفاع کے لیے ایک طویل خندق کھودی گئی۔

۴۔ غزوۂ خیبر اس وجہ سے پیش آیا کہ یہود خیبر نے احزاب میں ناکامی کے بعد غطفان اور دوسرے قبائل کو مدینہ منورہ پر حملے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ اقدام کر کے فتنے کی یہ آگ ہمیشہ کے لیے بجھا دی جائے۔

۵۔ موتہ کی مہم اس سبب سے پیش آئی کہ موتہ کے مسیحی حاکم شُرحبیل نے رسول اللہ صلعم کے سفیر کو ناحق قتل کرا دیا تھا۔ سفیر کا قتل اس دور میں بھی ایک قبیح بین الاقوامی جرم تھا۔ تین ہزار مجاہدین اس خون ناحق کا انتقام لینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے کم از کم ایک لاکھ فوج غنیم کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

۶۔ مکہ مکرمہ پر یورش اس وجہ سے ناگزیر ہو گئی کہ قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کے باوجود اپنے ایک حلیف قبیلے کو شہ اور مدد دے کر مسلمانوں کے حلیف قبیلے پر حملہ کرایا۔ رسول اللہ صلعم نے تلافی مافات کی دو صورتیں پیش کر دیں۔ یعنی یا تو ان لوگوں کا خون بہا دیا جائے جو حملے کے باعث ناحق مارے گئے۔ یا قریش اپنے حلیف قبیلے کی پاسداری سے خود ہاتھ اٹھا لیں۔ مسلمان بطور خود مناسب فیصلہ کر لیں گے۔ قریش نے دونوں میں سے کسی بھی صورت پر عمل نہ کیا اور مکہ مکرمہ پر پیش قدمی کے سوا چارہ نہ رہا۔

۷۔ غزوۂ حنین اس وجہ سے پیش آیا کہ فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن اور بنو ثقیف مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے اور اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ حدودِ حرم میدان جنگ بنیں گے۔ محاصرۂ طائف غزوۂ حنین ہی کا شاخسانہ تھا۔

۸۔ تبوک کا سفر اس لیے اختیار کیا گیا کہ قیصر کی طرف سے عرب پر حملے کی تیاریوں کے متعلق متواتر خبریں موصول ہُوئی تھیں۔ رسول اللہ صلعم تیس ہزار جانبازوں کی معیت میں کٹھن منزلیں طے کر کے عرب کی شمالی سرحد پر پہنچ گئے تاکہ لڑائی غنیم کے علاقے میں ہو۔ بیس روز قیام فرمایا۔ [illegible] آئی اور

حضور صلعم مختلف گروہوں کو امان نامے دے کر لوٹ آئے۔

باقاعدہ جنگوں کے نقصانات

ان باقاعدہ جنگوں کے جانی نقصانات کا اندازہ قاضی محمد سلیمان مرحوم کے فراہم کردہ اعداد کے مطابق درج ذیل ہے:[1]

جنگ	مسلمانوں کا جانی نقصان	مخالفوں کا جانی نقصان	کیفیت
بدر	۲۲	۷۰	عام روایتوں کے مطابق صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔
اُحد	۷۰	۳۰	عام روایت کے مطابق قریش کے صرف ۲۳ افراد قتل ہوئے تھے۔
خندق یا احزاب	۶	۱۰	عام روایت کے مطابق مخالفوں کے صرف چار آدمی قتل ہوئے تھے۔
خیبر	۱۸	۹۳	
موتہ	۱۲	نامعلوم	
حنین	۶	۷۱	ابن حزم نے شہدائے حنین کی تعداد چار بتائی ہے۔ (جوامع السیرۃ ص ۲۴۱)
محاصرۂ طائف	۱۳	نامعلوم	
تبوک	×	×	
میزان	۱۴۷	۲۷۴	

مخالفین کے جانی نقصان میں موتہ اور طائف کے اعداد شامل نہیں۔ وہ بہت زیادہ نہ ہوں گے۔

غرض تمام چھوٹی بڑی مہموں اور باقاعدہ جنگوں میں مسلمانوں اور مخالفوں کا کل جانی نقصان یہ ہُوا:

مسلمان = ۱۴۷ + ۹۶ = ۲۴۳

مخالفین = ۲۷۴ + ۱۸۸ = ۴۶۲

---

[1] اس نقشے میں فتح مکہ کے نقصانات شامل نہیں وہ سابقہ اعداد میں شامل کر لیے گئے ہیں یعنی دو مسلمان اور گیارہ غیر مسلم۔

ان میں رجیع اور بئر معونہ کے شہدا کو شامل نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ تبلیغ کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لیے بھیجے ہی نہیں گئے تھے۔ اگر آپ انھیں بھی جانی نقصان میں شامل کرلیں تو پوری تعداد اناسی[۷۹] کے اضافے سے تین سو تیئیس[۳۲۳] بن جائے گی۔ اسی طرح مخالفوں کے اعداد نقصان میں جنگ موتہ اور محاصرۂ طائف کے مقتولین شامل نہیں کیے گئے۔ ان کے شمول سے مخالفوں کی تعداد میں بھی کسی قدر اضافہ ہوجائے گا اگرچہ وہ زیادہ سے زیادہ چند سو ہی کا ہوسکتا ہے۔

باب ۱۰۳

رحمت وشفقت کا ابرِ گہربار

آدمیت احترامِ آدمی

—(۲)—

قاضی صاحب مرحوم کا نقشہ

قاضی محمد سلیمان مرحوم نے پہلے غزوات و سرایا کا ایک مفصل نقشہ دیا ہے، جس میں ایک ایک مہم اور ایک ایک جنگ کے متعلق الگ الگ بتایا گیا ہے کہ فریقین کے کل کتنے آدمی شریک تھے اور ان میں سے کتنے مقتول یا شہید، کتنے مجروح اور کتنے اسیر ہوئے[1] پھر انھوں نے تمام اعداد کا ایک جامع نقشہ تیار کیا ہے جو درج ذیل ہے[2]

فریق	شہید یا مقتول	مجروح	اسیر	میزان	کیفیت
مسلمان	۲۵۹	۱۲۷	۱	۳۸۷	قاضی صاحب مرحوم نے تصریح فرمادی کہ فریقین کے زخمیوں کی تعداد صحیح نہیں، اسیروں اور مقتولوں کی تعداد صحیح ہوگی۔ ان شاء اللہ
مخالفین	۷۵۹		۶۵۶۴	۷۳۲۳	"
میزان	۱۰۱۸	۱۲۷	۶۵۶۵	۷۷۱۰	"

مجھے حساب میں چنداں دسترس حاصل نہیں۔ قاضی صاحب نے جو اعداد مفصل نقشے میں درج کیے ہیں، انھیں میں نے خود بھی

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد دوم (ص ۲۴۴-۲۶۴) [2] ایضاً ایضاً ص ۲۸۰)

گئی مرتبہ بھی کیا، دوستوں کو بھی اس باب میں کئی مرتبہ زحمت دی۔ تاہم مفصل نقشے اور اس مجموعی نقشے کے اعداد میں تطابق پیدا نہ ہو سکا۔ بعض اندراجات بداہتہً غلط تھے مثلاً صفحہ ۲۶۲ پر سریہ خالدؓ بن ولید کے اعداد ملاحظہ فرمائیے۔ پچانوے کا عدد جو مسلم شہدا کے خانے میں درج ہے، وہ مخالف فریق کے مقتولوں کے خانے میں جانا چاہیے۔ لیکن ایسی تصحیحات سے بھی ہم تطابق کے قریب نہیں پہنچے۔ معلوم نہیں قاضی صاحب مرحوم نے حساب کیونکر کیا؟

توجہ طلب حقیقت

لیکن اصل معاملہ پیش کردہ حساب کی درستی یا نادرستی کا نہیں۔ خاص توجہ کی محتاج یہ حقیقت ہے کہ رمضان ۲ھ (مارچ ۶۲۳ء) سے ۹ھ (۶۳۰ء) تک جتنی جھڑپیں، یا کشمکشیں یا جنگیں ہوئیں، ان میں مسلمانوں اور مخالفوں کا نقصان جانی زیادہ سے زیادہ ایک ہزار اٹھارہ نکلتا ہے اور یہ اتنا بے حقیقت نقصان ہے کہ جب میں نے مختلف احباب سے اس کا ذکر کیا تو انھیں ابتدا میں یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے، وہ حقیقت ہے۔ اچھا، آپ فرض کر لیں کہ یہ نقصان حقیقی کا صحیح مرقع نہیں۔ اس عدد کو دگنا یا تگنا کر لیجیے۔ پھر نقصان زیادہ سے زیادہ تین ہزار جانوں کا ماننا ہوگا۔ یاد رہے کہ اس حساب میں ہم نے غزوات وسرایا کی نوعیتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہر جھڑپ کے نتائج یکجا کر لیے ہیں، انھیں آٹھ سال پر پھیلا لیا جائے تو فی سال کے حساب سے پونے چار سو آدمیوں کا نقصان ہوا اور یہ ان جنگوں کا نقصان ہے جن کے نہ رسول اللہ صلعم خواہاں تھے اور نہ حضور صلعم نے کسی میں پیش دستی کی۔ معاملہ محض پیغام حق کی تبلیغ کا تھا، جو صلح و امن کے ساتھ رزم و پیکار سے قطع نظر کرتے ہوئے، برابر جاری رہا۔ کس طرح اور کیوں کر؟ اس کے مفصل حالات ہمیں معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال عرب کی اندرونی کشمکشیں ختم ہو گئیں اور تبلیغ نے پہلی منزل کامیابی سے طے کر لی، یعنی عرب جوق در جوق، گروہ در گروہ اور قبیلہ در قبیلہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، جو وجود اقدس حق و باطل کی پہلی امتحان گاہ یعنی غزوۂ بدر میں صرف تین سو تیرہ جانباز لا سکا تھا، وہ تبوک کی جانب روانہ ہوا تو اس کا پرچم حق تیس ہزار سرفروشوں پر لہرا رہا تھا۔ اللہ اور دین حق کی راہ میں سب کچھ نثار کر دینے والا اتنا بڑا لشکر پہلے عرب کی سرزمین سے نہیں اٹھا تھا۔

کیا حقیقتہً ہزار سوا ہزار یا زیادہ سے تین ہزار جانوں کے نقصان کے ساتھ اتنا عظیم القدر کارنامہ انجام دینے کی کوئی مثال روئے زمین کی سرگزشت کے کسی بھی حصے سے پیش کی جا سکتی ہے؟ اس سرگزشت میں ظہور اسلام سے پیشتر کا دور بھی شامل ہے اور بعد کا دور بھی۔ پھر یہ روشن حقیقت بھی ہر لحظہ سامنے رہنی چاہیے کہ یہ صرف زمین کی تسخیر نہ تھی یہ تخت حکومت اور سریر سلطنت آراستہ کرنے کا معاملہ نہ تھا۔ اس دور میں ایک نئی قوم وجود پذیر ہو چکی تھی۔ کیسی قوم؟ قرآن مجید گواہ ہے:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، تامرون (مسلمانو!) تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو عالم انسانیت کے

بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنو ن باللہ۔ (آل عمران : ۱۱۰)

ارشاد و اصلاح کے لیے ظہور میں آئی۔ تم نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔

ان تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں سب کچھ فرما دیا گیا، جو کسی انسانی گروہ کی مدح و ستائش میں کہا جا سکتا تھا۔ اللہ پر ایمان، معروف کا حکم اور منکر کی روک تھام کے بعد کون سی چیز باقی رہ گئی، خواہ اس کا دائرہ کوئی ہو؟

پھر عربوں کی حالت ظہور اسلام سے پیشتر کیا تھی؟ جنگل کے وحشیوں اور درندوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے تمام قبیلوں اور گروہوں کے چلن وحشیانہ تھے۔ لوٹ مار کے سوا ان کا کوئی پیشہ نہ تھا۔ ان کی زندگیاں فتنہ و فساد میں کٹتی تھیں۔ دو شخصوں میں معمولی سی بات پر جھگڑا ہو جاتا تو قبیلوں کے قبیلے اس آگ میں کود پڑتے تھے۔ خواجہ حالی مرحوم کے قول کے مطابق:

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا　　کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا

لبِ جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا　　کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یونہیں روز رہتی تھی تکرار ان میں

یونہیں چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

قرآن مجید ہی گواہ ہے کہ اس قوم کو جو شیوہ ہائے انسانیت کے اعتبار سے شاید روئے زمین کی پست ترین قوم تھی، بلند ترین مسند پر لا بٹھایا اور امامت روئے زمین کا منصب سونپ دیا:

واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا وکنتم علیٰ شفا حفرۃ من النار فانقذکم منھا۔ (آل عمران : ۱۰۳)

اللہ نے تمھیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو تمھارا حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے (لیکن اللہ کے فضل وکرم سے ایسا ہوا کہ) بھائی بھائی بن گئے۔ تمھارا حال تو یہ تھا کہ آگ سے بھری خندق کے کنارے کھڑے تھے (ذرا پاؤں پھسلتا اور شعلوں میں جا گرتے) اللہ نے تمھیں اس خطرناک حالت سے نکال لیا۔

والف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعًا ما الفت بین قلوبھم و لکن اللہ الف بینھم۔ (انفال : ۶۳)

اور (اللہ ہی ہے جس نے) مومنوں کے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی، اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے۔ جب بھی ان کے دلوں میں باہمی الفت نہ جوڑ سکتا یہ اللہ ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔

اسی مختصر سی مدت میں جس میں تسخیر ارض کی پہلی منزل طے ہوئی، نئی قوم معرض وجود میں آ گئی۔ ایک نیا نظام بھی

پوری کامیابی سے جاری ہوگیا جو روئے زمین کے انسانوں کی تقدیریں پلٹ دینے والا تھا اور کیسی قوم؛

سب اسلام کے حکم بردار بندے — سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبیؐ کے وفادار بندے — یتیموں کے رانڈوں کے غمخوار بندے

وہ کفر و باطل سے بیزار سارے
نشے میں مئے حق کے سرشار سارے

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے — کہانت کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکامِ دیں پر جھکا دینے والے — خدا کے لیے گھر مٹا دینے والے

ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت — نہ پوشش سے مقصود تھی زیب و زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت — فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت

لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

خلیفہ تھے امت کے ایسے نگہباں — ہو گلے کا جیسے نگہبان چوپاں
سمجھتے تھے اُمّی و مسلم کو یکساں — نہ تھا عبد و حر میں تفاوت نمایاں

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی
زمانے میں ماجائی بہنیں ہوں جیسی[1]

اگر تاریخ میں ایسی دوسری قوم کی مثال ملتی ہے تو تلاش کر لیجیے۔ اتنے معمولی سے جانی نقصان کی بنا پر جس کی حقیقی مقدار سوا ہزار سے زیادہ نہ تھی، صرف آٹھ نو سال میں یہ سب کچھ عملی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا۔ کیا اس وجودِ اقدس کے "رحمۃ للعلمین" ہونے میں کسی کو دم بھر کے لیے تامل ہو سکتا ہے؛ لوگ معجزوں میں کلام کرتے ہیں، اس سے زیادہ پُرتاثیر اور یقینی طور پر ناقابلِ انکار معجزہ کون سا ہو سکتا ہے؛

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ارشاد | ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے فرمایا:

---

[1] خواجہ حالی مرحوم کے مسدس کے یہ بند دوسرے بے شمار بندوں کی طرح حقائق ثابتہ کا مرقع ہیں۔ یہ جس طرح آج روشن ہیں، اسی طرح اس وقت روشن تھے جب مسدس لکھا گیا تھا اسی طرح روشن رہیں گے جب تک مسدس دنیا میں موجود ہے۔

۱۔ مدینہ منورہ کی شہری مملکت رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ میں روزانہ دو سو چوہتر مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی رہی۔

۲۔ قریباً ہندوستان کے برابر وسیع علاقے کی فتح میں دشمن کے بہ مشکل ڈیڑھ سو آدمی قتل ہوئے اور مسلمان فوج کا اس دس سال میں مشکل سے ایک سپاہی ماہانہ شہید ہوتا رہا۔

میں ان اعداد کا معاملہ سمجھ نہیں سکا۔ بعض اعداد معلوم نہیں۔ لیکن جو معلوم ہیں، انھیں جمع کر لیا جائے تو ڈیڑھ سو سے یقیناً زیادہ ہوں گے اور یہ کہنا غالباً قرین صحت نہ ہو کہ دس سال تک ہر مہینے مسلمانوں کا صرف ایک سپاہی ہی شہید ہوتا رہا یعنی تمام جنگوں میں کل ایک سو بیس مسلمان شہید ہوئے۔

اعداد سے اختلاف کے باوصف محترم ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد کی تائید و حمایت میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ انسانی خون کی عزت جس پیمانے پر رسول اللہ صلعم نے کی، وہ تاریخ عالم میں بے نظیر ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

یہاں تقابل مقصود نہیں، کیونکہ تقابل بہ ہر حال کسی نہ کسی مناسبت کی بنا پر کیا جا سکتا ہے اور یہاں مناسبت کاملاً ناپید ہے۔ ہاں، عبرت کی غرض سے کچھ اعداد و شمار ان قوموں اور ملکوں کے پیش کیے جاتے ہیں، جو بہ زعم خویش تہذیب و شائستگی کے سدرۃ المنتہیٰ پر بیٹھے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے ابتدائی دور میں انگریزوں کو اپنی اور فرانسیسیوں کی فوجیں ڈنکرک سے نکالنی پڑی تھیں تو آدمیوں کو بچا لانا مقدم قرار دے دیا گیا اور بھاری سامان جنگ دشمن کے حوالے کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ چرچل نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ساز و سامان جنگ مشینوں میں ڈھالا جا سکتا ہے لیکن آدمی مشینوں میں نہیں ڈھالے جا سکتے۔ تاہم آپ خوب چھان بین کر لیں کہ مہذب یورپ نے باہمی جنگوں میں اور خصوصیت سے ان جنگوں میں جو ایشیائی اور افریقی خطوں میں کی گئیں، انسانی خون کو پانی سے بڑھ کر ارزاں بنائے رکھا یا نہیں اور یہ سلسلہ مشرق وسطیٰ یا ہند چینی میں آج بھی انتہائی بے پروائی سے جاری ہے۔ گویا وہاں انسان نہیں بستے جن کے خون کا احترام اہل مغرب میں سے کسی کے لیے قابل توجہ ہو۔

مرقع عبرت

آپ نے رحمۃ للعلمین صلعم کی ناخواستہ جنگوں کے اعداد ملاحظہ فرما لیے، جنھیں زیادہ سے زیادہ بڑھا کر بھی آٹھ نو سال میں تین ہزار تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اب داعیان تہذیب کی رزم آرائیوں کا پورا مرقع نہیں، بلکہ اس کی صرف چند جھلکیاں دیکھ لیجیے،

۱۔ "سی سالہ جنگ" ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک تیس سال جاری رہی، جس میں جرمنی، فرانس، آسٹریا، سویڈن وغیرہ نے حصہ لیا۔ اس میں صرف جرمنی کے ایک کروڑ بیس لاکھ آدمی مارے گئے[1]

---

[1] BOOK OF FACTS ص ۶۱۲۔

۲۔ امریکی خانہ جنگی ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک جاری رہی۔ اس میں ایک فریق شمالی ریاستیں اور دوسرا فریق جنوبی ریاستیں تھیں اور جنگ کا سبب غلامی کا مسئلہ تھا۔ اس میں تین لاکھ آدمی شمالی ریاستوں کے اور پانچ لاکھ جنوبی ریاستوں کے مارے گئے۔ چوہتر کروڑ پونڈ خرچ ہوئے۔ اس رقم سے دنیا بھر کے غلام ایک قطرۂ خوں بہائے بغیر آزاد کرائے جا سکتے تھے۔ امریکہ میں غلامی قانوناً ختم ہو چکی ہے، لیکن اس کی تمام لعنتیں آج بھی وہاں مکروہ ترین صورت میں موجود ہیں۔

۳۔ پہلی عالمی جنگ میں ایک کروڑ آدمی مارے گئے تھے اور دو کروڑ مجروح ہوئے تھے۔ خدا جانے ان میں سے کتنے لولے، لنگڑے، اندھے اور اپاہج ہوئے اور کتنوں نے ہسپتالوں میں جانیں دیں۔ پھر اس جنگ ہی سے انفلوئنزا شروع ہوا، جس میں مزید ایک کروڑ آدمی مر گئے۔ ایک انسانیت دوست صاحب علم کا اندازہ ہے کہ اس جنگ پر اسی ارب پونڈ خرچ ہوئے۔ اس رقم سے فرانس اور بلجیم کی نہ صرف زمین بلکہ ہر چیز پانچ پانچ مرتبہ خریدی جا سکتی تھی۔[1]

دوسری عالمی جنگ

۴۔ دوسری عالمی جنگ کے صرف مقتولین کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے:

چین	۱۳۱۰۲۲۴
فرانس	۲۰۰۰۰۰
جرمنی	۶۳۰۰۰۰۰
صرف فضائی بمباری سے	۵۰۰۰۰۰
جاپان	۵۳۵۷۹۵
بم باری سے	۲۴۱۳۰۹
یونان	۴۱۵۰۰۰
برطانیہ	۳۵۳۶۵۲

ان اعداد کی میزان قریباً ایک کروڑ بنتی ہے لیکن ان میں بہت سے شرکائے جنگ کے مقتولین شامل نہیں۔ مثلاً: چیکوسلواکیا، پولینڈ، روس، فن لینڈ، یوگو سلافیا، بلغاریا، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ۔ پھر مختلف ملکوں کے ان گروہوں کا جانی نقصان معلوم نہ ہو سکا، جنھیں ہٹلر کی فوجیں جبری مزدوری کے لیے جرمنی لے گئی تھیں

---

[1] Book of Facts ص ۶۱۵

، اور جنگ کے اختتام تک وُہ لوگ واپس نہ ہو سکے۔ یہ تمام اعداد جمع کیے جائیں تو دوسری عالمی جنگ کا نقصان دو کروڑ افراد سے بھی بڑھ جائے گا۔

آتش ریز اور آتش خیز بموں سے شہر، قصبے، کارخانے، کھیتیاں، زمینیں، گاؤں، بندرگاہیں، بجلی اور پانی کے مرکز جس طرح تباہ ہُوئے ان کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ ہیروشیما اور ناگا ساکی میں ایٹمی بموں سے جو قیامت برپا ہُوئی، اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔

ربانی سیاست اور شیطانی سیاست

رحمۃ للعلمینؐ ربانی سیاست پر کاربند تھے اور اسی سیاست کو اولادِ آدم کا دائمی مسلک بنا دینے کا پیغام پہنچا گئے۔ جو اعداد اوپر پیش ہو چکے ہیں، وہ ان گروہوں، جماعتوں اور قوموں کے کارنامے ہیں، جنھیں ربانی سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کا مدار شیطانی سیاست ہے۔ ربانی سیاست کا پُورا نظام ربانی صفات کے مرکز پر گھوم رہا ہے، جس میں رحمت، شفقت، رافت کارفرما ہوتی ہیں، انسانوں کی مادی اور معنوی تربیت صحیح اصول پر کی جاتی ہے۔ شیطانی سیاست عالمِ انسانیت کے لیے شدید طوفان برق و باد یا نہایت خوفناک بھونچال کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے جزوی مظاہرے جا بجا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تخریب در تخریب اور اعدام در اعدام کے سوا کچھ نہیں۔

سوچیے کہ اگر نوعِ بشر کے ہوش و حواس سلامت ہیں تو وہ کس سیاست کو اپنی بہتری اور بہبود کے لیے چُنے گی؟ وہ سیاست جسے تھوڑی مہلت مل جائے تو روئے زمین کے بہترین خطوں کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالے اور انسانوں کی عظیم صفوں کی مہلتِ حیات آگ اور خون کے طوفانوں میں ڈبو دے؟ انسانیت کی بہتری صرف ربانی سیاست میں ہے، جسے عرب کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں لے کر نکلیں تو جہاں پہنچیں تاریکیوں میں اُجالا کر دیا۔ صلح و امن اور محبت و مواخات کے سلسلے قائم کر دیے اور انسانوں میں حبِ باری تعالیٰ، حبِ رسول صلعم اور حبِ انسانیت کی لگن پیدا کر دی۔ آج حضور رحمۃ للعلمینؐ کے کروڑوں نام لیوا موجود ہیں مگر کہیں کوئی ایسا منظر نہیں ملتا جو قلب و رُوح کے لیے وجہ اطمینان یا حضور صلعم کی ذاتِ بابرکات سے انتساب کے پیشِ نظر زیبا ہو:

نہ داغ تازہ مے کارد نہ زخم کہنہ مے خارد
بدہ یارب دلے کایں صورتِ بے جاں نے خواہم

باب ۱۰۴

قرآن مجید کے چند انقلاب انگیز اصول

عالمی اصلاح و امن کی محکم بنیادیں

آں کتاب زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
نوع انساں را پیام آخریں — حامل او رحمۃ للعالمیں

عالمی اور بین الاقوامی زاویہ نگاہ اسلام کا زاویہ نگاہ یک قلم عالمی اور بین الاقوامی ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم پوری کائنات انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور حضور صلعم نے جب تبلیغی دعوت نامے ارسال فرمائے تھے تو وہ صرف رؤساے عرب کے لیے نہ تھے بلکہ ایران کے کسریٰ، مشرقی روم کے قیصر، مصر کے مقوقس اور حبش کے نجاشی کے لیے بھی تھے۔ یہ ملک عرب کے اردگرد واقع تھے، ان کے ساتھ عربوں کے تجارتی روابط تھے اور وہ ان ملکوں میں جاتے آتے تھے۔ یہ عالمی دعوت اسلام کی طرف پہلا قدم تھا۔ مسلمانوں کا فرض تھا کہ حضور صلعم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں وہ دعوت و تبلیغ کے دائرے کو تدریجاً وسیع تر کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ اسلام دنیا بھر میں پھیل جاتا اور رسول اللہ صلعم جس غرض سے مبعوث ہوئے تھے، وہ پایۂ تکمیل پر پہنچ جاتی۔ افسوس کہ تھوڑا ہی عرصہ گزرنے کے بعد ایسی حکومتیں وجود میں آ گئیں، جو وضع و ہیئت ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ بڑی حد تک معنوی اعتبار سے بھی ویسی ہی بادشاہیاں تھیں، جیسی ظہور اسلام سے پیشتر موجود تھیں۔ کہیں کوئی اچھا فرمانروا بروے کار آ تا رہا تو اس نے اپنے ماحول کے اعتبار سے مربیانہ سیاست کے مطابق کام کیا لیکن فی الجملہ حالت بگڑتی گئی، یہاں تک کہ وہ بادشاہیاں بھی رفتہ رفتہ اسی حالت کو پہنچ گئیں، جو ان کے لیے مقدر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی البتہ بعض نیک اور سعید ہستیوں نے جابجا تربیتی اور تبلیغی مرکز قائم کیے، جن کی برکات و حسنات کے ذکر کا یہ محل نہیں۔

یہاں قرآن مجید کے چند انقلاب انگیز اصول پیش کیے جاتے ہیں، جو عالمی صلح و امن اور خیر و بہبود کے زبردست عوامل تھے۔ تعجب ہے کہ خود مسلمان بھی ان پر ٹھیک ٹھیک عمل پیرا نہ ہو سکے۔ اس حالت میں دوسروں سے عمل پیرائی کی کیا امید رکھی جا سکتی تھی۔

بین الاقوامی امن کے تقاضے بین الاقوامی اصلاح و امن کے سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی امر

یہ ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانی گروہوں، جماعتوں اور قوموں کو اصولی اعتبار سے مساوی تسلیم کیا جائے اور اس مساوات کو عملی لباس پہنانے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی جائے۔ اگرچہ کسی کا عقیدہ کچھ ہو جو کتاب حق رحمۃ للعلمین صلعم پر نازل ہوئی، اس میں انسانی مساوات کا غیر مشتبہ اعلان موجود ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (حجرات، ۱۳)	لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم پہچان لیے جاؤ۔ یقیناً تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔ خدا دانا اور واقف کار ہے۔

تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدمؑ اور حواؑ کی اولاد ہیں۔ جس طرح ایک ماں باپ کے بچوں میں فرق و امتیاز کی کوئی وجہ نہیں، اسی طرح تم کیوں امتیازات قایم کرتے ہو؟ وہ بھی ایسے جن کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں؛ مثلاً رنگ اور نسل کا اختلاف، دولت وحشمت کا اختلاف، مختلف جغرافیائی خطوں کا اختلاف، یہ تمام اختلافات سراسر باطل اور بے اصل ہیں، جن میں الجھ کر تم ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی دیواریں کھڑی کرتے ہو، حالانکہ تمھیں چاہیے ان سے قطع نظر کرتے ہوئے بنیادی یکسانی اور یک جہتی کو مرکز توجہ بناؤ یعنی تم سب انسان ہو۔

حضور صلعم نے فتح مکہ کے بعد حرم پاک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا ان میں مخاطب وہ تھے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف اکیس برس تک ظلم و تعدی کا کوئی بڑے سے بڑا طوفان بپا کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور شاید ہی کوئی سینہ یا چہرہ ہو، جو مخاطبین کی برچھیوں، تلواروں اور تیروں سے جراحت زار نہیں بن چکا تھا۔ تاہم حضور صلعم نے فرمایا: آج تم پر کوئی الزام نہیں اور تم سب آزاد ہو۔

نیز فرمایا: اے قریش! جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ پھر سورۂ حجرات کی یہی چودھویں آیت تلاوت فرمائی جو اوپر منقول ہے۔ اس سے مزید توثیق ہو گئی کہ یہ آیت مساوات انسانی کی بنیاد ہے۔

واضح رہے کہ اسے وقتاً فوقتاً پڑھ دینا کافی نہیں۔ اس پر اسی طرح عمل ہونا چاہیے، جس سے مطلوب مساوات کی تکمیل ہو۔ تمام قوموں اور گروہوں کے درمیان ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے رشتے استوار ہوتے جائیں۔ امن عالم ایک حقیقت ثابتہ کی شکل اختیار کرلے۔ ایسا ہی ماحول پیغام حق کی اشاعت کے لیے بہ حیثیت مجموعی سازگار ہوگا۔ توپوں کے آتشیں گولوں یا طیاروں کی تباہی خیز بمباری کو پیغام حق پہنچانے اور حضور صلعم کے منصب اصلاح انسانیت کو لباس عمل پہنانے کا اچھا ذریعہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

اکثریت کی بنیاد پھر دیکھیے اس آیہ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسانوں کی عزت و اکرمیت کا

بنیاد دولت، رنگ، خون، نسل، قوم یا کوئی خاص جغرافیائی خطہ نہیں صرف تقویٰ اور حسن عمل ہے۔ ہر انسان اس بنا پر عزت کا مستحق نہیں سمجھا جا سکتا کہ کروڑپتی یا ارب پتی ہے۔ اس کا رنگ گورا ہے۔ اس کا تعلق آریائی نسل سے ہے جیسا کہ روئے زمین کے بعض فاتر العقل گروہ سمجھ رہے ہیں اور ان میں چھوت چھات کوئی نہ کوئی شدید افتراق انگیز شکل اختیار کیے ہوئے موجود ہے۔ صرف نیک عملی انسانی اکرمیت کی اساس ہے۔ اس باب میں سکندروں اور نپولینوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ موجدوں، فلسفیوں، سیاست دانوں، عالموں اور خطیبوں کو ان کے محض پیشوں اور مشغولیتوں کے اعتبار سے بھی لائق توجہ نہیں سمجھا جاتا۔ وہاں محض نکوکاری، راست بازی، حق پرستی اور خلق دوستی درکار ہے۔ اس کے سوا ہر سکۂ عمل کھوٹا اور ہر سرگرمی کار بے حقیقت ہے۔

اس کی حقیقت پر آپ نے غور فرمایا؟ اس دنیا میں حسن عمل کے سوا ہر معیارِ عظمت حسد، رقابت اور کشمکش کا موجب ہوتا ہے۔ دولت کو معیار بنایا جائے تو جسے جائز ذریعے سے حاصل نہ ہوگی، وہ ہر ناجائز ذریعے سے حاصل کرے گا اور خلق خدا کے لیے لعنت بن جائے گا۔ فن حرب و سیاست میں کمال کو معیار بنایا جائے گا تو مختلف لوگ روئے زمین کو انسانوں کے خون سے رنگنے میں اپنی زندگیاں تمام کر دیں گے اور دنیا ان کو صرف نفرین کا مستوجب ٹھہرائے گی لیکن حسن عمل میں رقابت یا حسد راہ ہی نہیں پا سکتے کیونکہ وہ منافیِ حسنِ عمل ہوں گے۔ یوں تمام انسانوں کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ حسنِ عمل کی فراوانی سے روئے زمین امن و سلامتی کا بہشت زار بن جائے۔

دین میں کوئی جبر نہیں

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے،

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣڎ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

(البقرة: ۲۵۶)

دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں۔ بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہو گئی ہے۔ پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کر دے (یعنی سرکشی، فساد اور گمراہی سے یک قلم بیزار ہو جائے) اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے فلاح و سعادت کی مضبوط ٹہنی پکڑ لی جو ٹوٹنے والی نہیں (جس کے ہاتھ آگئی وہ گرنے سے محفوظ ہو گیا) اور یاد رکھو اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

انسانی ظلم و ستم کے جو خونچکاں واقعات "تاریخ کے صفحات پر منقوش ہیں، ان میں سے تین چوتھائی واقعات صرف جبر و تشدد کا نتیجہ ہیں جو ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے بے دریغ روا رکھے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہر سلیم العقل انسان پر روز روشن کی طرح آشکارا تھی کہ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت د

موعظت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جبر و اکراہ سے انسانی جسم کو اپنی مرضی کے مطابق جھکایا جا سکتا ہے، مگر دل میں اعتقاد و ایمان کا چراغ روشن نہیں کیا جا سکتا اور جب تک چراغ یقین روشن نہ ہوگا، وہ اعمال ظہور پذیر نہیں ہو سکتے جو از روئے دین مطلوب و منظور ہیں بلکہ جبر سے دلوں میں نفرت و کراہت کی آگ مشتعل ہو گی اور جب جابر قوت میں ضعف آئے گا تو ردِ عمل کو کوئی طاقت روک نہ سکے گی اور وہی صورت حال نمودار ہو جائے گی جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے:

كَالَّتِىْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا۔ (نحل: ۹۲) اس عورت کی مثال، جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن کے فوائد میں اس آیت کے متعلق لکھا گیا ہے:

جب دلائل توحید بخوبی بیان فرما دی گئیں، جن سے کافر کا کوئی عذر باقی نہ رہا تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے؟ عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہیے۔ نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ۔[1]

پھر اس آیت کے مطالب کی توثیق بعض دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (یونس: ۹۹) اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں، وہ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تو ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاؤ میں چھوڑنے والا نہیں؟

اس آیہ مبارکہ سے ایک طرف یہ نمایاں ہے کہ مخلوق کی ہدایت کے لیے رسول اللہ کے قلب مبارک کی تڑپ کا کیا عالم تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ اس معاملے میں جبر کی کوئی گنجایش نہیں۔ اللہ کی مشیت یہی ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں خود سوچ سمجھ کر اس طرف متوجہ ہوں اور بقدر استعداد و سعادت کی منزلیں طے کریں۔

حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

آپ کو (رسول اللہ صلعم کو) یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں۔ خدا چاہتا تو بے شک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا مگر ایسا کرنا..... اس کی تکوینی حکمت و مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لیے نہیں کیا گیا۔[2]

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

---

[1] قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ص ۳۵۵ حاشیہ [2] ایضاً ص ۲۸۰ - ۲۸۵ حاشیہ۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ (کہف : ۲۹)

(اے پیغمبر) کہہ دو، یہ سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے اب جو چاہے مانے، جو چاہے نہ مانے۔ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں چاروں طرف سے انھیں گھیر لیں گی۔

غرض جس طرح مساوات کا اعلان شرفِ انسانی کے اعتراف کا ایک جزو ہے، اسی طرح عقیدہ و ایمان کے سلسلے میں جبر کی نفی بھی انسانی شرف ہی کا ذریعہ ہے، لیکن اسلام ہر انسان میں جہاں اشرفیت کا زیادہ سے زیادہ گہرا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے وہاں یہ توقع بھی رکھتا ہے (اور رکھنی چاہیے) کہ انسان اپنے شرف ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسنِ عمل کا مصدر بنیں گے اور خدا پر ان کا ایمان زیادہ سے زیادہ مستحکم و استوار ہوگا کیونکہ اشرفیت کا احساسِ صحیح سلیم العقل انسان کو کسی اور طرف لے جا ہی نہیں سکتا۔

عدل پر استواری

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (مائدہ : ۸)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کو مضبوطی سے کھڑے ہو جایا کرو اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ اس سے انصاف نہ کرو۔ (ہر حال میں) انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو اللہ کو خوب خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن میں ہے کہ "قوامین للہ" میں حقوق اللہ کی طرف اور "شہداء بالقسط" میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے۔[۱]

"عدل" کا مطلب ہے کسی کے ساتھ بدون افراط و تفریط وہ معاملہ کرنا، جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلے کو جھکا نہ سکے۔۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ "عدل و قسط" یعنی دوست دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملے میں جذبات محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا، یہ فضیلت حصولِ تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے۔[۱]

---

[۱] قرآن مجید مترجمہ حضرت شیخ الہند ص ۱۴۰ حاشیہ۔

ہر سلیم العقل انسان اندازہ کرسکتا ہے کہ اسلام کن خصوصیات والے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کسی فرد یا جماعت سے کتنی ہی عمیق محبت یا کتنی ہی شدید دشمنی ہو۔ جب گواہی دینے کا مرحلہ سامنے آئے گا، مسلمان کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے گا، جو حق و انصاف کے عین مطابق نہ ہو۔

یاد ہوگا کہ فتح خیبر کے بعد وہاں کی زمین نصف پیداوار کی بنا پر یہودیوں کے حوالے کر دی گئی تھی اور عبد اللہؓ بن رواحہؓ کو بٹائی کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ وہ پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو انبار لگوا دیتے اور یہودیوں سے کہتے کہ جو حصہ چاہو، اٹھا لو۔ یہودی کہتے "زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قایم ہیں"۔ مسلمانوں کا وظیفۂ حیات روئے زمین پر یہی تھا اور ایسے ہی اصول حیات عالمی امن کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ وہ افراد یا گروہ اس وظیفے کی بجا آوری کیونکر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، جن کی زبانوں سے الفاظ نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، پھول جھڑ رہے ہیں لیکن ان کے دل، ان کی طبیعتیں اور ان کی ذہنیتیں نہایت پست اور دامن بر انداز اغراض سے یکقلم آلودہ ہیں۔ یہ وہی شیوہ ہے جس پر مدینہ منورہ کے یہودی عربوں کے تعلق میں کاربند تھے اور کہا کرتے تھے:

لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ ۚ وَ یَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ۔
(آل عمران: ۷۵)

امیوں (یعنی عربوں) کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ہم پر کچھ مواخذہ نہیں (یعنی ان کے ساتھ دیانت داری برتنا ضروری نہیں) اور یہ کہہ کر وہ اللہ پر تہمت باندھتے ہیں حالانکہ اچھی طرح جانتے ہیں حقیقت حال کیا ہے؟

یعنی جس گروہ سے ذاتی اغراض وابستہ ہیں، ان کے متعلق ایک نظام اخلاق اور ایک ضابطۂ نیک و بد ہے لیکن جن سے کوئی خاص علاقہ نہیں، ان کے باب میں بالکل دوسری روش اور دوسرے اصول پیش کیے جاتے ہیں۔

نیکی میں تعاون بدی سے گریز

قرآن نے ایک انقلاب انگیز اصول مندرجہ ذیل آیت میں پیش کیا ہے:

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔ (مائدہ ۲)

جس گروہ نے تمہیں مسجد حرام سے روک دیا تھا، اس کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ اس کے ساتھ زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستور العمل تو یہ ہونا چاہیے کہ) نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو، گناہ اور ظلم کی کسی بات میں تعاون نہ کرو اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو۔ وہ (پاداش عمل میں) سخت عذاب دینے والا ہے۔

قریش مکہ نے حدیبیہ میں مسلمانوں کو اور اسے عمرہ سے روک دیا تھا، جب اختیار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ

میں آئی تو انھیں پر یہ واضح کر دینا ضروری تھا کہ قریش کی سابقہ زیادتی تمھارے لیے زیادتی کا موجب نہ بن جائے۔ اگرچہ تمھارے خیال کے مطابق وہ ان کی زیادتی کا جواب ہی ہو۔ مسلمان کا دستور العمل یہ ہے کہ جہاں نیکی اور اچھائی دیکھتا ہے، اس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ برّ و تقویٰ زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں۔ البتہ ظلم و گناہ سے دُور رہنا لازم ہے۔ انھیں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نہ دینا چاہیے۔

اب سوچیے اور غور کیجیے کہ اگر دنیا کی تمام قومیں اور جماعتیں یہ دستور العمل اپنا لیں، نیکی اور خدا ترسی کے لیے مل جل کر کام کریں۔ گناہ اور ظلم کو فروغ نہ پانے دیں بلکہ اسے متحدہ قوت سے روکیں تو کیا دنیا جلد سے جلد امن و سلامتی کا گہوارہ نہ بن جائے؟ (مولف)

باب ۱۵

قرآن مجید کے چند انقلاب انگیز اصول

عالمی اصلاح و امن کی محکم بنیادیں

آں کتاب زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
نوع انساں را پیام آخریں — حامل او رحمۃ للعالمین

—(۲)—

انسان اور راستبازی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ج اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ج وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا۔

(نسا: ۱۳۵)

اے ایمان والو! تم انتہائی مضبوطی اور پختگی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے ہو جاؤ کہ اگرچہ وہ گواہی خود تمہارے خلاف یا تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے بھی خلاف ہو تو ہرگز نہ جھجکو۔ اگر کوئی مالدار یا مفلس ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان پر مہربانی رکھنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہوا ئے نفس کی پیروی تمہیں انصاف سے باز رکھے۔ اگر تم (گواہی دیتے وقت) بات کو گھما پھرا کر پیش کرو گے یا گواہی دینے سے پہلو بچا جاؤ گے تو (یاد رکھو) اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح آگاہ ہے۔

انسان کے لیے ایک اہم مرحلہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں سچ پر قایم و استوار رہے اور سچی گواہی دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرے، اگرچہ سچ بولنے سے خود اسے یا اس کے والدین اور قرابت داروں کو نقصان پہنچے۔ یہ بھی ممکن ہے کسی کو مالدار کے مال کا لالچ یا اثر و رسوخ کا خوف سچ کہنے سے تمہیں باز رکھے یا کوئی مفلس ہو جس کی مفلسی پر ترس کھا کر تھوڑی سی غلط بیانی گوارا کر لی جائے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی مالدار ہو یا غریب، اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان کے لیے گواہی دینے والے سے کہیں زیادہ سود مند اور نفع بخش ہوگی۔ غرض انصاف کے معاملے میں ہوائے نفس کی پیروی ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی نہیں کہ بیان میں ہیر پھیر کا طریقہ اختیار کیا جائے یا گواہی نہ دینے ہی سے گریز کو

پناہ گاہ بنا لیا جائے۔ اسی طرح انسانوں کو جھکا دیا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دلوں اور نیتوں کے بھید بھی جانتا ہے جو لوگ اپنے خلاف یا اپنے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے خلاف بھی سچ کہتے ہوئے نہ جھجکیں، وہ مخلوق کی بھلائی اور بہبود کے لیے جو گراں بہا کام انجام دے سکتے ہیں، ان کی توقع ایسے لوگوں سے کیونکر رکھی جا سکتی ہے جو ایک لفظ زبان سے نکالتے وقت دس مرتبہ سوچتے ہیں کہ اس سے ہمارے موافقوں پر تو زد نہ پڑے گی اور ہمارے مخالف تو فائدہ نہ اٹھا لیں گے۔ اس کا نام ان کے ہاں "سیاستدانی" اور "تدبّر" ہے۔ امن عالم کے ضامن وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو حق و انصاف کے معاملے میں راست بازی کے اس انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہوں۔

برائی کے جواب میں بھلائی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے،

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ۔ (حم سجدہ: ۳۴)

اور نیکی اور بدی برابر نہیں۔ (بدی کو) اس طریق سے دور کرو جو اچھا ہے (یعنی نیکی کے ذریعے سے) پھر تم دیکھو کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان دشمنی ہے وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے گا۔

حضرت شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن مجید کے فوائد میں ہے،

خوب سمجھ لو بدی نیکی کے اور نیکی بدی کے برابر نہیں ہو سکتی، دونوں کی تاثیر جداگانہ ہے۔ بلکہ ایک نیکی دوسری نیکی سے اور ایک بدی دوسری بدی سے اثر میں بڑھ کر ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک مومن قانت خصوصاً ایک داعی الی اللہ کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ برائی کا جواب برائی سے نہ دے بلکہ جہاں تک گنجایش ہو برائی کے مقابلے میں بھلائی سے پیش آئے۔ اگر کوئی اسے سخت بات کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے مقابل وہ طرز عمل اختیار کرنا چاہیے جو اس سے بہتر ہو..... اس طرز عمل کے مقابلے میں تم دیکھ لو گے کہ سخت سے سخت دشمن بھی ڈھیلا پڑ جائے گا اور گو دل سے دوست نہ بنے تاہم ایک وقت آئے گا جب وہ ظاہر میں ایک گہرے اور گرم جوش دوست کی طرح تم سے برتاؤ کرنے لگے گا بلکہ ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد سچے دل سے دوست بن جائے۔[1]

غرض یہ اصول ایسا ہے کہ ہر ہمت ور اور مخلص انسان اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ پھر مسلمان تو حقیقتہً ایک

---

[1] قرآن مجید مترجمہ حضرت شیخ الہند مرحوم ص ۶۲۳ فوائد۔ میں نے یہاں فوائد کے سلسلے میں شیخ الہند کے ترجمہ قرآن کا ذکر اس لیے کیا کہ میرے علم کے مطابق زیادہ تر فوائد مولانا شبیر احمد عثمانی ہی نے لکھے تھے بلکہ حضرت شیخ الہند صرف سورۂ بقرہ اور سورۂ نسا ہی کے فوائد مکمل کر سکے تھے۔

مستقل داعی الی اللہ ہے۔ مزید برآں خود رسول اللہ صلعم کا دستور یہی رہا اور حضور صلعم کی پیروی سے بڑھ کر کسی کے لیے راہِ سعادت کیا ہوسکتی ہے؛

عدل و احسان قرآن مجید کی ایک اور جامع انقلابی دعوت پر غور فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔ (نحل: ۹۰)

اللہ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملے میں) انصاف کرو۔ (سب کے ساتھ) بھلائی سے پیش آؤ۔ قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرو اور تمھیں روکتا ہے بے حیائی کی باتوں سے ہر طرح کی برائیوں سے اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا تاکہ (سمجھو) اور نصیحت پکڑو۔

مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور اس آیہ کریمہ کے متعلق فرماتے ہیں:

اللہ کا فرمان مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ عدل کو اپنا شیوہ بناؤ، نیک کرداری میں سرگرم رہو۔ قرابت والوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ فحش کاموں سے بچو، ہر طرح کی برائیوں سے اجتناب کرو۔ ظلم و زیادتی سے کبھی آلودہ نہ ہو۔

جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے، ان کے لیے اب آزمائش عقاید میں نہ تھی، اعمال میں تھی۔ اس لیے اس آیت میں عملی زندگی کی تمام مہمات بیان کردیں۔۔۔۔۔ اسی لیے مفسرین نے اسے جوامع آیات میں شمار کیا ہے۔

عدل، تمام محاسن اعمال کی اصل ہے۔ جس انسان کے اندر یہ بات پیدا ہوگئی کہ جو بات کرنی چاہیے انصاف کے ساتھ کرنی چاہیے، اس نے سب کچھ پالیا۔ احسان سے یہاں مقصود حسن عمل ہے۔ جو بات کرو حسن و خوبی کی کرو۔ نیکی اور بھلائی کی کرو یعنی بنیاد عمل بھلائی ہو، برائی نہ ہو۔۔۔۔ جو ہم سے قریب کا رشتہ رکھتے ہیں، وہ ہمارے حسن سلوک کے زیادہ حقدار ہیں، اس لیے ایتائی ذی القربیٰ کی رعایت بھی ضروری ہوئی۔ پھر فحشا، منکر اور بغی سے روک کر نواہی کے سارے مقاصد پورے کر دیے۔ فحش سے مقصود وہ برائیاں ہیں جو حد درجے کی برائیاں تسلیم کر لی گئی ہیں، منکر میں ہر طرح اور ہر قسم و درجہ کی برائیاں آگئیں۔ بغی میں ہر طرح کی زیادتی آگئی، خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں کی گئی ہو۔

جو کتاب ایسے سانچے لے کر آئی ہو، جس سے ایسے اعمال ڈھلتے ہوں، جو ایسی زندگیاں بناتی ہو، اگر وہ ہدایت، رحمت اور بشارت نہیں تو اسے اور کس نام سے پکارا جاسکتا ہے؛

یہ بالکل درست ہے جس شخص کو نیکی، بدی اور اچھائی برائی کا کچھ بھی احساس و شعور ہو اور وہ دنیا کو بہتر

حالت میں دیکھنے کا واقعی آرزومند ہو، اسے مولاناؒ کے ارشادات سے ایک لمحے کے لیے بھی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حقیقی اور پایدار فلاح کی راہ وُہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دے رہا ہے اور اس کا صحیح اندازہ ہر انسان کو محض تدبر و تفکرِ صحیح سے ہوسکتا ہے، اگرچہ وہ اسے درکامفقود نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی تو نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ جس وجودِ اقدس کو اس تعلیم و دعوت کا اکمل و اتم پیکر بنا کر ہدایت عالم کے لیے مبعوث فرمایا گیا۔ اس کے "رحمۃ للعلمین" ہونے میں کسی کے لیے کیا گنجایش کلام باقی رہ سکتی ہے؟ قرآن یقیناً "ذکر للعلمین" ہے اور حضور صلعم لاریب "رحمۃ للعلمین" ہیں۔

عہدِ ماضی کے مناقشات

دنیا کا بڑا حصہ عہدِ ماضی کے مناقشات میں اُلجھا ہُوا ہے۔ جھگڑے جاری ہیں، بحثوں کی گرم بازاری ہے حالانکہ جن دور پر سیکڑوں یا ہزاروں سال بیت چکے ان کے متعلق آج کوئی فیصلہ ہو بھی جائے تو گزشتہ حالات کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا، جب کہا تھا:

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پہ جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ایک مکالمے کا مختصر سا ذکر ہے۔ فرعون نے سوال کیا کہ موسیٰؑ! تمھارا پروردگار کون ہے؟ جواب ملا کہ ہمارا پروردگار وُہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خلقت بخشی، پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ کھول دی۔ فرعون کو خیال آیا کہ بے شمار گروہ گزر چکے ہیں جو ایسے پروردگار کی معتقد نہ تھے۔ چنانچہ سوال کیا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہونا ہے، جو گزر چکے اور ایسے پروردگار کے تصور سے بھی نا آشنا تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا:

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى۔ (طٰہٰ: ۵۲)

اس کا علم میرے پروردگار کے پاس لکھا ہُوا موجود ہے، میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھُول میں پڑ جائے۔

یعنی اس کاوش میں پڑنے اور بحث و نزاع میں اُلجھنے سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ بہتر ہے کہ گزرے ہوئے لوگوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں اور اپنی توجہ صرف ذاتی درستی پر جما دیں، کیونکہ نہ پہلوں کی گمراہیاں ہمیں کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان کی نیکیوں سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ ہمارا اچھا یا بُرا انجام ہمارے ہی اچھے یا بُرے اعمال کی بنا پر ہوگا، پھر کیوں انہی کی فکر نہ کریں؟ قرآن مجید نے یہی اصول دوسرے مقام پر ان الفاظ میں پیش کیا:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (البقرہ: ۱۳۴)

یہ ایک امت تھی، جو گزر چکی۔ اس کے لیے وُہ تھا، جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمھارے لیے وُہ ہوگا جو تم اپنے عمل سے

کماؤ گے تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ان کے (یعنی گزری ہوئی
قوموں اور جماعتوں کے) اعمال کیسے تھے؟

کتنا پاکیزہ اور امن پرور اصول ہے، جو ہمارے بے شمار جھگڑوں اور بحثوں کو ختم کر سکتا ہے۔ جب یہ مسلّم ہے کہ نہ گزرے ہوئے لوگوں کی نیکیاں ہماری بحثوں سے کم یا زیادہ ہو جائیں گی اور نہ ان کی بُرائیوں میں ہمارے جھگڑوں کی وجہ سے کوئی فرق پڑے گا۔ آخر ان بحثوں سے اس کے سوا کیا حاصل ہو سکتا کہ اپنا وقت بیجا صرف کریں، باہمی روابط کو بگاڑیں حالانکہ ہماری یہ گرم جوشیاں نہ خود ہمارے نامہ اعمال میں کوئی اچھا اضافہ کرتی ہیں، نہ گزرے ہوئے لوگوں کے لیے کسی بھی درجے میں مفید و سود مند ہیں۔ اگر دنیا اس اصول کو اپنا لے تو غور کیجیے کہ اس کی ناخوشگوار اور بے نتیجہ سرگرمیوں میں کتنی کمی آجائے اور تعاون و خوشگواری کی فضا کتنی اچھی ہو جائے

بھائیوں کے درمیان مصالحت

قرآن مجید کا ایک اصول یہ ہے:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

(حجرات: ۹-۱۰)

اور اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ پس اگر ان میں سے ایک زیادتی پر تُلا رہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کا مرتکب ہو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پس اگر وہ لوٹ آئے تو دونوں فریقوں کے درمیان عدل کے مطابق صلح کرا دو اور انصاف پر استوار رہو۔ یقیناً اللہ کو پسند آتے ہیں انصاف کرنے والے۔ مومن باہم بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

دیکھیے، قتل و خونریزی کو روکنے کی کتنی عمدہ، منصفانہ اور موثر عملی تدبیر ہے۔ ممکن ہے دو بھائیوں کے درمیان غلط فہمی کی بنا پر کشمکش کی نوبت آجائے تو اس صورت دوسرے بھائیوں کا فرض ہے کہ ان میں صلح کرا دیں۔ اگر کوئی فریق صلح سے انکار کرے یا زور و قوت کے بل پر دوسرے فریق کو پامال کر دینے پر تُل جائے تو سب کا فرض ہے کہ متحد ہو کر مظلوم کی حفاظت کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ظالم کو رُک جانے پر مجبور کر دیں۔ جب زیادتی کرنے والا بھی صلح پر آمادہ ہو جائے تو بیچ بچاؤ کرنے والوں کا فرض ہے کہ صلح کرا دیں مگر وہ صلح عدل و انصاف کی بنا پر ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بعض لوگ قوی اور زبردست فریق کی کوئی بات اس بنا پر قبول کر لیں کہ وہ زبردست ہے حالانکہ وہ بات عدل کے خلاف ہو۔

حضور صلعم کا ارشاد ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم۔ عرض کیا گیا کہ مظلوم کی مدد تو کی جا سکتی ہے ظالم کی مدد کیونکر ہو گی؟ فرمایا: اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے روکو۔

یہ اصول مسلمانوں کے تعلق میں بیان ہوا ہے، لیکن یہ اصول دنیا کے ہر بین الاقوامی ادارے کا ایک بنیادی اصول بن سکتا ہے اور جس حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے، انجمن اقوام متحدہ کا پورا نظام اسی پر قایم ہے، اگرچہ مختلف اقوام یا حکومتوں نے ذاتی اغراض کی وجہ سے اس پر عدل و انصاف کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی صحیح صورت پیدا نہیں ہونے دی۔ ذاتی اغراض ہی کی آلودگی اب تک انجمن اقوام متحدہ کی کمزوری اور بے اثری کا باعث ثابت ہوئی ہے۔ قرآن مجید کے اس اصول سے جتنا انحراف کیا جائے گا یا اس پر عمل کی زیادہ سے زیادہ اچھی صورت اختیار کرنے میں جتنا تامل ہو گا اتنا ہی امن عالم میں اختلال کا دروازہ کھلا رہے گا۔

موجبات اختلال کا انسداد

پھر قرآن مجید نے قوموں کے خوشگوار تعلقات میں خلل ڈالنے والا ایک ایک رخنہ بند کیا۔ مثلاً:

۱۔ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ۔ (حجرات: ۱۱)	ہنسی نہ اڑائیں ایک قوم کے لوگ دوسری قوم کے لوگوں کی۔ شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔
۲۔ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ (حجرات: ۱۱)	عیب نہ لگاؤ ایک دوسرے کو۔
۳۔ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ (حجرات: ۱۱)	چڑانے کی غرض سے ایک دوسرے کے نام نہ رکھو۔
۴۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ (حجرات: ۱۲)	اے ایمان والے لوگو! بہت بدگمانیوں سے اجتناب کرو، کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔
۵۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ۔ (حجرات: ۶)	اے ایمان والے لوگو! اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس خبر لائے تو (اسے صحیح سمجھنے سے پیشتر) تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ (خبر سنتے ہی) تم نادانی سے دوسری قوم پر جا پڑو۔ پھر کل اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔

آخری گزارش

یہ صرف چند اصول بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں، جن سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا زاویہ نگاہ عالمی اور بین الاقوامی ہے۔ ساتھ ہی بین الاقوامی ادارہ ہائے امن و سلامتی کے بنیادی اصول بھی سامنے آ جاتے ہیں اور یہ پتا بھی چل جاتا ہے کہ ایسے اداروں کو زیادہ سے زیادہ موثر و کامیاب بنانے کے لیے کن کن اوصاف و خصائص کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ان اوصاف و خصائص کے مطابق ٹھیک عمل کیے بغیر کوئی اجتماعی ادارہ خصوصاً بین الاقوامی ادارہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ مغربی طاقتیں

لے جنھیں دنیا بھر میں کارفرمائی کا درجہ حاصل تھا، جنوری ۱۹۲۰ء میں جمعیتہ اقوام کی بنیاد رکھی تھی، جو دَورِ حاضرہ میں پہلا بین الاقوامی ادارہ تھا لیکن انفرادی اغراض، عالمی مقاصد پر اس طرح چھا گئے کہ یہ ادارہ پندرہ سولہ سال میں بالکل بے اثر رہ گیا اور دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ جون ۱۹۴۵ء میں انجمن اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی گئی، لیکن ظاہر ہے کہ بعض حکومتوں کے انفرادی اغراض کے باعث یہ ادارہ بھی غیر موثر رہ گیا ہے۔ جو چند قرآنی اصول اوپر پیش کیے گئے ہیں، ان پر خلوص کے ساتھ عمل کیے بغیر نہ کوئی بین الاقوامی ادارہ کامیاب ہو سکتا ہے نہ امن عالم کے خواب کی تعبیر کی کوئی شکل ہے اور نہ مصیبت زدہ انسانیت اطمینان کا سانس لے سکتی ہے۔ اس اہم ترین مقصد کے لیے بھی ایک ہی وسیلہ باقی ہے اور وہ رحمۃ للعٰلمین صلعم کا دامنِ رافت و رحمت ہے۔ (مولف)

تمت بالخیر